ترجمان دارالعلوم

مولانا

وحید الزماں کیرانویؒ

نمبر

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نئی دہلی ۲۵

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

ترجمان دارالعلوم

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نمبر

مدیر مسئول
مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

مدیر
اسعد الاعظمی

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

۱۱/۱۶۱ - جوگا بائی - جامعہ نگر - نئی دھلی - ۱۱۰۰۲۵

ماہنامہ ترجمان دارالعلوم

مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ نمبر

پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر	: ————	محمد افضال الحق جوہر قاسمی
تزئین و کتابت	: ————	زیر اہتمام عبد الستار شمیم
طباعت	: ————	جے آر آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مقام اشاعت	: ————	دفتر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند ۱۱/۱۶۱، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
قیمت	: ————	۱۰۰ روپے

فہرست مضامین

ابتدائی حالات

آغازِ سفر

شانِ عبقریت

اعترافِ عظمت

اصلاح و انقلاب کی قیادت

قائدِ مظلوم

ملّی و اجتماعی سرگرمیاں

سفرِ آخرت

منظوم خراجِ عقیدت

مولانا محمد افضال الحق قاسمی

حرفِ آغاز

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے (جگر مرحوم)

مولانا وحید الزماںؒ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ نہ آپ بیتی ہے نہ سوانح عمری، نہ قصیدہ ہے نہ مرثیہ، بلکہ مولانا کے معاصرین یا شاگردوں یا دوستوں کی رائیں ہیں، ان کے جذبات اور تاثرات ہیں یا ان کی حسرتیں اور کاوشیں ہیں۔ ہاں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ بھی ہے۔ ادارہ نے ان کو من وعن مرتب کر کے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ اس قد آدم آئینے کے سامنے اپنی نظر میں آپ کیسے لگتے ہیں۔ یہ نمبر آپ سے سرگوشی کرے گا کہ تمہاری تعلیم تمہاری تربیت، تمہارا درس، تمہارا انداز کار قابل اصلاح ہے اور کس حد تک ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی نظر آئیں گی کہ عمر بھر آپ کی رہنمائی کرتی رہیں گی خصوصاً مولانا کا درسی انداز اور ان کا تربیتی عمل اور سب سے زیادہ ان کی بے تکان کارکردگی اور مسلسل جد وجہد — ع

پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا بن جا۔

مولانا جتنی عمر کاتب تقدیر سے لائے تھے اس کا ایک ایک منٹ صرف کر کے تشریف لے گئے اور اس طرح گئے، ہیں کہ سینکڑوں شاگرد ان کی جدائی سے رو پڑے۔ سینکڑوں شخصیتیں حیران رہ گئیں کہ اب وحید الزماں کو کہاں تلاش کریں۔ ہزاروں طلبار ہاتھ مل کر رہ گئے کہ ہم ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ دارالعلوم کی تاریخ کے بیسیوں عنوان انتظار میں رہ گئے مگر مولانا کے ہاتھ ان کی نقاب کشائی نہ کر سکے۔

مولانا وحید الزماںؒ تاریخ کے ان رجال کار میں سے تھے جو اپنی تاریخ اپنے ہاتھوں سے

اپنے افکار و اعمال سے اور اپنی جدوجہد سے خود ہی مرتب کرتے ہیں اس لئے ان کے جانے کے بعد لوگ محسوس کرتے ہیں کہ کون کون سے کام ادھورے رہ گئے، کون کون سی باتیں تشنہ لب رہ گئیں، پھر ان کے شاگرد، ان کے احباب اور معاصر ان کی تکمیل کرتے ہیں جیسے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و اعمال کو دو سو برس تک لوگ مکمل کرتے چلے آئے اور آج بھی ان کی سیاست و افکار کے بہت سے گوشے ہیں جن کی تکمیل ہونی باقی ہے۔ یا جس طرح علامہ شبلیؒ کے عزائم کی تکمیل میں دار المصنفین جیسے عظیم ادارے کو ۵۰ برس سے زیادہ لگ گئے اور ان کے شاگردوں نے انھیں تقریباً پورا کر دیا۔ یا جس طرح حجۃ اللہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے چھوڑے ہوئے کام ان کے شاگردوں نے مکمل کئے اور بہت سے گوشے آج تک باقی ہیں خصوصاً ہندوستان کے مذاہب پر حجت قائم کرنا اور خود ان کی مذہبی کتابوں سے اور ان کی زبانوں کے ذریعہ اسے مکمل کرنا اور دار العلوم کو تحریک کی شکل میں عام کرنا اس طرح کے اور بہت سے کام، کیونکہ مولانا نانوتوی میدان جنگ میں سپہ سالار رہتے۔ درسگاہ میں استاد کامل، خانقاہ میں گوشہ نشیں، اہل قلم میں بخاری کے شارح، مناظرہ میں فاتح شاہجہاں پور، نئے علم کلام میں امام رازی، اسکیم سازی میں تحریک دار العلوم کے بانی اور شان و شوکت میں ابن مسعودؓ اور ابوذر غفاریؓ کی طرح سادہ و پرکار۔ ایسے میں ابھی سو سال تک ہم ان کے کاموں کو مکمل نہیں کر سکتے۔ مولانا وحید الزماں کے لئے مولانا نانوتوی ایک نمونے کے انسان تھے اور قابل تقلید فرد کامل تھے اس لئے اگر ان کو ۴۰، ۵۰ برس اور مل گئے ہوتے اور وہ صرف قلم کے میدان میں چلتے تو حضرت نانوتوی کے چھوڑے ہوئے بہت سے کاموں کو اسی طرح مکمل کرتے جس طرح انھوں نے ادب عربی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

مولانا وحید الزماں نمبر میں آپ تلاش کریں گے تو دار العلوم دیوبند کا ایک فرد بھی شامل نہیں پائیں گے، ہاں بعض جیالوں نے معذرت کے خطوط ضرور ارسال کئے ہیں مگر اپنے تاثرات جذبات، تنقید یا تبصرہ کے ساتھ شامل نہیں ہو سکے۔ آخر کیوں؟ آپ کا ذہن سوال کرے گا، آپ کیا جواب دیں گے مجھے معلوم نہیں مگر میرا جواب یہ ہے کہ خوف کی وجہ سے، ایسا خوف جس نے دار العلوم کے شاہین بچوں کو مرغابیاں بنا دیا ہے کہ وہ اپنے استاد کے لئے اپنے جذبات و تاثرات کو بھی زباں پر لاتے ہوئے گھبراجاتے ہیں۔ ع افسوس گز قبیلہ مجنوں کسے نماند

مولانا وحید الزماں صاحب نے دارالمؤلفین جن کاموں کے لئے قائم کیا تھا وہ مقاصد اور عزائم ابھی تک نامکمل ہیں۔ اگر دارالمؤلفین کو زندہ رکھ کر تاریخ دیوبند، تاریخ اکابر دیوبند اور علوم اسلامی نیز عربی ادب کی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے تو وہ مولانا کے لئے زادِ آخرت بھی ہوگا اور دنیا میں ان کی خدمات کا تسلسل بھی۔

یہ نمبر بڑی تاخیر سے آپ تک پہنچ رہا ہے مگر یہ تاخیر اس کی تکمیل کے لئے کرنی پڑی ہے اس لئے آپ انشاء اللہ بھول جائیں گے ہماری کوتاہیاں جب یہ نمبر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے گا۔

ہم ان تمام دوستوں عزیزوں اور معاصروں کے شکر گذار ہیں جن کی توجہ سے یہ نمبر مکمل ہوسکا اور مولانا وحید الزماں کی زندگی، ان کی فنکاری اور ہوشمندی کے بہت سے نئے گوشے اجاگر ہوسکے۔ ادارہ ان حضرات کے لئے بھی دعاگو ہے جو لکھنا چاہتے تھے مگر نہ لکھ سکے کہ ہم کیا ہیں؟ ہم سے کوئی غلط بیانی نہ ہو جائے، ہم کوتاہی نہ کردیں! یہ نمبر ان کی ہمت بڑھائے گا کہ انھیں ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ ایک ایک واقعہ، ایک ایک جملہ کبھی لمبی لمبی داستانوں سے بڑھ کر ہوتا ہے اس لئے ایسے حضرات کوئی نئی بات ہو تو ضرور لکھیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اسعد الاعظمی

عرضِ مرتب

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے چند ضروری باتوں کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے ۔ بعض قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ترجمان دارالعلوم نے اپنی پہلی خصوصی اشاعت کے لئے مولانا وحید الزماں صاحب کی شخصیت کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ ماضی قریب میں ہمارے حلقہ کی اور بھی کئی عظیم شخصیتوں نے ہمیں داغِ مفارقت دیا ہے، ان میں سے کسی پر کوئی نمبر کیوں نہیں شائع کیا گیا؟

اس سوال کے جواب میں ایک بات تو یہ کہی جا سکتی ہے کہ اپریل ۱۹۹۵ء میں مولانا وحید الزماں صاحب کے سانحۂ ارتحال کے فوراً بعد مختلف حلقوں کی طرف سے مولانا کی حیات و خدمات پر ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کے لئے اتنا شدید تقاضا ہوا کہ ترجمان دارالعلوم کے خدام مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں کی اس خواہش کو نظر انداز نہ کر سکے۔ مولانا کے قدر دانوں کی طرف سے پیہم اصرار اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ قدرت نے مولانا مرحوم کو عظمت کے ساتھ بے پناہ مقبولیت بھی عطا کی تھی اور یہ وہ دولت ہے جو ہر عظیم انسان کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس غیر معمولی مقبولیت و محبوبیت کی بنیادی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے (جیسا کہ زیر نظر نمبر کے بیشتر مضامین سے اس کی تائید ہوتی ہے) کہ مولانا نے تربیت اور افراد سازی کے میدان میں جو غیر معمولی جدوجہد کی اور اپنے طلبا کو بنانے اور سنوارنے کے لئے جس طرح خود کو کھپایا اور مٹایا، دورِ حاضر کی کسی اور شخصیت کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی۔

بہت سے حضرات نے اس بات پر زور دیا کہ چوں کہ ترجمان دارالعلوم ایک آزاد اور غیر جانب دار رسالہ ہے اور دارالعلوم کے کسی خاص گروپ سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے تمام حقائق کے بے کم و کاست اظہار کی جرأت رکھتا ہے اس لئے اسی کو مولانا مرحوم پر نمبر شائع کرنے

کی خدمت انجام دینی چاہیے۔ اور اسی سے مولانا کا حق ادا کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مخلصین کے اس اعتماد اور حسن ظن سے ہمیں روحانی مسرت بھی محسوس ہوتی ہے اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کا جذبہ اور حوصلہ بھی ملتا ہے۔ بعض کرم فرماؤں نے مالی وسائل کی فراہمی میں بھی بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی اس لئے ہمارے سامنے اس کام کے لئے کمر ہمت باندھ لینے کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

مولانا مرحوم پر نمبر شائع کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند (جس کی یہ رسالہ ترجمانی کرتا ہے) کی تاسیس ایک طرح سے مولانا کی ہی رہین منت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں جب مولانا وحید الزماں صاحب کو مجلس شوری میں ایک سیاسی شخصیت کے اثر و نفوذ اور ان کی ذاتی مخاصمت اور منتقمانہ مہم کے نتیجہ میں بلا کسی معقول وجہ کے اور انتہائی غیر متوقع طور پر دارالعلوم کی تدریسی خدمات سے گویا جبراً سبکدوش کر دیا گیا جس سے ملک و بیرون ملک میں ایک ہلچل سی مچ گئی تو دارالعلوم اور مولانا مرحوم دونوں سے عقیدت و محبت رکھنے والے کچھ مخلص و دردمند فرزندان قاسمی ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ اس اجتماع کا اصل مقصد تو اس مسئلہ پر غور و خوض کرنا تھا کہ مولانا جیسے منفرد معلم و مربی کی غیر قانونی علاحدگی پر فضلائے دارالعلوم دیوبند کو اپنے رد عمل کے اظہار کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور دارالعلوم کے ارباب حل و عقد کو اس نامعقول فیصلہ کے سنگین نقصانات سے آگاہ کرنے اور اس کو واپس لینے پر آمادہ کرنے کے لئے کون سا لائحہ عمل اپنانا چاہیے۔ لیکن کچھ ہوش مند فضلائے گرامی کی اس رائے نے تمام حاضرین کے دل جیت لئے کہ اجتماعیت کے اس دور میں فضلائے دیوبند کی کسی موثر تنظیم کا موجود نہ ہونا بڑے افسوس کی بات ہے۔ مولانا وحید الزماں صاحب کا مسئلہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ فضلائے دیوبند کی ایک ایسی تنظیم کا وجود نہایت ضروری ہے جو اصلاً قاسمی برادری کو مربوط و متحد کرنے، ان میں اجتماعی شعور اور اجتماعی عمل کا جذبہ پیدا کرنے اور حالات کے مطابق فضلاء کیلئے لائحہ عمل مرتب کرنے کی خدمت انجام دے اور ساتھ ہی دارالعلوم کے اساتذہ، طلباء، ملازمین اور فضلائے دیوبند کی مشکلات و مسائل کو حل کرنے میں بھی تعاون کرے۔ اس طرح فضلاء کے اتفاق رائے سے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا اور آغاز کار میں اس نے مولانا وحید الزماں صاحب کے مسئلہ کو ہی اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔ بنابریں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنظیم کے قیام کا اصل

محرک مولانا مرحوم کی دارالعلوم سے سبکدوشی تھی۔ یہ ایک خوشگوار نتیجہ تھا جو مولانا کی سبکدوشی کے سراسر غلط فیصلے کے بطن سے برآمد ہوا۔

اس غیر ضروری تفصیل کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ایک مخصوص حلقہ کی طرف سے جس کو نہ معلوم کیوں تنظیم کے وجود سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا ہے، تنظیم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے اب بھی یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے (اور شاید کچھ مخلص مگر سادہ لوح اور حقیقت حال سے ناواقف لوگ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں) کہ اس تنظیم کا قیام مولانا وحید الزماں صاحب نے اپنی سبکدوشی کے فیصلے کو تبدیل کرانے کے لئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے قائم کیا تھا۔ یہ تاثر نہ صرف یہ کہ بالکل بے بنیاد اور حقیقت کے برعکس ہے بلکہ مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ پر ایک بہتان عظیم بھی ہے۔ تنظیم کے قیام میں حصہ لینے والا ہر فاضل دارالعلوم گواہ ہے کہ تنظیم قائم کرنے کی تجویز پر مشورہ اور استصواب کی غرض سے جب فضلاء کے ایک وفد نے مولانا سے ملاقات کی تو اس بے لوث شخصیت نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ میں ذاتی طور پر جس طرح دارالعلوم کے اندر طلبار کی انجمن قائم کرنے کا پر زور حامی تھا اور اس کے لئے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کی اسی طرح دارالعلوم کے باہر فضلاء کی تنظیم کا بھی مؤید ہوں، لیکن اگر آپ حضرات کو تنظیم قائم کرنے کی تحریک میری علاحدگی کے مسئلہ سے ملی ہے اور آپ اس کے پلیٹ فارم سے میرے مسئلہ کو اٹھانے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں تو میں آپ سے بڑا ہونے کی حیثیت سے یہ مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ موجودہ مرحلہ پر جب کہ میرے مسئلہ کی وجہ سے فضا کسی قدر گرم ہے آپ کوئی تنظیم قائم کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ آپ تنظیم ضرور قائم کریں لیکن کسی اور موقع پر، اور مثبت اور وسیع تر مقاصد کے لئے۔

مولانا نے اپنی اس رائے کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اب تک کی زندگی میں جو بھی جدوجہد کی ہے وہ دارالعلوم دیوبند اور طلبار کے مفاد کے لئے تھی، اس سے میرا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا۔ میری علاحدگی کا مسئلہ چوں کہ میری ذات سے وابستہ ہے اس لئے اس کے لئے کوئی احتجاجی تحریک چلانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ دوسرا سبب مولانا نے یہ بیان کیا کہ میری سبکدوشی کے فیصلے کی وجہ "بیماری اور اشتعال انگیزی" بتائی گئی ہے، ہر چند کہ یہ ایک خود ساختہ عذر لنگ ہے لیکن اگر آپ حضرات کوئی تحریک چلاتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ماحول میں کچھ بدمزگی پیدا ہوتی ہے تو اس کو بھی میری ہی طرف منسوب کیا جائے گا اور

استعمال انگیزی کے بے بنیاد الزام کو ثابت کرنے کے لئے اسے ثبوت کے طور پر استعمال کیا جائے
گا۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دار العلوم میں پیش آنے والے حالات کے نتیجہ
میں علماء کی بڑی جگ ہنسائی ہو چکی ہے، اب ایک بار پھر اگر علماء کے باہمی اختلافات منظر عام
پر آتے ہیں تو اس جگ ہنسائی میں مزید اضافہ ہوگا۔

جب وفد کے ارکان نے مولانا کے مشورہ کو ماننے سے معذرت ظاہر کی اور کہا کہ ہم تنظیم
کو یقیناً" وسیع تر مقاصد کے لئے قائم کریں گے لیکن اپنے ضمیر کی آواز پر، پُر امن اور مہذب
انداز میں آپ کا مسئلہ بھی ضرور اٹھائیں گے تو مولانا نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ مصر ہیں تو میں آپ کو
مجبور نہیں کر سکتا، لیکن میرا آپ کی احتجاجی تحریک سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا، چنانچہ مولانا نے
تنظیم کا کوئی عہدہ یا اس کی سرپرستی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بعد میں جب فضلاء کی
تمام کوششوں کے باوجود مجلس شوریٰ نے اگلے اجلاس میں اپنے سابقہ فیصلہ کی توثیق کر دی اور
فضلاء نے مایوس ہو کر اپنی تحریک ختم کر دی تو مولانا نے تنظیم کے خدام کی گذارش پر اس کی مجلس
عاملہ کی رکنیت قبول فرمائی۔

بات دور جا پہنچی۔ اصل موضوع گفتگو یہ تھا کہ ترجمان دار العلوم نے اپنی پہلی خصوصی
اشاعت کے لئے مولانا وحید الزماں صاحب کا انتخاب کیوں کیا۔ سطور بالا میں جو اسباب بیان
کئے گئے وہ نسبتاً ضمنی اور غیر اہم ہیں۔ اس کا اصل اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں مولانا
وحید الزماں صاحبؒ مدارس عربیہ اور فضلائے دار العلوم کے لئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ ان کے افکار و نظریات اور ان کا عمل ہمیں ایک ایسی راہ کا پتا دیتے ہیں جس کی پیروی
دینی مدارس اور ان کے فضلاء کے لئے منزل مقصود کا حصول یقینی بناتی ہے بلکہ ہم یہ کہنے کی جسارت
کریں گے کہ دینی مدارس اور ان کے ارباب حل وعقد اگر خلوص نیت کے ساتھ تیزی سے بدلتے ہوئے
زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس منزل تک پہنچنے کے لئے مولانا مرحوم
جیسے بصیرت مند اور روشن دماغ عالم دین کے افکار و خیالات اور عملی تجربات کو ہی چراغ راہ
بنایا جا سکتا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم پر ایک عرصہ سے بحث جاری ہے۔ اس سلسلہ میں
کچھ حضرات کے خیالات بہت زیادہ قدامت پرستانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں تو کچھ دوسرے

حضرات ضرورت سے زیادہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مولانا وحید الزماں صاحب اس خصوص میں نہایت معتدل، متوازن اور حقیقت پسندانہ موقف رکھتے تھے۔ ان کے یہاں قدامت پسندی بھی ہے اور جدت طرازی بھی۔ وہ اسلاف کی زریں روایات کو سینہ سے لگائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے لیکن عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ وہ صالح روایات کے سچے قدردان تھے لیکن روایات کے نام پر جمود و تعطل اور وقت کی ضرورتوں سے آنکھیں بند کر لینے کو کوتاہ اندیشی قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مقصد اور وسائل میں فرق کرنا ضروری ہے۔ مقصد کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا لیکن وسائل کو حالات کے مطابق نہ صرف بدلا جا سکتا ہے بلکہ کئی بار ان کو بدلنا ضروری ہوتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ مدارس اسلامیہ کا بنیادی مقصد ملت کے نونہالوں کو علوم شریعت سے بہرہ ور کرنا ہے تاکہ وہ ملت کی دینی ضرورتوں کی تکمیل اور اسلام کا پیغام عام کر سکیں۔ اس نصب العین سے ایک انچ بھی ہٹنا ہمیں کسی قیمت پر گوارا نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس مقصد کے لئے ہمارے جو وسائل یعنی ہمارا جو تعلیمی نصاب و نظام ہے، اگر وقت کے بدلنے سے ان کی افادیت کم ہو گئی ہے تو ہمیں ان کی افادیت کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لئے کسی بھی جائز اور مفید اصلاح و ترمیم کو قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہہ دینا کہ انہی وسائل کے ذریعہ ہمارے اکابر نے مثالی خدمات انجام دی تھیں اس لئے ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، محض کوتاہ نظری اور اپنی ذمہ داری سے فرار کے مترادف ہے۔ جو وسائل کسی عہد میں مفید تھے، ضروری نہیں کہ ہر زمانہ میں ان کی افادیت برقرار رہے۔ اگر ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے مدارس سے نکلنے والی نئی نسل مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اتر رہی ہے اور معاشرہ پر علماء کا اثر و رسوخ بڑی تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے تو اس کے تدارک کے لئے ہمیں ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وسائل میں کسی تبدیلی کو قبول نہ کرنے پر اڑے رہنے کے نتیجہ میں بالآخر مقصد اصلی ہی فوت ہو کر نہ رہ جائے۔

مولانا کے یہ حقیقت پسندانہ نظریات محض ذہنی خاکے نہیں تھے بلکہ جب بھی موقع ملا انہوں نے ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ دارالعلوم کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہونے کے بعد مولانا نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے ذہنی خاکوں میں رنگ بھرنا اور عرصہ سے چلی آ رہی تعلیمی و انتظامی کمزوریوں کو دور کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ اور اتنی ہی تیزی سے اس کے خوشگوار نتائج بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے، لیکن افسوس کہ کوتاہ بینوں اور ظلمت پسندوں کو یہ گوارا نہ ہو سکا اور مولانا کو بڑی

مختصر مدت کے اندر ہی معاون مہتمم کے عہدہ سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ اگر مولانا کو کچھ اور مہلت ملی ہوتی تو ہمیں یقین ہے کہ انھوں نے دورس اور دیرپا اصلاحات کے ذریعہ دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو تیز رفتار ترقی کی راہ پر ڈال دیا ہوتا۔

اس سے پہلے عربی زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے بھی مولانا نے اپنے حقیقت پسندانہ نظریات کو عمل کا ملبوس پہنا کر اور حیرت انگیز نتائج پیدا کر کے سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس بات سے مولانا کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے کم از کم عربی زبان کی تعلیم کی حد تک ایک مختصر مدت کے اندر ناقابل یقین انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے تدریس کا انداز بدلا، مشق وتمرین کے نئے طریقے ایجاد کیے۔ حسب ضرورت نصابی کتابیں مرتب کیں، طلبا کی ذہنیت بدلی، ان کا انداز فکر ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو ہر چیز میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو طلبا کئی برس تک عربی زبان کے قواعد اور عربی کی کتابیں پڑھنے کے باوجود عربی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے تھے، وہ سال دو سال کے اندر عربی زبان کے ماہر بن جاتے۔ مولانا نے کسی بھی معاملہ میں پرانی لکیروں کو پیٹتے رہنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے جدت طراز ذہن سے نئے طریقے اور نئی راہیں ایجاد کیں۔ اس طرز عمل کی تہ میں وہی فکر کارفرما تھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا، کہ مقصد اصلی کے حصول کے لئے حالات کے مطابق وسائل میں اصلاح وتبدیلی کرنا نہ صرف مناسب بلکہ لابدا اوقات ضروری ہوتا ہے۔ مولانا نے عربی زبان کی تعلیم کے لئے جو لائحۂ عمل اختیار کیا اگر ہم انہی خطوط پر تمام علوم وفنون کی تعلیم کا نظم قائم کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ عربی زبان کے شعبہ میں جو نتائج برآمد ہوئے ویسے ہی نتائج دوسرے شعبوں میں برآمد نہ ہوں۔

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا وحید الزماںؒ کی مثالی شخصیت، ان کے حقیقت پسندانہ افکار ونظریات، ان کی جد وجہد بھری زندگی اور ان کے اعلیٰ اخلاق وکردار کے تعارف پر مشتمل یہ خصوصی نمبر ہماری آنے والی نسلوں کے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ہوگا جو انشاء اللہ ان کے سفر زندگی کی تاریک راہوں میں قندیل رہبانی کا کام دے گا۔

پیش نظر خصوصی نمبر کے لئے ہماری توقع کے برخلاف مضامین ومقالات بہت بڑی تعداد میں موصول ہوگئے۔ ہم نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اہل قلم کو نمائندگی کا موقع دیا جائے اور اس کے لئے کہیں کہیں مقررہ معیار کو نظر انداز بھی کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود ایسے مضامین کی

تعداد اچھی خاصی ہے جو مختلف اسباب کی بنا پر اس نمبر میں شامل نہ ہو سکے۔ جن محترم اہل قلم کے مضامین شامل نہیں کئے جا سکے ان سے ہم معذرت خواہ ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ ہماری مجبوریوں کے پیش نظر ہمیں معذور سمجھیں گے۔ کچھ ایسے مضامین جو قابل اشاعت ہونے کے باوجود محض تکرار سے بچنے کے لئے شامل نہ کیے جا سکے، ان کو ہم انشاء اللہ ترجمان دارالعلوم کے عام شماروں میں موقع موقع سے شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ بعض اہل قلم کے مضامین اہم ہونے کے باوجود اتنے طویل تھے کہ ان کی تلخیص ناگزیر تھی، ورنہ نمبر کا حجم جواب بھی ہمارے ابتدائی خاکے سے تقریباً تین گنا زائد ہے، بالکل ہی قابو سے باہر ہو جاتا۔

ایک اور مشکل تکرارِ مضامین کی تھی کہ ایک ہی شخصیت پر مختلف حضرات کی تحریروں میں مضامین کا تکرار ناگزیر ہے، ہم نے حتی الوسع تکرار سے بچنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے مضامین میں تلخیص اور حذف و ترمیم سے کام لیا ہے لیکن اس کے باوجود قارئین کو کہیں کہیں مضامین کا تکرار محسوس ہو سکتا ہے تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک ہی بات کا جب مختلف مضامین میں ذکر آتا ہے تو ہر مضمون نگار کا پیرایۂ بیان بھی مختلف ہوتا ہے اور ہر ایک کے یہاں کچھ نئی معلومات بھی ضرور ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ہی واقعہ کو مختلف لوگ الگ الگ زاویۂ نظر سے دیکھتے اور اس سے الگ الگ نتائج اخذ کرتے ہیں، اس لئے بادی النظر میں مضامین کا جو تکرار نظر آتا ہے اسے فی الواقع تکرار نہیں کہا جا سکتا۔

اس نمبر کی ترتیب کے دوران بعض محترم شخصیات نے ہمیں مشورہ دیا کہ مولانا وحید الزماں صاحب کے انتقال کے بعد اب ان اختلافی امور اور تنازعات کا ذکر مناسب نہیں ہے جن سے مولانا کو اپنی زندگی میں سابقہ پڑا۔ اس مخلصانہ مشورہ کی دل سے قدر کرنے کے باوجود اس کو قبول کرنا بوجوہ ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ ہمارے خیال میں کسی شخصیت پر شائع ہونے والے خصوصی نمبر میں اگر اس کی زندگی کے بعض اہم گوشوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ایک باشعور قاری کا ذوق مطالعہ تشنگی محسوس کرے گا اور کوئی بھی غیر جانبدار ناقد و مبصر بجا طور پر اسے ادھورا اور نامکمل قرار دے گا بلکہ یہ بات صحافتی اور تاریخی دیانت کے بھی خلاف ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اختلافی امور سے مکمل اجتناب کی صورت میں جو نقصان ہوتا وہ ان کے ذکر سے ہونے والے موہوم نقصان سے کہیں زیادہ ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے کہ مولانا وحید الزماں صاحب چونکہ ایک انقلابی شخصیت کے مالک اور دارالعلوم دیوبند کی نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے اور ایسی شخصیتوں کی زندگی میں اختلافی امور اور تنازعات نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے اختلافی امور سے صرف نظر کر کے مولانا کی شخصیت کو سمجھنا، اس کی تہ بہ تہ پرتوں کو کھولنا اور ان کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں مولانا مرحوم کا جب بھی ذکر آئے گا، خلافیات کا ذکر بھی ناگزیر ہو گا۔

تنظیم ابنائے قدیم اور ترجمان دارالعلوم کا روز اول سے یہ موقف رہا ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحب کی دارالعلوم دیوبند سے علاحدگی سراسر غلط اور ایک سازش کا نتیجہ تھی۔ دارالعلوم کو اس کے اہم ترین استاذ اور رجال شارعاشق کی خدمات سے جبری طور پر محروم کر دینا ایک ایسا سانحہ تھا جس نے نہ صرف قاسمی برادری کے جذبات و احساسات بڑے پیمانہ پر مجروح ہوئے بلکہ دارالعلوم کی زریں روایات بھی پامال ہوئیں۔ اس المیہ سے نہ ہم صرف نظر کر سکتے ہیں نہ مستقبل کا کوئی مورخ اسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ اور ہماری ناقص رائے میں اس المیہ کو یاد رکھنا اور آئندہ نسلوں کو اس سے مطلع کرنا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ دارالعلوم دیوبند خدانخواستہ آئندہ پھر کبھی کسی ایسی صورت حال سے دوچار نہ ہو۔ مذکورہ اسباب کے پیش نظر ہم نے اس نمبر میں دارالعلوم سے مولانا مرحوم کی سبکدوشی اور اس کے لواحقات کے لئے ایک مستقل باب مخصوص کیا ہے۔ البتہ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں رونما ہونے والے انقلاب کے پس منظر و پیش منظر کے بارے میں ایک اہم اور تفصیلی مضمون جو مولانا محمد فضل الحق الحسینی نے تحریر فرمایا تھا، طوالت کے خوف سے پورے کا پورا اس نمبر میں شامل نہیں کیا جا سکا اور اس کے صرف ایک مختصر حصہ کی شمولیت پر اکتفا کرنا پڑا۔ توقع ہے کہ مولانا موصوف عنقریب اسے کتابی شکل میں شائع کر کے اس کمی کی تلافی کر دیں گے۔

اس نمبر کے مندرجات کی قدرتی ترتیب تو یہ ہوتی کہ مولانا مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کے لئے مستقل ابواب قائم کئے جاتے لیکن چونکہ بہت سے مضامین بر یک وقت مولانا کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں اس لئے مجبوراً ان کے لئے عمومی نوعیت کے ابواب قائم کرنا پڑے۔ مخصوص عناوین کے تحت قائم کئے گئے ابواب میں جو مضامین شامل

کیے گئے ہیں ان میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کے کچھ حصے متعلقہ باب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ان کے مجموعی تاثر کو دیکھتے ہوئے وہاں شامل کر دیا گیا ہے۔ ایک باب کے مختلف مضامین کی تقدیم وتاخیر میں مضمون نگاروں کے مقام ومرتبہ کا کم اور متعلقہ باب کے تقاضوں کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ نمبر کے مندرجات کس پایہ کے ہیں اور ہم اس کو وقیع اور معیاری بنانے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا آخری فیصلہ تو قارئین کرام کا ذوقِ تنقید کرے گا تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس رنگا رنگ مجموعہ میں مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے رفقاء، معاصرین، تلامذہ اور عقیدت مند سبھی کے تاثرات واحساسات شامل ہیں اور مولانا مرحوم کی حیات وخدمات کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا بچا ہو جس پر اس نمبر کے ذریعہ روشنی نہ پڑتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نمبر کے لئے اتنی بڑی تعداد میں اور بعض نہایت بلند پایہ مضامین جمع ہو جائیں گے اس کا خود ہم نے بھی تصور نہیں کیا تھا۔ ہم اسے مولانا مرحوم کی سحر انگیز شخصیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے تمام مقالہ نگاروں کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔

آخر میں ادارہ ترجمان دارالعلوم اپنے دیرینہ مخلص وکرم فرما مولانا محمد مزمل الحق الحسینی (کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم) اور جناب خالد القاسمی صاحبان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہے کہ ان دونوں حضرات کا مسلسل اور گراں قدر تعاون اگر شاملِ حال نہ ہوتا تو اس نمبر کو موجودہ شکل میں لانا ممکن نہیں تھا۔ ان دونوں فضلائے گرامی نے اپنی متنوع مصروفیتوں کے باوجود اس نمبر کی ترتیب وتیاری کے دوران ہر قدم اور ہر مرحلہ پر اپنے قیمتی اور صائب مشوروں سے نوازا ہے اور اس کے ظاہر وباطن کو سنوارنے میں وہ برابر کے حصہ دار رہے ہیں۔ ہم مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے برادرانِ گرامی جناب مولانا عمید الزماں صاحب اور جناب مولانا فرید الزماں صاحب کے بھی تہِ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے بہت سی معلومات کی تحقیق اور دستاویزات کی فراہمی میں اپنے بیش قیمت تعاون سے نوازا اور اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود کسی بھی ممکنہ تعاون سے دریغ نہیں کیا۔ اسی طرح مولوی نوشاد عالم قاسمی آفس انچارج تنظیم ابنائے قدیم اور مولوی اسرار احمد رازی بستوی کا شکریہ بھی واجب ہے کہ ان دونوں حضرات نے کتابت شدہ مسودات کی مراجعت اور دوسرے متعلقہ امور کی انجام دہی میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لے کر ہمارے کام کو آسان بنا دیا۔

امید ہے کہ یہ خصوصی نمبر اہلِ علم اور اہلِ نظر کی توقعات پر پورا اترے گا۔ ☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیغام

حضرت مولانا صدیق احمد باندوی دامت برکاتہم

عارف باللہ حضرت مولانا صدیق احمد باندوی دامت برکاتہم نے ترجمان دار العلوم کے مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر کے لئے مندرجہ ذیل پیغام ارسال فرمایا ہے۔ مولانا مدظلہ نے پیغام کے ساتھ اپنے گرامی نامہ میں اس خواہش کا اظہار فرمایا ہے کہ مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کی ایک مستقل اور باضابطہ سوانح عمری بھی شائع ہونی چاہیئے اور یہ دعا فرمائی ہے کہ "اللہ پاک اس کے لئے کسی کو تیار کردے۔" (ادارہ)

حامداً و مصلیاً

جناب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مرحوم سے آخری ملاقات ان کے مرض الموت کے دوران ہوئی تھی جب میں دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا تھا، مولانا کے مرض و سحر کی شدت کو دیکھ کر اسی وقت دل میں یہ اندیشہ گزرا تھا کہ شاید اب وہ زیادہ دنوں تک ہمارے درمیان نہیں رہ سکیں گے، افسوس کہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا سحر و بیماری کے اس حملہ سے جاں بر نہ ہوسکے اور ۱۵ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

مولانا مرحوم سے میرا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ راقم ان کی شرافت نفس، حق گوئی و بے باکی، اخلاص فی العمل اور دوسری گوناگوں خوبیوں بالخصوص عربی زبان و ادب میں ان کی مہارت اور خدمات اور انتظامی صلاحیت سے بہت متاثر تھا۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ مولانا کچھ دنوں کے لئے باندہ آکر مدرسہ میں قیام کریں، یہاں کے نظم و نسق کا معائنہ کریں اور انتظامی اصلاحات کے لئے مشورہ دیں نیز

ان کی زیر نگرانی یہاں عربی زبان میں تخصص کا شعبہ قائم کیا جائے۔ مولانا مرحوم نے میری یہ تجویز بڑے انشراح قلب کے ساتھ منظور کرلی تھی اور انھوں نے کئی بار سفر کا عزم بھی کیا لیکن افسوس کہ ناگہانی عوارض، ان کی مسلسل علالت اور پھر انتقال پر ملال کی وجہ سے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہوسکا۔

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے رسالہ ترجمان دارالعلوم کی طرف سے مولانا مرحوم پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جارہا ہے۔ تنظیم ابنائے قدیم کے ذمہ داروں کا یہ اقدام قابل تحسین ہے۔ مولانا مرحوم کی خدمات کے تعارف سے انشاء اللہ آئندہ نسلوں کو بہت فائدہ پہنچے گا اور ان میں مولانا مرحوم کی طرح کام کرنے کا جذبہ اور لگن پیدا ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اس نمبر کو مدارس دینیہ کے اساتذہ وطلبار اور عام مسلمانوں کے لئے نافع بنائے اور اس کے ذریعے مولانا مرحوم کا فیض عام ہو۔ اللہ پاک تنظیم ابنائے قدیم اور رسالہ ترجمان دارالعلوم کے منتظمین کو اخلاص کی دولت نصیب کرے، ان کو مقاصدِ حسنہ میں کامیاب فرمائے اور ان کی نیک کوششوں کا بہتر صلہ دے۔ آمین۔

احقر صدیق احمد عفی عنہ
خادم جامعہ عربیہ ہتورا، باندہ
۲۵ رمضان ۱۴۱۶ھ

۱

ابتدائی حالات

خود نوشت

مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ

خودنوشت سوانح کے چند اوراق

مولانا وحیدالزّماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تلامذہ اور متعلقین کے مسلسل اصرار پر اپنے حالات زندگی قلم بند کرنا شروع کیے تھے۔ مولاناؒ کے ذہن میں اپنی خودنوشت سوانح کا جو خاکہ تھا وہ خود ان کی تحریر کردہ مندرجہ ذیل تمہید سے واضح ہے۔ مولانا مرحوم کی زندگی جس جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اس کے پیشِ نظر ان کی آپ بیتی یقیناً نئی نسل کیلئے نہایت مفید اور سبق آموز ہوتی، مگر افسوس کہ یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ اس خودنوشت سوانح کے چند ابتدائی اوراق مولاناؒ کے برادرِ خورد اور ان کے علمی جانشین جناب مولانا عمیدالزّماں صاحب کیرانوی کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین ہیں۔ واضح رہے کہ مولاناؒ کی یہ تحریر ابھی بالکل ابتدائی مسودہ کی شکل میں تھی جس کی تبییض کے وقت یقیناً وہ زبان و بیان اور مندرجات میں ضروری تصحیح و تنقیح فرماتے۔ ہم اس ابتدائی مسودہ کو اس کی اصل شکل میں بلا کسی ترمیم و تبدیلی کے شائع کررہے ہیں۔

ادارہ

تمہید

ہر انسان کی حسبِ حیثیت ایک سرگذشت ہے جس کا علم عام طور پر خود اسے یا صرف اس کے اہلِ خانہ اور متعلقین کو ہوتا ہے کبھی یہ بہت سادہ اور معمولی ہوتی ہے اور کبھی اس میں دوسروں کے لیے دلچسپی یا عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے اسی لیے بہت سے حضرات یا خود اپنی داستانِ زندگی قلم بند کرتے ہیں یا ان کے متعلقین و محبین اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔

میرا شمار ان شخصیتوں یا باحیثیت لوگوں میں اگرچہ نہیں ہے کہ جن کے احوالِ زندگی دوسروں کیلئے

لائق مطالعہ اور باعثِ دلچسپی ہوں تاہم اپنی ٹوٹی پھوٹی حیثیت کے باوجود اتفاقاً زندگی ایسے گوناگوں حالات سے دوچار رہی جن سے واقفیت بہت سے کم حوصلہ لوگوں کے لیے جہادِ زندگانی، صبر و تحمل اور اللہ کے فضل و انعام کی شکل میں اس کے ثمرات و نتائج کی کچھ سبق آموز تفصیلات فراہم کرتی ہے نیز بہت سے تاریخی حقائق و انکشافات بھی سامنے آئیں گے جن کا علم اور جن کی تفصیلات صرف خاکسار کے سینہ ہی میں محفوظ ہیں۔ میں اپنے حالاتِ زندگی اسی جذبہ اور تصور کے تحت قلم بند کر رہا ہوں کہ ان سے کچھ لوگوں کو حوصلہ ملے گا، کچھ لوگوں کی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور کچھ حقائق سامنے آئیں گے اور لوگوں کو حق و باطل اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا آسان ہوگا۔

اپنے حالاتِ زندگی کو حسبِ ذیل ابواب پر تقسیم کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ہر باب کے تحت اس کی اہمیت و افادیت کے بقدر تفصیلات عرض کروں گا۔

(۱) خاندانی حالات، (۲) زمانۂ تعلیم و تربیت، (۳) حصولِ تعلیم کے بعد عبوری دور، (۴) دارالعلوم دیوبند میں ملازمت اور اس کے مراحل، (۵) انقلابِ دارالعلوم اور اس کے ملحقات، (۶) دارالعلوم سے جبری سبکدوشی کے بعد مشاغل، (۷) علمی اور تصنیفی کام (۸) بیرونی اسفار، (۹) تلامذہ اور ان کا تعلق (۱۰) تلامذہ و دیگر محبین کے تاثرات۔

خاندانی حالات

وطن، قصبہ کیرانہ، ضلع مظفر نگر۔ صوبہ اترپردیش۔ انڈیا۔

خاندان دادھیال شیوخ کیرانہ، ننہیال شیوخ جھنجھانہ، سسرال شیوخ کاندھلہ، والد محترم مولانا مسیح الزماں فاضل دارالعلوم دیوبند، تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ و علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، دادا مولانا اسمٰعیلؒ پردادا حضرت مولانا محمد حسینؒ۔ پورا شجرۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ اور یہ مکمل شجرہ چار فٹ لمبے کاغذ پر والد صاحب کے پاس محفوظ تھا چونکہ یہ بوسیدہ ہوتا جا رہا تھا اس لیے والد صاحب نے اس کی صاف اور عمدہ نقل کرنے کے لیے میرے حوالے کر دیا تھا۔ دارالعلوم میں تدریسی انہماک و دیگر مصروفیات کے ساتھ میں اس پر توجہ نہ دے سکا اور بدقسمتی سے بار بار مکانات کی تبدیلی اور سامان کی منتقلی کے دوران وہ ٹین کا ٹیوب جس میں یہ شجرہ محفوظ تھا کہیں گم ہوگیا جس کا بڑا قلق و

افسوس ہے اب اس کے چیدہ چیدہ حصے والد صاحب کی مختلف بیاضوں اور یادداشتوں میں درج ہیں۔

قصبہ کیرانہ مغربی یوپی کا آخری قصبہ ہے، اس کی آبادی لگ بھگ پچاس ہزار ہے اور مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد ہے۔ یہاں تاریخی یادگار عمارتیں ابھی تک قائم ہیں جو مغل دور کی ہیں۔ نواب دروازہ اب ایک محلہ کا دروازہ ہے جو یہاں کے نواب صاحب کے زمانہ کا ہے۔ اس سے پہلے یہاں راجہ کرن کا راج تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام کیرانہ ہوا ایک بہت بڑا اور گہرا تالاب ہے جس کی اکثر دیواریں گر چکی ہیں۔ اس تالاب کے بیچ میں ایک چبوترہ ہے جہاں نواب صاحب کشتی میں جا کر تفریح کے لیے بیٹھتے تھے۔ اسی تالاب کے جنوب مغربی کنارہ پر اسی دور کی ایک بڑی عمارت جگہ جگہ سے شق ہونے کے باوجود موجود ہے تزک جہانگیری میں اس تالاب اور مغل دور کے بادشاہ شاہ جہاں کی آمد کا ذکر ہے۔ اس تالاب کے گرد وسیع و عریض باغ تھا، نواب صاحب نے بادشاہ کا استقبال اسی باغ میں کیا تھا۔

یہاں پیاز و سرخ مرچ کی بہت بڑی تجارت ہے اسی طرح ہاتھ کے پنکھوں کی صنعت بھی قریش برادری میں عورتوں کا عام مشغلہ ہے، دور دور تک یہاں کے پنکھے بھیجے جاتے ہیں۔

یہاں شیوخ میں سے بہت سے لوگ پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ شیعوں کی تعداد بھی یہاں بہت تھی لیکن ان کی اکثریت بھی پاکستان منتقل ہو گئی ہے، ان کے دو امام باڑے ہیں ہر سال اب بھی دونوں امام باڑوں سے تعزیوں کا جلوس ماتم کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ دُلدل اور مہدی جلوس بھی نکلتا ہے تب سے اس ماتم و جلوس کا سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔ بہت سے سنی لوگ بھی تعزیوں کا یہ جلوس نکالتے ہیں۔ کیرانہ کے نواحی علاقہ و دیہات میں مسلمان کاشتکاروں کی اکثریت ہے اور دینداری بھی ہے۔ اس دینداری کی وجہ زمانۂ گذشتہ میں دو شخصیتوں کی سالانہ تشریف آوری اور فیضِ روحانی کو بڑا دخل ہے ایک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جن کا قیام ہمیشہ ہمارے مکان پر ہوتا تھا اور ہر سال کم از کم ایک ہفتہ قیام کرتے تھے، دوسرے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحؒ جن کا قیام جناب مولانا احمد اللہ صاحب کے مکان پر ہوتا تھا۔

کیرانہ کا سیاسی ماحول

آزادی سے قبل جب پاکستان کا نعرہ بلند ہوا تو یہاں کی اکثریت اس کی حامی ہو گئی اور مسلم لیگ کا بڑا زور رہا۔ مسلم لیگ کے رضا کار سبز وردی میں ملبوس ہو کر زوردار جلوس نکالتے

اور نعرے لگاتے تھے۔ میرے والدؒ اور مولانا احمد اللہ صاحب سیاسی سطح پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہمنوا اور متحدہ ہندوستان اور کانگریس اور دیگر حریت پسند پارٹیوں کے پرجوش حامی تھے۔ مسلم لیگ کے جلوس کا مقابلہ مجلس احرار اسلام کے سرخ وردی پوش رضا کار کرتے تھے اس میں اکثر جی دار اور بہادر لوگ ہوتے تھے۔ متعدد بار دونوں جلوسوں کا مقابلہ ہوا تو مسلم لیگ کے جلوس کو میدان چھوڑنا پڑا۔ ہمارا مکان ہمیشہ علماء اور زعماء اور عمائدین کا میزبان رہا اور اکثر پارٹیوں کا دفتر بھی والد صاحب کی زیر نگرانی اپنے ہی مکانوں[1] میں رہا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں جب حکومت برطانیہ نے بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کیا تو والد صاحب اور مولانا احمد اللہ صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے اور ایک ماہ جیل کاٹ کر آئے۔ اور پھر آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کے پیر جمانے اور ثابت قدم رکھنے کے لیے زبردست جد وجہد کی اور حتی الامکان ہندو دوستوں کے تعاون سے مسلمانوں کی مختلف طریقوں پر خدمت کی۔

قصبہ کیرانہ میں کوئی رشتہ داری نہ ہو سکی البتہ جھنجھانہ جو میرا ننہال ہے وہاں خاندان کے افراد اب بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور رشتہ داروں کی ایک بڑی تعداد حیدرآباد دکن (حال آندھرا پردیش) میں ابھی تک موجود ہے اکثر افراد عصری تعلیم یافتہ تھے اور ہیں اور متوسط و سرکاری بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

میری والدہ والد صاحب کی حقیقی ماموں زاد بہن تھیں، دادی مرحومہ مولانا عبدالمجید صاحب جھنجھانوی کی صاحبزادی اور مولانا نواب قطب الدین صاحب مصنف "مظاہر حق" کی نواسی تھیں، یعنی ان کی والدہ اور مولانا عبدالمجید صاحب کی اہلیہ نواب صاحب کی صاحبزادی تھیں اور میری دادی نے اپنے نانا یعنی نواب قطب الدین صاحب کے سایۂ عاطفت ہی میں پرورش پائی تھی۔ ان کی شادی ہوئی تو وہ جہیز میں بہت سامان لے کر آئی تھیں ہر زیور سات عدد تھا اور اس زمانہ میں مروج جاگیرداروں اور بڑے گھرانوں میں جن فرش فروش اور گھریلو ساز و سامان کا رواج تھا وہ اعلیٰ ترین قسم کا اور وافر مقدار میں لائی تھیں۔ عرصۂ دراز گذرنے کے بعد اب صرف کچھ

---

[1] متعدد مکانوں میں سے ہمارے دور میں دو بڑے مکان تھے۔ ایک پرانا جدی مکان جو بعد میں فروخت کر دیا گیا تھا اور ایک نیا مکان جس کے دونوں طرف کشادہ صحن تھا۔ اس مکان سے متصل مرحوم چچا سید انصاری صاحب (جو ہمارے رشتے کے چچا تو نہیں تھے لیکن بربنائے تعلق حقیقی چچا کی طرح تھے) کا مکان تھا جو والد صاحب مرحوم ہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ چچا سید انصاری دہلی میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔

نشانیاں باقی ہیں۔ میرے دادا مرحوم مولانا محمد اسماعیل صاحب عالم بھی تھے اور زمیندار بھی، کئی سو پختہ بیگھہ زمین متعدد بڑے بڑے مکانات اور باغ وغیرہ تھے نیز جھنجھانہ میں خاندان کی مشترکہ زمینوں اور باغات میں بھی خاصا حصہ تھا دادا صاحب کی قصبہ میں نمایاں حیثیت تھی وہ وہاں کی جامع مسجد اور ایک دوسری بڑی مسجد کے متولی و منتظم بھی تھے والد صاحب چودہ بہن بھائی تھے۔ میرے چچا مولانا بدیع الزماں صاحب مرحوم بھی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور اس زمانہ کے معاون مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے گھرانے سے بڑے گہرے تعلقات تھے عجیب اتفاق ہے کہ ہماری یاد سے قبل ہمارے سب چچا اور پھوپھیاں انتقال کر چکے تھیں صرف تایا صاحب مولانا محمود الزماں کو ہم نے دیکھا ہے ان کا قیام ہمیشہ حیدرآباد میں رہا اور وہیں ان کا انتقال ہوا اور ایک صاحبزادے ظہیر الزماں فوج کے بڑے عہدے دار تھے ان کا بھی انتقال ہوگیا ان کی اولاد حیدرآباد میں مقیم ہے۔

تائے صاحب کی ایک ہی صاحبزادی تھیں وہ مولانا عبدالحق صاحب مصنف "تفسیر حقانی" کے منجھلے صاحبزادے ابوالخیر صاحب سے منسوب تھیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ کی صاحبزادی کی شادی محترم بھائی شفیع صاحب سے ہوئی وہ میرے رشتہ میں والد صاحب کی طرف سے چچا اور والدہ کی طرف سے ماموں ہوتے ہیں اس طرح حضرت مفتی صاحب سے رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوگیا۔

والد صاحب کی کچھ خصوصیات!!

میرے والد صاحب مرحوم دارالعلوم سے فارغ ہوکر انجمن حمایت الاسلام امرتسر میں مبلغ کی حیثیت سے ملازم ہوگئے تھے لیکن کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ دادا صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کی خبر سنکر امرتسر سے کیرانہ تشریف لائے تو دادی صاحبہ اور احباب و متعلقین نے اصرار کیا کہ اب کیرانہ ہی میں مستقل قیام کرکے دادا صاحب کی جگہ کام کریں اور جائیداد و جامع مسجد کی تولیت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا انتظام و انصرام سنبھالیں چنانچہ ملازمت سے مستعفی ہوکر پورے انہماک کے ساتھ انتظامی اور سیاسی امور میں مشغول ہوگئے اور روز بروز سیاسی انہماک بڑھتا رہا علماء اور زعماء کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ والد صاحب کا مزاج ہماری دادی

صاحبہ پر تھا غصہ بھی بہت تھا اور سختی بھی لیکن اسی کے ساتھ طبیعت میں فراخی اور سخاوت بھی تھی اور خوش مزاجی بھی، غیرت و محبت اور خودداری و شجاعت نمایاں وصف تھا سخت مزاجی اور سخت گیری کے باوجود عفو و درگذر بے مثال تھا۔ اگر افرادِ خانہ یا بیرونی افراد سے ناراض ہوئے تو اس کا اظہار ہر طرح کرتے ترک کلام کر دیتے اور اس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے لیکن اگر اس نے بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے باوجود معافی چاہ لی تو ان کا غیظ و غضب اس طرح زائل ہو جاتا کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہتا اور دل صاف ہو جاتا بہادری اور شجاعت مشہور تھی کبھی کسی انسان یا جن، چور، ڈاکو یا حوادث سے خوفزدہ نہ ہوتے اگر کسی نے طاقت کا مظاہرہ کیا اور ان کے حکم سے سرتابی کی تو اس کی خیر نہ تھی فوراً اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیتے تھے اور ہر مقدمہ پر کافی رقم خرچ کر دیتے تھے اپنی زندگی میں بہت سے مقدمات لڑے مگر کبھی کسی مقدمہ میں ناکامی نہیں ہوئی۔

سچائی اور ایفاءِ عہد

اپنے اور پرائے سب یہ بات جانتے تھے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے حتیٰ کہ عدالت میں کبھی بھی وکیل کا بتایا ہوا بیان نہیں دیا جو اصل واقعہ ہوا اسی کو صحیح صحیح بیان کر دیا خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو جائے اسی حق پرستی اور سچائی کا اثر تھا کہ عدالت میں بگڑا ہوا کیس بھی انہیں کے حق میں ہو جاتا تھا، یہی حال وعدہ کا تھا، اگر کسی سے کسی بھی بات کا وعدہ کر لیا تو اس سے کبھی انحراف نہیں کیا اس کو بہر قیمت پورا کرنا خواہ اس میں کتنا ہی نقصان ہو ان کی خاص صفت تھی۔

نماز کی پابندی

نماز کے اتنے پابند تھے کہ سفر کا پروگرام بھی نمازوں کی ترتیب کا خیال کر کے بناتے سفر میں ہوتے تو موٹر رکوا کر نماز ادا کرتے عدالت میں نماز کا وقت ہو جاتا تو مجسٹریٹ سے صاف کہہ دیتے کہ میں نماز کا پابند ہوں جانا چاہتا ہوں مجسٹریٹ پر ایسا اثر ہوتا کہ فریق مخالف کے اعتراض کے باوجود آزادی کے ساتھ نماز ادا کرنے کی اجازت دیتا اور تا واپسی مقدمہ ملتوی رکھتا نماز باجماعت میں کبھی کوئی بڑی سے بڑی بات یا بیماری حائل نہ ہوتی۔

وقت کی پابندی

اوقات کے بھی بہت پابند تھے جس طرح وقت سے باجماعت نماز کے لیے تیار ہوجاتے تھے اسی طرح ہر کام کا وقت مقرر ہوجاتا تو ایک منٹ کی تاخیر بھی انکو گراں اور ناگوار گذرتی تھی۔

داد و دہش

غریبوں کا بہت خیال کرتے تھے کسی نے اگر بڑی سے بڑی چیز کا سوال کردیا فوراً اسے دیدیتے، گھر میں جیسے ہی کوئی بیمار ہوتا تو اس کی پہلی دوا صدقہ وخیرات تھی، کوئی غریب دعوت کرتا تو قبول کرلیتے اور اس کے گھر جاکر کھا بھی لیتے تھے۔ والدہ صاحبہ گھر سے قطعاً باہر نہ نکلتی تھیں اور نہ ہی کسی کی تقریب میں شریک ہوتی تھیں لیکن غریبوں کے یہاں ان کو بھی تاکیداً بھیجا جاتا تھا۔ امرار اور رؤسار کی دعوتوں میں عام طور پر شرکت نہیں کرتے تھے اکثر مہمانوں کے اعزاز میں مکان پر بھی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں۔

تربیت کے اصول

والد صاحب منتظم مزاج اور منظم زندگی کے عادی تھے۔ اوقات کی پابندی ہر کام میں نظم وسلیقہ اور مستعدی و پھرتی دکھائی دیتی تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے لبا اوقات ملازم اور ایک خادمہ رہتی تھی ورنہ ایک ملازم تو ضرور ہی رہتا تھا اور کچھ دوسرے ایسے افراد بھی تھے جو مختلف چھوٹے بڑے کام انجام دیتے تھے لیکن گھر کا کوئی فرد بدعہدی اور کاہل وسست نہیں تھا خود والد صاحب اندرون خانہ ترتیب سامان اور نظم ونسق میں شریک رہتے تھے۔ والدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے بردباری، رحم وشفقت جیسی اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ مختلف اقسام کے لذیذ کھانے حلوہ جات، اچار ومربے اور سلائی اور کڑھائی جیسے کاموں میں بڑی مہارت عطا فرمائی تھی۔ خادمہ متعلقہ گھریلو کام انجام دیتی تھی لیکن کھانا وغیرہ خود والدہ صاحبہ ہی پکاتی تھیں۔ اس میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔

ہم بھائیوں کو بھی ہمہ وقت چاق وچوبند رہنا پڑتا تھا اور اندرون خانہ اور بیرون خانہ کے سب کام انجام دینے ہوتے تھے سستی اور کام چوری کے والد صاحب سخت

خلاف تھے۔ کبھی ناراض ہو جاتے تو سخت ناراض ہوتے لیکن جیسے ہی ہم معافی چاہتے فوراً پدرانہ شفقت عود کر آتی۔

اکثر اوقات خوش رہتے، ہنستے بولتے لیکن ہر بات میں تہذیب اور ادب ملحوظ رکھنا ہوتا تھا نشست و برخاست میں بھی سلیقہ اور چھوٹے بڑے کا ادب ضروری تھا۔

ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو بے حد پریشان ہوتے اور باہر کی ملاقاتوں اور دیگر مصروفیات کے باوجود کئی کئی بار کافی دیر تک بیمار بچہ کے پاس وقت گذارتے، سر دباتے اور محبت و شفقت کا یہ عالم ہوتا کہ جو چیز زبان سے نکل جاتی۔ اس کی فراہمی اگر کیرانہ میں ممکن نہ ہوتی تو دور دراز سے منگا کر دیتے کسی بات کی تنگی یا کسی جائز خواہش کی پامالی نہ ہوتی۔ موسم کی ہر چیز وافر مقدار میں منگا کر دی جاتی، اس کے علاوہ جس چیز کو دل چاہتا وہ سیر کر دینے والی مقدار میں منگا کر دی جاتی لیکن اس کی سخت تاکید تھی کہ بازار یا بیرون خانہ کوئی چیز قطعاً نہ کھائی جائے اور کسی چیز کی حرص نہ ہونی چاہیئے۔

کپڑا جوتا خاص وضع کا سادہ اعلیٰ سے اعلیٰ منگا کر دیتے۔ اس کا لحاظ رہتا کہ بچوں کو ایسا محسوس نہ ہونے پائے کہ ہمکو فلاں چیز نہیں ملی یا میسر نہیں، ہر قسم کی سہولتیں تھیں لیکن پابندیاں بھی تھیں اور تربیت کا کامیاب و بہتر اصول یہی ہے کہ اگر پابندیاں لگائی جائیں تو ساتھ ہی اس کا بدل بھی ہونا چاہیئے ورنہ بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے، ہم بھائیوں پر یہ پابندی تھی کہ کبھی زبان پر ناشائستہ الفاظ نہ آنے پائیں۔ مکتب میں پڑھنے کے زمانہ میں تاکید تھی کہ وقت پر سیدھے مکتب جانا اور سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا، کسی سے کلام یا ہنسی مذاق نہ کرنا کوئی چیز کسی سے نہ لینا اور اختلاط سے بچنا چونکہ مکتب والد صاحب کے ہی زیر اہتمام تھا اس لیے حافظ صاحب اور پڑھنے والے لڑکے محتاط رہتے تھے۔ والد صاحب کا رعب سبھی پر اتنا تھا کہ کسی کی غلط بات کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ گھر سے باہر حتیٰ کہ گھر کے چبوترہ سے اُتر کر قریب میں بھی کہیں جانا ہوتا وہ بھی بلا اجازت نہیں ہوتا تھا۔ اس پابندی و سختی کا بدل یہ تھا کہ مکان کے عقب میں بہت کشادہ دوسرا صحن تھا جس کے ایک حصہ میں پھول پھلواری اور کچھ درخت لگے ہوئے تھے باقی بڑا حصہ ہمارے کھیلنے کے لیے تھا۔ مکتب میں پڑھنے والے محلہ کے چند مہذب اور کم عمر ایک دو لڑکوں کو ہمارے گھر میں آکر کھیلنے کی اجازت تھی۔ نماز کے وقت ہر کھیل ختم کر دیا جاتا تھا۔

گھر کے کاموں میں ہماری کچھ مخصوص ڈیوٹیاں بھی تھیں جن سے نظم، سلیقہ اور مستعدی کا سبق ملتا رہتا تھا مثلاً گھر کی ضروریات خرید کر لانا اور ان کا حساب باضابطہ لکھ کر والد صاحب کو پیش کرنا۔

اندرون خانہ گرمی میں شام کے وقت سقا آتا اور تمام گھڑے اور مٹکے ٹنکی وغیرہ زنانہ و مردانہ بیٹھک کے بھر کر جاتا اور ہر جگہ پانی کا چھڑکاؤ کرتا۔

میں اور میرے ایک بھائی حافظ حمید الزماں (جو جون ۱۹۹۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور مجھ سے دو سال چھوٹے تھے) ہم دونوں ہی مکتب میں پڑھنے کے زمانہ میں نسبتاً بڑے تھے اس لیے زیادہ ذمہ داریاں اول نمبر پر میری اور دوسرے نمبر پر حمید الزماں مرحوم کی تھیں۔ گرمی کے موسم میں شام کو چارپائیاں صحن میں ترتیب کے ساتھ بعد نماز عصر بچھانا اور ان پر طے کیے ہوئے حسب تعداد افراد بستر رکھنا، چوکی پر کھانے کے لیے فرش بچھانا مغرب سے قبل مختلف زنانہ و مردانہ مکان کے حصوں میں روشن کی جانے والی لالٹینوں کو صاف کر کے ان کی بتیاں ٹھیک کرنا اور تیل ڈالنا۔

صبح نماز فجر کے بعد دو تین ہلکی چارپائیاں صحن میں چھوڑ کر باقی کو مع بستروں کے ان کی جگہوں پر پہونچانا، کوئی بستر چارپائی یا اس پر بستر ٹیڑھا نہیں ہوتا تھا۔ خاص ترتیب کے ساتھ ہی رکھا ہوتا تھا۔ دالان اور کمروں میں چارپائیوں کی جگہ اور رخ متعین تھے اسی کے مطابق روزانہ عمل ہوتا تھا۔ گھر میں صفائی ستھرائی اور پاکی کا اہتمام رہتا تھا۔ کوئی بچہ ہاتھ دھوئے بغیر پینے کے لیے خود پانی نہیں لے سکتا تھا یا کسی بڑے سے مانگتا تھا یا ہاتھ صاف اور پاک کر کے پیتا تھا اور کمال یہ تھا کہ والد صاحب ہمیں جن باتوں سے منع کر دیتے تھے ہم ان کی عدم موجودگی میں بھی ایسے ہی پابند رہتے تھے جیسے ان کے سامنے، کسی کام کو صرف ڈر خوف سے کرنا اور دل میں اس کی قدر نہ ہونا بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ تربیت کا بنیادی اصول یہی ہے کہ ہر کام محض ڈرا کر نہ کرایا جائے بلکہ اس کی اچھائی اور برائی ذہن میں بٹھا کر اس کا عادی بنایا جائے۔ اگر والد صاحب کبھی ایک دو ماہ کے لیے سفر پر چلے گئے تو ہماری یہ مجال وہمت نہیں تھی کہ ہم والد صاحب کی مرضی اور اصولوں کے خلاف کوئی کام کریں۔

الحمد للہ ان کی تربیت اور ذہن سازی سے ہم سب بھائی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور

بقدر استطاعت دوسروں کو بھی فائدہ پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے بچوں کی تربیت میں ہمیں مدد مل رہی ہے اور خدا کے فضل سے سبھی بھائیوں کی اولاد کسی برائی میں مبتلا نہیں۔ تعلیم کے ساتھ چھوٹے بڑے میں حسب مراتب تعلق اور ماں باپ کی کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ کار فرما ہے۔ یہ سب والدین کی تربیت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ نعمت عطا فرمائے۔

والد صاحب کی اولاد (ہم بھائی بہن)

والد صاحب کی پہلی شادی کیرانہ ہی کے ایک گھرانہ میں ہوئی تھی اور دو بچے پیدا ہوئے تھے ایک فرید الزماں اور دوسرا وحید الزماں۔ یہ دونوں بارہ تیرہ سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر دوسری شادی ہماری والدہ سے ہوئی جو والد صاحب کی ماموں زاد بہن اور جھنجھانہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سے ہم آٹھ بھائی پیدا ہوئے۔ دو کا انتقال تو پیدا ہونے کے بعد فوراً ہوگیا۔ ایک کا انتقال بارہ سال کی عمر میں بعارضہ ٹائیفائڈ ہوا اس کے بعد ہم پانچ بھائی تھے۔

وحید الزماں، حمید الزماں، عمید الزماں، معید الزماں، فرید الزماں۔ کچھ عرصہ پہلے مجھ سے چھوٹے بھائی حمید الزماں دیوبند میں قیام پذیر ہونے کے چند ماہ بعد آنتوں کی ایک ہفتہ کی بیماری میں پیٹ کے آپریشن کے بعد ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سانحہ کا ہم سب متعلقین کو گہرا رنج ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

والد صاحب نے ایک تیسری شادی بھی پرسولی گاؤں میں کی تھی۔ ان سے ایک بہن پیدا ہوئیں جو بفضلہ تعالیٰ بقید حیات اور مولانا غیاث الحسن صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "دینی مدارس" کے عقد میں ہیں۔ کوچہ ناہر خان (کوچہ چیلان) میں قیام ہے ہم سب کے خوشگوار تعلقات ہیں۔

گھریلو ماحول

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور والد صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہم اس وقت موجود چار بھائیوں وحید الزماں، عمید الزماں، معید الزماں، فرید الزماں، بہن فریدہ و بہنوئی مولانا غیاث الحسن صاحب میں خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و تعاون

کا جذبہ کارفرما ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ، ادب واحترام ملحوظ رہتا ہے۔ عام طور پر اگر بھائیوں میں اتحاد و اتفاق ہوتا بھی ہے تو عورتوں میں کچھ نہ کچھ ناچاقی ضرور رہتی ہے۔ ہمارے گھرانہ میں اَلْحَمْدُلِلّٰہ یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ چاروں بھاوجوں اور نندوں میں کوئی اختلاف و چپقلش نہیں ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں نیز یہ بھی اللہ کا بڑا انعام ہے کہ معاشی طور پر تھوڑی کمی بیشی کے فرق کے ساتھ آسودگی ہے اور معیار زندگی تقریباً یکساں ہے جو عام طور پر کم دیکھنے میں آتا ہے۔

موجودہ افرادِ خانہ

اس وقت ہم چار بھائی ہیں پہلا نمبر میرا ہے (مجھ سے دو سال چھوٹے بھائی حمیدالزماں دو سال قبل دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے) ان کے بعد عمیدالزماں، ان کے بعد سعیدالزماں ان کے بعد فریدالزماں۔

میری سرگذشت تو انشاءاللہ آپ پڑھیں گے ہی بھائیوں کا مختصر تعارف بھی کرادوں۔

حمیدالزماں مرحوم گھر کے معاشی حالات کمزور ہو جانے کے باعث سلسلۂ تعلیم منقطع کرکے (حفظ قرآن اور کنز الدقائق تک عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد) دہلی آگئے تھے۔ ابتداء میں پریشانی اٹھائی پھر اللہ نے ان کے لیے معاشی سہولتیں پیدا کردیں اور ان کا کاروبار اچھا چلتا رہا۔ دہلی کے ماحول سے گھبرا کر انھوں نے اخیر میں دیوبند کو وطن بنالیا تھا مگر اللہ کو جو منظور رہتا وہ ہوا، وہ ایک سال بھی نہ گذارنے پائے تھے کہ مختصری علالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے بیوہ اور ایک پروردہ بچی (جو چھوٹے بھائی سعیدالزماں کی بچی ہے) جسے انھوں نے گود لے لیا تھا۔ بفضلہ تعالےٰ موجود ہیں اور عمیدالزماں کے مکان پر علیحدہ قیام پذیر ہیں۔ ہم سب کا معاملہ ان کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا بھائی مرحوم کے زمانہ میں تھا وہ بے فکر و مطمئن ہیں۔

عمیدالزماں: یہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے بھی ہیں۔ سعودی سفارتخانہ میں ایک اہم عہدہ (شعبہ ترجمہ وصحافت کے انچارج) پر معقول ترین تنخواہ پر فائز ہیں۔ ذاکر نگر میں اپنے ذاتی وسیع مکان میں رہتے ہیں اور ایک

اسکول "ماڈل اسلامک اسکول" کے نام سے چلاتے ہیں۔ ان کی اہلیہ بی۔ اے پاس اور اسکول کی پرنسپل ہیں۔ یہ اسکول علاقہ میں بہت مقبول ہے۔ اس میں معیاری، عصری تعلیم کے ساتھ دینیات و قرآن پاک کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔

یہ مزاجاً انتہائی خود دار اور باوقار رفتار و گفتار کے عادی ہیں۔ اللہ نے مالی وسعت بھی عطا کی ہے اور ساتھ ہی فراخدلی اور سخاوت بھی میرے ساتھ انتہائی محبت و احترام کا معاملہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی اپنے چھوٹے بھائیوں سے بہت اچھا تعلق رکھتے ہیں شروع ہی سے محنت اور ہمہ وقت مشغول رہنے کے عادی ہیں، سیر و تفریح کا قطعاً مزاج نہیں دفتر سے آنے کے بعد بھی بہت سی علمی اور دفتری مصروفیتیں رہتی ہیں تعلقات کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہے اس لیے روزانہ اہم اور معقول لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی رہتا ہے ان کی دو بچیاں ہیں۔ دونوں زیر تعلیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے۔

معید الزماں: یہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اس کے بعد انھوں نے دہلی جامعہ طبیہ سے بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کی ہے تعلیم کے بعد سے دیوبند میں مقیم ہیں اور "دارالشفا رقاسمی" کے نام سے مطب چلاتے ہیں۔ کم گو، سنجیدہ اور خاموش طبیعت ہیں۔ مریضوں کے ساتھ بہت ہمدردانہ معاملہ کرتے ہیں۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی ہے اور رجوعات بھی بہت ہیں لیکن دوائیں اعلیٰ قسم کی استعمال کرتے ہیں اور کم پیسوں پر دیتے ہیں نیز غریب لوگوں کی مزید رعایت کر دیتے ہیں اور بسا اوقات بلا قیمت بھی دیدیتے ہیں کوئی فیس نہیں لیتے اس بنا پر مریضوں کی تعداد کے لحاظ سے بہت آمدنی ہونی چاہیئے لیکن وہ لحاظ و مروّت اور جذبۂ ہمدردی کی بنا پر اتنی کمائی نہیں کر پاتے جتنی ہونی چاہیئے یوں خدا کے فضل سے باوقار اور اچھی زندگی گذارتے ہیں۔ لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ عرصہ سے طلبۂ دارالعلوم کا رجوع بھی بڑھ گیا ہے۔ گھر کے چند افراد نے ایک چھوٹا سا فنڈ "علاج غرباء" کے نام سے قائم کیا ہے جس کے ذریعہ نادار لوگوں کا حسب گنجائش علاج مفت کیا جاتا ہے۔ ابھی یہ چھوٹا سا فنڈ ہے اس سلسلہ میں کوئی تعاون بھی حاصل نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے ماشاء اللہ سات بچے ہیں۔ تین بچے اور چار بچیاں، دو بچے ابھی چھوٹے ہیں باقی پانچ بچے اور بچیاں زیر تعلیم ہیں۔

فرید الزماں: یہ سب سے چھوٹے بھائی ہیں انھوں نے دیوبند میں فارسی تک

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس لائن کو ترک کرکے جامعہ ملیہ سے بی۔ اے کیا اور پھر مختلف ملازمتیں کیں اب عرصہ سے کویت سفارتخانہ میں ویزا سیکشن کے انچارج ہیں ان کا مزاج سب سے الگ ہے۔ انتہائی خوش مزاج سنجیدہ اور نرم دل، ملنسار گھر میں اور باہر سب کے ساتھ ہمیشہ شگفتگی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ ان کے حسن اخلاق کی بنا پر تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر لائن کے بڑے بڑے لوگوں سے رابطہ رہتا ہے۔ ہر قسم کی معلومات بھی رہتی ہیں۔ اپنی دفتری ڈیوٹی کے بعد جو بہت لمبی ہوتی ہے گھریلو ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دیتے ہیں نیز میرے اور عمید الزماں کے بھی بہت سے سپرد کردہ کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں اور کبھی پیشانی پر بل یا گھبراہٹ کے آثار دیکھنے میں نہیں آتے۔ میرے ساتھ ان کا معاملہ بالکل اولاد جیسا ہے۔ ہمہ وقت ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں تینوں جامعہ اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ذاکر نگر میں علیحدہ مکان میں قیام پذیر ہیں۔ دہلی میں میرا قیام اکثر ان کے یہاں ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی عمید الزماں کے مکان پر قیام کرلیتا ہوں۔

میری شادی کاندھلہ کے خاندان شیوخ میں ہوئی ہے۔ خدا تعالےٰ کے فضل سے اس وقت تین لڑکے اور ایک لڑکی موجود ہیں۔ لڑکا بدرالزماں سب سے بڑا ہے حفظ قرآن کے بعد دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ہے اور ساتھ ہی بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ بعد فراغت آٹھ دس سال سعودی سفارتخانہ میں انگریزی، عربی مترجم کی حیثیت سے ملازمت کی۔ اب پانچ سال سے قطر میں سرکاری ملازم ہیں شادی ہوچکی ہے دو بچے ایک بچی ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کی عمر دراز کرے۔ ان سے چھوٹی لڑکی ہے جس کی شادی دیوبند میں حافظ مولوی محمد رفعت مدرس درجہ قرآن دارالعلوم سے ہوئی ہے۔ ان کے دو لڑکے ہیں جو زیرِ تعلیم ہیں۔ ایک چھوٹی لڑکی پندرہ سال قبل بعارضۂ ذیابیطس ۱۴ سال کی عمر میں انتقال کرگئی۔ اس کے بعد دوسرا لڑکا صدرالزماں ہے جس نے سالِ گذشتہ ۱۴۱۲ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ہے اور اس سال جناب محمد حبیب صاحب صدیقی منیجر مسلم فنڈ دیوبند کی صاحبزادی سے شادی ہوگئی ہے۔ چھوٹا لڑکا قدرالزماں حفظِ قرآن کے بعد اس وقت دارالعلوم میں سالِ پنجم میں عربی کی تعلیم حاصل کررہا ہے اللہ کا فضل و کرم ہے کہ جس طرح بھائیوں اور بھاوجوں میں خوشگوار تعلق چھوٹے بڑے

کا خیال ہے۔ اسی طرح چاروں اولاد فرمانبردار اور نیک چلن ہے اور میں اولاد کی طرف سے ہر طرح مطمئن اور خوش ہوں۔ اولاد کا نیک چلن اور ماں باپ کا فرمانبردار ہونا اور خدمت گذار ہونا بڑی سعادت اور خدا کا بڑا انعام ہے اس پر جتنا بھی خدا کا شکر ادا کروں کم ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

زمانۂ تعلیم و تربیت

ہمارے گھرانے کا طریقہ یہ رہا کہ پہلے بچوں کا حفظ قرآن کرانا اور پھر ضروری دنیوی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم دلانا والد صاحب نے ہم سب بھائیوں کی تعلیم کا یہی طریقہ اختیار کیا۔

حفظ قرآن

جامع مسجد کیرانہ میں قرآن پاک کی تعلیم (زیادہ تر حفظ) کے دو مکتب تھے یہ والد صاحب کے زیر اہتمام چلتے تھے۔ دونوں مکتبوں میں پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد رہتی تھی اور ان کو پڑھانے کے لیے صرف دو حافظ مقرر تھے (۱) حافظ ہدایت اللہ صاحب اور (۲) حافظ رحمت اللہ صاحب دونوں استاد غیر معمولی محنت کرتے تھے اور ہر ایک کو سو طلبا کا روزانہ سبق سننا اور نیا سبق پڑھانا اور بلاناغہ شام کو سب کا آموختہ سننا ضروری ہوتا۔ اخفا اظہار وغیرہ تجوید کے ضروری قواعد کے ساتھ تعلیم ہوتی تھی۔ تعداد پڑھنے والوں کی زیادہ ہوتی تھی اور تنہا سب کا آموختہ سننا ناممکن تھا اس لیے طریقہ یہ تھا کہ ایک لڑکا حافظ صاحب کے سامنے بیٹھ کر سناتا اور تین یا چار جٹیں بنادی جاتی تھیں یعنی تین لڑکوں کا آموختہ حافظ صاحب کے گرد بیٹھ کر تین حافظ طلبہ ہی میں سے سنتے تھے۔ حافظ صاحب کے چوکنا پن اور محنت و توجہ کا یہ عالم تھا کہ وہ بطور خاص ایک لڑکے کا آموختہ خود سنتے اور اور اس کے ساتھ ہر جٹ کی طرف بھی مسلسل کان لگائے رہتے۔ اگر کسی سے مد بھی چھوٹ گیا تو کیا مجال کہ وہ بچ کر نکل جائے فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے، کبھی کبھی پٹائی بھی کی جاتی تھی۔ دونوں حافظ صاحبان روزانہ کم از کم آٹھ گھنٹے پورے انہماک کے ساتھ پڑھاتے

جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر سال حفاظ کی ایک بڑی تعداد تیار ہوتی تھی۔ رمضان مبارک میں قرآن پاک سنانے والوں کی کثرت کے باعث مساجد کی کثرت کے باوجود قلت ہوجاتی تھی۔ ایک ایک مسجد میں بسا اوقات کئی کئی حافظ باری باری سناتے تھے۔

ہمارے دونوں مکتبوں کا طریقہ یہ تھا کہ ماہ رمضان میں دوپہر کی چھٹی نہیں ہوتی تھی صبح سے اگر عصر کے بعد چھٹی ملتی تھی اور بعد نماز مغرب نفلوں میں قرآن پاک سنانے کے لیے حفظ کے تمام طلبہ کو آنا لازمی تھا۔ پرانے حفاظ جو فارغ ہوکر جاچکے ہوتے تھے وہ ماہ رمضان میں مکتب آنا شروع کردیتے تھے۔ تمام جامع مسجد حفاظ سے بھری رہتی تھی اور بعد نماز مغرب عجب قسم کی روحانی برکت چہل پہل اور رونق رہتی تھی قدیم حفاظ زیر تعلیم لڑکوں کا قرآن نفلوں میں سنتے تھے۔ حافظ صاحب ہر ایک کے پیچھے کھڑے ہوکر سنتے اور غلطی پر ٹوکتے تھے اس لیے پڑھنے اور سننے والے سب ہی متنبہ رہتے تھے۔

ان دونوں مکتبوں کے لیے جن میں پڑھنے والوں کی تعداد دو سو سے زائد ہوتی تھی کبھی کوئی عمومی یا بیرونی چندہ نہیں کیا گیا۔ مقامی کچھ لوگ ماہانہ تھوڑا تھوڑا عطیہ دیتے تھے اور مستطیع بچوں سے چار آنہ فیس لی جاتی تھی۔ فیس اور عطیات معینہ کی وصولیابی کا کام بھی دونوں حافظ صاحبان کے سپرد تھا بعد میں جب اخراجات بڑھے تب بھی والد صاحب نے کوئی عمومی چندہ نہیں کیا اس کے بجائے ایک مختصر اور کامیاب اسکیم یہ چلائی کہ فارغ ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی اور ان میں سے بہت سے کیرانہ کے باہر اچھے روزگار پر تھے ان سے مراسلت کرکے مدرسہ کے لیے اعانت کی اپیل کی گئی جس سے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ مقامی فیس و عطیات کے ساتھ ملاکر دونوں مکتبوں کا خرچ پورا ہونے لگا۔

آج عام طور پر یہ حال ہے کہ اگر کسی مدرسہ میں سو ڈیڑھ سو بچے حفظ قرآن و ناظرہ کے زیر تعلیم ہوں تو ان کے لیے کم سے کم چھ معلم درکار ہوں گے اور چندہ کا میدان اتنا وسیع کردیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی حدود کو پار کرکے وہ دیگر ممالک تک پہونچ جاتا ہے، اخلاص کم ہوتا جارہا ہے، مدارس و مکاتب کے نام پر اتنی بڑی رقمیں حاصل کی جاتی ہیں جن سے بڑے بڑے کام انجام دیئے جاسکتے ہیں جو مدارس و مکاتب اخلاص و للٰہیت اور نیک نیتی کے ساتھ تعلیمی جدوجہد کررہے ہیں وہ ضرورت بھر مالی فراہمی پر اکتفا کرلیتے ہیں لیکن جن کے یہاں تعلیم کی کوئی اہمیت یا اس کا کوئی معیار نہیں وہ حصولِ

زر کے لیے زیادہ بے چین اور کوشاں رہتے ہیں۔ جھوٹ اور فریب کاری سے دریغ نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو نیک نیتی اور اخلاص و قناعت کے ساتھ دینی اور تعلیمی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

مکتب میں قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے گھر پر پڑھنا اور یاد کرنا ضروری ہوتا ہے مگر مجھے اور ایسے ہی چھوٹے بھائیوں کو گھر پر مہمانوں کی بکثرت آمد کی بنا پر یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا اس لیے قرآن پاک میں پختگی پیدا نہ ہو سکی۔ زمانۂ حفظِ قرآن میں والد صاحب نے ایک ماسٹر صاحب کو اردو حساب وغیرہ پڑھانے کے لیے مقرر کر دیا تھا جس سے فائدہ ہوا۔ قرآن پاک حفظ کرنے اور دُہرانے کے بعد کیرانہ میں پانچ سال تک تراویح میں قرآن مجید سُنایا اس دوران والد صاحب نے درجہ فارسی و عربی بھی قائم کر دیا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد خالد صاحب دارالعلوم سے فارغ ہو کر پہونچے تو ان کو استاد مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اپنے والد صاحب کی اجازت سے بلا تنخواہ پڑھانا شروع کیا ہم تین ساتھی تھے ایک ساتھ فارسی شروع کی اور گلستاں بوستاں کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہو گئی۔ گلستاں اور بوستاں والے سال ہمارے مدرسہ میں ایک ہندو ماسٹر مولانا محمد خالد صاحب سے ایک عربی کتاب پڑھنے آتے تھے کسی امتحان کے نصاب میں وہ داخل تھی اور اس میں چھوٹے چھوٹے عربی کے جملے تھے ہم جب ان جملوں کا ترجمہ سنتے تو یہ شوق بڑھتا کہ آئندہ ہم عربی کی کوئی ایسی ہی کتاب پڑھیں گے اور ہمیں عربی بولنا آئے گا لیکن جب عربی کا پہلا سال شروع ہوا اور میزان و منشعب اور پھر پنج گنج، علم الصیغہ وغیرہ کتابیں سامنے آئیں تو ساری خوشی کافور ہو گئی اور دماغ پہ عجب قسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا اس لیے کہ ہر کتاب میں مشکل گردانوں اور مشکل ترین تعلیلات وغیرہ کے ذکر کے علاوہ کوئی دلچسپی کی چیز نہ تھی۔ بالخصوص ثقیلہ کی گردان تو بہت ثقیل اور بظاہر بے سود معلوم ہوتی تھی۔ میرے دونوں ساتھی کمزور تھے وہ اکثر گردانوں کا صحیح تلفظ اور پوری ادائیگی بھی نہ کر پاتے تھے اور نہ انھیں گردانیں یاد ہوتی تھیں روزانہ ہی ان دونوں کی پٹائی ہوتی تھی اور کبھی کبھی ان کی غلطیوں پر سب کو ہنسی بھی آجاتی تھی۔ خدا خدا کر کے گردان والی کتابوں کا سلسلہ ختم ہوا اور نور الایضاح، قدوری وغیرہ کا درس شروع ہوا۔ ہمارے استاد محترم مولانا محمد خالد صاحب باوجودیکہ تنخواہ نہیں لیتے تھے لیکن انتہائی پابندی وقت کے ساتھ مدرسہ کے ضابطے کے مطابق دلچسپی

اور محنت سے پڑھاتے تھے چونکہ والد صاحب انتظامی معاملات میں سخت تھے بے ضابطگی گوارا نہ تھی۔ مولانا خالد صاحب سے انھوں نے وضاحت سے فرمایا تھا کہ آپ تنخواہ لیں یا نہ لیں لیکن تعلیم و تدریس باضابطہ ہوگی۔ استاد صاحب نے اس بات کو پورے طور پر نبھایا وہ ایک بڑے کاشتکار عالم کے بیٹے تھے موسم سرما میں کبھی کبھی رات میں کھیت کو پانی دیئے جانے کی ایک ایک ہفتہ تک باری رہتی تو مولانا خالد صاحب کو پوری رات کھیت پر رہنا ہوتا تھا وہ قدوری وغیرہ ساتھ لے جاتے اور کھیت پر مطالعہ کر کے سبق کی تیاری کرتے علی الصباح پہلے گھنٹہ میں آکر درس دیتے پھر کچھ آرام کرتے تھے وہ تادم تحریر بقید حیات ہیں ان کے دو صاحبزادے دار العلوم سے فارغ ہو کر کاشتکاری میں مشغول اور خوشحال ہیں۔

سفر حیدرآباد

کیرانہ میں قدوری وغیرہ کا درس جاری تھا کہ اس دوران میری والدہ کے چچازاد بھائی یعنی میرے ماموں اور والد صاحب کی طرف سے چچا حافظ واحد علی جو دیندار متشرع اور انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ کیرانہ آئے انگریزی زبان پر ان کو بڑی قدرت اور بڑا عبور تھا بڑی روانی کے ساتھ فصیح و بلیغ انگریزی بولتے تھے۔ حیدرآباد میں ان کا قیام تھا اتفاقاً اس محلہ میں جہاں ان کا قیام تھا (محلہ نامپلی نزد ریلوے اسٹیشن) وہاں ایک شامی عالم جو سات زبانیں جانتے تھے اور مختلف ممالک میں رہ چکے تھے وہ مسجد کے ایک کوارٹر میں آکر مقیم ہو گئے اور انھوں نے مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دینا شروع کیا۔ حافظ واحد علی صاحب نے بھی ان سے عربی پڑھ کر تھوڑے ہی دنوں میں عربی بولنا شروع کر دیا جب وہ کیرانہ آئے تو میں مدرسہ میں تھا جیسے ہی مکان پر پہونچا تو انھوں نے سلام کے بعد عربی لہجہ میں کیف حالک یا ولد وغیرہ جملوں سے عربی میں سوال کرنے شروع کیے مجھے بڑی پریشانی کا سامنا ہوا اور فوراً پنج گنج اور علم الصیغہ کی گردانیں ذہن میں گھومنے لگیں مگر ان سے جواب دینے کا کام نہ چلا میں لا اور نعم بھی نہ کہہ سکا۔ بڑی شرمندگی بھی ہوئی ماموں صاحب نے والد صاحب پر زور دیا کہ وہ مجھے حیدرآباد برائے تعلیم لے جانے کی اجازت دیدیں والد صاحب نے اجازت دیدی اور ایک ماہ کے بعد میں ان کے ساتھ حیدرآباد (دکن) کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس زمانہ میں ریل کے سفر میں آج کل جیسی سہولتیں نہ تھیں دہلی سے جو گاڑی مدراس جاتی تھی

اس میں ایک بوگی حیدرآباد کے لیے لگائی جاتی تھی جو قاضی پیٹ اسٹیشن پر کاٹ کر نظام اسٹیٹ ریلوے سے جڑ کر حیدرآباد پہونچتی تھی ہم دہلی سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے۔ بوگی چونکہ ایک ہی تھی اور مسافر زیادہ تھے اس لیے پورے راستہ کھڑکی کے پاس اٹھتے بیٹھتے سفر پورا کیا اور تیسرے دن گیارہ بجے حیدرآباد پہونچے۔

علامہ المامون الدمشقی: ایک معمر بزرگ اور سات زبانوں سے واقف تھے مگر ان کی زندگی ایک معمہ تھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اپنی اولاد اہل خانہ سے الگ ہوکر مختلف ملکوں میں زندگی کیوں گذار رہے ہیں بڑے زیرک قیافہ شناس تھے۔ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتے تھے ان کا قیام مسجد نامپلی کے ایک کوارٹر میں تھا بہت با اخلاق، بہترین ادیب و شاعر، غیر مسلموں میں کامیاب مبلغ اور انتہائی ملنسار و خوش گفتار تھے زندگی نہایت سادہ و درویشانہ، تعلقات کا دائرہ وسیع رکھتے تھے قریب کی ایک مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دیتے تھے میں بھی اس میں شریک رہا درس کا کوئی باضابطہ نظام نہ تھا اور کوئی کتاب مقرر نہ تھی۔ تختۂ سیاہ پر کچھ جملے وغیرہ لکھ کر اس کی مشق کراتے تھے میں روزانہ ناشتہ کے وقت ان کے مکان پر جاتا ان کے ناشتہ کے دوران مختلف سوالات کرتا کبھی کتاب اٹھا کر اس کا کچھ حصہ پڑھتا اور کبھی صرف ان کی باتیں سنتا یہ سلسلہ بھی غیر منظم تھا ان کا ناشتہ بھی عجیب تھا خشک روٹی کو پانی میں بھگو لیا کچھ گڑ اور پنیر اور اسی طرح کی معمولی چیزیں ہوتی تھیں۔ گڑ شوق سے کھاتے تھے اور اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد ان کا معمول تھا کہ وہ دس بجے کے قریب مکان سے نکلتے اور مختلف اداروں اور دفتروں میں جاکر لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ہمیشہ فصیح و بلیغ عربی بولتے اور دوسروں کو حتیٰ کہ بڑے بڑے عربی باشندوں کو لغت فصحیٰ بولنے کی تاکید کرتے لغت عامیہ بولنے والوں کو ٹوکتے اور کہتے کہ لا تفسدوا اللغۃ العربیۃ میں ایک ماہ ان کے ساتھ صبح سے شام تک رہا ہر جگہ پیدل جاتے تھے میں تھک جاتا تھا مگر وہ نہ تھکتے تھے ان کی گفتگو کو غور سے سنتا اور ان کے جملوں کو محل استعمال کے ساتھ ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا کبھی کوئی جملہ بنا کر اس کی تصحیح و تصویب چاہتا۔ کبھی تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے:

"اَنْتَ نَفَقْتَ اَلعَرَب" اور کبھی ہنستے اور کہتے انت لا تعرف العربیۃ۔ حیدرآباد کی نشرگاہ (ریڈیو اسٹیشن) پر کچھ عرصہ کے لیے وہ مترجم و اناؤنسر مقرر ہوئے تو اصل خبریں اردو زبان میں

ہوتی تھیں اور ان کا ترجمہ عربی میں کرنا ہوتا تھا۔ انھیں اردو کے بعض محاورات کو سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی اس لیے مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے ان کی چند روزہ معیت سے بڑا فائدہ ہوا اور عربی زبان دانی کا سراغ مل گیا۔ ابھی چند ہی ماہ کا عرصہ گذرا تھا کہ اعلان آزادی سے قبل ۱۹۴۷ء میں حالات پیچیدہ ہونے لگے علاوہ ازیں علامہ المامون الدمشقی جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مقرر ہوگئے اور ناپلی سے مسافت طویل ہونے کے سبب استفادہ کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ تقسیم ہند کے بعد علامہ مرحوم مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں دو سال مقیم رہے اور بعد میں دہلی منتقل ہوگئے دونوں جگہ ان سے میری ملاقات رہی دہلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ریاست حیدرآباد کے مختصر حالات

حیدرآباد انگریزی دورِ حکومت میں اندرونی طور پر خود مختار ریاست تھی۔ یہاں مرکز سے رابطہ کے لیے انگریز ریزیڈنٹ (بمنزلہ سفیر) رہتا تھا۔ ریاست کے سربراہ میر عثمان علی خاں تھے جن کا نام جمعہ کے خطبہ میں لیا جاتا تھا یہاں کا سکہ اور جھنڈا الگ تھا۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کا بھی اندرونی طور پر مستقل نظام تھا پولس اور مختصر فوج بھی الگ تھی یہاں کی زبان اگرچہ اردو تھی اور اسے سرکاری وعلمی زبان کا درجہ حاصل تھا اور بہت سی اصطلاحات بھی تیار کرکے رائج کی گئی تھیں جن میں سے بہت سی ابھی تک عوام وخواص میں رائج ہیں لیکن بولنے کا انداز اور لب ولہجہ بالکل الگ تھا یہاں کے باشندے خود کو دکنی اور ریاست سے باہر کے لوگوں کو ہندوستانی کہتے تھے یہاں مجموعی طور پر مسلمانوں کا تناسب آبادی ۷ فیصد اور غیر مسلموں کا تناسب ۸۳ فیصد تھا لیکن مسلمانوں کی اکثریت ملازمت پیشہ اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز تھی دیگر مذاہب کے لوگ تجارت وغیرہ کے علاوہ عام چھوٹے درجہ کے پیشے کرتے تھے یہاں ایک پسماندہ ہندو قوم دھیڑ کہلاتی تھی جس کی زبان تلگو تھی اور انہی کی تعداد زیادہ تھی۔ عام طور پر مزدوری یا خانگی خدمت گذاری ان کا پیشہ تھا۔

نظام حکومت میں ہندو کسی نہ کسی حد تک شریک کیے جاتے تھے حتیٰ کہ وزیر اعظم کا عہدہ بھی ایک زمانہ میں ایک ہندو ہی کے پاس تھا مختلف اوقات میں ریاست کے باہر کے قابل

حضرات بھی وزارت عظمٰی کے عہدہ پر رہے جیسے سر مرزا اسماعیل اور نواب چھتاری وغیرہ وہاں کے حکمراں میر عثمان علی خاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور وہ دونوں فرقوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرتے تھے یہاں عوام وخواص ان کو اعلیٰحضرت کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اس وقت کے وسائل کے لحاظ سے ریاست کو علمی اور اقتصادی طور پر کافی ترقی دی، رفاہی اور خیراتی ادارے بڑی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کی مساجد اور ہندوؤں کے معابد کے اخراجات کا تکفل بھی ریاست ہی کی جانب سے ہوتا تھا۔

ائمہ مساجد کے تین درجے تھے (۱) اعلیٰ (۲) اوسط (۳) ادنیٰ اسی لحاظ سے ان کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں۔

اسلامی علوم کی درسگاہ جامعہ نظامیہ مشہور تھی جو اب رو بہ زوال ہے۔ یہاں کا نصاب تعلیم چار مرحلوں پر مشتمل تھا اور چار سندیں بھی دی جاتی تھیں۔

۱۔ مولوی ۲۔ عالم ۳۔ فاضل ۴۔ کامل جو علی الترتیب میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے برابر سمجھے جاتے تھے۔

یہاں اسلامی علوم بالخصوص حدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی اشاعت کا مشہور ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ ہے جس سے تذکرۃ الحفاظ، خصائص کبریٰ جیسی بڑی بڑی کتابیں تحقیق کے بعد شائع کی گئیں۔ ریاست کے خاتمہ کے بعد اب یہ ادارہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے۔

نظام کی جانب سے اندرون و بیرون ریاست حتیٰ کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں مختلف شخصیات و افراد اور اداروں کو مالی امداد دی جاتی تھی دارالعلوم دیوبند سے بھی نظام کا رابطہ تھا اور اس زمانہ میں ان کی جانب سے دارالعلوم کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ امداد دی جاتی تھی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے فرزند اور حضرت مولانا قاری طیب صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ احمد صاحب ایک عرصہ تک عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے جج بھی رہے پھر دارالعلوم میں ضرورت کی بنا پر دیوبند تشریف لائے اور منصب اہتمام پر فائز ہو گئے۔

حیدر آباد میں قیام و تعلیم

میرا سفر حیدر آباد ۱۹۴۶ء میں اس وقت ہوا تھا جب تحریک آزادی زوروں پر تھی اور ہر جگہ "انگریز ہندوستان چھوڑو" کی صدا بلند تھی۔ حیدر آباد کی ریاست بھی متاثر ہونے لگی تھی یہاں اتحاد المسلمین کی تنظیم قائم ہو چکی تھی اور بہت مقبول عام و منظم تھی جس کا مقصد اعلانِ آزادی کے بعد ریاست کو مکمل طور پر آزاد ملک بنانا تھا۔ قاسم رضوی رضا کار تنظیم کے قائد تھے۔

یہاں علماء ہند یا تقسیم مخالف جماعتوں سے متعلق افراد سے بڑی نفرت تھی۔ علماء کو بطور خاص ہدف ملامت بنایا جاتا تھا۔ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد حضرت مولانا سید حسین احمدؒ وغیرہ کو بطور خاص ہندوؤں کا غلام کہتے اور ان کی شان میں گستاخی کو دینی فریضہ سمجھتے تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے وقت ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہند یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے میں آزاد ہیں چنانچہ ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کے اعلانِ آزادی کے فوراً بعد خود مختار ریاستوں نے اپنے اپنے حالات اور جغرافیائی جائے وقوع کے پیش نظر کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کر لیا بعد میں ہندوستان میں ان ریاستوں کو ختم ہی کر دیا گیا تمام ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست حیدر آباد تھی جو ۱۲۴ اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی لیکن جغرافیائی لحاظ سے ہر طرف سے ہندوستان سے گھری ہوئی تھی اس ریاست کی وسعت کے علاوہ بہت ساری دیگر خصوصیات تھیں اس لیے مولانا ابو الکلام آزاد نے اس ریاست کو بچانے کے لیے بڑی حکمت و تدبیر سے کام لیا اور پنڈت جواہر لال وغیرہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ ریاست کا وجود کچھ شرائط کے ساتھ باقی رکھا جائے چنانچہ اس وقت کے ریاست کے وزیر اعظم نواب چھتاری کے ذریعہ نظام سے گفت و شنید کا آغاز ہوا لیکن جوں ہی قاسم رضوی اور دیگر لیڈروں کو علم ہوا جو ریاست کو ہندوستان سے بالکل الگ ایک آزاد ملک بنانے کے لیے کوشاں تھے تو نظام کو ان کے محل میں محصور کر دیا اور کسی سے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا دی اور ایک عارضی حکومت تشکیل دی گئی

جو ریاست کے نظام حکومت پر قابض ہو گئے۔ اتحاد المسلمین کے رضا کاروں کو نواب چھتاری کی دہلی آمد و رفت کا علم ہوا کہ وہ کوئی فارمولہ لے کر نظام سے بات کرنے آئے ہیں تو ان کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کیا گیا جو ناقابل ذکر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا فارمولہ

مولانا آزاد نے حکومت کو آمادہ کر کے جو فارمولہ تیار کیا تھا اور جسے تقریباً حکومت منظور کر چکی تھی حسب ذیل تھا۔

۱۔ ریاست حیدرآباد اندرونی طور پر خود مختار ہوگی۔

۲۔ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات میں مرکز کے تابع ہوگی۔

۳۔ ضرورت کے مطابق پولیس اور دس ہزار مسلح فوج ہوگی۔

۴۔ ریاست کا اپنا نظام، اپنا سکہ اور اپنا جھنڈا ہوگا۔

۵۔ سربراہ ریاست کا حسب سابق لقب ہوگا اور ان کا حسب سابق وزیر اعظم ہوگا۔

نظام تو چونکہ محصور تھے اس لیے عارضی حکومت نے اس فارمولہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عابد روڈ کے چوراہے پر بہت بڑا بورڈ لگا یا گیا جس پر مولانا آزاد کی بڑی تصویر بنی ہوئی تھی اور گلے میں پڑی زنجیر سے ایک گاڑی گھسیٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا جس پر "مسلمانوں کا غدار ہندوؤں کا غلام" لکھا ہوا تھا اس پر یہاں کے لوگ بہت خوش تھے اور یقین کیے ہوئے تھے کہ اگر ہندوستان نے فوج کشی کی تو پاکستان کی فوجیں فوراً مدد کے لیے حیدرآباد آجائیں گی ان بھولے اور سادہ لوح لوگوں کو یہ خبر نہ تھی کہ ابھی پاکستان کا وجود قائم کرنا اور باقی رکھنا سخت اور کٹھن کام ہے۔ ہندوستانی حکومت جب مفاہمت سے ناامید ہو گئی تو "پولیس ایکشن" کے نام سے بھاری تعداد میں ہر چہار جانب سے حملہ کر دیا یہ فوجیں دوسری عالمی جنگ میں انگریزوں کے دور اقتدار میں نازک اور اہم محاذوں پر لڑی ہوئی اور تجربہ کار تھیں اور ان کے مقابل حیدرآباد کی مختصر فوج غیر آزمودہ کار اور ناتجربہ کار تھی ادھر رضا کار اپنے جوش و خروش کے باوجود انتہائی ناقص ہتھیاروں سے مسلح یا بھر نہتے تھے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ رضا کاروں میں بہت

سے افراد مخلص وجاں نثار اور جذبۂ جہاد رکھتے تھے اور انھوں نے اس حد تک قربانی دی تھی کہ ان کے ہتھیاروں نے کام نہ کیا تو وہ جوش میں ہندوستانی ٹینکوں سے چمٹ کر اپنی جانیں قربان کر بیٹھے اور اگر ان کے پاس کسی بھی درجہ میں کام کے ہتھیار ہوتے تو وہ مقابلہ میں وقتی طور پر ہی سہی کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کرتے رضاکاروں کی ایک قسم وہ بھی تھی جن کا کام صرف لوٹ مار اور ڈاکہ زنی تھا جب سی پی اور برار کے علاقہ سے مسلمان بھاگ کر حیدرآباد آرہے تھے اور ان کے کیمپ لگائے جارہے تھے اسی طرح ہندو حیدرآباد سے فرار ہورہے تھے اس وقت میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رضاکاروں کے غلط عناصر نے بڑی لوٹ مار کی اور ہندو عورتوں کے گلے تک سے زیور نکلوالیے اگرچہ اس حرکت سے روکنے والے مسلمان بھی موجود تھے مگر ان کی کوئی ماننے والا نہ تھا۔

ہندوستانی فوجیں تمام اضلاع پر قبضہ کرتی ہوئی اور مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے انسانیت سوز مظالم ڈھاتی ہوئی دارالحکومت حیدرآباد سے چالیس کلومیٹر دور رہ گئیں تو عارضی حکومت کے ارکان اور قاسم رضوی صاحب وغیرہ جہازوں کے ذریعہ حیدرآباد یوں کو خود مختار حکومت دلائے بغیر فوجوں کی یلغار اور ظلم و تشدد کی آگ میں جھونک کر راہِ فرار اختیار کر گئے اس وقت نظام دکن کی محصوریت ختم ہوئی اور انہوں نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے نشرگاہ حیدرآباد سے اپنی شکست تسلیم کرنے اور ہتھیار ڈالنے کا اعلان کردیا جس سے ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی پندرہ سو کلومیٹر دور رک گئی اور اس طرح ریاست ایک مفتوحہ علاقہ ہوکر اپنا وجود کھو بیٹھی۔

نیا عارضی نظام حکومت

ریاست فتح کرلینے کے بعد جنرل چودھری کو یہاں کا گورنر جنرل بنادیا گیا اس نے انتظامی امور کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پہلا اعلان یہ کیا کہ تمام آتشیں ہتھیار اپنے اپنے قریبی پولیس اسٹیشنوں میں جمع کرادیئے جائیں لوگوں نے گھبراہٹ میں چھری اور چاقو تک احتیاطاً کنوؤں میں ڈال دیئے چند روز قبل جہاں مکمل آزادی کا نعرہ لگایا جارہا تھا اب وہاں ہر جانب سراسیمگی اور گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں خدا یاد آتا ہے وہ لوگ

جو کبھی نماز نہیں پڑھتے تھے مساجد کا رخ کرنے لگے اور مساجد آباد ہوگئیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے سابقہ ریاست کا حال اور نظام دکن کا دبدبہ بھی دیکھا اور پھر یہ اندوہناک منظر بھی دیکھا جو کسی مفتوحہ علاقے کا ہوتا ہے ایسی صورت حال میں وطن زیادہ یاد آنے لگا اور جلد سے جلد وطن پہونچنے کی خواہش بڑھنے لگی مگر راستے پرخطر اور انتہائی مخدوش تھے اب یہاں منظم یا غیر منظم کسی تعلیم کا بھی میرے لیے کوئی بندوبست نہ تھا ادھر وطن کے حالات کی تفصیل بھی معلوم نہ ہوتی تھی میں روزانہ آصفیہ لائبریری جاتا اور وہاں "مدینہ" اخبار جو بجنور سے نکلتا تھا اس کا متلاشی رہتا اس سے اپنے وطن کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔

انقلاب کے کچھ عرصہ بعد جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام بمبئی میں ہوا جس کی روداد اور تجاویز پڑھ کر بڑی ڈھارس بندھی نیز گھر سے معلوم ہوا کہ والد صاحب کو کیرانہ کا اعزازی مجسٹریٹ بنادیا گیا ہے اور وہ پورے ضلع مظفر نگر کے دورے کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کے قدم جو اکھڑ چکے تھے جمانے کی کوشش کی جائے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح بھی تمام مغربی اضلاع کے دوروں میں مشغول تھے والد صاحب نے بھی مظفر نگر کے مختلف علاقوں میں عام جلسوں میں حضرت مدنی رح کو دعوت دے کر تقریریں کرائیں جن کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ادھر والد صاحب نے غیر مسلم دوستوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے دہلی اور دیگر علاقوں میں شب و روز طوفانی دورے کیے اور مسلمانوں کی بازآبادکاری کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ کے مشوروں اور تعاون سے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

آغازِ سفر

- طالب علمی
- عملی زندگی کا ابتدائی دور

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا

۱۳۷۰ھ شوال کا مہینہ تھا جب صبح صادق کے وقت میں اپنے رفیق سفر مولوی حبیب الرحمن صاحب (دو گھرا ضلع دربھنگہ) کے ہمراہ دیوبند کے اسٹیشن پر اترا اور اپنے دوست مولانا ابوطاؤس ریحان الحق کشٹیاوی (حال بنگلہ دیش سابق مشرقی پاکستان) کو دیکھا اور ان کے ساتھ باب الظاہر کے راستہ دارالعلوم میں داخل ہوا۔ دارالعلوم کے داخلہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد داخلہ لیا۔ ظہر کے بعد ہدایہ کا درس مولانا سید اختر حسین صاحب کے پاس ہوتا، وہاں ایک طالب علم پر نظر پڑی چھریرا بدن، رنگ صاف، آنکھوں میں ذہانت اور ظرافت رقصاں لیکن درس میں بالکل خاموش، چند دنوں کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ ہوا حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تشریف فرما۔ نتائج امتحان کا اعلان فرماتے اور طلبہ کو انعام تقسیم کیے جاتے۔ اس دور کا قاعدہ تھا کہ جو طالب علم کم از کم ۵ پرچوں میں پچاس نمبر لاتا اور کسی پرچہ میں ۴۰ نمبر سے کم نہیں ہوتا اُسے خصوصی انعام دیا جاتا ۱۳۶۹ھ کے نتائج امتحان سناتے ہوئے حضرت مدنی نے نام پکارا ''وحید الزماں کیرانوی'' اور جب نتائج کا اعلان فرمایا تو سارے مجمع نے واہ واہ اور شاباش شاباش کہا۔ انتہائی ممتاز طالب علم کی حیثیت سے وحید الزماں کیرانوی نامی اس طالب علم کو میں نے پہلی بار پہچانا اور یہی بات یہ ہے کہ پہلی اور آخری بار جس طالب علم پر مجھے رشک آیا وہ یہی وحید الزماں کیرانوی تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں مہینوں یہی دعا کرتا رہا کہ اے اللہ مجھے بھی ایسی ہی کامیابی عطا فرما۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجھے مولانا مرحوم کے ممتاز نتائج نے محنت اور یکسوئی کے ساتھ درس و مطالعہ کی راہ پر ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ و رکن مجلس عاملہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

بہرحال پھر ان سے محبت و رفاقت اور انس اور مودت کا جو رشتہ قائم ہوا وہ آخری لمحاتِ حیات تک قائم رہا اور اگر موت رشتوں کو نہیں توڑتی تو آج بھی وہ تعلق قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گا (انشاء اللہ)

مولانا مرحوم میری قیام گاہ (کمرہ نمبر ۷، دار جدید) کے سامنے اوپر برج میں رہا کرتے تھے، ان کے ساتھ رہتے تھے بدر مرادآبادی (یعنی مولانا، ڈاکٹر، پروفیسر بدرالدین مرادآبادی استاذ جامعہ اسکول، پھر جامعہ کالج اور اس کے بعد ہندو یونیورسٹی بنارس کے پروفیسر اور اب ریٹائر ہوکر ٹبلہ ہاؤس نئی دہلی میں مقیم)۔ عام دنوں میں ہم سب اپنے درسی مشاغل میں رہتے لیکن جمعہ کی رات کو اکثر جشن و تفریح کی محفل اسی برج میں منعقد ہوتی اور مولانا مرحوم کی ذہانت و ظرافت کے نمونے مجلس کے شرکاء ہفتہ بھر کی ذہنی تھکان دور کرنے کا ذریعہ بنتے۔ اور جب عیدالاضحیٰ کی تعطیل ہوتی تو خود ساختہ کباب کے ساتھ مولانا مرحوم کی معیاری چائے ہم سب کے لیے لذت کام و دہن کا سامان فراہم کرتی۔ طالب علمی کی ان یادوں کے جلو میں نہ جانے کتنی تصویریں نظروں میں گھومنے لگتی ہیں۔ ٹرین میں بہت رش ہے، بیٹھنے کی جگہ نہیں، لیکن مولانا وحیدالزماں صاحب ساتھ ہوں تو کوئی مشکل نہیں۔ خدا جانے وہ کونسی انگریزی بولتے کہ لوگ اس سے مرعوب و متاثر ہوکر خود ہی جگہ دیدیتے۔

مولانا اپنی تمام تر علمی وسعتوں اور مصروفیتوں کے باوجود خشک طبیعت کے مالک نہ تھے بلکہ وہ انتہائی ظریف اور خوش مزاج انسان تھے، محفلوں میں ہنسا ہنسانا اور لوٹ پوٹ ہونا ان کا خاص مزاج تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں مولانا نے مولانا روح اللہ صاحب کو عربی لباس پہنایا اور ان کے ساتھ عربی بولتے ہوئے اور اجنبی عرب مہمانوں کی طرح ان کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک طالب علم کے کمرے میں اس طرح داخل ہوئے کہ اس طالب علم نے مولانا روح اللہ صاحب کو کوئی معزز عرب مہمان سمجھا لیکن میں دیکھ کر سمجھ گیا اور کہا ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشش
من انداز قدت را می شناسم

مولانا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے کچھ کہنے سے باز رکھا یہاں تک کہ مذکورہ طالب علم نے ان کی ضیافت پر سوڈیڑھ سو روپے خرچ کر ڈالے۔ ضیافت کے

بعد جب راز کھلا تو محفل میں ایک زوردار قہقہہ لگا اور یہ واقعہ کئی دن تک دوستوں کی مجلسوں میں سامانِ فرحت و انبساط بنا رہا۔

مولانا اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور حصولِ علم کے لیے اپنی جدوجہد کے اعتبار سے بھی ایک نمونہ ایک مثال اور ممتاز رہنما تھے جب دارالعلوم سے فارغ ہوئے تو کچھ عرصے بعد انھوں نے دیوبند واپس آکر "دارالفکر" کے ذریعے دیوبند میں عربی زبان کی تعلیم و اشاعت کا کام شروع کیا مجھے یاد ہے کہ رکن شوریٰ مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے مجلس شوریٰ پر دباؤ ڈالا کہ اگر ایسے ممتاز، فاضل اور ہونہار طالب علم کو بھی دارالعلوم میں تدریس کا موقع نہیں دیا جائے گا تو دارالعلوم کی ترقی اور کامیابی کے مواقع محدود ہو جائیں گے چنانچہ اسی مجلس میں مولانا کا تقرر عمل میں آیا۔ تقرر کے بعد دارالعلوم میں ان کو جو میدانِ کار ملا وہ نہایت وسیع تھا۔ مولانا نے اپنے دور میں دارالعلوم کے اندر تعلیم و تربیت، انتظام و اہتمام اور تعمیرات کے میدانوں میں جو کارنامے انجام دیئے انھیں دارالعلوم کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکے گی۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے طلبہ کی رہنمائی اور ان کی تربیت میں نہ صرف بے مثال کردار ادا کیا بلکہ تعلیم و تربیت کی ایک نئی طرح ڈالی، ان کے ہزاروں شاگرد شائستگی اور سلیقہ مندی کا نمونہ بن کر ہماری اُمت کے نونہالوں کو بنانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں شاید پہلی شخصیت تھی جس نے "رِجال سازی" اور "فرد سازی" کا ایسا کارنامہ انجام دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

عربی زبان و ادب مولانا کا خاص میدان تھا، اس میدان میں تعلیم و تربیت کے ان کے انوکھے انداز اور ان کی ممتاز صلاحیتوں سے استفادہ کر کے ان کے شاگرد ملک و بیرونِ ملک میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اہم خدمات انجام دے رہے ہیں مولانا کے شاگردوں کو بھی آن سے جو والہانہ تعلق اور عاشقانہ محبت ہے اس کی بھی اس دور میں مثال نہیں ملتی۔

مولانا کو جو صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں یقیناً وہ "وہبی" تھیں، اس قحط الرجال کے دور میں ایسی شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں لیکن جب پیدا ہوتی ہیں تو ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں جن سے نسلیں رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

مولانا نے دارالعلوم کے انقلاب کے دور میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ انقلاب میں رونما ہونے والے واقعات سے اتفاق یا اختلاف کیا جا سکتا ہے "لِکُلِّ جوادٍ کبوۃ" لیکن ان کے خلوص اور نیت پر کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ یہ ہماری اور ہماری امت کی بدنصیبی تھی کہ مولانا کی زندگی کے آخری برسوں میں دارالعلوم کے اندر "رجال سازی" اور "فرد سازی" کا کام جاری نہ رہ سکا اور انھیں حالات سے مجبور ہو کر دارالعلوم سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی اس کنارہ کشی کے بعد بھی اگرچہ انہوں نے افراد سازی کا وسیع اور طویل منصوبہ ترتیب دیا مگر حالات و واقعات اور زندگی نے انہیں اس کی تکمیل کی اجازت نہ دی۔

ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ مولانا کے ہم عصروں، شاگردوں اور مستفیدین کو چاہیئے کہ ان کے تعلیم و تربیت کے اصول اور اسلوب کو مشعلِ راہ بنا کر ان کے مشن کو فروغ دیں۔

مولانا کا وصال کوئی شخصی سانحہ نہیں بلکہ یہ دارالعلوم، ابنائے دارالعلوم اور پوری ملت کا عظیم نقصان ہے میں اسے اپنا ذاتی اور خاندانی حادثہ سمجھتا ہوں ؎

وَمَا کَانَ قَیْسُ هُلْکُهٗ هُلْکُ وَاحِدٍ
وَلٰکِنَّهٗ بُنْیَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

بقیہ : مولانا وحید الزماں کیرانوی کی یاد میں

اس زمانے میں میری عربی خدمات کے لئے دارالعلوم کی طرف سے مجھے ایک مخصوص وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس طرح گویا زمین پہلے سے تیار تھی۔ چنانچہ بعد کو جب میں یہاں آیا تو سابقہ اعتماد کی بنا پر ادب عربی کا شعبہ دارالعلوم نے کلی طور پر میرے حوالے کر دیا۔"

(الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۷ر جون ۱۹۶۸ء)

مولانا وحیدالدین خاں

مولانا وحیدالزماںؒ کیرانوی کی یاد میں

مولانا وحیدالزماں کیرانوی ۱۵ر اپریل ۱۹۹۵ء کو انتقال کر گئے۔ بوقت وفات ان کی عمر تقریباً ۶۵ سال تھی۔ مولانا مرحوم سے مجھے خصوصی ربط تھا۔ جب میں الجمعیۃ ویکلی کا ایڈیٹر تھا، میں نے ان کے بارے میں ایک سے زیادہ مضامین الجمعیۃ میں شائع کئے تھے۔ انہی میں سے ایک مضمون وہ تھا جو الجمعیۃ ویکلی کے شمارہ ۷ر جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔

اس وقت مولانا موصوف ہمارے درمیان موجود تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اس مضمون میں مولانا مرحوم کی زندگی کے ایک سبق آموز پہلو کا مختصر تعارف پیش کیا گیا تھا۔ ذیل میں اس مضمون کو کسی تبدیلی کے بغیر اس کی سابقہ صورت میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

جولائی ۱۹۶۷ء کی ایک شام تھی۔ نئی دہلی کی ایک مجلس میں کچھ علماء جمع تھے اور عرب ممالک کے حالات پر بات ہو رہی تھی۔ اس مجلس کا خاتمہ ایک شخص کی گفتگو پر ہوا۔ گفتگو کے آخر میں تمام حاضرین نے محسوس کیا کہ موصوف کو اس موضوع سے خصوصی تعلق ہے۔ ان کی شخصیت، ان کا انداز اور ان کا لب و لہجہ ہر چیز میں ایک دلآویز قسم کی عربی شان نظر آتی تھی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک ہندوستانی عرب سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو نسلاً ہندوستانی مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے عربوں جیسا ہو۔

یہ مولانا وحیدالزماں کیرانوی تھے جن کی عمر تیس چالیس کے درمیان ہوگی۔ آپ دارالعلوم دیوبند میں ادب عربی کے استاذ ہیں۔ اور اسی کے ساتھ دارالعلوم سے نکلنے والے سہ ماہی عربی رسالہ دعوۃ الحق کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ آپ نے نئی عربی اصطلاحات اور قدیم الفاظ کے نئے معانی سے متعلق دو ڈکشنریاں تیار کی ہیں۔ ایک اردو عربی

• صدر، اسلامی مرکز، نئی دہلی

ڈکشنری جو ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور دوسری عربی۔ اردو ڈکشنری جو ساڑھے چھ سو صفحات پر چھپی ہے اس کے علاوہ اردو اور عربی میں وہ اور بھی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ نئی دہلی کی مجلس کے بعد مجھے خصوصی اشتیاق ہو گیا کہ مولانا سے تفصیلی ملاقات کروں

"میں آپ سے ملنے کے لئے دیوبند آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ضرور آیئے، مجھے آپ کو وہاں پاکر بے حد خوشی ہوگی۔" مولانا کا جواب تھا۔

حسن اتفاق سے یہ موقع بہت جلد آگیا۔ جولائی ۱۹۶۸ء کی پندرہ تاریخ تھی۔ ایک طالب علم کی رہنمائی سے مجھے دارالعلوم دیوبند کے دارجدید کے اوپر کے ایک کمرہ کے سامنے پہنچایا گیا۔ کمرہ کی دیوار پر دعوۃ الحق کا خوبصورت بورڈ اس بات کی علامت تھی کہ میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

اب میں مولانا وحید الزماں کیرانوی کے کمرہ میں تھا جو رسالہ کا دفتر بھی ہے اور ان کی ذاتی رہائش گاہ بھی۔ وسیع کمرہ میں دفتر اور رہائش کے دوگونہ تقاضوں کو نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کیا گیا تھا۔ کمرہ کا فرش، الماریاں، کتابوں اور اخبارات و رسائل کے ذخیرے، دفتری ضروریات، رہائشی ضروریات کے سامان ہر چیز اس طرح رکھی گئی تھی جیسے انھیں کسی اور صورت میں ترتیب نہ دیا جا سکتا ہو۔ اس کے ساتھ اس کمرہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اندر حیرت انگیز طور پر عربی تہذیب سموئی ہوئی تھی جس طرح کسی شدید موسم میں سڑک سے گذر کر ایرکنڈیشنڈ مکان میں داخل ہونے سے یکایک ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کمرہ میں داخل ہو کر مجھے محسوس ہوا جیسے میں ہندوستانی جغرافیہ میں چلتے چلتے اچانک عرب دنیا کے اندر داخل ہو گیا ہوں۔ اس کمرہ کے پورے ماحول میں ایک قسم کی عربیت چھائی ہوئی تھی۔ جو غیر شعوری طور پر اپنا احساس دلاتی تھی۔

سرسری جائزہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ضروری سامان کو الگ کر لیا جائے تو اس کے بعد اس کمرہ میں جو کچھ بچے گا وہ عربی لٹریچر، عربی کتابیں، عربی رسائل اور عربی اخبارات ہوں گے۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ یہ کمرہ درحقیقت دارالعلوم کی اس وسیع دنیا میں عربی ادب اور عربی تقریر و تحریر کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

"مولانا" میں نے کہا "سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتایئے کہ دیوبند کے ماحول میں آپ نے جدید عربی اور عربی زبان میں لکھنے بولنے کی صلاحیت کس طرح پیدا کی؟"

"آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا" مولانا کیرانوی نے لطیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ حاصل کیا ہے بغیر کسی استاد کے حاصل کیا ہے۔"

"تب تو میں اور بھی زیادہ جاننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ان لوگوں کے حالات سے خصوصی دلچسپی ہوتی ہے جنھوں نے اپنے ذاتی عزم اور ذاتی جدوجہد سے اپنی زندگی بنائی ہو۔ ایسے لوگوں کے حالات میں بڑا سبق ہوتا ہے"

"اچھا تو سنئے" مولانا کیرانوی نے کہنا شروع کیا "میں اپنے وطن کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں جب ابتدائی عربی کا طالب علم تھا، میرے ایک عزیز حیدرآباد سے آئے۔ انھوں نے مجھ سے عربی بولنا شروع کی۔ مگر مجھے یہ محسوس کرکے بے حد دھکا لگا کہ عربی کا طالب علم ہونے کے باوجود میں عربی میں ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میرے یہ عزیز خود بھی کچھ زیادہ عربی پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ حیدرآباد میں انھیں ایک عرب سے استفادہ کا موقع مل گیا تھا اس بنا پر وہ عربی بولنے لگے۔ میرے بڑھے ہوئے اشتیاق کو دیکھ کر انھوں نے والد صاحب سے اجازت لے لی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ حیدرآباد لے جائیں گے"

"یہ کتنے پہلے کی بات ہوگی" میں نے کہا۔

"یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ اس وقت حیدرآباد میں ایک عرب علامہ محمد المامون ارزنجانی تھے۔ نام پلی کی مسجد میں روزانہ ایک گھنٹہ ان کا عربی میں درس ہوتا تھا۔ یہ چھ زبانوں کے عالم تھے۔ ترکی، عربی، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی اور اردو۔ ہر ایک زبان میں بے تکلف بولنے کی قدرت رکھتے تھے۔ میں نے ان کے درس میں شرکت شروع کی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ زیادہ استفادہ کے لئے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ حیدرآباد کی نشر گاہ میں عربی کے اناؤنسر تھے۔ اور روزانہ وہاں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ کیا کہ اس سفر میں ان کے ساتھ جاتا اور ساتھ واپس آتا۔ اس آنے جانے میں جو وقت ملتا اس میں ان سے میری گفتگو عربی میں ہوتی۔ میرے جملوں میں جو غلطیاں ہوتیں ان کی وہ تصحیح کردیا کرتے۔ نشر گاہ میں خبروں کا بلیٹن اردو میں آتا تھا اور ان کا ترجمہ کرکے عربی میں سنانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہاں یہ صورت رہتی تھی کہ میں اردو الفاظ پڑھ کر سناتا اور علامہ المامون اس کا ترجمہ کرتے چلتے تھے۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اردو کے بالمقابل عربی جملے فوراً سامنے آتے چلے جاتے تھے۔ اور اردو مفہوم کی عربی تعبیر سمجھنے میں مدد ملتی تھی"

"اس کے علاوہ باضابطہ طور پر ان سے عربی سیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی" میں نے پوچھا۔

"نہیں" مولانا کیرانوی نے دوبارہ کہنا شروع کیا "مگر میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی، فوراً کسی نہ کسی شکل میں استفادہ شروع کردیتا۔ چائے پینے یا کھانا کھانے کے دوران میں ساتھ ہوتا تو اس وقت بھی میں ایسا کرتا کہ ذہن میں جو خیال آتا اس کا عربی جملہ بناتا۔ علامہ المامون اس کی تصحیح کرتے، پھر میں ان کے جملہ کو پوری طرح ذہن میں بٹھاتا اور دونوں کے فرق کو سمجھتا۔ بدقسمتی سے یہ سلسلہ صرف چند مہینے جاری رہ سکا۔ اس کے بعد علامہ المامون جامعہ عثمانیہ چلے گئے۔ تاہم اس تجربہ سے مجھے ایک خاص فائدہ ہوا۔ حیدرآباد کے سفر سے پہلے عربی زبان میرے لئے بس اس طرح کی ایک چیز تھی جس کو میں نے نحو میر جیسی کتابوں میں پایا تھا۔ یعنی فَعَلَ فَعَلُوا کی

گردان وغیرہ۔

اب معلوم ہوا کہ عربی ایک زندہ زبان ہے جو اردو کی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے، طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں یہ میرے لئے گویا ایک دریافت تھی جس نے میرے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی۔"

"علامہ المامون سے چھوٹنے کے بعد آپ نے کیا صورت اختیار کی" میں نے مزید سوال کیا۔

"اس کے بعد میں کتب خانہ آصفیہ جانے لگا۔ وہاں روزانہ ۵ - ۶ گھنٹے مطالعہ کرتا۔ مطالعہ میں عربی اخبارات و رسائل خصوصیت سے دیکھتا تھا۔ اس طرح عربی کی شدبد ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں میں نے دارالعلوم دیوبند آکر داخلہ لیا۔ داخلہ کے وقت عربی تو کچھ بول لیتا تھا مگر عربی رسائل وغیرہ پڑھنے کی استعداد ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

"دارالعلوم میں آپ کے عربیت کے ذوق کے لئے کیا مواقع ملے" میں نے پوچھا۔

"جہاں تک دارالعلوم کا تعلق ہے، اس وقت یہاں اس سلسلے میں کچھ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ عربی انشا بھی نہیں تھی۔ مجھے بالکلیہ طور پر خود سے محنت کرنی پڑی، اور اس معاملہ میں اپنے شوق اور لگن کے سوا کوئی چیز میری رہنما نہ تھی۔"

"پھر آپ نے کیا صورت اختیار کی۔"

"میں نے عربی اخبارات و رسائل حاصل کر کے پڑھنے شروع کئے مگر استعداد کا عالم یہ تھا کہ ماہنامہ العرب کے ایک ایک صفحہ کو دس دس بار پڑھتا تھا پھر بھی پوری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میرے پڑھنے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ میں کسی مضمون کو اس اعتبار سے نہیں پڑھتا تھا کہ اس میں جو بات ہے وہ کیا ہے بلکہ صرف اس اعتبار سے دیکھتا تھا کہ کسی مفہوم کو عربی میں کس طرح ادا کیا گیا ہے۔ میں ایک جملہ کو لیتا اور پھر اس کی اردو تعبیر کو سامنے رکھ کر غور کرتا کہ ایک بات عربی میں کس طرح تعبیر کیا جاتا ہے اور اردو میں کس طرح۔"

"اس طریق مطالعہ کو مثال سے واضح فرمایئے" میں نے کہا۔

"فرض کیجئے، ایک جملہ ہے۔ ساشکوك الى ابيك بانك تغيب عن الدروس كثيرا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم عربی عبارت کا اجمالی مفہوم سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے وہ عربی اور اردو تعبیر کے فرق کو نہیں سمجھ پاتا۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا جملہ سمجھنے میں ایک طالب علم کو دقت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ اس کی عربی بناؤ کہ "میں تمہارے والد سے شکایت کروں گا" تو عین ممکن ہے کہ وہ کہہ دے۔۔۔ "ساشکوك من والدك ...." میرا طریقہ تھا کہ جب اس طرح کا جملہ آیا تو میں نے خصوصیت سے نوٹ کیا کہ ایسے موقع پر عربی میں شکایت کے ساتھ الیٰ کا صلہ آئے گا۔ اس طرح مطالعہ میں میرا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اکثر ایسا ہوتا کہ میں پورا مضمون پڑھ ڈالتا بلکہ کئی کئی بار پڑھتا۔ اس کے باوجود اس سے لاعلم رہتا کہ پورے مضمون میں بات کیا کہی گئی ہے۔ کیونکہ میرا ذہن عام طور پر اخذ تعبیرات پر مرکوز رہتا تھا۔"

نوٹ: افادات ملت الرحمن کرالوی نمبر

"گویا آپ نے عربی میں اظہار خیال کی مشق کسی استاد کے بغیر محض ذاتی طور پر کی"۔
"بالکل ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کیلئے مجھے بے پناہ محنت کرنی پڑی"۔
"گستاخی معاف ۔ یہ بتایئے کہ عربی میں جب آپ لکھتے یا بولتے ہیں تو اس کی شکل کیا ہوتی ہے ۔ یعنی ذہنی خیالات کی آمد اردو میں ہوتی ہے اور آپ اس کو عربی میں منتقل کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یا خود خیالات ہی عربی میں آتے ہیں"۔
"خیالات خود عربی میں آتے چلے جاتے ہیں ۔ خدا کے فضل سے مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی"۔
"آپ کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اردو زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے یا عربی"۔
"اردو تو بہر حال مادری زبان ہے مگر کثرتِ تعلق کی وجہ سے اب ایسا ہو گیا ہے کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی خیال کو عربی میں ادا کرنا میرے لئے اردو سے زیادہ آسان ہے"۔
"اچھا اخذ تعبیر والی بات جو ابھی آپ نے فرمائی تھی، اس کو عربی میں کہئے"۔
میرا یہ جملہ سن کر مولانا کیرانوی اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور اسی آن بغیر کسی توقف کے عربی میں بولنے لگے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایئر فون میں اردو کو بند کر کے عربی کا بٹن دبا دیا گیا ہو اور فوراً وہی بات عربی میں سنائی دینے لگے جس کو کان اب تک اردو میں سن رہے تھے ۔
"اپنے طریقہ کو آپ نے دوسروں کے سلسلے میں کیسا پایا ؟"
"بہت کامیاب ۔ خود اپنے بھائی کو میں نے اس لائن پر لگایا اور اب اس کی عربی اچھی خاصی ہو چکی ہے ۔ یہاں دارالعلوم میں کثرت سے ایسے طلبہ ہیں جنھوں نے اس ڈھنگ پر کوشش کی اور غیر معمولی کامیابی حاصل کی"۔
"یوں سمجھئے کہ عربی میں بالکل بے تکلف بولنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً بیس ہوگی، متوسط درجہ کی صلاحیت رکھنے والے پچاس اور کچھ نہ کچھ بول لینے والے کئی سو کی تعداد میں ہوں گے"۔
"آپ کا یہ طریقہ غالباً صرف بول چال کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کارآمد ہوگا"۔
"ایسا نہیں ہے، بلکہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے عربی میں قوتِ مطالعہ اور قوتِ اخذ بھی نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے طلبہ خود حیرت انگیز طور پر اس کو محسوس کرتے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں جو طلبہ عربی لکھنے بولنے میں فائق ہیں وہ قوتِ مطالعہ میں بھی فائق ہیں"۔
"دارالعلوم سے فراغت کے بعد" میں نے دوسرا سوال چھیڑتے ہوئے کہا "آپ فوراً یہاں استاد مقرر ہو گئے تھے، یا درمیان میں اور کہیں رہنا ہوا"۔
"میں یہاں سے فراغت کے بعد دہلی چلا گیا تھا، وہاں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کی وفات تک ان کے

پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔"

"اس زمانہ میں بھی کیا آپ کی عربی زبان کی مشق جاری رہی؟"

"وہاں مولانا کی معرفت حکومت ہند کے دفتر خارجہ میں آنا جانا ہوا۔ مصر کی انقلابی کونسل کے رکن اور موجودہ قومی اسمبلی کے اسپیکر انورالسادات ۱۹۵۳ء میں سرکاری دورہ پر ہندوستان آئے تو ڈاکٹر سید محمود نے مجھ ہی کو ان کا ترجمان مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت ہندوستان کی وزارت خارجہ میں ریاستی وزیر تھے۔ اس ملاقات کے دوران میں نے انورالسادات سے کہا کہ مصر اور ہندوستان میں کلچرل تبادلہ ہونا چاہئے۔ اس سے انھوں نے اتفاق کیا چنانچہ اس کے بعد شیخ عبدالمنعم النمر ہندوستان بھیجے گئے۔ شیخ موصوف سے ابتداءً خط و کتابت کا کام میں نے ہی انجام دیا تھا۔"

"آپ کو عرب ممالک میں جانے کے مواقع بھی ملے۔"

"میرے دہلی قیام کے زمانہ میں ایک وفد گڈول مشن کے طور پر حجاز گیا تھا۔ نو ارکان کا یہ وفد مکہ، مدینہ اور جدہ گیا اور ۲۴ روز وہاں گذارے۔ میں اس میں ترجمان کی حیثیت سے شریک تھا۔"

"اس کے علاوہ بھی کوئی موقع آپ کے لئے پیدا ہوا؟"

"جی ہاں۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کامل قدوائی نے ہندوستان کے سعودی عرب کے سفارت خانہ میں ایک بہت اچھی جگہ کے لئے از خود میرا تقرر کر دیا تھا۔ مگر مجھے اس قسم کی ملازمتوں کا کبھی شوق نہیں رہا۔ یہاں دارالعلوم میں بہت مطمئن ہوں۔ یہاں مجھے طلبہ کے اندر علمی اور دینی دونوں طرح کی خدمت کا موقع مل رہا ہے اور خدا کے فضل سے میں اس میں پوری طرح کامیاب ہوں۔"

"پھر آپ یہاں کیسے آپہنچے؟"

"اصل میں دارالعلوم کی طالب علمی ہی کے زمانے میں میں نے یہاں کام کا آغاز کر دیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تو پہلے ہی سال میں نے دارالعلوم کے ایک جلسہ میں عربی میں تقریر کی۔ یہ یہاں کے ماحول کے لئے بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ اس کے بعد میں نے ایک قلمی رسالہ عربی میں نکالا۔ طلبہ کو ابھارا کہ وہ عربی لکھنے بولنے کی مشق کریں۔ چنانچہ متعدد طلبہ نے اس طرف توجہ کی۔ حتی کہ میں نے خود سے ایک درجہ قائم کر کے لڑکوں کو عربی پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح دوران طالب علمی جن طلبہ کو میں نے پڑھایا ان کی تعداد تقریباً اسی تک پہنچتی ہے۔"

"پھر تو گویا دوران طالب علمی ہی میں آپ یہاں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔"

"اصل میں مجھے شروع سے عربیت کا بے حد شوق ہے۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں دارالعلوم کی عربی خط و کتابت کا کام مجھ سے متعلق ہو گیا تھا۔ عربی وفود کی آمد کے موقعہ پر ترجمان کے فرائض میں ہی انجام دیتا تھا حتی کہ

(بقیہ صفحہ ۶۵ پر)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی

شہیدِ نازِ اربابِ تقویٰ

مولانا وحید الزماں کیرانوی رح

غزالاں! تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گذری؟

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو سب سے پہلے اس ملاقات کی یاد تازہ ہوگئی جب کہ مولانا مرحوم چند سال قبل دارالمؤلفین کی تاسیس کے بعد ایک طالب علم کے ہمراہ راقم الحروف کی قیام گاہ مدرسہ عربیہ منبع العلوم موائی (ضلع بارہ بنکی) تشریف لائے تھے۔ مذکورہ سفر سے چند ماہ قبل بھی مولانا موائی تشریف لائے تھے لیکن راقم الحروف کی عدم موجودگی کے باعث ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ اس کے علاوہ مولانا کو بعض دشواریاں پیش آئیں وہ مزید برآں تھیں مثلاً موائی چوراہے سے پانچ کلومیٹر کا فاصلہ کھڑکھڑے (تانگے کی ایک اوٹ پٹانگ اور مضحکہ خیز قسم کی تکلیف دہ سواری) پر طے کرنا پھر اس کھڑکھڑے کا راستے میں اُلٹ جانا اور مولانا کا حیرت انگیز طور پر محفوظ رہنا، رات بھر بجلی کی غیر حاضری اور غیر متوقع بارش وغیرہ وغیرہ۔ شاید اسی لئے دوبارہ موائی تنہا نہیں تشریف لائے کہ خدا جانے کیا افتاد پیش آجائے حالانکہ دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں پیش آئی کیونکہ اطلاعی مکتوب مجھے مل گیا تھا اور متوقع تاریخوں میں راقم الحروف چشم براہ تھا۔

پہلے ناکام اور تکلیف دہ سفر کے بعد مولانا مرحوم نے جو مکتوب تحریر کیا وہ بھی زندہ دلی کا شاہکار تھا جس کا ایک جملہ ذہن میں تاہنوز محفوظ ہے کہ "بسلسلہ جائے قیام آپ کے حسن انتخاب کی داد دیتا ہوں" دراصل یہ جملہ میری گوشہ نشینی و عافیت کوشی پر بھرپور طنز تھا کیونکہ مولانا جب بھی اپنی مہم جوئی یا سرگرمیوں میں شرکت کے لئے ناچیز کو دعوت دیتے تو یہاں سے لکھ دیا کرتا ؎

زاہد نداشت تاب جمال پری رخاں
کنجے گرفت و خوف خدارا بہانہ ساخت

• مدرسہ عربیہ منبع العلوم، موائی، بارہ بنکی

مولانا مرحوم جب دوبارہ موائی تشریف لائے تو نہایت تفصیلی ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔ غالباً گورنی جا رہے تھے اور ملی جمعیۃ علماء کے قیام کا خاکہ اور اس کی تاسیس کا پروگرام مدنظر تھا۔ یا اس سلسلے میں کھچڑی سی پک رہی تھی، مولانا نے مجھ سے جب رائے لی یا مجھے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی تو راقم الحروف نے حسب عادت کھل کر مخالفت کرتے ہوئے نہایت تلخ اور روکھے انداز میں یہ بات کہی کہ "دارالمؤلفین کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ ویسے اگر آپ نے منصورؒ کی طرح نعرۂ اناالحق مار کر تختۂ دار پر چڑھنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو بھلا میرے منع کرنے اور روکنے سے آپ کب باز آنے والے ہیں۔ کیونکہ ناچیز کے بارے میں جناب کے سوچنے کا انداز بھی کچھ اس قسم کا ہے کہ ؏

دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہئے؟"

بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوا "جف القلم بما ھو کائن" سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں لیکن مولانا کے ساتھ جو صورتیں پیش آئیں جب ان کا خیال آتا ہے تو قلبی تکلیف ہوتی ہے اور اپنا ہی ایک شعر اس زمانے کا یاد آ جاتا ہے جس زمانے میں خاکسار کو بھی شعر و شاعری کی بیماری لاحق ہو گئی تھی اور شافی مطلق نے محض اپنے فضل سے مذکورہ بیماری سے نجات عطا فرمائی۔ شعر یہ تھا ؎

جور اہل دنیا کی اس قدر شکایت کیوں؟

اہل دین کے ہاتھوں کیا ستم نہیں ہوتے؟

میرا مطلب یہ نہیں کہ مولانا مرحوم کمزوریوں سے پاک تھے یا ان کا ہر اقدام قابل تائید تھا خواہ وہ کتنا ہی مبنی بر خلوص رہا ہو۔ پھر بھی ہم لوگ عموماً جوابی اقدام یا انتقامی کارروائی کے وقت "وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ" کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں شاید مولانا کچھ اسی قسم کی صورت حال کا شکار ہو گئے۔

دارالفکر کی یادیں

مولانا وحید الزماں مرحوم نے دارالفکر ۱۹۵۸ء میں قائم کیا اور آغاز کار ہی میں راقم الحروف کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ بعد ازاں مولانا عبدالرؤف صاحب عالی (موجودہ پیشکار اہتمام وقف دارالعلوم دیوبند) بھی شامل کارواں ہو گئے۔

یوں تو متعدد احباب کا تعاون حاصل رہا پھر بھی دارالفکر کا بنیادی ڈھانچہ مذکورہ مثلث پر ہی قائم تھا جس میں مولانا مرحوم کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ دارالفکر کے قیام کے بعد ماہنامہ القاسم

کے اجرا کی نوبت تو بعد میں آئی۔ سب سے پہلے مولانا مرحوم نے القاموس الجدید کے کاموں کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔ اور القاموس الجدید کی پہلی طباعت کے سلسلے میں مولانا کو کتنے زہرہ گداز مراحل سے گذرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے پوری کتاب کی ترتیب اور صبر آزما کتابت کے بعد جب کتابت شدہ کاپیاں مرحوم کے مخلص اور بے تکلف دوست مولانا خالد صاحب اعظمی کے کوہِ نور پرنٹنگ پریس (دہلی) پہنچ گئیں اور شاید ہفتہ عشرہ میں طباعت ہونے ہی والی تھی کہ صرف القاموس الجدید کی کتابت شدہ کاپیاں چوہے درمیان سے اس طرح کتر گئے جیسے خاص اسی کام کے لئے پلان بنا کر آئے ہوں کیونکہ وہیں رکھی ہوئی دوسری متعدد کتابوں کی کتابت شدہ کاپیاں بالکل محفوظ رہیں مگر اس قسم کی باتوں کا مولانا کی صحت پر کیا اثر پڑسکتا تھا، مولانا مرحوم ساری آفت رسیدہ کاپیاں دہلی سے دیوبند لائے اور ان کے متاثرہ حصوں پر بطور پیوند دوسرا کاغذ چپاں کرنے کے بعد از سرِ نو کتابت مکمل کرلی۔

القاموس الجدید کی کتابت کے سلسلے میں مولانا کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد تخت کتابت پر بیٹھ جاتے اور ظہر کے وقت ہی کام سے فارغ ہونے کے بعد اٹھتے، اس دوران صرف ہلکے پھلکے ناشتے ہی پر انحصار ہوتا تھا، ہاں! چائے کا دور البتہ چلتا رہتا۔ مولانا مرحوم چائے کے سلسلے میں نہایت باذوق ہی نہیں بلکہ خوش ذوق واقع ہوئے تھے اور ان بے تکلف احباب کی طنزیہ جملوں اور دلچسپ نقروں سے بڑے لطیف انداز میں خبر لیتے جو گڑ بڑ گھٹالا قسم کے گاڑھے، میٹھے اور گرم سیال کو چائے کے معزز لقب سے نوازتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی مرتبہ خود راقم الحروف مولانا کے حملوں اور جملوں کی زد میں آگیا۔

مولانا مرحوم کے قیام دیوبند کے زمانے کو تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں جو تقریباً تیس پینتیس سال کے طویل عرصہ کو محیط ہے پہلے حصے کو دورِ ابتلا سے تعبیر کرسکتے ہیں جو نہایت صبر آزما، جانگسل اور حوصلہ شکن تھا لیکن یہ بندۂ خدا ؎

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گذر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر اسے

ایک جانب اپنے ذاتی اشاعتی پروگراموں کی تکمیل کی مشقت، دوسری جانب گھریلو اخراجات کا بار صبح سے دوپہر تک القاموس الجدید وغیرہ کی کتابت اور بوقت شب ان کاموں کی انجام دہی جو دہلی وغیرہ کے اشاعتی اداروں سے متعلق تھے۔

مولانا مرحوم اس قدر غیور و خوددار تھے کہ وہ نہ تو اپنے بلند معیار زندگی میں کوئی تبدیلی گوارا کرسکتے تھے اور نہ ہی مادی منفعت کے لئے کسی کے سامنے دبنے یا جھکنے والے تھے گویا زبان حال سے کہہ رہے

ہوں سے

ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے
کشیدہ سر بھی ہوں پابند زلف یار بھی ہوں

مولانا کا دور ابتلا یا عملی زندگی کا ابتدائی دور نہایت پریشان کن تھا اس کے باوجود مولانا انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ اور ہم قریبی احباب کو بھی کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان پر کیا گذر رہی ہے۔ بس ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی اگرچہ ہم خوب سمجھتے تھے کہ سے

یوں تو اشکوں سے بھی ہوتا ہے الم کا اظہار
ہائے وہ غم جو تبسم سے عیاں ہوتا ہے

مرحوم حافظ ظہیر صاحب کے مکان کی بیٹھک جو دار الفکر کے دفتر کی حیثیت سے معروف و متعارف تھی ہمیشہ ہی زندہ دل احباب بے تکلف کی آمد و رفت سے آباد رہتی ظاہری رونق اور چہل پہل کی وجہ سے عام دیکھنے والوں کو وہاں ہمیشہ خیر و عافیت اور خوشحالی ہی نظر آتی جبکہ حقیقت حال سے ہم چند افراد ہی آگاہ تھے، دار الفکر کے دفتر میں جمعہ کی شب نماز عشاء کے بعد اجتماعی کھانے کا پروگرام بھی نہایت دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ جس کے شرکا میں قاری علاء الدین صاحب (ہردوئی) مولانا عبد الرؤف صاحب عالی، مفتی ظلال عثمانی کے علاوہ وقتاً فوقتاً دیگر مختلف احباب کا بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا، کبھی کبھار سراپا تفریح مولوی فرزند علی صاحب میرٹھی بھی آدھمکتے تھے جن سے مولانا مرحوم کافی مانوس تھے اور جن کے جاں لیوا قسم کے فلک شگاف قہقہے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ وہ بھی عجیب دور تھا جس کی اب صرف یاد ہی باقی رہ گئی ہے نہ دار الفکر کا دفتر رہ گیا نہ وہ دوست احباب۔ کچھ تو عنفرلہٗ ہو گئے اور باقی جو ہیں وہ بالکل فالودہ کی شکل اختیار کر کے اوپر جانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ سے

كأن لم يكن بين الحجون الى الصفا
انيسٌ ولم يسمر بمكة سامر

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

دیوبند میں مولانا مرحوم کی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جبکہ آپ دار العلوم میں مسند تدریس پر فائز ہوئے یہ زمانہ تقریباً سترہ اٹھارہ سال کی مدت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کو فیض رسانی کے لحاظ سے مولانا کی زندگی کا قیمتی سرمایہ اور طلبا کی تعلیم و تربیت نیز ادارے کی تنظیم و ترقی کے پہلو سے

دارالعلوم دیوبند کے سنہری لمحات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ کام کا زمانہ یہی تھا، پھر تیسرا دور اجلاس صد سالہ کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اس کا اختتام اس وقت ہوتا ہے جبکہ دارالعلوم دیوبند سے مولانا مرحوم کا رابطہ بالکل منقطع ہوگیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ؎

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی۔

تفصیلات میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں ؎

بڑی دلخراش ہے داستاں   مرا کانپتا ہے رواں رواں

یہ بات نہیں کہ واقعات و تفصیلات کا علم نہیں راقم الحروف پر متحارب گروپ کے اعتماد کی وجہ سے بہت سے ایسے واقعات و حالات بھی علم میں ہیں جن سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں پھر بھی یہ اپنی ذمہ داری ہے کہ ع

"رہنے بھی دو حجاب کی باتیں حجاب میں"۔

ہمارے اکابر میں سے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر ہر حقیقت واقعہ کا اظہار موقع بے موقع ایسا ہی ضروری ہے تو ہمیں چوراہے پر مادر زاد برہنہ ہوجانا چاہیے"۔

بقول شاعر ؎

کن لفظوں میں اتنی کڑوی اتنی کسیلی بات لکھوں
شعر کی میں تہذیب نبھاؤں یا اپنے حالات لکھوں

اگرچہ یہاں شعر و شاعری کی کوئی بات نہیں پھر بھی نثر کے بھی تو کچھ اصول و آداب اور تقاضے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ باہمی اختلافات کی جو صورتیں بھی پیش آئیں ان کو حق و باطل یا کفر و اسلام کی جنگ سے تو تعبیر کر نہیں سکتے، بس طریق کار کی تعیین یا اس بات کی جنگ تھی کہ ایک بین الاقوامی ادارے کی زمام اختیار کس کے ہاتھ میں رہے۔ اس سلسلے میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ ناگوار واقعات پیش آئے۔ آنجہانی میلا رام وفا کا ایک شعر یاد آگیا ؎

دیں دست و گریباں پاؤ گے اللہ والوں کو
جہاں ذکر خدا زیادہ ہے اور خوف خدا کم ہے

متحارب گروپ کی اعلیٰ قیادت کے بارے میں تو کچھ کہتے ہوئے احتیاط برتنی پڑتی ہے لیکن نچلی سطح پر جو حرکتیں ہوئیں ان کو اہل علم و دین کی شایان شان نہیں کہہ سکتے۔

عملی انسان

مولانا وحید الزماں مرحوم جنھیں شہید ناز ارباب تقویٰ کے لقب سے بھی یاد کرسکتے ہیں، نہایت زود حس، فعال اور عملی انسان تھے، اسی لئے راقم الحروف کی مولانا مرحوم سے کبھی نہیں بنی۔ اگرچہ دونوں جانب سے باایں طور جذباتی لگاؤ تھا کہ ایک مشکل ترین دور میں مل جل کر کام کر چکے تھے نہ معلوم ماضی کی کتنی یادیں وابستہ تھیں اور ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ بھی بحمد اللہ زندگی بھر برقرار رہا۔ اب اسے آپ وضعداری کہیئے یا مخلصانہ تعلقات سے تعبیر کیجیئے! مولانا مرحوم کا مزاج یہ تھا کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں فوراً متشکل ہوکر سامنے آجائے ورنہ برافروختہ ہوجاتے —— چنانچہ مرحوم کے اس مزاج کی وجہ سے بعض ایسے واقعات بھی پیش آگئے کہ اگر مولانا کے علاوہ کوئی دوسرے صاحب ہوتے تو ان کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اجلاس صدسالہ کے سلسلے میں مولانا طوفانی دورہ فرمارہے تھے، طبیعت کچھ علیل تھی اور بے حد تھکے ہوئے بھی تھے ضلع بستی کے کسی مقام پر جلسہ تھا اور اتفاقاً جلسہ کے ذمہ دار اور روح رواں مولانا مرحوم ہی کے کوئی قدیم شاگرد تھے۔ مولانا مرحوم کی ان کو تاکید تھی کہ وہ مولانا کا تقریر کے سلسلے میں اسٹیج پر نام نہ لیں مگر ان صاحب نے جو کہ شاید صدر جلسہ بھی تھے مولانا کی تقریر کا اعلان کردیا۔ سخت تاکید کے باوجود ان کی اس حرکت پر مولانا کو غصہ آگیا اور اسٹیج پر پہنچ کر اعلان کرنے والے صاحب کی برسرعام سخت سرزنش کی۔ مگر واہ رے مولانا کے شاگردوں کا مثالی اور والہانہ تعلق کہ سوائے وقتی تاثر کے کوئی بھی ایسی بات نہ پیش آئی جس سے مولانا کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کا شائبہ نکلتا ہو۔

ایک دوسرا واقعہ جس کو شاید لوگ اب تک نہ بھولے ہوں وہ ہے جس میں مولانا مرحوم نے طلبائے دارالعلوم کے ایک پُرجوش نوجوان اور باڈی بلڈر قسم کے لیڈر کی احاطہ مولسری ہی میں سب کے سامنے پٹائی کردی تھی اور وہ کسی سے نہ دبنے والا نوجوان مولانا کے سامنے اس طرح سر جھکائے مار کھا رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ کسی شرارت پر اپنے والدین سے پٹتا ہے۔ مولانا کی یہی ہر دل عزیزی تھی جسے دیکھ کر بعض لوگ انگاروں پر لوٹ جاتے تھے۔ لیکن مولانا کو اپنے اس مخصوص مزاج کی بنا پر کچھ نقصانات بھی اٹھانے پڑے۔

تحریر طوالت اختیار کرتی جارہی ہے اور اپنا خیال ہے "مولانا وحید الزماں نمبر" کے اعلان کے بعد بہت سے کارآمد و سنجیدہ مضامین بھی ادارے کو موصول ہوں گے، ان کے لئے بھی جگہ چھوڑنی ہے لہذا چند متفرق واقعات کا تذکرہ کرکے مضمون کو سمیٹنے اور مختصر کرنے کی کوشش کروں گا۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے"

غالباً ۱۹۶۰ء ماہ اکتوبر کی بات ہے ماہنامہ القاسم کے پہلے شمارے کو چند روز میں منظر عام پر لانا تھا رات کے تقریباً دو بجے تھے۔ راقم الحروف اداریہ کی عبارت کو تین تین چار چار سطروں کی پٹی کی شکل میں تراش تراش کر مولانا مرحوم کو دیتا جاتا تھا اور مولانا کتابت کرتے جاتے تھے، اچانک مرحوم سب کام چھوڑ چھاڑ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور مکان کے بالائی کمرے سے اتر کر مکان کے نچلے حصے میں چلے گئے، میں نے یہ سمجھا کہ شاید استنجے وغیرہ کی ضرورت پیش آگئی ہوگی لیکن ذرا سی دیر کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا ہاتھوں میں گرم گرم حلوے کی پلیٹ لئے چلے آرہے ہیں، آتے ہی کہنے لگے کہ ہم لوگ کئی گھنٹے سے مسلسل کام میں جُتے ہوئے تھے کوئی دوسرا تو یہاں ہے نہیں جو ہماری ہمت کی داد دے اس لئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم لوگ خود ہی گرم گرم حلوا کھا کر اپنی حوصلہ افزائی کا فریضہ انجام دے لیں۔ بہر حال اذان فجر سے ذرا سی دیر قبل ہم لوگ القاسم کی کاپیاں مکمل کر چکے تھے اور جب محلہ لال مسجد میں اپنے کمرہ پر آیا تو ستارۂ صبح کی نیلگوں روشنی اس قدر بھلی معلوم ہورہی تھی کہ میں اس سہانے منظر میں کھو گیا اور تکان کا احساس تک جاتا رہا۔ مختصر یہ کہ مولانا مرحوم اسی روز کاپیاں لے کر دہلی چلے گئے اور چند ہی روز میں پرچہ طبع ہوکر منظر عام پر آگیا۔ اس زمانے میں دیوبند سے دو ماہنامے تجلی اور ہادی شائع ہوتے تھے دونوں کا اپنا اپنا اسلوب تھا اور دونوں ہی ماہنامے معیاری اور مقبول تھے۔ تجلی کے انداز میں شوخی، ادبیت اور چھیڑ چھاڑ کا عنصر زیادہ تھا جبکہ ہادی اپنے علمی انداز اور بھولے پن کی وجہ سے انفرادی حیثیت کا مالک تھا۔ اول الذکر ماہنامے کے مدیر مولانا عامر عثمانی مرحوم تھے اور ماہنامہ "ہادی" محبوب رضوی صاحب مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ماہنامہ "القاسم" کے منظر عام پر آنے کے بعد مختلف انداز میں اس پر تبصرے ہوئے لیکن مدیر تجلی مولانا عامر عثمانی مرحوم کے اس تبصرے سے ہم لوگوں کو بڑا حوصلہ ملا تھا کہ " دیوبند میں اگر کوئی ماہنامہ کامیاب ہوسکتا ہے تو یہی ہے"۔ دراصل ہمیں خطرہ مرحوم ہی سے تھا کہ اگر کوئی چیز ان کی گرفت میں آگئی تو ہم لوگوں کی مٹی پلید کردیں گے لیکن جب انہی کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی تو ہم لوگ مطمئن ہوگئے۔ مولانا وحید الزماں صاحب کی وفات سے کچھ دنوں قبل میں نے انھیں ماہنامہ القاسم کے شماروں کی ایک جلد پیش کی تھی جس میں ایک سال کے مطبوعہ پرچے تھے ممکن ہے مولانا کے سامان میں وہ جلد محفوظ ہو۔

سات روپے کا قصہ

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

ایک مرتبہ نماز مغرب کے بعد کہنے لگے کہ میری جیب میں کبھی روپے نہیں بچتے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج سات روپے جیب میں فالتو پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے مذاق میں کہا کہ فکر مند نہ ہوں صبح تک کوئی نہ کوئی مصرف نکل ہی آئے گا۔ چنانچہ صبح جب بیدار ہوئے تو کمر یا پشت پر ایک پھوڑا نمودار ہو چکا تھا۔ جس میں بہت تکلیف تھی، مولانا مرحوم نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی آنجہانی ڈاکٹر سورج پرکاش کے مطب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے پانچ روپے میں ایک انجکشن لگا دیا۔ (یہ اس دور کی بات ہے جبکہ پانچ روپے اگر پچاس نہیں تو موجودہ دور کے پچیس روپے کے برابر ہوتے ہی تھے) باقی جو دو روپے بچے اس کے ٹیبلیٹ وغیرہ عنایت فرما دیئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد جب مولانا نے سرگذشت بیان کی تو سب کو ہنسی آ گئی ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

مکان پر حملہ

ایک اور موقع پر مولانا مرحوم فرمانے لگے کہ دارالعلوم کے نظام میں خوشگوار تبدیلی لانے کے لئے کتنے دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑا اور کتنے خطرات سے دوچار ہونا پڑا ہے کسی کو کیا معلوم؟ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہو چکا ہے کہ بوقت شب مخالفین کے پورے گروہ نے مکان پر حملہ کر دیا بس ایک شور تھا کہ مارو! بچنے نہ پائے۔ اس طوفان بدتمیزی سے بچنے کے لئے مکان کے دروازے کی کنڈی اندر سے لگا لی گئی تو پوری بھیڑ دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ باہر سے شرپسندوں کا پورا زور تو دروازے پر تھا اور میرے ساتھ میرے معمر والد بلکہ گھر کی مستورات تک دروازے کو پوری طاقت سے روکے ہوئے تھیں کہ کہیں دروازہ ٹوٹ کر اندر نہ گر پڑے کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد ظاہر ہوئی محلہ ہی کے کچھ افراد غالباً مرغوب احمد نام کے نوجوان کی سربراہی میں لٹھ لے کر نکل پڑے تو شرپسندوں کو دروازے سے ہٹنا پڑا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مولانا کے چہرے پر افسردگی چھا گئی اور کہنے لگے:

"بتایئے! اگر اس قدر قربانیوں کے بعد بھی دوبارہ دارالعلوم کے نظام میں وہی خرابیاں پیدا ہونے لگیں جن کو دور کرنے کے لئے سب کچھ برداشت کیا گیا تو اس سے زیادہ بدقسمتی اور افسوس کی بات اور کیا ہو گی؟ مذکورہ واقعہ کا دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ مولانا کی طرف سے مدافعت کے لئے جو

لوگ گھروں سے نکلے ان کا تعلق بھی اسی گروپ سے تھا جس گروپ سے حملہ آور متعلق تھے جبکہ ع
"مر رہے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے"

شرافت اور وضعداری

قیام دارالمؤلفین کے بعد مولانا مرحوم نے راقم الحروف کو متعدد خطوط لکھے جن میں کبھی ہلکا پھلکا اور کبھی شدید تقاضا ہوتا تھا کہ راقم الحروف دیوبند پہنچ کر دارالمؤلفین کی سربراہی اور اس کے کاموں کی تکمیل کی ذمہ داری قبول کرکے ادارے کے ساتھ تعاون میں سرگرم حصہ لے مگر چونکہ دارالفکر کی رفاقت کے دوران مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بعض پہلوؤں سے میرے اور مولانا کے مزاج میں بہت زیادہ ہم آہنگی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ پروگراموں میں مولانا کی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری کا ساتھ دینا بھی میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے دیوبند پہنچنے کی جرأت نہ کرسکا۔ دوسری بنیادی رکاوٹ یہ تھی کہ مولانا تو "من و گرز و میدان و افراسیاب" کے قائل تھے جبکہ راقم الحروف کی ناقص یا غیر ناقص رائے یہ تھی کہ کسی علمی و تحقیقی ادارہ کو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ مکمل یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ صرف ادارہ پر توجہ دی جائے اور دوسری ہر طرح کے اختلافات اور تنازعوں سے مکمل علاحدگی اختیار کرلی جائے، کیونکہ اگر کسی اور محاذ پر تصادم اور ٹکراؤ کی فضا قائم ہو تو ہماری توانائیوں کا ارتکاز برقرار نہ رہ سکے گا اور ہماری قوتیں اس طرح منتشر ہو جائیں گی کہ سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ مولانا مرحوم میری باتوں کی تائید تو ضرور کرتے لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہ ہوسکا۔

دارالمؤلفین دیوبند پہنچنے کے سلسلے میں جب مولانا کا تقاضا برقرار رہا تو ایک خط کے جواب میں جہاں بہت سی دیگر مجبوریاں بیان کیں وہیں جھلا کر یہ بھی لکھ مارا کہ "جوانی تو دارالفکر میں برباد کی اب دارالمؤلفین میں آکر کیا اپنے بڑھاپے کا ستیاناس ماروں"؟ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا یہ خط متعدد مجلسوں میں سنایا گیا اور مذکورہ جملے کی بے تحاشا قہقہوں سے پذیرائی ہوئی چنانچہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم یہاں مدرسہ عربیہ مواٸی تشریف لائے تو مذاق میں کہنے لگے کہ بھائی آپ نے تو اپنا قیمتی بڑھاپا محفوظ کرلیا لیکن خاکسار تو اپنے بڑھاپے کا بیڑا غرق کرنے پر لگا ہوا ہے۔ مولانا مرحوم نے دارالمؤلفین کی مطبوعات کے بارے میں جب میری رائے معلوم کی تو راقم الحروف نے عرض کیا کہ کتابت و طباعت، کاغذ و بائینڈنگ وغیرہ ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے تو کوئی بڑے سے بڑا اشاعتی ادارہ بھی شاید آپ کی مطبوعات کا مقابلہ نہ کرسکے، لیکن ظاہری خوبیوں کے ساتھ معنوی خوبیوں کی جانب مزید توجہ کی ضرورت ہے جب

مولانا میری بات پر چونکے اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے دار المؤلفین کی ایک مطبوعہ کتاب کے بعض مقامات کی نشاندہی کی۔ اس پر مولانا نے ایک بار پھر زور دیا کہ اگر آپ دیوبند آکر قیام نہیں کر سکتے ہیں تو کم از کم اتنی ذمہ داری تو قبول کیجئے کہ مسودات آپ کے پاس بذریعہ ڈاک پہنچتے رہیں اور ان پر آپ ایک نگاہ ڈال لیا کریں۔ اس سلسلے میں بطور حق الخدمت متعینہ رقم جو آپ تجویز کریں گے انشاء اللہ آپ کے پاس ماہانہ پہنچ جایا کرے گی۔ بہر حال اسی پر معاملہ ہو گیا اور ایک متعینہ رقم بھی ماہانہ پابندی کے ساتھ راقم الحروف کے پاس پہنچتی رہی لیکن کسی مسودے کو نہ میرے پاس آنا تھا اور نہ آیا۔ کیونکہ مولانا مرحوم سیاسی معاملات میں الجھ گئے تھے یا الجھا دیئے گئے تھے، میں نے مولانا مرحوم کو لکھا ؎

اک کرم اور ہم غریبوں پر
اور وہ یہ کہ اب کرم نہ کرو!

آئندہ ہر مسودہ پر مستقل معاملہ کر لیجئے گا ماہانہ رقم بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ در اصل مجھے خود ہی مولانا پر ترس آگیا۔ چونکہ مزاج سے واقف تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ مولانا رقم بھیجتے رہیں گے خواہ ان پر حالات کچھ بھی گذر جائیں۔

اپنوں کی بے وفائی

میں نے مولانا کے عروج کا وہ دور بھی دیکھا جبکہ اچھے اچھے قبلہ نما حضرات مولانا کے گرد و پیش لگے رہتے تھے۔ بعض بعض تو مولانا کے مکان ' زنان منزل ' کی طرف آتے ہوئے دیوان دروازے کے سامنے ہی سے بغرض خفض جناح الذل سینہ دھنسا کر مونڈھے جھکا لیتے تھے تاکہ مولانا کے سامنے پہنچتے ہی اظہار خشوع و خضوع میں ٹائم نہ لگے، اگرچہ اس قسم کے بہروپیوں کی کچھ کمی نہ تھی لیکن مولانا مرحوم کے فدائیوں اور شیدائیوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جو نہایت مخلص اور مولانا مرحوم سے والہانہ عقیدت مندانہ تعلق رکھتی تھی۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنوں یعنی اپنائیت کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھوں بہت کچھ نقصان اور اذیت پہنچی۔ مشکل کی گھڑی میں ماضی کے بیشتر احباب و متعلقین نے مصلحت اندیشی اور بے وفائی کا مظاہرہ کیا۔ اسی بات کا اظہار کسی نے بایں طور کیا ہے ؎

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

یا سہ
دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مولانا مرحوم جس نوع کی دماغی، روحانی و جسمانی اذیتوں سے دوچار رہتے وہ تکلیف دہ بات تو تھی ہی مجھ جیسے حساس انسان کو یہ دیکھ کر شدید ذہنی اذیت ہوتی تھی کہ وہ لوگ بھی مولانا سے مجتنب اور گریزاں ہیں جن پر مرحوم کے بے انتہا احسانات رہتے اور جو کسی زمانہ میں اگر میں مبالغہ کی زبان استعمال کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے تلوے چاٹا کرتے تھے، چنانچہ عید کے روز مولانا سے فیض یافتہ اور والہانہ تعلق رکھنے والے مولانا نور عالم جیسے معدودے چند افراد ہی مولانا سے عید ملنے یا عیادت کی غرض سے مولانا کے مکان پر حاضر ہوئے باقی وہ بھیڑ کہیں نظر نہ آئی جو کسی زمانے میں مولانا کے گرد و پیش منڈلایا کرتی تھی البتہ انتقال کے بعد جسے دیکھئے فلینگ مارچ کرتا ہوا تعزیت کے لئے چلا آرہا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ جسد خاکی کو دیکھ کر عین الیقین کے درجے میں مطمئن ہو جانا چاہتے ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ مولانا سے غلطیاں نہیں ہوئیں اور نہ مولانا مرحوم کی طرف سے وکالت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہوں پھر بھی یہ ضرور عرض کروں گا کہ غلطیاں بھی انہی سے ہوتی ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں، جو زندہ اور پیکر جہد و عمل ہوتے ہیں۔ مُردوں سے غلطیاں نہیں ہوا کرتی ہیں۔

دارالعلوم میں جس قدر ظاہری و معنوی خوشگوار و قابل دید تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ اظہر من الشمس ہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وہ سب مولانا مرحوم کی شب و روز کی محنت و جگر کاوی ہی کا ثمرہ تھیں اور ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے مولانا اپنی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے (جو کسی بھی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے) اور ہار نہ ماننے والے مزاج کی وجہ سے انتقامی کارروائیوں کی زد میں آگئے۔ علاوہ ازیں مولانا کا اور کوئی قصور نہ تھا۔ لوگوں کو مولانا کی ذات ہی سے پرخاش تھی سہ

سألتُ وما ذنبي؟ فقالت مجيبةً
وجودك ذنبٌ لا يقاس به ذنبُ

اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم سے کام لیا گیا اور خوب کام لیا گیا، یہاں تک کہ مولانا بیچارے خود کام آگئے سہ

مرگ عاشق پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

یا یوں کہہ لیجئے سہ

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

مولانا مرحوم نے جو کچھ کیا وہ ان کے مزاج کا تقاضا تھا اور دوسروں نے جو رویہ اپنایا وہ ان کی اپنی سرشت تھی قل کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ بعض معاملات میں مولانا سے اجتہادی غلطی یا بے احتیاطی ہوئی۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ ع

جس کو ہو جان و دل عزیز ان کی گلی میں جائے کیوں؟

جو کچھ واقعات پیش آئے وہ اگرچہ تکلیف دہ ہیں لیکن ان سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسرے مفید اور تعمیری کاموں میں مصروف ہونا ہی بہتر ہے، اگر کسی نے احسان فراموشی یا بے وفائی کی تو اس پر ماتم سے کیا حاصل؟ ہر شخص اور گروہ نے اپنے مزاج کے مطابق کام کیا ہے

نیش کژدم نہ از پے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

ے
کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے

ہم کسے الزام دیں؟

ے شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو بخدا ہم نے جلایا نہیں پروانے کو

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی طرف سے زیادتی ہوئی لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا پر ظلم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اب اس بحث سے کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ جن لوگوں پر الزام ہے کہ انھوں نے مولانا کے ساتھ زیادتی کی، ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کہ جامۂ اتقا میں ملبوس ہیں اور یہی وہ جامہ ہے جو نہ صرف یہ کہ الزام پروف ہوتا ہے بلکہ الزام شکن بھی۔

ے جو میخانے میں ہے ام الخبائث حضرت واعظ
پہنچتی گر وہ حجرے میں شراب الصالحیں ہوتی

پھر اگر یہ بات ثابت بھی کر دی جائے کہ فلاں صاحب نے زیادتی کی ہے تو اسے مانے گا کون؟ لہٰذا

؎ پڑے ہیں تو پڑے رہنے دو میرے خون کے دھبے
تمہیں محشر میں سب دیکھیں گے داماں کون دیکھے گا

مولانا مرحوم بیچارے شریف اللسان تھے، خاموشی کے ساتھ سب کچھ جھیل گئے۔ انھوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن ہم ان کی طرف سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

یہ بات نہیں کہ جن لوگوں کے مقابلے میں مولانا کو پسپائی اختیار کرنی پڑی وہ لوگ مرحوم سے معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور دوراندیشی میں فائق تھے (بلکہ راقم الحروف کو معاف کیا جائے جو یہ کہنے پر مجبور ہے کہ ان میں سے بعض تو ایسے تھے کہ اگر حماقت کا عالمی مقابلہ ہو تو ان کو نوبل پرائز سے نوازا جائے) ان تمام باتوں کے باوجود مولانا مرحوم سب کچھ محض اس لئے خاموشی کے ساتھ جھیل گئے کہ ان کی طبع بلند کو یہ گوارا نہ تھا کہ دارالعلوم (دیوبند) کا وقار مزید مجروح ہو ؎

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ایک دوسری بات جس سے مولانا کو بار بار زبردست نقصان برداشت کرنا پڑا وہ مرحوم کی حد سے بڑھی ہوئی رجائیت تھی بس وہ ہمیشہ اس بات کے قائل نظر آئے کہ ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار رقص کرنا ہے اگر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مولانا کی مذکورہ کمزوری سے لوگوں نے غلط فائدہ حاصل کیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کے بعد بی جمالو کی طرح ناک پر انگلی رکھ کر دور جا کھڑے ہوئے اور مرحوم کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا کہ اٹھی ہر اک نگاہ سے آواز الاماں

ایک بے تکا مذاق جس نے حقیقت کا روپ دھار لیا

بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی، لگے حال چال پوچھنے، میں نے مرحوم کو بتایا کہ پچھلے دنوں بمبئی گیا تھا وہاں جا کر ایک افسوسناک خبر معلوم ہوئی۔ میں نے مولانا مرحوم کو بتایا کہ بمبئی میں اپنے بے تکلف اور ہم سبق صرف دو ساتھی تھے ایک توحیدیہ مسجد پائیدھونی کے خطیب مولانا انیس الرحمان ازہری اور دوسرے خطیب جامع مسجد بمبئی مولانا شوکت علی صاحب زید مجدہم۔ مذکورہ دونوں ساتھیوں میں سے ایک صاحب یعنی مولانا ازہری صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا میری بات سنتے رہے ذرا سے توقف کے بعد معلوم نہیں کیا سوجھی، کہنے لگے ہم لوگوں کے ساتھی تو ایک ایک کرکے جارہے ہیں، اچھا بتاؤ کہ اپنے اور میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ مجھے بھی

سوجھ گئی اور کہنے لگا کہ لائن سے تو ہم لوگ بھی لگ چکے ہیں۔ مگر معلوم نہیں سیریل میں آپ آگے ہیں یا ناچیز۔ پھر بھی اپنی خواہش یہی ہے آپ ہی آگے رہیں۔ میری اس بات پر پہلے تو کچھ چونکے اور پھر مسکرا کر کہا کہ آپ کی اس خواہش کی کچھ بنیاد اور وجہ بھی ہے؟ میں نے کہا کیوں نہیں، بہت مضبوط بنیاد اور نہایت معقول وجہ ہے۔ کہنے لگے وہ کیا؟ میں نے کہا کہ اگر میرا نمبر پہلے آگیا تو آپ تعزیتی مضمون حسب عادت فصیح و بلیغ عربی میں لکھیں گے اور لوگوں کو القاموس الجدید خریدنی پڑے گی جس سے خواہ مخواہ لوگوں کی جیب پر بار پڑے گا۔ جبکہ ناچیز ٹوٹی پھوٹی اردو میں اظہار خیال کر سکتا ہے جسے تلنگے اور رکشے والے بھی بآسانی سمجھ لیں گے میری اس بات پر مولانا کو جو ہنسی آئی ہے تو روکے نہیں رک رہی تھی۔

"یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری"

رمضان المبارک میں جب نماز مغرب کے بعد آخری اور تفصیلی ملاقات ہوئی (اس وقت کسے معلوم تھا کہ آخری ملاقات ہے) تو مولانا تقریباً ایک گھنٹہ نہایت انشراح اور توانائی کے ساتھ مصروف گفتگو رہے، آخر میں کہنے لگے کہ دیکھئے! اس وقت میری کیفیت بالکل نارمل سی ہوگئی ہے، آپ جیسے حضرات تو مجھے چھوڑ چھاڑ کر دور جا بیٹھے اب کوئی ایسا بھی تو نہیں ملتا جس سے کھل کر باتیں کر سکوں ورنہ میری آدھی بیماری تو بغیر علاج ہی کے دور ہو جائے۔ میں بطور اعتذار کہنے لگا کہ بھائی! تیس چالیس سال پہلے کی بات کچھ اور ہی تھی نوعمری اور کام کے ولولے کا زمانہ تھا، اب تو بال بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ ہے اور صرف بقدرِ ضرورت صحت و توانائی۔ وطن سے دور کوئی پروگرام بنانے سے قبل کئی مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ مولانا میری بات سن کر مسکرانے لگے اور کچھ نہ کہا۔

اک لمحہ برق تڑپی   تڑپ کر ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ چکی ہے اسی اضطراب میں

مولانا کی زندگی مذکورہ شعر کی بھرپور تشریح تھی، تھکنا اور پرسکون ہونا تو جانتے ہی نہ تھے، ہمہ وقت اپنے یا دوسروں کے لئے متحرک و فعال رہنے والے انسان تھے۔ مولانا مرحوم کی زندگی عبارت تھی حرکت و حرارت سے مولانا کی زندگی کا ہر لمحہ اعلان کناں تھا ؎

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدم ماست
ما زندہ از انیم کہ آرام نہ گیریم

پھر ساتھ ہی نہایت حساس اور جذباتی بھی واقع ہوئے تھے جس زمانے میں معاون مہتمم تھے

راقم الحروف سے کہنے لگے کہ دارالعلوم میں بعض جگہیں ایسی ہیں جنھیں آپ پُر کر سکتے ہیں (شاید کوئی تحریری کام تھا) میں نے مولانا کا مطلب سمجھ لینے کے بعد کہا: آپ کو معلوم ہے کہ کہیں ملازمت اور ماتحتی قبول کر لینے کے بعد ضروری ہے کہ انسان میں استسلام اور خود سپردگی کا جذبہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہو اور ناچیز کو مذکورہ جذبہ کی شاید ہوا تک بھی نہیں لگی ہے ورنہ اجلاس صدسالہ سے قبل تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے از خود اردو لٹریچر کی تیاری کے سلسلے میں مع دیگر دو معاونین (مولانا عتیق صاحب بستوی و مولانا ندیم الواجدی) دارالعلوم میں تقرر کر دیا تھا مگر (بھلا بندر کب پیال کے نیچے بیٹھا ہے؟) ڈیڑھ دو ماہ کے بعد ہی قاری طیب صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم کے دست مبارک کا تحریر کردہ تقرر نامہ بطور تبرک لے کر بھاگ کھڑا ہوا جو اب تک ناچیز کے پاس محفوظ ہے۔ جب میں نے مولانا کے سامنے اپنے مزاج کی یہ کمزوری بیان کی تو مولانا بھی خاموش ہو گئے اور دوبارہ کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ پھر بھی جہاں تک مجھے علم ہے مولانا نے بہت سے لوگوں کو کام سے لگا دیا اگرچہ وہی لوگ وقت پڑنے پر مولانا کے کسی کام نہ آئے اور انھوں نے احتیاطاً مولانا سے رابطہ ہی منقطع کر لیا ؎

اک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
یہ بھی اچھا ہی ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

مولانا مرحوم ایک جانب گراں قدر علمی خدمات کی انجام دہی میں بھی مصروف تھے، ساتھ ہی مرحوم کو جو ملکی لڑائی بھی لڑنی پڑ رہی تھی اگرچہ میرا منصب یہ نہیں تھا کہ مولانا کو سمجھاؤں پھر بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ مرحوم کا ٹکراؤ بعض گرگ باراں دیدہ قسم کے سیاسی حضرات سے ہے، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو علمی اور تعلیمی امور مفوضہ کے دائرے میں محدود رکھیں مگر بھلا وہ میری بات کب ماننے والے تھے، اس بات سے قطع نظر کہ ناچیز کو ذاتی طور پر بہت مانتے تھے۔ میرے مخلصانہ مشورے کی محرک دراصل میری یہ خواہش تھی کہ مولانا کی ذات سے جو علمی فیض خصوصاً ادب عربی کے سلسلے میں طلبائے دارالعلوم کو پہنچ رہا ہے اس کا سلسلہ برقرار رہے مگر ؏

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

قلی تھانوی "

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ ۱۹۸۳ء یا ۱۹۸۴ء کی بات ہے ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کا کام جاری

تھا اس سلسلے میں کچھ ذمہ داری راقم الحروف کو بھی سونپی گئی تھی، میرا قیام محمود ہال (دیوبند) سے ملحقہ کمروں میں سے عمارت کی مغربی جانب ایک کمرے میں تھا کبھی کبھی وہاں مولانا بھی آجایا کرتے اور تھوڑی دیر کے لئے نیم علمی و نیم تفریحی مجلس ہو جایا کرتی۔ ایک روز میں کسی کام میں مصروف تھا مولانا آئے علیک سلیک کے بعد چند لمحہ بیٹھے ہی تھے کہ اچانک میرے شانے کو پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہنے لگے: ''دلی تھا دلی؟'' میں نے دریافت کیا کہ کون؟ اس پر مولانا خاموش ہوگئے غالباً وہ اس کشمکش و پیچ میں پڑ گئے کہ مجھ سے بات کہیں یا نہ کہیں! میں نے دوبارہ کچھ لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ دوبارہ یہی حرکت کی، اب تو میں جھلا گیا اور مولانا سے کہا کہ حضرت! کوئی کچھ بھی رہا ہو مجھے کسی سے کیا لینا دینا لیکن یہ تو بتایئے کہ اس خاکسار کو کس خوشی میں شاک لگائے جا رہے ہیں؟

میری اس بات پر مرحوم کو ہنسی آگئی اور کہنے لگے کہ ارے بھائی! وہی ولی تھا جس کے ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں اتنی بدعنوانیاں نہیں ہوئیں جتنی انقلاب کے بعد ساٹھ دنوں میں ہوگئیں۔ میں نے مولانا سے کہا کہ بڑے اداروں میں نچلی سطح پر نظام ذرا دیر اور مشکل ہی سے قابو میں آتا ہے خصوصاً جبکہ انقلاب کی صورت پیش آگئی ہو، نئے سرے سے اعلیٰ پیمانے پر نظم و ضبط قائم کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ میری اس بات پر مولانا مجھ ہی پر برس پڑے اور کہنے لگے کہ آپ تو صفائی دینے لگے مولانا کی بات پر میں نے خاموش ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی کیونکہ اگر میں بھی بھڑک اٹھتا تو ہفتہ عشرہ کے لئے تعلقات تعطل کا شکار ہو جاتے جیسا کہ ماضی میں بارہا یہ صورت پیش آئی لیکن مولانا اپنی زندہ دلی، خوش مزاجی یا پُربہار طبیعت کی وجہ سے تجدیدِ تعلقات کی کوئی نہ کوئی پُرلطف صورت نکال ہی لیا کرتے تھے بہرحال میں نے معاملے کی نزاکت کے پیشِ نظر کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیا کہ مولانا کو ہنسی آگئی اور کمرے کا ماحول دوبارہ خوشگوار ہوگیا۔

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

مولانا وحید الزماں مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں علمی ادبی تربیتی اور تعمیری و انتظامی امور کچھ اس طرح باحسن وجوہ انجام دیئے کہ حیرت ہوتی ہے اسی کے ساتھ ممکن ہے بعض امور میں کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہوں پھر بھی بہ تقاضائے امر "اذکروا محاسن موتٰکم" ان لغزشوں سے صرفِ نظر ہی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے، ان کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کی تکمیل کی شکل پیدا فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے جن کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کی وفات سے دارالعلوم دیوبند یا دیوبند میں جو خلاء پیدا ہوا اس کے احساس کے ساتھ بے اختیار زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

مشاہد کے قلم سے

وحیدِ زماں

شمعے کہ سوخت خود را گداخت بزم افروخت

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کے بارے میں لکھنے والے لکھیں گے، ان کے شاگرد بھی، معتقد بھی، ہم عصر بھی، ہم درس بھی، متاثرین بھی اور متعلقین بھی، مگر بالعموم یہ سب لکھنے والے مرحوم کی حیاتِ مستعار کے اس حصہ پر روشنی ڈالیں گے جو ان کی تدریسی، تصنیفی، تحریکی اور جماعتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ راقم کا ان سے واسطہ و رابطہ ایک دہائی سے زیادہ مدت تک رہا۔ جو سراسر اس خاص گوشۂ حیات سے تعلق رکھتا ہے جس میں احقر اور چند دوستوں کے علاوہ کوئی اور دوسرا فرد ہماری طرح شریک و سہیم نہیں تھا، جس طرح ہم نے انھیں دیکھا اور برتا ہے۔ اس سلسلے کی چند یادیں اور باتیں جو ذہن اور حافظہ میں محفوظ تھیں۔ وہ تبِ سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

سنہ ۵۳ء ۵۴ء میں احقر کی دیوبند آمد و رفت ہوئی تو جناب فرید الوحیدی اور خالد سیف اللہ صاحب کی گفتگوؤں میں پہلی بار مولانا وحید الزماں کیرانوی کا تذکرہ سنا جو کسی انقلابی ذہن رکھنے والے طالب علم کے ہنگامہ ہائے رستاخیز کی دلچسپ سرگرمیوں اور موافق و مخالف گروہوں کے نقطہ ہائے نظر کے تحت تائیدی اور تنقیدی تبصروں پر مشتمل تھا۔ اپنا مزاج اگرچہ کبھی بھی انقلابی نہیں رہا مگر تجسس اور تفرد کے جراثیم سے پاک بھی نہ تھا۔ ایسے نوجوان جو اپنی راہ خود نکالنے اور مقاصد و منازل کی نئی بلندیاں تلاش کرنے کے خوگر تھے وہ اپنی دلچسپیوں کا محور بنتے اور ان سے ایک طرح کی ہم آہنگی کا احساس پیدا ہوتا ــــ چنانچہ یہاں دیوبند کے ماحول میں مولانا وحید الزماں صاحب کے تذکرے سن کر ان سے ملنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ پھر سنہ ۵۵ء سنہ ۵۶ء کے دوران راقم الحروف کا کافی وقت دہلی میں گذرا۔ وہاں قیام کے دوران اکابر جمعیۃ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمان عثمانی اور مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی مجلسوں میں گاہ بہ گاہ حاضری کا

موقع ملا۔ نیز اسی زمانے میں معروف احراری رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی چاندنی چوک کے کوچہ رحمان میں سکونت پذیر ہو چکے تھے، ان کے ہاں احقر کے ایک خاندانی بزرگ اور معروف قانونی و سیاسی شخصیت قاضی محمد احمد کاظمی بھی الہ آباد سے آکر کچھ دن قیام کرتے، وہیں ان دونوں حضرات سے بھی استفادہ اور ملاقات کے لئے کبھی کبھی جانا ہوتا۔ یہاں اس بات کی وضاحت غالباً بے محل نہ ہوگی کہ احقر کی ذات میں تو اپنی جگہ کوئی بات ان بزرگان ذی احتشام کے لئے چنداں قابل التفات نہ تھی۔ مگر والد گرامی قدر کی نسبت سے ان حضرات کی شفقتیں اور عنایتیں کچھ نہ کچھ احقر کے شامل حال ہوتیں۔ چنانچہ اس تعلق سے مولانا حبیب الرحمان صاحبؒ کے یہاں حاضری کی بدولت مولانا وحید الزماں صاحبؒ سے بھی بالمشافہ تعارف و گفتگو کی راہ باز ہوئی ۔ مسلسل ملاقاتوں کے بعد ان کی ذہانت و ذکاوت، روشنی طبع، علمی استعداد اور لیاقت و صلاحیت کا خوشگوار تاثر پیدا ہوا پھر موصوف ہی کے توسط سے ان کے شامی استاد جناب مامون دمشقی سے نیاز حاصل ہوا۔ جن سے مولانا مرحوم نے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں عربی زبان و ادب کے سلسلے میں خصوصی استفادہ کیا تھا اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں احقر نے دارالعلوم میں مقیم و مبعوث ازہر مصری اساتذہ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی کے یہاں داخلہ لیا تو یہاں مولانا ابوالحسن صاحب بارہ بنکوی احقر کے رفیق درس اور محب خاص تھے، اس عرصہ میں مولانا وحید الزماں صاحب بھی دہلی سے دیوبند منتقل ہو چکے تھے چنانچہ مولانا مرحوم کی قیام گاہ پر مولانا بارہ بنکوی کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ دیوبند میں موصوف کے ساتھ تعلق و ارتباط کے بعد ان کی خصوصیات اور مزاجی کیفیات کا بہت قریب سے اندازہ کرنے کے مواقع ملے۔ دیوبند میں موصوف کا قیام جامع مسجد کے عقب میں دیوبندی شیوخ کی ایک مشہور شخصیت حافظ ظہیر صاحبؒ کی بیٹھک میں تھا۔ جہاں مولانا مرحوم نے مشاغل تالیف و تصنیف کے ساتھ سلسلۂ تدریس و تعلیم بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے انقلابی ذہنیت رکھتے تھے اور دارالعلوم کے معاملات میں نقد و تبصرہ ان کی بات چیت کا غالب حصہ رہتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ فکر معاش سے غافل نہ تھے البتہ آزاد معاش کے قائل ہونے کی بنا پر کسی کی احسان مندی اور ممنونیت کو گوارا نہ کرتے۔ دیوبند میں انھوں نے کتابت و تصحیح کے ذریعے اور کچھ چھوٹی چھوٹی دینی کتابیں لکھ کر اور ان کے حقوق اشاعت فروخت کر کے اپنے مصارف پورے کئے بلکہ اکثر و بیشتر قرض سے اپنی ضرورتیں پوری کیں لیکن قرض کے لینے اور دینے میں کبھی کسی قرض دہندہ کو اس کا احساس نہ ہونے دیا کہ اس قرض کی ادائیگی دوسرے قرض کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔ اسی وقت انھوں نے اپنا ادارہ اشاعت دارالفکر کے نام سے قائم کیا۔ جہاں طلبۂ دارالعلوم کو جدید عربی سکھانے کا کام بڑے ذوق و شوق سے انجام دیتے رہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

ان کا انداز تربیت خوردان کے لئے اپنے گھرانے میں جس طرح کا تھا اس وقت سامنے آیا جب قیام دیوبند کے کچھ دنوں کے بعد مولانا مرحوم کے تین چھوٹے بھائی بھی تعلیم کے لئے یہاں آگئے جو آج ان کے فیض تربیت کے نتیجے میں اپنے اپنے ذوق وصلاحیت کے لحاظ سے برسرروزگار ہیں۔ عمید الزماں صاحب اور فرید الزماں صاحب عرب سفارت خانوں میں ذمہ دارانہ خدمات انجام دے رہے ہیں اور ڈاکٹر معید الزماں صاحب دیوبند ہی میں "دار الشفاء قاسمی" کے تحت خدمت خلق میں مصروف ہیں۔ ان تینوں بھائیوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل مرحوم برادر معظم کی نگرانی میں کی، چنانچہ ان پر مولانا مرحوم کی چھاپ اس حد تک پڑی کہ جس شخص کی بھی دو چار ملاقاتیں مولانا مرحوم سے ہوگئیں وہ کسی پیشگی تعارف کے بغیر ان برادران عزیز سے ملتا تو وہ ان کے رہن سہن اور طرز گفتگو سے یہ سمجھ لیتا کہ یہ مولانا ہی کے اخوانِ عزیز ہیں۔

پھر یہ منظر بھی سامنے آیا کہ مولانا مرحوم کے والد ماجد مولانا مسیح الزماں صاحب قاسمی جو اکابر کے صحبت یافتہ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے خصوصی مجلس نشین تھے، زمیندارانہ ماحول کے پروردہ ہونے کی وجہ سے سخت گیر اور ضابطہ پسند طبیعت کے ساتھ اطاعت طلب خوئے مربیانہ کے مالک تھے اور ان کا یہ بے لچک رویہ اپنے خوردوں اور متعلقین کے ساتھ پہلے دن سے تھا لیکن بڑے صاحبزادے ہونے کے ناطے اس کی زد پر سب سے زیادہ مولانا وحید الزماں صاحبؒ ہی رہتے۔ تاہم فرماں برداری والدین کا مثالی نظارہ بھی یہیں دیکھنے میں آیا کہ مولانا مرحوم والد محترم کے سامنے دست بستہ مؤدب حاضر رہتے اور ہر آن سر تسلیم خم رکھتے، ادھر والد مکرم کی جانب سے کسی امر کا اشارہ ہوتا اور ادھر اسی آن لازماً اس کی تعمیل ہوتی۔ غرض تربیت کی اس بھٹی سے مولانا وحید الزماں کندن بن کے نکلے اور پھر بڑے بھائی کی سرپرستی میں یہ برادران وحید بھی تپ تپا کر باہر آئے مگر ان کی تربیت میں تپش کے ساتھ برادر معظم کی شفقت و دلداری کی خنکی بھی شامل تھی۔

اس دور میں مولانا مرحوم سمیت جن چار ہم نشینوں پر "چار یار" کی اصطلاح بھی چسپاں کی جاتی تھی ان میں مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم، نفاست پسندی، دوست نوازی، فراخ دستی، بلند حوصلگی اور انتظامی صلاحیت کے حامل، دوسرے قاری علاء الدین صاحب مدنی کتب خانہ کے منیجر ایک خاص سیاسی حلقہ سے وابستگی کے باوجود یاروں کے یار اور اپنی آزادانہ رائے کے مالک، تیسرے مولانا ابو الحسن بارہ بنکوی اپنی استعداد اور زبان وادب کی صلاحیتوں کے ساتھ شعلہ مزاجی، گرم گفتاری اور اخلاص مندی سے آراستہ اور یہ خاکسار قلم طراز۔ اپنی خاموش طبعی، صلح جوئی، دقیقہ سنجی اور بذلہ گوئی میں متہم۔ یہ ارکان اربعہ ہر جمعرات کو ہفتہ واری مجلس طعام یا دعوتِ شیراز میں شریک ہوتے، جہاں یہ اخوان الصفا اپنے یہاں سے کھانا لاتے اور دار الفکر

میں ایک دسترخوان پر بیٹھ کر ٹیبل ٹاک کا لطف اٹھاتے جو مولانا مرحوم کا مستقر تھا جہاں ہر موضوع پر باہمی مذاکرہ اور گفتگو کا سلسلہ مغرب سے عشاء تک بلکہ عشاء کی نماز کے بعد بھی خاصی دیر تک جاری رہتا۔ یہیں مولانا مرحوم کے جاری کردہ ماہنامہ "القاسم" جدید کے مضامین کا انتخاب، اداریہ اور تبصرہ و ترتیب پر مشاورت ہوتی، بعض اوقات مولانا بارہ بنکوی کی بدولت دلچسپ اور دوستانہ نوک جھونک سے یہ مجلس بڑی پرلطف بن جاتی۔ راقم الحروف کا تعلق "القاسم جدید" کی ادارت سے ان تینوں احباب کی خواہش اور اصرار کے بعد ہو گیا تھا کہ اس سے قبل دیوبند سے نکلنے والے ماہنامہ "تذکرہ" کے قانونی مدیر تو مولانا نجم الدین اصلاحی تھے مگر عملاً کچھ عرصہ تک پرچہ کی ترتیب اور اداریہ کا تعلق احقر ہی سے رہا جس نے بظاہر ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ اسی بنا پر "القاسم جدید" سے بھی وابستگی ہوئی اور اس کے بعض اداریے اور تبصرے بھی خاصے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے اور حلقۂ دیوبند میں دیر تک موضوع بحث رہے۔ یہ دور مولانا مرحوم کی وضعداری کی خاص شان رکھتا تھا۔ وہ خود مقروض اور تنگ دست ہو کر دوستوں کے لئے قرض لیتے اور ان کی ضرورت پوری کرتے۔ معاشی حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود وہ اپنے رہن سہن اور طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آنے دیتے؛ صاف شفاف لباس، شائستہ گفتگو، دوٹوک بات چیت اور تنقیدی مزاج کے ساتھ وہ ہر جگہ "وحید الزماں" کی حیثیت سے اپنی اک پہچان رکھتے تھے۔

انہی خصوصیات نے انھیں دارالعلوم میں آنے سے پہلے دارالعلوم کے حلقہ میں اچھا خاصا متعارف کرا دیا تھا۔ نیز جدید عربی کی کلاسیں کھولنے، طلبا کے ساتھ ہمدردانہ اور شفقت آمیز رویہ برتنے اور امداد و تعاون کی روش نے انھیں طلبا میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ مولانا مرحوم کا اپنا ایک ذہن تھا جو طے کر لیتے اس کو ہر قیمت پر عملی جامہ پہنانے کی سعی کرتے، دھن کے پکے اور ارادہ کے پختہ تھے۔ وہ انقلابی فکر رکھتے تھے مگر سیاسی مزاج کے حامل نہ تھے اس لئے جماعتوں اور پارٹیوں کے ساتھ دور تک اور دیر تک چلنا ان کے بس کا نہ تھا۔ بلاشبہ یہ بات محتاج بحث نہیں رہی کہ دارالعلوم کے سلسلہ میں مرحوم کا استحصال جس طرح کیا گیا اور جس طرح انھیں دودھ کی مکھی کی طرح دارالعلوم سے باہر نکال دیا گیا اس نے انھیں وقت سے پہلے توڑ پھوڑ کر بستر مرگ پر لا ڈالا۔ وہ تبدیلی اور تغیر کے ضرور داعی تھے۔ مگر سیاسی ہتھکنڈوں کو طبعاً ناپسند کرتے، دل کی بات بلا تکلف زبان پر لانے کے عادی تھے، سیاسی لوگوں کی طرح منافقت انھیں چھو کر نہیں گئی تھی، اس لئے بعض اوقات ان کی صاف گوئی تیزی و تندی تک جا پہنچتی تو سامعین کے لئے اس کا حلق سے نیچے اتارنا مشکل ہوتا۔

وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے دیوبند کو "قاسمیت" کا ایک نمونہ دیکھنا چاہتے تھے اور قاسمیت

پر ان کے یہاں بڑا زور تھا۔ ہنگاموں کے دوران جب ان کی صف کے بعض افراد نے اس نسبتِ قاسمیت کا رشتہ دار العلوم سے کمزور کرنے اور مسلّمہ تاریخی حقیقت کا رویہ بدلنا چاہا اور ایک چھوٹا سا طبقہ جماعت دیوبند اور اس کی تحریک کو فکر و دانش اور علم و فضل کے قاسمی سرچشمہ سے جدا کر کے محض ایک روحانی شخصیت اور گوشہ نشین بزرگ کی حد تک محدود کرنے پر مصر ہوا تو مرحوم نے بڑے شد و مد سے اس کا دفاع کیا۔ اس وقت ان کی بات میں وزن تھا اور ان کے ساتھ جماعت کے جو لوگ لگے ہوئے تھے وہ ان کی رائے اور فکر کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ مرحوم کے نزدیک بات کسی مدرسہ کے آغاز اور بنا کی نہ تھی بلکہ جو چیز دارالعلوم دیوبند کے نام متعارف ہوئی اور جس کا خاکہ اور نقشہ قاسمی ذہن نے استوار کیا تھا اور جس کو شیخ الہند، حکیم الامت حضرت تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب جیسے نامور اور مشہور عالم نابغۂ روزگار فرزند پیدا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ اصلاً حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے عبقری وقت کے حکیمانہ ذہن کا آفریدہ اور اکابرین وقت و ہم عصران حجۃ الاسلام کی بصیرت مندانہ تائید و نصرت سے ہی بروئے کار آیا تھا جسے برصغیر میں قبول عام نصیب ہوا پھر اس کو عالمگیر شہرت نے بام عروج تک پہنچایا۔

اس خاکسار کا اپنا مطالعہ یہ ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحب اپنے مزاج کے اعتبار سے دارالعلوم کی آہستہ روی اور قدیم طرزِ نظم و نسق سے مطمئن نہ تھے۔ وہ قدیم و جدید کے امتزاج تعلیم و تربیت کے جدید اور مؤثر منصوبوں، تعمیر و تنظیم کے نتیجہ خیز اور مربوط لائحۂ عمل پر مشتمل نصاب و نظام دارالعلوم کا ایک تصور رکھتے تھے ان کا دل اصلاح و اقدام کے جذبے سے لبریز تھا وہ پیش روی اور تیز گامی کے قائل تھے، ادھر دارالعلوم قدیم سے جس ڈھنگ اور طرز پر گامزن تھا اس کے کار پرداز اسی کو اکابر کی تجویز کردہ راہ مستقیم سمجھ کر مصروف عمل تھے جس میں گاہ بگاہ حالات و مسائل کے پیش نظر وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی روا رکھنے کی کوشش کی گئی۔ مگر بحیثیت مجموعی ادارہ کی روش مولانا مرحوم کے پرجوش جذبات ان کے بلند مقاصد اور مجوزہ نقشہ ہائے فکر و عمل سے ہم آہنگ نہ تھی۔ تاہم میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ مرحوم کا دارالعلوم کی اس وقت برسرِ عمل انتظامیہ کے ساتھ صحیح سیاق و سباق کے تحت مناسب انداز میں رابطہ قائم نہیں ہونے دیا گیا ورنہ یہ تکلیف دہ حادثہ پیش نہ آتا۔ جس نے جماعت دیوبند کو اندوہناک صورت حال سے دوچار کر دیا اور مولانا وحید الزماں صاحب جیسی باصلاحیت شخصیت کو ایسے المناک حالات سے گذرنا پڑا شاید جماعت دیوبند کے حلقوں میں راقم کی اس رائے سے سب ہی لوگوں کو پوری طرح اتفاق نہ ہو، تاہم مولانا مرحوم کے ساتھ احقر کو اس زمانے میں نشست و برخاست اور تبادلۂ خیال کا خاصا موقع ملا جب دارالعلوم کے بارے میں ان کے تصورات

(بقیہ صـ ۱۰۲ پر)

مولانا عبد اللہ سورتی

رفیقِ محترم

۴۹-۴۸ء۱۹ میں بندہ ڈابھیل جامعہ سے دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا۔ کافیہ، نفحۃ الیمن، مرقات وغیرہ کتب کا امتحان دے کر کنز الدقائق، شرح جامی، نفحۃ العرب، اصول الشاشی میں داخلہ لیا۔ باب قاسم (صدر دروازہ) سے داخل ہوکر بائیں جانب مطبخ کی طرف جو راستہ تھا وہاں سے دروازہ کے اوپر کے حصہ میں ایک کمرہ تھا جس میں مولوی اسمٰعیل عبد الرزاق افریقی اور ان کے ساتھی حافظ اسمٰعیل افریقی مقیم تھے۔ بندہ بھی چند ماہ ان کے ہمراہ اسی کمرہ میں رہا تھا بعد میں دار جدید نمبر ۲۶ میں جگہ مل گئی تھی۔

مطبخ کی طرف جاتے ہوئے کتب خانہ کے سامنے دو کمرے تھے جن کی دیواریں کچی تھیں اور چھت پر بھی مٹی پاٹی گئی تھی۔ اسی کمرہ میں دو تین مظفر نگری طلبا مقیم تھے، جن میں مولانا وحید الزماں کیرانوی اور اشفاق صاحب کے نام یاد ہیں۔ مطبخ میں کھانا لینے دونوں وقت اسی کمرے کے سامنے سے گذر ہوتا تھا۔

نفحۃ العرب کے سبق میں مولانا بھی ہمارے شریک درس تھے، اس لئے ان کے کمرے سے گذرتے ہوئے علیک سلیک اور تھوڑی دیر گفت گو ضرور ہوتی، کمرہ میں چٹائی بچھائی ہوئی تھی اور ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی نظر آتی تھی، مولانا ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن فرماتے اور اپنی نشست و برخاست اور گفتار و رفتار میں بھی عام طلباء سے الگ نظر آتے، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوتی اور گفت گو میں سنجیدگی ہوتی ویسے مولانا کم آمیز اور یکسوئی پسند تھے مگر دوستوں سے ملتے تو پوری بشاشت سے پیش آتے۔

عربی زبان کا بہترین ذوق، اسباق میں پابندی، اساتذہ کے ساتھ ادب واحترام کا سلوک اور امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی کے سبب سب ہی اساتذہ مولانا کو چاہتے اور ان کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے۔

• سابق مہتمم دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر (گجرات)

ہماری یہ رفاقت صرف ڈیڑھ سال رہی، اس لئے کہ شرح وقایہ، مقامات کے سال بندہ بیمار ہوگیا اور ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق درمیانی سال میں گجرات واپس آکر جامعہ ڈابھیل میں داخل ہوکر تعلیم مکمل کی۔
پھر سنہ ۱۹۵۹ء میں مولانا اسمعیل گارڈی مرحوم ڈابھیلی جو افریقہ کے معروف علماء میں تھے اور بڑے تاجر اور دارالعلوم اور اساتذہ دارالعلوم سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اپنے دو صاحبزادوں کو دارالعلوم میں بغرض تعلیم بھیجا اور بندہ کو ان کے ساتھ نگرانی اور تربیت کے لئے مقرر کیا۔ مولانا وحید الزماں صاحبؒ بھی اس وقت تکمیل فرماکر جامع مسجد کے قریب دارالفکر نامی ایک ادارہ شروع فرماچکے تھے۔ اور دارالعلوم کے بہت سے طلباء عربی زبان سیکھنے دارالفکر جانے لگے تھے۔

مولانا کے اچھوتے طرز تعلیم اور طلباء کی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کرنے ان کو نظم وضبط کا پابند بنانے، عربی تلفظ درست کرنے اور مختصر وقت میں عربی رسم الخط میں ماہر بنانے وغیرہ جیسی کئی خصوصیات کے سبب دارالفکر اور مولانا کا چرچا دارالعلوم کی چہار دیواری میں عام ہونے لگا تھا۔ بندہ کو بھی مولانا کے اس ادارہ کا علم ہوا تو ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ درمیان میں کافی عرصہ گذر جانے کے باوجود مولانا کو پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ اور بہت ہی پرتپاک طریقہ سے گلے ملے اور مسرت کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد بار بار دارالفکر میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا طلباء سے جس طرح ملتے اور جس طرح ان کی تربیت فرماتے وہ مدارس کے عام اساتذہ کے درمیان میں کم ہی دیکھنے اور سننے کو ملا۔ خوش طبعی اور کشادہ دلی سے بات چیت کرنے کے باوجود ادب واحترام اور نظم وضبط میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی، ضرورت کے موقع پر مولانا کا لب ولہجہ سخت بھی ہوجاتا تھا مگر طالب علم کو کبھی ناگوار نہ ہوتا، اور مولانا کی محبت وعظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آتا تھا۔

اسباق کے ختم ہوتے ہی مولانا چائے کا نظم فرماتے اور اس میں بھی ان کی نفاست پسندی اور خوش ذوقی کا پورا نمونہ سامنے آتا۔ بہر حال مولانا کی ان صحبتوں اور مجلسوں سے ناچیز کو علمی اور انتظامی بہت سے امور میں کافی نفع پہنچا اور دارالعلوم سے واپسی کے بعد ڈابھیل کی تدریس اور دارالعلوم فلاح دارین کے اہتمام کے زمانہ میں ان میں سے بہت سی باتیں میرے لئے بڑی کار آمد ثابت ہوئیں۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

۱۹۶۱ء میں بندہ پھر ڈابھیل جامعہ میں مدرس ہوکر چلا گیا اور ۱۹۶۶ء میں دارالعلوم فلاح دارین میں پہلے مدرس اور پھر اہتمام کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ اس کے بعد ہر سال دارالعلوم فلاح دارین کے کاموں کے لئے دیوبند کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اب مولانا وحید الزماں صاحب بھی دارالعلوم میں تشریف لاچکے تھے، اس لئے تعلیمی امور اور مدرسہ کے نظم ونسق کے سلسلے میں بھی ان سے مشورے ہوتے رہتے۔

مولانا مدارس عربیہ کے ناقص طرز تعلیم اور طلباء کی ذہن سازی و کردار سازی میں پھیلی کوتاہیوں کا بار بار تذکرہ فرماتے، جس سے ان کے دل میں امت کے نونہالوں اور قوم کے جگر گوشوں کی ہمدردی اور ان میں صلاحیت پیدا کرنے کی دلی تڑپ محسوس ہوتی تھی، بہت درد سے فرماتے تھے کہ بھائی امت کا بہترین سرمایہ ہماری کوتاہیوں اور ناکردگی کے سبب ناکارہ بنتا جارہا ہے، ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔ خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے طلباء میں وہ انقلابی تبدیلیوں کے خواہاں تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں جو تبدیلی ہوگی اس کا اثر برصغیر اور دیگر ممالک پر بھی پڑے گا۔

مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ نے پوری جانفشانی اور انتھک محنت کرکے دارالعلوم دیوبند کے طلباء میں ایک نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا فرمایا اور طلباء کی ایک اچھی خاصی تعداد عربی زبان اور مولانا کے طرز فکر کو لے کر ہندوستان اور بیرون ہند پھیل گئی۔ دارالعلوم فلاح دارین کے شعبۂ عربی اور النادی العربی کے لئے ہم نے مولانا سے استاذ طلب کیا تو مولانا نور محمد دیوریاوی صاحب کو بھیج دیا۔ جنھوں نے مولانا کی ہدایات اور طرز پر طلباء میں اچھا خاصا عربی زبان کا ذوق اور انتظامی صلاحیتیں پیدا کیں۔ النادی العربی کے باقاعدہ ہفتہ واری، ماہانہ اور سالانہ جلسے ہوتے رہے۔

ہم نے حضرت مولانا وحید الزماںؒ کو النادی العربی کے سالانہ جلسہ کے لئے مدعو کیا تاکہ ان کے مشوروں اور رہنمائیوں سے استفادہ کرکے مزید بہتری پیدا کرسکیں۔ انتہائی مصروفیات کے باوجود حق رفاقت ادا کرنے اور عربی زبان کی ترویج و ترقی میں تعاون کرنے کی خاطر دعوت منظور فرمالی۔ اور طلباء و اساتذہ سے مفید تبادلۂ خیال فرماتے رہے۔

مولانا کو اپنی محنت کا کچھ ثمرہ اور اپنے طرز فکر کا تھوڑا عکس دارالعلوم فلاح دارین میں نظر آیا تو انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔ معائنہ بک میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً۔ ہندوستان میں دینی عربی مدارس کی کمی نہیں ہے، ہر صوبہ اور ہر علاقہ میں روز بروز ان اداروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ اس روزافزوں تعداد کے باوجود اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات کو ایسے مدارس کی تلاش و جستجو رہتی ہے جو محض کثرت تعداد کا باعث نہ ہوں، بلکہ وہ اپنے معیار تعلیم اور طرز تربیت میں امتیازی مقام رکھتے ہوں۔ دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، گجرات ان چیدہ معاہد اسلام میں سے ہے جنھوں نے بہت ہی مختصر عرصہ میں اپنے معیار تعلیم اور نظام تربیت میں خصوصی مقام حاصل کیا۔ احقر کو پہلی بار (۲۰؍ جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ) کو حاضری کا موقع ملا۔

یہاں کے اساتذہ اور طلبار سے مختلف مجلسوں میں مختصر اور طویل ملاقاتیں ہوئیں، درس گاہوں میں جانے اور طلبا سے مختلف موضوعات پر سوالات کا بھی اتفاق ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے یہاں وہ سب کچھ پایا جو میرے دل کی آواز تھی۔ درس گاہوں کا انتظام، اساتذہ کی تعلیمی دلچسپی اور طلبار کے ساتھ غیر معمولی محنت چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام اور ان کی خصوصی تربیت، صفائی، ستھرائی، پابندی اوقات، مدرسین اور اساتذہ کا آپس میں ربط اور تعلق یہ وہ سب خصوصیات ہیں جو عام طور پر کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

دارالعلوم فلاح دارین نے جس طرح علوم وفنون کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی ہے اور ان کے لیے لائق اساتذہ کا انتخاب کیا ہے ایسے ہی عربی زبان وادب بھی اس کا خاص مرکز توجہ ہے۔ یہاں کے طلبہ نے اپنی عربی انجمن (النادی العربی) کے زیر اہتمام منعقدہ اجلاس میں جو عربی پروگرام پیش کیا وہ واقعی میری توقعات سے بڑھ کر اور ہر طرح قابل ستائش تھا، زبان کی صحت، طرز تکلم کی عمدگی اور برجستگی ہر طالب علم کے کلام میں نمایاں تھی۔ طلبہ کا یہ کامیاب پروگرام بلاشبہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کے اساتذہ اور سرپرست حضرات نے ان کے ساتھ غیر معمولی محنت کی ہے۔

کسی بھی ادارہ کے طلبہ کی صلاحیت اور علمی برتری اس کے ذمہ داروں کی محنت اور ان کے خلوص کی دلیل ہوتی ہے۔ میری قطعی رائے ہے کہ جس طرح اس دارالعلوم نے اپنی بہت ہی مختصر عمر میں تعمیری، تعلیمی اور تربیتی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے، وہ اگر اسی جذبہ، اخلاص اور محنت وجانفشانی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہا تو ان شاء اللہ اس علاقہ کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا ایک مثالی دارالعلوم ہوگا اور نئی پود اس سرچشمۂ علم وفن سے فیضیاب ہوتی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کے مؤسس کو اور منتظمین ومدرسین حضرات کو زیادہ سے زیادہ اخلاص عطا فرمائے اور اس ادارہ کی ترقی کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا فرمائے۔ آمین۔

احقر وحید الزماں کیرانوی

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ ۱۲ جولائی ۱۹۷۴ء

مولانا کے اخلاص اور دارالعلوم دیوبند کے لئے بے پناہ جد وجہد کے سبب دارالعلوم کا ہر بہی خواہ ان سے بے حد محبت کرنے لگا اور مولانا کو ترقی ملتی رہی تا آں کہ نئے نظام کے قیام کے بعد مولانا کو تعلیمی تعمیری کاموں کے ساتھ اب نیابت اہتمام کی بھی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ مولانا سے تعلق اور ان کی بھرپور صلاحیتوں کے سبب دارالعلوم کو فائدہ ہونے سے بندہ کو طبعی مسرت ہوئی اور مبارکبادی کا عریضہ روانہ کیا۔ مولانا نے اس کا یہ جواب لکھا:

برادرِ مکرم مولانا عبداللہ صاحب زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی مودت نامہ ملا۔ آپ کی محبت ومکرمت کا پہلے سے قائل ہوں، میں موجودہ ذمہ داریوں کا اہل تو نہیں ہوں اور صحت بھی خراب رہتی ہے مگر احباب اور اکابر کے اصرار پر خدا کے بھروسہ کام کا آغاز کردیا ہے۔ ہر دم آپ جیسے مخلصین کی صرف دعا کا ہی نہیں عملی تعاون کا بھی محتاج ہوں۔ امید ہے کہ مجھے اس میدان میں تنہا نہ چھوڑا جائے گا۔

آپ کی تالیف لطیف کے ایک حصہ کا مطالعہ کیا تھا پھر باقی کو پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ جب مؤلف ہی ثقہ اور قابلِ تعریف و اطمینان ہے تو بلاشبہ تالیف بھی ایسی ہی ہوگی، آپ نے اپنے وطن اور علم کا ایک حق واجب ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس حسن خدمت کو قبولیت عطا فرمائے اور توفیق مزید سے نوازے۔

جملہ پرسانِ حال، مدرسین حضرات سے سلام مسنون، طلبہ سے بھی۔

والسلام
مخلص وحید الزماں

اس کے بعد پھر دیوبند کا سفر ہوا۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ دیوبند کا سفر ہو اور مولانا سے ملاقات نہ کریں حسب معمول دولت کدہ پر حاضر ہوا تو باوجود ہجوم کار ڈیڑھ گھنٹہ مجلس رہی۔ دارالعلوم کے احوال اور درپیش مسائل پر گفتگو فرماتے رہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کو حسب منشا رفقار کار نہ مل سکے اور مولانا حالات میں تبدیلی کے جو ارادے رکھتے تھے اس میں موانع پیش آتے رہے، جس کا ان کی حساس طبیعت پر بہت اثر پڑا، بہر حال مولانا نے اپنے اس حقیر رفیق کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ مجلس کے اختتام پر دریافت فرمایا کہ آئندہ کل کیا پروگرام ہے؟ عرض کیا کہ علی گڈھ جانے کا قصد ہے، مسکرا کر فرمایا واہ واہ ہم بھی کل علی گڈھ ہی جانے والے ہیں، اور آپ بھی ہمارے ساتھ کار میں چلیں گے۔ مجھے بھی مولانا کی معیت میں یہ سفر نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوا۔

غالباً مولانا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے اور اسی کی کسی میٹنگ میں شرکت کرنے یا عربی شعبہ کے لئے اساتذہ کے انٹرویو کے سلسلے میں سفر فرما رہے تھے۔ راستہ میں خوب خوب دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ فضلاء دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی کے فارغین طلبہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے علی گڈھ کے طلباء میں فراغت کے بعد بھی آپس میں ایک خاص تعلق اور جوڑ رہتا ہے اور ہر علاقہ میں علیگ برادری کی

انجمنیں ہیں اور اس طرح کا تعلق قاسمی فضلاء میں نہیں ہے، فضلاء دارالعلوم دیوبند میں اگر صحیح طریقہ سے ربط ہو تو عظیم کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

اسی سفر میں بندہ نے عرض کیا کہ دارالعلوم کے بعض نامور فضلاء، عرب اور دیگر ممالک میں بہترین علمی کام کر رہے ہیں مگر خود دارالعلوم دیوبند کے ترجمان رسائل اور ذمہ داروں کی طرف سے ان کی اتنی ہمت افزائی نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہیں۔ ندوۃ العلماء کے فضلاء کی خدمات کو ارباب ندوہ اور اس کے عربی اردو ترجمان جس طرح پیش کرتے ہیں اس کا پچاس فیصد بھی دارالعلوم کی طرف سے نہیں ہوتا۔ حالانکہ ان کی صلاحیتوں سے خود دارالعلوم بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

بندہ نے بطور مثال ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی، مولانا اسمٰعیل افریقی وغیرہ فضلاء کے نام لئے۔ اول الذکر کی کتابوں کا عرب فضلاء اعتراف کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر میرے علم کی حد تک دارالعلوم نے کبھی ان کو مدعو کرکے پذیرائی نہیں کی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ واقعی ان فضلاء کے بارے میں مستقل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے مجھے بھی اس کا خیال آتا ہے مگر تنہا ایک شخص کس کس پہلو کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔ واقعی مولانا کی بات صحیح تھی کہ ان کی ذات کی مثال ایک انار اور صد بیمار کی مصداق ہو کر رہ گئی تھی۔

علی گڈھ پہنچ کر مولانا کو تو یونیورسٹی کی کارروائی میں شرکت کرنی تھی۔ ناچیز کو مہمان خانہ ساتھ لے گئے اور وہاں کے ذمہ داروں سے وقیع الفاظ میں تعارف کرایا جس کا میں قطعاً مستحق نہیں تھا، مگر مولانا کی شرافت نفس اور ان کی بلندیٔ کردار تھی کہ اپنے قدیم رفیق کی عزت افزائی فرما کر اس کی جملہ سہولتوں کا خیال فرمایا۔ اس دور میں بہت سے لوگ جب کسی بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو اپنے ساتھیوں اور رفقاء کو فراموش کر دیتے ہیں۔ مگر مولانا کو ہمیشہ دیکھا گیا کہ جو تعلق طالب علمی کے دور میں قائم ہوا مولانا اسے زندگی کے آخری دور تک اسی طرح بلکہ شاید پہلے سے بھی بہتر طریقہ سے نبھاتے رہے۔ یہ بات ان کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے جو بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

وقت گذرتا گیا ادھر مولانا کی علالت کی مسلسل خبریں آتی رہیں۔ اسی دوران پھر دیوبند کا سفر ہوا اور اگلی صبح مولانا کی عیادت کے لئے ان کے دولت کدہ پر حاضری کا قصد کیا، مگر بعض طلباء نے بتلایا کہ مولانا آج کل کسی سے ملاقات نہیں کرتے اس لئے وہاں جانا بیکار ہے، بندہ تھوڑی دیر سوچتا رہا اور پھر مکتبہ حسینیہ پہنچا، جو مولانا کا ہی مکتبہ تھا اور وہاں موجود ایک صاحب سے عرض کیا کہ آپ صرف مولانا سے یہ عرض کر دیں کہ عبداللہ سورتی حاضر ہوا ہے اور صرف سلام عرض کرتا ہے اور خیریت معلوم کرتا ہے۔ وہ صاحب مکان میں تشریف لے گئے اور بندہ کتب خانہ میں کچھ کتابیں دیکھنے لگا، اتنے میں پیغام لے کر آئے کہ مولانا آپ کو یاد فرماتے ہیں

بندہ گھر میں داخل ہوا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا کہ سنا ہے کہ آپ نے ملاقاتیں موقوف کر دی ہیں؟
مولانا نے مسکرا کر فرمایا کثرتِ واردین کے سبب آج کل وحشت سی ہوتی ہے مگر اپنے دوستوں کے لئے دروازہ کبھی بند نہیں کرتا اور پھر آپ ایسے لوگوں سے تو باتیں کرنے سے تو طبیعت ہلکی ہوتی ہے، اس کے بعد فرمانے لگے کہ بالکل بے تکلف پیر پھیلا کر بیٹھ جائیے، تکیہ لگا لیجئے، اور حسب عادت چائے تیار کرائی اور حالاتِ حاضرہ پر تفصیل سے گفتگو فرماتے رہے۔
مولانا کی صحت کافی خراب ہو چکی تھی اس پر حالات نے ان کو مزید نڈھال بنا دیا تھا۔ بندہ نے عرض کیا کہ مجھے تو ان لوگوں پر تعجب ہے جنھوں نے آپ کے چشمہ صافی سے تشنگی بجھائی اور آپ نے ہی ان کو قلم پکڑنا سکھایا اور وہ اب اپنا رویہ بدل رہے ہیں۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا کہ یہ تو دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ عربی کا مشہور شعر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

اعلّمہ الرمایۃ کل یوم   فلمّا اشتدَّ ساعدہ رمانی

(میں اسے روزانہ تیر اندازی سکھاتا ہوں جب اس کا ہاتھ بیٹھ گیا تو مجھے ہی تیر کا نشانہ بنا دیا)
اس شعر کو اسی طرح ہم نے اساتذہ سے سنا تھا اور یاد کیا تھا مگر صاحب تثقیف اللسان نے لکھا کہ دوسرے مصرعہ میں اشتدّ غلط ہے استدّ ہے۔)
بہر حال ہم سال سے زائد مدت کے تعلقات اور سفر و حضر میں بعض اوقات رفاقت اور ان کے ساتھ علمی، تربیتی، انتظامی موضوعات پر تفصیلی گفتگو کے سبب یہ بات بندہ کے مشاہدہ میں آئی جس میں ذرہ برابر مبالغہ یا بے جا مدح سرائی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سی ایسی خوبیوں اور بلند صفات سے نوازا تھا جو اس دور کے بہت سے اہل علم میں نہیں پائی جاتیں۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ
ان کی مرنجان مرنج شخصیت، مثالی کردار و اخلاق، تعلیم و تربیت کے انوکھے اور مؤثر طریقے وغیرہ صفات میں وہ بلاشبہ اپنے اقران و احباب میں بہت ممتاز تھے، ان کی باوقار مگر دلکش شخصیت نے ہزاروں انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اگر مدارس عربیہ میں مولانا ؒ ایسی شخصیتیں پیدا ہو جائیں تو ہر طرح اور ہر لائن میں انقلاب آسکتا ہے۔ ع

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے اعمال حسنہ اور خدمات جلیلہ کو قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں بلند درجات نصیب فرمائے اور ہم لوگوں کو مولانا کے نقش قدم پر چلا کر امت کی فلاح کے لئے اپنی زندگی صرف کرنے کی توفیق عطا فرماوے۔ اللّٰھم امطر علیہ شآبیب رحمتك ورضوانك وادخلہ جناتك برحمتك وفضلك۔ آمین۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ

ان کی یادوں کے سفینے

میں جب ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو بنارس میں ریٹائر ہوا تو اسی دن سے سوچ رہا تھا کہ اپنے دیرینہ رفیق وہمدم مولانا وحید الزماں کیرانوی کو ملازمت سے سبکدوشی کی اطلاع دوں گا اور مئی میں دہلی پہونچ کر دیوبند جانے کا پروگرام بناؤں گا، مگر افسوس مجھے ۱۷ ؍اپریل کو تاخیر سے اطلاع ملی کہ مولانا اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ میں کیا بتاؤں اس اندوہناک خبر نے مجھ پر کیا اثر کیا اور کس طرح آس پاس کے لوگوں نے مجھے یک لخت ساکت وصامت دیکھا۔ اب میرا قلم لرزاں ہے، دل ودماغ میں ایک تلاطم برپا ہے، خیالات اب سے ۴۳ سال قبل کی یادوں کو سمیٹنے سے قاصر ہیں۔ مولانا وحید الزماں کا وصال کیا ہوا، ایک عالم، ایک ادیب ایک موجد، ایک فنکار، ایک مخلص، ایک حق گو اس دنیا سے اٹھ گیا۔ وہ مرد مجاہد، صدق وصفا کا پیکر، خودداری کا پاسبان، مصائب میں صبر وشکر کا علمبردار، آسانی وفراوانی میں میانہ روی کا وضعدار اب کبھی واپس نہ آئے گا۔

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

۴۳ سالہ رفاقت

آج وہ وقت وہ سماں میری نگاہوں کے سامنے ہے جب ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں قدم رکھا تو داخلہ کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے مولانا معراج الحق مرحوم کی سفارش پر برج جنوبی فوقانی میں مولانا وحید الزماں کیرانوی کے ہمراہ رہنا ہوگا۔ بس یہی ہماری رفاقت کا آغاز تھا جو الحمد للہ ۴۳ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ قضا وقدر کے حتمی فیصلہ نے اس شعلہ بیاں خادم علم وادب کو ہم سے جدا کر دیا۔

مولانا مرحوم سے میری پہلی ملاقات

داخلہ کے بعد میں مولانا معراج الحق" کا پرچہ لے کر جب برج جنوبی میں داخل ہوا تو عام طلباء کی رہائش سے بالکل مختلف سلیقہ مندی اور صفائی ستھرائی کی ایک دل آویز شکل میرے سامنے آئی۔ پورے کمرے میں صاف ستھری سفید چاندنی، ایک طرف چھوٹی سی تپائی جس پر سفید غلاف اس پر ایک قلمدان اور چند کاغذ رکھے تھے، ایک گاؤ تکیہ جو معلوم ہو رہا تھا کہ لحاف کو گول کرکے اس پر غلاف چڑھا دیا گیا ہے، جبکہ بعض کمروں میں رسّی سے بندھے ہوئے لحاف توشک میں نے چھت کے کنڈوں میں بندھے دیکھے تھے، طاق پر ایک پردہ پڑا تھا، جب چائے کی ضرورت پیش آئی تو اس میں سے ایک خوبصورت چائے دان اور شکر دان نکالا گیا۔ چاندنی پر ایک دھلا ہوا معمولی کپڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اس پر چائے کا جملہ سامان رکھا گیا اور پینے کے بعد برتن دھو کر پھر اسی طرح سجا دیئے گئے، اس ملاقات کے دوران مولانا مرحوم کی متانت، سنجیدگی اور پُروقار گفتگو نے مجھے گرویدہ کرلیا اور ہماری رہائش شروع ہوگئی۔

دو چار دن میں مجھے مولانا کی مصروفیات اور بعض ذاتی حالات کا علم ہوا تو سمجھ میں آیا کہ یہ شخص عزت وعسرت کے عالم میں سادگی کے حسن سے آراستہ معیاری زندگی اور وضع داری کا مجسمہ ہے نیز ہر حال میں سلیقہ مندی سے جینے کا ہنر رکھتا ہے۔

مولانا اس سال دورۂ حدیث کے طالب علم تھے اور میں نے موقوف علیہ میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت تک مدارس میں اسباق کی سن وار تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ مولانا کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا ان کے والد مولانا مسیح الزماں کیرانوی ؒ مرحوم نہایت باصلاحیت اور وضع دار عالم تھے، انھوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف فتح الملہم کی تیاری میں ایک باصلاحیت معاون شاگرد کی حیثیت سے کام کیا تھا مگر موصوف کے حصول معاش کا گوشہ ہمیشہ تشنہ ہی رہا بلکہ مولانا کے برادر خورد حمید الزماں مرحوم کی کوششوں سے گھر کے اخراجات چلتے تھے۔

اس زمانے میں مولانا کو دارالعلوم سے غالباً ۱۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اس کے علاوہ وہ دن میں دو تین گھنٹہ کتابت بھی کرتے تھے تاکہ وظیفہ اور کتابت سے حاصل شدہ آمدنی کا کچھ حصہ گھر کے اخراجات کے لئے فراہم کرسکیں۔ ان دنوں مولانا کیرانوی مرحوم، مولانا سید فرید الوحیدی کی نئی تالیف "رسول عربی" کی کتابت کر رہے تھے جس کا معاوضہ انھیں شاید آٹھ آنہ صفحہ کے حساب سے ملتا تھا اور اسی سلسلہ میں مولانا فرید الوحیدی صاحب خود بھی کمرہ میں تشریف لاتے اور ان کی پُرلطف گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے کمرہ لالہ زار بن جاتا۔ اکثر عصر کے بعد

مولانا فرید الوحیدی صاحب کے ساتھ مولانا خالد سیف اللہ گنگوہی بھی ہوتے۔ یہ دونوں اس زمانے میں یونیورسٹی امتحانات دینے کی جدوجہد میں لگے تھے اور عربی بولنے کی مشق بھی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی مولانا وحید الزماں صاحب کی مصاحبت میں ان لوگوں کے ساتھ ٹہلنے جاتا اور ان کی گفتگو سے محظوظ ہوتا۔

مولانا کیرانوی مرحوم کا ایک یومیہ محبوب مشغلہ عربی کے نوآموز طلبار کو عربی انشار سکھانا بھی تھا۔ اکثر میں نے دیکھا کہ مولانا ظہر کے بعد یا اس سے قبل مولانا جلیل احمد کیرانوی مرحوم کی درس گاہ کے ایک کونہ میں چند طلبار کو پڑھاتے تھے، ان طلبار میں مولانا ریاست علی بجنوری اور مولانا لقمان الحق مرحوم کے نام مجھے یاد ہیں، لیکن یہ درس تقریباً چھ سات طلبار پر مشتمل ہوتا تھا اور میرا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں عربی گفتگو یا عربی انشار پردازی کی یہی داغ بیل تھی جو مولانا کی سرپرستی میں پروان چڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے ثمرات نے برصغیر کے طول و عرض میں عربی زبان وادب کی شمع روشن کر دی۔

دارالعلوم میں مولانا کی حیثیت

چونکہ میں نے مولانا مرحوم کی بنیادی خدمات کے آغاز کو بچشم خود دیکھا اور اس زمانہ کے ماحول کے تناظر میں سمجھا اور پرکھا ہے اس لئے نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا وحید الزماں کیرانوی سے قبل دارالعلوم دیوبند میں عربی تقریر و تحریر اور انشار پردازی کا ماحول تھا ہی نہیں، وہاں جو کچھ بھی علمی یا دینی وادبی کام ہوا اس کا تعلق انشار پردازی یا عربی صحافت وغیرہ کی ذہن سازی سے نہ تھا، اور اس چھوٹی دہائی میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، اساتذہ کرام میں صرف حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ وہ واحد شخصیت تھے جو بے تکلف عربی زبان میں عربوں سے گفتگو کر سکتے تھے، اور اس کا مشاہدہ میں نے خود مصر کے انور سادات کی آمد پر کیا جب حضرت نے پورے دارالعلوم میں ان کے ساتھ گھوم پھر کر ایک ایک چیز کا تعارف کرایا تھا اس کے علاوہ مولانا عبدالحق مدنی مرحوم جب بھی مراد آباد سے دیوبند تشریف لاتے اور حضرت شیخ الاسلام سے گفتگو ہوتی تو صرف عربی زبان ہی گونجتی سنائی دیتی تھی۔

ان دنوں بڑے اساتذہ کرام کے صاحبزادگان میں بعض مدرس ہو چکے تھے مگر ان میں سے کسی میں بھی بے تکلف عربوں سے بات کرنے کی صلاحیت نہ تھی، یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ تونس کے ایک مہمان دارالعلوم تشریف لائے تو اہتمام کے اہل کاروں نے انھیں مہمان خانہ میں ٹھہرا دیا اور ذمہ دار حضرات کو اطلاع کر دی مگر کوئی صاحب بنفس نفیس تشریف نہ لائے بلکہ مولانا وحید الزماں صاحب کی تلاش میں اہل کار دوڑتے رہے۔ جب وہ آگئے اور مہمان خانہ میں جا کر گفتگو شروع کر دی تب دوسرے حضرات

وارد ہوئے۔ اور جہاں تک طلبا کا تعلق ہے اس وقت پورے دارالعلوم میں گنتی کے چار چھ طلبا عربی انشاء یا گفت گو کی قدرت رکھتے تھے، ان میں مولانا وحید الزماں اور مولانا محمد اسماعیل افریقی کے نام مجھے یاد ہیں اور ان طلبا کی یہ صلاحیت بھی ان کے ذاتی شوق اور کوشش کا نتیجہ تھی۔ یہاں ہو سکتا ہے قارئین کو یہ خیال پیدا ہو کہ میں حق رفاقت ادا کرنے میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں ورنہ مولانا کیرانوی کوئی عرب نژاد یا عرب ملک کے تعلیم یافتہ تو نہ تھے جو ان میں یہ صلاحیت ابھری۔ آخر وہ کیرانہ کے ایک معمولی قصبہ کے رہنے والے تھے جہاں ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند آ گئے۔

حیدرآباد دکن میں تعلیم و تربیت

اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کی گفت گو کی روشنی میں عرض کروں گا کہ آزادی سے قبل کسی وقت مولانا کے بعض عزیز و اقارب حیدرآباد جا کر آباد ہو گئے تھے اور مولانا مرحوم کو حفظِ کلام پاک نیز ابتدائی فارسی عربی کی تعلیم کے بعد کسی وجہ سے حیدرآباد بھیج دیا گیا تھا، یہ وہاں تقریباً دو سال مقیم رہے اور اس دوران ان کو خوش قسمتی سے اس زمانہ کے مشہور عالم و ادیب علامہ المامون الدمشقی سے شرف تلمذ کا موقع مل گیا، بس یہی ان کی صلاحیت کا بنیادی راز تھا۔ اس کے بارے میں مولانا کبھی کبھی فرمایا کرتے کہ میں نے علامہ مامون مرحوم سے کوئی باقاعدہ اسباق یا مختلف کتابیں نہیں پڑھیں بلکہ مولانا نے دو ایک دن میری ابتدائی صلاحیت اور ذہانت کا اندازہ لگانے کے بعد مجھے کسی عرب مصنف کی ادبی کتاب دے دی اور پڑھانا شروع کر دیا اور یہی کتاب میں نے دو سال میں ختم کی۔ مگر اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھی ایک صفحہ کے سبق پر کام کرتے کرتے کئی دن گذر جاتے۔ حالانکہ اس کا مطلب اور مشکل لغات میں پہلے دن حل کر لیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ مرحوم ایک سبق میں بہت کچھ سکھاتے۔ جیسے قواعد، ترکیب، نحوی و صرفی، جملوں سے نئی تعبیرات اخذ کر کے اپنے جملوں میں استعمال کرنا، بعض محاوروں کو گفت گو میں استعمال کرنا، اس عمل میں خاصا وقت صرف ہوتا مگر کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا حق ادا ہو جاتا تھا اور میں استاذ مرحوم کی خدمت میں کافی وقت گذارتا اس لئے کسی وقت بھی وہ معمولی سے معمولی ضرورت کے لئے اردو میں بات نہ کرتے بلکہ خالص فصیح عربی میں گفت گو فرماتے تھے حالانکہ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔ اس طرح اس کتاب نے دو سال میں نہ صرف میری بنیادی صلاحیت کو مانجھ دیا بلکہ آئندہ پڑھنے کے لئے شوق پیدا کر دی۔

مندرجہ بالا مشغولیات کے علاوہ اس زمانہ میں مولانا مرحوم کا ایک محبوب مشغلہ القاموس الجدید کی تیاری بھی جو اپنی قسم کا ایک نادر کام تھا۔ مولانا اس کے لئے بہت کم وقت نکال پاتے مگر کچھ نہ کچھ کرتے

رہتے تھے، جب کوئی عربی اخبار یا مجلہ ہاتھ آجاتا تو اس کی ایک ایک سطر غور سے پڑھتے، نئے الفاظ اور تعبیرات پر نشان لگاتے پھر کئی مقامات پر دیکھ لینے کے بعد جب معانی کا تیقن کر لیتے تو اپنے مسودہ میں شامل کرتے۔ مجھے جب اس کام کی نوعیت کا علم ہوا تو اندازہ ہوا کہ بیسویں صدی میں کسی ہندوستانی عالم کا یہ نادر روزگار کارنامہ ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کرام بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے دینی مدارس میں تقریباً ۱۹۵۰ء تک عیسائی مؤلف معلوف یسوعی کی تالیف المنجد ہی مروّج تھی اس کے علاوہ روزمرہ کے استعمال کے لئے کوئی لغت کی کتاب تھی ہی نہیں، پھر سنہ ۵۰ء کے آس پاس مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی تالیف مصباح اللغات وجود میں آئی جس کو المنجد کا اردو ترجمہ ہی کہا جاسکتا ہے مگر بہرحال اس سے عربی کے طلبا اور اساتذہ کا بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے علاوہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی تالیف بیان اللسان اور قاموس القرآن نے بھی کافی حد تک مدارس عربیہ کی ضرورت پوری کی مگر ان تمام کوششوں میں ایک تو اردو عربی لغت کا گوشہ یکسر خالی تھا۔ دوسرے جتنی لغت کی کتابیں تیار کی گئیں وہ قدیم قوامیس کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی تھیں موجودہ دور کی ترقی یافتہ اصطلاحات و تعبیرات کی تدوین پر کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا اس لئے مولانا کیرانوی مرحوم کی یہ جدید کوشش قدیم قوامیس سے بالکل مختلف تھی۔

مولانا کیرانوی مرحوم نے اپنی القاموس الجدید کے لئے قدیم قوامیس کو ماخذ بنانے کی بجائے عربی کے یومیہ جرائد، مجلات اور قصص وغیرہ کی ایسی کتابوں کو ماخذ بنایا جن میں دنیا بھر کے طول و عرض کی سیاسی اقتصادی، معاشی، تعلیمی، فوجی، سرکاری، غیر سرکاری ہر سطح کی خبریں عربی میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان سے نئی موضوعہ اصطلاحات کا علم ہوتا ہے۔ مولانا کا معمول تھا کہ بڑی دیدہ ریزی سے ان کا مطالعہ کرتے اور معنی متعین کرنے کے لئے حسب ضرورت لغت کی قدیم کتابوں سے بھی مدد لیتے۔

اس کام سے مولانا کا خاص مقصد یہ تھا کہ عربی کے طلباء قدیم ادبی کتابوں کو سمجھنے کے لئے تو مصباح اللغات وغیرہ سے مدد لے لیتے ہیں لیکن کلاسیکل ادب سے ذرا آگے بڑھ کر انھیں آج کی نت نئی ایجادات اور اصطلاحات کا بھی علم ہونا چاہئے تاکہ موجودہ عالم عرب میں اپنا مقام پیدا کر سکیں، اور عربوں سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں اپنا مافی الضمیر سمجھا سکیں۔ اس کے علاوہ موجودہ ہند عرب تعلقات میں ہر سطح پر روز افزوں اضافے، ذرائع معاش کے بڑھتے ہوئے وسائل کے پس منظر میں دیکھئے تو مولانا کیرانوی مرحوم کی اس عرق ریزی کی افادیت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی اور اندازہ ہوگا کہ مولانا نے یہ عظیم خدمت انجام دے کر آنے والی نسلوں کے لئے علم اور معاش کے کیسے دروازے کھول دیئے ہیں۔

طالب علمانہ سیاست

مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک مشغلہ دارالعلوم کی طالب علمانہ سیاست میں حصہ لینا بھی تھا جس کو میں نے قریب سے دیکھا۔

دارالعلوم دیوبند میں یوپی کے طلبار کا ایک کتب خانہ مدنی دارالمطالعہ اور اسی نام سے انجمن قائم تھی جس کے عہدیداروں کا سالانہ انتخاب ہوتا اور طلبار استفادہ کرتے، مگر جس سال میں دارالعلوم پہونچا اسی سال انتخاب کے موقعہ پر مشرقی اور مغربی یوپی کے طلبار میں اہم مناصب حاصل کرنے پر شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس موقعہ پر مولانا وحید الزماں مرحوم اور ان کے دست راست اور مشیر کار مولانا حکیم حفیظ الرحمن دھام پوری اپنے ہم مزاج طلبار کے ساتھ میدان میں آ گئے، انتخابی سرگرمی شروع ہوئی اور مولانا کیرانوی مرحوم صدارت کے منصب پر فائز ہو گئے۔

دورۂ حدیث کے بعد

یہ سال اپنی تمام تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ختم ہوا اور مولانا کیرانوی مرحوم نے دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کچھ فنون وغیرہ کی کتابیں لے کر طالب علمی کی زندگی کو باقی رکھنے کا ارادہ کیا اگر معاشی پریشانیوں کی وجہ سے وہ دارالعلوم میں مستقل قیام نہ کر سکے، کبھی کیرانہ اور کبھی بھائی حمید الزماں مرحوم کے پاس دہلی آتے جاتے رہے اور ان کا یہ تعلیمی سال مکمل نہ ہو سکا۔

جامعہ ملیہ میں عارضی قیام

میں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آجانے کا ارادہ کیا اور یہاں درجہ خاص میں داخلہ لے لیا۔ جو مدارس کے طلبار کے لئے مخصوص کلاس تھی۔ اس دوران مولانا سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی اور ان کی سرگرمیوں کا علم ہوتا رہا۔

حسن اتفاق سے تعلیم کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسہ ابتدائی میں استاد اسلامیات کی جگہ نکلی تو ذمہ دار حضرت نے خاکسار کو اس کے لئے موزوں سمجھا اور میں ۱۲؍ اگست ۵۶ء کو اس منصب سے منسلک ہو گیا اس طرح دہلی میں میرے قیام کی صورت نکل آئی۔

ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کے یوم تاسیس کے موقعہ پر ۲۹؍ اکتوبر کو ہر سال ایک تعلیمی میلہ ہوا

کرتا تھا جس میں ہر سطح کے طلبا اپنے تعلیمی کاموں کی نمائش کیا کرتے تھے، اکتوبر ۱۹۵۶ء میں خاکسار کے سپرد محمد علی ہال کی آرائش کا کام کیا گیا۔ یہ ہال اس وقت نماز اور عام جلسوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو مسجد کی تعمیر کے بعد ختم کر دیا گیا۔

میں نے اس آرائش کے لئے چند اخلاقی آیات اور احادیث کے تراجم بڑے چارٹس پر لکھوانے کا پروگرام بنایا تو کتابت کے لئے مولانا کیرانوی مرحوم سے درخواست کی اور انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق چند شرطوں کے ساتھ منظور کر لیا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں جامعہ آؤں گا تو تمہارے کمرہ میں سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر کام کروں گا۔ مجھے کام دینے اور لینے کا صرف تمہیں اختیار ہوگا اور کسی استاد یا افسر کو مجھ سے بازپرس کرنے کا حق نہ ہوگا۔ کام کا معاوضہ لینے کے لئے میں نگراں مدرسہ یا کسی افسر کے پاس نہ جاؤں گا نہ کسی دفتر میں حاضری دوں گا۔ کام ختم ہونے پر آپ فوراً ادائیگی کردیں گے اور میں حسب قاعدہ رسید لکھ دوں گا۔

میں نے یہ تمام شرائط قبول کرلیں اور مولانا نے حسب وعدہ وقت کے اندر کام انجام دے دیا۔ ان کے لکھے ہوئے کتبات کی تقریباً ۲۰ / ۲۵ سال تک فریموں میں نمائش ہوتی رہی۔ بہت سے مہمان ان کے فوٹو لے گئے، اور اب بھی کہیں محفوظ ہوں گے۔

اسی زمانہ میں ان کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے سکریٹری کی حیثیت سے خدمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اور ان کے ساتھ مشرق وسطیٰ کے دورہ پر تشریف لے گئے مگر وہاں سے آکر زیادہ عرصہ اس منصب سے وابستہ نہ رہ سکے بلکہ دیوبند چلے گئے۔

دیوبند میں دارالفکر کا قیام اور القاسم کا اجرار

مولانا کے مزاج میں نہ مایوسی تھی نہ جدوجہد سے منہ موڑنا انھوں نے سیکھا تھا، جب دیکھا کہ دہلی میں معاشی گتھی سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے تو دیوبند جاکر انھوں نے دارالفکر نامی ادارہ قائم کیا۔ اور ایک ماہانہ مجلہ القاسم جاری کیا پھر اس کی ترویج و اشاعت میں سرگرداں رہے اور ان کے ساتھ برادر خورد مولانا عمید الزماں کیرانوی بھی تعاون کرتے رہے مگر اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی مقدر نہ تھی، مولانا نے مجھے ادارہ کا تعارفی لٹریچر بھیجا اور القاسم رسالہ بھی۔ اس کے لئے مجھے لکھا کہ قصص القرآن پر تو کافی کام ہوچکا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم قصص الحدیث پر کچھ کام کرو لہذا میں نے اس موضوع پر کئی پرچوں میں لکھا اور مرحوم نے خادم کو اس کی مجلس ادارت میں بھی شامل کیا۔ مگر شاید دو سال بعد اسے مجبوراً موقوف کرنا پڑا۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت

حالات نے پھر کروٹ لی اور ۱۹۶۳ء میں مولانا مرحوم کو دارالعلوم میں عربی ادب کے مدرس کی حیثیت سے خدمت کرنے کا موقعہ مل گیا اس نئے منصب پر فائز ہونے کے بعد ایک طرف تو ان کی معاشی پریشانی دور ہوئی دوسرے ان کے مزاج کے مطابق طلبار کی تعلیم و تربیت کا میدان ہاتھ آگیا جس کے ثمرات آج برصغیر ہند و پاک میں ان کے لائق و فائق شاگردوں کی صورت میں نمایاں ہیں۔

دارالعلوم کے مدرس ہونے کے بعد آپ کی ادارت میں دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں پہلا عربی مجلہ "دعوۃ الحق" جاری ہوا جس نے مشرق وسطیٰ میں اس عظیم ادارہ کی خدمات کا تعارف کرانے میں اہم خدمات انجام دیں نیز دارالعلوم کے اساتذہ اور باصلاحیت طلبا کی قلمی استعداد کو جلا بخشی۔ اس کے ساتھ ہی جمعیۃ علماء ہند کا پندرہ روزہ جریدہ "الکفاح" مولانا کی ادارت میں جاری ہوا اور دو اداروں کے یہ دو ترجمان مولانا کی زیرنگرانی عرصہ تک بخوبی چلتے رہے۔

اس کے علاوہ آپ نے طلبار کی انجمن النادی الادبی کی بنیاد ڈالی جو آپ کے دور میں مادر علمی کی چہار دیواری میں سب سے فعال اور متحرک انجمن تھی، اس کے ایک سالانہ جلسہ کا بچشم خود میں نے مشاہدہ کیا اور وہ اس طرح کہ نومبر ۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے رخصت لے کر میں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کا ارادہ کیا اور وہاں جاکر ہوسٹل میں مقیم رہا۔ اس دوران جون ۷۴ء میں گرمی کی تعطیل ہوئی تو میں دیوبند چلا گیا تاکہ وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے استفادہ کرسکوں۔ اسی ماہ میں وہاں ایک شاندار تاریخی سالانہ جلسہ منعقد کیا گیا جس کی تفصیلات اور اپنے تاثرات میں نے قلمبند کئے تو مولانا مرحوم نے بذات خود اس تحریر کو "النادی الادبی کے جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال" کے عنوان سے ۳۲ صفحات پر مشتمل کتابچہ کی شکل میں شائع فرمایا اور اس کی مقبولیت اس وقت وہاں جو ہوئی سو ہوئی مگر ۹۱ء میں جب میں بنارس گیا تو جامعہ مظہر العلوم کے مدرس مولانا خورشید انور صاحب نے بتایا کہ مجھے تو آپ کی آمد سے قبل اس کتابچہ کے ذریعہ تعارف حاصل ہوچکا ہے جس کی دارالعلوم دیوبند میں عرصہ تک شہرت رہی ہے۔

تربیتی جد و جہد

اس ایک ماہ کے قیام میں میں نے مولانا کی تربیتی جد و جہد کا بھی باریکی سے جائزہ لیا۔ میں نے مولانا کے پاس آنے والے طلبار کی سرگرمیوں کو دیکھا، ان سے مختلف موضوعات پر باتیں کیں، صلاحیتوں کو پرکھا، طرز تکلم کا جائزہ لیا۔ کبھی میں بعض طلبا کے ساتھ عصر کے بعد ٹہلنے بھی جاتا رہا، ان کے معمولات اور مولانا کے برتاؤ پر گفتگو

ہوتی رہی۔ ان مجموعی ملاقاتوں میں اندازہ ہوا کہ مولانا کے شاگردوں میں عام طلباء سے ایک فرق نمایاں ہے، ان کا رہن سہن دوسروں سے الگ تھلگ ہے، کمرہ بستر ہمیشہ صاف دکھائی دیتا ہے، کتابیں سلیقہ سے لگی ہیں۔ کسی چیز پر گرد نظر نہیں آتی۔ یہ مطبخ سے کھانا لینے جاتے ہیں تو ناشتہ دان یا بند برتن میں ورنہ اکثر طلباء کو خود میں نے دیکھا کہ ایک المونیم کے پیالہ میں سالن اور اسی پر دو روٹیاں رکھ کر پورا دار جدید عبور کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض روٹیوں کو اپنی گردن پر پڑی رومال سے لپیٹ لیتے ہیں۔ مولانا کے شاگرد ٹہلنے جاتے ہیں تو ان میں ایک نمایاں متانت اور وقار جھلکتا نظر آتا ہے، وہ والی دال اور فٹ بال کھیلتے ہیں تو اس میں بھی عربی کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں وہ دکانداروں سے قرض نہیں لیتے، اگر ضرورت پڑتی ہے تو وہ خود آپس میں ساتھیوں سے لے کر حسب وعدہ واپس کرتے ہیں، مولانا خود اس کا خیال رکھتے ہیں اور ضرورت مند طلباء کی قرض یا عطیہ کی شکل میں مدد فرماتے ہیں۔ قدم قدم پر طلباء کو ہدایت اور رہنمائی اور ان کی غلطیوں پر باز پرس، غرض دن رات کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ طلباء ان کی سخت سست باتوں کو سر جھکا کر سنتے اور دم نہ مارتے تھے کیونکہ مولانا کی اس ڈانٹ پھٹکار میں خلوص تھا، اسی کا اثر تھا کہ بڑے سے بڑا مجمع ان کی ایک للکار پر سہم جاتا اور اشاروں پر چلتا تھا۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ مولانا نے طلباء کے انداز فکر کو بدلنے اور سطح زندگی کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

مولانا کا سن پیدائش ۱۹۲۹ء اور میرا ۱۹۳۵ء ہے اس لحاظ سے وہ مجھ سے چھ سال بڑے تھے اور ہمیشہ انھوں نے مجھے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا اور میں نے اس کو نبھانے کی کوشش کی۔ مولانا جب کبھی اپنے صاحبزادہ یا برادران میں سے کسی کے ہاں تشریف لاتے اور مجھے اطلاع ہوجاتی تو ملاقات کے لئے حاضر ہوتا۔ ایک مرتبہ ۹۰ء میں جب میں شام کی کلاس لینے شعبہ عربی پہونچا تو دیکھا مولانا اپنے ایک شاگرد کے ساتھ بہ نفس نفیس میرا انتظار فرمارہے ہیں۔ میں پہونچا تو فرمانے لگے بھائی آج ہم نے قصد کرلیا تھا کہ تم جہاں بھی ملوگے ملاقات کروں گا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی اور مولانا تھوڑی دیر بیٹھ کر ذاکر نگر تشریف لے گئے۔ ۱۹۹۱ء میں جب پروفیسر کی حیثیت سے میرا تقرر بنارس میں ہوا اور میں نے انھیں اطلاع دی تو فوراً مبارکبادی کا خط لکھا اور اس میں خادم کو "بدر ملت" کے لقب سے سرفراز فرمایا۔ غالباً دسمبر ۹۴ء میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے دفتر جوگابائی دہلی میں دارالعلوم دیوبند کی البم کا افتتاح تھا، میں بھی ان دنوں دہلی میں موجود تھا، جلسہ میں حاضر ہوا، مولانا کی تقریر سنی جس میں جوش وہی تھا مگر سانس میں قدرے رکاوٹ محسوس ہورہی تھی، میں نے تقریباً چار گھنٹے ان کے ساتھ گذارے، بس یہی میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد نیاز حاصل نہ ہوسکا۔ افسوس کہ ان کا مادی جسم ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ مگر ان کا علمی فیض انھیں حیات جاوداں عطا کرے گا۔ وہ دنیا کے کتب خانوں، لائبریریوں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں صدیوں زندہ رہیں گے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

باتیں اُن کی یادیں اُن کی

وقت کس طرح پر لگا کر اُڑ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے، حساب لگایا تو اس بات کو کوئی ۴۲ سال گزر چکے ہیں۔ جب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد چند سال دہلی میں گذار کر وارد دیوبند ہوئے اور جامع مسجد کی پشت پر حافظ ظہیر حسن عرف حافظ دھنیے کی بیٹھک کرایے پر لے کر اس میں دارالفکر کے نام سے ایک ادارہ کی بناء رکھی۔ اس بیٹھک میں ایک بڑا ہال کمرہ درمیان میں تھا، سامنے مختصر سا دالان اور دالان کے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ دارالفکر سے "القاسم (جدید)" کے نام سے ایک مختصر سا ماہنامہ شروع کیا۔ خوش قلم تھے، کتابت خود کر لیتے تھے۔ ہال کمرے میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے کلاسیں شروع کیں۔ ایک کمرہ دفتر کے لئے اور ایک رہائش و آرام کے لئے مخصوص ہوا۔ اسی زمانے میں القاموس الجدید کے نام سے اردو عربی ڈکشنری مرتب کر کے شائع کی جو بعد میں اضافے کے ساتھ بڑے سائز پر چھپی اور پھر اردو عربی کے علاوہ اس کو عربی اردو میں بھی کیا۔ ڈکشنری مرتب کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے برابر سائز کے کاغذ کے ٹکڑے کاٹ کر ان پر الفاظ لکھتے تھے اور پھر ان کو حرفوں کے حساب سے الگ الگ ڈبوں میں رکھتے جاتے تھے، مکمل ہونے کے بعد ان کاغذ کے ٹکڑوں سے کاپی میں منتقل کرتے تھے، سلیقہ اور نظم ان کی ہر بات میں تھا، اس کے علاوہ اتنے فعال، متحرک اور جفاکش تھے کہ تھکن اور صحت کی پرواہ کئے بغیر جس کام کو کرنا ہوتا تھا اس پر یوں کہئے پل پڑ جاتے تھے۔

اسی زمانے میں ہم چند آدمیوں کی ایک بے تکلف قسم کی علمی مجلس سی بن گئی جو اپنا زیادہ تر وقت دارالفکر میں گزارتے تھے۔ "حسن الیقین" کتاب کے مؤلف مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی، معارف المشکوٰۃ کے مصنف

---

٥ جامعہ دار السلام مالیر کوٹلہ (پنجاب)

مولانا سید عبدالرؤف عالی (وقف دارالعلوم دیوبند)، مولانا قاری علاءالدین گونڈوی اور ان کے ساتھ یہ بندہ خاکسار — باتیں ہوتی تھیں، مجلسیں جمتی تھیں، طرح طرح کے علمی پروگرام بنتے تھے۔ کھانا، پینا، ہنسنا بولنا، غم روزگار سے بے نیاز، طالب علمی کے سہانے دن جیسے لوٹ کر آ گئے تھے۔ مولانا وحیدالزماں صاحب ہر دن ایک نیا پروگرام بنا کر سامنے رکھ دیتے تھے۔ مولوی ابوالحسن صاحب بے تکلفی سے کہہ دیتے تھے کہ "اس فکری کی کھوپڑی میں ہر وقت ایک پلان تیار رہتا ہے۔"

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی علمی مجلس میں اکثر دو تین آدمی اکٹھے حاضر ہوتے تھے اور فائدہ اٹھاتے تھے، مولانا وحید الزماں صاحب کی عربی زبان سے دلچسپی طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھی۔ دارالعلوم کے صدر دروازے پر عربی میں دیواری رسالہ لکھ کر آویزاں کرتے تھے حضرت مہتمم صاحب کو ان کی صلاحیتوں کا خوب اندازہ تھا، ان کے لئے دارالعلوم میں جدید عربی سکھلانے کا ایک شعبہ "القسم العربی" کے نام سے قائم کر دیا گیا اور یہ نگینہ دارالعلوم کی انگوٹھی میں فٹ ہو گیا — اور ایسا فٹ ہوا کہ اس کی چمک دمک نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ پورے دارالعلوم میں عربی بولنے لکھنے کا ایک ماحول بن گیا۔ سیکڑوں ہزاروں طلباء نے ان سے فائدہ اٹھایا — درس و تدریس، فکری و علمی تربیت ان کا خاص میدان تھا۔ ان کی صلاحیتیں اسی میدان میں نکھریں، چمکیں اور پروان چڑھیں — جوڑ توڑ ان کا مزاج نہ تھا، سیاست بازی ان کی طبیعت نہ تھی۔ آج کل سیاست نفاق کی بنیادوں پر چلتی ہے اور وہ کھری طبیعت کے صاف گو انسان تھے۔ ادھر میں بھی دارالعلوم کے شعبۂ فارسی میں مدرس ہو گیا اور اب ہماری روزمرہ کی مجلس ہفتہ واری مجلس میں بدل گئی اور دارالفکر کے بجائے مستقر محلہ شاہ رمزالدین دیوبند میں میرے مکان کی بیٹھک بن گئی اس میں کچھ اور حضرات بھی شریک ہو گئے، بڑی مفید اور پُرلطف مجلسیں ہوتی تھیں یہاں تک کہ ایک مرتبہ مولانا علی میاں صاحب بھی شریک مجلس ہوئے اور اس کا ذکر غالباً انھوں نے اپنی کتاب "عصر جدید کا چیلنج" کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔

دارالعلوم کی تدریس چھوڑ کر میں ۷۳ء کے آغاز میں مالیر کوٹلہ آ گیا۔ مجھے اس کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے کہ نوعمر ہونے کے باوجود پہلے دارالعلوم کی تدریسی لائن میں اور پھر مالیر کوٹلہ کے اجنبی ماحول میں اپنی جگہ بنانے کے لئے جو سخت کوشش میں نے کی ہے اس میں بہت کچھ مولانا وحیدالزماں صاحب کی رفاقت کا اثر تھا — صد سالہ اجلاس کی تیاری کے لئے نمائندہ اجلاس بلایا گیا تو پنجاب کی طرف سے میں نے شرکت کی اور پہلی بار دارالعلوم کی انتظامیہ کے تئیں مولانا وحیدالزماں صاحب کے تیور بدلے ہوئے محسوس ہوئے۔ جلسہ میں وہ عم گرامی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے الجھ گئے۔

بعد میں ایک مرتبہ رات کو ان سے ملاقات کے لئے گیا، مقبولیت کا شباب تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر ان کے کمرے کے سامنے جاں نثار طالب علم سیکیورٹی گارڈ کی طرح کھڑے رہتے تھے۔ اجنبی لوگوں کو نام بنام ملاقات کی غرض بتانی ہوتی تھی، جب باریابی کا موقعہ ملتا تھا مجھے دارالعلوم چھوڑے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا، طلبار کے لئے اجنبی نہ تھا اس لئے یہ معاملہ میرے ساتھ پیش نہ آیا۔ تنہائی میں ملے اور اسی بے تکلفی اور محبت سے ملے جو ان کا دستور تھا، چائے کے دوران ان کے موجودہ رویے پر میں نے کافی بحث کی ۔ مگر اس وقت ان پر کچھ اور ہی دھن سوار تھی، ان کی جذباتیت ابھری ہوئی تھی، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح دارالعلوم کی اصلاح اور ترقی کا راستہ کھل جائے گا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یہ "اپوزیشن" اس کو جس طرح کہوں گا اس کو کرنا پڑے گا کیونکہ طلباً کی حمایت اور قوت میرے ساتھ ہے ۔ بہرحال یہ باب بڑا تلخ اور تکلیف دہ ہے۔ دارالعلوم کا بحران ملت اسلامیہ کا اذیت ناک حادثہ ہے۔ مولانا وحید الزماں صاحب کے ساتھ اس انقلاب کے بعد جو کچھ گذری وہ سب کو معلوم ہے لیکن وہ بڑے صابر اور باہمت آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو علمی کاموں میں مشغول رکھا جو ان کا اصل میدان تھا۔

ان کی وضع داری اور قدیم تعلق کی پاسداری کے سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا ہوا جو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد ان کی قدر و منزلت میرے دل میں اور زیادہ ہو گئی۔ ہوا یہ کہ ۸۱ء یا ۸۲ء میں وہ دارالعلوم کی تجدید تعمیر کے سلسلہ میں سرمایہ فراہم کرنے کے لئے "مالیر کوٹلہ" آئے۔ اس زمانہ میں یہاں گہری سازش کے تحت میرے خلاف ایک قسم کی شورش برپا تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی اور یہ فرمائش کی کہ اگر آپ فضیل الرحمٰن کے خلاف جلسہ عام میں ایک تقریر کر دیں تو ہم آپ کو معقول چندہ فراہم کر کے دیں گے۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے جواب دیا کہ آپ کے اور ان کے مابین کیا معاملات ہیں مجھے اس کا علم نہیں ہے، ایک طرفہ بات سن کر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا، رہا ان کے خلاف تقریر کرنے کا معاملہ تو آپ چندہ کرائیں یا نہ کرائیں میں ان کے خلاف ہرگز ایک لفظ نہیں کہوں گا، میرا ان سے پرانا تعلق ہے اور میں ان کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔" بھڑکانے کی کوشش کرنے والے منہ دیکھتے رہ گئے۔ اور وہ مزید چندہ کے بغیر مالیر کوٹلہ سے واپس چلے گئے۔ یہ واقعہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو اس گفتگو کے وقت موجود تھے۔ مولانا نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

وہ آج دنیا میں نہیں رہے اور یہاں رہنا بھی کس کو ہے۔ مگر ان کی باقیات الصالحات ان کی وقیع علمی کتابوں اور ان کے لائق تلامذہ اور ان کے قابل بھائیوں مولانا عمید الزماں، فرید الزماں وغیرہ کی صورت میں باقی ہے۔ وہ کیرانہ کے تھے مگر دیوبند کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ دیوبند ان کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ملت ان کو

(بقیہ ص ۱۰۶ پر)

مولانا احمد علی قاسمی

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ
طالب علمی کا آخری دور

علم وفن کے میدان میں بعض لوگوں کو اللہ کی طرف سے خصوصی صلاحیتیں عطا ہوتی ہیں اور وہ اپنے میدان کار میں نمایاں تاریخی کارنامے انجام دیتے ہیں، ایسے لوگ عام طور پر اخباروں کی سرخیوں میں کم پہنچتے ہیں اور عام لوگوں سے ان کا رابطہ بھی عمومی نہیں ہوتا بلکہ ان کا دائرہ کار علمی حلقوں تک ہی محدود ہوتا ہے۔ اور ان کی شخصیت اور اہمیت عوام کے سامنے نہیں آپاتی۔

۱۹۵۲ء میں میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، مولانا کیرانوی اور مولانا انظر شاہ کشمیری بھی ان دنوں طالب علمی کے آخری مرحلے میں تھے، بیضاوی شریف اور توضیح تلویح میں بھی میں ان حضرات کے شریک درس تھا۔ ان دنوں جدید عربی کا رواج گویا نہیں تھا اور مولانا کیرانوی صاحب جدید عربی کے حصول کے لئے طلبا کو راغب کرتے اور جو لوگ آمادہ ہوتے ان کو بڑی دل سوزی اور لگن کے ساتھ سکھاتے پڑھاتے، دارالعلوم دیوبند میں جدید عربی کی کمی کا احساس تو اصاغر و اکابر سبھی کو تھا مگر عملاً اس محاذ پر مولانا کیرانوی نے اپنے دور طالب علمی میں ہی کام شروع کردیا۔ اور اس مشن میں الحمدللہ بڑی کامیابی ہوئی۔ سینکڑوں طلبا ر جدید عربی میں تحریر و تقریر کے میدان میں کامیاب ہوکر میدان میں آئے اور ملک و بیرون ملک میں نمایاں کام کررہے ہیں۔ مولانا کیرانوی صاحب نے اپنی زندگی کو اسلامی علوم کے ساتھ عربی زبان وادب سے مربوط کیا اور طلبار دارالعلوم اور مکتبۂ فکر دیوبندی میں اسلامیات کے ساتھ عربی ادب کو رائج کرنے میں پوری زندگی صرف کردی اور متعدد کتابیں اور لغات ترتیب دیں۔ جو بہت ہی مقبول و معروف ہوئیں اور

• سابق جنرل سکریٹری مسلم مجلس مشاورت

طلبا رعربی کا ایک بڑا طبقہ ان سے استفادہ کر رہا ہے،

مولانا کیرانوی کے اندر علمی اور ادبی صلاحیت تو تھی ہی، ان کو اللہ نے انتظامی صلاحیت اور حسن کارکردگی کی دولت سے بھی نوازا تھا جس کا مظاہرہ دورِ طالب علمی، دورِ تدریس و تالیف و تصنیف کے میدان میں ہوتا رہا ہے۔

عام طور پر ایسی علمی و فکری صلاحیت کے لوگ جماعتی اور گروہی میدان میں زیادہ کامیاب نہیں ہوپاتے، اس لئے کہ ان کا علم و تدبر اور حقیقت پسندی و صاف گوئی جماعتی اور گروہی کاموں میں زیادہ مقبول و مؤثر نہیں ہو پائی۔ اسی لئے دار العلوم کے انتظامیہ سے جمعیۃ علماء اور ملی جمعیۃ علماء اور مرکزی جمعیۃ علماء تک ان کی صاف گوئی اور حقیقت پسندانہ اقدامات کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا گیا اور ان کی قدر نہیں کی جاسکی۔ یقیناً ایسے جید علماء ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے۔ اور مسلم ملت کی پرانی عادت کے مطابق بعد از مرگ ہی ان کے اوصاف و کمالات کو پہچانا جاتا ہے۔ پوری زندگی مولانا مرحوم سے رابطہ رہا اور تمام اتار چڑھاؤ کے دور میں جبکہ بہت سے مسائل میں ہم متفق الرائے نہیں تھے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔

میں نے صرف تنظیم ابنائے قدیم کے اس مستحسن اقدام میں شرکت کے لئے یہ چند جملے تحریر کئے ہیں اس لئے کہ مولانا مرحوم کے میدان کار سے میری زندگی کا بہت گہرا ربط نہیں رہا۔

بقیہ: وحیدِ زماں — شمع کہ سوخت خود را ....

بحث و بیز کے مراحل سے گذر رہے تھے۔

وہ جو کچھ سوچتے تھے اس پر ہم بے تکلف احباب کے سامنے بحث و گفتگو ہوتی۔ ہم میں سے ہر ایک اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا لیکن کسی رائے پر وہ جم جاتے تو مخالف رائے کے پورے احترام کے ساتھ اپنی رائے پر قائم رہتے، اس لئے اس ضمن میں کچھ کہنے کا حق راقم کو ہی ہے۔

اتفاق و اختلاف فکر و نظر کی دنیا میں ایک مسلمہ بات ہے۔ ہر اہل نظر اور باخبر اپنے علم و خبر اور ذہنی رجحان کے مطابق واقعات کے تناظر میں رائے قائم کرسکتا ہے۔ بہر حال اس انقلابی شخص کو جماعتی زندگی کے اسٹیج پر اپنا جو تقدیری پارٹ ادا کرنا تھا وہ کر گیا۔ اب اس کے مثبت و منفی نتائج و اثرات اہل علم اور ارباب جماعت کے درمیان زیر بحث آئیں، آتے رہیں۔

اب وہ ہیں اور ان کا مولیٰ ہے، بندوں کی نظر انسانی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر پڑتی ہے، مگر رب کریم جو خالق العباد ہے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ کسی ایک ہی عمل کا پلڑا بھاری کردیتا ہے۔ مالک یوم الدین انصاف کی ترازو میں ضرور تولے گا مگر فیصلہ اس کی شانِ رحمت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

سید احمد رامپوری (فنان خطاط)

میرے مرشد میرے رہنما

جناب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی عظیم شخصیت سے وہ حضرات زیادہ واقف ہیں جو ان سے کسی بھی رنگ میں قریب تھے۔ راقم السطور پانچ برس سے زیادہ ان کے دل کے قریب رہا، یہ چند سطور ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۹ء میں مولانا وحید الزماں صاحب نے دیوبند میں "دارالفکر" نام کا ایک ادارہ قائم کیا۔ آپ نے ابھرتے ہوئے تصنیف و تالیف کی صلاحیت رکھنے والوں کو دعوت دی کہ ادارہ سے وابستہ ہو کر اپنی کاوشوں کو جاری رکھیں، ادارہ ان کی نگارشات کو ان کے نام سے منظر عام پر لائے گا۔ انھیں دنوں مولانا کی چند تصانیف ادارہ شمع دہلی کے مکتبہ دینیات کے توسط سے منظر عام پر آئیں جن کے پے درپے کئی ایڈیشن چھپے ان میں سے ایک کتاب کا نام "خدا کا انعام" اور دوسری "اسلامی آداب" تیسری "انسانیت کا پیغام" قابل ذکر ہیں۔

دارالفکر کے قیام کے بعد آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایک معیاری دارالکتب قائم کیا جائے اور اس کے ذریعہ ایسی کتابوں کی اشاعت ہو جو مضامین، کتابت، طباعت اور ڈیزائن کے زیور حسن سے آراستہ ہوں، اس کام کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ دیوبند کے ایک متمول عالم مولانا شوکت علی خاں مرحوم بھٹہ والے (محلہ قلعہ دیوبند) اس مکتبہ کے قیام کے لئے راضی ہو گئے۔ سب سے اول مولانا چھوٹی کتب منظر عام پر لائے، یہ کتب بے حد مقبول ہوئیں کیونکہ تمام خوبیوں سے آراستہ تھیں۔

اوائل ۱۹۶۲ء میں مولانا میری رہائش گاہ پر تشریف لائے، میرے خط نسخ کے نمونے کو دیکھ کر بہت پسند فرمایا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ ایک معریٰ قرآن کریم کی کتابت لیتھو میں کر دوں اور یہ کام دیوبند رہ کر کرنا

• تالاب ملا ارم، رامپور ۔ ۲۴۴۹۰۱

ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں خطوط عربیہ کی ریسرچ کر رہا ہوں اور آثار قدیمہ جا کر خطوط کی تحقیقات کرتا ہوں، کیونکہ دہلی میں دور اسلامی کے کھنڈرات بکثرت ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ دیوبند میں رہ کر بھی یہ کام ہو سکتا ہے آپ دارالفکر میں قیام کریں، کتابت کے علاوہ اپنی تحقیقات کا سلسلہ بدستور جاری رکھیں، میں مختلف خطوط کے نمونے اور ان سے متعلق مضامین مہیا کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

میں دہلی سے دیوبند آگیا اور دارالفکر میں قرآن کریم کی کتابت شروع کر دی۔ مولانا نے دارالفکر میں موجود عربی اخبارات و رسائل کے بارے میں اجازت دے دی کہ جس مضمون اور عربی خط کے نمونے کی ضرورت ہو فوراً تراش لوں۔ میں آٹھ ماہ قیام کی غرض سے دیوبند آیا تھا، مولانا کی شفقت اور محبت سے گرویدہ ہو کر پانچ برس آٹھ ماہ مقیم رہا۔ دیوبند میں مالی منفعت سے دور تھا، معمولی گذارے کے لئے کچھ کام مل جاتا تھا، خاموشی سے تحقیقاتی کام جاری رکھا۔

مکتبہ نظامیہ کے قیام اور اس کی معیاری کتب کو دیکھ کر دوسرے تاجران کتب کے سر پر یہ خطرہ منڈلانے لگا کہ اس جدید مکتبہ کی تاسیس سے ان کے چراغ مدھم نہ پڑ جائیں۔ پُراسرار طریقہ پر مولانا کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مولانا شوکت علی خاں کے دل میں شکوک و شبہات کے بیج بو کر اس شجر نو کو جڑ سے قطع کر دیا۔ مولانا اس مکتبہ کے بند ہونے سے سخت غمگین ہوئے، کیونکہ اس مکتبہ کو بڑھانے کے لئے رات دن محنت کی تھی، مولانا پیکر صبر و رضا تھے خاموش ہو گئے۔

۱۹۶۲ء میں مولانا نے "القاموس الجدید" (اردو عربی ڈکشنری) کی تکمیل کی اور القراۃ الواضحہ (اول و دوم) اور ان کی دلیل لکھی۔ ان ایام میں مولانا دارالعلوم سے منسلک نہ تھے۔ عربی جدید کے شائق طلباء کو دن کے دوسرے پہر میں مفت تعلیم دیتے تھے۔ تعلیم دینے کا انداز نہایت دلکش ہوتا تھا۔ ہر مبتدی طالب علم سے مسکرا کر فرماتے کہ مولانا اب آپ بتائیے کہ اس جملہ کے کیا معنی ہوئے۔

مولانا کی تعلیم کے انداز اور جدید عربی کے لہجہ سے متاثر ہو کر یہ بات طلباء میں عام طور پر گشت کرنے لگی کہ عربی زبان کی مہارت میں مولانا وحید الزماں صاحب کا دارالعلوم میں کوئی ہمسر نہیں ہے۔ چونکہ میں دارالفکر میں مقیم تھا ہر روز کے واقعات سے باخبر تھا۔

مولانا اوقات کے نہایت پابند تھے: اول پہر میں مطالعہ کتب، دوسرے پہر میں طلباء کو تعلیم تیسرے پہر میں تصنیف و تالیف، چوتھے پہر میں تالیفات کی کتابت۔

مولانا کی سیر: مولانا وحید الزماں صاحب جامع کمالات تھے۔ وہ تفریحات کے مشغلوں سے

کوسوں دور تھے۔ گفتگو جامع اور مختصر ہوتی تھی، دشمن کا بھی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے تھے۔ راقم السطور نے کبھی بھی ان کے منہ سے مخالفین کی برائی نہیں سنی۔ وہ حالات کے بگڑنے سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔

مولانا کی روزافزوں ترقی سے کچھ اہل علم حسد کی بیماری کا شکار ہوگئے اور مولانا کو تقریر و تحریر کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے باد مخالف کے جھونکوں کی کبھی پرواہ نہیں کی اور ناگفتہ بہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ دارالفکر میں کھڑکی کے راستے دھمکی آمیز خطوط لکھ کر ڈالے جاتے تھے۔ دشمن عناصر کی یہ پوری کوشش تھی کہ مولانا دیوبند سے چلے جائیں، انھیں پورا یقین تھا کہ مولانا کا علمی آفتاب ضرور نصف النہار پر تاباں ہوگا اور ہمارے چراغ اس کی روشنی میں معدوم ہوجائیں گے۔ ان کی بھرپور کوشش تھی کہ اس آفتاب ہی کو گہن لگ جائے۔ مخالف حضرات میری نظر میں ہیں۔ ان کے ذکر کا اعادہ ضروری نہیں۔

مولانا نفیس مزاج تھے، ان کے زیر تربیت ان کے چھوٹے بھائی بھی نفیس مزاج تھے، وہ قناعت پسند تھے، کھانا کھانے کا انداز بڑا دلکش ہوتا تھا، میں اکثر ان کے ساتھ شریک طعام رہا۔ کھانے سے قبل سفید دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور اس پر اعلیٰ طرز کی پلیٹیں رکھ دی جاتیں اور سفید دسترخوان میں روٹیاں ہوتیں، ضرورت کے مطابق روٹیاں نکال کر دسترخوان کو ڈھک دیا جاتا تھا۔ حالات کے پیش نظر کبھی دسترخوان پر اعلیٰ کھانا ہوتا تھا اور کبھی سادہ غذا۔

چائے کی پتی اعلیٰ کوالٹی کی استعمال کرتے تھے اور چائے بڑی نفاست طبع سے نوش فرماتے تھے چائے پینے کے دوران بالکل خاموش رہتے، کپ اٹھا کر منہ تک لیجاتے اور پھر رکھ دیتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ بغیر گھونٹ لئے کپ کو رکھ دیا ہے، کسی قسم کی آواز چمچ یا کپ سے ٹکرانے کی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

راقم السطور نے مولانا سے بہت کچھ سیکھا، مثلاً تنہائی، غیر ضروری گفتگو سے احتراز، بر وقت کام، کام کے علاوہ فرصت کے اوقات میں مطالعہ اور اس کا مسلسل لکھنا۔ میں دارالفکر کے قیام سے قبل خط نستعلیق خط نسخ اور کچھ ثلث لکھ لیتا تھا۔ مولانا کے فیضان سے خط رقعہ، دیوانی اور خط کوفی میں طاق ہوگیا تھا۔

۱۹۶۸ء میں دہلی واپس آگیا۔ کچھ دن بعد وزیر اعظم کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب مرحوم نے مہندسین معماری کے ایما پر مسجد حضرت بل کا کام میرے سپرد کیا۔ تاج محل آگرہ کے انداز پر ایک طویل پٹی پر جس کا طول ایک سو اڑتالیس فٹ آٹھ انچ اور عرض تین فٹ تھا اسماء الحسنیٰ جلی قلم سے کتابت کرکے دیئے۔ اس کا رسم کتابت ثلث کبیر طریقہ کرسندی دور ردیف تھا۔ یہ عبارت مسجد حضرت بل کے بیرونی گنبد پر کندہ ہوئی اس عمارت کی بلندی ۱۵۵ فٹ تھی۔

مسجد کے افتتاح کے موقعہ پر والی عمان سلطان قابوس بن سعید کے ٹیکنیکل ایڈوائزر نے دیکھا اور

بہت پسند کیا۔ شیخ عبداللہ سے میرا ایڈریس لے کر مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ملاقات کی، انھوں نے بتایا کہ والیِ عمان کے محلات شاہی کے لئے ایک ایسے فن کار کی ضرورت ہے جو عربی کے ہمہ اقسام کے خطوط کے ساتھ ساتھ قدیم اسلامی آرٹ کا ماہر ہو۔ میں نے نمونے بھیجے جو بے حد پسند کئے گئے۔ میں دس برس سلطان کے تعمیرات اسلامی کے ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہا اور بطور مشیر فن کار کے کام کرتا رہا۔ دس برس کے عرصہ میں دس ہزار اسکوائر فٹ اسلامی آرٹ اور فن کتابت کا کام انجام دیا۔ محلات کے تمام ڈیزائن کے پرنٹ میرے پاس محفوظ ہیں۔ عمان کے اخبارات نے میرے پیش کردہ فنون کے بارے میں تبصرے کئے، ترکی کے "حامد الآمدی" ادارہ نے اپنی انجمن کا رکن بنایا۔ آغا ایوارڈ (پیرس) کا بھی ممبر ہوں۔

میں اکثر لوگوں سے اس بات کا ذکر کرتا ہوں اور خود بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں مولانا وحید الزماں صاحب کے دارالفکر میں قیام نہ کرتا اور ان کی اچھی باتیں نہ سیکھتا تو گمنام ہوتا۔ میں سادہ زندگی کو پسند کرتا ہوں اور شہر سے کوسوں دور ہوں، مولانا کی صحبت نے تنہائی پسند بنا دیا۔ مطالعہ اور لکھنا ہر وقت کا مشغلہ ہے۔ مجھے مولانا کے انتقال کا قلبی دکھ ہے، وہ میرے راہ نما اور روشنی کا مینار تھے۔

بقیہ: گلشنِ دارالعلوم کا گلِ سرسبد

ایک تیسرا سفر حضرت کے ہمراہ بہت ہی اہمیت کا حامل رہا۔ نہایت کمزوری اور ضعف و ناتوانی کے عالم میں جذبہ قومی لئے پھرنا۔ یہ تھا مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی تحریک سے لوگوں کو متعارف کرانا اور قوم کے اندر سے خوف و ہراس نکال کر ہمت و جرأت کے ساتھ جینے کا سلیقہ سکھانا۔

اس سلسلے میں حضرت کا جگہ جگہ زبردست پرجوش خیر مقدم ہوا۔ بار بار دل پر لگی اس چوٹ کا اظہار ہوا کہ جمعیۃ علماء ہند کو ہمارے اکابر نے ظالم و جابر حکمرانوں کے ظلم و بربریت کے خلاف اور ان کا نتیجۂ استبداد موثر دینے کے لئے قائم کیا تھا، لیکن آج ان کے ورثاء نے جمعیۃ کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ انھیں ظالموں کی گود میں لے جا کر بٹھا دیا جن کے دل وہی تھے شکلیں بدل چکی تھیں۔

افسوس کہ مولانا وحید الزماں کی عمر نے وفا نہ کی۔ ورنہ شاید ان کے سوز دروں کی مرکزی جمعیۃ علماء ہند تعبیر ہوتی۔ مولانا مرکزی جمعیۃ علماء ہند کو جذبۂ حریت، حق گوئی و بے باکی کا علمبردار دیکھنا چاہتے تھے۔ افسوس ان کے مسلسل مرض نے اس کا موقع نہیں دیا اور بالآخر "کل من علیہا فان" کا ازلی قانون ان پر بھی نافذ ہو گیا۔ خدا امت مسلمہ کو ان کا بدل نصیب فرمائے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

شانِ عبقریت

- تعلیم و تربیت
- عربی زبان کی ترویج
- افراد سازی
- تصنیف و تالیف

مولانا عبدالوحید حیدرآبادی

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان عمارت اور اس کے حصوں کو جوڑنے والی خوبصورت راہ داریاں اور زینے اس ہستی کے لیے ہمیشہ اشک بار رہیں گے جس نے اس صدی کی کئی دہائیوں تک اپنے علمی، ادبی، اخلاقی اور مثالی کردار سے ان کو جگمگائے رکھا تھا۔ درس گاہوں کے در و دریچے، چوکیاں اور تپائیاں دُہائیاں دے دے کر روتی رہیں گی جو ایک عرصہ تک طالبانِ علم و ادب کے جھرمٹ میں اس ماہ کامل کو جلوہ فگن دیکھتی رہی تھیں. قصبہ دیوبند کی گلیاں اور دارالعلوم کی چہار دیواری سے مختلف جہتوں میں پھوٹنے والے راستے، اس کے مکین و مکاں، اس برق رفتار سفید پوش اخلاق و کردار کے پیکر کے دیدار کو ترستے رہیں گے جنھوں نے برسہا برس ان راہوں پر اُسے گامزن دیکھا تھا جس کی رفتار میں تیزی اور چال میں متانت و وقار کے ساتھ راہ گزری کے آداب کا اتنا خیال تھا کہ نظر قدموں سے آگے نہ بڑھتی، جو چلتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے کو بھی شائستگی کے خلاف سمجھتا تھا. طلبہ کے علاوہ دیوبند کے عوام و خواص تقریباً سب ہی اس کی شخصیت سے واقف تھے، اُسے دُور سے آتا دیکھ کر سب لوگ نہ صرف تنگ راہوں پر کنارے لگ جاتے بلکہ ہنسی مذاق سے بھی گریز کرتے۔ یہ اس کی رفتار و کردار کا اثر تھا جو لوگوں کو خود بخود ایک انجانے احترام پر آمادہ کردیتا تھا.

وہ جُبّہ پوش، الحیم شحیم، توش و توانا پیر و مرشد کے حلیہ کا حامل نہ تھا بلکہ ایک نحیف الجثہ جسم کا ایسا اسلامی کردار تھا جس کے رہن سہن، نشست و برخاست اور گفتار و کردار سے ان شمائل کی خوشبو مہکتی تھی جو اسلامی خمیر سے بننے والے مجسمہ سے پھوٹتی ہے، گھر ہو، درسگاہ ہو، طلبہ کے ساتھ نشست ہو، احباب کی مجلس ہو یا اربابِ اہتمام کے ساتھ انتظامی اُمور پر گفت و شنید، جس نے بھی اس کے ساتھ چند لمحے جس ماحول اور جس کیفیت میں گزارے ہوں گے وہ اس کے حافظہ کا ابدی حصہ بن گئے ہوں گے جن کا تصوّر آتے ہی وہ مثالی یادگار لمحات

• کمپیوٹر سنٹر، جامعۃ الملک سعود، ریاض

پیکر کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آکھڑے ہوتے ہوں گے۔

اسلام گفتار و کردار کا ایک دستور عمل ہے، اس کی زندگی اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھی، جس نے بھی اس سے گفتگو کی یا کسی موضوع پر بولتے سُنا وہ اس بات کی شہادت دے گا کہ اس کی زبان کس قدر شستہ اور بات کتنی نپی تلی ہوتی تھی اور شاید اس کی سچائی کا اثر تھا کہ باتیں از دل خیزد، بر دل ریزد کی کیفیت سے دوچار کردیا کرتی تھیں۔ کردار کا امتحان، آپ بیتی اور جگ بیتی میں ہوتا ہے۔ مومن کی شان خودداری کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ سفید پوش ضرور تھا مگر اس سفید پوشی کے لیے اس نے اپنے کردار کو کبھی داغدار نہ ہونے دیا۔ اس نے عزتِ نفس اور کردار کو پاکیزہ رکھنے کی خاطر ساری زندگی اپنی جان کو آزمائشوں میں مبتلا رکھا۔ ریاکاری اور جعلسازی کے گورکھ دھندے اپنا کر عوام کو تقدس کے لبادہ میں دھوکہ دینا بہت آسان ہے مگر یہ ضمیر فروشی کے بغیر ممکن نہیں، جو اس کی غیرتِ ایمانی کو گوارا نہ تھا۔ دستِ سوال کی درازی، حسنِ طلب کی چالیں اس کے نزدیک رُوح کی موت اور حق گوئی پر قدغن کا باعث تھیں، وہ زندہ بدست مُردہ زندگی گزارنے کا قائل نہ تھا۔ اقبال نے نہ معلوم کس واقعہ سے متاثر ہو کر یہ کہا تھا

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

وہ ایک شیر صفت، خوددار غیور فرد تھا جس نے عسرت کے زمانہ میں اسلامیات اور اخلاقیات پر کتابیں تصنیف کر کے رسالوں اور پرچوں کی ادارت اور کتابت کر کے اپنے لیے مالی اسباب فراہم کیے۔ قناعت اس کی طینت کا جوہر تھا۔ حرص و ہوس نے کبھی اس کے دامن کو داغدار نہیں کیا۔ وہ طلبہ کی تربیت بھی اپنے نہج پر کرنا چاہتا تھا۔ دارالعلوم کے کتنے ہی نادار طلبہ کو کتابت کا ہنر سکھا کر "النَّادِی الْاَدَبِی" کے دیواری پرچوں اور رسالوں کی کتابت کے ذریعہ ان کے لیے کفالت کے اسباب پیدا کیے۔ طلبہ کی اس انجمن کے تحت مختلف شعبے قائم کر کے ان کے ناظم مقرر کیے تاکہ تدریس کے ساتھ ان میں تنظیمی صلاحیتیں بھی پیدا ہوں، ان کی عملی تربیت بھی ہوتی رہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ صنعت و حرفت کو بھی فعال دیکھنا چاہتا تھا تاکہ علماء میں اسلاف کا کردار لوٹ آئے، معاش کا انحصار مسجد و مدرسہ پر نہ رہے، وہ اپنے ہنر اور پیشہ سے اپنی دُنیا بنائیں، معاشی بے فکری کے بعد ہی اخلاص کے ساتھ دینی خدمت ممکن ہے، اگر خدا توفیق دے، ورنہ کہنے والا کہہ جائے گا کہ اہل مدرسہ نے اُن کا گلا گھونٹ کر حق گوئی کے اظہار اور ضربِ کلیمی کی قوت و تاثیر سے محروم کردیا۔

اس کے منصوبے نہایت دُوراندیشی اور علوہمتی کے آئینہ دار ہوتے مگر اربابِ اقتدار و اختیار کی تنگ نظری، بے عملی اور بے حسی کی وجہ سے وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکتا تھا۔ وہ دینی مدارس کے طلبہ میں عزتِ

نفس کے جذبہ کو ابھارنا چاہتا تھا، وہ نادار اور مالدار طلبہ کے درمیان امتیاز کا قائل نہ تھا۔ اس کیلئے مدارس کے ماحول میں سب سے زیادہ گرانی مطبخ کا سبب کھانے کی تقسیم کا عمل تھا، وہ اپنی طبیعت کو ساری زندگی اس بدعت کے قبول کرنے پر راضی نہ کرسکا، مہمانانِ رسول کے ساتھ اس دور میں بھی یہ غیر شریفانہ تقسیم طعام کا طریقہ کار کیوں روا رکھا گیا۔ طالب علموں کے ہاتھ میں کھلی روٹی اور ڈھب بے ڈھب ڈول کٹورے دیکھ کر اس کی طبیعت میں بے چینی کی کیفیت پیدا ہوجاتی۔ اس کے شاگرد اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ مطبخ کی رہگزر پر کھڑے ہوکر مختلف انداز و گفتار سے طلبہ کو شائستگی کے اطوار سکھاتا کبھی وہ لڑکوں کو کپڑے کے دسترخوان دیتا دکھا گیا تاکہ وہ روٹی کو ڈھانک کر لے جایا کریں، کسی سے کہتا، کیا تمہارے پاس اتنے بھی پیسے نہیں کہ ٹفن یا کوئی ڈھنگ کا برتن ہی خریدلو۔ آتے جاتے جہاں کہیں کوئی لڑکا نازیبا حرکت کرتا نظر آتا وہ وہیں کھڑے ہوکر موقعہ محل کے مطابق نرم یا سخت رویہ اختیار کرکے اپنے فرض منصبی کی تکمیل کرتا۔

وہ معاشرہ کا ایک نہایت نفیس فرد تھا اور معاشرہ کے ہر فرد کو نفیس اور شائستہ دیکھنا چاہتا تھا تاکہ ان کے ذریعہ اسلام کی صحیح نمائندگی ہو۔ ایک جگہ مولوی نور عالم صاحب کے ساتھ دسترخوان پر مولانا کا ذکر چھڑ گیا۔ اُنھوں نے بیان کیا مولانا وحیدالزماں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دسترخوان پر نظر ڈال کر ہر ایک کو اشیاء خورد و نوش کی ایک تقسیم ذہنی کرلینی چاہیئے تاکہ یہ طے ہوجائے کہ کس چیز میں اس کا کتنا حصہ ہوسکتا ہے پھر مولانا نے خود ہی اپنے ایک ساتھی مولوی زبیر کی دعوت کا قصہ سنایا تھا، جس میں ایک گاؤدی مولوی بر موقعہ شریک ہوگیا جس کے سامنے اتفاق سے گلاب جامن کا پیالہ آگیا اس پر اس نے جو تابڑ توڑ حملے کیے اس پر ہماری کیفیت "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کی سی ہوگئی۔ میں اور مولوی زبیر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

مولانا کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے لطیف انداز سے شاگردوں کی تربیت فرمایا کرتے تھے، ان کے انداز اور برموقعہ اصلاح کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ آدمی زندگی بھر اس غلطی کو دہرا نہیں سکتا تھا۔ ہر ایسے موقعہ پر وہ تازیانۂ اصلاح اس کے حواس پر مسلط ہوجاتا۔ دو واقعے میرے ساتھ بھی پیش آئے۔ دارالعلوم کی قدیم مسجد میں سائبان کا حصہ کم تھا اور نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ظہر کی نماز میں اندر کی صفیں بھر جانے کے باعث نمازی اقامت کے انتظار میں اندر کی طرف جگہ پا جانے کی کوشش میں محراب نما کمانوں میں کھڑے ہوجایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا بھی کمان میں پہونچے، مجھے دیکھا کہ آگے صف میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں۔ مولانا نے زبان سے کچھ نہ کہا، خاموشی سے صف میں داخل ہوکر میرے پہلو میں گھٹنا سرکا کر ایک زانو بیٹھ گئے، مولانا کو دیکھ کر میں بھی سہم کر یک زانو ہوگیا۔ اس دن سے آج تک جب کبھی مسجد میں ایسی کیفیت نظر آتی ہے میرے زانو خود بخود سکڑ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع

پر میں درس گاہ میں مطالعہ کر رہا تھا، مولانا ان دنوں "القاموس" مرتب کر رہے تھے؛ عربی، انگریزی اور اردو کی ڈکشنریاں ان کے سامنے رکھی رہتی تھیں؛ مولانا کی عادت تھی کہ کام کرتے کرتے طبیعت تھک جاتی یا کسی مسئلہ پر غور و فکر کرتے تو اپنے اقامتی کمرہ میں ٹہلنے لگتے، رات کا وقت ہوتا تو کمرہ کے سامنے صحن میں نکل آتے۔ اپنی درس گاہ میں روشنی نظر آتی تو کبھی وہاں چلے آتے۔ وہاں جو کوئی ہوتا اس سے دو چار باتیں کرتے اور پھر واپس چلے جاتے؛ اس سے نہ صرف ان کی طبیعت میں بشاشت آجاتی بلکہ طالب علم کی طبیعت پر بھی خوشگوار اثر پڑتا۔ ایک رات درس گاہ میں آئے، ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ لفظ کنسیشن کی اسپیلنگ لکھ کر دو میرے سامنے کتاب تھی، لکھنے کے لیے آس پاس کاغذ نہ تھا۔ بے ادبی جان کر ہمت نہ ہوئی کہ کہوں کاغذ نہیں ہے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو درس گاہ کے ایک کونہ میں کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا پڑا نظر آیا۔ میں نے اس پر اسپیلنگ لکھی اور مولانا کو دے دی۔ مولانا نے اس ٹکڑے کو بڑی نزاکت سے اپنی چٹکی میں پکڑا اور فرمانے لگے، "مولوی عبدالوحید! اس کاغذ کا تھوڑا سا حصہ بچ گیا ہے اسے پھاڑ لو۔ میں نے شرمسار نگاہیں نیچی کیں اور مولانا مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ آج تک جب بھی کچھ لکھ کر دینے کا موقعہ آتا ہے مولانا کی چٹکی میں پھنسی پرچی اور شبیہ بیک وقت نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ یہ وہ انداز تھا تربیت کا جو لطافت کی تاثیر لیے ساری زندگی کے لیے درس عمل بن جاتا تھا۔ ع

وہ دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

خدا نے مولانا کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ نجابت و شرافت کے اعلیٰ خونی اور نسبتی رشتوں کے علاوہ بلا کی ذہانت ودیعت ہوئی تھی جس پر ریاضت اور کسب کے عمل نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ ادب کے علاوہ دیگر علوم و فنون پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ جس فن کی کتاب پڑھانے کو دی گئی اس کا حق ادا کر دیا۔ کبھی کسی طالب علم کو تشنگی کا احساس نہ ہوتا تھا مگر جب حماسہ اور متنبی جیسی ادبی کتابیں پڑھایا کرتے تھے تو سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ اردو میں سمجھاتے سمجھاتے کبھی کبھی اشعار کی شرح عربی میں بیان کرنے لگتے۔ میں نے عربی کے مشہور ادیبوں اور عالموں کو عربی میں خطبات دیتے، تقریریں کرتے اور گفتگو کرتے سنا مگر جو روانی، شگفتگی اور الفاظ کی صحت کے ساتھ ادائیگی کا انداز مولانا کو نصیب ہوا تھا وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہوگا۔ مولانا کی زبان سے بکھرتے موتیوں کی کھنکھناہٹ عربی زبان کے آہنگ لہجہ اور طنطنہ کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتی تھی۔ ایک دن ہم سب ساتھی حماسہ کے درس میں بیٹھے ہوئے تھے مولانا سے کسی غیر درسی موضوع پر بات چیت چل رہی تھی اچانک مولانا نے پہلو بدلا اور کتاب کا ورق الٹتے ہوئے عربی میں بولنا شروع کر دیا اور ایک ایسے موضوع پر بولنے لگے جس کا درس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اخبارات

اور رسالوں میں جو غیر اخلاقی مضامین شائع ہو رہے ہیں اس سے قوم کے افراد اور معاشرہ پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں" یہ موضوع تھا اور وہ اپنی گرج دار بلند آواز میں رواں ہو گئے۔ یہ سماں دیکھ کر طلبہ بھی پہلو سنبھال کر بیٹھ گئے، چند لمحات کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے عرب مہمان درس گاہ کے سامنے دروازے کے پاس مبہوتی کے عالم میں کھڑے مولانا کو تک رہے ہیں گویا انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اس روانی کے ساتھ بھی کوئی ہندی عالم عربی زبان میں کسی موضوع پر بول سکتا ہے۔ مولانا تلفظ اور لفظوں کی صحیح ادائیگی کا بہت خیال رکھتے تھے چنانچہ ان کے شاگردوں میں شاید ہی بنگالی، بہاری، بھوجپوری شاگرد ایسا بچ نکلا ہو جس کی "ز" "ش" درست نہ ہوئی ہو۔ حیدرآبادیوں کے خا لو سب قالو میں بدل گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند ان کی عقیدت کا مرجع و ماوی تھا؛ اس کے در و دیوار سے ان کو جس قدر جذباتی لگاؤ تھا اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ دارالعلوم کی کسی بھی حیثیت میں خدمت کرنے کو وہ اپنے لیے باعثِ سعادت و شرف تصور کرتے تھے۔ معاون مہتمم کے عہدہ پر یا ناظم تعلیمات کی حیثیت سے جو اصلاحات وہ کرنا چاہتے تھے، اس کی راہ میں نکمے اور بے علم و عمل افراد کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور جب یہ دیکھا کہ میرے صحیح اور سخت رویے سے دارالعلوم میں کوئی بڑا انتشار برپا ہو جائے گا تو اپنے منصب سے مستعفی ہو گئے۔ تعمیرات کی ذمہ داری سونپی گئی تھی تو دارالعلوم کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

مولانا کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے مگر ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ وہ ہر آزمائش اور ابتلاء سے کامیاب اور سرخرو ہو کر نکلے۔ کم ہی افراد کو اخلاص، سچائی، بلند حوصلگی، وفا کیشی اور کردار کی پختگی جیسی اعلیٰ صفتیں اور خصلتیں موہوب ہوتی ہیں جو مصلحتوں اور مفادات کو پس پشت ڈال کر اصول اور حق پر قربان ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے بارہا ایسے مواقع آئے جن سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتے تو دارالعلوم کی زمام اقتدار ان کے ہاتھوں میں آجاتی اور جن ہاتھوں میں ان کے طفیل اقتدار پہنچا وہ ان کے لیے خواب و خیال ہی رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے حق و صداقت اور وفا کیشی کی اعلیٰ قدروں کی خاطر ہر آزمائش کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ہر موقع پر دنیوی اور مادی مفادات کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے ان کو ہر طرح کی مادی، جسمانی، نفسیاتی اور روحانی اذیتوں سے گذرنا پڑا، انہیں اس کے عوض نہ کسی سے کسی قسم کے صلہ کی تمنا تھی اور نہ ہی احسان فراموشیوں کا گلہ شکوہ کرنا ان کا شیوہ تھا۔

مولانا اپنے شاگردوں کے ساتھ فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے مشفقانہ انداز میں دوستوں کی سی

بے تکلفی روا رکھتے تھے تاکہ کسی صحیح غلط عمل پر جرح کرسکیں اس سے وہ ان میں حق گوئی کی جرأت اور حق فہمی کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شاگرد یا کوئی غیر کیسی ہی نادانی کر جائے ان کے سامنے اپنے کیے پر پشیمان ہو جاتا تو اس کو نہ صرف معاف کر دیتے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ قریب کر لیا کرتے تھے۔ یہ وہ تربیت کا گر ہے جس سے عادی مجرم کو بھی پارسا بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بنا پر وہ دارالعلوم کے ہر دلعزیز استاد تھے۔ طلبہ ان پر اپنی جان چھڑکتے تھے اس لیے کہ مولانا نے بھی اپنا تن، من، دھن، سونا، جاگنا سب کچھ ان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میرے چار سالہ عہد طالب علمی میں دو بار طلبہ نے نظامت و تدریس کے امور میں بدعنوانیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو ارباب اقتدار کے مشیر کار حاسدوں نے مولانا کو اس کا محرک ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ حل پیش کیا کہ مولانا کو دارالعلوم کی خدمت سے برطرف کر دیا جائے یا ان کی طاقت کو ختم کر کے عضو معطل بنا کر رکھ دیا جائے۔ مولانا کو برطرف کرنا آسان نہ تھا اس لیے کہ یہ وہ وقت تھا جبکہ آتش جوان تھا اس طرح کی کوئی نادانی اسی وقت اقتدار و اہتمام کی کایا پلٹ کا باعث بن جاتی۔ مولانا کو نہ صرف طلبہ کی حمایت حاصل تھی بلکہ مہتمم صاحب اور شوریٰ کے موید اور مخالف ممبران سب ہی ان کے اخلاص اور صلاحیتوں کے قائل تھے۔ جو ممبران کے مخالف تھے وہ بھی صرف مدنی حلقہ سے وابستگی کی وجہ سے مخالفت کرتے تھے ورنہ شخصی طور پر تو مولانا منت اللہ رحمانی بھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ چنانچہ ارباب حل و عقد نے دوسری حکمت عملی پر عمل کیا۔ صف عربی کی خصوصی جماعتوں اور علیحدہ نظام درس کو ختم کر کے اسی کو عام کورس اور نظام درس میں ضم کر دیا گیا۔ طلبہ کی بے چینی دور کرنے کے لیے ان کے مطالبات اور گذارشات پر غور و خوض کرنے کے بجائے ایسے طلبہ کی لمبی فہرست تیار کی گئی جو مولانا کے قریبی شاگرد شمار ہوتے تھے اور ان پر ایسے سنگین الزامات لگائے گئے جن کی پاداش میں ان کا اخراج یقینی ہو سکے، چنانچہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد دارالعلوم کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئی۔ یہ غیر دانشمندانہ پالیسی حضرت قاری صاحب کے ناعاقبت اندیش مقربین اور مشیر کاروں کی حاسدانہ سازشوں پر مبنی تھی ورنہ دانشمندی تو اس میں تھی کہ مولانا کو ہی طلبہ میں پھیلی بے چینی کو دور کرنے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی تو وہ نہ صرف طلبہ کی شکایات کا ازالہ کر کے ان کو مطمئن کر دیتے بلکہ بہت سی انتظامی کمزوریوں اور تدریسی عملہ کی جانب سے ایام تدریس میں اسفار اور غیر تدریسی امور میں دلچسپی کی وجہ سے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہیوں کا سدباب کر کے دارالعلوم میں نئی روح پھونک دیتے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اس کے برخلاف مولانا کو شوریٰ میں بلوا کر اس الزام کے بابت بازپرس کی گئی کہ انھوں نے طلبہ کو شورش پر اکسایا۔ ایسے موقعوں پر مولانا کی شعلہ بیانی دیدنی اور شنیدنی ہوتی۔ شوریٰ کے ممبروں کو بار بار کہنا پڑتا۔ مولانا ہم آپ پر الزام نہیں لگا رہے، کوئی کہتا، مولانا آپ ایک ذمہ دار استاد ہیں، آپ سے ہم صرف حالات

اور اسباب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ طلبہ کی اس شورش پر تو زور زبردستی طاقت کا استعمال کر کے قابو پالیا گیا مگر سال ڈیڑھ سال بعد طلبہ میں بے چینی کا لاوا مزید آتش فشانی کے ساتھ پھوٹ پڑا جس میں دارالعلوم کا تقدس فوج اور پولیس والوں کے بوٹوں تلے روندا گیا، پھر حالات ایسے بنتے گئے کہ اہتمام کی روایت کا صد سالہ تسلسل ٹوٹ گیا۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں دارالعلوم کے دونوں ہنگامے میرے طالب علمی کے زمانہ میں ہوئے۔ میرا نہ صرف مولانا بلکہ دیگر اہم اساتذہ سے بھی تعلق تھا۔ تعلیمی ریکارڈ میرے ایک اچھے طالب علم ہونے کا روشن ثبوت تھا۔ پہلی اسٹرائک میں مجھ پر یہ مضحکہ خیز الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے حضرت قاری صاحبؒ کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ نعوذ باللہ۔ یہ دارالعلوم اور ارباب شوریٰ و اہتمام کی شرعی عدالت تھی جس میں کسی متہم کو صفائی کا موقعہ دیئے بغیر گردن زدنی کا مستوجب قرار دیا گیا تھا۔ حیدرآباد کی بعض برگزیدہ شخصیتوں نے میری بابت قاری صاحب کو لکھا۔ قاری صاحب بذات خود مجھے ایک نمایاں طالب علم کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ مجھ پر لگائے گئے الزام کو سن کر یقیناً مسکرائے ہوں گے بہرحال انھوں نے اہتمام سے براہ راست خط لکھ کر مجھے دیوبند بلایا۔ تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔ دورۂ حدیث کی تکمیل ہوئی۔ تمام طلبہ میں نمبر اول سے پاس ہوا۔ جس کی پذیرائی میں یہ عزت افزائی ہوئی کہ فوراً میرا تقرر بحیثیت معاون مدرس کر دیا گیا۔ ابھی چند ماہ ہی گذرے تھے کہ طلبہ میں پھر بے چینی پھیلی۔ شورش برپا ہوئی، حالات قابو سے باہر ہوئے اور دارالعلوم کو فوج کے حوالے کرنا پڑا۔ اس بار میں نے شوریٰ کے ممبران کی موجودگی میں طلبہ کی ترجمانی کی تھی۔ میری وضاحت اور باتوں سے مطمئن ہوجانے کے باوجود بعض تنگ دل اور تنگ نظر ممبران شوریٰ اس بات پر اڑے رہے کہ ایسے تمام طلبہ کو دارالعلوم سے نکال باہر کیا جائے جن میں باغیانہ لیڈری کے جذبات ہوں۔ موٹی عقل کے دانشمندوں نے پھر ایک بار غیر دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ انگلیوں سے انگار بجھانے کا فیصلہ کر کے خود اپنے ہاتھ جلا بیٹھے۔ مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا، میں نے کبھی کسی استاد یا طالب علم کو اپنے کسی عمل پر انگشت نمائی کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ صرف مولانا وحید الزماںؒ سے قربت کا جرم تھا اور اس جرم کی پاداش میں دوبارا اخراج ہوا۔ اس جرم پر میرا ہزار بار بھی اخراج ہوتا تو میں اس جرم سے باز نہ آتا اس لیے کہ میری نظر میں تو وہ ہی ایک دیدہ ور تھا ؎

خوشا حرفے کہ من گفتم   خوشا جرمے کہ من کردم

لوگ کردار کی باتیں کرتے ہیں، جن کا کردار زبان کی نوک کے کرّوفر سے آگے نہیں بڑھتا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے اسی شخصیت کا خود بیان کردہ خواب یاد آرہا ہے، جس کے بعض میرے ساتھی مولوی نور عالم پورنوی

مولوی محمد رضوان دربھنگوی، مولوی طاہر گیاوی، مولوی اعجاز اعظمی بلکہ شاید مولوی ابوالقاسم بنارسی بھی گواہ ہوں گے جو مجھ سے پہلے اَلنّادی الادبی کے معتمد تھے۔ مولانا نے خواب میں دیکھا کہ ایک زبردست طوفان برپا ہے ہوا کے زور سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور قاری محمد طیب صاحبؒ کی ٹوپیاں اُڑ کر نیچے گر پڑیں۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک کی ٹوپی اُٹھانی ہے، میں نے مولانا مدنیؒ کی ٹوپی کو اُٹھا لیا۔ اس نے خواب کو حقیقت کا رُوپ دیا۔ تاحیات اسی ٹوپی کو سینے سے لگائے رکھا۔ زندگی میں سینکڑوں نشیب و فراز آئے، ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں مگر کردار پر آنچ نہ آنے دی۔ اس کے اس عظیم مثالی کردار کے عوض مدنیؒ کے جانشینوں اور ارباب اقتدار نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے محاسبہ کیلئے خدا کے دربار میں وہ کس منھ سے جائیں گے۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

برسہا برس بعد مولانا سے ریاض، سعودی عرب میں ملاقات ہوئی تھی جبکہ درویش شکل درندہ صفت، احسان فراموش انسانوں نے ان کو ایسے وقت جسمانی اور روحانی کوفت میں مبتلا کر دیا تھا جبکہ ان کی برسہا برس کی خدمات اور احسانات کے صلہ میں ان کو ہر طرح کی سہولت اور سکون کے اسباب مہیا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ عمر طبعی کے ساتھ عوارض کا لگ جانا تو فطری عمل ہے مگر ایک ایسے حادثہ سے اچانک دوچار ہو جانا جس کا وہم و گمان میں بھی تصور نہ ہو، آدمی کو ذہنی، نفسیاتی اور روحانی طور پر بے چینی کی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ اس پر ایک ایسے ہاتھ نے وار کیا تھا جس کا باپ زندہ رہتا تو اس کو اپنے سر کا تاج بنائے رکھتا۔

ریاض میں مولانا کے قیام کے دوران مولوی عبدالسلام کے مکان پر شاگردوں کا ہجوم رہتا۔ مولانا عبدالحمید ازہری بھی کبھی پہونچ جاتے جو مولانا کے معہد دارالفکر میں اپنی خاص تعلیم و تربیت کے لیے انگریزی کی کتاب بغل میں چھپا کر پڑھنے جایا کرتے تھے، ساری ساری رات ماضی کے قصّے اور حال کے واقعات کی حکایت رانی ہوتی۔ اس سے مولانا کی علیل طبیعت کو یک گونہ سرور میسر ہوتا۔ اسی مقصد سے مولانا کو ان کے خیرخواہوں اور شاگردوں نے ریاض بلوایا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی مولانا سب کو میل محبت سے رہنے کی تلقین کرتے، ماہانہ نشستوں کی ضرورت، لکھنے پڑھنے اور علمی کام کی طرف رغبت دلانے کے لیے طرح طرح کی اسکیمیں پیش کرتے جو ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی! انقلاب کی باتیں کرتے، میں نے تنہائی میں ایک بار مولانا سے کہا جہاں کہیں انقلاب آیا، کوئی نہ کوئی ہٹلر تو سامنے نہ آیا؟ میری اس شرارت پر مسکرا کر رہ گئے، وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ریاض میں مولانا انفعال الحق صاحب کے لڑکے مولوی راشد، مولانا کے عزیز شاگرد مولوی الطاف اور بعض نئے پرانے شاگرد مولانا کی خدمت میں پیش پیش رہتے۔ میں بھی کبھی کبھی موقعہ بے موقعہ پہونچ جاتا، کبھی جلوت اور کبھی خلوت

(بقیہ صفحہ ۲۴۶ پر)

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی*

ہمارے شفیق استاد

۱۹۵۸ء کی بات ہے مادرِ علمی دارالعلوم میں زیرِ تعلیم تھا۔ جدید عربی زبان و ادب سیکھنے کی خواہش تھی جو اسوقت دارالعلوم کے نصاب درس میں شامل نہیں تھا۔ کسی نے اس مقصد کے لیے مجھے "دارالفکر" میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔ یہ ادارہ حال ہی میں دیوبند میں قائم ہوا تھا اور وہاں جدید عربی زبان و ادب کی جز وقتی تعلیم و تمرین کا معیاری اور معقول بندوبست تھا۔ دوسرے دن میں وہاں حاضر ہوا۔ وہاں میری ملاقات مولانا کاشف الہاشمی صاحب سے ہوئی۔ میں نے ان کو اپنی حاضری کا مقصد بتایا تو کہنے لگے، آپ تھوڑی دیر انتظار کیجیے، ابھی ابھی مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب تشریف لانے والے ہیں ان سے ملاقات کیجیے، موصوف ہی اس ادارہ کے ذمہ دار ہیں۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ حضرت مولانا تشریف لے آئے اور سلام کرتے ہوئے اپنی نشست گاہ پر بیٹھ گئے۔ لباس سادہ مگر پروقار تھا، جسم منحنی لیکن بے حد متحرک دکھائی پڑتا تھا، چہرہ پر علمی رعب اور لبوں پر پاکیزہ مسکراہٹ تھی۔ نہایت شفقت و محبت سے میری طرف مخاطب ہوئے جیسے دیرینہ شناسائی ہو۔ میں نے اپنی درخواست پیش کی تو نہایت خندہ پیشانی سے اس کو منظور فرمایا اور دارالفکر کے اصول و آداب اور قواعد و ضوابط کی پابندی کی ہدایت دینے کے بعد درس میں شرکت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہمارے شفیق استاد حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔

دارالفکر قائم تو کیا گیا تھا جدید عربی زبان و ادب کی تعلیم و تمرین کے لیے لیکن وہاں طلبہ کی اخلاقی، ذہنی اور فکری تربیت بھی کی جاتی تھی۔ اہم علمی موضوعات پر مباحث کا سلسلہ بھی تھا۔ طلبہ کو تعلیم کے مقاصد اور ذمہ داریوں سے آگاہ بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح دارالفکر کا فیض یافتہ

---

* اسسٹنٹ سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل، سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

ہر طالب علم، علمی اعتماد، فکری شعور و آگہی، ذہنی بالیدگی اور احساسِ ذمہ داری کا پیکر بن کر باہر آتا تھا
اور یہ دراصل سب کچھ علمی فیض تھا حضرت الاستاذؒ کا جو اس ادارہ کے بانی اور روحِ رواں
تھے۔ انھوں نے دارالفکر کے ذریعہ مردم خیزی اور کردار سازی کی ایک مہم شروع کی تھی اور
اس مہم کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں ان کی فعال، متحرک اور سیمابی شخصیت شب و روز
مصروفِ کار رہتی تھی۔ قدرت نے ان کو علم و فضل اور جہد و عمل کی سرفرازیوں سے نوازا تھا۔ اخلاق
کریمانہ تھا۔ دل درد میں ڈوبا ہوا تھا، ذہن کشادہ تھا۔ فکر میں بے پناہ وسعت تھی اور خیالات
جدّت طراز تھے لیکن شریعت پر مضبوط گرفت تھی۔ طلبہ کے ساتھ باپ جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ
زبردست پدرانہ شفقت کے حامل تھے۔ وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے
تھے اور اپنا آشیانہ پھونک کر روشنی بخش دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کی یادیں اور محبتیں، ان کا
علمی وقار و عظمت طلبہ کی تعلیم و تربیت میں ان کی مسلسل محنت اور عرق ریزی کے گہرے نقوش میرے
ذہنی کینوس پر مرتسم ہو کر لافانی و لازوال ہو چکے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں ایک خوشخبری کی بازگشت سنائی دی کہ دارالعلوم میں جدید عربی زبان و
ادب کی تعلیم کے لیے ایک مستقل شعبہ کھلے گا جس کے سربراہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ
ہوں گے اور اگلے تعلیمی سال سے باقاعدہ اس شعبہ کا آغاز ہو جائے گا۔ اس خوشخبری سے طلباء
کے چہرے کھل اٹھے۔ انھیں اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ
کے علمی تبحّر اور فکری تجدد سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کا موقع میسر آئے گا۔ راقم السطور
کا یہ دورۂ حدیث کا سال تھا۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ اگلے تعلیمی سال فنون میں داخلہ لوں گا اور
ایک سال مادرِ علمی میں مزید رہ کر حضرت الاستاذؒ سے بھی فیضیاب ہو سکوں گا۔ نئے تعلیمی سال کا
آغاز ہوا اور شعبہ کھل گیا، مجھے بھی داخلہ مل گیا۔ اس شعبہ کو درسگاہ وہ ملی جہاں بیٹھ کر حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسنؒ نے قرآن مجید کا شہرۂ آفاق ترجمہ کیا تھا جو "ترجمۂ شیخ الہند" کے نام سے مشہور ہوا۔ جس درسگاہ
سے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے مسلسل دو دہائیوں تک تشنگانِ علوم حدیث کو سیراب کیا تھا اور
جہاں سے فنِ حدیث کے جواہر پارے انھوں نے پوری دنیا کو لٹائے تھے۔ اب اسی درسگاہ سے
ایک نیا تعلیمی انقلاب وجود پذیر ہونے جا رہا تھا اور ادیبِ عصر، صاحبِ زبان و بیان حضرت مولانا
وحید الزماں کیرانویؒ کی آمد سے وہ نیا انقلاب برپا ہو گیا۔ عربی زبان و ادب کی نئی بہار آگئی۔ نئی
نصابی کتابیں، نیا طریقۂ تعلیم، نیا اسلوبِ بیان، تدریس و تدریب کا نیا طرز، آلاتِ درس کا استعمال،

اوقات کی تحدید و تقسیم اور مناسب و مفید استعمال سے ایک نیا ماحول پیدا ہوا جس میں ذوقِ مطالعہ کو فروغ ملنے لگا۔ عربی زبان میں قلمی جرائد کا سلسلہ شروع ہوا، عربی خطابت و صحافت کے میدانوں میں طلبہ کی فطری صلاحتیں پروان چڑھنے لگیں۔ عربی خطاطی کے فن کو عروج بخشا گیا۔ عربی مجلّہ ”دعوۃ الحق“ کا اجراء عمل میں آیا جس کے ذریعہ عربی زبان میں طلبہ کی علمی، ادبی، فکری اور صحافتی صلاحیتوں کا عوامی مظاہرہ شروع ہوا۔ دُنیائے لغت میں تہلکہ مچا دینے والا ”اردو عربی“ اور ”عربی اردو“ لغت حضرت الاستاذؒ کا علمی شاہکار بن کر سامنے آیا جس سے استفادہ کرنے کے بعد طالبانِ علوم میں نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا ہوا۔ نظم و ضبط اور ڈسپلن کی زندگی پر زور دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دلکش مناظر ہر طرف نظر آنے لگے۔ دَرد محسوس کرنے اور دَرد بانٹنے کا مزاج پیدا کیا گیا اور مواسات و مواخات کے چشمے اُبل پڑے۔ اکرام و احترام اور عقیدت و محبت کا درس دیا گیا اور استاذ و تلمیذ، ہم عصر و ہم درجہ جیسے رشتوں کے تقدس میں انوکھا نکھار آگیا۔ اور یہ سب کچھ وہ ”نیا تعلیمی انقلاب“ اپنے دامن میں سمیٹ کر لایا جو حضرت الاستاذؒ کی تشریف آوری سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں بپا ہوا تھا۔ حضرت الاستاذؒ نے ”دارالفکر“ میں طلبہ کی کردار سازی کی جو مہم محدود پیمانے پر شروع کی تھی۔ انھوں نے اس مہم کو یہاں نہ صرف جاری کیا بلکہ اس کو مزید وسعت دی۔ انھوں نے موم کی بتی کی طرح ہمیشہ اپنے جسم و جان کو پگھلایا اور اپنے طلبہ کی زندگیوں میں حیات نو اور نئی تازگی پیدا کی۔ اپنا آرام و راحت قربان کیا اور اپنے طلبہ کے لیے زندگی بھر کی راحتوں کا سامان مہیا فرما دیا۔ انھوں نے اپنی علمی و انتظامی مصروفیتوں کے پُر ہجوم دَور میں بھی اپنے طلبہ کے فلاح و بہبود کی اسکیموں پر برابر غور کیا جس کی ایک مثال ”صندوق الاسعاف“ کا قیام ہے۔ یہ ایک باہمی امدادی سوسائٹی کے طرز پر مالی فنڈ تھا جو طلبہ کو ہنگامی ضرورتوں میں مالی امداد فراہم کرتا تھا۔ راقم السطور کو اس مالی فنڈ کا پہلا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی ذات طلبا برادری کے لیے مرجع و ملجا بن گئی تھی۔ ان کی محبت اور عقیدت کی جڑیں طلبہ کے دلوں میں گہری ہو گئی تھیں۔ ہر طالب علم ان کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کرتا تھا جس کا زبردست مظاہرہ دارالعلوم دیوبند کے ہنگامہ کے موقع پر سامنے آچکا ہے۔ آج ان کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے طلبہ بڑی تعداد میں مُلک اور بیرونِ مُلک مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان میں سے کئی اہم مناصب اور کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کے سبھی تربیت یافتہ اپنی بہتر کارکردگی کے ذریعہ اپنی ضرورت و اہمیت کو منوا چکے ہیں اور زندگی کے ہر قدم پر ان کے منت شناس ہیں آج ہمارے

سروں سے ان کی زندگی کا گھنا اور خنک بار سایہ اٹھ چکا ہے لیکن ان کی یادوں کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا اور اپنی ضیا پاشی سے دلوں کو منور کرتا رہے گا۔

ہمارے شفیق استاذ ہمہ گیر، ہمہ جہت اور گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جہاں وہ ایک تجربہ کار، کہنہ مشق اور قابل استاذ و مربی تھے وہیں خدا نے ان کو دوراندیشی، تدبر، معاملہ فہمی اور نظم و انتظام کی قابل رشک صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی زندگی صداقت و عدالت، حق گوئی و بے باکی، بلند ہمتی و جرأتمندی نیز خلوص و للّٰہیت کا آئینہ دار تھی۔ انھیں مال و دولت اور جاہ و منصب کی حرص نے نہ کبھی لبھایا اور نہ ابتلا و آزمائش اور فاقہ مستی و تنگدستی کی سختیوں نے کبھی ان کو ڈرایا۔ وہ ایک خدا ترس انسان تھے اور اپنے رب کی خوشنودی کے نشہ سے سرشار اور اس کی رحمت کے خواستگار تھے۔ ان کی خداداد انتظامی و عملی صلاحیتوں کا ظہور اس وقت ہوا جب انھیں ایشیا کی سب سے بڑی علمی و دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے مددگار مہتمم کے منصب پر فائز کیا گیا۔ انھوں نے تعلیم، انتظام اور تعمیر سبھی شعبوں پر توجہ دی، ترقیاتی خاکے تیار کیے۔ قریہ قریہ، شہر شہر دورہ کیا۔ فنڈ اکٹھا کیا اور ان خاکوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیا لیکن ان کی تیز روی کو نظر لگ گئی۔ وہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل نہیں کر سکے اور دارالعلوم کی تعمیر و ترقی کے لیے جو خواب انھوں نے دیکھے تھے وہ ادھورے رہ گئے۔ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند، ملی جمعیۃ علماء ہند اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے بھی سیادت و قیادت اور ملی سرگرمیوں کی اپنی تاریخ بنائی۔ وہ اس میدان کے بھی بابکدست شہسوار تھے۔ وہ ملکی، ملی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ واقعات پر بے لاگ تبصرے کرتے تھے، ہر مسئلہ پر اپنی پختہ رائے رکھتے تھے اور پورے اعتماد سے اپنی دو ٹوک رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ملی زندگی میں بھی تقریباً ایک دہائی تک مجھے ان کی معیت کی سعادت حاصل رہی۔ میں نے بہت قریب سے دیکھا کہ وہ ضمیر و رائے کی آزادی کو بیحد قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کے دل میں زبردست احترام تھا۔ بیجا مداخلت، منصب کا غلط استعمال، شورائیت کی بے حرمتی، موقع پرستی اور وقتی مفاد کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیاسی ناوابستگی کو مسلم تنظیموں کے لیے ریڑھ کی ہڈی خیال کرتے تھے۔ کئی موقعوں پر ان کو اپنے اس خیال کی بالادستی قائم رکھنے میں اپنوں کی زبردست مخالفتوں اور زود رنجیوں کا سامنا ہوتا تھا لیکن وہ اپنی راست گوئی اور اصابت رائے پر نہایت مضبوطی سے جم جاتے تھے اور اس قدر سخت گیر

ہو جاتے تھے کہ کبھی کبھی آں سر کی اس راست گوئی کو ان کی سخت مزاجی پر محمول کرلیا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کا دل بے حد نرم تھا اور مزاج میں بے حد شگفتگی تھی۔ خود رائی اور مداہنت کا دُور دُور تک ان میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ بے غرضی، بے لوثی اور ظاہر و باطن کی یکسانیت انکی فطرت ثانیہ تھی۔ ان کی طبیعت اصول پسند تھی۔ اصولوں کو پاش پاش ہوتے ہوئے وہ کبھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایسی صورتِ حال کو وہ کسی بھی طرح برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ اگر ضرورت ہوتی تو اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ ان کو اپنی روش پر ثابت قدم رہنے کے لیے تا عمر بر سر پیکار رہنا پڑا۔ انھوں نے اس راہ میں اپنی ہڈیاں پگھلا دیں، اپنی بے شمار آرزوؤں کا خون کیا، ان کے کئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے مگر ان کی راست روی استقامت اور ثبات قدمی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ کہیں بھی لغزشِ پا کے شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے تیز و تند طوفانی ہواؤں میں حق و صداقت کا چراغ روشن کیا۔ ظلم و جور کے تاریک ماحول میں مینارۂ نور نصیب کیا۔ وہ صبر و ہمت کے ساتھ خارزاروں سے گذرتے رہے۔ ان کی آبلہ پائی کبھی بھی ان کو قدم بڑھانے سے نہیں روک سکی، یہاں تک کہ آخری بلاوا آگیا اور وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ برسوں کی بے قراری کو قرار آگیا اور ان کی پاکیزہ سیر آنے والی نسلوں کے لیے قابلِ تقلید نمونۂ عمل بن گئی۔ ؏

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

بقیہ : دارالعلوم سے میری سبکدوشی...

کا استقبال کرتا ہوں۔ میرے پاس بفضلہ تعالیٰ ان کی ہر بات ہر انداز اور ہر الزام کا جواب موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بہانہ بن جائے ان کے اعمال کے تمام ریکارڈ کے عوام کے سامنے آنے کا اور ان کے قد اور ان کی شخصیت کو سمجھنے کا۔ ویسے پہلے ہی ملک کا دیندار طبقہ ہو، اہل علم ہوں، خواص ہوں یا عوام انھیں کتنا بھروسہ رہ گیا ہے مولانا موصوف کی سچائی پر؟ اور چونکہ میرا ضمیر مطمئن ہے اس لیے مجھے نہ کسی کا ڈر ہے اور نہ اس دھمکی کی پروا۔ باب الاخلاقیات اور باب المالیات بہت وسیع ہیں، اگر یہ کھل گئے تو اس کے بہت دور رس اثرات ہوں گے۔ اور اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری مولانا اسعد صاحب پر ہوگی۔

مولانا نور عالم خلیل امینی •

اے تو مجموعۂ خوبی...

"مولانا (وحید الزماں کیرانویؒ) لباس و پوشاک کے تعلق سے خاصے نستعلیق اور نفاست پسند تھے، ان کے نزدیک کسی بھی مسئلے میں بے قاعدگی نہایت ناپسندیدہ تھی، چاہے عام مجلس ہو یا بزم احباب یا بزم مشورہ، یا بزم خورد و نوش۔ حد یہ ہے کہ فرش اور بستر کی سلوٹیں ان کو کسی آن گوارہ نہ تھیں۔ طلبہ کا بے جا تکلف اور اساتذہ کے لیے نمائشی طور کھڑا ہونا ان کو نہایت درجہ ناگوار تھا۔ وہ ہمیشہ فرماتے تعظیم در حقیقت دل میں ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام کو نہایت قرینے سے انجام دیتے اور ہر کام کو ڈھنگ سے انجام دینا ان کی فطرت اور مجبوری تھی۔ حتیٰ کہ اسکیل کے ذریعہ کاغذ پر لکیر دینے کا طریقہ بھی ہم لوگ ان سے سیکھا کرتے اور یہ بھی کہ چائے کی پیالی تھوڑے سے پانی سے کس طرح بہت عمدہ طریقے سے دُھلی جا سکتی ہے کمرے میں جھاڑو کس طرح دینی چاہیے، اس کی اچھی طرح صفائی کس طرح ممکن ہے، اس کے سامان کس طرح مرتب کیے جا سکتے ہیں؟

مولانا کا کمرہ جس میں ان کی رہائش ہوتی یا مہمانوں سے ملتے یا لکھنے پڑھنے کے لیے مخصوص ہوتا، اس درجہ مرتب، منظم اور ٹھکانے کا ہوتا کہ ہر آنے جانے والا خصوصاً نو وارد متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، وہ کسی بڑے خرچ سے اور گراں بہا اسباب و کمالیات سے کمرے کو سجا کر اس کا حسن دو بالا نہ کرتے، بلکہ کمرے میں ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر اس قرینے سے چنی ہوتی کہ معمولی چیز بھی غیر معمولی طور پر بھلی لگتی اور نشست گاہ کی مجموعی وضع انسان کو دعوت نظارہ دیتی رہتی۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ماحول میں عموماً میز کرسی اور صوفے وغیرہ کے استعمال کا رواج نہیں اس لیے رہائشی کمرہ ہو یا دیوان خانہ، نشست فرش پر ہی ہوا کرتی ہے۔ فرش پر عموماً ٹاٹ یا اس جیسی کوئی چیز ڈال دی جاتی ہے

• استاذ عربی ادب و ایڈیٹر ماہنامہ الداعی (عربی) دارالعلوم دیوبند

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

اس پر ہلکا گدا یا دری اور اس کے اوپر چاندنی یا رنگین میل خوری چادر بچھادی جاتی ہے اور حسب استطاعت متعدد تکیے اور گاؤ تکیے سے ملاقاتی کمرہ کو سجادیا جاتا ہے۔

مولاناؒ کے وہاں مذکورہ اسباب کو میں نے جس سلیقہ سے ہمیشہ چنا ہوا پایا، خواہ یک بارگی اور پیشگی اطلاع کے بغیر جانا ہوا ہو، یاد نہیں آتا کہ اس کی مثال میں نے کہیں اور دیکھی ہو، چاندنی پر کسی زاویہ میں کوئی شکن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی، وہ چاندنی بچھاتے وقت شکنوں کو دونوں ہتھیلیوں کے ذریعہ طولاً و عرضاً چاندنی پر سہلاکر درست کرتے اور فرماتے کہ فرش کی شکنیں اس کے بغیر کما حقہٗ دور نہیں ہوتیں اور چاندنی، دری یا گدے سے صحیح طور پر نہیں چپکتی لہٰذا برقی پنکھے کی ہوا اور انسانی قدموں سے اس پر لہریں نمودار ہوجاتی ہیں۔

ملاقاتیوں اور مہمانوں سے مولانا نہایت باادب طریقے سے پیش آتے، وہ تکیے اور گاؤ تکیے مہمانوں کو پیش کردیتے اور بااصرار انہیں مسند نشیں بنادیتے اور خود کسی کونے میں بغیر ٹیک کے بیٹھ جاتے۔ ہم ایسے خوردوں کو اس سے بڑی الجھن ہوتی، لیکن وہ کسی طرح اس کے لیے تیار نہ ہوتے کہ مہمانوں کے ساتھ خود بھی تکیہ لگاکر بیٹھ جائیں، اگر مہمان اس کے لیے اصرار کرتے تو فرماتے دیکھئے یہ میرا گھر ہے یہاں میں کسی طرح بھی رہ سکتا ہوں آپ مہمان ہیں اس لیے آپ کے لیے یہی موزوں وضعِ نشست ہے۔

ہم ایسے "بدویوں" کے لئے سب سے بڑا امتحان ان کی مجلس میں چائے نوش کرنا ہوتا، اس لئے کہ ان کے وہاں چائے نوشی میں ہونٹ سے چسکی لینے کی آواز کان لگانے کے باوجود بھی نہیں سنی جاسکتی تھی اور ہم لوگ اس کے کچھ ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ بلا آواز چائے کو ہونٹ اور زبان کی گھاٹی سے براہِ راست حلق میں اتارنے کی شکل میں سارے منہ کو آبلہ زدہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے کوشش اور ان کی ہر ادا کی نقل اتارنے کے جذبے کے باوجود میں اس شائستہ ادا کو اپنانے کی سعادت سے ہمکنار نہیں ہوسکا۔

اس سے زیادہ آزمائش خورد ونوش کے دسترخوان پر ہوتی کہ ان کے وہاں منہ میں نوالہ ڈالنے کے لئے منہ کو وا کرنے اور نوالے کی موزوں مقدار لینے میں ایسا دقیق انسانی اصول کارفرما ہوتا اور نوالے کو چباتے وقت منہ سے کسی طرح کی آواز نہ آنے دینے اور جبڑوں کو بے ہنگم طریقے سے گردش دینے سے محتاط رہنے کے ایسے زریں قاعدوں پر عمل ہوتا کہ انسان اور بہائم کے مابین گہرے فرق کا بخوبی ادراک ان کے دسترخوان پر ضرور ہوجاتا۔

دسترخوان چننے کے لئے ان کے یہاں قاعدہ تھا کہ چاندنی پر ایک اور چھوٹی چادر بچھادی جاتی اور اس پر دسترخوان، فرماتے کہ تمام تر احتیاط کے باوجود کھانے کے ذرات دسترخوان

کے دائرے کے باہر ضرور گر جاتے ہیں اور ذرا سی بے احتیاطی سے فرش کے خراب ہو جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے اس لئے اگر ایک اور نسبتاً چھوٹی چادر ڈال دی جائے تو یہ سب کچھ اسی پر ہوتا ہے اور اس کو دھونا آسان ہوتا ہے، جب کہ فرش کی بڑی سی چادر کی صفائی کا عمل دشوار گذار ہوتا ہے ان کے دسترخوان پر پلیٹیں، چمچے، ڈونگے اور کٹورے وغیرہ پانی سے بھیگے ہوئے قطعاً نہ ہوتے، فرماتے کہ پانی لگے ہوئے برتن سے کراہت ہوتی ہے اس لئے اسے صاف کپڑوں سے پونچھ کر لانا چاہیے یا دھوپ میں سوکھا ہوا ہونا چاہیے۔

چائے دانی، کپ، چمچے، چینی دانی اور دودھ دانی وغیرہ کی صفائی دیدنی ہوتی۔ ہم ایسے لوگوں نے جو یورپ کے ناقابل تصور پچھڑے پن کے نمونے والے دیہات سے دار العلوم آئے تھے محض چائے بھی اچھی اور صاف کیوں پی ہوگی چہ جائے کہ ابلی ہوئی اور دم کی چائے کے لطیف فرق کا شعور ہوتا اور ایک پتی سے دوسری پتی کیوں کر زیادہ نفیس، گراں قدر اور فرحت بخش ہوتی ہے جس کا ایک گھونٹ مکمل مضمون کی آمد، پورے گھنٹہ درس دینے یا دراز نفس تقریر کر لینے اور بعض دفعہ کسی گہرے غم کے ازالے میں کس درجہ مددگار ہوا کرتا ہے اس کا شعور کیوں کر ہو سکتا تھا مولاناؒ فرماتے کہ اچھی چائے کی جاں فزا خوشبو پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی ناک کی راہ سے مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے اور اچھی سے اچھی پتی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پڑ کر پانی کو مناسب وقت تک جوش دینے یا نہ دینے، چائے دانی کو گرم پانی سے قرینے سے دھونے یا نہ دھونے اور چمچیوں کو اور پیالیوں کو صحیح طور پر گرم پانی سے گذارنے یا نہ گذارنے کی وجہ سے بدل جایا کرتی ہے اور کسی بے شعور کے ہاتھ میں پڑ کر تو ساری خصوصیات ہی کھو بیٹھتی ہے، بلکہ بعض دفعہ خود اپنے ہاتھ سے بھی دم کرنے میں بے احتیاطیوں کی بنا پر فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مجلس میں ملاقاتیوں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوتی چائے دم ہی کی پلاتے۔ بعض دفعہ راقم الحروف نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! ایسے موقع پر ابلی ہوئی چائے میں شاید زیادہ آسانی ہو تو فرمایا، کہ ہمارے ہاں چائے کو دال کی طرح ابالنے کے فن سے کوئی بھی واقف نہیں۔ سارے خورد و کلاں دم ہی کی چائے لیتے ہیں۔

مولاناؒ وقت اور وعدے کے بھی بے حد پابند تھے، ہم لوگوں کو طالب علمی کے زمانے سے ان کی پابندیٔ اوقات کا خوب تجربہ تھا، لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا گیا کہ ادھر دو تین سالوں کے دوران ان کی صحبت میں مغربی یوپی کے کئی ایک سفر کئے گئے۔ سفر سے ایک دو روز قبل ہی دیوبند سے بذریعہ کار روانگی کا وقت، منزل پر قیام کی مدت اور واپسی کی میعاد طے ہو جاتی۔

کبھی ایسا نہ ہوا کہ طے شدہ اوقات کی پابندی نہ کی گئی ہو، ایک روز ہم لوگوں کو مرزا پور، رائے پور اور سہارن پور کے سفر پر جانا تھا، وقت صبح سات بجے کا طے تھا، موسم جولائی کا آخر تھا، اتفاق سے رات ہی سے ترشح شروع ہو گیا اور صبح کو موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ یقیناً حضرتؒ آج تو سفر نہیں کریں گے۔ لیکن بارش کی شدت کی وجہ سے کسی کو بھیج کر ان کا عندیہ معلوم کرنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ میں صبح کی چائے پینے کے بعد سفر کی مکمل تیاری کے ساتھ یہی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ان کا فرستادہ آیا اور ان کا یہ پیغام لایا کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ سفر حسب معمول ہوگا۔ البتہ روانگی کے وقت میں آدھے گھنٹہ کی تاخیر ہوگی، اس لئے آپ ٹھیک ساڑھے سات بجے مولانا کے مکان پر پہنچ جائیں۔ اس نئے مقرر کردہ وقت سے دس منٹ پہلے میں چھتری لے کر گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ اسی زور کی بارش میں پھر اسی قاصد نے آکر کہا کہ آپ یہیں رہیں مولانا نے فرمایا ہے کہ اب میں گاڑی لے کر خود یہیں آرہا ہوں تاکہ آپ کو اس تیز بارش میں پیدل چلنا نہ پڑے۔ اس ایک واقعہ سے پابندیٔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بلند انسانی صفت اور ہر ایک کی تکلیف و راحت کا خیال رکھنے میں غیر معمولی باریک بینی سے ان کے کام لینے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سفر کے دوران گاڑی میں بیٹھنے میں ہماری طرف سے لاشعوری طور پر صادر شدہ ذرا سا تکلف کا بھی انھیں احساس ہوتا تو اصرار کرتے کہ آپ کھل کر بیٹھئے، آرام سے بیٹھئے اور اپنی نشست کے دائرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ دیکھئے! مجھے تو صرف اتنی سی جگہ کافی ہے ان کے برادران نے بتایا کہ زندگی کے آخری لمحوں تک کسی بھی اہل تعلق کے آرام و راحت کا حسب سابق خیال کرتے اور اپنے اہل خانہ کو اس سلسلے میں بستر مرگ پر بھی تاکید فرماتے رہے، حتیٰ کہ ڈرائیور کے متعلق بھی ہدایت فرماتے رہے کہ دیکھو! یہ دن میں بہت تھک جایا کرتے ہیں اس لئے عشاء بعد فوراً ان کے کھانے کا انتظام کیا جائے تاکہ جلد سو سکیں۔

مولانا ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنے کے عادی تھے، یہاں تک کہ موم بتی اور دیا سلائی کو بھی، چنانچہ وہ اندھیرے میں انھیں ڈھونڈ لے سکتے تھے۔ ان کے روزانہ کے چھوٹے بڑے مصارف ریکارڈ رہتے یہاں تک کہ وہ پانچ نئے پیسے بھی جو انھوں نے اپنے خاندان کے کسی بچے کو دیئے ہوں اور اس نے پڑوس کی دوکان سے چیز خریدی ہو۔

آداب مجلس کی رعایت میں بے نظیر تھے، ادبی و ثقافتی یا انتظامی مجلسوں میں زیر غور مسائل کے تمام پہلوؤں اور گوشوں تک ان کا ذہن جس سرعت سے منتقل ہو جاتا تھا اس کی مثال شاید و باید ہی پیش کی جاسکتی ہے وہ مجلسوں میں قوت دلائل، حسن گفتار اور منطقیانہ و مربوط گفتگو سے چھا جاتے تھے، ان کی مدلل گفتگو کا جواب بعض دفعہ اچھے اچھوں سے نہیں بن پڑتا تھا۔ اور نوجوانوں

کو اپنی گفتار و کردار سے اپنے اشارے پر چلانے والا ایسا معلّم میں نے اپنی زندگی میں کیوں دیکھا ہوگا؟ ان کی صرف ایک تقریر بعض دفعہ طلبہ میں گویا "طارق بن زیاد" کی افواج کا سا اعتماد اور "خالد بن ولید" کی تلوار کی سی قوتِ عمل جگا دینے کے لئے کافی ہوا کرتی تھی۔ وہ طلبہ کے معاملات میں سختی و نرمی کو اپنی اپنی جگہ صحیح وقت پر اور صحیح تناسب کے ساتھ بروئے کار لانے میں طاق تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت ان کے عمل کا جز تھی۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں سلیقہ و انتظام سے الفت اور بدنظمی سے نفرت کرنے والا ان کے ایسا دوسرا کیوں ہونے لگا، تقریر و محاضرات میں قادر الکلام ایسے کہ جیسے پہاڑوں سے آبشار گر رہا ہو۔ وہ ہمیشہ تیز چلتے، تیز کام کرتے اور تھوڑے وقتوں میں بہت زیادہ نتائج بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خود اعتمادی ان کا سب سے کارگر ہتھیار تھی اور تعجب خیز حد تک انہیں اپنے دست و بازو پر بھروسہ تھا۔ ان کا زرخیز ذہن ہمیشہ سال خوردہ پروگراموں کو مسمار کرتا رہتا اور ہر آن نئے نئے پروگرام وضع کرتا۔ زندگی کے کسی پہلو میں لگے بندھے طرزِ کہن پر تا دیر گامزن رہنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنی ہنرمندی سے صرف چند لمحوں میں مخاطب کے دل میں گھر کر لیتے۔ وہ بیک وقت انسان ساز بھی تھے اور تاریخ ساز بھی، انھوں نے اپنی تقدیر اپنے قلم اور اپنی روشنائی سے لکھی تھی۔ وہ بزم میں گفتگو کرتے یا محض شرکت یا کلاس میں درس دیتے یا مجمع میں تقریر کرتے تو ان کے چہرے پر ایک وقار اور تمکنت ہوتی۔ وہ کسی مجلس میں بار بار پہلو نہیں بدلتے تھے۔ کسی پڑھے لکھے یا زیرِ تعلیم طالبِ علم کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر تعلیماً اور تادیباً ضرور ٹوکتے کہ وہ مدرسوں کے ماحول میں پڑھے لکھے طبقہ کو اس کی تہذیب کے معیارِ مطلوب پر آتار لانے کی تحریک کے سب سے بڑے نقیب تھے۔

منحنی جسم، کتابی چہرہ، کشادہ جبیں، قدرے کشادہ چشم، کشیدہ قامت، گندمی رنگ مائل بہ سفیدی، آنکھوں سے ذہانت و عبقریت کے آثار نمایاں، چھریرا بدن، تیر کی طرح مستقیم القد، رفتار میں وقار، گفتار میں اعتماد و تاثیر، حرارت و صلابت اور دلکشی و حلاوت۔ ایک نفیس سانچے میں ڈھلی ہوئی ان کی پُرکشش شخصیت کی مجموعی وضع پر سفر یا حضر میں جس اجنبی کی نگاہ پڑ جاتی، وہ صاحبِ شخصیت کے غیر معمولی ہونے کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور دارالعلوم میں خصوصاً اور دیوبند میں عموماً جدھر بھی جا نکلتے مرکزِ نگاہ رہتے۔

حرفِ آخر

دنیا جائے فانی ہے اور مسافرانِ آخرت کی سرائے، جو آیا ہے وہ جانے ہی کے لئے آیا ہے اور

کچھ پتہ نہیں کس کو کب جانا پڑے؟ صرف سابق اور لاحق کا فرق ہے۔

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے؟

لیکن دیوبندی مکتب فکر کے مدرسوں سے متعلق نوجوانوں کی نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے حضرت مولانا ؒ کی مثالی خدمات کے پیش نظر (جن کی ہلکی سی تصویر سطور بالا میں پیش کی گئی) اور اس سلسلے میں انھوں نے جو منفرد، اچھوتا اور کم وقت میں زیادہ کارآمد تعلیم و تربیت کا اسلوب وضع کیا اور ان کے ان اوصاف و کمالات کی بنا پر جن میں وہ یقیناً یگانۂ روزگار تھے، نوجوانوں کی جو محبت و عقیدت اور گرویدگی و شیفتگی ان کے حصے میں آئی اس کی مثال برصغیر کے مدرسوں کے کسی مدرس کے سلسلے میں اس دورِ آخر میں نہیں پیش کی جاسکتی۔

اسی لئے ان کی وفات پر جس طرح میں نے نوجوانوں خصوصاً ان کے خوشہ چینوں کو لہو روتے بلکتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا، اور جس طرح ان کا غم تازہ اور ان کی یاد اب تک زندہ ہے اور جس طرح پڑھے لکھوں کی ہر مجلس میں ان کی مدح سرائی جاری ہے وہ بھی ان کی شخصیت کی طرح بے مثال ہے ــــــ اور ہم ایسے پروانوں کو تو شاید زیادہ کراہنے اور گریہ کرنے کی بھی سکت نہیں۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں موجود تو ہیں لیکن میرے اور ان کے دیگر پروانوں کے لئے بے رونق، فکر و خیال کی دنیا اُجڑ سی گئی ہے اور دل و دماغ ایک خرابۂ وحشت ناک سا بن گیا ہے۔

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہے
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، یاد آتے رہیں گے، دلوں اور آنکھوں میں بسے رہیں گے، ان کا کارنامۂ تاباں انفس و آفاق پر چھایا رہے گا اور تاروں کی چمک، چاند کے داغِ جگر، شب کی زلفِ برہم صبح کی برودت، دنوں کی حرارت، بادِ سحرگاہی کی لطافت، شبنم کی افتادگی، ساحل کی بے نیازی، غنچوں کی چٹک، پھولوں کی مہک اور بجلی کی تڑپ میں ان کی یادوں کی قندیل ہمیشہ ضوفشاں رہے گی۔"

("وہ کوہ کن کی بات" سے ایک اقتباس)

مولانا ندیم الواجدی

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

کچھ حقائق، کچھ تاثرات

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں؟ استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کی وفات کے حادثۂ جانکاہ کو کئی ماہ کا عرصہ گذر چکا ہے، اس عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جس دن میں نے یہ ارادہ نہ کیا ہو کہ استاذ محترم کے تئیں اپنی محبت اور عقیدت کا خراج پیش کرنے کے لئے کچھ لکھوں، لیکن جب بھی میں اپنے اس ارادہ کو عمل کا ملبوس پہنانے کے لئے بیٹھا ایسا محسوس ہوا جیسے دل کے سمندر میں جذبات کا طوفان برپا ہو گیا ہو، اور میرے خیالات کی کشتی بپھری ہوئی لہروں میں ہچکولے کھانے لگی ہو۔ نہ جانے کتنی بار کاغذ قلم لے کر بیٹھا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ میں اپنے محبوب اور مشفق استاذ کو کس طرح خراجِ عقیدت پیش کروں، اس عظیم شخصیت کو جس نے ہمیں اپنا خونِ جگر پلایا، جس نے ہمیں ایک مہذب اور باوقار انسان بنانے کے لئے اپنا آرام و راحت قربان کیا، جس نے ہماری زندگی کو مقصدیت عطا کی، جس نے ہمارے عزائم کو بلندی اور حوصلوں کو رفعت بخشی معمولی الفاظ کے ذریعہ کس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔

دنیا میں رات دن آنے اور جانے کا سلسلہ جاری ہے، قیامت تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ یہاں کسی کو دوام نہیں، لوگ آتے ہیں اور کاروانِ زندگی سے بچھڑ جاتے ہیں۔ لیکن بعض شخصیتیں دنیا کو اس

• رکن مجلس عاملہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند — (دارالکتاب دیوبند)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

طرح داغِ مفارقت دیتی ہیں کہ ان کی جدائی کے صدمے سے آنکھیں ہی اشکبار نہیں ہوتیں بلکہ دل روتے ہیں استاذ محترم کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی وہ دنیا سے کیا گئے ان کے ہزاروں تلامذہ، متعلقین و منتسبین کی دنیا تاریک ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر رجوع استاذ محترم کی طرف تھا، اور ان کے تلامذہ کو جس قدر تعلق خاطر اپنے استاذ سے تھا، اور اللہ تعالیٰ نے جو شانِ محبوبیت انھیں عطا کی تھی اس کی مثال دار العلوم کے موجودہ دور میں کہیں نہیں ملتی۔ آج جب میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ استاذ محترم کی روشن اور تابناک زندگی کے کس پہلو کو اپنی گفت گو کا عنوان بناؤں، وہ ایک ایسی دل آویز، طرح دار اور دل نواز شخصیت کے مالک تھے جس کا ہر پہلو ممتاز، منفرد اور جداگانہ تھا، جس کا ہر عمل لائق تقلید اور ہر نقش کف پا لائق اتباع تھا، وہ اپنے عشاق کے لئے شمع یقین تھے، اپنے شاگردوں کے لئے مینارۂ نور اور اپنے متعلقین کے لئے ایک شجر سایہ دار تھے وہ جب تک زندگی سے بہرہ ور رہے اپنے عمل سے ماحول کو اجالے اور پاکیزگی بخشتے رہے۔

ایک طالب علم کو اس کی تعلیمی زندگی میں بہت سے لائق اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، ان میں سے بعض مہربان اور مشفق بھی ہوتے ہیں اور بعض محتاط اور یکسو ہوتے ہیں۔ میں نے بھی دار العلوم کے تعلیمی سفر میں بہت سے لائق تعظیم اور مشفق اساتذہ سے رہ نمائی حاصل کی ہے، ان سب کے بے شمار احسانات مجھ پر ہیں لیکن جو بات استاذ محترم میں تھی وہ کسی میں نہیں تھی وہ دار العلوم کے روایتی اساتذہ کی طرح نہیں تھے جو صرف اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں۔ اور جن کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز وہ اسباق ہوتے ہیں جو ارباب حل و عقد نے ان کو تفویض کر رکھے ہیں یا ان کا دائرۂ عمل ان مناصب تک وسیع ہوتا ہے جو انھیں حاصل ہیں یا جن کے حصول کی امید ہے، استاذ محترم بھی ایک استاذ تھے، ان کے ذمے بھی کچھ اسباق تھے، لیکن وہ استاذ کم ایک مشفق مربی اور ایک مہربان باپ زیادہ تھے۔ میری طرح ان کے لاتعداد شاگردوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ محض تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک رحم دل، ہمدرد اور مزاج شناس باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں، اپنے طلبہ سے ان کا لگاؤ، ان کے مشاغل پر گہری نظر؛ ان کی اصلاح و تربیت کے لئے جہد مسلسل، ان کے مسائل سے دلچسپی، ان کی پریشانیوں میں اضطراب، یہ استاذ محترم کی ایسی خصوصیات ہیں جو روایتی کے اکثر اساتذہ میں ناپید ہیں۔ ہر طالب علم ان سے انتساب کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتا تھا، اور جس نے ان کے دامن میں پناہ لے لی اسے یہ احساس سرشار کر جاتا تھا کہ وہ حالات کی تیز دھوپ سے بچ کر ایک ایسے درخت کے سایے میں آگیا ہے جس کی شاخیں گھنی اور جس کی ہوائیں خنک ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

میں نے اپنی تعلیمی زندگی کے پورے دو سال استاذ محترم کے مخصوص شعبوں تکمیل ادب عربی اور تخصص ادب عربی میں لگائے اور اس عرصے میں ان کی بے پناہ شفقتوں اور محبتوں سے مالامال رہا، مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ استاذ محترم نے اپنی رہنمائی سے میری زندگی کو نیا رُخ عطا کیا۔ میرے تعلیمی سفر کو نیا زاویہ بخشا اور میرے حوصلوں کو نئی جہت دی۔ بہت ممکن تھا کہ میں آج وہ ہوتا جو میں نہ چاہتا تھا۔ خدا کے فضل وکرم سے میں اپنی زندگی کے سفر میں اس راستے پر گامزن ہوں جس پر استاذ محترم نے مجھے چلایا اور میری رہنمائی کی۔

شانِ انفرادیت

دارالعلوم کی تعلیمی زندگی میں مجھے سب سے پہلے استاذ محترم سے القراءۃ الواضحہ کا پہلا حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت دارالعلوم میں درجہ بندی نہیں تھی، بلکہ طلباء اپنی خواہش سے بھی خالی گھنٹوں میں یا خارج میں اسباق لے لیا کرتے تھے، بہرحال کسی گھنٹے میں میرا سبق شروع ہوا، سو ڈیڑھ سو طلباء درس گاہ میں حاضر تھے، دوسری درس گاہوں کے برعکس یہاں کا منظر کچھ غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہوا۔ اب تک تو یہ دیکھا تھا کہ ہر کتاب کا آغاز جانے پہچانے انداز میں ہوتا، استاذ صاحب تشریف لاتے، سلام کا تبادلہ ہوتا، اور اپنی نشست پر تشریف رکھتے۔ کوئی طالب علم کتاب کی ابتدائی عبارت پڑھتا اور استاذ صاحب کی تقریر شروع ہو جاتی۔ یہاں ابتداء ہی عجیب وغریب انداز سے ہوئی۔ نہ کسی طالب علم سے عبارت پڑھنے کے لئے کہا گیا اور نہ لمبی چوڑی تمہید باندھی گئی؛ اور نہ بسم اللہ پر بحث وگفتگو کے دروازے کھولے گئے، بلکہ طلباء کے سامنے تعلیم کی افادیت، عربی زبان کی اہمیت اور سبق کے آداب پر کچھ دل میں اتر جانے والی باتیں کہی گئیں، جب اجنبیت کی دیوار گری اور فضا میں انسیت گھلی تو طلباء سے کہا گیا کہ وہ کھڑے ہو کر اپنا تعارف کرائیں، ہر طالب علم نے اپنا تعارف کرایا، اور استاذ صاحب ہر طالب علم کی طرف اس طرح متوجہ رہے جیسے کوئی منکسر المزاج، اور متواضع میزبان اپنے کسی پسندیدہ مہمان کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ دو تین روز اسی تعارفی کارروائی میں لگے، یہ نقشِ اولیں تھا جو میرے اور مجھ جیسے نو آموز طلباء کی سطح ذہن پر مرتسم ہوا یہ الوکھی کارروائی ہی ہماری گفتگو کا موضوع بن گئی پہلے ہی دن تمام ہم سبق ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔

استاذ محترم کی درسی خصوصیات بھی ان کی شانِ انفرادیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ وہ اس طرح سبق پڑھاتے کہ ایک ایک لفظ ذہن نشین ہو جاتا، پہلے مختلف طلباء سے سبق کی عبارت پڑھواتے، اگر کوئی طالب علم

غلطی کرتا تو دوسرے طالب علم سے سوال کرتے کہ اس نے کیا غلطی کی ہے؟ اگر وہ تبلادیتا تو اس سے عبارت کی تصحیح کراتے، تلفظ کی درستگی اور لہجے کی اصلاح پر خاص توجہ ہوتی، ایک ایک جملہ کئی کئی بار پڑھواتے، دائیں بائیں آگے اور پیچھے بیٹھے ہوئے کسی بھی طالب علم سے عبارت پڑھوائی جاسکتی تھی، اور کسی سے کچھ بھی پوچھا جاسکتا تھا، اسی لئے درس گاہ میں ہر شخص حاضر دماغی کے ساتھ بیٹھتا، جہاں ذرا ذہن بھٹکا، چہرے کے تاثر یا آنکھوں کی گردش سے استاذ محترم نے اندازہ لگالیا، اسی وقت گرفت ہوگئی، عبارت کی قرأت، تصحیح واصلاح اور لہجے کی درستگی کے بعد معانی کا نمبر آتا، پہلے ان الفاظ کے معانی بیان کرتے جو گذشتہ اسباق میں گذر چکے ہیں پھر نئے الفاظ کے معانی بتلاتے، اس کے بعد ترجمہ شروع ہوتا، مختلف طلبار بار بار ایک ہی عبارت پڑھتے اور اس کا ترجمہ کرتے، باقی طلبار سماعت کرتے، دو روز کے بعد مشق و تمرین کا سلسلہ شروع ہوتا، ایک ایک سبق کی تمرین میں کئی کئی دن لگتے، کبھی اردو جملوں کی اعرابی بنوائی جاتی کبھی عربی جملوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جاتا، کبھی سوال وجواب ہوتے، کبھی طلبار کا محادثہ کرایا جاتا، غرضیکہ مشق میں اس قدر تنوع تھا کہ ایک دن کا سبق ہفتوں کا سبق بن جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری القراۃ الواضحہ کا پہلا جزء آخر سال تک چلتا رہا پھر کتابی تعلیم پر ہی قناعت نہیں تھی، ہم اس سبق کے دوران اٹھنے بیٹھنے، گفتگو کرنے چلنے پھرنے اور ہنسنے تک کے آداب سیکھتے تھے۔ درس گاہ میں کیسا لباس پہن کر آئیں، کس طرح سلام کریں، اگر درس گاہ میں تاخیر سے آئے ہیں تو باہر کھڑے ہوکر کس طرح اجازت لیں، کس طرح بیٹھیں، سبق کے دوران استاذ کو کس طرح مخاطب کریں، حد یہ ہے کہ کمرے میں کس طرح رہیں، بازاروں میں کس طرح جائیں، دوکانوں سے کس طرح خریداری کریں، مطبخ سے کھانا کس طرح لائیں یہ اور اس جیسی تمام باتیں ہماری تعلیم کا حصہ بن گئی تھیں اور یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو ہم سب کے لئے نامانوس تھا، لیکن یہ باتیں ایسی تھیں کہ طبیعت خود بخود ان کی طرف مائل ہوتی تھی۔ پھر استاذ محترم کے بولنے کا طریقہ، ان کی گفتگو کا انداز، ان کے سمجھانے کا اسلوب، دل میں اتر جانے والے الفاظ، کبھی ایسا لگتا جیسے سارے بدن میں تیرے اتر گئے ہوں اور کبھی دل کو برف کی سی ٹھنڈک اور پھولوں کی سی خوشبو ملتی، کبھی ایسی حرارت نصیب ہوتی جیسے شعلے بھڑک اٹھے ہوں۔ وہ جادوگر تھے، الفاظ سے ایسا سحر کرتے کہ سننے والا اپنے دل ودماغ پر سے قابو کھو دیتا۔ وہ ایک سحر طراز شخصیت کے مالک تھے، ان کے ایک گھنٹے کے سبق نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ ہم اپنے اردگرد کے ماحول میں امتیاز پاتے جارہے تھے، یہ تھا استاذ محترم کی شاگردی کا پہلا سال۔ اور ان کی ساحری کے زیر اثر آنے کی ابتدا۔

اس کے دو سال بعد استاذ محترم سے مقاماتِ حریری پڑھی، یہاں بھی پڑھانے کا وہی دل آویز

انداز تھا، وہی سرد و گرم لہجہ، وہی دلوں پر حکمرانی کے تیور، وہی سب کچھ تھا جو دو سال پہلے تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کتاب کی مقدار خواندگی بھی مقصود تھی۔ ابتدائی سالوں میں استاذ محترم سے دو کتابیں پڑھیں اور اپنی بساط کے مطابق استفادہ بھی کیا، لیکن اپنی کم ہمتی اور نو عمری کے باعث وہ تقرب حاصل نہ کر سکا جو میرے ہم سبق بعض طلباء کو میسر تھا اور جس کے ذریعے وہ عربی زبان و ادب میں اور تہذیب و شائستگی میں اپنی شناخت بنا رہے تھے۔

عالی ظرفی

چند سال ایسے گذرے کہ ان میں استاذ محترم سے دوری رہی، لیکن دار العلوم کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں میرا انہماک بڑھ گیا، انجمنوں میں حصہ لینے لگا، اردو زبان میں لکھنے کا شوق ہوا اور مختلف رسالوں اور اخباروں میں دینی اور سیاسی مضامین لکھنے شروع کر دیے، کچھ سیاست کا شوق بھی ہوا لیکن صرف مقامی سطح پر اور وہ بھی محض اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر اور اس ہیجان پر قابو پانے کے لئے جو برسر اقتدار کانگرس کے مسلم مخالف فیصلوں سے پیدا ہوتا رہتا تھا، اُن دنوں کانگرس سے اس قدر نفرت تھی کہ کسی مسلمان لیڈر کی اس سے وابستگی کو ہم نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ ایک سرکردہ عالم دین اور ایک مسلم جماعت کے سربراہ اُس زمانے میں کانگرس کے ایک فعال رکن تھے، اور راجیہ سبھا میں اس کے نامزد ممبر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے، استاذِ محترم کو ان سے بڑا تعلق خاطر تھا، ان کی مخالفت میں کوئی لفظ سننا انھیں گوارا نہیں تھا، اسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سلسلے میں وہ سیاہ بل پاس ہوا جس سے اس کا اقلیتی اور اقامتی کردار متاثر ہو رہا تھا مسلمانوں میں اس بل کے خلاف نہایت غم و غصہ تھا، خاص طور پر ملت کے وہ رہنما جنھوں نے اس بل کی خاموش تائید کی تھی مسلمانوں کے غصے کا شکار ہو رہے تھے، ہم بھی جوش اور جذبات سے لبریز تھے۔ اور جن بزرگ کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے خلاف اخبارات میں لکھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ سولہ سترہ سال کی عمر بے شعوری کی عمر ہوتی ہے، عواقب کا خیال نہیں ہوتا۔ اور نہ نفع و نقصان پر نظر ہوتی ہے، اس وقت دار العلوم میں اس مسلم جماعت کی ممبر سازی بھی ہوتی تھی، خاصی تعداد میں طلباء اس کے ممبر بنتے تھے۔ ہم نے پوسٹر لگا کر اور دیواری پرچوں میں مضامین لکھ لکھ کر ممبر سازی کے اس سلسلے کو رکوانے کی کوشش کی، ممبر سازی تو خیر کیا رکتی، طلباء میں گروپ بندی ہو گئی۔ اور وہ اساتذہ بھی کھل کر میدان میں آ گئے جو اس جماعت سے وابستہ تھے استاذ محترم کا تعلق بھی اسی جماعت سے تھا اور اس قدر ریختہ تھا کہ پورے ملک کی مخالفت اور صدائے احتجاج بھی انھیں اپنے موقف سے ہٹنے پر مجبور نہ کر سکتی تھی، اگرچہ استاذ محترم کے پاس ان دنوں ہمارا کوئی سبق نہیں

تھا اور بدقسمتی سے میں اس تعلق کو برقرار نہ رکھ سکا تھا جو گذشتہ برسوں میں قائم ہوا تھا تاہم سلام کلام کا سلسلہ تھا، جب بھی سامنا ہوتا میں ادب واحترام سے سلام کرتا اور وہ محبت سے جواب دیتے، لیکن اس سیاسی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ استاذ محترم نے سلام کا جواب دینا بلکہ نظر اٹھا کر دیکھنا تک بند کردیا۔ یہ بھی استاذ محترم کی ایک ادا تھی، جس سے ناراض ہوتے اپنے طرز عمل سے اس کا صاف صاف اظہار کردیتے، نہ خود میں منافقت تھی اور نہ دوسروں میں منافقت پسند کرتے تھے۔

شاید کچھ وقت گذرنے پر یہ ناراضگی دور ہوجاتی، لیکن دارالعلوم کے ماحول میں رونما ہونے والے ایک اور واقعے نے اس ناراضگی کو مزید غذا فراہم کی۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدینؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم میں بخاری شریف کی تدریس کا مسئلہ انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان اختلاف کا سبب بن گیا تھا، اس وقت حضرت مولانا شریف الحسنؒ کی قابلیت اور علمیت کے سب معترف تھے، علوم حدیث پر ان کی گہری نظر تھی، طلبار بجا طور پر یہ توقع کررہے تھے کہ ان کی بخاری شریف کا درس حضرت مولانا شریف الحسنؒ سے متعلق کیا جائے گا، بالفاظ دیگر انھیں نیا شیخ الحدیث نامزد کیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ ایک دوسرے استاذ کو ان کی سینیارٹی کی بنیاد پر شیخ الحدیث بنا دیا گیا، طلبار کو ان سے تشفی نہیں ہوئی اس لئے سبق شروع ہونے کے بعد بھی یہ کوشش جاری رہی کہ بخاری شریف کا درس ان کے یہاں سے تبدیل ہوکر مولانا شریف الحسنؒ کے یہاں چلا جائے۔ اس سلسلے میں جمہوری طرز پر تحریک چلائی گئی۔ حضرت مہتمم صاحبؒ اور مجلس شوریٰ کے مؤثر اراکین سے ملاقاتیں کی گئیں، اور ان کی خدمت میں درخواستیں پیش کی گئیں، دارالعلوم دیوبند کے جن قدیم استاذ صاحب کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا گیا تھا وہ ان دنوں اس جماعت (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کی دیوبند شاخ کے صدر تھے۔ اس طرح یہ مسئلہ تعلیمی سے زیادہ سیاسی بن گیا۔ استاذ محترم کیونکہ اپنی جماعت میں سب سے زیادہ باحوصلہ النسان تھے، قوت فیصلہ بھی رکھتے تھے، واقعات اور حالات سے اثر لیتے تھے، منافقت سے دور تھے، شخصیات اور مقاصد سے وابستگی کو اخلاص کے ساتھ اہمیت دیتے تھے اس لئے وہ ایک ایسے مسئلے میں جس سے بظاہر ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، یکایک سامنے آگئے، انتظامیہ نے مسئلے کی نزاکت کو محسوس کیا طلبار کے دباؤ سے نہیں بلکہ خالص علمی بنیادوں پر وہ فیصلہ کیا گیا جس کے لئے طلبار جدوجہد کررہے تھے، اس طرح ہمیں اپنی تحریک میں کامیابی تو مل گئی لیکن اس دوران جو واقعات پیش آئے ان سے استاذ محترم کے ساتھ ایک نئے اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔

اس حکایت دراز سے داستان سرائی مقصود نہیں ہے، بلکہ ان واقعات سے استاذ محترم کی مزاجی خصوصیات اور اپنے ساتھ ان کے طرز عمل پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ دورۂ حدیث شریف کا سال پورا ہوا۔ دورہ حدیث شریف کی تکمیل کے بعد طلبار کی بڑی تعداد دار العلوم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجاتی ہے۔ کچھ طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں میں داخلہ لے کر کچھ اور وقت مادر علمی کی رفاقت میں گذارنے کے آرزومند ہوتے ہیں، میری دلی خواہش تھی کہ میں عربی زبان پر دسترس حاصل کروں، اس کے لئے ضروری تھا کہ میں شعبۂ تکمیل ادب میں داخلہ لوں، اس شعبہ کی تمام تر ذمہ داری استاذ محترم پر تھی اور تمام اسباق آپ ہی سے متعلق تھے۔ اگرچہ میں اس شعبے میں داخلے کی تمام شرائط پوری کر رہا تھا لیکن گذشتہ چند سالوں کے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والی تلخی اور دوری نے مجھے اس شعبے میں داخلہ لینے سے روکا۔ میں اپنی کم فہمی کے باعث یہ جرأت بھی نہ کرسکا کہ اپنے بہتر مستقبل کے لئے استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں اور اظہار ندامت سے تلافی مافات کرلوں۔ مجبوراً شعبۂ تفسیر میں داخلہ لینا پڑا۔

اللہ تعالیٰ استاذ محترم کو جزائے خیر عطا کرے انھوں نے جب کسی ذریعے سے یہ سنا کہ میرا ارادہ تکمیل ادب میں داخلہ لینے کا تھا لیکن گذشتہ سالوں کے ناگوار واقعات مجھے اس شعبے میں داخلے سے روک رہے ہیں اور میں ان حالات میں حاضر ہونے کی جرأت سے بھی محروم ہوں تو انھوں نے ازخود میرے ماموں حضرت مولانا شریف الحسن رحمہ اللہ کے ذریعہ کہلایا کہ میرے دل میں کسی طرح کی کوئی رنجش باقی نہیں ہے، وہ میری ناراضگی کے موہوم تصور سے اپنا سال برباد نہ کرے اور فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرے، میرے لئے یہ دعوت ایک نوید تھی۔ ڈرتا ڈرتا حاضر ہوا مسکراکر سلام کا جواب دیا۔ کچھ حوصلہ ملا۔ خود ہی گفتگو شروع کی، فرمایا اس سے خوشی ہے کہ تم تکمیل ادب کرنا چاہتے ہو، مگر تمہاری اس حماقت پر افسوس ہوا کہ تم معمولی واقعات کو بنیاد بناکر اپنا مستقبل تباہ کررہے ہو، پوری گفتگو یاد نہیں، اتنا ذہن میں ہے کہ مجھے پڑھنے لکھنے میں انہماک اور سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی کی تلقین فرمائی، آخر میں فرمایا کہ تم ضرور اس شعبے میں داخلہ لو، ماضی میں جو ہوچکا ہے اسے بھول جاؤ لیکن تمہیں یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ مستقبل میں کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔
میں اس زمانے میں ایک مقامی پندرہ روزہ اخبار میں ایک خاص شخصیت کی کانگریس نوازی کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ اس خاندان سے مجھے محبت اور تعلق ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ تم بھی تعلق رکھو لیکن کوئی ایسا کام بھی نہ کرو جس سے مجھے تکلیف ہو اور دوسروں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ تمہارا فلاں شاگرد ایسا کر رہا ہے۔

اس واقعے سے استاذ محترم کی متعدد اہم خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے، بلاشبہ وہ اعلاظرفی اور

وسیع المشربی کا زبردست نمونہ تھے، انھیں اپنے شاگردوں کے بہتر مستقبل کی فکر دامن گیر رہتی تھی، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ استاذ اور شاگرد کے درمیان بے مثال ذہنی ہم آہنگی ہو تاکہ شاگرد صحیح طور پر اکتساب فیض کر سکے۔ پھر جس جماعت کے وہ رکن تھے، اور جس شخصیت کو اس کے خاندانی پس منظر کے باعث یا اس کی ملکی و ملی خدمات کی وجہ سے اپنا قائد مانتے تھے اس سے مکمل وفاداری بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ اس شخصیت کے خلاف کوئی نامناسب بات سننے کے متحمل نہیں تھے خاص طور پر اپنے تلامذہ سے۔

تکمیل ادب میں داخلے کے بعد تعلیم کا آغاز ہوا۔ شروع کے چند دنوں ہی میں استاذ محترم نے یہ اندازہ لگالیا کہ جماعت کے کچھ طلبار اچھی صلاحیت رکھتے ہیں اور کچھ کمزور ہیں۔ فوراً ہی طلبار کے دو گروپ بنادیے گئے۔ اور کمزور طلبار کو مولانا عبدالخالق مدراسی کے سپرد کر دیا گیا جو ان دنوں حضرت کی کوشش اور جدوجہد سے معاون مدرس کے طور پر مقرر کئے گئے تھے اور دوسرے گروپ کو اپنے پاس رکھا، خوش قسمتی سے میرا تعلق اسی دوسرے گروپ سے تھا۔ اللہ کا فضل ہے میں نے اپنے استاذ محترم کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کی، اور مختلف مواقع پر حضرت کی ستائش سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ میں اپنی کوشش میں کچھ نہ کچھ کامیاب ضرور ہوں۔

النادی الادبی ایک مکمل ادارہ

ان دنوں دارالعلوم میں عربی زبان سیکھنے کا شوق کافی بڑھا ہوا تھا، بے شمار طلبار القرأۃ الواضحہ کے اجزار سبقاً سبقاً پڑھنے میں مصروف تھے، استاذ محترم نے عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے مقصد سے، طلبار کو مشق و تمرین کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے "النادی الادبی" کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی، استاذ محترم اس کے المشرف العام (سرپرست اعلا) تھے۔ انجمن کی باقی تمام ذمہ داریاں طلبار کے سپرد تھیں، بہ ظاہر یہ ایک انجمن تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں طلبار عربی زبان میں تحریر و تقریر کی مشق بھی کرتے تھے اور تہذیب و شائستگی کا درس بھی لیتے تھے۔ دارالعلوم کے تمام ذہین، باشعور اور باصلاحیت طلبار اس انجمن کے رکن تھے، اور اس طرح استاذ محترم النادی الادبی کے ذریعے بلکہ النادی الادبی کے واسطے سے اپنی خدمات کے ذریعے تمام طلبار کے دل و دماغ پر حکومت کرتے تھے۔

ابھی تعلیمی سال کے آغاز کو ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ استاذ محترم نے "النادی الادبی" کی نئی کابینہ تشکیل فرمائی اور میں اس وقت خوشگوار حیرت میں پڑ گیا جب استاذ محترم نے یہ بتلایا کہ تمہیں "النادی الادبی" کا معتمد بنادیا گیا ہے، یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، دارالعلوم دیوبند میں طلبار کی سب سے بڑی انجمن کا معتمد بننا

کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا، ماضی میں لائق اور ہونہار طلبار اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے، استاذ محترم کا یہ فیصلہ جس طرح میرے لیے باعثِ حیرت تھا اسی طرح دوسرے لوگ بھی کچھ کم حیرت زدہ نہیں تھے، ہر شخص یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ ایک ایسے شخص کو جس کی وابستگی دوسرے گروپ سے ہے (حالانکہ ایسا نہیں تھا) اس اعزاز سے سرفراز کرنا ہوش مندی اور دانائی نہیں ہے، جماعت کے بعض لوگوں نے کھلے لفظوں میں اس فیصلے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن استاذ محترم نے کبھی اس طرح کے دباؤ قبول نہیں کئے، وہ اگر کوئی فیصلہ کرتے تو اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر ہوتی تھی، فیصلہ کرنے کے بعد محض کسی کے کہنے سے اس کو مسترد کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا، اس لئے نکتہ چینوں کو دوٹوک الفاظ میں بتلا دیا گیا کہ یہ فیصلہ تعلیمی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ اس کا جماعتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تکمیلِ ادب عربی اور النادی الادبی میں شرکت نے استاذ محترم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ حاضر رہنے کے مواقع بخشے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دن میری زندگی کے سنہرے دن تھے، میں نے اگر کچھ سیکھا تو انہی دنوں میں، قدم قدم پر استاذ محترم کی رہنمائی نے ذہن و فکر کی دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ استاذ محترم روایتی استاذ نہیں تھے بلکہ وہ ایک مہربان باپ تھے جس کو ہر لمحہ اپنے بیٹے کے تابناک مستقبل کا خیال رہتا ہے، انھیں اپنے وقت اور صحت کی فکر نہیں تھی، وہ دارالعلوم کی زندگی میں ایسی مشین بن گئے تھے جسے ہر وقت متحرک رہنا ہے۔

دل چاہتا ہے "النادی الادبی" کا کچھ اور ذکر کروں، یہ انجمن استاذ محترم کی محنتوں کا ثمر، ان کی امنگوں کی آماجگاہ، ان کے حسین خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کی اُڑان، اور ان کے خونِ جگر سے سینچا ہوا وہ شاداب پودا تھا جو اب تناور درخت بن گیا ہے اور جس کے برگ و بار دارالعلوم کی حدود سے گذر کر اب دنیا کے بے شمار مدارس میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ انجمن استاذ محترم کی ایک ایسی علمی یادگار ہے جسے مستقبل کا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کے ذریعے استاذ محترم نے جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن جو لوگ اس انجمن کے رکن رہ چکے ہیں وہ اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ انجمن دارالعلوم کے ان طلبار کے لئے تشکیل دی گئی تھی جو عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق کرنا چاہتے ہوں، اس کا ایک دفتر تھا، جس میں سلیقے سے متعدد ڈیسک رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈیسک پر النادی الادبی کے کسی ایک ذمہ دار کے منصب کی تختی رکھی ہوئی تھی، الماریوں میں قرینے سے فائلیں اور رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طلبار کی تحریری کاوشوں کے نمونے شیشے کے بڑے بڑے فریموں میں آویزاں تھے — النادی الادبی کا مکمل نظام تھا، پوری انجمن مختلف شعبوں پر منقسم تھی، شعبۂ تقریر، شعبۂ تحریر، لائبریری،

مالیات، شعبۂ اصلاح، شعبۂ تعاون وغیرہ۔ ہر شعبے میں تین عہدے دار تھے، ایک ناظم، دوسرا نائب ناظم تیسرا معاون، معتمد ان تمام شعبوں کا سربراہ تھا اور براہ راست سرپرست اعلا کو جواب دہ تھا۔ شعبۂ تقریر کے تحت طلبا عربی زبان میں تقریر کی مشق کرتے تھے اس کے لئے جمعرات کے دن مغرب کی نماز کے بعد دار العلوم کی مختلف درسگاہوں میں آٹھ آٹھ دس دس طلبا ایک جگہ بیٹھتے، ایک طالب علم جوان سب میں ممتاز اور باصلاحیت ہوتا، ان کی نگرانی کرتا۔ یہ ایک چھوٹا سا جلسہ ہوتا تھا، اور اس میں ایک مکمل اجلاس کے آداب کی رعایت کی جاتی تھی۔ مراقب یا نگراں کسی طالب علم کے نام کا اعلان کرتا اور وہ متعین جگہ پر کھڑے ہو کر اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تقریر کرتا۔ نگراں کے پاس النادی الادبی کے مطبوعہ فارم ہوتے تھے، جن پر مقرر کا نام اس کی تقریر کا عنوان تحریر کیا جاتا۔ اور یہ لکھا جاتا کہ اس نے کتنی دیر تقریر کی ہے، اس کا لہجہ کیسا تھا۔ اس کی تقریر میں نحوی، صرفی اور لغوی غلطیاں کتنی تھیں، بعد میں یہ فارم دفتر میں جمع ہوتے، اس طرح تمام ممبر طلبا کی ہفتہ وار سرگرمیوں کی رپورٹ معتمد کے سامنے رہتی۔ ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی ان جلسوں میں خاص طور پر ان طلبا کو ترجیح دی جاتی تھی جن کی کارکردگی ہفتہ وار اجتماعات میں بہتر رہی ہو۔

ماہانہ جلسوں کی اپنی الگ شان تھی، کافی دن پہلے دار العلوم کے صدر گیٹ پر یہ اعلان لگا دیا جاتا تھا کہ فلاں تاریخ کو النادی الادبی کا ماہانہ اجتماع منعقد ہوگا، جو طلبا اس اجتماع میں اپنی تحریری یا تقریری کاوشیں پیش کرنا چاہتے ہوں وہ درخواست دے دیں، اسی کے ساتھ اجتماع کی باقاعدہ تیاری شروع ہو جاتی۔ خواہشمند طلبا سے ان کے مقالے، تقریریں، نظمیں اور محادثے حاصل کر لئے جاتے، معتمد اور شعبۂ تقریر کے ذمہ دار لوگ ان کاوشوں پر غور و خوض کرتے، ضرورت ہوتی تو اصلاح کرتے، لمبی اور طویل تحریروں کو مختصر کرتے تاکہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ طلبا کو موقع دیا جا سکے۔ یہ اجلاس پورے مہینے کی کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا تھا اس لئے بڑی دلجمعی اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اس کی تیاری ہوتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ پورا پروگرام اتنا دلچسپ اور ہمہ جہت ہو کر سامعین شروع سے آخر تک جلسہ گاہ میں جمے رہیں۔ اس مقصد کے لئے نئے نئے موضوعات پر دلچسپ محادثے (مکالمے) تیار کئے جاتے تھے، اور دو ایک تقریروں یا مقالوں کے بعد ایک محادثہ پیش کر دیا جاتا تھا۔ ماہانہ اجتماعات میں استاذ محترم لازماً شرکت فرماتے تھے، بعض دوسرے مدرسین کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر اساتذہ دار العلوم ہی جلسوں کی صدارت بھی کیا کرتے تھے۔

راقم السطور جب النادی الادبی کا معتمد تھا تو ایک مرتبہ استاذ محترم نے ایک نئی تجویز رکھی کہ ماہانہ

اجتماعات کی صدارت کوئی ذہین اور ممتاز طالب علم کیا کرے، کسی جلسے کی صدارت کرنا بھی ایک فن ہے اور دار العلوم سے رخصت ہونے کے بعد ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ کسی جلسے کی صدارت کرنی پڑ جائے، اس لئے تقریر کی طرح صدارت کی مشق بھی ہونی چاہئے، دار العلوم کے ماحول میں یہ انوکھا فیصلہ تھا، اول تو کوئی طالب علم اپنے ہی جیسے ساتھیوں کے اجتماع کی صدارت کرے۔ یہ معاملہ ہی کچھ کم حیرت انگیز نہیں، پھر اپنے اساتذہ کی موجودگی میں صدارت کرنا، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دار العلوم کے روایتی ماحول میں جہاں عربی زبان کا یہ چلن ہی لوگوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا اس طرح کی جدت طرازیوں پر کیا کچھ واویلا نہ ہوا ہوگا، لیکن ظاہر ہے استاذ محترم کا یہ فیصلہ کسی کی اہانت کے لئے نہیں تھا اور نہ اس لئے تھا کہ طلبا میں عُجب اور پندار پیدا کیا جائے بلکہ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ طلبا جس طرح نظامت اور خطابت کی مشق کرتے ہیں اسی طرح صدارت کی بھی مشق کرلیں۔ بہر حال متعدد طلبا نے اپنے اساتذہ کرام کی موجودگی میں صدر جلسہ بننے کا شرف حاصل کیا۔ پورے وقار اور ادب کے ساتھ، اپنے بڑوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، محض مشق کی خاطر، نہ کہ خود نمائی اور ستائش کے لئے۔

دار العلوم کے تعلیمی اور ثقافتی ماحول پر "النادی الادبی" کے ماہانہ اجتماعات کے زبردست اثرات مرتب ہوتے تھے، طلبا میں عربی زبان سے دلچسپی اور وابستگی بڑھتی تھی، نئے طلبا آنا چاہتے تھے، اور پرانے طلبا زیادہ بہتر انداز میں کام کرنا چاہتے تھے اور کامیابیوں سے حوصلہ پاکر ذمہ دار طلبا نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اجتماعات میں پیش کئے گئے پروگراموں کے معیار اور جلسہ گاہ کے نظم و نسق میں استاذ محترم کے ذہن و فکر کی جھلک ملتی تھی۔ یہ ماہانہ اجتماعات دوسری اصلاحی انجمنوں کے لئے نمونہ اور معیار قرار پاتے تھے۔

النادی الادبی کا سالانہ اجتماع دار العلوم کی تعلیمی زندگی کا ایک بے مثال، پرجوش اور کیف آور واقعہ ہوا کرتا تھا، تقریباً دو ماہ پہلے سے اس اجتماع کی تیاری شروع کر دی جاتی تھی، خواہشمند طلبا سالانہ اجتماع میں پروگرام پیش کرنے کے لئے درخواستیں دیتے تھے، مگر ترجیح ان طلبا کو دی جاتی تھی جنھوں نے ہفتہ وار اور ماہانہ اجتماعات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو، جس کی درخواست منظور ہو جاتی اسے اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق موضوع دیا جاتا۔ اجتماع سے کافی پہلے تمام طلبا سے ان کے موضوعات تحریری شکل میں لے لئے جاتے، ان پر غور کیا جاتا، بعض طلبا کے مضامین دفتر ہی میں صحیح کر دیئے جاتے، اور بعض طلبا سے دوبارہ لکھنے کے لیے کہا جاتا، بعض طلبا کو دفتر میں بلا کر تقریریں اور محادثے سنے جاتے۔ جلسہ گاہ کے نظم و نسق کے متعلق تمام جزئیات پر نظر ڈالی جاتی اور ہر کام کے لیے طلبا میں سے ذمہ دار مقرر کیے جاتے۔ یہ زمانہ النادی الادبی کے اراکین کے لیے

مصروفیت کا زمانہ ہوتا تھا، رات رات بھر دفتر کھلتا، چاروں طرف سے مشقوں کی آوازیں سنائی دیتیں، خاص بات یہ ہے کہ استاذ محترم ہر مرحلے میں اپنے طلبار کے ساتھ شریک رہتے، اپنا قیمتی وقت بھی دیتے اور اپنی جیب بھی ہلکی کرتے۔

یادگار سالانہ اجتماع

راقم السطور کے دور معتمدی میں طلبار نے اس کثرت سے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے درخواستیں دیں کہ ہمارے لئے پروگرام کو سمیٹنا مشکل ہوگیا، مجبور ہوکر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس اجتماع کو دو روزہ کر دیا جلئے، اس طرح طلبار کی اچھی خاصی تعداد کو اجتماع میں پروگرام پیش کرنے کا موقعہ مل گیا۔ النادی الادبی کے سالانہ اجتماعات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں ملک وملت کی کسی اہم شخصیت کو بطور صدر مدعو کیا جاتا تھا، خاص طور سے کسی ایسی شخصیت کو جس کا دارالعلوم دیوبند سے علمی اور فکری تعلق بھی ہو، اس اجتماع کی صدارت کے لئے دارالعلوم دیوبند کے سابق رکن شوریٰ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ (امیر شریعت بہار) کو دعوت دی گئی تھی، سہولت یہ ہوئی کہ اس موقع پر دارالعلوم کی مؤقر مجلس شوریٰ کا اجلاس بھی منعقد ہو رہا تھا، اس طرح مجلس شوریٰ کے تمام اراکین کو النادی الادبی کی سرگرمیوں، اور عربی زبان کے لئے ان کے جذبوں اور ولولوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

اجتماع رات میں تھا، دن میں النادی الادبی کی طرف سے ایک عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں النادی الادبی کے تمام اراکین کے علاوہ دارالعلوم کی تمام اصلاحی انجمنوں کے صدور اور نظما بھی مدعو تھے، دارالعلوم کے تمام اساتذہ کو بطور خاص دعوت دی گئی تھی، بہت سے اساتذہ نے عصرانے کو رونق بخشی۔ اس پروگرام کی مرکزی شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تھے، عصرانے کا اہتمام دارالحدیث فوقانی میں کیا گیا تھا۔ اور کوشش یہ کی گئی تھی کہ تمام حاضرین ایک ہی نشست میں چائے نوش کرلیں۔ استاذ محترم نے پورے پروگرام کی خود نگرانی فرمائی اور ہر کام میں پورا پورا حصہ لیا، نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ دارالحدیث میں ایک دائرہ سا بن گیا، درمیان میں حضرت مہتمم صاحبؒ اور اساتذہ کرام جلوہ افروز ہوئے اور ان کے چاروں طرف طلبار کی قطاریں لگیں، اس خوبصورت اور باوقار منظر سے حضرت مہتمم صاحب بیحد متاثر ہوئے، اور اپنے مزاج کے مطابق تعریفی کلمات ارشاد فرمائے، استاذ محترم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے درخواست کی کہ اجتماعی کھانے میں اللہ نے جو برکت اور وقار رکھا ہے وہ الگ الگ کھانے میں نہیں ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر دارالعلوم میں طلبار کے لئے اجتماعی طور پر کھانا کھانے کا کوئی کشادہ ہال تعمیر ہو جائے، حضرت مہتمم صاحب نے اس خیال کی تصویب فرمائی۔ اور وعدہ فرمایا کہ وہ اس ضمن میں مجلس شوریٰ کے رواں اجلاس میں

تجویز رکھیں گے، معلوم ہوا یہ تجویز رکھی گئی، اور منظور بھی ہوئی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے لئے اس جگہ کا انتخاب بھی ہوا جہاں آج کل رواق خالد ہے، لیکن معلوم نہیں کس طرح یہ تجویز سرد خانے میں چلی گئی اور آج تک سرد خانے میں ہے، جب کہ بے شمار مدارس میں اجتماعی طور پر کھانے کے کامیاب تجربے ہوچکے ہیں گجرات کے اکثر مدارس میں اس مقصد کے لئے وسیع ہال تعمیر کئے گئے ہیں، تمام طلبار وقت مقررہ پر آتے ہیں اور بیس پچیس منٹ میں کھانے سے فارغ ہوکر چلے جاتے ہیں، نہ مطبخ میں لائن لگانی پڑتی ہے، نہ کھلے برتنوں میں کھانا لے کر دو دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، نہ یخ سالن کھانا پڑتا ہے، نہ طلبار کا ذہن برتنوں کو دھونے رکھنے میں مشغول ہوتا ہے، نہ کمرے گندے ہوتے ہیں، نہ کم کھانے والے کھانا ضائع کرتے ہیں اور نہ زیادہ کھانے والے بھوکے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں ارباب دارالعلوم ایک ساتھ بٹھا کر کھلانے کو معیوب سمجھتے ہیں؟

یہ ایک جملہ معترضہ آگیا ورنہ میں تو اجتماع کے سحر میں گم تھا ـــــ استاذ محترم کی نگرانی، توجہ اور شوق نے، منتظمین کی محنت اور جانفشانی نے اور عام طلبائے دارالعلوم کے جوش وخروش نے اس جلسے کو ایک یادگار جلسہ بنادیا۔ آج بھی جب کبھی اس اجتماع کا خیال آتا ہے تو دل کے نہاں خانوں میں یادوں کے چراغ روشن ہوجاتے ہیں۔

استاذ محترم کے تخیل کی پرواز جدا گانہ تھی، نئے بال و پر تلاش کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی جدت طرازیوں سے کسی بھی واقعے کو یادگار بنانے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ استاذ محترم نے صدر جلسہ کے استقبال کے لئے النادی الادبی کے اراکین میں سے تقریباً ۳۰۰ طلبار کا انتخاب فرمایا تھا۔ اس گروپ میں شامل تمام طلبار سفید کرتے سفید پاجامے اور سفید دوپلی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ سفید کرتے پاجامے تو طلبار کے پاس موجود تھے لیکن کیوں کہ طلبار عموماً دیوبندی ٹوپی (گاندھی کیپ کی بگڑی ہوئی شکل کی ٹوپی) پہنتے ہیں اس لئے اس موقع کے لئے سفید کپڑے کی ۳۰۰ دوپلی ٹوپیاں بطور خاص سلوائی گئی تھیں۔ دارالحدیث تحتانی کے شمالی حصے میں بنے ہوئے طویل وعریض اسٹیج سے مہمان خانے کے اس کمرے تک جہاں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی مقیم تھے، ان سفید پوش طلبار کی دورویہ قطار بنائی گئی تھی، درمیان میں مہمان محترم کے گذرنے کا راستہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ جیسے ہی مہمان محترم نے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا فضا دارالعلوم تدوم اور الشیخ منۃ اللہ یعیش کے پرجوش نعروں سے گونج اٹھی اور نعروں کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مہمان محترم اسٹیج پر جلوہ افروز نہیں ہوگئے۔ یہ اجتماع استاذ محترم کے حسن انتظام، سلیقہ مندی اور فکر و تدبر کا ایک ایسا مظاہرہ تھا جس کی صدائے بازگشت سے کافی دنوں تک دارالعلوم کے دیوار و در گونجتے

رہے۔ بلاشبہ مبدأ فیاض نے استاذ محترم کو ایسی بے شمار خصوصیات سے نوازا تھا جن کی نظیر ان کے معاصرین میں تو مفقود رہے ہی، سابقین میں بھی کم ملتی ہے اور لاحقین کا حال تو سب پر عیاں ہے۔

شعبۂ تحریر سے روزنامہ کا اجراء

النادی الادبی کا دوسرا بڑا شعبہ قسم التحریر تھا۔ اس شعبے کے تحت النادی الادبی میں شامل طلباء عربی زبان میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کی مشق کرتے تھے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ مضمون نگاری سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کے چند گروپ بنا دیئے جاتے۔ اور ہر گروپ کو ایک دیواری رسالہ نکالنے کا پابند کیا جاتا۔ کچھ رسالے الصف الاول، الصف الثانی اور تکمیل الادب العربی کے طلباء نکالتے تھے، ہر رسالے کا ایک مدیر ایک نائب مدیر اور کچھ اراکین مجلس ادارت ہوتے تھے، رسالوں کے شائع ہونے (آویزاں ہونے) کی تاریخ مقرر ہوتی تھی، رسالہ شائع ہونے سے قبل مضامین نگار حضرات اپنے اپنے مضامین ایڈیٹر کے سپرد کردیتے۔ ایڈیٹر (جو اپنے گروپ میں ممتاز ہوتا تھا) مضامین کی خود اصلاح کرتا یا اپنے سینئرز کو دکھلا دیتا، اس کے بعد سفید کاغذ پر جس کے چاروں طرف پھولوں کی رنگین بیل بنائی جاتی تھی کوئی خوشخط طالب علم مضامین کی کتابت کرتا، النادی میں کچھ طلباء استاذ محترم کی کرم فرمائی سے بہترین کاتب بن گئے تھے اور ہر سال دو تین طالب علم اچھے کاتب ہوجاتے تھے۔ جن میں سے کئی آج بھی اس فن کی بدولت روزی روٹی سے جڑے ہوئے ہیں، یہاں یہ بھی بتلادوں کہ استاذ محترم اردو اور عربی کے بہترین کاتب بھی تھے۔ بلکہ عربی ٹائپ کے حروف کو قلم سے لکھنے کے فن کے موجد تھے، جو طلباء اپنے ذوق سے عربی کی کتابت سیکھنا چاہتے تھے استاذ محترم ان کی رہنمائی فرمادیتے تھے، اور وہ لوگ چند روز کی محنت اور مشق سے بہترین کاتب بن جاتے تھے۔ ایسے ہی کاتب طلباء رسالے کا نام اور اس کے مضامین کے عنوانات کی کتابت کردیا کرتے تھے۔ کتابت کے تمام لوازمات النادی الادبی کی طرف سے مہیا کئے جاتے تھے۔ کتابت کے بعد رسالہ شیشے کے ایک فریم میں سجا کر دارالعلوم کے صدر گیٹ پر آویزاں کردیا جاتا تھا۔ ہر رسالہ ہفتہ دس روز دیوار پر معلق رہتا، اور جب ناظرین کی توجہ کم ہوجاتی تو اس فریم میں دوسرا رسالہ لگادیا جاتا۔ اس طرح دس بارہ رسالے ہر ماہ شائع ہوتے، عام طور پر ماہانہ رسالوں کا دستور تھا کیونکہ درسی مصروفیات کے بعد اس طرح کی "غیر درسی" سرگرمیوں کے لئے وقت ہی کہاں ہوتا تھا، تاہم تکمیل ادب کے طلباء "النادی" کے نام سے پندرہ روزہ رسالہ نکالتے تھے۔ ہمارے زمانے میں ایک جدت یہ ہوئی کہ طلباء نے استاذ محترم کی رائے مشورے اور ہمت افزائی سے "النادی" کو پندرہ روزہ کے بجائے روزنامہ بنادیا۔ راقم السطور اس کا ایڈیٹر تھا، میرے ایک ساتھی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں استاذ ہیں معاون

ایڈیٹر تھے اور کچھ رفقاء مجلس ادارت میں شامل تھے، ہم ملکی اور غیر ملکی خبریں تو روزنامہ الجمعیۃ سے اخذ کرتے تھے اور دارالعلوم کی داخلی خبروں کے لئے دفاتر کے کلرکوں اور چپراسیوں کے انٹرویو لیتے پھرتے تھے، داخلی طور پر ہماری دلچسپی کا محور اساتذہ کرام کی رخصت ہوا کرتی تھی۔ اور ہم یہ خبر کہ آج صبح کون استاذ چھٹی پر ہیں نمایاں طور پر شائع کرتے تھے۔ رات کو دیر تک رسالہ تیار کیا جاتا تھا اور کسی ایک شخص کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ فجر کی اذان اور نماز کے درمیانی وقفے میں روزنامے کا فریم صدر دروازے پر آویزاں کردے۔ نماز پڑھ کر لوٹنے والے طلباء اخبار کے سامنے ہجوم لگا لیتے تھے، حالانکہ اس وقت روشنی بھی پوری طرح پھیلتی نہیں تھی اس طرح کی سرگرمیوں میں استاذ محترم کی رہنمائی اور نگرانی قدم قدم پر تھی، اور ساتھ ہی ہر وقت تعریف اور توصیف کے خزانے بھی ہاتھ آتے رہتے تھے اور یہ اپنے مشفق استاذ کی ہمت افزائی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر رسالے نکالتے تھے، مشق کی مشق تھی، اور دلچسپی سے بھرپور ایک مشغلہ بھی تھا۔

النادی کے دوسرے شعبے

النادی الادبی کے دوسرے شعبے بھی تھے، جن میں سے ایک مالیات کا شعبہ تھا جس کے ذریعے النادی الادبی کے ماہانہ اور ہنگامی چندے وصول کئے جاتے تھے، یہ چندے بہت معمولی ہوتے تھے، زیادہ بڑے مصارف کے لئے ہم ہمیشہ استاذ محترم کے سامنے دست سوال دراز کیا کرتے تھے، دارالعلوم سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی۔ ہم لوگوں کی جد وجہد سے حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حلیمی کے باعث یہ اجازت مرحمت فرمادی تھی کہ النادی الادبی اپنے ماہانہ اور سالانہ اجتماعات میں دارالعلوم کا لاؤڈ اسپیکر سیٹ استعمال کرلیا کرے، ورنہ جن لوگوں کے اختیار میں یہ سیٹ تھا وہ تو مختلف بہانوں سے اس اجازت کو منسوخ کرانے کی کوشش میں لگے رہے، اس اجازت سے ماہانہ مصارف میں کچھ کمی آگئی تھی النادی الادبی میں ایک شعبہ امداد باہمی کا تھا، اس شعبے کے ذریعے نادار طلباء کی مالی مدد کردی جاتی تھی دارالعلوم میں غیر امداد یافتہ طلباء کی معقول تعداد زیر تعلیم رہتی ہے، ان میں سے کچھ طلباء جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اپنے کھانے کا انتظام خود کرلیتے ہیں۔ لیکن جو طلباء معاشی اعتبار سے نہایت غریب ہوتے ہیں اور وہ کسی وجہ سے دارالعلوم کی امداد (طعام) سے محروم رہ جاتے ہیں وہ خشک روٹی کا بھی انتظام نہیں کرپاتے۔ اس وقت دارالعلوم کے مطبخ سے خشک روٹی قیمتاً ملتی تھی، استاذ محترم کے لئے غیر امدادی طلباء کا معاملہ دلی اذیت کا باعث بنا رہتا تھا۔ ظاہر ہے النادی الادبی کوئی خوشحال انجمن نہیں تھی کہ اپنے مصارف کی متکفل بھی ہوتی اور ضرورت مند طلباء کو روٹی بھی مہیا کرتی، متعدد طلباء استاذ محترم سے

ماہانہ وظائف کی شکل میں کچھ رقم حاصل کرتے تھے لیکن ضرورت مند طلباء کی تعداد اچھی خاصی تھی اس لئے ایک مرتبہ یہ حل نکالا گیا کہ جو طلباء اپنی دو روٹیوں میں سے کچھ بچا دیتے ہیں وہ ضائع نہ کیا کریں بلکہ النادی کے آفس میں جمع کرادیا کریں، وہاں سے یہ روٹیاں ضرورت مند طلباء میں تقسیم کردی جائیں گی یا وہ لوگ وہاں آکر کھالیا کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہم لوگ استاذ محترم کے ساتھ دار جدید کے مختلف کمروں کا گشت کرتے اور جو روٹی بچی ہوئی حاصل ہوتی اسے النادی کے دفتر میں لاکر رکھ دیتے، یہ ایک ایسا اقدام تھا شاید ہی کسی کے ذہن میں اس کا تصور آیا ہو، استاذ محترم کو اللہ نے فکر و عمل کی بے پناہ توانائی عطا کی تھی، انھوں نے طلباء کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے سوتے جاگتے بے شمار خواب دیکھے، کچھ کی تعبیر ملی اور کچھ ٹوٹ گئے۔

النادی الادبی کا ایک اور اہم شعبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تھا، اس شعبے کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ طلباء میں دینی اور اجتماعی بیداری پیدا کی جائے۔ طلباء کو نماز کے اوقات میں نماز کے لئے تاکید کرنا، خاص طور پر ظہر اور فجر کی نمازوں میں کمرے کمرے گھوم کر طلباء کو بیدار کرنا، یہ ایک اہم ذمہ داری تھی، فجر کے وقت استاذ محترم خود بھی طلباء کو بیدار کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استاذ محترم کو علمی فضل و کمال کے ساتھ ساتھ ذاتی وجاہت اور شخصی ہیبت بھی عطا فرمائی تھی، اور یہ چیز بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ عام طور پر طلباء کم ہی کسی سے اس حد تک متاثر ہوتے ہیں جس حد تک وہ استاذ محترم سے تھے، ان کی ایک آواز پر، یا قدموں کی آہٹ پر طلباء کا اپنے بستروں سے اٹھ اٹھ کر مسجد کی طرف لپکنے کے مناظر آج بھی نگاہوں کے سامنے روشن ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ یہ سلسلۂ گفتگو دراز تر کروں، اس میں ہے ہی کچھ ایسی لذت۔ "النادی الادبی" ایک انجمن ہی نہیں تھی، بلکہ اپنے آپ میں یہ ایک مکمل ادارہ تھی، ایک تربیت گاہ تھی، جس نے دار العلوم کے طلباء میں عربی زبان کا شوق، اور اسے ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے سیکھنے کا جذبہ بیدار کیا، ان میں اجتماعیت کا شعور اور اس کی طاقت کا احساس بخشا، ان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت راسخ کی کہ وہ بیکار کی چیز نہیں ہیں، بلکہ امت مسلمہ کے لئے ان کی حیثیت شہ رگ کی سی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ النادی الادبی ایک بے جان جسم تھی، اس کی روح استاذ محترم تھے، جنھوں نے اپنے فکر و عمل کی تمام جوانی طلباء دار العلوم کی فکری، علمی اور عملی تربیت کے لئے وقف کردی تھی۔ ایک دور حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمہ اللہ کا دار العلوم دیوبند کا تھا جنھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر تھی کہ وہ کس طرح قطروں کو گہر بنائیں۔ اور کس شخص سے کیا کام لیں کہ وہ آسمان علم پر آفتاب بن کر چمکے۔ ایک شخصیت حضرت علامہ کشمیریؒ کی تھی جن کی تربیت نے جادو جگایا۔ اور ایسے شاگرد تیار کئے جو دار العلوم کی آبرو ہیں۔ ایک شخصیت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی

تھی جنھوں نے ایک چھوٹے سے قصبے کی مسجد کو رجال علم وعمل اور اصحاب فضل وکمال ڈھالنے کا کارخانہ بنادیا ان چند عظیم شخصیتوں کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں اگر کسی نے رجال سازی کے میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ استاذ محترم کی شخصیت ہے۔ انھوں نے اپنے طلبار کو مادی نفع ونقصان سے بے نیاز ہوکر اپنے مفوضہ فرائض سے الگ ہٹ کر کچھ اور بہت کچھ بنانے کی کوشش کی، پھر ان کی جدوجہد کے نتائج بارآور ہوئے۔ آج دارالعلوم کے بے شمار نوجوان فضلار جہاں بھی ہیں، جس جگہ بھی ہیں اور جو کچھ علم دین اور عربی ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ سب استاذ محترم کی تیس سالہ سعی پیہم کو اپنے حسن عمل سے مجسم شکل دے رہے ہیں اور ان کے خوابوں کو تعبیر کا لبادہ پہنا رہے ہیں۔

النادی الادبی کا ذکر کچھ طویل ہوگیا، دراصل استاذ محترم پر کوئی مضمون مکمل ہو ہی نہیں سکتا اگر اس میں النادی الادبی کا ذکر جمیل نہ ہو۔ یہ ان کی ایک ایسی تخلیق ہے جس کو انھوں نے اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا، اپنوں اور غیروں کی سرد وگرم نگاہوں سے اس کے نرم ونازک وجود کو بچایا، مخالفتوں کی تیز وتند آندھیوں سے اس پودے کے گلاب بکھرنے نہیں دیئے۔ اگر کوئی مورخ دارالعلوم کی تاریخ بالکل غیر جانبدار ہوکر لکھے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ النادی الادبی کے حوالے سے استاذ محترم کی طویل جدوجہد کو اور بے مثال خدمات کو دارالعلوم کی تاریخ کا سنہرا عنوان قرار دے گا۔

بے پناہ شفقتیں

تکمیل ادب کے بعد عام طور پر طلبار اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کرکے رخت سفر باندھ لیتے ہیں، دو سال پہلے دارالعلوم نے تکمیل ادب سے فارغ طلبار کے لئے استاذ محترم کی تجویز پر ایک نیا شعبہ قسم التخصص فی 'الأدب العربی' کے نام سے قائم کیا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اس شعبے میں داخلہ لوں، اور اس طرح مادر علمی کے سایے میں ایک سال اور گذار لوں، لیکن میرے گھریلو حالات معاشی اعتبار سے مستحکم نہیں تھے، اس لئے والد محترم سے مزید ایک سال کے لئے اجازت مانگنے کی ہمت نہیں تھی۔ استاذ محترم کے علم میں میری یہ دشواری تھی، اس لئے خود ہی اس کا حل تلاش کرلیا، اور جو کام میں خواہش کے باوجود نہیں کراپارہا تھا وہ استاذ محترم کی شفقت سے ہوگیا۔ میرے والد اور استاذ محترم دونوں ہم سبق تھے، اس حوالے سے دوستی بھی تھی، اس لئے انھوں نے میرے والد سے مل کر انھیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے مزید ایک سال تعلیم میں مشغول رہنے دیں۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی تکلف نہیں کہ استاذ محترم کو اپنے شاگردوں کی بہتری کا جس قدر خیال تھا شاید ہی کسی دوسرے استاذ کو ہو۔

مولانا حبیب الرحمن کیرانوی نمبر

میری زندگی کے یہ دو سال سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان دو سالوں سے پہلے کی زندگی میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اجنبی مسافر لق و دق صحرا میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہو اور منزل کی جستجو میں سرگرداں ہو، یہ دو سال ایسے لگتے ہیں جیسے کسی مسافر کو اچانک اس کی منزل مل گئی ہو۔ استاذ محترم کو اس تعلیمی سفر کے دوران جس قدر تعلق مجھ سے تھا شاید ہی کسی سے ہو، لیکن شاید میرا خیال غلط ہے، میرے تمام احباب اور رفقائے درس، استاذ محترم کی بے پایاں توجہات اور بے پناہ شفقتوں کا ذکر اسی اعتماد سے کرتے ہیں جس طرح میں کر رہا ہوں، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ استاذ محترم کو اپنے ہر شاگرد سے کچھ ایسا تعلق تھا کہ وہ اسے اپنے لئے خاص سمجھ بیٹھتا تھا۔

تکمیل ادب کے سال حالانکہ ہم لوگ مکمل چھ گھنٹے استاذ محترم کے اسباق میں گذارتے تھے، لیکن اس زمانے میں عربی زبان سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا، دل چاہتا تھا کہ کچھ اور وقت مل جائے، اسی جذبے کے تحت میں نے استاذ محترم سے درخواست کی کہ وہ مجھے عربی کا کوئی اخبار پڑھا دیا کریں۔ حسب توقع حضرت نے مصروفیات کا عذر کیا، مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور جب کبھی موقع ملا یہ درخواست ضرور دہرا دی۔ مجبوراً مجھے کچھ وقت عنایت کیا گیا، مگر صرف ان چند لمحوں کا وقت جب استاذ محترم درس گاہ سے کمرے تشریف لے جاتے ہیں اور کچھ وقفے کے بعد دوبارہ کمرے سے درس گاہ تشریف لاتے ہیں، جو لوگ کمرہ اور درس گاہ کا فاصلہ جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مختصر وقت میں عربی اخبار کی ایک سطر بھی مشکل ہی سے پڑھی جا سکتی ہے، مگر میں مایوس نہیں ہوا، استاذ محترم نے میرے ذوق و شوق کو دیکھ کر وقت میں کچھ توسیع فرمائی، مگر وقت ایسا دیا جو ایک طالب علم کے لئے خاص طور پر جو دیر تک جاگتا ہو لذتِ خواب کا وقت ہوتا ہے یعنی فجر سے پہلے، مگر میں اس امتحان میں کامیاب اترا، بالآخر مجھے اطمینان کے چند لمحے نصیب ہوئے اور میں نے ایک عربی اخبار کے کئی صفحے سبقاً سبقاً پڑھے۔

مجھے اردو میں مضامین لکھنے کا شوق تھا اور دورِ طالب علمی میں ہی میرے سینکڑوں مضامین ملک بھر کے اخبار و رسائل میں شائع ہو چکے تھے، استاذ محترم میرے اس شوق سے واقف تھے، اس لئے وہ مجھے اکثر و بیشتر عربی زبان میں مضامین لکھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل میں متعدد عربی مضامین لکھے۔ میرا پہلا مضمون اپنی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ "دعوۃ الحق" میں کافی کچھ ترمیم و اصلاح کے بعد شائع کیا۔ اس زمانے میں جمعیۃ علماء ہند نے اپنا ترجمان الکفاح کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، اس اخبار میں میرے متعدد مضامین، خبروں کے تراجم اور دوسری قلمی کاوشیں شائع ہوئیں۔ لیکن جمعیۃ سے میرے فکری اختلاف کے باعث کبھی میرا نام اخبار میں نہ آ سکا لیکن میں نے محض مشق کے لئے اور تکمیل شوق کی خاطر

لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا اور استاذ محترم سے داد تحسین وصول کرتا رہا۔

استاذ محترم کے ساتھ ناانصافیاں

دار العلوم سے رخصت ہو گیا، لیکن استاذ محترم سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں ان دنوں حیدرآباد میں بسلسلۂ تدریس مقیم تھا جب دار العلوم نے اپنا صد سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا اور اس کی تیاریوں کا آغاز کیا اس سلسلے میں دار العلوم نے اپنے عربی ترجمان دعوۃ الحق کو الداعی کے نام سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور اسے سہ ماہی سے پندرہ روزہ میں تبدیل کر دیا۔ استاذ محترم اس کے مدیر اعلیٰ قرار پائے اور ایک فاضل دار العلوم نائب مدیر قرار پائے۔ لیکن اس زمانے میں دار العلوم میں گروپ بندی کی سیاست زوروں پر تھی، آہستہ آہستہ استاذ محترم کے اختیارات سلب کر لئے گئے، اور نائب مدیر ہی سب کچھ قرار پائے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی جھجک نہیں کہ دار العلوم کی تدریسی زندگی میں استاذ محترم کے ساتھ زبردست ناانصافیاں کی گئیں، وہ ایک ایسے انسان تھے جس کی رائے کی صلابت اور فکر وعمل کی قوت پر دوست دشمن سب یقین رکھتے تھے لیکن جب دار العلوم میں انتظامی اور علمی عہدوں پر تقرری کا سوال اٹھتا تھا تو چن چن کر ایسے ایسے لوگ رکھے جاتے تھے جو کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر چاپلوس ضرور ہوں۔ یہ ناانصافی کا دور تھا، حق تلفی کا زمانہ تھا، کچھ مفاد پرست لوگ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سادہ لوحی اور ضعف وپیرانہ سالی کی بنا پر اس طرح کی سازشیں رچ رہے تھے جن کی وجہ سے قابل لوگ حاشیے میں جا پڑے تھے اور بے صلاحیت لوگ نمایاں ہو رہے تھے۔ غالباً یہی حق تلفیاں اور ناانصافیاں تھیں جن کے خلاف انہیں آواز اٹھانی پڑی۔ اگرچہ اجلاس صد سالہ سے کچھ قبل استاذ محترم کو ارباب حل وعقد نے غیر معمولی طور پر اور توقع کے برخلاف اہمیت دی۔ اجلاس صد سالہ کے نظم ونسق کے لئے تشکیل دی جانے والی کئی کمیٹیوں کا کنوینر یا ممبر نامزد کیا گیا، بہت سے کام متعلق کئے گئے، خاص طور پر تعمیراتی کاموں کی ذمہ داری ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دی گئی یا خود انھوں نے اس ذمہ داری کے بار گراں سے خود کو بوجھل کر لیا۔ بہرحال ان آنکھوں نے دیکھا کہ وہ دن بھر ادھر سے ادھر دوڑ رہے ہیں، کہیں کمرہ بن رہا ہے، کہیں ٹوٹ رہا ہے، کسی عمارت میں اضافے ہو رہے ہیں کسی عمارت کو گرایا جا رہا ہے، شام ہوتی ہے، راج مزدوروں اور لوہے سیمنٹ والوں کا جم غفیر کمرے کے اندر اور باہر موجود ہے حسابات کئے جا رہے ہیں اور ادائیگیاں ہو رہی ہیں، رات ہوتی ہے۔ تمام بہی خواہان دار العلوم گداز بستروں پر محو استراحت ہیں اور یہ مجاہد ٹھیکیداروں اور انجینیروں سے آج کی پیش رفت اور کل کے لائحہ عمل پر مصروف گفتگو ہے۔ تعمیر کا کام بھی اس شان سے کیا کہ اگر رقم کم رہ گئی تو خود ہی سفر کی زحمتیں برداشت کر کے سرمایہ بھی جمع کیا۔ شب وروز کی اس جاں گسل محنت نے وہی کام کیا

جو اسے کرنا چاہئے تھا، صحت جواب دے گئی، یہاں تک کہ جب لوگوں کا جم غفیر دیوبند میں پروانوں کی طرح شمع علم پر نثار ہو رہا تھا اور ارباب اقتدار دونوں ہاتھوں سے تعریف و تحسین کی دولت سمیٹ رہے تھے یہ نحیف و نزار جسم اجلاس کی رونقوں سے دور بستر مرض پر دراز تھا۔ دارالعلوم کے لئے آفاق کی وسعتوں کے در کھل گئے لیکن تمام صلہ، تمام ستائش، تمام برکتیں اور سعادتیں چند مخصوص لوگوں نے سمیٹیں۔ جن لوگوں نے تن من کی بازی لگائی وہ اس طرح نظر انداز کر دیئے گئے جیسے وہ کوئی وجود ہی نہ رکھتے ہوں۔

ناانصافی بے ضمیر لوگوں کو بے حس، بناتی ہے لیکن ضمیر رکھنے والے خود دار لوگ انصاف کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر انصاف پالیتے ہیں، اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں جو انقلاب آیا وہ اسی شخصیت کی جدوجہد کا ثمر تھا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ انقلاب کے لئے یہ اقدام غلط تھا یا صحیح، نہ ہم اس بحث کے دروازے کھولنا چاہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد کے حالات اچھے ہیں یا پہلے کے حالات اچھے تھے، یہاں صرف یہ گفتگو ہے کہ کیا اقتدار کی تبدیلی کے لئے استاذ محترم کی جدوجہد نظر انداز کی جاسکتی ہے جب خیال آتا ہے دل مسوس کر رہ جاتا ہوں کہ استاذ محترم کس قدر سادہ لوح تھے کہ انھوں نے اپنی صحت خراب کی، اپنا سکون برباد کیا، اپنے قیمتی شب و روز ضائع کئے۔ استاذ محترم تو بڑے دور رس، دوربیں، دور اندیش تھے پھر کیا ہوا کہ وہ ایک ایسے مقصد کے لئے اپنی جان کی بازی لگا بیٹھے جس کے نتیجے میں انھیں صحت کی خرابی، دل کی بے چینی اور گوشۂ تنہائی ملا۔ جو لوگ کام بنانے کے لئے ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے کام نکلنے کے بعد اس طرح رخ بدل کر کھڑے ہو گئے جیسے ان سے کوئی شناسائی نہ ہو، کوئی واسطہ نہ ہو۔ استاذ محترم کی زندگی کے بے شمار تابناک باب ہیں لیکن یہ باب ایک سوالیہ نشان ہے جب بھی کوئی شخص اس پر قلم اٹھائے گا اس کے سامنے متعدد سوال اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کسی کی وفاداری کا سوال کسی کی بے وفائی کا سوال، کسی کی جانبازی کا سوال، کسی کی بے رخی کا سوال۔

اس وقت میرے ذہن کی اسکرین پر بے شمار واقعات روشن ہیں، لیکن یہ ایک مضمون ہے کوئی کتاب نہیں، اس میں اتنی گنجائش کہاں کہ جو کچھ ذہن میں ہے وہ سب کاغذ پر منتقل کر دیا جائے، پھر استاذ محترم کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں، ہر پہلو ایک مکمل کتاب بن سکتا ہے اگر کوئی قلم اٹھائے، یقیناً لوگ لکھیں گے، استاذ محترم کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک صاحب قلم ہیں۔ ان شاء اللہ کوئی گوشۂ زندگی تشنہ نہیں رہے گا۔ ان کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، انھوں نے اپنے اسباق سے، اپنی تقریروں سے، اپنی تحریروں سے، اپنی گفتگو سے، اپنے فکر و خیال سے، اپنی کتابوں سے جو چراغ روشن کئے تھے وہ ابھی بجھے نہیں ہیں اور جب تک یہ تحریریں زندہ رہیں گی اور جب تک ان کے شاگردوں کا قافلہ رواں دواں رہے گا ان کے جلائے ہوئے چراغ اسی طرح اجالے بکھیرتے رہیں گے۔

پروفیسر زبیر احمد فاروقی

ایک عہد ساز و عہد آفریں شخصیت

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

" اس زمانہ میں جبکہ دارالعلوم کو مولانا کی شدید ضرورت تھی چند سیاسی شعبدہ گروں نے ان کو دارالعلوم کی خدمات سے محروم کردیا۔ یہ ایک سیاسی جھٹکہ تھا جس نے برقی لہر بن کر ان کی زندگی کی ساری لطافتوں کو خاکستر کردیا۔ وہ سیاسی شعبدہ بازوں کی ستم ظریفی اور سنگ دلی سے واقف نہ تھے۔ وہ فطرتاً و مزاجاً اتنے معصوم اور اپنے کام میں اس قدر مخلص اور سچے تھے کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ ان کے غیر مخلص دوست ان کو دارالعلوم سے اور دارالعلوم کو ان کی خدمات سے محروم بھی کرسکتے ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے کہ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔"

(مولانا سید عیاث الحسن مظاہری " آہ مولانا وحید الزماں کیرانوی " : ماہنامہ دینی مدارس، نئی دہلی اپریل ۱۹۹۵ء)

" مرحوم مولانا کو مولانا مرحوم کو اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر دارالعلوم کو خیر باد کہنا پڑا۔ کئی تنظیموں سے غیر متعلق ہونا پڑا، کیونکہ بہت سے حضرات کی کرسیاں ان کی مقبولیت کی بنا پر ہلتی نظر آئیں۔"

(صادق علی قاسمی: وہ اک چراغ ہوا جس سے زیچ کے جلتی تھی: ماہنامہ نقوش حیات بستی: مئی ۱۹۹۵ء)

مندرجہ بالا اقتباسات مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے بارے میں ان کے سانحہ ارتحال کے موقع پر

• صدر شعبۂ عربی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (فاضل دیوبند)

شائع شدہ اخبارات و رسائل کے اداریوں سے لئے گئے ہیں۔ ان اقتباسات کے توسط سے جس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایک ایسا نقطۂ سیاہ ہے جس کی پرچھائیاں اس عظیم ادارے کے تعلیمی مستقبل کو ہمیشہ متاثر کرتی رہیں گی۔

عالمانہ بصیرت، عملی جدوجہد، مقصد کی لگن، حق گوئی و بیباکی، خلوص و تواضع، حکمت و تدبر، وسعتِ نظر، انتظامی مہارت، وقار و تمکنت اور تلخ نوائی برائے کار تریاقی، ان تمام عناصر کو یکجا کرنے سے جو انسانی تصویر ابھرتی ہے وہ ہے مولانا وحید الزماں مرحوم جیسی شخصیت کی تصویر۔ ان کی زندگی علامہ اقبال کے ان دو شعروں کا مصداق تھی:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

مولانا مرحوم کی شخصیت میں "علماء" کی تمام صفاتِ صالحہ موجود تھیں لیکن وہ "مولویوں" کی تنگ نظری، اندھی تقلید، کم علمی کے ساتھ کبر و نخوت، بغض و حسد، سہولت پسندی، محنت و مشقت سے اجتناب اور سازشی ذہنیت جیسے ناپسندیدہ اوصاف سے کوسوں دور تھے۔

کسی تعلیمی ادارے کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے اربابِ انتظام و انصرام کسی سیاسی دباؤ سے مغلوب ہوکر اس کے علمی سوتوں کو بند کردیں۔ تعمیری تنقید کرنے والی زبانوں کو کتر دیں اور ان ہاتھوں کو مفلوج کردیں جو ادارے کے فرسودہ نظام میں عصری تقاضوں کے پیشِ نظر ایسی اصلاحات کے لئے کوشاں ہوں جن کی وجہ سے ادارے کے اعتبار و وقار میں اضافہ ہو، البتہ اہلِ سیاست اور علمی دولت سے تہی مایہ اصحابِ غرض کے بیجا عمل و دخل کی راہیں مسدود ہوجائیں اور ادارے پر ان کا تسلط خطرے میں پڑجائے۔ مولانا وحید الزماںؒ اسی طرح کی صورتِ حال کا شکار ہوئے۔ ایک فریق نے عرصۂ دراز تک دارالعلوم میں تدریسی دروازہ ان پر بند رکھا، حالانکہ وہ دیوبند میں رہتے تھے اور ان کی صلاحیتیں روزِ روشن کی طرح سب پر عیاں تھیں اور دارالعلوم میں عربی زبان و انشاء کی تعلیم کا اس وقت کوئی باضابطہ انتظام بھی نہیں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب عالمی شہرت کے حامل اس ادارے میں دو چار حضرات ہی عربی زبان میں اظہار و تعبیر کی صلاحیت رکھتے تھے، اور باہر سے جب کوئی عرب مہمان آتا تو ایک مترجم کی تلاش ہوتی تھی۔

مولانا سے میرے تعارف کی ابتدا عربی زبان وادب کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھانے کی دائمی جدوجہد کی مرہونِ منت ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ تعلیم (۱۹۵۶-۱۹۶۱ء) کے دوران اس معہد علمی کے اساتذہ کے علاوہ اس کی چہار دیواری سے باہر جن عبقری شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا ان میں دو نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک مولانا کاشف الہاشمی اور دوسرے مولانا وحید الزماں مرحوم۔ اول الذکر کے یہاں کسی توسط سے رسائی ہوگئی اور تا قیامِ دیوبند ان سے کسبِ فیض کا سلسلہ جاری رہا لیکن مؤخر الذکر سے برسوں تک رابطہ کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد ایک سال تک دیوبند سے باہر رہا، لیکن پھر رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں ملازمت ملنے پر واپس آگیا اور دو سال تک دیوبند میں قیام کا دوبارہ موقع ملا۔ اس دوران "المجلس الهندي للروابط الثقافية" آزاد بھون دہلی کی طرف سے اردو میں ایک مضمون پہلی دفعہ عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ملا۔ میں نے ترجمہ تو کرلیا لیکن کسی ماہر استاذ کی اصلاح کے بغیر اسے "ثقافة الهند" میں اشاعت کے لئے بھیجنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ چونکہ مولانا مرحوم سے استفادہ کی خواہش برسوں سے دل میں تھی اس لئے ہمت کرکے خدمت میں حاضر ہوا اور اصلاح کی درخواست کی۔ مولانا نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود نہایت حوصلہ افزا، خندہ پیشانی اور مربیانہ شفقت کے ساتھ ایک ہی نشست میں ترجمہ پر اصلاح فرمادی۔ یہ تھی مولانا سے میری پہلی تفصیلی ملاقات جس کے نقوش دل پر ابھی تک نقش ہیں۔ اس کے بعد میں جلد ہی دہلی آگیا۔ اور پھر کبھی دہلی اور کبھی دیوبند میں مختصر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا سے میری دوسری تفصیلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں "مسابقہ دارالعلوم دیوبند" کے عنوان سے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہا تھا اس سلسلہ میں دیوبند جاکر مولانا سے ان کی کتابوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور ان کے مستقبل کے پروگراموں کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کی۔ مولانا نے فرمایا کہ وہ المعجم الوسیط اور دیگر متداول عربی لغات کی بنیاد پر ایک ضخیم اور مفصل عربی اردو قاموس تیار کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً انھوں نے اس پر کام بھی شروع کردیا تھا۔ یہ بات ہے ۱۹۸۳ء کی۔ اور اب مولانا کے قریبی حلقوں سے معلوم ہوا کہ مولانا نے ناسازگاری صحت اور متعدد مصروفیات کے باوجود اس کام کو مسلسل لگن کے ساتھ جاری رکھا اور بالآخر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ان کی زندگی میں اس قاموس کی طباعت واشاعت مکمل نہ ہوسکی۔ یہ قاموس جس کا مجوزہ نام "القاموس الوحید" ہے ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور توقع ہے کہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔ اسے بہت مفصل انداز میں مرتب کیا گیا ہے اور اس میں عربی کے تمام متداول الفاظ اور اصطلاحات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے پہلے مولانا کی دو اور ڈکشنریاں "القاموس الجدید" اور "القاموس الاصطلاحی" جو مدارس کے طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔

مجھے اپنی اس محرومی کا شدت سے احساس ہے کہ مولانا کا تقرر جس وقت دارالعلوم میں ہوا اس وقت میں وہاں سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور اس طرح باقاعدہ شاگرد رہ کر ان سے استفادہ نہ کر سکا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کم ملاقاتوں کے باوجود انھیں مجھ سے بڑا خصوصی تعلق تھا جس کا اندازہ ان سے مل کر بھی ہوتا تھا اور دوسرے لوگوں کی زبانی بھی معلوم ہوتا رہتا تھا۔

پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے دوران مولانا کی کتابوں اور "دعوۃ الحق" و "الکفاح" میں شائع شدہ ان کی عربی تحریروں کو تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا۔ ان تحریروں میں اسلوب کی پختگی اور تعبیرات کا جو حسن ہے اس نے مولانا کے لئے عالم عرب کے ممتاز ادیبوں کی صف میں جگہ بنادی تھی۔ ان کے ایک نہایت قریبی شاگرد مولانا نور عالم خلیل امینی نے جو اس وقت دارالعلوم میں ان کے جانشین ہیں بجا طور پر لکھا ہے کہ "عربی زبان کی تدریس کا جو سلیقہ اور طریقہ خزانۂ قدرت سے ان کو ودیعت ہوا تھا برصغیر بلکہ بیرون ملک میں بھی عربی زبان کے بہت کم مدرسین کے حصہ میں آیا ہوگا ...... جو چیز مولانا کو دوسروں سے بالکل ممتاز کر دیتی ہے وہ ان کا پیارا، خوبصورت، آسان ترین اور مفید ترین طریقۂ درس تھا۔ نیز اپنے شاگردوں تک کامیابی سے زیر تدریس مضمون کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات اور جذبات کو منتقل کر دینے کی برق رفتار اور حیرت انگیز صلاحیت اور افہام و تفہیم، مرتب گفت گو اور مخاطب کو مطمئن کر دینے کی بھرپور قدرت اس سے بڑھ کر یہ کہ "بہت دور تک جا پہنچنے کے لئے بہت مختصر راستہ" کی شریفانہ اور ہوش مندانہ راہ نمائی .... ہمارے بہت سے احباب جو مشرق و مغرب کی سیر کر آئے ہیں اور ان میں سے متعدد بڑی جامعات میں اساتذہ ہیں ان کی بھی یہی رائے ہے کہ "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری" (وہ کوہ کن کی بات: ادارہ علم و ادب دیوبند۔ یوپی، ص ۲۴۔ ۲۵)

میں نے کبھی ان کے درس میں تو شرکت نہیں کی ہاں البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عربی زبان سکھانے کے لئے مولانا کی کتاب "القراۃ الواضحہ" کے تینوں اجزا ان کے ماہر تعلیم ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ اسے مولانا کے طویل تجربہ کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ اس میں اسباق کی تیاری میں انھوں نے تعلیم کے عصری منہج کی رعایت ملحوظ رکھی ہے، مسلمان طلبہ کی نفسیات اور ان کے مخصوص ماحول کو بھی ذہن میں رکھا ہے، تعلیم کے دشوار اور اکتا دینے والے طریقوں سے اجتناب کیا ہے، سہل سے دشوار کی طرف نہایت منطقی انداز میں پیش رفت کی ہے۔ اسباق کی بنیاد ضروری نحوی قواعد پر رکھی ہے اور ان کی ترتیب میں عملی ضرورت کو اساس بنایا گیا ہے۔ ہر سبق کے بعد مفید مشقیں دی گئی ہیں اور مثالوں کے ذریعہ طالب علم کے لئے آسانی پیدا کی گئی ہے کہ وہ اسی طرح کے جملے اپنی طرف سے بنائے۔ ایک سبق میں صرف ایک ہی قاعدہ پر اکتفا

کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور قاعدے کو خلط ملط کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی سبق ترکیب اضافی کے قاعدے پر مبنی ہے اور اس سے قبل ترکیب توصیفی پر مبنی کوئی سبق نہیں گزرا ہے تو اس سبق میں کوئی ایسا جملہ نہیں دیا گیا ہے جو صفت و موصوف کے قاعدے پر مبنی ہو۔ اس طرح طالب علم کا ذہن ایک سبق میں صرف ایک ہی قاعدے پر مرکوز رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کی تیاری کے پیچھے جو ذہن ہے وہ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم کا ہے جس کی گرفت تعلیم کے میدان میں زمانہ کی نبض پر بہت مضبوط ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب سالہا سال سے نہ صرف مدارس بلکہ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے اور آج تک کوئی دوسری کتاب اس کی جگہ نہیں لے سکی ہے۔

مولانا نے طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں معمولی سی تبدیلی و اضافات کے ذریعہ دارالعلوم کی فضا میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، وہ دارالعلوم جس کے طلبہ و اساتذہ عربی میں گفتگو کرنے سے شرماتے اور کتراتے تھے اب اس کے در و دیوار سے عربی لہجہ سنائی دینے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ جب "جامع ازہر مصر کے شیخ عبدالحلیم دیوبند تشریف لائے تو انھیں دو چیزوں پر سخت حیرت ہوئی تھی جب انھیں معلوم ہوا کہ اتنا بڑا ادارہ صرف عوامی چندوں سے چلا کرتا ہے تو انھیں مبالغہ نظر آیا اس لئے ڈابھیل جا کر ایک بزرگ سے پوچھا کہ دارالعلوم کیا واقعی صرف عوامی چندوں سے چلتا ہے۔ جب انھوں نے اثبات میں جواب دیا تب یقین آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری حیرت ناک بات یہ تھی کہ استقبالیہ جلسہ کا اناؤنسر درجہ ہفتم کا ایک چھوٹا سا طالب علم تھا جس کی عمر تقریباً پندرہ برس تھی اور بے تکلف عربی بول رہا تھا اور خالص عربی لب و لہجہ میں کارروائی چلا رہا تھا۔ جلسہ کے بعد شیخ عبدالحلیم محمود نے اظہار حیرت کیا کہ ایک بچہ اور ہندوستانی بچہ اتنی صاف عربی اور خالص عربی لہجہ میں کیسے بول رہا ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ دارالعلوم میں عربی کی تربیت کا ایسا ہی انتظام ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بچہ تھا محمد راشد اعظمی اور اس کے فنکار استاد تھے مولانا وحید الزماں، جو خود ڈائس پر تھے اور اپنے شاگرد سے وہ کام انجام دلا رہے تھے جسے دارالعلوم کا بڑے سے بڑا استاد نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس طرح کر رہا تھا کہ شیخ محمود حیرت زدہ رہ گئے۔"

(محمد افضال الحق قاسمی، علم و اخلاق کی دنیا اجڑ گئی: ماہنامہ ترجمان دارالعلوم جدید اپریل۔ مئی ۱۹۹۵ء)

مولانا کی شخصیت کا جو اصلی جوہر تھا اور جو انھیں اپنے متقدمین اور معاصروں سے نمایاں طور پر ممتاز کرتا ہے وہ ہے مردم سازی کے میدان میں ان کی بے پناہ صلاحیت، دارالعلوم کی تاریخ میں بڑے

بڑے بحر العلوم اور اساتذۂ فن گزرے ہیں لیکن ایسے علماء جو علم و فن کے میدان میں اپنی مخصوص مہارت کے علاوہ مردم سازی اور تربیت کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال ہوں چند ہی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں نام مولانا حبیب الرحمان عثمانی رحؒ کا ہے اور دوسرا مولانا وحید الزماںؒ کا۔

مولانا ایک اجتہادی، تعمیری اور انقلابی ذہن و فکر کے مالک تھے اور اسی ذہن و فکر نے انھیں دارالعلوم میں " نشأۃ ثانیہ " کے نام پر اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کیا۔ وہ دارالعلوم کو موروثی تسلط کے دائرہ سے نکال کر ایک آزاد علمی اور ڈیموکریٹک فضا میں لانا چاہتے تھے، لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ نشأۃ ثانیہ کی یہ تحریک کچھ ارباب غرض اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کریں گے اور دارالعلوم پر ایک ایسا جاگیردارانہ نظام مسلط کر دیں گے جو پہلے سے بھی بدتر ہو۔ اور جسے علمی ترقیوں سے کم اور ذاتی مفادات سے زیادہ دلچسپی ہو۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا کو ان کی ہمہ جہتی صلاحیتوں کی بناء پر منصب اہتمام پر بٹھایا جاتا تاکہ اس منصب کا علمی اور انتظامی وقار جس کا سلسلہ خطیب الامت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کی ذات پر آکر ختم ہو گیا پھر سے بحال ہو جاتا لیکن ایک مخصوص سیاست کے تحت ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔

دارالعلوم کی تاریخ میں مولانا وحید الزماں مرحوم کی خدمات کا دور (۱۹۶۲ — ۱۹۹۰ء) علمی اور انتظامی دونوں اعتبار سے زریں عہد کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ علمی سطح پر مولانا نے دارالعلوم کے طلبا کو اس احساس کمتری اور مرعوب ذہنیت سے آزادی دلائی جس کا وہ ندوۃ العلماء کے طلبہ کے مقابلہ میں برسوں سے شکار تھے اور جس کی وجہ صرف عربی میں اظہار و تعبیر کی صلاحیت سے ان کی محرومی تھی۔ مولانا نے ہی پہلی دفعہ استاد اور شاگرد کے درمیان وہ سچا تعلیمی رشتہ قائم کیا جو ان سے پہلے تعلیمی کم اور " خادم و مخدوم " کا زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ کے درمیان جتنی مقبولیت مولانا کو حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ طلبہ کے درمیان ان کی اس مقبولیت کو کچھ اہل سیاست نے جو عرصہ سے صرف سیاسی داؤ پیچ کے سہارے دارالعلوم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے کوشاں تھے، بھانپ لیا اور اس وقت کی انتظامیہ سے مرحوم کے اختلافات کو اپنے اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔ لیکن جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ اس آفتاب کی چمک دمک ان کے ستاروں کو ہمیشہ کے لئے ماند کر دے گی تو انھوں نے اسے دارالعلوم کے افق پر زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہیں دیا۔

بہر حال اسلامی تاریخ کا یہ کوئی نیا المیہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ اور امت مسلمہ اس طرح کے المیوں کو دیکھنے خاموشی سے برداشت کرنے اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد بھول جانے کی عادی ہو چکی ہے۔ اسلامی تاریخ کے دوسرے حادثوں کی طرح یہ حادثہ بھی فراموش کر دیا جائے گا، البتہ جو چیز رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جا سکے گی وہ ہے مولانا کی بے مثال خدمت جو انھوں نے عربی زبان و ادب کے میدان میں تقریباً چار دہائیوں تک انجام دی۔ یہ بڑی

عجیب بات ہے کہ دارالعلوم جیسے اسلامی اور عربی ادارے میں جسے "ازہر الہند" کے نام سے جانا جاتا رہا ہے مولانا مرحوم سے پہلے چند لوگ ہی عربی میں تقریر و تحریر کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مولانا نے اگر اس شدت سے محسوس ہونے والی کمی کو دور کیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد سمتوں میں کوششیں کیں۔ ایک طرف تو انھوں نے طلبہ کے لئے نصابی کتابیں اور لغات تیار کیں جن کی ترتیب میں روایتی نہج سے ہٹ کر عصری تقاضوں کو بنیاد بنایا۔ اور دوسری طرف عربی زبان میں رسالے جاری کئے اور "النادی الادبی" قائم کی۔ ان ہمہ جہتی کوششوں کے نتیجے میں انھوں نے عربی زبان پر قدرت رکھنے والے نوجوانوں کی کئی نسلیں تیار کر دیں جو آج ملک اور بیرون ملک میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ زبان کے سلسلہ میں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ دارالعلوم جیسے عالمی شہرت کے حامل اداروں میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عربی کے ساتھ ساتھ وہاں دوسری زبانوں اور خاص طور پر انگریزی اور ہندی کی تعلیم کا بھی انتظام ہو، بلکہ دعوتی کاموں اور ربادی تقاضوں کو دیکھتے ہوئے ایک ACADEMY OF LANGUAGES کا قیام بھی مفید ثابت ہوگا جس میں طلبہ اپنے اپنے ذوق کی مطابقت سے مختلف غیر ملکی زبانیں سیکھ سکیں۔ شاید مولانا کی توجہ اس طرف نہیں گئی یا چونکہ یہ ایک بہت بڑا پروجیکٹ تھا اس لئے اس کے بارے میں انھوں نے ادارے کے وسائل اور حالات کو دیکھتے ہوئے غور نہیں کیا۔ مولانا کے بعد اب صرف یہی امید کی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم میں ان کے جو علمی ورثا کسی منصب پر فائز ہیں وہ اس چراغ کو بجھنے نہ دیں گے جو مولانا نے روشن کیا تھا۔ لیکن بظاہر یہ کام اس وقت تک مشکل ہے جب تک وہاں مخصوص سیاسی اثرات کی کارفرمائی بدستور جاری ہے۔

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگئے کس سے
گناہگار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے

مولانا کے بعد بھی یہ گلستاں باقی رہے گا لیکن بقول شاعر:

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز ؟
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز ؟

ڈاکٹر شمس تبریز خاں
شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

وحید العصر مولانا وحید الزماں کیرانوی

قحط الرجال کے اس دور میں کسی رجل رشید اور مرد کار کا اپنے درمیان سے اُٹھ جانا کسی قومی حادثہ اور ملی سانحہ سے کم نہیں ہوتا۔ ملت اسلامیۂ ہند و پاک پچھلے دنوں ایک بڑے علمی و ثقافتی خسارے سے دوچار ہوئی جب ذی قعدہ ۱۵ھ/۱۴ اپریل ۱۹۹۵ء کو برصغیر کے ممتاز عالم اور عربی زبان و ادب کے فاضل اجل اور دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ جناب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نے طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اکابر دیوبند نے دارالعلوم کے تعلیمی مقاصد میں علوم دینیہ کے اصول ثلاثہ فقہ و تفسیر اور حدیث پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی اور عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس سے اتنا ہی اعتنا کیا جتنی ان علوم اسلامیہ کے افہام و تفہیم کے سلسلے میں ضرورت تھی اس لیے دارالعلوم کے ابتدائی اور وسطی دور میں عربی زبان و ادب کی تحصیل و تعلیم کو ضمنی و ثانوی مقام دیا گیا۔ لیکن عربوں کی بیداری اور عربی زبان کی عصری اہمیت کے پیش نظر دارالعلوم میں سب سے پہلے شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی نے عربی زبان و ادب کی تعلیم کو مستقل اہمیت دی اور طلبہ کو عربی میں تقریر و تحریر پر آمادہ کیا۔ حماسہ اور دیوان متنبی کے عربی حواشی تحریر فرمائے اور "نفحۃ العرب" کے نام سے عربی نثر کا ایک اچھا تدریسی انتخاب مرتب کیا اور اس پر گرانقدر و فاضلانہ حواشی لکھے۔

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم نے شیخ الادب کے کام کو اور آگے بڑھایا اور حق شاگردی پوری طرح ادا کردیا۔ انھوں نے عربی زبان کی عصری اہمیت کو اچھی طرح محسوس کیا اور دارالعلوم میں عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور اس میں تقریر و تحریر کو اگر اولیت نہیں تو مساوی حیثیت حاصل ہوگئی اور احاطۂ دارالعلوم میں دینی مذاکرے کے ساتھ خالص علمی و ادبی بحثیں اور تقریریں ہونے لگیں، طلبہ کے عربی میں لکھے ہوئے دیواری رسائل شائع ہونے لگے، عربی میں تحریر و تقریر کا ماحول بن گیا، عرب ممالک کے اخبار و رسائل کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا، اسی فضا میں مولانا مرحوم کے برادر خرد اور عربی کے ممتاز اہل قلم مولانا عمید الزماں کیرانوی اور مولانا سید ارشد صاحب مدنی کی زیر ادارت

عربی اخبار" الیقظۃ" شائع ہونے لگا پھر مولانا وحید الزماں صاحب نے دارالعلوم سے ایک سہ ماہی رسالہ "دعوۃ الحق" کے نام سے جاری کیا جواب مولانا نور عالم امینی کی ادارت میں ماہنامہ "الداعی" کے نام سے نکل رہا ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنے عربی درس کو اپنی شخصیت کی سادگی و پرکاری، محنت و مستعدی، طلبہ کے ساتھ بے تکلفی کی حد تک شفقت کے سبب بہت مرغوب و مقبول بنادیا جس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ طلبہ نے ان سے استفادہ کیا اور عربی میں برجستہ تقریر اور بے تکلف تحریر کی صلاحیت پیدا کرلی اور اپنے استاد کے ساتھ دارالعلوم کا نام بھی روشن کیا اور عربی کی استعداد کے ذریعہ اپنی علمی و دینی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔

دارالعلوم میں ۲۰-۲۵ سال کے اپنے دور تدریس میں عربی میں لکھنے اور بولنے والوں کی ایک پوری جماعت تیار کردی جو ہندو بیرون ہند میں عربی میں دین و ادب کی خدمت کررہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نوجوان فضلاء جو عربی تقریر و تحریر کے لیے امتیاز رکھتے ہیں ان میں تقریباً سبھی مولانا مرحوم یا ان کے تلامذہ سے مستفید ہوئے ہیں اور ان کا یہ وہ اعزاز و امتیاز ہے جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ ممنونیت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ حلقۂ دارالعلوم میں عربیت کا انقلابی پیمانے پر اجراء و احیاء، اور اس کی ترویج و اشاعت مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جو انھیں اسم بامسمّٰی بناتا ہے اور انھیں مرد وحید و فرد فرید ہونے کا اقتدار ثابت کرتا ہے۔

مولانا وحید الزماں صاحب نے عربی کے فروغ کے لیے صرف درس و تدریس ہی کا طریقہ نہیں اپنایا بلکہ اس کے لیے تصنیف و تالیف کا ذریعہ بھی اپنایا اور بول چال اور روزمرہ استعمال میں آنے والی عربی الفاظ سے واقفیت کے لیے اردو عربی دونوں میں "القاموس الجدید" کے نام سے دو حصوں میں ایک نہایت کارآمد و مفید لغت تیار کردی اور پھر جدید محاورات و اصطلاحات کے لیے ایک اور لغت "القاموس الاصطلاحی" بھی تیار کردی۔ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی مرحوم کی "مصباح اللغات" کے بعد سب سے زیادہ مقبول عام مولانا وحید الزماں صاحب کی "القاموس الجدید" ہی ہے جس میں اس کی افادیت کا دخل ہے! اور اس کے ساتھ کئی حصوں میں "القراءۃ الواضحۃ" کے نام سے عربی کی ریڈریں تیار کردیں جو جدید عربی کی مروجہ نصابی کتابوں میں امتیاز خاص رکھتی ہیں۔

اس علمی استعداد کے ساتھ وہ اچھی انتظامی صلاحیت کے بھی مالک تھے چنانچہ ایک عرصے تک دارالعلوم میں ناظم تعلیمات بھی رہے اور حیرت کی بات ہے کہ بہت اچھا تعمیری ذوق بھی رکھتے تھے جس کے تحت انھوں نے دارالعلوم کے جشن صد سالہ (۱۹۸۰) کے موقع پر دارالعلوم کی عمارتوں کی تجدید کی اور دارالعلوم کا ایسا صدر دروازہ بنوایا جس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی اور جو دنیائے اسلام کے اس علمی و دینی قلعے کی عظمت کا نقیب و پاسبان معلوم ہوتا ہے۔ غالباً دارالعلوم کا نیا اور شاندار مہمان خانہ بھی مولانا ہی کے ذوق تعمیر کا آئینہ دار ہے، مولانا کی

جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک اچھے خطاط بھی تھے اور انھوں نے اپنی کتابوں کی خود کتابت بھی کی۔ ان کے شانِ خط میں بھی ان کی شخصیت کی طرح بڑی جدّت و انفرادیت ہے اور اس میں عربی کے ٹائپ اور خطِ کوفی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

راقم الحروف مولانا مرحوم کے درس میں تو شریک نہ ہو سکا لیکن اُسے بعض عربی الفاظ کی تحقیق کے ذریعے یک گونہ تلمذ حاصل ہے، میرے زمانۂ طالب علمی میں مولانا مرحوم نے شہر میں "دار الفکر" کے نام سے عربی تدریس کا ایک ادارہ قائم کیا تھا جہاں انھوں نے اپنی لغت تیار کی پھر دارالعلوم میں استاد ہونے کے بعد مسفِ عربی قائم کی اور اس کے شریکِ طلبہ جمعرات کو "النادی الادبی" کے تحت تقریری پروگرام کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں روس کے مفتی اعظم ضیاء الدین بابا خانوف دارالعلوم کی زیارت کے لیے تشریف لائے ان کے ساتھ دہلی سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے، حضرت مولانا طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے اہتمام میں دارالعلوم کی مسجد میں جلسہ ہوا، اس میں دارالعلوم کی طرف سے مولانا وحید الزماں صاحب نے برجستہ عربی میں استقبالیہ تقریر کی اور دارالعلوم کے اعزاض و مقاصد اور اس کی تاریخ کا تعارف کرایا اور ایسے دیگر مواقع پر بھی وہی سامنے آتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا سے اس طرح رابطہ قائم رہا کہ ان کے رسالہ "دعوۃ الحق" میں گاہے گاہے کوئی عربی مضمون بھیجتا اور وہ اُسے شائع کر کے مجھ پر کرم فرماتے۔ دیوبند میں جب بھی ملاقات ہوئی تو بزرگانہ شفقت و اخلاق سے پیش آئے، پچھلے سال ان کے دولتکدہ پر حاضر ہوا تو علالت کے باوجود ضیافت میں عملاً شریک رہے اور اس بے تکلفی و خوش اخلاقی سے ملے جو دوست احباب کے ساتھ برتی جاتی ہے اور منع کرنے کے باوجود بالاخانہ سے اتر کر دروازے تک رخصت کرنے آئے۔

"دار المؤلفین" کے نام سے ایک علمی و تحقیقی ادارے کا خاکہ بھی ان کے ذہن میں تھا اور ان کی یہ تمنا تھی کہ فضلائے دیوبند علمی و دینی مسائل پر اجتماعی جذبے کے ساتھ اپنے نتائج فکر پیش کریں اور تقریر و تدریس کے ساتھ علم و دین کی تحریری خدمت بھی انجام دیں اور عصری مسائل میں ملک و ملت کی رہنمائی کریں۔

اس سلسلے میں انھوں نے اپنی آخری ملاقات میں مجھ سے بتایا تھا کہ وہ اس سلسلے میں فضلائے دارالعلوم کا ایک جلسہ کریں گے اور اس تجویز کو اُن کے سامنے رکھیں گے، اس کے بارے میں انھوں نے مجھے خط بھی لکھا تھا لیکن خرابیٔ صحت ان کے عزم و ارادے کی راہ میں حائل ہوگئی اور ان کا یہ مبارک خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مولانا مرحوم نے جو بڑے بڑے کام اپنے ذمہ لئے اور انھیں وہ جس محنت و محویت اور تندہی و مستعدی سے انجام دیتے تھے اور جس طرح کام کی دُھن ان پر سوار رہتی تھی اس کا نزلہ ان کے جسم ضعیف پر گرا اور وہ

ذیابطیس میں مبتلا ہوگئے جس نے ان کے کمزور جسم کو اور بھی نحیف و ناتواں کردیا اور بالآخر اپنی عزم وارادے کا وہ انسان جس نے دارالعلوم میں انقلابی اور تعمیری اقدامات کئے، اس کا نام روشن کیا اور کتاب و سنت کی مبارک زبان عربی کی شمع پر پروانہ وار نثار ہوتا رہا۔ شمع انجمن کی طرح جل جل کر اور تیرہ و تار ماحول کو روشنی بخش کر خاموش ہوگیا اور دارالعلوم و تحریک دیوبند کے فروغ و ترقی کے عظیم منصوبے اور عزائم اس کے ساتھ چلے گئے۔

رفتی واز رفتنت یک عالمے تاریک شد   تو مگر شمعے چو رفتی بزم برہم ساختی

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کو اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے جو تعلق تھا اس کے نتیجے میں ان کی حمایت حمیت کے درجے پر پہونچی ہوئی تھی اور وہ دارالعلوم کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے ہمہ وقت فکرمند اور بے چین رہتے تھے اور اس کی عظمت و شوکت، ترقی و سربلندی کے منصوبے بناتے رہتے تھے مگر اپنے رفقاء اور ذمہ داروں کی مصلحت بینی واحتیاط پسندی پر جھلا کر رہ جاتے تھے اور اپنی زود حسی اور نازک مزاجی کے سبب علیٰحدگی پسندی پر مجبور ہوجاتے تھے مگر اس صورت حال میں بھی دارالعلوم سے ان کا مخلصانہ تعلق اور مطلق وغیر مشروط وفاداری و ہمدردی بحال قائم رہتی تھی۔

دارالعلوم سے ان کی یہ وفاداری بر شرط استواری ان کے لیے اصل ایماں اور عین الیقین کا درجہ رکھتی تھی جو تمام فرزندان و محبانِ دارالعلوم کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ اور لائق تحسین اسوہ ہے۔

بڑے ادارے، جماعتیں اور تحریکیں ایسے ہی مخلص و دردمند، فکرمند و ہوشمند افراد کے عزم و اخلاص اور فکر و عمل سے فروغ پاتی ہیں جو اس کے روحِ رواں اور قلبِ تپاں ہوتے ہیں اور ان کی بلند نگاہی و دلسوزی اداروں کی رگ و پے میں خونِ تازہ کی طرح دوڑتی ہے اور ان کی شاخوں کو اس طرح سرسبز و شاداب رکھتی ہے جیسے شاخِ گل کو بادِ سحرگاہی کی نمی تازہ رکھتی ہے۔

مولانا محمد عبد الرحمٰن کیرانوی بجر

سید ارشد رضا الحسنی

ہمہ جہت شخصیت

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کو لرزہ آتا ہے یقیناً ہمہ جہت شخصیت تھے۔ میری اُن کے یہاں حاضری دارالفکر کے زمانہ سے ہوئی۔ غالباً سیتنات (ساتویں دہائی) کے شروع کی بات ہے۔ دیوبند کی جامع مسجد کے لیے ایک راستہ محلہ گدی واڑہ سے جاتا ہے۔ اسی راستہ پر ایک چھوٹے سے مکان میں دارالفکر قائم تھا اور مولانا وہاں طلبہ کو عربی زبان سکھایا کرتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی وہاں حاضری دیا کرتا تھا۔ پھر وقت نے کروٹ لی اور مولانا دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تدریس میں آگئے۔ وہاں ان کی خدمت میں حاضری کے مستقل مواقع میسر آگئے۔ چنانچہ عربی زبان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ مولانا کے پاس باقاعدہ شروع ہوا۔ دارالعلوم میں النادی الادبی کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا نے اسی وقت عربی زبان سیکھنے کے لیے تین مراحل رکھے تھے۔ پہلے مرحلہ کو صف ابتدائی کا نام دیا گیا تھا اور باقی دو مرحلوں کو صف ثانوی اور صف نہائی کا نام دیا گیا تھا۔ مولانا کی خدمت میں رہ کر یہ تینوں مراحل طے کیے۔ اور ساتھ ساتھ دارالعلوم کے سیاسی نشیب و فراز میں بھی بھرپور حصہ لیتا رہا۔ مولانا کی خدمت میں کافی عرصہ حاضری رہی اور اس طرح مولانا کے کام کرنے کا انداز، تحریر و تقریر کے جوہر اور مشفقانہ مربیانہ اور منتظمانہ صلاحتیں دیکھنے کا بھرپور موقع ملا۔ جیسا کہ شروع میں تحریر کرچکا ہوں۔ مولانا ہمہ جہت شخصیت تھے۔ طلبہ کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتے تھے وہ صرف تنخواہ دار مدرس نہیں تھے کہ وقت مقرر پر درسگاہ میں آئیں اور درس دے کر چلے جائیں اور اس طرح پھر دوسرے دن وقت مقرر پر ان کی صورت نظر آئے بلکہ وہ تو چوبیس گھنٹہ طلبہ

شعبۂ رقابۃ المطبوعات، دمام (سعودی عرب)

کے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں یہ جوش تھا اور یہ امنگ تھی کہ طلبہ کچھ بن جائیں۔ ان کے دروازے طلبہ پر کبھی بند نہیں ہوتے تھے۔ وہ متعلقہ کتاب کا درس دے کر خاموش نہیں ہوتے تھے بلکہ جس قدر بھی طالب علم کی زندگی سے متعلق امور ہوا کرتے تھے، اُن پر بحث کرتے تھے اور صرف بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ عملی طور پر ان پروگراموں کو پورا کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ خوب ماحول تھا، مولانا درس دے رہے ہیں، نظم وضبط سکھا رہے ہیں۔ اوڑھنا بچھونا بتا رہے ہیں، کھانے پینے کے آداب بتا رہے ہیں، صفائی ستھرائی سکھائی جا رہی ہے، طلبہ کی مالی ضروریات بھی خاموشی سے پوری کی جا رہی ہیں۔ غرض درس بھی چل رہا ہے، تربیت بھی ہو رہی ہے شفقتوں کا انداز بھی ہے اور نظم وضبط بھی۔ وہ مدرس، مربی، مشفق، منتظم اور غمگسار بھی تھے اور خلوص و مودت کا پیکر بھی اَڑے وقتوں میں مددگار بھی، جری باحوصلہ اور مردِ میدان بھی تھے، قلم کے شہسوار بھی تھے اور خطابت کے مردِ میدان بھی۔ یہ ساری مذکورہ صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں جن کا ہماشما کو ہمیشہ تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ چونکہ ان کا انداز تمام مدرسین سے الگ تھا اور طلبہ کے حد درجہ غمگسار اور مددگار رہتے تھے اس لیے فطرتاً طلبہ کا زبردست جھکاؤ ان کی جانب ہی رہتا تھا۔ وہ ہر دلعزیز تھے، سب ان سے محبت کرتے تھے، ہر دل میں ان کا احترام رہتا تھا مولانا میں عجیب قسم کی مقناطیسیت تھی جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے قریب رہنے والے ہر شخص کو یہی گمان رہتا تھا کہ مولانا کا سب سے زیادہ تعلق اُسی سے ہے اور اتنی ہر دلعزیزی بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ علم و فن میں کمال کے ساتھ ساتھ شفقت و محبت اور پھر انتظام و اہتمام کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنا خال خال نظر آتا ہے۔ انھوں نے فنِ تعمیر میں بھی اپنا سکہ جمایا۔ مولانا کو فنِ تعمیر کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا۔ وہ یقیناً مجموعۂ خصائلِ حسنہ تھے، حق گوئی بھی تھی اور حق بات سن بھی لیا کرتے تھے، خصوصاً راقم الحروف تو یہ جانتا ہے کہ بارہا میں نے جن باتوں کو حق سمجھا وہ برملا مولانا کے سامنے کہہ دیں اور مولانا نے ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات نے بعد میں ان باتوں کو صحیح یا غلط ثابت کیا۔ غرضیکہ چھوٹوں کی رائے بھی سنتے تھے، خوب توجہ دیتے تھے۔ کبر و غرور نہ تھا۔ بلند ظرف تھے۔ بارہا بعض لوگوں نے کمینی حرکات کیں مگر کبھی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔

میں نے مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے، ان کی تقاریر سنی ہیں، کتابیں پڑھی ہیں، ان کی مجلسوں میں بیٹھا ہوں، بعض دفعہ اسفار میں بھی ساتھ رہا ہوں۔ مولانا

مرحوم کی بہت سی باتیں حضرت مجاہد ملت سے ملتی جلتی تھیں۔ وہی دونوں میں کام کی لگن، وہی جرأت و شجاعت، وہی خلوص و محبت، چھوٹوں بڑوں کی ضرورتوں کا خیال اور اپنے اکابر سے تعلق، جوش اور ولولہ اپنوں اور غیروں سب کے لیے ہر وقت ہمدردی وغیرہ وغیرہ دسیوں باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ خود مولانا حضرت مجاہد ملت مرحوم سے بہت متاثر تھے اور ہمیشہ ان کی باتیں دلچسپی سے سناتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم کو بھی ضرور اندازہ ہوگا کہ ان کی اور حضرت مجاہد ملت مرحوم کی بہت سی باتیں مشترک تھیں۔

راقم الحروف نے رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کا انداز بھی دیکھا ہے وہ بھی مرد میدان تھے اور چونکہ مولانا مرحوم رئیس الاحرار کے ساتھ رہے تھے اس لیے ان کی بھی باتیں مولانا میں کافی حد تک تھیں۔ مولانا کی زندگی پر حضرت مجاہد ملت اور رئیس الاحرار کی زندگیوں کے نقوش بہت گہرے تھے۔

مولانا مرحوم پر اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی کافی اثر تھا۔ راقم کو مولانا مرحوم کے والد حضرت مولانا مسیح الزماں صاحب کیرانوی مرحوم کی صحبت بھی حاصل رہی۔ خصوصاً حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جس زمانہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا تھا وہیں حضرت مولانا مسیح الزماں صاحب کیرانوی مرحوم کی زیارت بھی ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم کے والد صاحب کا حضرت علامہ کے یہاں خوب آنا جانا تھا۔ آپ کے والد مرحوم بھی انتہائی خلیق اور ملنسار تھے، حق گو اور بیباک تھے، متدین تھے اور دین کی تڑپ تھی۔ مولانا مرحوم کو اپنے والد صاحب مرحوم کی نمایاں خصوصیات ورثہ میں ملی تھیں۔ مولانا مرحوم میں اپنے والد صاحب مرحوم کی وجاہت و بزرگی کے انمٹ نقوش بھی نظر آتے تھے۔

میں بھی ان خوش نصیبوں میں یقیناً شامل ہوں جن سے مولانا مرحوم کا تعلق خاطر تھا مولانا مرحوم نے شفقت و محبت کا ہمیشہ ایک نیا انداز چھوڑا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا کو پتہ چلا کہ راقم ہندوستان آیا ہوا ہے۔ مولانا چوں کہ شفقت و محبت کے پیکر تھے خود بجنور تشریف لے آئے۔ مولانا کی آمد سے جہاں فخر و محبت کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی کوتاہی پر شدید شرمندگی بھی ہوتی تھی کہ کاش جلد دیوبند پہونچ کر خود ہی فوراً حاضری کیوں نہ دی۔

وہ انسان بنایا کرتے تھے اور یہ فن ان کو خوب آتا تھا۔ نہ معلوم کتنوں کو قلم پکڑنا سکھا گئے اور کتنوں کی توتلی اور لڑکھڑاتی زبانیں درست کر گئے، کتنوں کی زندگیاں سنور گئیں بقول شخصے

جینا آگیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ لاتعداد شاگردوں کو کتابت بھی سکھا گئے کہ اگر کچھ نہیں تو کتابت کرکے ہی رزق حاصل کرلیں۔ انھوں نے جینا سکھایا، عزت اور وقار کے ساتھ رہنا سکھایا۔ متاخرین میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں متقدمین کے دور میں یقیناً ایسے اساتذہ ہوتے تھے جو ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے مگر متاخرین میں اتنی خوبیوں والا استاذ بظاہر کوئی نہیں تھا۔ گذشتہ ۲۵ سال میں وہ دارالعلوم دیوبند کے تنہا مدرس تھے جو ہمہ جہت تھے اور میرا یہ چیلنج ہے کہ اگر گذشتہ ۲۵ سال میں مولانا کا ہم پایہ ہمہ جہت کوئی مدرس ہو تو اس کا نام بتایا جائے۔ کم از کم مجھے تو کوئی مولانا جیسا مدرس گذشتہ ۳۵ سال میں نظر نہیں آتا جس میں اتنی ساری خوبیاں بیک وقت موجود ہوں اور چوبیس گھنٹے طلبہ کے لیے وقف رہا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ مولانا جب دارالعلوم کے مدرس نہیں بنے تھے اور النادی الادبی قائم نہیں ہوئی تھی تو اس وقت دارالعلوم کی تعطیلات کے زمانہ میں جو طلبہ بذریعہ ٹرین لکھنؤ کی جانب سے اپنے وطن جایا کرتے تھے انھیں ٹرینوں اور اسٹیشنوں پر ندوہ کے طلبہ سے واسطہ پڑتا تھا چونکہ ندوہ کے طلبہ کو ہی فقط اس وقت عربی سے شد بد ہوتی تھی اور وہاں عربی کا ماحول تھا اس لیے وہاں کا ایک عام طالب علم بھی عربی کے چند جملے رٹ کر دیوبند کے طلبہ پر اپنی قابلیت کی دھاک جمایا کرتا تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ مولانا دارالعلوم کے مدرس بن گئے، النادی الادبی قائم ہوئی۔ عربی زبان کا بول بالا ہوا۔ دارالعلوم کی دیواریں عربی مجلات سے مزین ہوئیں، درسگاہیں عربی خطابت سے گونج اٹھیں اور لاتعداد طلبہ عربی زبان لکھنے بولنے لگے۔ طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والا، ان کی ہمت بڑھانے والا آگیا تھا۔ چنانچہ دارالعلوم کے ماحول میں، طلبہ میں ہمت و شجاعت تو تھی صرف صلاحیتوں کو ڈھونڈ کر اجاگر کرنے والے کی ضرورت تھی اور جب یہ سب میسر آگیا تو پھر یہی طلبہ ٹرینوں میں دوسرے مدارس کے طلبہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سے عربی بولتے تھے اور اپنا سکہ جماتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ندوہ کے اس وقت کے ہونہار طلبہ بھی دارالعلوم کے فضلاء کی مدد کے خواستگار ہوتے تھے۔ وہاں دفاتر میں عربی بولنے کے لیے ہم فضلاء کو ساتھ لے جایا کرتے تھے اس لیے کہ ان کے یہاں تحریر کی مشق تو تھی تقریر کی زیادہ نہ تھی اور ہمارے یہاں دونوں باتوں پر یکساں مشق کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ ہم بے تکلف لکھتے بھی تھے اور بولتے بھی تھے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا کی یہ خصوصیت بھی عجیب تھی کہ وہ اتنے کم عرصہ میں تن تنہا ایک ایسا زبردست عربی کا ماحول بنا گئے جو کہ ادارے یا جماعتیں مل کر کرتی ہیں۔ دو چار، دس بیس نہیں سیکڑوں طلبہ کی باقاعدہ تربیت اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا مولانا ہی کا کام تھا۔ پھر درس و تدریس ہی نہیں تصنیف و تالیف کا بھی شاندار کام کر گئے۔
ڈکشنریاں ترتیب دیں جو ہندو پاک کے تقریباً ہر عربی اسکالر کی ضرورت ہیں۔ میں جب قاہرہ میں تھا تو مجھ سے "المعجم الوسیط" منگوائی تھی۔ پتہ چلا کہ اسے سامنے رکھ کر ایک اور ضخیم ڈکشنری بھی تیار کر گئے۔ اپنے اکابر علماء کی تصنیفات کو آسان عصری اردو میں منتقل کرانے کا کام بھی سنبھالا۔ مولانا کے لاتعداد واقعات ہیں اور بیسیوں شفقتوں اور محبتوں کے قصے ہیں۔ کس کس کا ذکر کروں۔ انشاء اللہ العزیز مختلف فرصتوں میں مولانا مرحوم کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔ ان جیسی شخصیات آجکل نایاب ہیں جو ہمہ جہت ہوں۔ خداوند کریم مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین ثم آمین۔

بقیہ : ایک یادگار و باکردار شخصیت ......

بھی ہے۔ افسوس کہ آخرت کے سفر کا سفرنامہ تیار کرنے والا بالآخر خود بھی آخرت کے اس سفر پر چلا گیا جس سے واپسی ناممکن ہوتی ہے، تاہم اس بات سے دل کو حوصلہ ملتا ہے کہ مسافر سفر پر ضرور چلا گیا ہے لیکن اپنا روشن نشانِ سفر چھوڑ گیا ہے جسے دیکھ کر پیچھے آنے والے منزل کی صحیح سمت کا پتہ لگا لیں گے اور انشاء اللہ وحیدِ عصر مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے متعلقین اور چاہنے والے خصوصاً تلامذہ ان کے نشانِ سفر کو اپنی جدوجہد سفر کے لیے مشعلِ راہ میں بدل دیں گے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے آگے بڑھیں گے اور بڑھتے چلے جائیں گے اور اس میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انؒ کے نقوشِ پا بیابان کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی ثابت ہوں گے اور جب بھی خود فراموشی کی تاریکی پھیلنے کی کوشش کرے گی۔ حضرت وحیدِ عصر کی یادوں کا اُجالا اسے مات دینے میں کامیاب ہو جائے گا، اس شرط کے ساتھ کہ تاریکی سے چوکنا اور اجالے کو باقی رکھنے کی کوشش برابر جاری رہے۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی
مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ

مردم ساز، شخصیت گر، فنکار استاذ

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کا انتقال ہو گیا، سننے میں یہ ایک مختصر سی خبر تھی، لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے دل و دماغ پر سناٹا چھا گیا ہو۔ بے ساختہ لبوں پر انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کی ربانی تسلی جاری ہوئی مگر ذہن و خیال منجمد ہو کر رہ گیا۔ مولانا وحید الزماں صاحب مر گئے؟ نہیں، میں مر گیا، دنیا مر گئی، اب کون بچا، صرف ایک ذات وحدہ لا شریک لہ باقی ہے، ورنہ ہر ایک فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی لگا۔ ایک لمحہ کے لیے۔ وہ لمحہ بہت مختصر تھا، مگر بڑا جاں گزا تھا، وحشت اثر تھا۔ پھر فکر و خیال میں حرکت آگئی، پھر دنیا حسب معمول چلنے لگی، سارا کاروبار زندگی جو یکلخت بند ہو گیا تھا معمول پر آ گیا جیسے کچھ نہ ہوا ہو، وہی بھاگ دوڑ، وہی حرکت و عمل، وہی خورد و نوش، وہی غفلت و سرمستی! تو کیا واقعی کچھ نہیں ہوا؟ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔؟

انسان بھی عجیب شے ہے، ایک خبر سنتا ہے غمزدہ ہو جاتا ہے: دنیا تاریک ہو جاتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ غم ہمیشہ تازہ اور یہ دنیا ہمیشہ تاریک رہے گی۔ یہ زخم سدا ہرا رہے گا لیکن وقت کی رفتار آگے بڑھ جاتی ہے اور آدمی نئی چیزوں، نئے سامانوں، نئے قصوں میں پچھلے حادثہ کو فراموش کر دیتا ہے، زخم کا صرف داغ باقی رہ جاتا ہے، درد کافور ہو جاتا ہے۔

مولانا وحید الزماں صاحب کی رحلت کی خبر سنی تو اچانک نبض دوراں رکتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن جب وہ رواں ہوئی تو میرے فکر و خیال کا دھارا یک بیک پیچھے کی طرف مڑ گیا۔ مجھے وہ باتیں اور وہ زمانہ یاد آنے لگا جس نے مولانا وحید الزماں صاحب کو ہم طالب علموں کے دل کی دھڑکن بنا دیا تھا، وہ ہمارے ذہن و دماغ پر فکر و خیال بن کر چھا گئے تھے۔ میں نے انہیں اس وقت تک دیکھا نہیں تھا مگر تصور میں ان کی تصویر کے خاکے بنایا کرتا تھا۔

میں عربی کی ابتدائی جماعت کا طالب علم تھا۔ اساتذہ تمرین کے لیے اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا کرتے تھے۔ میں ایک کمزور طالب علم تھا، غلطیاں بہت ہوتی تھیں، اساتذہ کی ڈانٹ سنا کرتا تھا۔ مجھے تلاش

تھی کہ کوئی ایسا لغت ملتا جس کی مدد سے اُردو کا ترجمہ عربی میں بخوبی کرسکتا۔ ایک کتاب ملی مگر میں اس سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکا۔

پھر ایک دوسری کتاب چھوٹی سائز کی کسی قدر باریک کتابت والی میں نے اپنے ایک شفیق اُستاد کے پاس دیکھی، اس پر "اَلْقَامُوْسُ الْجَدِیْد" لکھا تھا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو بہت اچھی اور مفید معلوم ہوئی۔ مصنف کا نام مولانا وحید الزماں کیرانوی تھا۔ یہیں سے مولانا سے واقفیت کی بنیاد پڑی۔ اپنی استعداد کے بقدر اس سے استفادہ کرتا رہا، اس کی ضرورت اُردو عربی انشاء میں ہوتی تھی اور مجھے اس سے مناسبت بہت کم تھی اس لیے استفادہ کی نوبت بھی کم آتی تھی پھر دارالعلوم دیوبند سے مولانا کی ادارت میں ایک عربی مجلہ "دعوۃ الحق" نکلنا شروع ہوا۔ طلبہ کی انجمن میں وہ آتا تھا۔ خوبصورت، دیدہ زیب ٹائیٹل، مدیر کے حسن ذوق کا آئینہ دار، ایک تو دارالعلوم دیوبند سے عقیدت، دوسرے مدیر رسالہ کی عظمت، بڑے شوق سے اس کا حرف حرف پڑھا جاتا۔ گو کہ اس کا بڑا حصہ ہماری دسترس سے باہر ہوتا مگر شوق و محبت کی دُنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

پھر اچانک طبیعت کا رُخ بدلا، کہاں تو عربی انشاء و تکلم سے کوئی مناسبت نہ تھی اور کہاں اب یہ حال ہوا کہ ہر وقت اسی کی دُھن رہنے لگی۔ ایک کتب خانہ والے سے فرمائش کی کہ دیوبند سے "القاموس الجدید اردو سے عربی" منگوا دیجیے، اُنھوں نے منگوائی ضرور مگر اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا، ضخامت بھی کچھ زیادہ تھی، جلد نہایت خوبصورت، طباعت بیحد نظر فروز، بچپن کا زمانہ، حسن اور زیبائش پر طبیعت فریفتہ، دیر تک اس کا حسن و جمال ہی دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا لیکن یہ خوشی یکلخت کافور ہوگئی جب بجائے "اُردو سے عربی" کے دیکھا تو عربی سے اردو کا وہ لغت تھا، یا اللہ اب کیا کروں؟ مجھے تو اُردو سے عربی میں ترجمہ کی مشق کرنی تھی مگر اب کیا کرتا، اسی کو اتنا دوہرایا کہ تقریباً پوری کتاب حفظ ہوگئی۔

پھر ۱۳۸۶ھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے دیوبند پہونچا دیا، امتحان داخلہ مولانا وحید الزماں صاحب کے پاس تجویز ہوا، جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم کے امتحانِ داخلہ کا منظر قیامتِ صغریٰ کا نمونہ ہوتا ہے۔ نئے نئے طلبہ دیوبند کی ہیبت اور اس کا جلال، اساتذہ دارالعلوم کی عظمت و شوکت، امید و بیم کی ایسی کشمکش ہوتی ہے کہ ان دنوں گردشِ ایام کا بھی پتہ نہیں چلتا، اب تو وہاں امتحانات داخلہ بھی تحریری ہونے لگے ہیں، اس وقت تقریری امتحانات ہوتے تھے۔ دارالحدیث میں مختلف اساتذہ، تپائیوں کے حصار میں بیٹھے ہوتے؛ کتابیں ان تپائیوں پر رکھی ہوتیں، چپراسی طالب علم کا نام لے کر پکارتا طالب علم بیچارہ ڈرا سہما حاضر ہوتا، کچھ دیر امتحان کی جانکنی میں مبتلا رہتا پھر واپس ہوجاتا، اس کے بعد نمبر معلوم کرنے کی بیقراری ہوتی۔

اساتذہ مختلف رنگ و طبائع کے تھے، بعض امتحان میں نرم ہوتے۔ ہر طالب علم چاہتا کہ اس کا امتحان

انھیں کے پاس ہو بعض اصول کے نہایت پابند اور قواعد کو پوری طرح برتنے والے ان کے پاس جانے سے ہر ایک گھبراتا اور کتراتا، ایسے حضرات کے پاس کم ہی خوش قسمت کامیاب ہوتے۔

معلوم ہوا کہ اساتذۂ دارالعلوم میں امتحان کے باب میں بااصول لوگوں کی صف اوّل میں ممتاز ترین نام مولانا وحیدالزماں صاحب کا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ میرا امتحان داخلہ مولانا ہی کے سپرد ہوا۔ میرے بعض پرانے رفقاء نے بہت کوشش کی کہ امتحان وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے اور اس کے واسطے دو دو مرتبہ پکار کے باوجود مجھے حاضر نہیں ہونے دیا مگر ان کی کوشش ناکام ہو گئی اور بالآخر میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ امتحان کا انداز عجیب تھا، عبارت پڑھنے کا حکم دیا۔ فرمایا اس طرح پڑھیے کہ معلوم ہو کہ آپ نے کتاب کو سمجھا ہے۔ عبارت جیسی بن پڑتی تھی پڑھ دی۔ حکم ہوا کتاب بند کرکے عبارت کا مطلب سمجھائیے، جس طرح سے ہو سکا اس کی بھی تعمیل کر دی، پھر دیوانِ متنبی کھولنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ ایک جگہ سے چند اشعار پڑھوائے، ترجمہ اور مطلب دریافت کیا، ایک لفظ پر تھوڑی سی رد و کد بھی ہو گئی۔ میں نے جو مطلب بتایا مولانا نے اسے قبول نہیں کیا، میں مصر ہو گیا، مولانا سمجھا رہے تھے اور مجھ پر حماقت سوار تھی، میں اپنے بیان کئے ہوئے معنیٰ کے لیے دلائل دینے لگا، مولانا انھیں رد کر رہے تھے اور میں اُلجھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ بجائے ناراض ہونے کے مولانا خوش ہو رہے تھے۔ چہرے پر بشاشت اور لہجہ میں شفقت بڑھتی جا رہی تھی، آنکھوں میں تلطف کی ایک خاص چمک محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک جگہ سے دس اشعار پڑھوائے اور امتحان ختم ہو گیا۔ یہ سارا معاملہ بمشکل دس منٹ میں تمام ہو گیا۔ لطف کے جن الفاظ اور کرم کے جس لہجے میں مولانا نے واپسی کا حکم دیا اسی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ امتحان میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں ہے چنانچہ جب نتیجہ معلوم کیا گیا تو کھلا کہ صرف کامیابی کی سند ہی مولانا نے نہیں دی ہے بلکہ امتیازی نمبر عطا کیے ہیں، یہ تھی میری پہلی گستاخی اور ان کا پہلا کرم۔

چند دنوں میں اسباق شروع ہونے والے تھے، مولانا اس زمانہ میں عربی تکلّم و انشاء کے شائق طلبہ کو خود پڑھاتے تھے اور اس کے لیے بڑی مشقت برداشت کرتے تھے، خود ہی اسباق تیار کرتے اور انھیں اپنے خاص انداز میں پڑھاتے، انھیں اسباق کا مجموعہ بعد میں "القراۃ الواضحہ" کے نام سے متعدد اجزاء میں شائع ہوا۔ ان سے پڑھنے کی ہر طالب علم ہمت بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ جہاں خود لگن سے کام کرتے تھے اسی طرح طلبہ سے بھی کام لیتے تھے، اس وقت انھوں نے تین درجے قائم کر رکھے تھے، صفِ اوّل، صفِ ثانوی، صفِ نہائی۔

صفِ اوّل، بالکل ابتدائی درجہ تھا اس کی تعلیم کے لیے کبھی کبھی صفِ نہائی کے ممتاز طلبہ سے کام لیتے تھے، صفِ نہائی آخری درجہ تھا۔ اس میں شریک ہونے والے طلبہ عموماً عربی لکھنے اور بولنے پر بے تکلف قادر ہو جاتے

تھے، نئے طلبہ عموماً صفِ اوّل میں داخلہ حاصل کر پاتے تھے، میں نے جرأت کی اور دفترِ تعلیمات میں درخواست گذاری کی کہ میرا داخلہ صفِ ثانوی میں کرلیا جائے۔ حکم ہوا کہ مولانا سے اس پر منظوری لکھوا کر لاؤ۔ میں ڈرتے ڈرتے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھیں میرا امتحان یاد تھا، دیکھتے ہی پہچان گئے اور میری درخواست پر ایسے کلمات تحریر فرمائے جو ہر اعتبار سے میری حیثیت سے بہت بلند تھے اور آج بھی ان الفاظ کو سوچتا ہوں تو شرماتا ہوں کہ مولانا نے کیا حسنِ ظن ظاہر فرمایا تھا اور میں کس پستی میں پڑا ہوں۔

صفِ ثانوی کے اسباق نمازِ مغرب کے بعد ہوتے تھے۔ چند ہی دن گذرے تھے کہ ایک روز درسگاہ میں بیٹھتے ہی فرمایا کہ آج کل میں جس نے بھی کوئی سفر کیا ہو اس کی رُوداد کھڑے ہو کر عربی میں بیان کرے۔ قدیم طلبہ دو چار دن کے اندر مدرسہ میں حاضر ہوئے تھے۔ اس غیر متوقع حکم سے سب سراسیمہ ہوگئے۔ ہم جیسے طالب علموں کے لیے مجمع عام میں اُردو میں چند منٹ بولنا مشکل تھا، عربی میں اس طرح بولنا تو اس وقت تک سوچا بھی نہ تھا۔ سب خاموش تھے اور مولانا اسی حکم کو مکرر دوہرا رہے تھے۔ بستر طلبہ کی جماعت تھی، زیادہ تر قدیم طلبہ تھے، چار پانچ جدید طالب علم تھے میں سدا کا ناعاقبت اندیش، اُلّڑ، تھوڑا سا انتظار قدیم طلبہ کا کیا کہ وہ سال بھر مولانا کی صحبت میں مشق و تمرین سے مستفید ہو چکے تھے اور میری جو کچھ مشق تھی بغیر کسی استاذ کے تھی لیکن دیکھا کہ ان میں سے کوئی نہیں کھڑا ہوا۔ تو میں نے ہمت کر ڈالی، دو روز پہلے سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضری دی تھی، اسی سفر کی داستان کٹے پھٹے الفاظ میں، اٹکتے بھٹکتے، ہکلاتے رُکتے بیان کرتا رہا اور اخیر میں بے اختیار میری زبان سے نکلا رجعت منہا وقت الشام۔ شام کے لفظ پر طلبہ کا ایک لطیف سا قہقہہ درس گاہ میں گونج گیا اور میں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محفل قہقہہ زار کیوں بن گئی لیکن معاً مولانا کی گرجدار آواز سُنائی دی۔ انھوں نے ہنسنے والوں کو تنبیہ کی اور بولنے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ مولانا کی گفتگو سے احساس ہوا کہ غلطی کیا تھی۔

مولانا کا دستور عموماً یہی تھا کہ وہ طالب علموں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر زیادہ نظر نہیں رکھتے تھے اور نہ ان پر بہت زیادہ زجر و توبیخ کرتے تھے اور نہ ان کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھتے تھے، وہ ان کی خفتہ صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے، اُنھیں بیدار کرنے کی تدبیریں کرتے، کمزور کو ہمت دِلاتے، ہمت والوں کی حوصلہ افزائی کرتے، طالب علموں کو بے تکلف کر کے استفادہ کی راہ کشادہ اور آسان کرتے، ان کے پاس جا کر، ان کی باتیں سُن کر طالب علموں میں کام کی لگن، پڑھنے لکھنے کی دُھن اور محنت و کوشش کی آگ بھڑک اُٹھتی، کمزور سے کمزور طالب علم یہ سمجھ کر ان کے یہاں سے اُٹھتا کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں، وہ اس طریقہ سے طلبہ کو بہت جلد ترقی کی راہ پر لگا دیتے، نئے طلبہ جو ابتدا میں دارالعلوم میں ڈرے سہمے رہتے دبتے اور جھجکتے رہتے۔ مولانا ان کی جھجک

بڑے خوبصورت انداز میں دُور کرتے ۔

تعلیم شروع ہو چکی تھی، ایک روز مجلسی گفتگو میں اُنھوں نے چند طلبہ کو ترغیب دی کہ بدھ کے روز شام کو آپ سب لوگ اپنا اپنا کھانا لے کر میرے کمرے میں پہونچ جائیں اور سب مل کر کھانا کھائیں، یہ چار پانچ طالب علم تھے، ہم لوگ ہر بدھ کو حاضر ہوتے ۔ مولانا کے ساتھ کھانا کھاتے، کھانے کا سلیقہ سکھتے، دسترخوان کے آداب کیسے برتے جاتے ہیں؟ مولانا ہمیں سکھاتے ۔ اس نجی مجلس میں طلبہ بے تکلف ہوتے اور مولانا سے قرب و محبت کا احساس ہوتا ۔ مولانا اس مجلسی گفتگو میں طلبہ میں ایک عجیب علمی و عملی لگن پیدا کر دیتے ۔ مولانا بہت نازک مزاج تھے مگر نہ جانے صبر و ضبط کا کون سا پتھر اپنی نازک مزاجی پر رکھ لیتے کہ ہم لوگوں کے گنوارپن پر بھی کوئی تغیر محسوس نہ ہوتا ۔ کھانے کے بعد مولانا خود چائے بناتے، نہایت نفاست کے ساتھ، بڑے اہتمام کے ساتھ ہر ایک کو پلاتے، پینے کا طریقہ سکھاتے اور لطف و عنایت کی باتیں کرتے جاتے ۔

عصر کی نماز کے بعد تفریح کے لیے جاتے، دو چار طلبہ اس میں بھی ساتھ ہو جاتے ۔ عربی میں گفتگو ہوتی، ساتھ والے طلبہ اس سے بہت فائدہ اٹھاتے، تفریح میں ساتھ جانے کی سعادت مجھے دو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں حاصل ہوئی ۔ البتہ مجلس طعام میں پابندی سے شرکت ہوتی ۔

ایک بار مولانا کو اندازہ ہوا کہ پڑھنے لکھنے کے باب میں عموماً طلبہ میں سستی آچلی ہے، اچانک خبر پھیلی کہ دارالحدیث میں مولانا طلبہ کو خطاب فرمائیں گے ۔ بجلی کی طرح یہ خبر سارے دارالعلوم میں کوند گئی ۔ غالباً مغرب بعد کا وقت تھا جو جہاں سے اس خبر کو سنتا، وہیں سے دارالحدیث کی طرف پلٹ پڑتا ۔ میں اب تک مولانا کے درس میں شریک ہوا تھا جس میں زیادہ تر گفتگو عربی میں ہوتی یا مجلس طعام میں، جس میں سب کو بولنے کی اجازت ہوتی لیکن مولانا خطیب بھی ہیں، اس کی خبر نہ تھی ۔ مولانا کا خطاب سننے کے لیے طلبہ بے تحاشہ لپکے چلے جارہے تھے اس سے مولانا کی محبوبیت و مقبولیت بیجد کا اندازہ ہو رہا تھا اور یہ بات تو معلوم تھی ہی کہ مولانا کی مقبولیت احاطۂ دارالعلوم میں اکثر اساتذہ سے بڑھ کر ہے لیکن آج کیا خاص بات ہے کہ طلبہ اس طرح تیزی کے ساتھ لپکے جارہے ہیں، میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا، دارالحدیث میں جب پہونچا تو اس میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی ۔ ایک دروازے پر کھڑے ہونے کی جگہ ملی، دیکھا کہ مولانا بھی تیزی سے چلے آرہے ہیں، چہرے پر جوش کے خاص آثار دکھائی دے رہے ہیں، نگاہوں میں گرمی ہے، مولانا کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا، سارا بدن سمٹا ہوا، پرسکون ہوتا لیکن رفتار ہوا جیسی ہوتی، دائیں بائیں کوئی جنبش نہ ہوتی حتیٰ کہ ہاتھوں میں بھی حرکت نہ ہوتی، تیر کی طرح چلتے، سیدھے تخت پر آگئے، نہ کوئی تمہید، نہ مقدمہ! آتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ

کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو، اس جوش اور روانی کے ساتھ بول رہے تھے کہ سننے والوں کی سانسیں سینوں میں اٹک اٹک گئیں۔ الفاظ کا زیر وبم، آواز کی گھن گرج، خطابت کا ایسا طوفانی جوش میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پہاڑ کی بلندی پر سے پانی کا ریلا نہایت شدت کے ساتھ اُتر رہا ہو اور اپنے ساتھ بڑی بڑی چٹانوں کو بہائے لیے چلا جا رہا ہو، ٹھیک اسی طرح مولانا کا جوشِ خطابت، طبیعتوں کی سرد مہری، سستی و ناکارگی، بے حوصلگی و بے ہمتی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے چلا جا رہا تھا، بمشکل پون گھنٹہ یہ خطاب ہوا تھا لیکن سننے والوں کو محسوس ہوا کہ مدتوں کی گراں جانی اُن پر سے اُتر گئی ہو، دلوں میں حوصلہ کی حرارت بڑھ گئی، مقصد کے لیے انہماک اور دُھن کا ولولہ جاگ اُٹھا، دارالحدیث سے واپسی ہوئی تو ہر طالب علم بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ایک بار خبر گرم ہوئی کہ ممالک عربیہ کے کچھ سفراء دارالعلوم کے معائنہ کے لیے آ رہے ہیں، ان کے استقبال کے لیے دارالحدیث میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ یاد نہیں کہ کتنے سفراء تھے مگر اسٹیج پر ایسا لگتا تھا، جیسے عربوں کی ایک دُنیا اُتر آئی ہو، ابتدائی کارروائی کے بعد مف نہائی کے ایک ممتاز طالب علم کو تقریر کے لیے طلب کیا گیا وہ آیا اور برجستہ فصیح و بلیغ عربی میں، خالص عربی لب و لہجہ میں ارتجالاً تقریر کی۔ دارالعلوم کے سبھی اساتذہ و طلبہ اور اربابِ انتظام بے حد مسرور ہوئے، یہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی کاوش و کوشش کا ایک نمونہ تھا۔ یاد آتا ہے کہ کسی سفیر نے کچھ دیر تقریر کی۔ اخیر میں دارالعلوم دیوبند کے نامور مہتمم، ملک کے بے مثال خطیب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حکیمانہ انداز میں ایک بلیغ تقریر کی۔ یہ تقریر اردو میں تھی اس لیے معزز مہمان اس سے مستفید نہ ہو سکے، مہتمم صاحب کی تقریر ختم ہوئی اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب ترجمہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ایسا برجستہ، شستہ اور فصیح و بلیغ ترجمہ کیا اور اتنی روانی اور خطیبانہ آہنگ کے ساتھ کیا کہ عام سامعین تو مبہوت تھے ہی، عرب سفراء بھی مسحور ہو کر رہ گئے، ان کا حال یہ تھا کہ کبھی جھومنے لگتے، کبھی مولانا کا چہرہ تکتے، کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے، بے ساختہ سُبحان اللہ کی صدا بلند ہوتی۔ مولانا کا خطاب تھا کہ لمحہ بہ لمحہ اس کی قوت و جوشش بڑھتی جاتی تھی، آواز تھی کہ جادو جگا رہی تھی، شعلہ سا لپک رہا تھا۔ مضامین حضرت مہتمم صاحب کے نہایت بلند و بالا، ترجمہ عربی زبان میں جس کی رزانت و جزالت کا جواب نہیں اور محوِ گل افشانی گفتار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب جن کی خطابت بے مثال! بس سماں بندھ گیا، تقریر ختم ہوئی تو تمام مہمان کھڑے ہو گئے اور ایک صاحب جو ذرا ممتاز تھے، بے اختیار بغل گیر ہو گئے، پھر کچھ کہنے لگے تھے غالباً مولانا کو داد دے رہے تھے۔

مولانا کو دارالعلوم سے عشق تھا، دارالعلوم کی تعلیم میں، اس کی تربیت میں کچھ کمزوری اور کمی محسوس

کرتے تو بیتاب ہو جاتے اور اپنے دائرۂ اختیار میں ہر ممکن کوشش اس کو دور کرنے کی کرتے، انھیں محسوس
ہوا کہ طلبہ نماز میں کچھ سست ہو رہے ہیں، گرمیوں کا موسم تھا، رات گئے دیر تک طلبہ پڑھتے رہتے، رات چھوٹی
ہوتی، سوتے تو نوجوانی کی نیند، سوتے ہی رہ جاتے۔ فجر کی جماعت میں حاضری کم ہو گئی تھی، مولانا نے اسے محسوس
کیا اور علی الصباح دارالاقاموں کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ مولانا وحید الزماں صاحب جس طوفانی وجود کا نام تھا ممکن
نہ تھا کہ جس طرف سے وہ گذر جائیں کوئی اپنے بستر پر پڑا رہ جائے حالانکہ وہ نہ ڈانٹتے، نہ مارتے بس ان کی
ہیبت، ان کا جلال اور ان کی محبت ایسی تھی کہ ہر ایک کو خواب راحت سے اٹھاتی، بستر استراحت چھڑاتی
اور مسجد تک پہونچاتی چلی جاتی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہوا کہ فجر کی نماز میں پچھڑ جانے والوں کو جگہ ملنی
مشکل ہو جاتی۔ نہ جانے کیا جادو تھا ان کی شخصیت میں۔!

دارالعلوم دیوبند کا موضوع علمی و تعلیمی اعتبار سے قرآن و حدیث اور فقہ ہے اور عملاً ایسے رجال کار تیار
کرنا جو اسلام، ایمان اور احسان تینوں شاخوں کے جامع ہوں تاکہ شریعت اسلامی کامل طور پر ان کی صورت و
سیرت اور ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہو، وہ خود عالم باعمل ہوں اور دیکھنے والوں کے لیے دین اسلام کے حسن و
جمال کے مرقع ہوں ان کو دیکھ کر اللہ یاد آئے، وہ ایسے مرد مجاہد ہوں کہ اللہ کے نام پر، رسول کے نام پر، دین و
مذہب کے واسطے جان و مال کی بڑی سے بڑی قربانی دے کر، اپنے عجز و قصور کا اعتراف کریں۔ وہ ہر باطل
سے پنجہ آزمائی کے لیے مستعد رہتے ہوں۔

بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند ایسے رجال کار اور مردان راہ تیار کرنے میں کامیاب رہا، بالخصوص دارالعلوم
کا قرن اول اور قرن ثانی اس سلسلے کا عہد زریں ہے۔ اس دور میں ہر جہت علماء پیدا کیے لیکن دارالعلوم پر ایک
ایسی جہت سے اعتراض ہوتا رہا جو دارالعلوم کا موضوع نہ تھا، وہ یہ کہ یہاں کے طلبہ و علماء عربی انشاء پردازی
اور عربی بولنے پر قدرت عموماً نہیں رکھتے، الزام یہ تھا کہ اتنے دنوں تک عربی پڑھنے پڑھانے کے باوجود
اس زبان میں چند الفاظ بولنے ہوں یا کچھ لکھنا ہو تو یہ لوگ عاجز رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ندوہ نے
پیش رفت کی تو یہ اعتراض اور نمایاں ہو گیا۔

دارالعلوم پر سے اس اعتراض کو جس نے اٹھایا وہ مولانا وحید الزماں صاحب تھے، وہ جیسا کہ معلوم ہو چکا عربی
زبان کے غیر معمولی قادر الکلام خطیب تھے۔ خالص عربی لب و لہجہ میں جب وہ محو تکلم ہوتے تو اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا
وہ ہندوستانی ہیں یا عربی! اس سے بڑھ کر ان کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے عجمی ماحول کو یکسر عربی میں تبدیل
کر دیا تھا۔ وہی جو کل تک عربی زبان کے حق میں گونگے تھے آج ناطق و گویا ہو گئے۔ یہ ان کی تعلیم و تربیت
(بقیہ ص ۲۳۱ پر)

مولانا بدر الحسن القاسمی
وحدۃ البحوث، وزارت اوقاف و اسلامی امور، کویت

حضرۃ الاستاذ مولانا وحید الزماں الکیرانوی

کچھ یادیں۔ کچھ باتیں!

فاضل مضمون نگار دارالعلوم دیوبند کے قضیہ نامرضیہ کے دوران دارالعلوم کی سابق انتظامیہ کے پرزور مؤید تھے۔ زیر نظر مضمون کے بعض حصے ان کے اسی نقطۂ نظر کے عکاس ہیں۔ قارئین حضرات اس بات کو ملحوظ رکھیں۔ (ادارہ)

۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء کو عربی زبان کے نامور ادیب، عالم اور لغت نگار مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب کے انتقال سے برصغیر، عربی کے ایک بے مثال استاذ سے محروم ہوگیا ہے، اور عربی زبان وادب کی بزم سونی ہوگئی ہے، دینی مدارس اور مولانا کے ہزاروں شاگردوں کے لیے تو یہ ایسا سانحہ ہے کہ برسوں اس کی کسک محسوس ہوتی رہے گی اور مولانا کے رخصت ہوجانے سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ پُر نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ مولانا اپنی مثال آپ تھے اور ع "لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں" کا صحیح مصداق۔

مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کے انتقال کے ساتھ ہی دارالعلوم دیوبند کا ایک اہم باب ختم ہوگیا ہے بلکہ میرے نزدیک صحیح بات تو یہ ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند کے تبدیلی اقتدار کے سانحہ کے ساتھ ہی مولانا وحید الزماں صاحب کی حقیقی زندگی بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک مولانا چلتے پھرتے ضرور نظر آتے رہے بعض عہدے اور مناصب سے بھی انھیں جوڑا گیا لیکن جن سیاسی بازیگروں نے ان کی ساری قوت نچوڑ لی تھی ان کی بے وفائی مولانا کے لیے سوہان روح بنتی گئی اور دس پندرہ سال کی مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت اور بہت ساری قربانیوں کا جو نتیجہ مولانا کے سامنے آیا وہ نہایت مایوس کن اور المناک تھا۔

مولانا ایک طویل عرصہ سے بعض بیماریوں کا شکار تھے، لیکن ان کی انتہائی حساس طبیعت کے لیے جو مرض جان لیوا ثابت ہوا وہ یہی المیہ تھا جس نے ان کو بالکل نڈھال کردیا تھا اور جسے وہ برداشت نہ کرسکے۔ اس طرح

کہنا چاہئے کہ مولانا وحیدالزماں صاحب کا خون بھی انہیں لوگوں کی گردن پہ ہے جنہوں نے مولانا کا استحصال کر کے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب کی جان لی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں جنت نصیب کرے اور انھیں ان کی زندگی کے مضطرب لمحات کا صلہ آخرت کے سکون کی شکل میں دے۔ (آمین)

مولانا وحیدالزماں کیرانوی صاحبؒ ایک عظیم انسان تھے اور ان کی شخصیت میں عظمت اور عبقریت کے کئی پہلو تھے ـــ غیر معمولی ذکاوت، شدتِ احساس، قرینہ، سلیقہ، ادب، آگہی، زبان آوری، طلاقت لسانی سب کے مجموعہ کا نام مولانا وحیدالزماں کیرانوی تھا۔

عربی زبان، ان سے زیادہ صحت اور طلاقت کے ساتھ بولنے کا سلیقہ برصغیر کے کسی دوسرے معاصر عالم میں نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ عربی ادب کے ذخائر سے واقفیت، اور عربی لکھنے کی قدرت میں ممکن ہے اور لوگ بھی ان کے ساتھ شریک یا ان سے بڑھ کر ہوں لیکن اسٹیج پر ان سے زیادہ رواں، برجستہ اور شستہ اور نطق وادا کی صحت کے ساتھ عربی بولنے والا کوئی اور نہیں تھا اور نہ ان سے اچھا کوئی عربی کا مدرس تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا وحیدالزماں صاحب کی انتہائی مصروف، ہمہ جہت اور ہنگامہ خیز زندگی میں قدیم عربی لٹریچر کو پڑھنے یا ادبی تراث کی تحقیق اور ایڈٹ کرنے اور جدید ادبی رجحانات پر نظر رکھنے کا زیادہ موقع نہیں تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ عربی کے مختصر سے اخباری تراشہ سے جتنا کام لینے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ برسہا برس تک ادبی لٹریچر کھنگالنے والوں کے بھی بس کی بات ہرگز نہیں تھی۔

ان کے طرز تدریس میں بلا کی جاذبیت، اثر آفرینی بلکہ ایک طرح کا سحر تھا، طلبہ بہت جلد ان کے گرویدہ ہوجایا کرتے تھے اور صرف ان کے بولنے کے انداز ہی نہیں ان کی چال ڈھال اور وضع قطع سب میں ان کی تقلید شروع کر دیتے تھے۔

مولانا وحیدالزماں کیرانوی کا کمال علمی دقائق یا ادبی نکات کے بیان میں نہیں بلکہ طلبہ کی مسلسل حوصلہ افزائی اور ان میں خود اعتمادی کی روح پھونکنے میں تھا، مردہ سے مردہ طالب علم میں بھی زندگی اور نشاط کا پیدا کر دینا ان کی تقریر اور تدریس کا عام اثر تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے روایتی ماحول میں عربی زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کرنا اور عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق وتمرین کا رجحان پیدا کرنا مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کا مرہونِ منت ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور فیضِ اثر سے بہت سے نوجوان فضلاء صاحب زبان وقلم بن گئے۔

مولانا میں افراد سازی کا خاص ہنر تھا، اگر دیوبند کے بعض سیاسی شعبدہ بازوں نے انھیں مختلف جھمیلوں میں مبتلا نہ کیا ہوتا تو طلبہ میں ان کی مقبولیت خالص علمی وتحقیقی کاموں کے لیے افرادِ کار کی تیاری کا اور زیادہ مؤثر

وسیلہ بنتی اور مولانا کے گرد مقالہ نگاروں، اور مؤلفین کی اور زیادہ بڑی اور باقاعدہ ٹیم ہوتی جو مولانا کے مشن کو ان کی زندگی کے بعد بھی برقرار رکھ سکتی۔

مولانا وحید الزماں صاحب کو قدرت نے تصنیف وتالیف کا جو سلیقہ عطا فرمایا تھا اس کا سب سے بڑا شاہکار ان کی وہ عربی اور اردو کی ڈکشنریاں ہیں جو انھوں نے "القاموس الجدید" کے نام سے مرتب کی ہیں، بلاشبہ وہ اپنی نظیر آپ ہیں اور خاص طور پر اردو سے عربی ڈکشنری جس سلیقہ مندی اور بالغ نظری سے انھوں نے مرتب کی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ بظاہر ان سے مخالفت رکھنے والے حلقہ میں بھی جو لوگ عربی سے شغل رکھتے ہیں ان کے ذاتی کتب خانوں میں بھی اس کا ایک نسخہ ضرور نظر آئے گا۔

انھوں نے عربی سکھانے کے لیے جو دروس ترتیب دئے تھے وہ بھی کافی مقبول ہوئے اور ان کو زندۂ جاوید رکھنے کے لیے ان کے یہ کارنامے کم نہیں ہیں۔

مولانا کے عزائم بہت کچھ کرنے کے تھے لیکن ظالموں نے ان کی ذات کی حد تک ایک قطعی لاحاصل جنگ میں ان کی زندگی کے کئی قیمتی سال ضائع کرا دیئے اور کبھی ان کو یکسوئی سے علمی کاموں کے لیے فارغ ہونے کا موقع نہیں دیا۔

دارالعلوم میں آنے سے پہلے ایک عرصہ تک انھیں مشقت کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ دارالفکر کا قیام۔ ڈکشنری کی شروعات اور چند اردو اصلاحی رسائل کی تالیف اس زمانہ میں ہوئی۔ پھر دارالعلوم سے وابستگی کے بعد یہ احساس کہ ان کی صلاحیتوں کی پورے طور پر قدر نہیں کی جارہی ہے۔ ان سب عوامل نے ان کے مزاج کا ایک خاص رنگ بنا دیا تھا، سیاسی بازیگروں نے ان کے جوہر قابل کا اندازہ کرکے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کیے یہاں تک کہ انھیں دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کے خلاف بغاوت کا عنوان اور انقلابی نعرہ بنا کر ہی دم لیا۔

کامیاب طرز تدریس، عربی زبان پہ عبور، لب ولہجہ کا جلال و آہنگ تو تھا ہی، اس لیے ان کا آتش فشاں بن جانا بالکل قرین قیاس تھا۔

کسی بھی ماحول کی اصلاح تو ایک ایسا عمل ہے جس کی ضرورت ہر زمانہ میں باقی رہے گی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مولانا نے جن لوگوں کے سہارے پر انقلابی نعرہ بلند فرمایا ان کے "شرمحض" ہونے پر تقریباً امت کا اتفاق سا ہے۔ اور خود مولانا کو بھی بعد میں اس کا احساس اچھی طرح ہو گیا تھا۔

لیکن جس وقت ایک خاندان کو بے دخل کرکے دوسرے خاندان کو برسر اقتدار لانے کی مہم زوروں پہ تھی اس وقت مولانا کے ذوقِ انقلاب کو مہمیز کرنے والی بہت سی چیزیں جمع ہو گئی تھیں اور بعض بونے قد کے لوگ بھی بڑی اونچی آواز سے بولنے لگے تھے اور ماحول وہی ہو گیا تھا جس کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی نے کہا ہے

ع
بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اب بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا تو خواہ مخواہ قربان ہوئے، فائدے میں وہی رہے۔ اور دارالعلوم کے مکانات، دکانیں، بنگلے سب انھیں لوگوں کے حصہ میں آئے جن کا کوئی خاص رول نہیں رہا البتہ فتنوں کو شہ دیتے رہے۔

مولانا کی زندگی کا وہ پہلو جس سے مجھے کبھی مناسبت نہیں ہوئی اور جس کی وجہ سے باہم کسی قدر دوری کی نوبت بھی آئی وہ جمعیۃ علماء ہند کی موجودہ قیادت سے مولانا کی وابستگی تھی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ جمعیت علماء" کی حیثیت ایک بے جان لاشہ کے سوا کچھ اور نہ رہ گئی ہو۔ مولانا کی طرف سے اس کی حمایت ہم لوگوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ مولانا نے جن کی زندگی کا پیغام ہی ادب اور شائستگی کو فروغ دینا تھا۔ جمعیۃ علماء کی تائید وحمایت میں بعض دفعہ ایسا انداز اختیار فرمایا جو ان کے مقام اور مشن سے میل نہیں کھاتا تھا۔

جہاں تک میرے اور مولانا کے تعلق کی بات ہے تو مولانا میرے نہایت ہی قابل احترام استاذ تھے اور میں ان کا ایک ادنیٰ شاگرد۔ مولانا سے میں نے حریری کی مقامات پڑھی تھی اور ان کے طرز تدریس کی کشش ایسی تھی کہ پورے سال میں نہ کبھی ناغہ کی نوبت آئی اور نہ بیماری کے عذر کی، سچ ہے کہ ؎

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمع بمکتب آورد طفل گریز پائے را

مولانا تعلیم کے ساتھ طلبہ میں خود اعتمادی کا جذبہ بھی ابھارتے رہتے تھے، چنانچہ مولانا کے درس سے زندگی کا شعور بھی ابھرتا تھا اور مولانا سے محبت اور گرویدگی بھی بڑھتی تھی۔ عربی کی مشق وتمرین کا بھی ان کا اپنا نرالا انداز تھا مولانا سے تعلق میں گرد اگر کبھی پڑی بھی تو اس کی وجہ مولانا نہیں بلکہ جمعیت علماء کی موجودہ قیادت سے مولانا کی وابستگی اور میری عدم مناسبت تھی۔ جس کی وجہ سے آزمائش کے مراحل بھی سامنے آئے۔

لیکن میرے لیے یہ بات خوشی اور سعادت کی ہے کہ مولانا نے اپنی نجی مجلسوں میں بھی اس کا بارہا اعتراف کیا کہ "میں نے بدر کو سب کچھ کہا لیکن اس نے کبھی میری بات کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے ساری باتیں سنتا رہا"۔ ورنہ مولانا کے بعض وہ شاگرد جن پر مولانا کو خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے زیادہ اعتماد تھا۔ انھوں نے قاسمی گروپ کے زیر اثر دارالعلوم کی درسگاہوں میں مولانا کے خلاف زبان درازی بھی کی جس سے مولانا سخت کبیدہ خاطر تھے اللہ نے سیاسی ذوق ورجحان میں موافقت نہ ہونے کے باوجود مجھے اس برے انجام سے محفوظ رکھا۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو "تقدس زادوں" نے پولیس کی مدد سے جو دارالعلوم پہ شبخون مار کر بظاہر فتح ونصرت

کا اعلان کیا تھا وہ درحقیقت اس کی کوشش تھی کہ دارالعلوم سے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ذوقِ اصلاح اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے ذوق علم و تحقیق کا جنازہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے اور دارالعلوم ایک مخصوص سیاسی گروہ کے ذاتی استحصال اور خاندانی وجاہت اور زرکشی کا ذریعہ بن جائے۔ حضرت الاستاذ مولانا وحیدالزماں کیرانوی کو اس مقصد کے حصول کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا کیونکہ ان کا اثر و رسوخ طلبہ پر بہت زیادہ تھا لیکن مقصد برآوری کے فوراً بعد ہی خود ان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا اور جب اس سے بھی مولانا کا انقلابی خطرہ نہیں ٹلا تو ان کو نہایت اعزاز کے ساتھ اس طرح سبکدوش کر دیا گیا جس طرح کہ صحت کی خرابی کا عذر کر کے اس سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو ان کی ساٹھ سالہ خدمات کا صلہ دیا جا چکا تھا۔ کیونکہ مولانا کے دارالعلوم میں رہنے کا مطلب ان لوگوں کی نظر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ بدنظمی اور استحصال کے خلاف پھر علم بغاوت بلند کر دیں اور دارالعلوم پر قبضہ رکھنا ان لوگوں کے لیے دشوار ہو جائے۔

حضرت الاستاذ مولانا وحیدالزماں کیرانوی میں زبان کی فصاحت کے ساتھ مزاج کی نفاست بھی بہت زیادہ تھی، ان کے جسم کے کپڑے سے لیکر ذاتی رہائش گاہ تک ہر چیز سے سلیقہ اور قرینہ ظاہر ہوتا تھا جو طلبہ کے لیے ایک مستقل درس اور تربیتی کورس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ادنیٰ درجہ کی بدنظمی اور بدسلیقگی بھی مولانا کے مزاج پر سخت گراں ہوا کرتی تھی۔ پھر مولانا کی جس طرح زبان نہایت شستہ تھی اسی طرح ان کا خط بھی نہایت پاکیزہ اور نفیس تھا اور عربی کی خطاطی میں بھی ان کی استادی مسلم تھی، مولانا کے حُسنِ ذوق، حسنِ تکلم اور نفاستِ طبع سے مولانا کے تمام بھائیوں اور مولانا کی اولاد کو بھی حصہ وافر ملا ہے اور سبھی باصلاحیت اور باسلیقہ ہیں۔ اور مولانا کی تربیت کا رنگ ان سبھوں پہ نمایاں ہے۔

حضرت مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن عربی زبان و ادب کی جو خدمت انھوں نے کی ہے، وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی اور ان کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے ان کی عربی کی بے مثال ڈکشنریوں اور عربی کے دروس کے علاوہ ان کے ہزاروں شاگرد بھی ہیں جو ملک کے طول و عرض میں ہی نہیں دنیا کے مختلف ملکوں میں بھی پھیلے ہوئے ہیں اور سبھی مولانا کی تعلیم و تدریس کی خوبی اور سلیقہ و شائستگی کے ثنا خواں ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کے نام پر عربی کی ایک اکیڈمی قائم کی جائے جس کے تحت ایک منظم پروگرام بنا کر عربی زبان و ادب کے فروغ کا کام اس طرح انجام دیا جائے جس سے مولانا کا مشن پورا ہو، اور اس مہم کے لیے اگر برادر مکرم جناب مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحب اقدام کریں تو مولانا کے شاگرد بھی ان کی اس مہم میں شریک ہو سکتے ہیں اور بظاہر وہ اس سے غافل نہیں ہیں اور غالباً مولانا کے باقیماندہ مسودات کی اشاعت

کا نظم بھی ان کے پیشِ نظر ہے ۔

اس بات کا غم البتہ ہم سبھوں کو رہے گا کہ مولانا کو اللہ نے شخصیت سازی کی جو صلاحیت دی تھی اور انھیں "مصنف" ہی نہیں " مصنف گر " بننے کا جو جوہر خدا نے ودیعت کیا تھا ظالموں نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر مولانا کو سیاسی خرخشوں میں الجھا کر ان کو یکسوئی کے ساتھ علمی کاموں کے لیے فارغ نہیں رہنے دیا اور ان کی صلاحیتوں کا خون کیا ورنہ برصغیر ہی نہیں عالم عرب میں بھی ایک بلند پایہ ادیب ، عالم اور مفکر کی حیثیت سے چند گنے چنے افراد میں ان کا شمار ہوتا لیکن گندم نما جو فروشوں اور دوست نما دشمنوں نے ان کا دوہرا خون کیا اور ملک و ملت کا بھی زبردست نقصان کیا ۔

دو سال پہلے برسوں کی دوری کے بعد جب مولانا ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے کویت تشریف لائے تو میں نے ان سے میریڈین ہوٹل میں ملاقات کی ۔ بعد میں غریب خانہ پر بھی تشریف لائے اور جبتک رہے بڑی محبت اور تعلق کا اظہار فرماتے رہے اور اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تم دیوبند آؤ تو میں تمہارا میزبان ہوں گا ، یہ ان کی ذرہ نوازی اور عظمت کی بات تھی ۔ افسوس ہے کہ ان سے پھر دوبارہ ملاقات کی نوبت نہیں آسکی اور ہمیشہ کے لیے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں میں جگہ دے ۔
ان کے انتقال کی خبر سننے کے لیے طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں تھی ۔ اور نہ ذہن تصدیق کے لیے تیار ۔ اس لیے :

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

بقیہ : ایک نابغۂ روزگار شخصیت .....

دارالعلوم اور طلبہ دارالعلوم کی ان خدمات کے علاوہ عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت ، تصنیف و تالیف محیر العقول کارنامے اپنی تنظیمی صلاحیتوں سے دارالعلوم اور متعدد جماعتوں کی سربراہی اور ان کی مجالس میں شریک ہوکر ایک مفکر اور مدبر کی حیثیت سے صحیح مشورے دینا اور نہایت بے باکانہ انداز میں حق گوئی کا مظاہرہ کرنا ، اور بڑے بڑے دانشوروں کی مجلس میں نہایت ٹھوس رائے پیش کرنا اور ان کے جمود و تعطل کو ختم کرکے میدانِ عمل میں اتارنا ۔ یہ آپ کی وہ عظیم خصوصیات اور کارنامے ہیں جن کو آنے والا مؤرخ آبِ زر سے لکھے گا اور رہتی دنیا تک مشعل راہ ثابت ہوں گے ۔

مولانا حبیب الرحمن کبیر الدین نگر

خالد القاسمی

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

۱۵/اپریل ۱۹۹۵ء کو حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی وفات کا سانحہ ایک عام عالمِ دین کی وفات کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسے مجاہد شخص کی جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم سے بھرپور داستانِ حیات کے اختتام کا سانحہ تھا، جو دارالعلوم دیوبند سے وابستہ موجودہ اکابر و علماء دین کی صف کا ایک ممتاز اور راقم الحروف کے خیال میں بعض وجوہ سے واحد روشن دماغ فرد تھا، جس نے جمود اندھی تقلید، بے جا شخصیت پرستی اور مجرمانہ مصلحت کوشی اور دجل وفریب کے مقابلے میں حرکت وعمل، بصیرت مندی اور حق گوئی و بے خوفی کا چراغ روشن کرنے کی جرأت کی تھی۔

(۱)

مولانا مرحوم پر لکھتے وقت یادوں کا ایک طویل سلسلہ ذہن میں آرہا ہے، مرحوم سے تعلق کا آغاز اصلاً دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عربی زبان وادب کے تکمیل وتخصص کے درجات میں داخلے کے وقت ہوا۔ پھر دارالمؤلفین دیوبند میں جب ان کی براہِ راست نگرانی وسرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا تو یہ نیازمندانہ تعلق اور زیادہ مستحکم ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ مرحوم کے ساتھ ان کے آخری ایام تک قائم رہا بلکہ ان سے متجاوز ہوکر دیگر افراد خاندان کے ساتھ بھی خوش گوار تعلقات قائم ہوگئے؛ جو تاہنوز برقرار ہیں۔ اس طرح مولانا کی وفات احقر کے لئے ایک گونہ شخصی المیہ بھی ہے۔

مولانا مرحوم کے تذکرے کی مناسبت اوران کے بھائیوں اور دیگر افرادِ خاندان سے راقم الحروف کے تعلقات کے حوالے سے ان کے برادرِ خورد حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم کا ذکر بھی یہاں کچھ بے جا نہ ہوگا جو اُن سے چار سال قبل ہی جوارِ رحمتِ باری میں پہنچ گئے۔ مرحوم جید حافظ قرآن تھے۔ عربی وفارسی کے آٹھ سالہ نصاب درسِ نظامی بھی نصف سے زائد مکمل کرچکے تھے۔ خاندانی شرافت کا نمونہ اور خوش کلامی، خوش لباسی اور سلیقہ مندی اور رواداری میں اپنے بھائیوں کی طرح ہی بے مثال تھے۔ ان کی دل نواز گفتگو

اُن سے ملنے والوں کو خاص طور پر متاثر کرتی۔ کاروباری مشغولیت کے باوجود نماز باجماعت کی غیر معمولی پابندی قابلِ رشک تھی۔

حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم کا ذکر یہاں خاص طور پر اس لئے بھی موزوں ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ اور ان کے دوسرے بھائیوں کے عروج و ترقی میں مرحوم کی ایثار نفسی اور اس جذبۂ خدمت و محبت کا بھی خاص دخل ہے جو خود غرضی اور نفسی نفسی کے آج کے مادہ پرستانہ دور میں تقریباً ناپید سا ہو کر رہ گیا ہے۔ مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ سے دو سال چھوٹے اور دیگر بھائی بہنوں سے بڑے تھے، اس لئے جب مولانا کے اہلِ خانہ کو قدرے معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑا تو قدرتی طور پر مولانا کے ساتھ حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم پر بھی گھر کی ذمہ داری آپڑی، انھوں نے یہ ذمہ داری نہایت خوبی کے ساتھ نبھائی اور فیصلہ کرلیا کہ اپنی تعلیم کا سلسلہ بند کرکے مکمل طور پر کسبِ معاش میں لگ جائیں، تاکہ ایک طرف بڑے بھائی مولانا وحید الزماں صاحب کو علمی و تصنیفی کاموں کے لئے قدرے یکسوئی حاصل ہوسکے اور دوسری طرف ان کے دوسرے چھوٹے بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم و ترقی میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم کی یہ خاموش قربانی رنگ لائی۔ چنانچہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی اپنی ذہانت صلاحیت اور عبقریت کے راستے شمعِ ضیا پاش بن کر چمکے اور دوسری طرف دوسرے بھائیوں نے بھی اعلیٰ دینی و عصری تعلیم حاصل کرکے ترقی کے مدارج طے کئے۔

حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم سے راقم کے تعلقات اس وقت ہوئے جب ۱۹۸۹ء کے اواخر میں وہ دہلی سے دیوبند منتقل ہوئے اور میں دہلی کے لئے پابہ رکاب تھا۔ ایک روز بے تکلفی کے انداز میں کہنے لگے کہ خالد میاں یہ ٹھیک نہیں کہ میں دیوبند آیا تو تم لوگ دہلی کا رخ کرو، ہمارے تعلقات اور دیرپا ہونے چاہئیں میں نے کہا دہلی رہتے ہوئے بھی ان شاء اللہ آپ سے تعلقات اسی طرح رہیں گے جیسے یہاں۔ مگر افسوس کہ صحبتِ یار آخر شد۔ مرحوم کی حیاتِ مستعار کے دن پورے ہوگئے تھے۔ جون ۱۹۹۰ء میں امتحان کے سلسلے میں علی گڈھ میں مقیم تھا کہ ایک روز صبح کے اخبار میں ان کے اچانک حادثۂ وفات کی خبر پڑھ کر سُن رہ گیا۔ زندگی کی ناپائیداری اور موت کے سامنے انسان کی بے بسی اگرچہ ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ و مشاہدہ بارہا ہوتا رہتا ہے، مگر اس کا احساس اس وقت شدید ہوجاتا ہے جب کوئی متعارف و محبوب شخصیت غیر متوقع طور پر ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے۔ میں بھی کچھ دیر کے لئے اسی طرح کے احساس و صدمے سے دوچار رہا۔ پھر غالباً اسی روز دیوبند مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کے نام ایک مکتوبِ تعزیت روانہ کیا۔

(۲)

دارالمؤلفین میں قیام کے دوران مولانا مرحوم نے حضرت نانوتویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ کی کتابوں کی تسہیل و ترتیب کا کام میرے سپرد کیا اور پوری آزادی دی کہ اس کام کو اپنے طور پر بہتر سے بہتر انداز میں انجام دوں۔ ترتیب و تسہیل کے سلسلے میں مولانا کی طرف سے دی گئی آزادی کا میں نے کچھ زیادہ ہی استعمال کیا اور اس میں اردو کے نئے اور مروجہ قواعدِ املا کی مکمل رعایت و پابندی کی بھی ٹھان لی اور اس کے لئے جدید اردو املا کی سب سے مستند و قابل اعتبار کتاب پروفیسر رشید احمد خاں صاحب کی "اردو املا" کو خاص طور سے پیشِ نظر رکھا۔ مذکورہ کتاب میں درج جدید املا اگرچہ اکثر ادیبوں اور لکھنے والوں کے ذریعے اختیار کرلی گئی ہے اور ہندو پاکستان کے تقریباً تمام معیاری اخبارات و ماہناموں میں ایک عرصے سے وہی رائج ہے، مگر دینی اداروں اور علمائے دین کے حلقے اب بھی اس سے بہت حد تک نامانوس ہیں۔ چنانچہ میرے دہلی آنے کے بعد جن حضرات کو مولانا نے میرے تیار کردہ مسودوں کو پروف ریڈنگ کے لئے دیا، ان میں سے بھی بعض نے میرے اختیار کردہ جدید املا کو "املا کی غلطی" سمجھا۔ مجھ تک جب یہ بات پہنچی تو احساس ہوا کہ ترتیب و تحقیق کے نئے انداز کو اختیار کرتے ہوئے قدرے احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا، اور پرانے ذہن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔

خیر، بتانا یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی طرف سے پوری علمی آزادی حاصل تھی اور ہم تمام رفقائے ادارہ کو لکھنے پڑھنے کی جو سہولیات درکار ہوتیں وہ فوراً مہیا ہوجاتیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مولانا علمی اور دینی پہلو سے دارالعلوم دیوبند کے خاص فکر اور منفرد نقطۂ نظر کے حامل اور داعی ہونے کے باوجود دوسرے علمار کے افکار و خیالات کا بھی احترام کرتے اور اس سلسلے میں وسیع النظر اور روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ چناں چہ ایک بار ہم نے ان سے عرض کیا کہ حضرت نانوتویؒ کی متکلمانہ انداز میں اسلام کے دفاع میں لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین کو آج کی عصری زبان میں پیش کرنے میں مولانا مودودی مرحوم کی تحریروں سے بھی زبان و بیان، طرزِ نگارش اور طریقۂ استدلال کی حد تک رہنمائی حاصل کرنی چاہئے کہ مولانا مودودی کے بعض خیالات سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود دورِ حاضر کے ایک متکلم اسلام کی ان کی حیثیت و اہمیت میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے اگر دارالمؤلفین کی لائبریری میں ان کی تصنیفات بھی ہوں تو ہمیں اپنے کام سے متعلق ان سے استفادہ کا موقعہ ملے گا اور رہنمائی حاصل ہوگی۔ مولانا نے ہماری اس درخواست کو بشاشت کے ساتھ قبول کرلیا اور دوسرے روز دارالمؤلفین کی لائبریری میں مولانا مودودی کی تمام تصنیفات کا ایک مکمل سیٹ آگیا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، دیگر اکابر دیوبند کی طرح مولانا مرحوم کو بھی مولانا

مودودیؒ کے بعض افکار سے جو اختلاف تھا اور اس کا وہ جس قوت سے اپنی مجلسوں میں اظہار کرتے تھے، وہ ان سے قریب رہنے والوں پر مخفی نہیں، اس کے باوجود ان کی مذکورہ روشن خیالی کا موازنہ اگر دارالعلوم دیوبند کی اس صورتِ حال سے کیا جائے تو بڑا عجیب لگتا ہے جس میں مختلف کتابوں اور لٹریچر کے مطالعہ کی ہمت افزائی یا اس کو گوارا کرنا تو دور کی بات ہے، صرف کسی خاص جماعت کی طرف سے شائع ہونے والے کسی کیلنڈر اور تعارفی لٹریچر کا وجود بھی کسی ذہین طالب علم کے قابلِ عتاب واخراج ہونے کے لئے کافی ہے۔ ایسے ماحول میں بھلا علم ودانش کا فروغ، ذہانتوں اور صلاحیتوں کی صیقل گری اور نئے حالات وتقاضوں سے باخبر، بصیرت مند اور روشن خیال افراد کی تربیت کیسے ممکن ہے؟ تنگ نظری، ذہن ودماغ کو زہر آلود بناتی ہے۔ اور جہالت، جمود اور اختلاف کے دروازے کھولتی ہے۔

دارالمؤلفین سے ہماری وابستگی، ہماری زندگی کا ایک یادگار دور ہے جو مولانا مرحوم سے قربت اور ان کی رہ نمائی میں کچھ لکھنے پڑھنے کا سلیقہ سیکھنے میں گزرا اور جس میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر حضرت نانوتویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے علوم ومعارف پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے عصری تعلیم اور امتحانات کا سلسلہ بھی جاری رکھا، جس کے لئے ہمیں مولانا کی طرف سے پوری حوصلہ افزائی اور آزادی حاصل تھی، یقیناً علمی اور مادی طور پر اب تک جو کچھ مجھے حاصل ہوا یا آئندہ بھی جو خدا کے فضل وکرم سے حاصل ہوگا، اس میں دارالمؤلفین سے مختصر وابستگی اور مولانا مرحوم کی رہ نمائی کو جو بنیادی دخل ہے، اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح عربی زبان وادب کی حد تک مولانا کے ہی ممتاز شاگرد استاذ محترم مولانا نور عالم خلیل امینی استاذِ دارالعلوم دیوبند ومدیر ماہنامہ "الداعی" (عربی) کی فیض رسانی کو بھی کبھی بھلا نہیں سکتا۔ خدا انھیں عمر دراز نصیب کرے اور ان کے علمی وادبی فیوض کو عام اور جاری وساری رکھے۔

(۳)

مولانا کے اندازِ تعلیم وتربیت کی انفرادیت وافادیت اور اس سلسلے میں ان کی جگر کاوی کا صحیح اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے، جب تصویر کے دونوں پہلو سامنے ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کن نامساعد حالات میں مرحوم نے کیسے کیسے غیر معمولی کام انجام دیئے، بدقسمتی سے میں وہ دور نہیں دیکھ سکا: جو ان کی تدریسی وعلمی سرگرمیوں کا اصل عہدِ شباب تھا، جس میں ان کے چشمۂ فیض تعلیم وتربیت سے ان گنت تشنگانِ علم وادب سیراب ہوئے، اور پھر لعل وگہر بن کر نکلے، مولانا کے اس خاص دور کی تفصیلات ترجمانِ دارالعلوم کے اس خاص شمارے کے بعض مضامین میں مل

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کی کراچی نمبر

جائیں گی جو ان کے اسی دور کے بعض ہونہار و باکمال شاگردوں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے دینی مراکز و مدارس کا ماضی بہت تابناک رہا ہے اور اس سے فیض یافتہ علماء و فضلاء نے خاص دینی و اسلامی علوم کے علاوہ، جو ان کی اصل اور فطری جولانگاہ تھی، علم و فن کی دوسری شاخوں میں بھی جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بھی اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے کچھ کم درخشاں اور قابل رشک نہیں ہیں۔ آج سے ایک صدی قبل کے علمائے دین کی مختلف سماجی اور انسانی علوم و فنون کی ہمہ جہتی خدمات و تخلیقات کو اگر سامنے رکھیں تو یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ اسی جماعت کے پیش رو ہیں، جس نے آج کل خود کو بڑی حد تک خانقاہوں، مسجدوں اور مدرسوں میں محصور کر رکھا ہے جہاں عموماً بہ قولِ شاعر ؎

نہ زندگی ، نہ محبت ، نہ معرفت ، نہ نگاہ

مثال کے طور پر ادب، صحافت اور شعر و شاعری کا باب لے لیجیے اور عربی، فارسی اور اردو کے زیادہ نہیں نصف صدی قبل کے ذخیرے پر نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ ان میدانوں میں بھی جو آج کل صرف "روشن خیال" "جدید تعلیم یافتہ" بلکہ "دین بیزار" لوگوں کی جاگیر سمجھا جاتا ہے، دینی مدارس کے حلقوں سے وابستہ فضلاء و علماء کے کارنامے کسی سے کم نہیں ہیں۔ لیکن جب سے دینی مدارس و مراکز میں جمود، تقلید اور خانقاہی مزاج کے دَر آنے کی وجہ سے علمی زوال شروع ہوا تو زبان و ادب سے بھی دوری بڑھتی گئی اور بتدریج نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ تقریباً آٹھ سالہ درسِ نظامی کی تکمیل خالص عربی زبان میں کرنے کے باوجود فضلائے مدارس دورِ حاضر میں رائج عربی زبان کو سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی صلاحیت سے افسوسناک حد تک محروم رہنے لگے۔ دینی مدارس اور خاص طور سے دارالعلوم دیوبند کے حلقے سے وابستہ اداروں کے فضلاء و طلباء کی یہ بے خبری نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک کمی تھی، بلکہ اسلام کے افہام و تفہیم اور دعوت و تبلیغ کے اس فریضے کی ادائیگی میں بھی ایک بڑی رکاوٹ تھی، جو یقیناً دینی مراکز اور ان کے فضلاء کا اہم اور اولین مقصد ہے۔ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی جیسے روشن دماغ، بیدار مغز اور حقیقت پسند عالمِ دین کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی اور انھوں نے اس کمی کو دور کرنے کا عہد کر لیا۔ چنانچہ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان و ادب کے فروغ کے لئے جو کوششیں کیں اور ان کے جو خوشگوار نتائج برآمد ہوئے وہ آج ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ جس سے اختلاف کی مجال مولانا مرحوم کا مخالف ترین شخص بھی نہیں کر سکتا۔

عربی زبان قرآن و حدیث کی زبان ہے، اسلامی فقہ و قانون کے معتبر و مستند مراجع کی زبان ہے، اسلامی

تاریخ، تہذیب اور دعوت وتبلیغ کی اصل زبان ہے اور عالم اسلام کے ایک بہت بڑے حصے میں بولی، سمجھی اور برتی جانے والی زندہ زبان ہے، اس لئے اس کے فروغ واشاعت کے لئے کی گئی مولانا مرحوم کی خدمات اور کوششوں کی عظمت میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہئے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ مولانا کو ابتدا میں خود دارالعلوم دیوبند میں "عربی مخالف" ماحول کا سامنا کرنا پڑا، اور بعض موقر اساتذہ وذمہ داران کے تمسخر آمیز کلمات اور طعنوں کو بھی سہنا پڑا، جو دراصل اس خاص میدان میں اپنی کم علمی کے احساس کو چھپانے کے لئے مولانا کی ان خدمات کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ آج بھی علم و فضل کے ایسے دعویدار نظر آجاتے ہیں، جو دانستہ یا نادانستہ طور پر مولانا مرحوم اور ان کے فیض یافتگان کی اس خوبی وہنرمندی کو کم کرنے کی کوشش کرکے خود کو اس نامراد کارواں میں شامل کرلیتے ہیں، جس کے دل سے متاعِ کارواں تک کے لٹ جانے کے بعد" احساسِ زیاں" بھی جاتا رہا ہو۔ اگر عربی زبان کی مخالفت یا اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش اخلاص ودردمندی کے ساتھ ہے تو ہماری دعا ہے کہ خدا ان کی اس بے توفیقی وکم علمی کو دور کرکے صرف عربی زبان ہی نہیں تمام زندہ زبانوں کی افادیت کو سمجھنے اور ان کو اسلام کی دعوت وتبلیغ اور مسلمانوں کی ترقی وفلاح کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت واہمیت کا ادراک وتوفیق عطا کرے۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی اور جذبہ کارفرما ہے تو ہم ان اعتراضات کو ایک "بداندیش" کی کم نظری سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے جسے ہنر بھی عیب نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا مرحوم صرف عربی زبان کے ہی مردِ میدان نہیں تھے، جیساکہ عام تاثر ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں ہی بعض وجوہ سے ان کی صلاحیتیں آشکارا ہوسکیں، ورنہ دیگر علوم وفنون سے بھی مولانا کا تعلق کچھ کم نہ تھا، ایک زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں مولانا کو دورۂ حدیث کے بعض اسباق ملے، تو انہیں بھی طلبا میں وہی قبولِ عام حاصل ہوا جو مولانا کے عربی زبان کے اسباق کو حاصل تھا۔ خود مولانا کی زیرنگرانی مرکز دعوتِ اسلام (جمعیۃ علمائے ہند) اور دارالمؤلفین دیوبند سے جو مختلف علوم وفنون کی وقیع کتابیں شائع ہوچکی ہیں، وہ ان کی علمی ہمہ گیری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بہرحال جس علمی یکسوئی اور کمال کے ساتھ آپ نے زندگی کے آخری دو تین سالوں میں، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی مقبول عام تفسیر "معارف القرآن" کے مضامین کو چودہ سو صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں میں "جواہر المعارف" کے نام سے مرتب فرمایا اور شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن کی تسہیل کا جو خالص علمی کام شروع کردیا تھا یہ سب مولانا کی علمی ہمہ جہتی کی دلیل ہے، اس سے واضح ہے کہ اگر مختلف النوع سرگرمیوں نے ان کو مہلت دی ہوتی تو یقیناً ہمارے درمیان آج ان کے قلم سے نکلی ہوئی دیگر علوم وفنون کی بھی بیش قیمت کتابیں موجود ہوتیں۔

(۴)

مولانا مرحوم نے طلبہ کی ذہنی و فکری تربیت کا جو انداز اپنایا تھا اور اس کے جو خطوط متعین کئے تھے، وہ بھی اپنی ندرت، اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بے مثال تھے۔ دینی مدارس و مراکز میں عام طور پر بے جا عقیدت و احترام کو طلبہ پر اس قدر مسلط کر دیا جاتا ہے کہ بسا اوقات ان کی خود داری اور صاف گوئی کی عادت بھی منفی طور پر متاثر ہو جاتی ہے، مولانا اس صورتِ حال کو ناپسند فرماتے تھے اور اپنی طرح طلبہ اور شاگردوں سے بھی صاف گوئی اور احترام آمیز بے تکلفی کی توقع رکھتے اور فرماتے کہ غیر ضروری عقیدت و احترام اور ڈر کو اس طرح مسلط کر دینا کہ طلبہ اپنے دل کی بات بے خوف و خطر نہ کہہ سکیں، دراصل نفاق، دروغ گوئی اور تصنع آمیزی جیسی برائیوں کو جنم دیتا ہے۔

مولانا کی تربیت عملاً جامع اور ہمہ گیر ہوتی تھی اور وہ اپنے شاگردوں کی علمی، فکری اور نفسیاتی تربیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی کے عام معمولات پر بھی نظر رکھتے اور نہایت سلیقہ اور حکمت کے ساتھ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے وغیرہ جیسی معمولی چیزوں کے آداب تک کی تلقین فرماتے۔ اس سلسلے میں نمونہ خود ان کی زندگی ہوتی جو سلیقہ مندی میں اپنی مثال آپ تھی۔ مولانا ان اکابر و علماء میں سے نہیں تھے جو صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں اور مسندِ درس و ارشاد پر جلوہ افروز ہو کر ایک آدھ گھنٹہ کسی علمی یا فقہی مسئلہ پر فلسفیانہ تقریر فرما لینا ہی معراجِ کمال سمجھتے ہیں اور اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ان کی تقریر دل پذیر کا طلبہ اور شاگردوں کی عام زندگی پر کوئی دیرپا اثر ہوا یا نہیں اور یہ کہ حقیقت اور عمل کی دنیا میں اس سے کیا فائدہ ہوا؟ مولانا شعلہ بار خطیب ہونے کے باوجود وعظ گوئی کے ڈھنگ کو ناپسند کرتے ہوئے اپنی ایک ایک حرکت و عمل سے طلباء اور شاگردوں کی تربیت کرنے میں یقین رکھتے تھے۔

مولانا کے بارے میں ہمارا یہ دعوا بالکل نہیں کہ وہ بحر العلوم تھے، علامۂ بیکراں اور فاضلِ دوراں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور برصغیر میں کچھ لوگ علم و فضل میں ان سے بڑے ہوں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہمارے علم کی حد تک مولانا نے اپنی شخصی کوششوں، بے لوث جد و جہد اور لگن سے عربی زبان و ادب، دینی علوم اور سماجی، ملی اور اخلاقی شعور و آگہی سے جتنی بڑی نسل کو آراستہ و فیض یافتہ بنایا، شاید ہی آج کل کسی دینی درس گاہ سے شخصِ واحد کی محنت کے نتیجے میں اتنی بڑی تعداد میں باشعور علماء نکلے ہوں۔ مرحوم کی تربیتِ خاص سے فیض یافتہ اس جماعت کے افراد برصغیر ہند و پاک کے علاوہ عرب، افریقہ اور یورپ کے متعدد ملکوں میں اُن سے حاصل کردہ فکر و شعور کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن [illegible] نمبر

مولانا کو جو چیز دیگر روایتی علماء و اکابرین سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے ان کی حقیقت پسندی، نئے حالات اور ان کے تقاضوں کا بصیرت مندانہ شعور اور طلباء کی ایسی تعلیم و تربیت کہ ان کی خودی و خودداری کسی طرح کمزور نہ ہو اور اسلاف کی تاریخ و روایات پر نظر رکھتے ہوئے دورِ جدید کے تقاضوں کا بھی انہیں پورا ادراک ہو تاکہ ان میں احساس کمتری پیدا نہ ہو اور وہ آج کی تیز رفتار اور نت نئی ایجادات سے بھری دنیا میں خود کو اجنبی محسوس نہ کریں، ان کا خیال تھا کہ دینی مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم اور بالخصوص طریقۂ تعلیم امت کو باشعور دینی اور اجتماعی قیادت فراہم کرنے کے لئے کافی نہیں۔ دورِ جدید کے تقاضوں اور علوم سے علمائے دین کی بے خبری مولانا کو ہمیشہ فکر مند رکھتی تھی کیونکہ انہیں احساس تھا کہ "آئینِ نو سے ڈرنا" اور "طرزِ کہن پہ اڑنا" قوموں کی زندگی میں کتنا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔

مولانا کے مذکورہ اندازِ تعلیم و تربیت کی افادیت اس وقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے، جب ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کا موازنہ عام فضلائے مدارس سے کیا جائے۔ چنانچہ ایک طرف جہاں مولانا سے فیض یافتہ افراد ملک و بیرونِ ملک زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت کامیابی سے سرگرم عمل ہیں اور نئے ماحول میں وہ خود کو قطعاً اجنبی اور مرعوب محسوس نہیں کرتے، تو دوسری طرف عام طور سے روایتی فضلائے مدارس دینیہ کی جو خستہ حالی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

مولانا مرحوم کی اس مربیانہ خصوصیت و فنکاری کا اعتراف و احساس ہر واقف کار مخالف و موافق کو ہے کہ ان کے فیض یافتہ شعور و سلیقہ مندی میں عام فضلائے مدارس سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دار العلوم دیوبند میں جامعہ ازہر، قاہرہ، مصر کی طرف سے عربی زبان و ادب کی تدریس کے لئے مبعوث مصری عالم شیخ عبد اللہ جمعہ رضوان نے اس زمانے میں، جب مولانا کے مخالفین نے ان کو بدنام کرکے غیر مفید ثابت کرنے کی زبردست مہم چلا رکھی تھی، تاکہ ان کو دار العلوم سے جبراً سبکدوش کرنے کی راہ ہموار کی جا سکے، اپنے کمرے میں ایک مرتبہ چند حضرات کے سامنے جن میں راقم بھی تھا اور غالباً دار العلوم دیوبند کے کچھ اساتذہ بھی، کہا تھا کہ اگر دار العلوم کے لئے شیخ وحید الزماں کیرانوی کی ہمہ جہت قربانیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ان کا یہ کارنامہ کافی ہے کہ انھوں نے اپنی تربیت کے نتیجے میں ایک باشعور نسل پیدا کر دی ہے، کیوں کہ یہ بات ان کے علاوہ کسی اور شخص کے یہاں میں نے نہیں پائی۔

اور یہی وہ خاص اندازِ تربیت تھا جس نے ہمیشہ مولانا کی ذات کو دار العلوم دیوبند کے ذہین طلبہ کا مرجع و محبوب بنا رکھا تھا۔ حالاں کہ ان کے پاس حدیث و تفسیر کے بنیادی اسباق نہیں ہوتے تھے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

اور عموماً انھوں نے عربی کے تکمیل اور تخصص کے شعبوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے، جنھیں اضافی اور تکمیلی درجات کی حیثیت حاصل رہی ہے اور جن میں فارغ التحصیل طلبہ کی ایک مختصر جماعت کو ہی داخلہ مل پاتا تھا، پھر بھی چونکہ ذہین طلبہ کو صحیح ذہنی، فکری اور شعوری غذا مرحوم کے پاس ہی مل پاتی تھی، اس لئے وہ ان سے وابستہ رہنے کی کوشش کرتے، ان سے استفادہ کرتے اور بہت جلد ان کے جاں نثار و وفا شعار بن جاتے۔ مولانا کو کبھی کبھار اس سے بظاہر نقصانات بھی ہوئے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی طرف سے جب بھی اسٹرائک کا کوئی بڑا واقعہ ہوا، تو مرحوم کی طرف ہی انگلیاں اٹھائی گئیں۔ کیوں کہ ایک تو یہ کہ طلبہ کے ہنگامے اور اسٹرائک عموماً ان کے مطالبات کو لے کر ہوئے اور مولانا طلبہ کی ہمدردی اور ان کے جائز مطالبات کی حمایت میں سب سے آگے رہتے، دوسرے عموماً اسٹرائک کی قیادت ذہین طلبہ کے ہاتھوں میں رہتی اور ذہین و باصلاحیت افراد ہمیشہ مولانا کے حلقہ بگوش رہے۔

(۵)

مولانا مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں اصلاح اور نشأۃ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا، بس وہ خواب ہی رہ گیا اور ایشیا کی اس عظیم تاریخی اسلامی درس گاہ کی عظمتِ رفتہ کی واپسی کے امکانات بظاہر معدوم سے ہوگئے ہیں۔ دیوبند جیسے چھوٹے شہر میں چند قدم کے فاصلے پر دو دارالعلوم وجود میں آچکے ہیں اور دونوں کا یہ علاحدہ وجود چند لوگوں کے ذاتی مفادات کی وجہ سے پائیدار ہوتا جارہا ہے اور ساتھ ہی ان کا دائرہ بھی سکڑتا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال ہم جیسے ان ہزاروں بہی خواہان و فیض یافتگان کے لئے نہایت کربناک ہے، جو اب بھی اس عظیم ادارے کی یکجائی و آفاقیت بحال ہونے کی بظاہر پوری نہ ہونے والی تمنا اپنے سینوں میں چھپائے بیٹھے ہیں۔

خیر، مصلحتِ خداوندی کے آگے کس کی چلی ہے؟ مرضیِ مولا از ہمہ اولا ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے خدا کرے یہ شمع علم و عمل ماضی کی طرح مستقبل میں بھی فروزاں رہے۔

لیکن جہاں تک دارالعلوم دیوبند اور مولانا کا تعلق ہے، تو اس کی داستان بھی بڑی عجیب ہے اور چمنستانِ قاسمی میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے، اس کا ایک پہلو وہ ہے جو مرحوم کی ۲۷ سالہ تدریسی و تربیتی خدمات پر مشتمل ہے، یہ پہلو نہایت تابناک اور قابلِ رشک ہے کیونکہ یہی مولانا کا اصل میدان تھا۔ انھوں نے کس طرح خود کو موم کی طرح پگھلا کر، فنا کرکے، اپنے آرام و راحت کو تج کر اور شب و روز جاں گداز و مسلسل محنت کرکے اپنے شاگردوں کو علمی و فکری تربیت دی، انھیں لکھنے پڑھنے کا سلیقہ دیا اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ انھیں باشعور زندگی جینے کا قرینہ بتایا، اس کی تفصیلات تحریری طور پر اس خاص نمبر کے بعض مضامین میں مل جائیں گی اور عملی طور پر ان ہزاروں شاگردوں اور فیض یافتگان کی شکل میں، جو ملک و بیرون ملک چہار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر صرف یہ عرض کروں گا کہ اگر مولانا نے طلبہ کی تربیت میں خود کو فنا نہ کر دیا ہوتا اور بہت سے اساتذہ کی طرح صرف درس گاہوں میں جا کر درس کی خانہ پُری کر دیتے اور واپس آکر سارا وقت علمی اور تصنیفی کاموں میں یکسوئی کے ساتھ صرف کرتے جیسا کہ عموماً بڑے اداروں اور یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے، تو یقیناً وہ نہ صرف برصغیر بلکہ ایشیا کے ممتاز مفکر و مصنف ہوتے، کیوں کہ ان کا ذہن جتنا زرخیز اور دور رس تھا اور ان کی قوتِ فیصلہ و عمل جس قدر مضبوط اور بے پناہ تھی، اس سے کون واقف نہیں؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک بڑا مفکر، مصنف، پیر یا لیڈر بننے کے لیے جس خود غرضی، استحصال پسند اور مفاد پرست طبیعت و صلاحیت کی ضرورت ہے، مرحوم اس سے عاری تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی تعمیر کے بجائے اپنے شاگردوں کی تعمیر و تربیت پر ساری توانائی صرف کی۔

ایک بار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک استاذ نے جواب خود بھی جوارِ رحمتِ باری میں پہنچ گئے ہیں، مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کو نہایت اخلاص و ہمدردی کے ساتھ مشورہ دیا کہ جتنا وقت وہ طلبہ کی تعلیم و تربیت پر صرف کرتے ہیں اگر اس میں قدرے کمی کر کے وہ اپنے علمی اور تصنیفی کاموں کی طرف زیادہ توجہ دیں تو یہ ان کی ذات کے لئے نسبتاً زیادہ مفید ہوگا۔ مولانا نے اپنے مخلص کرم فرما کی خیر خواہی کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ طلبہ اور اپنے شاگردوں پر محنت و توجہ میں کمی نہیں کر سکتے، خواہ اس میں ان کا ذاتی نقصان کیوں نہ ہو۔ یہ جذبہ، یہ بے غرضی اور ایثار آج کے خود غرضانہ ماحول میں کس قدر عظیم اور قابلِ رشک ہے۔

مولانا مرحوم کا دارالعلوم دیوبند سے متعلق ایک پہلو وہ بھی ہے، جو اس کی تعمیرات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجلاس صد سالہ کے موقع پر نہایت کم مدت میں دارالعلوم کی بنیادی عمارتوں کی تعمیر و اصلاح کے لئے مولانا نے جس طرح شب و روز ایک کر کے اور اپنی صحت و طبیعت کے تمام تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر کے یہ کام مکمل کیا، اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس مردِ مجاہد کی زندگی کا یہ پہلو دیکھا ہو۔ جو علمی، تربیتی، فکری اور تدریسی نہیں بلکہ تعمیراتی تھا جہاں کتابوں اور طالب علموں سے نہیں، اینٹ، پتھر اور مزدوروں و ٹھیکیداروں سے واسطہ تھا، مگر اس سے بھی ان کا شغف دیدنی تھا۔ ایک مشاہد کی روایت ہے کہ اس زمانے میں دیر رات گئے تک جاگ کر حساب

وکتاب کی جانچ کرنا اور پھر صبح سویرے تعمیرات کی نگرانی اور ضروری ہدایات دینے کے لئے جائے تعمیرات پر پہنچ جانا مولانا کا معمول سا بن گیا تھا اور جب سرمائے کی کمی ہوئی تو مولانا نے اس کے لئے پورے ملک کا طوفانی دورہ کرکے ضروری فنڈ اکٹھا کیا، ان کی شب وروز کی بے پناہ محنت وجاں فشانی کا احساس تقریباً سب کو تھا اور سب سے زیادہ اس وقت کے سرخیلِ کاروانِ دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کو جن کی آنکھیں کئی بار مولانا کیرانوی کے تئیں جذباتِ تشکر وہمدردی سے اشکبار ہوگئیں، جیساکہ عینی مشاہدین کی روایت ہے۔ خدا ان نیک نفس بندوں کو اپنی رحمت سے نوازے۔

دارالعلوم دیوبند سے متعلق مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک نہایت اہم لیکن نتائج وعواقب کے لحاظ سے اسی قدر افسوسناک پہلو انقلاب کا ہے جس نے اس عظیم ادارہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور ساتھ ہی ان سے وابستہ ذمے داروں اور ہمدردوں کو بھی۔ دارالعلوم دیوبند کے نظام کی اصلاح اور اس کی نشاۃِ ثانیہ کی تمنا اس ادارے کے ہزاروں لاکھوں فیض یافتگان وبہی خواہان کے دلوں میں موج زن تھی اور قاسمی برادری کے ایک باشعور فرد کی حیثیت سے مولانا مرحوم کے دل میں بھی یہ درد کسی سے کم نہ تھا، بلکہ اسی درد نے انھیں جد وجہد پر آمادہ کیا اور چونکہ ان کی عادت تھی کہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی بھرپور سعی کرتے۔ دارالعلوم کی اصلاح وانقلاب سے متعلق ان کی جد وجہد بھی کچھ اسی انداز کی رہی۔ چنانچہ توفیقِ خداوندی شاملِ حال رہی اور مولانا کی قیادت میں آخر انقلاب آکر رہا۔

اس انقلاب کے عوامل ومحرکات کیا تھے؟ مولانا کیرانوی کے ساتھ لگنے والے دوسرے لوگ کتنے مخلص تھے؟ اور اس کے موجودہ نتائج کا ذمے دار کون ہے؟ یہ باب کھلا ہوا ہے اور لوگ اس پر اپنے اپنے نقطۂ ہائے نظر کے مطابق لکھتے رہے ہیں اور رہیں گے۔ اس بحث کو چھوڑتے ہوئے یہاں دو باتیں ایسی ہیں جو راقم کے نزدیک بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اس انقلاب کے حوالے سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے گرد گھیرابندی کرنے والے وہ نادان لوگ اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے، جنھوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے قاری صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی اس وقت کی موقر مجلس شوریٰ کے ان اراکین، اساتذہ، طلبہ اور تمام ہمدردوں اور بہی خواہوں کے مقابل زبردستی لاکھڑا کیا تھا جن کے دلوں میں قاری صاحب کے تعلق سے عقیدت واحترام اور ان کی خدمات کے اعتراف میں نہ تب کوئی کمی تھی اور نہ اب ہے۔ دوسرے یہ کہ مولانا وحید الزماں

صاحب کے ساتھ لگنے والے بعض حضرات کی نیت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، مولانا مرحوم کا مقصد اصلاح کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور اس سلسلے میں ان کے اخلاص میں کوئی کلام نہیں۔ چناں چہ انقلاب کے بعد پورا دارالعلوم انتظامیہ اور شوریٰ کے حوالے کر کے یہ کہتے ہوئے دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ:

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

مولانا مرحوم کے اسی اخلاص و حق گوئی سے خوف کھا کر یاروں نے جس طرح انھیں بتدریج اہتمام، تدریس اور پھر دارالعلوم سے الگ کر دیا، یہ کون نہیں جانتا۔ میرا مقصد سخن فہمی ہے، غالب کی طرفداری نہیں، اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ وہ بھی انسان تھے اور نسبتاً عام لوگوں سے زیادہ سرگرم عمل۔ اس لئے ان سے ایک گوشہ نشین شخص کے مقابلے میں زیادہ اجتہادی غلطیوں کا صدور عین ممکن ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ زیادہ حساس طبع ہونے کی وجہ سے وہ قدرے زود رنج بھی تھے، لیکن ان چیزوں سے ان کا اخلاص، ان کی دردمندی اور کارکردگی کیسے متاثر ہو سکتی ہے؟ اور ان کی عظمت و عبقریت کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟

(۶)

دارالعلوم دیوبند میں ایک طویل عرصہ ایسا بھی گذرا ہے، جب لوگ مولانا مرحوم کی بے پناہ مقبولیت اور مختلف النوع قابل رشک صلاحیتوں کی وجہ سے ان سے وابستگی اور قربت کی تمنا اپنے سینے میں چھپائے پھرتے اور کوشش ہوتی کہ ان سے وابستگی اور اکتساب فیض کی کوئی شکل نکل جائے۔ مولانا سے کسی طالب علم کی وابستگی اس کے سلیقہ مند، ذہین، باصلاحیت اور باشعور ہونے کی علامت ہوتی، جو اسے دوسرے طلبہ سے ممتاز رکھتی۔ خود راقم کے زمانۂ طالب علمی میں بھی مولانا کی یہ برگزیدگی باقی رہی اور ان سے کسی بھی طالب علم کا ادنیٰ سا انتساب و تعلق، اس کے دل میں یہ احساسِ فخر و مسرت پیدا کرنے کے لئے کافی تھا کہ:

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

حالاں کہ یہ زمانہ وہ تھا جب مولانا کو اپنوں کی ریشہ دوانیوں نے دارالعلوم کے انتظام و تدریس سے عملاً دور کر رکھا تھا اور ان کو بدنام و غیر مقبول بنا دینے کی مہم پوری طرح جاری تھی۔ لیکن جس مردِ مجاہد کو یہ مقبولیت خدا کی طرف سے ملی ہو، اسے بھلا کوئی بھی ریشہ دوانی کیسے کم کر سکتی ہے؟ چناں چہ اس کا احساس اس وقت دوبارہ ہوا، جب ۱۶/ اپریل ۱۹۹۵ء کو دیوبند میں مولانا کے مکان

پر ان کے آخری دیدار کے لئے آنے والے سیکڑوں، ہزاروں طلبہ کو نماز فجر کے بعد سے ہی قطاروں میں کھڑے دیکھا۔ ان کے اداس و غمگین چہرے ان کے اندرونی کرب و محرومی کی عکاسی کر رہے تھے۔

اس موقع پر دارالعلوم دیوبند سے وابستہ بعض ایسے اساتذہ و کارکنان سے بھی ملاقات ہوئی جو مولانا سے بے پناہ تعلق رکھتے تھے، کیونکہ وہ بھی ان لوگوں میں سے تھے، جنھیں مولانا کی صحبت و تربیت نے بہت کچھ دیا تھا، انھوں نے دورانِ گفت گو بتایا کہ وہ دہلی آکر مولانا کی عیادت کرنا چاہتے تھے، مگر نہیں آسکے۔ نہ آسکنے کی ندامت اور کسک کے آثار ان کے لہجے اور چہرے سے نمایاں تھے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی تھی کہ ابھی وہ آنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ مولانا عازم سفرِ آخرت ہو گئے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس میں اس دہشت کے ماحول کا زیادہ دخل ہے جس میں مرحوم سے ملنے والوں پر نظر رکھی جاتی تھی تاکہ بعد میں ان کا مواخذہ کیا جا سکے۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ آخری علالت کے دوران تقریباً دو ماہ کا طویل عرصہ مولانا نے دہلی کے مختلف ہسپتالوں میں زیرِ علاج رہتے ہوئے گذارا لیکن ان کی عیادت و مزاج پرسی کے لئے اس ادارے کا کوئی قابلِ ذکر ذمہ دار شخص نہ آیا جس کے تعمیری و تعلیمی گلستاں کو مرحوم نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اور جس کے موجودہ اربابِ حل و عقد اپنی حیثیت و اقتدار کے لئے سو فیصد مرحوم کی قربانیوں اور جدوجہد کے مرہونِ منت ہیں۔ ایک طرف زمانے کی بے وفائی و سنگدلی کا یہ رنگ دیکھیے اور دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کے اس عاشق کی یہ تڑپ دیکھیے کہ وہ بسترِ مرگ پر بھی اس خواہش کا اظہار کر رہا ہے کہ اس کا علاج ختم کر کے اسے دہلی سے دیوبند لے جایا جائے جہاں دارالعلوم کے طلبہ و اساتذہ اس کی عیادت کر سکیں، کبھی وہ اپنے بیٹوں سے کہہ رہا ہے کہ اگر دارالعلوم کے ذمہ داران آئیں تو انھیں کہنا کہ میں نے اپنی طرف سے سب کو معاف کیا اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا۔ کبھی وہ اپنے عزیزوں کو دارالعلوم کی برابر خدمت کرتے رہنے کی وصیت کر رہا ہے۔ کیا تڑپ ہے، کیا عشق ہے، کیا جگر ہے اور کیسی دردمندی ہے۔ زندہ باد وحیدِ زمانہ! خدا آپ کے مضطرب روح کو سکون و رحمت سے نوازے۔

لیکن جب مولانا کی آخری زیارت کے لئے طلبہ، باشندگانِ دیوبند اور دارالعلوم کے اساتذہ و منتظمین کو قطاروں میں کھڑے دیکھا تو جی میں آیا کہ میں اس سچے عاشق کو کسی طرح بتا سکوں کہ لیجیے، آپ کی تمنا پوری ہوئی اور آپ جنھیں دیکھنا چاہتے تھے وہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے سوگوار چہروں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے حاضر

ہیں، مگر اب آپ نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اگر آپ انھیں دیکھ سکتے تو یقیناً آپ کو ناقدریٔ ایام کا زیادہ شکوہ نہ ہوتا اور نہ یہ کہنے کی ضرورت ہوتی کہ :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

کیونکہ ان تمام لوگوں کو آپ کے کارناموں پر فخر ہے، آپ کی قربانیوں کی عظمت کا احساس ہے اور آپ کے ساتھ کی گئی ظلم و زیادتی کا درد بھی۔

اس کا ثبوت تقریباً دس ہزار افراد کی دیوبند جیسے چھوٹے قصبے میں آپ کی تدفین میں شرکت ہے اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک کے بیسیوں اخبارات و رسائل میں شائع شدہ وہ مضامین و اداریئے ہیں جن کے ذریعے قلم کاروں نے مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کی بساط بھر کوشش کی۔ اس کا ثبوت تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا ماہنامہ "ترجمان" کا یہ خصوصی ہمہ جہت شمارہ ہے جس نے مرحوم کی مظلوم شخصیت کے ساتھ انصاف کرنے کی مقدور بھر سعی کی ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ مذکورہ چند مظاہر کو مرحوم سے خلقِ خدا کے اصل تعلق کو سمجھنے کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا کہ ہزاروں فضلائے دارالعلوم اور خاص طور سے ان کی نئی نسل کے دلوں میں آپ سے عقیدت و احترام اور تعلق و ہمدردی کے جو بے پناہ جذبات ہیں، ان کو ظاہری پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔ یہ سب اس کی دلیل ہے کہ کم نظروں اور کوتاہ قامتوں کی تمام کوششیں اور ریشہ دوانیاں آپ کی خداداد عظمت و مقبولیت کو نقصان نہیں پہنچا سکیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما !

بقیہ : ایک فاضل استاد

کرتے تھے لیکن آج شخصیت سازی تو کجا باصلاحیت افراد کو خود اپنی محنت سے آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ اصحاب اقتدار کی یہ غرض مندی ملت کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

بہر حال قاسمی برادری بالخصوص مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کے رفقاء کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک کو باوجود وسائل کی کمی کے آگے بڑھائیں۔

مولانا محمد رفیق بستوی
مقیم ریاض (سعودی عرب)

مولانا وحید الزماں — آئینۂ صفات

مصر کے معروف ادیب احمد امین نے اپنی خودنوشت سوانح "حیاتی" میں لکھا ہے کہ انسان اپنے گردوپیش کی پیداوار ہوتا ہے۔ یعنی ماحول کی جو مشینری اس کے اردگرد مصروف کار ہوتی ہے وہ اس کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ انسانی زندگی کے تجربات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات بلاخوف تردید درست ہے مگر پھر لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ زیادہ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن پر ان کا ماحول حکمرانی کرتا ہے۔ خواہ وہ ماحول اپنے جملہ اجزائے ترکیبی کے ساتھ صالح ماحول ہو یا فاسد۔ دوسری قسم ایسے انسانوں کی ہوتی ہے جو ماحول کی حکمرانی قبول نہیں کرتے بلکہ اپنی دیدہ وری سے حالات کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔ قابلِ قبول اور مفید چیزوں کو گلے لگاتے ہیں۔ فرسودہ و دور از کار روایات کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ چمنستانِ حیات کو نت نئے گلوں کی تخم ریزی و آبیاری سے سنوارتے اور نکھارتے ہیں اور اس کا دامن خس و خاشاک کی آویزشوں اور آلودگیوں سے پاک کرتے ہیں۔ کارگہِ حیات میں فرسودہ پگ ڈنڈیوں پر قطع مسافت ان کے دلِ غیور اور حوصلۂ بلند کے لئے وجہ ننگ و عار ہوتی ہے۔ وہ اپنے کاروانِ زندگی کے لئے شاہراہِ حیات خود تعمیر کرتے ہیں۔ اُن کی منزلیں اور مرحلے خود ساختہ و پرداختہ ہوتے ہیں۔ منت کشِ غیر نہیں ہوتے ؎

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

استاذ مرحوم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نور اللہ مرقدہ بلاشبہ اسی دوسری قسم کی کمیاب اور گراں مایہ ہستیوں میں سے تھے، جن کا دیدار چشمِ فلک کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ وہ سچ مچ اسم بامسمّٰی یعنی یکتائے دہر اور یگانۂ روزگار تھے۔ اسم اور مسمّٰی کے مابین ایسی مطابقت

اور معنویت کی مثالیں صفحۂ دہر پر ہی نہیں اوراقِ تاریخ میں بھی کم ہی دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔

آئندہ سطور میں ہم حتی المقدور ان اسباب وعوامل کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے اور ان محرکات و موثرات کا سراغ لگانے کی سعی کریں گے، جنہوں نے صاحب اسم وحیدالزماں کو بامسمیٰ بناکر یگانگی و یکتائی کے اس بلند و بالا قطب مینار پر لا کھڑا کیا، جہاں وہ سارے زمانے سے یگانہ و یکتا نظر آئے۔ خلق خدا بیک زبان بول اٹھی۔ لم تر العیون مثله وما رآی هو مثل نفسه" یعنی سارے زمانے میں ان جیسا نہیں۔

ہمارے خیال میں جلیل القدر اور عظیم المرتبت ہستیوں کے سانحۂ ارتحال کے بعد اُن کے سوانحی خاکوں میں اسی خاکے کے خدوخال اور نشیب و فراز بیش از بیش توجہ اور تجزیہ کے مستحق ہوتے ہیں تاکہ ان کی عظمتِ رفتہ کے نقوش اور اُن کے عہدِ زرّیں کے خطوط کی سچّی اور صحیح تصویر کشی کے ذریعے اُن کے طرزِ زندگی کی واضح نشاندہی کی جاسکے۔

اس تحریر میں ہم اپنے زاویۂ نگاہ سے اس حقیقت کی نشاندہی کی امکانی کوشش کریں گے۔ جس نے استاذ مرحوم کو "جنس کمیاب" ہی نہیں "درنایاب" بنادیا تھا۔ ہماری ناقص رائے میں مولانا کی یگانگی، یکتائیت اور انفرادیت کا سرچشمہ اُن کی ذاتِ گرامی میں پائی جانے والی چند صفات اور خصوصیات تھیں۔

۱- علم و فضل: استاذ مرحوم اپنے خاندانی پس منظر کے اعتبار سے ایک ایسے علمی خانوادے کے وارث و جانشین تھے، جہاں صرف زمینداری ہی اپنے تمام کروفر کے ساتھ سایہ فگن نہ تھی بلکہ پشتہا پشت سے خاندانِ وحیدی علم دین کا گہوارہ بھی تھا۔ چنانچہ آپ کے جدّی سلسلے کے پانچ بزرگ بلا انقطاع عالم دین ہوتے ہیں۔

آپ آغازِ طفولیت سے ہی نہایت ذہین اور طباع تھے۔ گویا طباعی اور خلاقی خداداد تھی۔ بعدازاں اولاد کی تعلیم و تربیت کے رسیا اور سخت گیر باپ کی بے لچک رہنمائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں اپنے عہد کے معدودے چند ممتاز ترین طلبا میں آپ سرِ فہرست رہتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی دارالعلوم دیوبند ہی میں صبح خنداں کی شعاعوں نے اپنی ضیا پاشیوں سے حنِ چمن کو منور کرنا شروع کردیا تھا۔ چنانچہ اس عہدِ بے خبری اور گہوارۂ مادرِ علمی میں رہتے ہوئے آپ کا ایک طالبِ علمانہ کھیل یہ تھا کہ "سلسلة الدروس العربية" کے نام سے جدید اور رائج الوقت عربی زبان کی مشق کے علاوہ مروج و مستعمل الفاظ و معانی کی

ڈکشنری نما ایک فہرست بناکر اندرون دارالعلوم کسی شارع عام پر آویزاں کر دیتے تاکہ فیض رسانئ خلق میں بقدرِ امکان کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ہم عصر اور ہم درس احباب کو بھی شرف تلمذ حاصل ہوا۔ میں ایسے متعدد علماء کرام کو جانتا ہوں جو استاذ مرحوم کے ہم عصر ہونے کے باوجود ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ دارالعلوم میں تشریف لانے والے عرب مہمانوں کی آمد پر ترجمانی اور سپاس نامہ خوانی کی خدمت کے علاوہ اسی دور میں دارالعلوم دیوبند کے لئے تعارف نویسی و مقالہ نگاری کے یوسفِ بے کارواں بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے رسمی فراغت کے بعد طبیعت ہزار رنگ اور ذوق جدت پسند نے ایک نئی راہ سجھائی اور بغایت بے سروسامانی کے عالم میں " دارالفکر" نامی ایک جامع ادارہ کا قیام عمل میں آگیا، جہاں صرف جدید عربی کی کلاسیں ہی شروع نہیں ہوئیں بلکہ اس احساس کے تحت کہ عربی مدارس کے فضلا میں انگریزی زبان سے ناواقفیت کے سبب شدید احساسِ کمتری پایا جاتا ہے۔ انگریزی کلاسوں کا بھی آغاز ہو گیا۔ اگرچہ حالات اور ماحول نے خود انہیں انگریزی سیکھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ دارالفکر میں تشنگانِ تقریر کی سیرابی کا سامان ہو اور میکشانِ تحریر کی سرمستیوں کے لئے کوئی جولانگاہ نہ ہو۔ ایک رسالہ بھی "القاسم" کے نام سے جاری کر دیا گیا جو کافی عرصہ بعد تک نکلتا رہا۔

سمندِ فکر نے کچھ اور کروٹیں لیں اور اپنی آبلہ پائیوں کے لئے ایک اور نیا میدان ڈھونڈ نکالا۔ دلِ درد آشنا نے اس بار طلبہ اور فضلاء مدارسِ عربیہ کے اندر عربی زبان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت و مہارت پیدا کرنے کے لئے جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ ایک کورس ترتیب دینے کی ٹھانی اور "القراءۃ الواضحۃ" کے نام سے تعلیمی مراحل کو ملحوظ رکھتے ہوئے تین اجزاء معرضِ وجود میں آگئے۔ ساتھ ساتھ ان کی دلیلیں بھی قیدِ تحریر میں لائی گئیں تاکہ نصابِ تعلیم کی طرح طریقِ تعلیم کی بھی واضح نشاندہی کی جا سکے۔ آئندہ اجزاء کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ کیونکہ حیاتِ مستعار کی پرشور ساعتوں نے اس کی مہلت ہی نہ دی ؎

وکم حسرات فی بطون المقابر

علاوہ ازیں علوم عقلیہ و نقلیہ کے حصار میں حبس دوام کی سزا کاٹنے والی بیچاری عربی زبان کو رستگاری دلانے کے لئے اور اُسے ایک زندۂ جاوید اور حیاتِ انسانی کے سُروں سے ہم آہنگ زبان بنانے کے لئے چھوٹی بڑی متعدد ڈکشنریاں ترتیب دے کر جزیرہ نمائے ہند میں اسے بازیچۂ اطفال

بنادیا۔ آخری ڈکشنری جس کی ترتیب کا کام وفات سے ذرا پیشتر مکمل ہوا تھا، اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ خدائے علیم وخبیر نے روزِ اول سے ہی اس پورے سلسلے کو ایسی حیرت انگیز قبولیت بخشی جو قابلِ صد رشک ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بعد استاذ مرحوم کی دوسری والہانہ وابستگی جمعیۃ علماء ہند سے تھی۔ آپ کی سرکردگی میں وہاں "مرکزِ دعوتِ اسلام" کا قیام ہوا۔ اور آپ کی سرپرستی ونگرانی میں متعدد کتابیں وجود میں آئیں۔ عمرِ رواں کے آخری مراحل میں جب دارالعلوم دیوبند کی مصروفیتوں سے ذرا سانس لینے کا موقع ملا تو آپ نے "دارالمؤلفین" نامی ادارہ برائے تصنیف وتالیف قائم کیا اور نہایت مختصر عرصہ میں مختلف موضوعات پر نہایت مفید چھوٹی بڑی تقریباً تیس کتابیں تیار ہوگئیں۔

دورانِ تدریس آپ نے دارالعلوم دیوبند سے ایک عربی مجلہ "دعوۃ الحق" جاری کیا۔ جو پوری پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ دارالعلوم کی انتظامیہ نے جشنِ صد سالہ کے موقع پر اس وقت کے مخصوص حالات میں خاص مقاصد کے پیشِ نظر استاذ مرحوم کی سرکردگی میں پندرہ روزہ عربی ترجمان "الداعی" نکالنے کا فیصلہ کیا اور "دعوۃ الحق" موقوف کردیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند نے اندرونِ ملک اپنی ترجمانی کیلئے روزنامہ "الجمعیۃ" اردو کے علاوہ جب عرب دنیا میں اپنے تعارف کا قصد کیا تو استاذ مرحوم سے عربی جریدہ نکالنے کی درخواست کی گئی۔ جمعیۃ سے فکری، عملی اور موروثی وابستگی کے سبب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود آپ نے یہ بارِگراں بھی اپنے کندھوں پر اٹھایا اور "الکفاح" نامی پندرہ روزہ عربی جریدہ کا اجراء کیا۔ جو نہایت پابندی سے ایک طویل عرصے تک نکلتا رہا۔ اور عرب دنیا میں جمعیۃ کی ترجمانی کرتا رہا۔ تا آنکہ جمعیۃ نے خود اسے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ بالا جملہ اداروں اور ان کے ذریعے انجام پذیر کارناموں کے بانی اور روحِ رواں استاذ مرحوم ہی تھے۔ وہ اپنے تلامذہ سے تعاون لیتے جو انہیں کی آغوش تربیت میں زیرِ تربیت ہوتے۔

مذکورہ بالا حقائق ہمیں اس احساس واعتراف پر مجبور کرتے ہیں کہ ہندوستان میں علماء واسلاف دیوبند کے قائم کردہ دونوں عظیم اداروں دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے لئے دیگر خدمات کے علاوہ عربی زبان وادب کی خدمات کا سہرا بلا شرکت غیرے استاذ مرحوم کے سر ہے۔ تاریخ کے اس گوشے پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالنے سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ معمولی سعادت

نہیں جو کاتبِ تقدیر نے اُن کے نصیب میں لکھ دی تھی ورنہ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ دارالعلوم دیوبند جہاں روزِ اوّل سے تمام تر توجہ اسلامی علوم کی تدریس پر مرکوز رہی ہے اور عربی یا کسی دوسری زبان کو بحیثیت زبان کبھی موضوع نہیں بنایا گیا۔ وہاں کا ایک فاضل بیرونی محرکات و موثرات کی ناسازگاری کے باوجود اپنے اندر زمانۂ طالب علمی ہی سے ایک انوکھے موضوع کی کسک محسوس کرے۔ اور آہستہ آہستہ وہی جذب اندروں اس کے سارے وجود بلکہ ساری زندگی پر چھاجائے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران مخصوص اسباب کے باعث عربی زبان نے اپنی دینی حیثیت کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر ناگزیر اہمیت اختیار کرلی ہے۔ استاذ مرحوم نے اس بدلتی ہوئی صورتحال میں دونوں اداروں کو اپنی خداداد صلاحیت سے رفتارِ زمانہ سے ہم آہنگ کردیا۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

استاذ مرحوم کا دوسرا نمایاں وصف محنت و مجاہدہ تھا۔ اس کی

۲۔ محنت و مجاہدہ: اچھی خاصی جھلک آپ نے گزشتہ باب میں دیکھی۔ ان کے شب و روز کا مشاہدہ کرنے سے ایسا لگتا تھا کہ اُنہیں ایک لمحہ کی فارغ البالی راس نہیں آتی۔ ایک منٹ بھی چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ پارہ کی بیتابی اُن کی فطرۃ ثانیہ تھی۔ بعض اوقات اُنہیں عملاً غیر مصروف دیکھ کر ایک ناواقف شخص اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا کہ فرصت میں ہیں، مگر فی الواقع ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان بظاہر خالی لمحات میں بھی کارہائے گزشتہ کا جائزہ لینے میں ذہنی اور فکری طور پر مصروف ہوتے یا آئندہ کی منصوبہ بندی میں مشغول۔

مدارس میں مروج نظام الاوقات کے اعتبار سے نماز عصر سے فراغت کے بعد کا وقت اساتذہ، طلبہ اور ملازمین سبھی کے لئے فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ استاذ مرحوم کی اس وقت بھی چھٹی نہ ہوتی تھی۔

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اور چاق و چوبند ہو کر اس وقت بھی مصروفِ کار ہوتے۔ اور عربی زبان کے شوقین طلبہ کو نہایت تندہی و جانفشانی سے پڑھاتے۔ میں نے خود صف ثانوی ان سے اسی طرح پڑھی ہے۔ اس سال صف ثانوی میں تقریباً تیس پینتیس طلبہ شریک درس رہے ہوں گے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال مغرب اور عشاء کے بعد ہوتی۔ علاوہ ازیں مولانا کے دروازے

عربی زبان کے شیدائیوں کے لئے ہمہ وقت کھلے رہتے۔ ایک صاحب نہایت نیازمندی سے جدید عربی الفاظ وتعبیرات کے معانی ومفاہیم معلوم کر رہے ہیں۔ دوسرے صاحب کسی عربی مضمون نویسی کے لئے رہنمائی چاہتے ہیں۔ تیسرے صاحب مشق مضمون نویسی کے بعد اصلاح کے خواہاں ہیں۔ غرض "ایک انار سو بیمار" کی تمثیل۔

اپنے قیام کے دوران ہم اکثر دیکھتے کہ استاذ مرحوم رات دیر گئے عموماً بارہ کے بعد ہی گھر تشریف لے جاتے۔ حالانکہ رہائش دارالعلوم سے بالکل قریب تھی۔ اس کے باوجود اندرون دارالعلوم ایک حجرہ میں اپنا بیشتر وقت گزارتے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُن کے یارانِ تشنہ کام کا حلقہ بھی نہایت محدود تھا۔ شاید انہوں نے عمرِ رواں کی برق رفتار ساعتوں کو شمار کرلیا تھا، جن میں یار باشیوں اور خوش گپیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ ؎

غمِ دوراں میں گزری جس قدر گزری جہاں گزری
اور اس پر لطف یہ ہے زندگی کو مختصر جانا

گرمیوں کے زمانے میں مدارس کی دوپہر خاصی طویل ہوتی ہے۔ تقریباً ۱۱ بجے صبح کی شفٹ ختم ہوجاتی ہے اور شام کی شفٹ تین بجے شروع ہوتی ہے۔ اتنی طویل دوپہر میں کبھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں نہ تو کبھی تکان محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ ہی آرام کی ضرورت۔

پورا ہفتہ پڑھائی کے بعد جمعرات کے دن شام ہی سے لوگوں کے چہروں پر اگلے روز چھٹی کی بشاشت نظر آتی۔ بیشتر اساتذہ اور ملازمین اپنے اہل وعیال میں مگن یا اپنے شخصی پروگراموں اور جلسے جلوسوں میں مصروف، دارالعلوم دیوبند سے قریب رہنے والے طلبہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ۔ باقی طلبہ اپنی مستیوں میں سرمست۔

مگر استاذ مرحوم کے لئے غالباً یہ وقت ہفتہ بھر میں زیادہ مصروفیت کا وقت ہوتا۔ وہ اور اُن کا قافلہ "النادی الادبی" دارالعلوم کی درس گاہوں میں عربی زبان کی مشق کے لئے ہمہ تن سعی وعمل، سرزمین عجم میں یہ قافلۂ عرب چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں مادرِ علمی کی درس گاہوں کا اکیلا وارث۔ درس گاہوں اور تپائیوں کی وضع قطع تبدیل کرکے عربی خطابت کے لئے اسٹیج کی استواری اور دھواں دھار عربی تقریروں میں منہمک۔

استاذ مرحوم کی عدالت عالیہ میں ہر ٹیم کا ذمہ دار اس ہفتہ وار اجتماع کی رپورٹ پیش کرتا اور وہ بغور ملاحظہ کے بعد اپنے تربیتی اور اصلاحی احکامات جاری کرتے۔

دیگر خصوصیات کی طرح اس خصوصیت کی بھی کرشمہ سازیاں کسی ایک میدان کے ساتھ مخصوص نہ تھیں۔

ذہن کی خلاقی اور طبیعت کی روانی یکساں جوش و جذبہ کے ساتھ ہر محاذ پر سرگرم عمل نظر آتی ـــــ چنانچہ "جشن صدسالہ دارالعلوم دیوبند" کے موقع پر تقسیم کار میں جب صدسالہ اور نصف صدسالہ شکستہ اور بوسیدہ عمارتوں کی شکست و ریخت اور پھر اصلاح و ترمیم کی دماغ سوز اور جاں گدازِ خدمت کا بارِ گراں اس وفا سرشت سپوت کے سپرد ہوا تو اسے مادرِ علمی کے تنِ زار و نحیف کو ازسرِ نو آراستہ و پیراستہ کرنے میں ایک لمحے کا تامل پیش نہیں آیا۔ تردد پیش آیا تو صرف یہ کہ دورانِ کار عدم مداخلت کی ضمانت فراہم کی جائے چونکہ ذریہ ذہنی لبسا اوقات سدِّ راہ بن جاتی ہے۔ اس مرحلے میں کوئی "مائی کالال" عقل و خرد کی کسی بھی پیمائش کی رُو سے "مائی" کی یہ خدمت سرانجام دینے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھا۔ لہٰذا ضمانت فراہم کی گئی۔ بس پھر کیا تھا عشق بلاخیز آتشِ تعمیر میں کود پڑا۔ اور ایک ناقابلِ یقین مدت میں جنوں نے وہ سرمستیاں دکھائیں کہ فرزانگی دیوانگی کے سامنے انگشت بدنداں رہ گئی۔ انجام سب کے سامنے تھا۔ مادرِ علمی کے تنِ سال خوردہ اور جسمِ بوسیدہ میں ایسا دم خم اور بناؤ سنگار پیدا ہوگیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اسی محدود رقبہ میں ناقابلِ تصور وسعت ہوگئی۔ اساتذۂ کرام اور طلبۂ عزیز کے لئے غیر معمولی آسانیاں فراہم ہوگئیں۔ روایتی پُرتکلفی قصۂ پارینہ بن گیا۔ ؎

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظّارہ

خلقِ خدا اس اعتراف پر مجبور ہوگئی کہ "جشن صدسالہ" اگرچہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ایک بلائے بے اماں اور اس کی تابندہ جبیں پر ایک بدنما داغ ثابت ہوا۔ لیکن مولانا کی اَن تھک جدوجہد اور شبانہ روز کی جفاکشی کے طفیل "یادگار اکابر عمارتوں" کی اصلاح و ترمیم کا کارنامہ بہت دل کش انداز میں انجام پذیر ہوگیا۔

اس طرح گویا روحِ دارالعلوم کے سقف و بام ہی پر نہیں، اس کے درو دیوار پر بھی استاذ مرحوم کی سخت کوشیوں اور جدت طرازیوں کے انمٹ نقوش ثبت ہیں۔ ذہن انسانی سرگشتہ و حیرت زدہ ہے کہ ایک انسان جو اپنے تعلیمی پس منظر کی رُو سے "محض مولوی" ہے اور میدانِ عمل کے لحاظ سے فقط "مدرس" اس کے اندر تعمیر کا ایسا استادانہ ذوق اور معماری کی ایسی فنکارانہ مہارت

کے چشمے کہاں سے اُبل پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ جشنِ صد سالہ کی کم نصیبیوں کے انبار میں یہی واحد خوش نصیبی ہے جو ایک شیدائی مادرِ علمی کو قدرے سامانِ تسکین فراہم کرتی ہے۔

جشنِ صد سالہ کے سلسلے میں مالیہ کی فراہمی اس وقت ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ تھی۔ اس کے لئے مختلف علمائے کرام کو اندرونِ ملک مختلف حلقوں میں روانہ کیا گیا۔ استاذ مرحوم کے حصے میں مشرقی یوپی کا کورزدہ اور پسماندہ علاقہ آیا جہاں دیگر پسماندگیوں کے ساتھ معاشی پسماندگی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہوتی ہے۔ استاذ مرحوم نے اپنی مخصوص منصوبہ بندی اور محنت و مشقت سے اس علاقے سے اتنی بڑی رقم فراہم کی کہ لوگ حیران رہ گئے۔

ان کے شوقِ جاں فشانی کی صحرانوردیاں اسی پر ختم نہیں ہوتیں بلکہ "جشنِ صد سالہ" کے معاً بعد جب چمنستانِ نانوتوی شر و رفتن کی آماجگاہ بن گیا تو ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ وارثانِ علومِ نبوت اور مہمانانِ رسول دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ زیادہ بڑے حصے کو جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ تھا۔ ہزاروں نفوس پر مشتمل نوجوان انقلابیوں کے اس جمِ غفیر کے قیام و طعام کا بندوبست ہی کیا کچھ کم دردِ سر تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسے پُر فتن زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت کا نظم و نسق اور ہر لحظہ تیز تر ہوتے والی جنگ زد و بد میں اربابِ اہتمام اور یارانِ اقتدار سے پنجہ آزمائی۔

اس روح فرسا صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے بھی کوئی نیا نسخہ دریافت نہیں ہوا۔ نسخہ وہی پرانا تھا، لاعلاج امراض کا ایک ہی نسخہ یعنی " وحید الزماں" حالانکہ اس وقت انقلاب پسندوں کے اس لشکرِ جرار میں اربابِ اقتدار و اختیار، اصحابِ اثر و رسوخ، صاحبانِ علم و فضل، لذت کشانِ شریعت و طریقت، یارانِ تفکر و تدبر اور شہسوارانِ شعور و آگہی کی کمی نہ تھی۔ باتفاق رائے خارا شگافی کی یہ خدمت بھی اُنہیں کو تفویض ہوئی اور وہی اس کے چارہ سازِ اساسی قرار پائے۔ پھر سب نے دیکھا کہ کس محیر العقول فراست و بصیرت، ناقابلِ یقین دماغ سوزی و عرق ریزی اور ہوش رُبا جرأت و ہمت سے اس اُلجھی ہوئی صورتِ حال کی ہر گتھی کو سلجھایا اور تباہی کے دہانے پر کھڑے اس خانماں برباد قافلے کا شیرازہ بکھرتے سے بچایا۔ خیراندیش ہی نہیں بداندیش بھی اُن کے فضل و کمال کے اعتراف پر مجبور ہو گئے۔ ٥

والفضل ما شهدت به الاعداء

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

۲- اخلاص وہمدردی:

استاذ مرحوم خلوص و ہمدردی کا پیکر تھے۔ اُن کے تلامذہ و احباب ہی نہیں بلکہ وہ سارے لوگ جن سے اُن کی کوئی ادنیٰ وابستگی اور خط وکتابت رہی ۔ اس حقیقت کی شہادت دیں گے کہ وہ اپنی مراسلت اور تحریروں کے آخر میں دستخط کی جگہ عمر بھر "مخلص وحید الزماں" لکھنے کے عادی رہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاروبارِ زندگانی میں دیگر امور کی طرح اس معاملے میں بھی اُنہوں نے یہ روش محض ایک پر کشش رسم اور بے معنی روایتی تواضع وخاکساری کی خانہ پُری کے لئے نہیں اپنائی تھی بلکہ اس مختصر سے چہار حرفی لفظ کے انتخاب کا باعث اُن کی مخصوص ہمدردانہ ذہنیت اور خیر خواہانہ طبیعت تھی ۔

اُن کی شخصیت ، سلوک اور شب وروز میں اخلاص اور ہمدردی وخیر خواہی کا یہ اَمول وصف اتنا عیاں تھا کہ اسے محسوس کرنے کے لئے طویل مجالست ومصاحبت کی ضرورت نہ پیش آتی ۔ ہر کس وناکس بڑی آسانی سے اور نہایت قلیل مدت میں اس احساس اور اعتراف پر اپنے کو مجبور پاتا کہ " مخلص وحید الزماں" حقیقت میں سارے جہاں کے لئے خلوص وہمدردی کا پیکر ہیں ۔

فکر وعمل کی پہنائیاں اس معاملے میں بھی ناپید اکنار اور کسی بھی نوع کی تنگ دامنی اور اپنے و پرائے کی حدبندی سے بالاتر ۔ سب کے لئے ہمہ وقت ایثار واخلاص کے جذبے سے سرشار اور ہر گھڑی ہر ممکنہ خدمت وتعاون کے لیے تیار ۔ اُن کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ سارے ہی لوگ اُن کے اپنے تھے ۔ وہ سب کے تھے ۔ اُن کی ہمہ وقت مصروف زندگی سے ایک شہادت بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسی معاملے میں کبھی بھی وہ کسی کے ساتھ کسی بھی قسم کی غیریت برتنے کے مرتکب ہوئے ہوں ۔ کسی بھی ضرورت مند کی ضرورت دیکھ کر اُن کے لوحِ دماغ پر یکساں قسم کے خطوط اُبھرتے ۔ اُن کا دلِ دردآشنا ایک ہی نوع کی کسک محسوس کرتا اور پھر حتی الوسع حاجت برآری کے لئے مستعدی اور چستی کی رفتار بھی ایک ہی طرح کی رہتی ۔ وہ اپنے اور پرائے کی تقسیم سے نابلد تھے ۔ اُن کے فکر وعمل کے خانوں میں "پرائے" نام کا کوئی خانہ نہ تھا ۔ وہ حبِ انسانی کی اس بلندی پر تھے ، جہاں پہنچ کر ابنائے جنس کے مابین فرق وامتیاز کی مصنوعی حدبندیاں اور پستیاں نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں اور انسان " کلکم من آدم و آدم من تراب" کی حقیقت کا رمز شناس اور " انما المومنون اخوۃ " کا رازدار بن جاتا ہے ۔ بلاشبہ استاذ مرحوم اسی قسم کے انسان تھے ۔

ان کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی نے انہیں انسانیت کے اس بلند وبالا مقام پر پہنچادیا جہاں پہنچ کر وہ انسانیت کی فلاح وبہبود اور خدمتِ خلقِ خدا کو رضائے خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ

تصور کرتے تھے ۔

چند فرضی لکیروں کو سجدے نہ کر چند خاکی حدوں کا پجاری نہ بن
آدمیت ہے اک موجۂ بیکراں ساری دنیا ہے انسانیت کا وطن

لیکن ظاہر ہے کہ بڑی حد تک ان کی جولانگاہ اور ان کا میدانِ عمل دارالعلوم دیوبند تھا۔ اس لئے اُن کی اس خصوصیت کا عکس بھی زیادہ تر یہیں نظر آتا ہے۔ بحیثیت استاذ رسمی گھنٹوں میں اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے علاوہ دیگر خارجی اوقات میں رضاکارانہ طور پر استعداد و لیاقت میں فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلبۂ عزیز کی مختلف جماعتیں اور درجات صف ابتدائی، صف ثانوی وغیرہ ناموں سے تشکیل دے کر ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشاں اور فکرمند رہتے۔ اس کے علاوہ تقریری اور تحریری مشق کے لئے "النادی الادبی" نامی انجمن قائم کی تھی جس کی تقریری سرگرمیاں ہفتہ کے اختتام پر جمعرات کو شام میں اور تحریری کاوشیں پورے ماہ فرصت کے لمحات میں جاری رہتیں۔ مزید برآں جو وقت بچ رہتا اس میں بلا کسی خاص تنظیم و ترتیب کے جملہ نواسیرانِ قفسِ عربی کے لئے دبستانِ وحیدی کے دروازے کھلے رہتے۔

دارالعلوم دیوبند اور عربی مدارس کے نظم و نسق سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُنہیں اس جہدِ مسلسل کی تیز گامیوں اور شوقِ بے پایاں کی کامجوئیوں پر کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ از روئے ملازمت یہ سب کچھ ان کے فرائض میں شامل نہ تھا۔ اس پر کوئی معاوضہ تو کجا بسا اوقات بہت سے تیرہ دماغ اور ناعاقبت اندیش دانشمندان کی ان جنوں خیزیوں پر زبانِ طعن و استہزاء دراز کرتے۔ لیکن فقدانِ معاوضہ ہو یا تمسخر و استہزاء کوئی بھی شے ان کے عزم و عمل کی راہ میں رُکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ کیوں کہ ان کا دل و دماغ نورِ اخلاص سے مستنیر و منور اور ذوق و شوق جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی سے سرشار و معطر تھا۔

دوسرے بہت سے علمائے کرام کی طرح استاذ مرحوم کے لئے ممکن تھا بلکہ اُن کی شخصیت و صلاحیت کے پیشِ نظر زیادہ روشن امکانات تھے کہ وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات مواعظ و تقاریر وغیرہ میں صرف کرتے، جہاں فریضۂ تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ قدر و منزلت بھی ہوتی ہے اور مالی منفعت بھی۔ جس کی اُنہیں سخت ضرورت تھی۔ اس لئے کہ زندگی کا زیادہ بڑا حصہ اُنہوں نے عسرت میں گزارا ہے اگرچہ اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور ایسے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

صلہ و ستائش کی مسرتوں سے بے نیازانہ اور تنقید و تبصرے کی کدورتوں سے بالاتر خلوص و محبت کی یہ تلخ کامیاں، نونہالانِ دارالعلوم دیوبند کو زندگی کی صراطِ مستقیم سے روشناس کرانے کے لئے وقف تھیں۔ اُن کے خلوص و محبت کی جلوہ گری کے لئے تنگنائے دارالعلوم دیوبند کافی نہ تھی۔ چنانچہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم بہت سے تشنگانِ علم و ادب آئے دن اس چشمۂ آب پر وارد ہوتے اور سیراب ہو کر واپس جاتے۔ خدمت یہاں بھی بلا معاوضہ تھی۔ ہمدردی اور خیر خواہی کے علاوہ اس کی اور کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔

خلوص و خیر خواہی کی یہ جھلک اُن کی شخصیت کے تعلیمی پہلو سے متعلق تھی۔ ان کے بہت سے تلامذہ اور فضلاء کی ناقابلِ تردید شہادتوں اور اعترافات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستحق طلباء کا مالی تعاون بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ جذبۂ عمل بھی دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود نہ تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان پندرہ روزہ عربی "الکفاح" جس کے بانی اور رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) استاذ مرحوم ہی تھے۔ اس میں انہیں کے ایک شاگرد (بطور معاون کام کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ گھر سے خط آیا کہ والدہ کی طبیعت خراب ہے۔ لیکن میں اپنی ملازمت اور دیانت کے پیشِ نظر اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس وقت گھر جا کر والدہ کی عیادت کر سکوں۔ اسی دوران مولانا تشریف لے آئے۔ افسردہ و پژمردہ دیکھ کر تحقیقِ حال کرنے لگے۔ میں نے صورتحال اُن کے سامنے پیش کی تو فوراً بحیثیت ذمہ دار اعلیٰ "الکفاح" صرف یہی نہیں کہ مجھے رخصت مرحمت فرمائی بلکہ فی الفور گھر جانے کی تلقین کی اور بطور ہدیہ کرایہ کی رقم بھی مرحمت فرمائی۔ انہیں صاحب نے بتایا کہ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ مولانا اپنی مصروفیات کے باعث الکفاح میں زیادہ وقت نہ دے سکتے تو اس ماہ اپنے مشاہرہ کی وصولیابی کے موقع پر باصرار کہتے کہ میں چونکہ وقت نہیں دے سکا اس لئے یہ معاوضہ آپ لے لیجئے اور ہزار انکار کے باوجود ایک حصہ لینے پر مجھے مجبور ہونا پڑتا۔ استاذ مرحوم کے جذبۂ خیر خواہی کا یہ عملی نمونہ ایک ایسے شخص کے ساتھ تھا جو صرف اُن کا شاگرد ہی نہیں تھا بلکہ جدید عربی سے اس کی واقفیت تمام تر انہیں کی رہینِ منت تھی۔ اور انہوں نے ہی "الکفاح" میں بطور معاون اس کا تقرر کیا تھا۔

ان کے اس جذبۂ خیر خواہی میں تحریک یا اس کے روبہ عمل آنے کے لئے ضرورت مند کی

طرف سے حرفِ طلب یا اظہارِ غرض کی بھی شرط نہ تھی۔ استاذ مرحوم کا صرف احساس انہیں متحرک کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ ۱۹۷۶ء میں تکمیلِ ادب سے فراغت کے بعد جب میں نے انہیں کے حکم پر بغرضِ تدریس ہوجائی ضلع نوگاؤں (آسام) کے لئے روانگی کا قصد کیا تو صراحۃً یا کنایۃً میری جانب سے کسی طلب کے بغیر بمقتضائے حال یہ کہہ کر کہ آپ کے پاس کرایہ نہیں ہوگا، چابیوں کا گچھا میری طرف بڑھا دیا اور کمرے میں تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے بریف کیس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس میں سے حسب ضرورت پیسے لے لیجئے۔ اگرچہ میں نے بہ عجلت ممکنہ وہ رقم استاذ مرحوم کو واپس کردی مگر انہوں نے اس سلسلے میں خود ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آسام میں رہتے ہوئے میں نے انہیں کسی خط میں لکھا تھا کہ مزید تعلیم کے لئے میں جامع ازہر (مصر) جانا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں ان کی وساطت اور کوشش سے بعض فضلاء دارالعلوم ازہر جایا کرتے تھے۔ جب میں وہاں سے تعلیمی سال کے اختتام پر واپس آیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو انہیں وہ بات یاد تھی۔ کہنے لگے کہ اس وقت جامع ازہر کا معاملہ تو دشوار ہوگیا ہے۔ البتہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں دو طالب علموں کے داخلے کے لئے میں سعودی سفیر سے گفتگو کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کے لئے بھی گفتگو کرلوں۔ میں ذہنی طور پر جامعہ اسلامیہ کے لئے آمادہ نہیں تھا اور میں نے معذرت کردی۔ ان کی کوششوں سے ان دونوں طالب علموں کا داخلہ جامعہ اسلامیہ میں ہوا اور انہوں نے وہاں تعلیم حاصل کی۔

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے اور مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں محسوس ہونی چاہئے کہ میں نے کبھی اپنے آپ کو استاذ مرحوم کے "اخص الخواص" بلکہ "خواص" میں سے بھی نہیں سمجھا۔ اگر کسی زاویۂ نگاہ سے ان کے تلامذہ اور متوسلین میں خاص و عام کی تفریق کی جائے ورنہ میرے مشاہدہ اور تجزیہ کی رو سے ان کے فکر و عمل کے خانوں میں ایسی کسی تقسیم کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی تفریق و تقسیم سے بے نیاز اور بالاتر تھے جس طرح مجھے بتقاضائے احسان شناسی و شکر گزاری یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ زمانۂ طالب علمی میں جس مبارک و مسعود ساعت میں ان سے تعارف ہوا۔ اس وقت سے لے کر تا دمِ واپسیں اور یہ عرصہ بیس سال سے کم نہیں۔ انہوں نے مجھ جیسے معمولی انسان کے ساتھ وہ سب کچھ بلکہ اس سے زیادہ کیا جتنا ایک مشفق استاذ اپنے شاگرد کے ساتھ کرتا ہے یا

ایک شفیق باپ اپنے بیٹے کے ساتھ۔ انہیں ہم اُستاذ محترم سے تعبیر کریں یا والد ماجد سے وہ ہر عنوان کی مکمل تعبیر تھے۔

میں اپنے محسوسات اور مشاہدات کی بنیاد پر پورے احساس امانت و دیانت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا یہ سلوک بلا تفریق و امتیاز سب کے ساتھ تھا۔ اگر کسی کو ان کے حلقۂ فیضان میں اپنی نشست اوروں سے کچھ بالا محسوس ہوئی تو یہ اس کی محض خوش فہمی کی دین ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی کو فروتری کا اندیشہ گزرا تو یہ اس کی غلط بینی کا نتیجہ ہے۔ دراصل ایسی شخصیتوں کا بسا اوقات دوطرفہ استحصال ہوتا ہے۔ چھوٹے اپنی دوکانیں سجانے کے لئے اور بڑے اپنے کو مزید چمکانے کے لئے اسی قسم کی ناشائستہ حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۴۔ تعلیم و تربیت: استاذ مرحوم کی ایک بہت نمایاں اور اثر انگیز خصوصیت ان کا طریق تدریس تھا۔ اس باب میں بھی وہ اپنے ماحول اور مروجہ طریقوں سے بیزار اور ایک نئے اور زیادہ مفید طرز تدریس کے داعی اور علمبردار تھے۔ ۵

زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

دارالعلوم دیوبند میں وہ اس طریقۂ تعلیم کی نشاۃ ثانیہ کے بانی تھے۔ وہ خود اپنی تدریسی زندگی میں ہمیشہ سختی سے اس پر کاربند رہے۔ اس کی افادیت کا لوہا ہی نہیں منوایا بلکہ اس کا سکہ جما دیا اور اسے ہر بحث و تحیص سے بالاتر کر دیا۔

برِصغیر کے دینی مدارس میں مروج درسِ نظامی میں شامل مختلف عقلی و نقلی علوم کی طرح عربی ادب کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک ایک لفظ پر اکتا دینے والی اور طلبہ کے لئے ناقابلِ ہضم بحثیں ہوتیں۔ کسی لفظ کے تحت ڈکشنری میں مختلف مواقع پر استعمال ہونے والے جتنے معانی درج ہوتے ہیں، وہ سب یا اُن کا بیشتر حصہ نقل کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی ادب جیسا عجیب علم یونانی فلسفے کی کوئی چیستاں معلوم ہوتا اور عربی زبان لکھنے اور بولنے کی صلاحیت بالکل پیدا نہ ہوتی۔ استاذ مرحوم کا انداز فکر یہ تھا کہ اس طریقۂ تعلیم میں مشقت زیادہ اور منفعت بہت کم ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایک موقع پر کسی لفظ کے صرف وہ معنی بیان کئے جائیں جس معنی میں وہ لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے تو اسے سمجھنا، یاد رکھنا اور لکھنے و بولنے میں اس کی مشق کرنا آسان ہوگا پھر جہاں کہیں وہی لفظ دوسرے معنی میں مستعمل ہو، وہاں دوسرے معنی بیان کئے جائیں۔ یہ بات کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ رَغِبَ الی.....

رَغِبَ عن ..... اور رَغِبَ فی ..... کا رمز شناس اس کے معمولی استعمال سے ناواقف اور عاجز ہو اور عربی زبان میں بشمول عربی ادب درجنوں اسلامی علوم وفنون کی تحصیل کے لئے اپنی عمر کی ایک دہائی بسر کرنے والا واجبی تقریر وتحریر کے لئے شرمساری سے دوچار رہو۔

تدریس کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ استاذ مرحوم نصاب میں شامل کتابوں کے حل مطالب پر قناعت نہ کرتے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شاملِ نصاب کتابیں علامتی طور پر پڑھایا کرتے تھے۔ اصل نگاہ اس پر ہوتی کہ طلباء کے اندر عبارت فہمی کے ساتھ ساتھ عربی زبان لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے "النادی الادبی" قائم کر رکھی تھی جس کے دو اہم شعبے تھے۔ شعبۂ تقریر اور شعبۂ تحریر۔

علاوہ ازیں ان کے اسباق "اردو میڈیم" میں نہ ہوتے بلکہ "عربی میڈیم" میں ہوتے۔ الفاظ و معانی کی وضاحت عربی میں کرتے۔ کلمات کے معانی عربی میں لکھواتے۔ ان کے استعمال کی مشق عربی میں کراتے۔ انتہا یہ تھی کہ دورانِ درس اگر کسی طالب علم کی کسی حرکت بیجا پر ناراض ہوتے تو ناراض عربی میں ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک طالب علم کی بسیار گفتاری پر خفا ہو کر کہنے لگے: "انت تجادل دائما"

درس گاہ میں مختلف موضوعات پر اپنے سامنے ایک ایک طالب علم کو مکلف کرتے کہ وہ کھڑا ہو کر اور حتی الوسع جملہ آدابِ خطابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقریر کرے۔ دوسرے شرکاء درس کو پابند بناتے کہ وہ سراپا گوش بن کر تقریر سنیں اور فریضۂ خوردہ گیری وعیب جوئی انجام دیں۔ کبھی دو طالب علموں کو بھری درس گاہ میں کھڑا کرتے کہ وہ کسی موضوع پر گفتگو (محادثہ) کریں۔ جملہ شرکاء درس پر فرضِ عین تھا کہ درس گاہ میں انہیں جو کچھ بھی کہنا ہو عربی میں کہیں۔ اردو شجرِ ممنوعہ تھی۔ اسی کے ساتھ کسی شریکِ درس کو اس کی قطعی اجازت نہ تھی کہ وہ شرافت کے پس پردہ غفلت کیش خاموشی اختیار کئے بیٹھا رہے۔ ہر طالب علم کے لئے عبارت پڑھنا، سوالات کرنا اور اپنے جملہ حواس کو حرکت میں رکھنا ضروری ہوتا۔ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں ازراہِ معذرت " لا استطیع" کا استعمال "اکبر الکبائر" تھا۔

ان کی درس گاہ کے سامنے عام گزرگاہ تھی۔ دورانِ سبق کسی گزرنے والے پر اچٹتی نگاہ ڈالنا بھی کمتر از کفر نہ تھا۔ ایسی صورت حال اگر کبھی پیش آتی تو اصلاح حال کے لئے بسا اوقات ایسا کرتے کہ گزرنے والے کو اندرونِ درس گاہ بلا لیتے اور اس سے کہتے کہ فلاں صاحب آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ براہِ مہربانی تھوڑی دیر یہاں کھڑے ہو جائیں تاکہ وہ آپ کو دیکھ لیں۔

ایک فاضل دار العلوم دیوبند کے اندر جسے "قادرِ لغت ہائے مجازی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ رائج الوقت عربی لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے داخلِ نصاب کتابوں کے علاوہ عربی اخبارات کے اقتباسات اور تراشے تیار کرتے اور انہیں اسباق کی طرح باقاعدہ پڑھاتے۔ طلباء کو اس بات کا مکلف کرتے کہ وہ حتی الامکان سبق بغیر پڑھائے خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس سال میں نے تکمیلِ ادب کیا، میرا مشاہدہ ہے کہ وہ بعض دفعہ درس گاہ میں تشریف لائے۔ طالب علم نے عبارت پڑھی اور اس کا ترجمہ کیا۔ نہایت خاموشی سے بغور عبارت اور ترجمہ سنتے رہے آخر میں فرمایا سبق ہوگیا۔

عبارت خوانی وغیرہ میں قواعد صرف و نحو پر غیر معمولی زور دیتے، صرف اتنا ہی کافی نہ تھا۔ بلکہ الفاظ کی مخارج سے ادائیگی کے ساتھ ساتھ حتی المقدور عربی لب و لہجے کی نقالی بھی ضروری تھی۔ "النادی الادبی" کی تحریری سرگرمیوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر آئے دن درسگاہ میں اپنے سامنے مضامین لکھواتے۔ درس گاہ میں طلبہ کو عربی خطوط میں "خطِ نسخ" اور "خطِ رقاع" کی مشق کراتے۔ خط تو سبھی کا سدھر جاتا۔ بہت سے افراد اپنی ذاتی دلچسپی اور محنت سے باقاعدہ خطاط بن گئے۔

یہ ان کے درس، طریقِ درس اور درس گاہ کے اہم اجزائے ترکیبی تھے۔ مندرجہ بالا اجزاء میں کوئی جز اختیاری نہ تھا۔ تمام اجزاء واجبی بلکہ اجباری تھے جس سے سرمو انحراف کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کی اس جگر سوزی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس سال ہم نے تکمیلِ ادب کیا اس وقت کا تاثر بیس سال گزرنے کے باوجود اب تک لوحِ دماغ پر تازہ ہے۔ درس گاہ سے نکلنے کے باوجود ہم احباب آپس میں باتیں کرتے کہ مولانا کے اسباق سے کتنا زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ہر سبق کے بعد ایسا لگتا ہے کہ آج بہت کچھ حاصل ہوا ہے جو اب سے پہلے حاصل نہ تھا۔ اس وقت اس خاص تاثر میں شدت کا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ تکمیلِ ادب کا سال دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد کا ہوتا ہے۔ اس وقت دورۂ حدیث کی ایک مخصوص نوعیت تھی۔ غالباً اس وقت بھی کم و بیش ویسی ہی نوعیت ہوگی جس میں سال کا بیشتر حصہ چند فقہی مسائل کی طولانی بحثوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ کتابوں کے بیشتر حصے کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ انتہائی دقیقہ سنجی اور موشگافی کی عادی طبیعتیں اتنی رواں دواں ہو جاتی ہیں کہ تبرکاً قراءت احادیث پر قناعت کر لیتی ہیں اور کتب احادیث کے جملہ ابواب تک کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسی صورتحال میں درس گاہ کی افادیت کا احساس عقیدۃً تو ہو سکتا ہے حقیقۃً نہیں۔

ایک تعلیمی سال کی مدت تقریباً آٹھ ماہ سے زائد نہیں ہوتی۔ زبان وادب کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ کوئی زبان سیکھنے کے لئے یہ مدت مضحکہ خیز ہے۔ لیکن استاذ مرحوم اپنی خداداد صلاحیت و جگر سوزی سے اس مختصر مدت میں طلبہ کے اندر عموماً اتنی صلاحیت پیدا کر دیتے کہ انہیں اخذ و تعبیر کا سلیقہ آجاتا اور عربی زبان کی زمام کار ان کے ہاتھ میں آجاتی کہ آئندہ وہ اپنے عزم وہمت کے بقدر جتنی مسافت طے کرنا چاہیں، طے کر سکیں۔ چنانچہ ان کے تلامذہ میں بے شمار افراد ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ذوق اور جدوجہد کے ذریعے اس میدان میں دستگاہ حاصل کی۔ استاذ مرحوم کی تدریس وتعلیم کی خاکہ نگاری بالکل ادھوری اور نامکمل رہے گی اگر اس میں ان کی مخصوص تربیت اور منفرد ذہن سازی کا تذکرہ نہ ہو۔ تعلیم اور تربیت کا ذکر ایک ساتھ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تدریس کا تربیت سے قطع نظر کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے جسد تدریس میں روح تربیت اس طرح سرایت کئے ہوئے تھی جیسے برگِ گل میں بوئے گل۔

ان کی ذات سے وابستہ جس تاریخ سازی، ذہن سازی، افراد سازی اور مردم سازی کا غلغلہ ہے۔ اس کے لئے تدریس اور درس گاہ سے علیحدہ کوئی تربیت گاہ اور تربیتی پروگرام نہیں تھا۔ درس گاہ ہی تربیت گاہ تھی اور تدریس ہی تربیت۔ یہ فیصلہ کرنا ہم خوشہ چینوں کے لئے بھی سخت مشکل ہے کہ وہ مدرس زیادہ اچھے تھے یا مربی۔ غالباً یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ وہ بے نظیر مدرس اور بے مثال مربی تھے۔ وہاں تعلیم وتربیت لازم وملزوم تھے اور دونوں کو یکساں اہمیت حاصل تھی۔ اسباق حیات کی تدریس پر وہ اس سے کم توجہ اور توانائی صرف نہیں کرتے تھے جتنی ابواب عربی ادب پر کرتے تھے۔

جب درس گاہ میں داخل ہوتے تو باآواز بلند الفاظ کی مخارج سے ادائیگی کے ساتھ السلام علیکم کہتے ایسا بالکل نہ کرتے جیسا عموماً غرورِ نفس میں مبتلا بڑے اپنے چھوٹوں کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں کہ یا تو سرے سے سلام ہی نہیں کیا یا دوسروں کے منتظر رہے یا بڑی عنایت کی تو دبی اور مری ہوئی آواز میں پلکے پٹے الفاظ میں کچھ زیر لب فرمایا۔ مبادا ان کی شرعی شخصیت پر کوئی سر پھرا ہاتھ نہ اٹھا بیٹھے۔ اگر وہ پہلے سے درس گاہ میں موجود ہیں اور کسی نووارد سے سلام میں کسی قسم کی کفایت شعاری کا ارتکاب ہوا تو اسے ٹوکتے اور "اسلامی آداب" کے موضوع پر نہایت معقول اور مدلل اور حد درجہ پُر تاثیر اور پُر مغز درس تربیت دیتے جو سامعین کے دلوں میں اسی طرح گھر کر لیتا جیسے کوئی کتابی سبق بلکہ اس سے زیادہ چونکہ کتابی سبق سے تو وہ اور بھی بہت سی درس گاہوں میں لطف اندوز ہوتے تھے۔

ملا واحد الرحمن کیرانوی نمبر

مگر درس حیات کی جو گرہ کشائیاں یہاں ہوتیں وہ اُن کے دل و دماغ کو مسحور کئے بغیر نہ رہتیں ۔
باہمی احترام کی عملی شکل جو استاذ مرحوم کے معمولاتِ زندگی میں نظر آتی تھی اس کی مثال شاید ہی مل سکے ۔ وہ اپنے تلامذہ کو بھی "آپ" اور "مولوی فلاں" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔ ہم نے یہ طریقہ انہیں سے سیکھا پھر اپنے دوستوں بلکہ عمر میں چھوٹوں کو بھی "آپ" کہنے میں جھجک اور تکلف باقی نہیں رہا ۔ ورنہ اسلامی مدارس کے شرعی ماحول میں بھی شاگردوں کو بحالت فرحت و مسرت "تو" اور "تم" اور بحالتِ غیظ و غضب "خبیث" "ملعون" اور "مردود" وغیرہ القاب سے نوازنے والوں کی کمی نہیں ہے ۔
صفِ ثانوی ہم نے ان سے خارج وقت میں پڑھی ۔ اس سال بہت دنوں تک "ایک بیٹھ دو کاج" کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے استاذ مرحوم نمازِ عصر کے بعد اپنی جماعت کے ہمراہ سہارنپور روڈ کی طرف نکل جایا کرتے تھے اور کسی صاف ستھری اور پُر فضا جگہ یہ عرب کا رواں خیمہ زن ہو جاتا ۔
ایک روز میں راستہ میں اُن سے کچھ کہہ رہا تھا ۔ اثنائے گفتگو دارالعلوم دیوبند کے ایک استاذ کا نام اس طرح سے لیا ۔ "مولوی فلاں صاحب" لفظ مولوی کے استعمال پر وہ تنبیہ کئے بغیر نہ رہ سکے اور کہنے لگے کہ پورے احترام سے اساتذہ کا نام لینا چاہئے ۔ عموماً اساتذہ کے ناموں سے قبل کم از کم "مولانا" اور آخر میں "صاحب" بڑھانا مروّج ہے ۔
وہ خود بھی اپنے بڑوں کا بہت احترام کرتے تھے ۔ اپنے اساتذہ اور بڑوں کا نہایت احترام سے نام لیتے تھے ۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب نور اللہ مرقدہ ان کے استاذ تھے ۔ استاذ مرحوم جب کبھی ان سے ملنے جاتے تو ان کی نشست سے ذرا فاصلے پر نہایت مؤدب انداز میں تشہد کی ہیئت پر بیٹھتے جس طرح مؤدب طلبہ درس گاہوں میں اپنے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں ۔ صرف بڑوں ہی کا نہیں اپنے احباب بلکہ تلامذہ کا بھی احترام کرتے تھے ۔ وفات سے چند ماہ پیشتر جب ریاض تشریف لائے تو اُن سے ملاقات کے لئے حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب تشریف لے گئے ۔ مولانا خود بھی بہت خلیق اور متواضع انسان ہیں ۔ اس وقت استاذ محترم کی نشست گاہ پر ایک کپڑا تھا ۔ انہوں نے وہ کپڑا سمیٹ دیا تاکہ نشست گاہ کا امتیاز باقی نہ رہے ۔ حالانکہ مولانا عمر میں استاذ محترم سے چھوٹے ہیں بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن جو حساسیت اور شرافت اس کا سبب ہوتی ہے وہ انمول اور نہایت کمیاب جنس ہے ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

امانت و دیانت جیسی اہم انسانی اور اسلامی اقدار کی تلقین کے لئے صرف یہ بہانہ ان کے لئے کافی تھا کہ سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کے موقعوں پر جو عموماً درس گاہ میں ہوتے وہ سوالات کا پرچہ طلبہ کے حوالے کرنے کے بعد کہتے کہ ہر طالب علم نہایت امانت و دیانت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنا پرچہ حل کرے۔ کسی قسم کی کوئی خیانت اور بد دیانتی بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔ اور یہ بات ایک طالب علم کے وقار اور مرتبے کے منافی ہے کہ اس کی کسی خیانت، بد دیانتی اور بدعنوانی پر گرفت کے لئے کوئی استاذ یا نگراں اس پر نظر جمائے بیٹھا رہے۔ یہ گویا اس حقیقت کا غیر ملفوظ اعتراف ہوگا کہ ہمارا وصفِ امانت و دیانت اندیشۂ سزا کے ساتھ مشروط ہے۔ عین امتحان کی ساعت میں یہ تربیتی درس دے کر چلے جاتے۔ عجیب بات تھی کہ وہی طلبہ جن میں بہت سے لوگ امتحان گاہوں میں اپنے قریبی ہمسایوں سے سرگوشیوں اور پرچی بازیوں کی امدادِ باہمی پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ بسا اوقات پوری پوری شروح جیب و گریباں کے پس پردہ ساتھ لاتے۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی حالت اتنی بلند ہو جاتی کہ وہ یہاں ان جایکستیوں کو گناہ تصور کرنے لگتے۔ اور ان کی غیر حاضری میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے سوالات حل کرتے۔

حوصلہ افزائی کی قدر و قیمت تعلیم و تربیت کے میدان میں کسی پر مخفی نہیں۔ استاذ مرحوم کے کشکول تربیت میں تو گویا یہ نسخۂ کیمیا تھا جسے وہ نہایت فراوانی سے استعمال کرتے اور خدا ہی بہتر جانے کتنے ستم رسیدۂ روزگار "ہیچمدانوں" "ناچیزوں" اور "احقروں" کو مایوسی اور نامرادی کے تیرہ و تاریک غار سے نکال کر ان کے ہاتھوں میں خود شناسی کی مشعل تھمائی جس سے انہوں نے اپنی زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا کام لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں ہمہ وقت خاکستر کے انبار میں دبی ہوئی چنگاری کی تلاش رہتی ہو۔ نرم گرم ہر انداز سے اس درجہ ہمت افزائی کرتے کہ اپنے تئیں سنگ ریزہ سمجھنے والے خود کو "لعلِ بدخشاں" سمجھنے لگتے۔

احساسِ کمتری ہر قسم کی بے عملی کی اساس اور زندگی کے لئے پیش خیمہ ہلاکت ہے۔ وہ اپنے متوسلین کے دماغ سے اس مردم خور دیمک کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ؎

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

کہا جاتا ہے کہ کوئی بڑا خواہ کیسا ہی ہمدرد اور بہی خواہ ہو، کبھی اس بات سے خوش نہیں ہوتا کہ چھوٹا اس کا ہمسر بلکہ بنے یا اس سے فائق ہو جائے۔ علاوہ باپ کے جو دل و جان سے اس بات کا خواہشمند

ہوتا ہے کہ اس کا لختِ جگر کارزارِ حیات میں اس سے بھی سبقت لے جائے۔ ہم اپنے عینی مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ اپنے تلامذہ کے لئے استاذ مرحوم کے جذبات بحیثیت پدر روحانی پدر نسبی سے کمتر نہ تھے۔

وفات سے قبل تین سالوں کے دوران اپنے خوشہ چینوں کی دعوت اور اصرار پر دوبار ریاض (سعودی عرب) تشریف لائے۔ پہلی بار تقریباً ایک ماہ قیام کے بعد جب واپسی کی ساعت قریب آئی تو بہت سے تلامذہ جمع تھے، اس وقت آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ ہی لوگ میری اولاد اور میرا سرمایہ ہیں۔

وہ پوری فراخ دلی سے اپنے ریزہ چینوں کی تعریف و توصیف کرتے اور یہ تک کہنے میں تامل نہ کرتے کہ فلاں مجھ سے فائق ہو گیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ تکمیلِ ادب کے سال درس گاہ میں اپنے برادرِ خورد مولانا عمید الزماں صاحب کے بارے میں جو بڑی حد تک انہیں کے پروردہ ہیں کہنے لگے کہ عمید کی عربی زبان مجھ سے اچھی ہے جس طرح وہ ازراہِ اصلاح خامیوں پر نہایت شائستہ حرف گیری میں کوئی دریغ نہ کرتے، اسی طرح خوب سے خوب تر کی جستجو میں خوبیوں پر دل کھول کر حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

عزتِ نفس غالباً استاذ مرحوم کو ورثہ میں ملی تھی اور ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ زندگی ان گنت نشیب و فراز سے دوچار ہوئی۔ گردشِ لیل و نہار نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ حالات کے تلخ و تند جھونکوں نے جی بھر کے بھڑاس نکال لی۔ ان کی داستانِ حیات میں عسرت و تنگدستی کے صفحات کی کمی نہیں بلکہ عمرِ رواں کی بیشتر دہائیاں نہایت کفایت شعاری میں گزریں۔ مصنوعی چہروں کے دیدہ زیب خول اترنے کے بعد ان کی نگاہوں نے ایمان و یقین کو متزلزل کرنے والے مکر و فن کے کریہہ اور گھناؤنے مناظر دیکھے۔ یہ سب کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ انسانوں کے جس گروہ سے ان کا تعلق تھا اس کے ساتھ ماضی میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا اور ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن عزتِ نفس کی جس میراث کے وہ وارث تھے، اس کی نگہداشت اور پاسبانی سے وہ تمام عمر یک لحظہ غافل نہیں ہوئے۔ ان کے پائے استقلال و عزیمت میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنے حلقہ بگوشوں کو بھی تاحیات پورے عزم و حوصلے کے ساتھ اسی کا درس دیتے رہے۔ ٥

حدیثِ بے خبراں ہے کہ با زمانہ بساز　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

جزیرہ نمائے ہند کے مخصوص حالات کے باعث بالخصوص گزشتہ نصف صدی میں ارباب دین اور وابستگانِ مدارس میں احساسِ کمتری بہت عام ہوگیا ہے۔ غیر دیندار طبقہ اپنی بے دینی کے باعث اور دیندار طبقہ اپنی ناپختہ دین داری کے سبب اسلامی علوم کی تحصیل کو سامانِ ذلت و رسوائی سمجھنے لگا ہے۔ استاذ مرحوم اس ناعاقبت اندیشی سے سخت نالاں رہے اور تاحیات اس کے خلاف جہاد میں مصروف۔

دورانِ درس جب کبھی ایسا کوئی موقعہ آجاتا تو وہ طلبہ کو سمجھاتے کہ ہمیں اپنے لباس و پوشاک، خورد و نوش، نشست و برخاست، گفت و شنید غرض ہر چیز میں باسلیقہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے کسی طور طریقے اور نقل و حرکت سے پھوہڑپن اور چھچھوراپن نہیں ظاہر ہونا چاہیئے۔ بہت سے طلبہ ایسا کرتے ہیں کہ سردیوں میں جو لحاف اوڑھتے ہیں وہی نہایت بے ترتیبی سے اوڑھ کر فجر کی نماز کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح مطبخ سے کھانا لینے کے بعد ایک ہاتھ میں روٹیاں لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں سالن کا کٹورا لبا اوقات کھلا ہوا لئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح تفہیم مدعا کے لئے کبھی ان لوگوں کو ہدف تنقید بناتے جو ملاقات کے لئے جاتے اور آداب ملاقات کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے مصروفِ ملاقات رہنے کے بجائے گرد و پیش رکھی ہوئی چیزوں پر غائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور لبا اوقات بہت سے غیر ضروری استفسارات شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کتاب آپ کو کہاں سے ملی۔ اس کمبل کی قیمت کیا ہے وغیرہ۔

استاذ مرحوم عزت نفس اور سلیقہ مندی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ممکن نہیں تھا کہ ان کے کسی چھوٹے یا بڑے کام میں کسی ادنیٰ درجے کی خفت پسندی اور بے سلیقگی کو جگہ مل سکے۔ ان کی چال ڈھال نشست و برخاست، گفت و شنید، غرض ہر عمل خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کے سانچے میں ڈھلا ہوتا۔ ہمیں ان کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر حیرت افزا مسرت ہوتی کہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جسم سے اتارے ہوئے کپڑوں کو رکھنے میں بھی وہ سلیقہ مندی کو بالائے طاق رکھنا گوارا نہ فرماتے۔

اس ذیل میں یہ سمجھنا خلافِ واقعہ ہوگا کہ وہ اپنی ظاہری وضع قطع اور رکھ رکھاؤ پر بہت سا پیسہ خرچ کرتے ہوں گے۔ سچائی یہ ہے کہ "کم خرچ بالانشین" کی جو تعبیر ان کی عملی زندگی میں نظر آتی تھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ٹیکسٹائل کی صنعت کے اس ترقی یافتہ دور میں انہوں نے پوری زندگی سوتی کپڑے استعمال کئے۔ معمولی شکل و صورت کی ایک ہلکی پھلکی چین لگی ہوئی گھڑی کو خدائے علیم و خبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے کتنے سالوں تک شرف رفاقت بخشا۔ دارالعلوم دیوبند کے جس کمرے میں

رہتے تھے اس میں معمولی ٹاٹ بچھا رہتا تھا۔ البتہ تلامذہ، احباب اور ملاقاتیوں کے اعزاز کے لئے اس پر ایک سفید چادر بھی رہتی تھی۔ نہ نہ بیز قالین اور نہ گداز صوفے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر چیز صاف ستھری برمحل اور سلیقہ مندی کی تصویر ہوتی۔ قناعت پسندی اور کفایت شعاری کے بوریے میں جو لطافت و نفاست تھی وہ ناقابلِ بیان آرائشی و زیبائشی فرنیچروں میں نہ محسوس ہوئی۔

مقبولیت

استاذ مرحوم کے علم و فضل، جفاکشی و جاں فشانی، خلوص و ہمدردی، تعلیم و تربیت، وقار و تمکنت، جرأت و ہمت اور راست بازی و صداقت نے ان کی شخصیت کو غیر معمولی حد تک پُر تاثیر بلکہ سحر انگیز بنا دیا تھا۔ وہ اپنے انہیں اوصاف و کمالات کے سبب کم و بیش تین دہائیوں تک دارالعلوم دیوبند کے اُفق پر ابر رحمت بن کر چھائے رہے۔ حالانکہ انقلاب دارالعلوم دیوبند تک نہ وہ کبھی مہتمم رہے نہ نائب مہتمم نہ صدر مدرس نہ ناظم تعلیمات نہ شیخ التفسیر اور نہ شیخ الحدیث بلکہ جمعیۃ علمائے ہند سے اپنی وابستگی کے سبب انتظامیہ کی نظر میں ہمیشہ ایک ناپسندیدہ شخصیت۔ مگر طلبہ کی نگاہوں میں اپنی مردم سازی اور تاریخ ساز کارکردگی کے باعث انتہائی پسندیدہ شخصیت رہے۔

یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بعد طلبہ میں جو مقبولیت استاذ مرحوم کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے بے تاج بادشاہ تھے۔ انتظامیہ کی فائلوں میں ان کی حکمرانی کے دستخط نہ سہی، طلبہ کے دل و دماغ کی سلطنت میں ان کی فرماں روائی کی مہر ثبت تھی۔

ایسا نہ تھا کہ اُن کا حلقۂ اثر صرف انہیں طلبہ تک محدود رہا جو اُن کے زیر تدریس و تربیت ہوں بلکہ اُن کے فکر و نظر کی وسعت، کردار و عمل کی کشش، خلوص و خیر خواہی کی مہک، متعلق اور غیر متعلق ہر ایک کو اپنی گرفت میں لئے ہوتی تھی۔ اپنی اسی پُر تاثیر اور پُر کشش شخصیت کی بنا پر ہمیشہ ابنائے زمانہ میں محسود اور ارباب حل و عقد کی نگاہوں میں معتوب رہے۔

ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی ان کے کسی عمل تسخیر قلوب کا نتیجہ نہ تھی اور نہ وہ اس کی بقا یا

اس میں اضافہ کے لئے اپنے اصولوں میں کسی لچک یا مداہنت کو روا رکھتے تھے۔ اگر ہم نے بچشم خود مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو شاید یقین نہ آتا کہ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد فضلاء دارالعلوم جو تکمیل ادب میں شریک ہوتے، استاذ مرحوم ان کی غلطیوں پر برافروختہ ہو کر بعض دفعہ بھری درس گاہ میں رجسٹر وغیرہ سے ان کی پٹائی کر دیتے۔ اس کے باوجود طلبۂ عزیز کے دلوں میں ان کے لئے کبھی کوئی میل پیدا نہ ہوتا۔ یہاں تسخیر قلوب کا طریقۂ کار کوئی شرعی یا سفلی عمل نہ تھا بلکہ طلبہ کے لئے بے پناہ جذبۂ خیر و ہمدردی اس کا سبب تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر کسی انسان کو اس بات کا یقین ہو کہ کوئی اس کا بہی خواہ ہے، اس کی مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ اصلاح و تادیب کی ایک شکل ہے تو ایسی صورت میں تادیبی کارروائیاں انسان پر گراں نہیں گزرتیں ؎

مقام گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

طلبۂ عزیز کے دل و دماغ پر ان کی پُرکشش شخصیت کی گرفت ایسی معقولیت آمیز شدت کی حامل ہوتی کہ مادرِ علمی کو خیرباد کہنے کے باوجود اس کی گرہیں ڈھیلی نہ ہوتیں۔ انقلابِ دارالعلوم کے ہنگاموں کے دوران ایک طالب علم نے جو اپنی لیڈرانہ ذہنیت کے سبب بہت ممتاز اور ان انقلابی ہنگاموں میں غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا بعد ازاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا اور اب باقاعدہ میدانِ سیاست کا سرگرم کارکن ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے استاذ مرحوم کی برطرفی کے بعد اس سے ملاقات ہوئی۔ آغاز ملاقات میں یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند میں استاذ مرحوم کے ہاتھوں سخت سرزنش کے اثرات کہیں اس کے حافظے میں تازہ نہ ہوں مگر گفتگو کے بعد یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ استاذ مرحوم سے اس کو غیر معمولی عقیدت اور تعلق ہے اور وہ ان کے لئے کسی بھی نیاز مند سے کم پُرجوش نہیں ہے۔ حالانکہ اب حصارِ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد اُسے نہ کسی جزاء کی توقع ہو سکتی ہے اور نہ کسی سزا کا اندیشہ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عمر کے آخری تین سالوں کے دوران استاذ مرحوم سعودی عرب بالخصوص ریاض میں اقامت پذیر اپنے تلامذہ کی دعوت پر دو بار یہاں تشریف لائے۔ ان کی آمد پر یہاں موجود فضلاء دارالعلوم دیوبند جتنی بڑی تعداد میں ان کے گرد دکھائی نظر آئے اور جس والہانہ عقیدت اور وابستگی کا انہوں نے اظہار کیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حالانکہ حلقۂ فضلاء میں بدنصیبی سے

بہت سی گروہی تقسیمات پیدا ہوگئی ہیں مگر استاذ مرحوم ان سب کے لئے یکساں طور پر باعثِ کشش تھے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ استاذ مرحوم کے ساتھ وابستگی اور عقیدت میں "دینی شخصیت" کا مبہم اور رائج الوقت تصور کسی بھی درجہ میں شامل نہ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کو دعائیں دینے کے بعد نہ تو استجابت دعا کا یقین دلایا اور نہ ہی ناراضگی میں کسی کو بددعائیں دے کر ڈرایا بلکہ اگر کسی طالب علم کو ادب واحترام وغیرہ کے عنوان سے دین دار حلقوں میں متعارف پُرتکلف اور غیر ضروری طور طریقوں میں مبتلا پاتے تو ٹوکتے اور کہتے کہ احترام دل میں ہونا چاہیئے۔ ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ جس کا ہر صفحہ بلکہ ہر لفظ عیاں تھا۔

قوتِ فکر وعمل پر اُن کا ایمان تھا۔ کورانہ تقلید کے لئے وہاں کوئی گنجائش نہ تھی

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بقیہ : فیصلۂ سبکدوشی پر .....

بقیہ : فیصلۂ سبکدوشی پر .....

لہٰذا آپ کے توسط سے مجلسِ شوریٰ سے میری گزارش ہے کہ ۱۸ر جون ۱۹۹۰ء کے مذکورہ جلسے میں مجھ پر جو مختلف النوع الزامات لگائے گئے اگر وہ غلط ہیں اور یقیناً غلط ہیں جیسا کہ واقعہ ہے تو اس نہایت غیر ذمہ دارانہ اور مذموم حرکت پر الزامات لگانے والوں سے بازپرس کی جائے۔ کیوں کہ ادارے کو مفاد کو بہر حال شخصیات پر فوقیت حاصل ہے نیز تجویز میں میری سبکدوشی کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اور اس کے پس منظر میں جو الزامات کارفرما ہیں۔ ان سب کی تحقیق کی جائے اور مجھے بھی صفائی کا موقع دیئے جانے کے بعد اس فیصلے پر غور کیا جائے۔ اُمید کہ مجلس اپنی ذمہ داری اور انصاف پسندی سے کام لیتی ہوئی میری اس درخواست پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ والسلام۔

خادم

وحید الزماں کیرانوی

۲ر محرم ۱۴۱۱ھ

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز

مولانا وحید الزماںؒ اور تنظیم ابنائے قدیم

استاذ مکرم مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے سانحۂ ارتحال کو چند ماہ گذر گئے ہیں مگر ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو ان کی یاد برابر تڑپا رہی ہے، ترجمان دارالعلوم ان کی یاد میں اگر خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے تو اپنا ایک اہم فریضہ ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ تنظیم ابنائے قدیم کے کرتا دھرتا اور روحِ رواں زیادہ تر مولانا کے رفقاء ہیں یا وہ عقیدت مند حضرات جنھوں نے ان سے براہِ راست یا ان کی تالیفات کے ذریعہ یا ان کے مجاہدانہ طرزِ حیات سے استفادہ کیا۔ مولانا مرحوم کو درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے خصوصاً عربی زبان وادب اور دینی علوم سے عمر بھر جو شغف رہا، وہ محتاج تعارف نہیں۔ یہ بات بارہا بہت سے مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ سامنے آچکی ہے کہ دارالعلوم دیوبند، اس کی شاخوں اور نصاب درسِ نظامی کے حامل دیگر متعدد مدارس و معاہد میں جدید عربی زبان وادب کا شوق و شعور پیدا اور بیدار کرنے والی مولانا ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد لغات و مؤلفات بھی تصنیف فرمائیں۔ مگر یہ کاوشیں ان کے دائرہ کار کا صرف ایک حصہ تھیں۔ مولانا کے کارناموں کی اصل اسپرٹ ان کا انتھک مسلسل مصروف جہد و عمل رہنے کا جذبہ تھا، ان کے نزدیک گردش مدام اور اضطراب پیہم ہی زندگی کا حقیقی مفہوم تھا۔ علمی اداروں کی تاریخ دیکھی جائے تو پتہ لگتا ہے کہ ان سے وابستہ چند فیصد حضرات ہی ان کی نیک نامی و بلندنامی کا سبب ہوتے ہیں ورنہ اکثریت استفادہ یا استحصال کرنے والوں ہی کی رہتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ہر دور میں مخلص و ماہر و مجتہد اساتذہ میسر آتے رہے اور اس دورِ قحط الرجال میں بھی مولانا کیرانوی جیسے لائق و فائق اساتذہ سے اس کا دامن خالی نہیں رہا۔ راقم السطور جب دارالعلوم کا طالب علم تھا اس وقت ادبی و علمی سطح پر شیخ الادب مولانا اعزاز علی مرحوم اور علامہ

کلاں محل دہلی ۶

انور شاہ کشمیریؒ کے اسمائے گرامی طلبہ و اساتذہ کی زبانوں پر ہوا کرتے تھے (اس دوران مولانا کا تقرر ثانیاً عمل میں آیا تھا اور راقم مقامات حریری میں مولانا کا شاگرد تھا) مجھے یقین ہے کہ دارالعلوم کے موجودہ ماحول میں مولانا کیرانویؒ کے نام نامی کی بازگشت کم و بیش اسی طرح سنائی دی جا رہی ہوگی۔

علم و حکمت کسی کی میراث نہیں ہے، قادر مطلق جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: یؤتی الحکمۃ من یشاء۔ پھر اس علم و حکمت کی فیض رسانی کی توفیق بھی خالص عطیہ ربانی ہے، اس زاویۂ نگاہ سے مولانا مرحوم بہت خوش نصیب رہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں تشنگانِ علوم کو ان کی ذاتِ بابرکت سے فیض پہنچا اور یہ سلسلہ تاحال منقطع نہیں ہوا ہے اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔ کیونکہ ایک طرف آپ کے شاگردوں کا جم غفیر ہے تو دوسری جانب متعدد و متنوع تصانیف کا صدقہ جاریہ ہے جس سے ہر دور کے طالبانِ علم و حکمت استفادہ کرتے رہیں گے۔

ہمارے علمی اداروں نے فارغ التحصیل حضرات کی مزید تربیت و آبیاری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے دونوں جانب اس قدر کامیابیاں نہیں ملیں جتنی مل سکتی تھیں۔ وہ علمی و دینی رجحان و مزاج جو ادارے کی چہار دیواری میں پروان چڑھتا ہے اس کی اگر عملی زندگی میں مسلسل آبیاری ہوتی رہے تو بہت سے گوہرہائے شاہوار جو فکر معاش اور ناقدریٔ ایام کی دست برد کا شکار ہو جاتے ہیں اس سے محفوظ رہ کر قوم و ملت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ دراصل صالح تنظیم اور اجتماعی روح ہی انسانیت کی سربلندی کا زینہ ہے۔ ابن خلدون اپنے مقدمۂ تاریخ میں برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ مثلاً ایک لاکھ بے ہنگم منتشر افراد کے مقابلے میں ایک ہزار متحد و منظم بامقصد افراد کی قوت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

یوں تو تنظیم ابنائے قدیم کا نعرہ بہت سے لوگوں نے لگایا، بعض سیاسی ہستیوں نے ایک آدھ موقع پر بہت زور و شور سے اس پر اپنی اجارہ داری کا اعلان بھی کیا، مگر نعرہ لگانا ایک چیز ہے اور حقیقت میں کسی تنظیم کو بروئے کار لانا اور چلانا بالکل دوسری چیز ہے، جو لوگ کام کرتے ہیں وہ نعرے نہیں لگاتے راقم نے کسی ایسے ہی ماحول کے پیش نظر ایک غزل میں کہا تھا:

وہ جو سماجی کارندے ہیں اور سیاسی شعبدہ گر
ان کو زیب نہیں دیتا در آنا علمی اداروں میں

مولانا مرحوم نعرے بازی کے نہیں بلکہ سعی پیہم کے علمبردار تھے، وہ یقین محکم کی دولت سے بھی مالا مال تھے اور فاتح عالم محبت و اخلاق کا بھی جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

راقم کے نزدیک دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کو باقاعدہ مربوط و منظم کرنے کی سعی اگرچہ پہلے بھی متعدد بار کی جاچکی ہے لیکن ماضی قریب میں اس کی تشکیل نو اور آبیاری کا سہرا یقیناً مولانا کے شاگردوں، عقیدت مندوں اور ان سے وابستگان و منتسبین کے سر ہے، آج کل نفسی نفسی کا شور ہے، عالم اسلام افتراق و انتشار کی لعنت سے دن بدن کمزور ہوتا جارہا ہے، ایسے دور میں ان اداروں کو لامحالہ مستعد ہونا پڑے گا جو اسلامی علوم و تعلیمات کے دعویدار و علمبردار ہیں، دارالعلوم دیوبند کا قیام دینی اقدار کی حفاظت کے لئے معرض وجود میں آیا تھا اور فضلاء و اکابر دارالعلوم نے تعلیم و تعلم کے ساتھ روح جہاد و اجتہاد کی حفاظت بھی کی اور نمائندگی بھی، یہ ناممکن ہے کہ موجودہ فضلائے دارالعلوم کسی وقتی نعرے یا تاثر کا شکار ہوکر اپنے اسلاف و اکابر کے اسوۂ حسنہ سے یکسر روگردانی کرنے لگ جائیں۔ اس نازک موڑ پر ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں، ماضی و حال کا جائزہ لیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ یہ کام کسی موقعہ یا مفاد پرست ماحول کے ذریعہ ممکن نہیں، انھیں خود ہی آگے آنا ہوگا اور اپنی ہی تنظیم قائم کرنی ہوگی۔ اور وہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی شکل میں موجود ہے۔ واضح رہے کسی تنظیم کا محض قیام کوئی کارنامہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا لائحۂ عمل، مقصد قیام، اسلوب کار اور اس سے وابستہ حضرات کا عزم و حوصلہ اور کردار و کارگذاری اصل کارنامہ ہوتا ہے، اگر کوئی شخص صرف چند پودے لگاکر شور مچانے اور جشن منانے لگ جائے کہ فلاں باغ قائم ہوگیا تو یہ اس کی خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے، جب تک وہ پودے سرسبز و تنآور درخت بن کر پھل دینے نہ لگ جائیں اس کو باغ سمجھنے سمجھانے والے کج فہم بھی شمار ہوں گے اور سادہ لوح بھی۔

بہت سے حضرات مسلمانوں کی خدمت و تنظیم کے وقتاً فوقتاً نئے نئے اعلان اور وعدے کرتے رہتے ہیں، جبکہ ان سے اگر ان کے نعروں اور وعدوں کا صحیح مفہوم ہی پوچھ لیا جائے تو بغلیں جھانکنے لگ جائیں گے۔ ملت کی بدنصیبی یہ بھی ہے کہ ناخواندہ و ناکارہ عناصر دولت و سیاست کے بوتے پر قیادت و رہنمائی کا دعوی کررہے ہیں اور کوئی ان سے نہ ان کا مبلغ علم دریافت کرتا ہے اور نہ یہ پوچھتا ہے کہ حضور آپ کے کل کے نعروں اور وعدوں کا کیا ہوا۔ بقول شاعر:

ہیں وہ ہمارے رہنما جن کا کمال فن ہے یہ
کل کا بیان کچھ اور تھا، آج بیاں کچھ اور ہے

مولانا مرحوم کو دارالعلوم کی مسند تدریس سے سبکدوش کیا گیا مگر کیا وہ حقیقت میں سبکدوش

ہوگئے؟ ہرگز نہیں! آج بھی ان کے ہزاروں شاگرد درس وتدریس سے وابستہ ہیں، آج بھی طلبۂ دارالعلوم ان کے اقوال وملفوظات، مکتوبات وبیانات اور سیرت وکردار سے استفادہ کررہے ہیں اور آج بھی فضلائے دارالعلوم کی تنظیم ابنائے قدیم منارۂ نور وشعور بن کر جلوہ گر ہے۔ مولانا مرحوم ایک ادارہ اور اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ہمارے دیگر اساتذہ وقائدین کو ان کی انتھک اور طویل مصروف جہد وعمل سیرت سے استفادہ کرنا چاہئے، مولانا یقیناً ان حضرات میں سے تھے جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:
(اولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ)

پس ماندہ معاشروں کا ایک المیہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ اپنے سچے مخلص روشن دماغ رہنماؤں کو خراج عقیدت ان کی یاد کے جلسے جلوسوں، ان کے کارناموں کے فقط تذکروں اور ان کی ستائش وپرستش کی شکل میں پیش کرتے ہیں جبکہ صحیح خراج عقیدت، ان سے بھرپور رہنمائی حاصل کرنے اور ان کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی طرف پیش قدمی کرنے کا نام ہے۔ مولانا کے شاگردوں اور علوم وادبیات خصوصاً عربی علوم وفنون کے جملہ طالب علموں کو چاہئے کہ مولانا مرحوم کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنائیں اور اداروں کی سیاست سے دور رہ کر علم وادب کی شمعیں روشن کریں، مولانا کا طریقہ کار اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر تھا ؎

اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو
میں مملکتِ لوح وقلم بانٹ رہا ہوں

یا بقول شخصے ؎

دیا ہوں گر حقیر سا تو کیا ہوا کہ بارہا
ہزارہا چراغ جل اٹھے ہیں اک چراغ سے

مولانا کی ذاتِ گرامی بلاشبہ ایسا ہی چراغ تھی جس نے ہزارہا چراغ روشن کیے۔

؎ ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
علم کا اک چراغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر محمد معروف قاسمی

تعمیراتی کارنامے

فاضل مضمون نگار ڈاکٹر محمد معروف صاحب کو مولانا وحیدالزماں علیہ الرحمہ کی خدمت میں کوئی پندرہ سال تک رہنے کا شرف حاصل رہا ہے اور انھیں مولانا کے خادم خاص کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ دیوبندی الاصل ہونے کی وجہ سے دارالعلوم سے فراغت کے بعد بھی مولانا کے ساتھ ان کا رشتہ آخری لمحات تک برقرار رہا، اس لیے انھیں مولانا کے مزاج، عادات واطوار اور افکار و خیالات کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا مرحوم سے متعلق اپنی یادوں اور اپنے زمانۂ تعلق کے اہم اور قابلِ ذکر واقعات پر مشتمل ایک نہایت طویل مضمون ارسال فرمایا ہے، جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کا مشاہدہ بڑا تیز اور حافظہ نہایت قوی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ صفحات کی تنگ دامانی کے باعث اس پورے مضمون کو شاملِ اشاعت کرنا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے ساتھ اس دلچسپ اور معلوماتی مضمون کا ایک مختصر حصہ نذرِ قارئین ہے۔ (ادارہ)

حضرت الاستاذ مولانا وحیدالزماں علیہ الرحمہ کو دارالعلوم دیوبند سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی اور جب بھی کوئی موقع آیا تو انھوں نے اس عقیدت ومحبت کا عملی طور پر ثبوت پیش کیا؛ چنانچہ اجلاسِ صدسالہ کے موقع پر جب آپ کو دارالعلوم کی عمارتوں کی تجدید وتزئین جیسی خشک اور سخت محنت طلب ذمہ داری سپرد کی گئی تو آپ نے بغیر کسی تردد کے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ آپ ذرا سوچیں کہ تعلیم وتعلّم اور تصنیف وتالیف کے میدان سے تعلق رکھنے والے کو فنِ تعمیر کے رموز واسرار سے کیا تعلق، یہ بالکل الگ لائن ہے لیکن محبت وعقیدت کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے، حضرت کو

دارالعلوم سے محبت و عقیدت تھی اس لیے انھوں نے دارالعلوم کی اس آواز پر بھی لبیک کہا چنانچہ دارالعلوم میں ترمیم و تزئین کے نام پر تعمیرات کی ایک بہت بڑی ذمہ داری کو انھوں نے اپنے سر لیا اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ دن رات محنت کی اور اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں کے ذریعہ انھوں نے سب پر ثابت کر دیا کہ جس چیز سے آدمی کو لگن و محبت ہوتی ہے، وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے اور کسی بھی آزمائش سے گزر سکتا ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کی اس اہم ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد، انھوں نے تمام مصروفیات نیز وہ تصنیفات جو زیر قلم تھیں، سبھی سے کنارہ کشی کر لی، تعمیرات کی دھن کے علاوہ انھیں کسی سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی جلوت و خلوت اور نوم و یقظہ پر محض ایک چیز چھائی تھی اور وہ تھی دارالعلوم کی ترمیم و تزئین۔ چنانچہ حضرت نے سب سے پہلے طلبا کی بالائی رہائش گاہ سے، جو "دارِ جدید فوقانی" کے نام سے موسوم ہے، اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہ ترمیم اپنے کام کی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر پھیلاؤ لیے ہوئے تھی، کہ لوگوں نے آغاز ہی میں اس کی وسعتِ کار پر چہ می گوئیاں شروع کر دیں کہ ہر دو کمروں کے درمیان ایک ایسا ہی ہال نما کمرہ اور یہاں سے وہاں تک (مراد تھی معراج گیٹ سے مولانا بہاریؒ کی درسگاہ تک) اتنا لمبا کام، اس کے لیے نہ یہ کہ بہت پیسے کی ضرورت ہے بلکہ وقت بھی بہت لگ جائے گا۔

لیکن قربان جایئے اس گوہر شناس بادشاہ کے جو گوہر شناسی میں کسی بڑے جوہری سے کم نہیں تھا، جس کے پاس دارالعلوم کے اہتمام سے وابستہ پیرانہ سالی کے تجربات کا خزانہ تھا، جس نے اپنی جوانی میں اہتمام کی باگ ڈور سنبھالی اور اٹھاون سال تک منصبِ اہتمام پر فائز رہا، یعنی جس نے نصف صدی تک اپنی بلندیِ نگاہ، بلندیِ کردار، خلوص اور دلنوازی جیسی خصوصیات کی وجہ سے دارالعلوم پر حکومت کی، جو اپنی ذات میں خود ایک دارالعلوم تھا، جو اپنی مخصوص وضع قطع، اپنے مخصوص گورے اور نورانی رنگ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ اس صاحبِ نظر شاہِ دارالعلوم نے، اس درِ نایاب کی آب و تاب کو، جو دارالعلوم پر ضوفشانی کے لیے بیتاب تھی، اپنی نگاہِ زمانہ شناس سے پہچان لیا۔ چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کو اپنے اختیاراتِ خاصہ کی رو سے یہ کہا کہ آپ اس سلسلہ میں مکمل آزاد ہیں، جس طرح بھی آپ بہتر سمجھتے ہوں، کریں، کسی کے اعتراض یا نکتہ چینی پر توجہ نہ دیں، اللہ مالک ہے۔ بس پھر کیا تھا، حضرت نے اپنے ان خوابوں کو جن کو وہ سوتے جاگتے دارالعلوم کے لیے دیکھا کرتے تھے، تعبیر کا جامہ پہنانا شروع کر دیا اور اس طرح ترمیم و تزئین کے نام سے اس اہم گیر تعبیری کام کا آغاز کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ باتیں، جو حضرتؒ مجھ سے، دارالعلوم آتے جاتے کہا کرتے تھے، سمجھ میں آنے لگیں۔ حضرت کہا کرتے تھے کہ یہاں ایسا ہونا چاہیے، یہ جگہ تنگ ہے اس کو کشادہ ہونا چاہیے، یہ جگہ

بالکل بیکار پڑی ہے، اس میں طلباء کی رہائش کے لیے بہت سے کمرے نکل سکتے ہیں' مثلاً جب دارالعلوم کے اس جنوبی زینہ سے گزرتے، جو بڑا زینہ کہلاتا ہے اور مولانا انظر شاہ صاحب مدظلہ العالی کی سابقہ قیام گاہ یا چھوٹے گنبد کو دیکھتے تو فوراً کہتے، یہ برج نہیں' برجی ہے۔ بہت چھوٹا گنبد ہے' اس کو بڑا ہونا چاہئے۔ اس کے سامنے یہ اتنی بڑی چھت کی چوکی بنی ہوئی ہے' یہ بالکل غلط ہے۔ اس کو توڑ کر اس پر بہت بڑا ایک ہال یا درسگاہ بن سکتی ہے اور اس طرح دوسری شمالی جانب بھی ہونا چاہئے۔ میں بغیر سمجھے' جی' کہدیا کرتا تھا۔ ایسے ہی جب صدر گیرٹ سے داخل ہوتے تو بائیں جانب جہاں گھنٹہ آویزاں ہے' ایک بہت چھوٹا سا راستہ ہوا کرتا تھا جو فارسی خانہ کی طرف جاتا تھا اس سے گزرتے تو یہ کہتے' یہ راستہ بہت تنگ ہے یہاں ایک بڑا راستہ ہونا چاہئے' جس سے کہ اندر کی ساری بڑی بڑی عمارتیں نظر آسکیں اور اگر کوئی گاڑی بھی لے کر آئے تو اس کو کتب خانہ سے متصل کشادہ صحن میں لاکر کھڑی کر سکے ۔ صدر گیٹ پر جب بہت سی کاریں کسی بڑے مہمان کی آمد پر آکر کھڑی ہو جاتی ہیں تو راستہ بالکل تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں جواباً 'جی' کہدیا کرتا۔ ایسے ہی وہ اہتمام میں جانے والے اس ٹیڑھے میڑھے زینہ کے بہت خلاف تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ زینہ بہت ہی غلط ہے۔ بھلا دفتر اہتمام کہاں' زینہ کہاں' دفترِ اہتمام میں جانے والا راستہ بھی بہت اہتمام کا ہونا چاہئے۔ القصہ وہ جہاں سے بھی گزرتے اس کی متعلقہ عمارت پر ضرور اپنی رائے دیتے اور میں صرف جی! جی! کے علاوہ اس لیے کچھ اور نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں یہ سمجھ ہی نہیں پاتا تھا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں' یا اس سے حضرت کا مقصد کیا ہے؟ جب تعمیرات کا یہ سلسلہ شروع ہوا' اس وقت حضرت کی باتیں ایک ایک کر کے میری سمجھ میں آگئیں۔

حضرت مہتمم صاحب کی آمد

چنانچہ ایسا ہی ہوا' جب دارجدید فوقانی کے درمیانی خلا کو پُر کر کے بالکل برابر والے کمرہ کی شکل دے دی گئی اور یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، تو حضرت مہتمم صاحب اس کا معائنہ کرنے کے لیے تشریف لائے، اس وقت حضرت مہتمم صاحب کے جو الفاظ تھے' وہ یہ تھے: " بھائی ماشاء اللہ۔ مولانا: معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دو کمروں کے درمیان کوئی خلا بھی تھا اور بھائی مولانا! آپ نے تو اس نئی تعمیر کو پُرانی تعمیر سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا جیسے یہ پہلے ہی سے تعمیر شدہ ہے۔ بھائی ماشاء اللہ۔ اللہ آپ کو اس کی جزاءِ عظیم عطا فرمائے۔" اور اس طرح مولانا: سید الزماں صاحب' حضرت مہتمم صاحب کو سمجھاتے رہے اور آگے بڑھتے رہے' حضرت مہتمم صاحبؒ خوب۔ ماشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔ جزاک اللہ" کہتے رہے۔ میں چونکہ ساتھ تھا' اس لیے میں بغور

حضرت مہتمم صاحب کے روئے انور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حضرت مہتمم صاحب کے چہرے پر، ہونٹوں پر پان کی سرخی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب کیفیت تھی، جس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد یہ دونوں حضرات مع طلبہ کی جمعیت کے، باب الظاہر سے ہوتے ہوئے مدنی گیٹ کے زینہ سے واپس نیچے اتر آئے حضرت نے، حضرت مہتمم صاحب کو لے کر اس جگہ کھڑے ہوگئے جہاں موجودہ فوارہ بنا ہوا ہے۔ حضرت نے چل کر گول دائرے کے انداز سے حضرت مہتمم صاحب کو کچھ بتایا، جو میری سمجھ میں اس وقت نہیں آسکا یقیناً وہ فوارہ سے متعلق ہی اپنے ذہنی خاکہ کو بتلا رہے ہوں گے یا پھر اور کوئی بات ہوگی۔ بہرحال اس جگہ دیر تک کھڑے رہے اور پھر بڑے زینہ سے جو دارالتفسیر کی طرف جاتا ہے، حضرت مہتمم صاحب کو لے کر مولانا انظر شاہ صاحب کی سابقہ قیام گاہ کی طرف مڑ گئے اور ذرا دور چل کر اس منبر نما فرش پر جو حضرت مولانا انظر شاہ صاحب مدظلہ کی قیام گاہ سے شروع ہوکر مشرقی سمت میں اخیر تک بنا ہوا تھا، بیٹھنے کا ارادہ کیا تو فوراً ہی کسی طالب علم نے اپنا رومالِ عقیدت بچھا دیا اور حضرت مہتمم صاحب تشریف فرما ہوگئے اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کھڑے کھڑے حضرت مہتمم صاحب سے باتیں کرتے رہے، میں اس وقت دیگر طلبہ کی طرح ذرا فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، لہٰذا گفتگو کے الفاظ تو صاف طرح نہیں سنائی دے رہے تھے البتہ گفتگو کے دوران ہاتھوں کے اشارہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ گفتگو کا موضوع قریب ہی کی کوئی جگہ ہے اس کے بعد حضرت نے چل کر برج پر ہاتھ رکھا اور حضرت مہتمم صاحب سے فاصلہ ہوجانے کی وجہ سے بلند آواز سے فرمایا کہ حضرت گنبد کی موجودہ گولائی جہاں سے شروع ہوتی ہے یہاں سے اس کو اتار دیا جائے گا اور اس کو مزید اونچا کردیا جائے گا، جس سے اس کی خوبصورتی اوپر والے بڑے گنبد (اشارہ دارالتفسیر کی طرف تھا) کے بالمقابل نمایاں اور واضح معلوم ہوگی اور اس کو چاروں سمتوں سے کھلا رکھا جائے گا۔ حضرت مہتمم صاحب گردن کے اشارہ سے ثابت کرتے رہے کہ میں آپ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوں۔ پھر حضرت نے مزید فرمایا کہ یہ چبوترہ حضرت مولانا اختر حسین صاحب کی درسگاہ کا بالائی حصہ ہے جس کا بظاہر کوئی مصرف بھی سمجھ میں نہیں آتا، میں چاہتا ہوں کہ اس کو توڑ کر ایک اتنی ہی بڑی درسگاہ جتنی نیچے ہے، یہاں بھی بنائی جاسکتی ہے اور شمال کی طرف جو برج ہے، اس کا بھی یہی نقشہ ہوگا اور یہ کوئی بڑا خرچ بھی نہیں ہے۔ اس طرح مولانا باتیں کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کے قریب آگئے، مولانا کے قریب آتے ہی حضرت مہتمم صاحب فرمانے لگے کہ بھائی مولانا! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ خود اپنی حالتِ زار کا شکوہ کررہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھے ادھورا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ یہ حضرت کا ظریفانہ انداز تھا، جس سے خود مولانا بھی بہت خوش ہوکر ہنس پڑے اور قریب کھڑے ہوئے طلبہ میں بھی ایک قہقہہ سا چمک پڑا۔

اس کے بعد حضرتؒ حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ اپنی درسگاہ سے ہوتے ہوئے اس زینے سے نیچے اُتر آئے جو مطبخ کی طرف اترتا ہے، یہاں آکر حضرت مہتمم صاحب کچھ لمحوں کے لیے ٹھہرے اور کچھ ہمت افزا باتیں کیں اور پھر سلام کرکے اسی جگہ سے تنہا رخصت ہوگئے۔ مولانا اپنے کمرے میں چلے آئے۔ مولانا کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے چائے کے لیے کہا، میں نے جلدی سے چائے تیار کی۔ چائے پیتے وقت جو بات حضرت نے مجھ سے کہی وہ یہ تھی: "دیکھا معروف تم نے۔ یہ ہوتی ہے دوراندیشی اور حوصلہ مندی کی بات کہ حضرت مہتمم صاحب نے میری ایک بات پر بھی کوئی نکیر یا انقباض کا اظہار نہیں کیا بلکہ میرے خاکے اور نقشے کی بھرپور انداز میں تائید کی، اس کو کہتے ہیں عقلمندی۔

پھر اس کے بعد اگلے روز مزدوروں اور ٹھیکیداروں کو بلا کر اپنا اگلا پروگرام سمجھایا اور کہا کہ کل سے ان دونوں جگہوں پر کام شروع کرنا ہے۔ چنانچہ ٹھیکیدار بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کافی دیر تک بیٹھا رہا اور اچھی طرح حضرت سے سوال وجواب کی صورت میں اپنی تسلی کرکے اٹھا کیونکہ وہ حضرت کا مزاج جانتا تھا کہ پہلے کام کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھو، پھر کرو۔ اگر کام بغیر سوچے سمجھے کیا گیا تو کام بگڑ جائے گا اور اگر خدانخواستہ کام بگڑ گیا تو حضرت خفا ہوجائیں گے، کیونکہ دارالعلوم کے معاملے میں وہ کسی کی غفلت یا لاپروائی کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ اگلے روز مزدوروں نے درسگاہ پر بنے چبوترے کو توڑنا شروع کردیا، جیسے ہی توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو بعض قدامت پسند حضرات نے حضرت مہتمم صاحب سے یہ شکایت کی کہ یہ بزرگوں کی درسگاہیں ہیں، دارالعلوم کے آثارِ قدیمہ اور بزرگوں کی نشانیاں ہیں، ان کو ایسے ہی رہنے دیا جائے۔ لیکن حضرت مہتمم صاحب نے ان شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی ویسے اس کا علم حضرت کو بھی ہوگیا تھا کہ اس طرح کی شکایت کی جارہی ہے، اس کے بعد بھی حضرت نے اپنا تعمیری پروگرام جاری رکھا اور دیکھتے دیکھتے دونوں طرف دو بڑے ہال تعمیر ہوگئے۔ تعمیری نوعیت کے حساب سے یہ کام چونکہ خاصا اہم تھا اور حضرت کی عقلمندی اور مہارت سے ہر دو جانب پُرشکوہ ہال بن کر تیار ہوگئے تو بعد میں انہی شکایت کرنے والے قدامت پسند لوگوں نے حضرت کی بہت تعریف کی اور حضرت کے اس کام کو بہت سراہا گیا۔ اس کے علاوہ بھی چونکہ دارالعلوم میں جگہ جگہ تعمیر کا کام جاری تھا، مثلاً دارالعلوم کی بالائی مسجد اور مسجد کا ایک بڑا مشرقی گیٹ، اسی سے متصل مسجد کا حوض احاطہ باغ، دفتر تعلیمات کے قریب ایک بڑی عمارت یا بڑا دفتر تعلیمات وغیرہ، جبکہ اس سے پہلے تعمیرات کا ایک بڑا مرحلہ جس میں دارِ جدید کے فوقانی حصوں میں بننے والے بڑے ہال کمرے شامل ہیں، طے ہوچکا تھا، جس پر دارالعلوم کے خزانے کا بڑا حصہ صرف ہوچکا تھا اور اب زیر تعمیر عمارتوں کے لیے

مزید پیسہ دارالعلوم کے پاس نہیں تھا اس لیے اس موقع پر حضرت کے ذہن میں ایک زبردست الجھن رہا کرتی تھی، چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ راج اور مستریوں کی ایک ٹیم بغرض ملاقات آئی۔ رسمی بات چیت کے بعد دارالعلوم کی تعمیرات سے متعلق گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت فرمانے لگے، بھائی مستری حضرات کام تو اسقدر لمبا چوڑا چھیڑ رکھا ہے اور دارالعلوم کا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ اب کیا کیا جائے، مستری حضرات کہنے لگے کہ حضرت ہم اسی پریشانی کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ کام اس قدر لمبا ہے۔ وقت بھی کم رہ گیا ہے، جگہ جگہ تعمیر کا کام چل رہا ہے۔ اب اگر پیسے کی کمی کی وجہ سے کام ایک دو روز بھی رُک گیا تو کام کی جو رفتار آپ نے بنائی تھی اس کو بہت جھٹکا لگے گا اور معمار و مزدوروں کی اتنی بڑی تعداد بکھر کر رہ جائے گی۔ اس لیے ہم نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ کچھ بھی ہو، ہم انشاء اللہ کام جاری رکھیں گے ہمیں اپنی مزدوری کی کوئی پروا نہیں ہے، خواہ وہ ہمیں ملے یا نہ ملے۔ معمار حضرات کی اس ہمدردی پر حضرت خوش ہوئے اور فرمانے لگے، میں دارالعلوم کے تئیں آپ سب لوگوں کی اس قربانی اور جذبے کی قدر کرتا ہوں اللہ آپ لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن میں آپ لوگوں سے یہ بھی عرض کروں گا کہ انشاء اللہ کام جس انداز اور جس تیز رفتاری سے چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے گا، کام رُکنے کا تو کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، البتہ یہ ضرور ہے کہ کام بہت بڑے پیمانہ پر چھیڑ دیا گیا ہے، اس لیے یہ ایک وقتی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ آپ سب حضرات مطمئن رہیں، اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں، توکل علی اللہ ہی ہمارا پیسہ ہے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ آپ حضرات اسی محنت اور اسی جانفشانی سے کام کرتے رہیں اور بھائی اس بات کی جتنی فکر ہم سب کو ہے، اس سے زیادہ تو حضرت مہتمم صاحب کو ہے۔

اس طرح معمار حضرات کی یہ مجلس تقریباً بارہ بجے تک جاری رہی اور پھر یہ سب حضرات رخصت ہو گئے۔ اس کے معاً بعد دروازے سے سلام کی آواز آئی۔ یہ حضرت کے شاگرد مولوی حفظ الرحمٰن اور مولوی شبیر احمد تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ فائلیں اور کچھ دیگر کاغذات تھے۔ انھوں نے اپنی کاپیاں اور فائلیں کھولیں اور حضرت کو پورے ہفتے کا حساب سمجھایا اور حضرت کے مختلف کاغذات پر دستخط لیے، دراصل حضرت نے بہت سے کام اپنے ان شاگردوں کے ذمے کر رکھے تھے جو حساب کتاب کے معاملے میں بہت ہوشیار تھے۔ یہ دونوں حضرات رات گئے دیر تک حضرت کے ساتھ بیٹھے کام کرتے رہے، میں نیند کے غلبے کے باوجود کسی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا، اس خیال سے کہ حضرت شاید کوئی حکم کریں، اتنے میں حضرت نے مجھ سے کہا کہ معروف تم بیٹھے کیا کر رہے ہو، بھائی بہت دیر ہو گئی ہے تم سو جاؤ۔ حضرت کے کہنے پر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا فوراً نیند آگئی۔ درمیان میں

نہ جانے کس وقت آنکھ کھلی تو دیکھا تینوں حضرات قلم لیے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں ۔

دو بڑوں کی ملاقات

صبح اُٹھ کر میں نماز کے لیے چلا گیا ۔ واپس آیا تو دیکھا کہ حضرت اسی طرح بیٹھے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں ۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے، کیا نماز ہوگئی ؟ میں نے کہا جی ۔ تو جلدی سے اُٹھے اور نماز کے لیے چھتہ مسجد چلے گئے کہ وہاں قدرے تاخیر سے جماعت ہوتی ہے ۔ ان کے جانے کے بعد ابھی میں نے تلاوت شروع ہی کی تھی کہ دروازے کی سمت سے کسی کے سلام کرنے کی آواز آئی، تو مجھے کچھ عجیب سا لگا ۔ ایسا لگا جیسے کہ یہ آواز قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی ہے، میں دروازہ کھول کر باہر آیا دیکھا تو واقعی حضرت مہتمم صاحب ہی تھے ۔ میرے منھ سے فوراً نکلا حضرت تشریف لائیے ۔ میں نے پورا دروازہ کھول دیا ۔ حضرت اندر آئے ۔ میں نے تشریف رکھنے کے لیے کہا تو حضرت مہتمم صاحب فرمانے لگے، حضرت مولانا تشریف نہیں رکھتے ؟ میں نے کہا جی ! وہ ابھی آپ کے آنے سے ذرا پہلے مسجد چھتہ میں نماز کے لیے گئے ہیں ۔ حضرت مہتمم صاحب دوزانو ہو کر بیٹھ گئے ۔ میں نے کہا، حضرت یہاں تشریف رکھیں (میری مراد اس گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے سے تھی) لیکن حضرت مہتمم صاحب اسی طرح بیٹھے رہے اور تسبیح پڑھتے رہے ۔ میں بھی دوزانو ہو کر حضرت مہتمم صاحب سے ذرا فاصلے پر پیچھے کی جانب بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب اتنی صبح صبح اور تن تنہا مولانا کے کمرہ پر تشریف لائے ہوں ۔ آخر کیا بات ہو سکتی ہے مگر میری یہ مجال بھلا کب ہو سکتی تھی کہ میں کچھ لب ہلاتا اور حضرت مہتمم صاحب سے ان کی تشریف آوری کی وجہ دریافت کرتا ۔ میری منتظر نظریں دروازے پر گڑی ہوئی تھیں کہ اچانک حضرت مولانا تشریف لے آئے ۔ میں ان کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور تیزی سے حضرت کے قریب ہو کر حضرت مہتمم صاحب کے تشریف فرما ہونے کی اطلاع دی ۔ مولانا نے نسبتاً ذرا بلند آواز سے سلام کیا، حضرت مہتمم صاحب فوراً کھڑے ہوگئے ۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور حضرت مولانا نے بھی مصافحہ کے لیے فوراً اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسی طرح حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھوں کو پکڑے پکڑے گاؤ تکیہ کی سمت لے جاتے ہوئے کہا حضرت یہاں تشریف رکھیں ۔ پھر حضرت مولانا نے میری طرف دیکھا، اشارہ تھا کہ چائے بناؤ ۔ میں سمجھ گیا اور بہت جلد چائے وغیرہ تیار کر کے دسترخوان پر رکھ دی ۔ حضرت نے کچھ میٹھا نمکین کھانے کے لیے عرض کیا تو مسکرا کر فرمایا کہ آج تو آپ جو کچھ بھی کھلائیں گے ۔ میں ضرور کھاؤں گا گو کہ میرا بڑا سخت پرہیز چل رہا ہے ۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے جو گفتگو کی، وہ یہ تھی: " احقر خود ہی حاضر ہو جاتا

آپ نے تشریف لانے کی زحمت اٹھائی، کئی زینوں کی مسافت طے کرنی پڑی۔ طبیعت پر بہت زور پڑا ہوگا"
حضرت مہتمم صاحب، مولانا کی اس حساس طبیعت پر مسکرا کر فرمانے لگے "یقیناً مولانا سچ پوچھئے تو میری طبیعت پر جتنا زور پڑ رہا ہے، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اب تو راتوں کی نیند بھی غائب ہوگئی۔ آج پوری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سویا" مولانا حضرت مہتمم صاحب کے ان جملوں کو عجیب غور بھرے انداز سے سن تو ضرور رہے تھے لیکن حضرت مولانا کے چہرے کے تاثرات اور زیر لب ہلکی سی مسکراہٹ سے میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت مولانا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں خود بھی نہ سمجھ سکا کہ حضرت مہتمم صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں اور ان کا مخاطب کون ہے۔ حضرت مولانا، مہتمم صاحب کی اس مخصوص گفتگو کو جو حضرت مہتمم صاحب، اپنے مخصوص دھیمے دھیمے گل پاشی کے انداز میں فرما رہے تھے؛ بہت توجہ کے ساتھ سن رہے تھے۔ میں بھی ہمہ تن گوش بر آواز اس منظر کی طرف متوجہ تھا اور میرے ناپختہ ذہن میں یقین کی حد تک یہ خیال جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ کوئی بڑا حادثہ یا بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوگیا ہے جس کو بتلانے کی غرض سے مہتمم صاحب خلاف عادت بلا کسی اطلاع کے، حضرت مولانا کے کمرہ میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا " اور اب تو یہ کیفیت ہوگئی ہے: سفر ہو یا حضر؛ جلوت ہو یا خلوت غرضیکہ ہر وقت آپ ہی کا تصور دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مولانا مجھے پہلے آپ سے صرف تعلق تھا، لیکن اب محبت ہوگئی ہے"۔ اتنا کہتے ہی حضرت مہتمم صاحب کی آواز گلوگیر ہوگئی اور تقریباً اشکبار ہوگئے اپنے ہاتھ سے انھوں نے دستی نکالی اور چشمے کو ذرا اوپر کرکے اپنے آنسو صاف کیے۔ اس وقت حضرت مہتمم صاحب کا جو انداز تھا، وہ بالکل اسی طرح کا تھا، جس طرح نماز میں قعدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ نگاہ بالکل نیچے تھی اور سر مبارک جھکا ہوا تھا، حضرت مولانا بھی تقریباً اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مہتمم صاحب کی اس کیفیت کا جو اثر حضرت مولانا کی طبیعت پر ہوا، وہ بھی بڑا اشک تھا۔ آنکھیں نہ یہ کہ صرف اشکبار ہوئیں بلکہ سرخ ہوگئیں۔ میری آنکھوں میں تو آنسو بالکل نہیں آئے، لیکن ان دونوں حضرات کے راز و نیاز کو دیکھ کر میری طبیعت پر جو اثر تھا، اس کو میں ہی جانتا ہوں۔ کیفیات کا یہ منظر اس قدر عجیب تھا کہ میں اس کو خانۂ تصور سے نکال کر لفظوں کی صورت میں بیان نہیں کرسکتا۔ چند لمحوں کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگے کہ "میرے علم میں تو یہ بھی ہے کہ تعمیرات کی مصروفیت میں، نہ تو آپ وقت پر کھانا کھاتے ہیں اور نہ سوتے ہیں، مولانا! آپ نے تو اپنے آپ کو بالکل فنا کر رکھا ہے۔ دارالعلوم کے تئیں آپ کی یہ محنت اور لگن مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ آپ کا یہ احسان دارالعلوم پر بھی ہے اور مجھ پر بھی۔ مولانا، میں آپ کا بہت مشکور ہوں اور احسان مند بھی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے"۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ حضرت! میں تو

آپ کا خادم ہوں، میرے لیے اس سے زیادہ اور فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا اور کسی لائق سمجھا، میں تو آپ کا چھوٹا ہوں، آپ جس وقت جو حکم فرمائیں گے اس کو بجالانا اپنے لیے میں بہت بڑی سعادت سمجھوں گا۔ حضرت مہتمم صاحب نے دعائیہ انداز میں فرمایا کہ اللہ آپ کو بلند حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے۔ اس کے بعد حضرت مولانا، مہتمم صاحب سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ حضرت! مشکل یہ آن پڑی ہے کہ مالی اعتبار سے تعمیرات کا کام اس نہج پر چلتا ہوا نظر نہیں آتا اور کام کو بہرحال جاری رکھتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہونچانا ہے۔ اس سلسلے میں، میری یہ گزارش ہے کہ ہم لوگوں کو اس وقتی مشکل کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ سرکردہ مدرسین کی ایک جماعت تشکیل دی جائے جو پورے ملک کا دورہ کرے اور دارالعلوم کی تعمیرات کے لیے چندہ فراہم کرنے کے لیے نکل پڑے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ پروگرام کامیاب رہے گا اور اس طرح باقیماندہ عمارتیں جو زیر تعمیر ہیں، پایۂ تکمیل کو پہونچ جائیں گی۔ حضرت مہتمم صاحب نے جواباً فرمایا: بیشک آپ نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ اس کے علاوہ تو بظاہر اور کوئی صورت نظر بھی نہیں آتی۔ آپ اس کام کا آغاز کریں، مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ آپ کامیاب رہیں گے۔ حضرت مہتمم صاحب کی اس تصویب رائے پر حضرت مولانا بہت خوش ہوئے اور کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا، اچھا اب مجھے اجازت دیں اور اس سلسلے میں آپسی رائے اور مشورہ سے جو زیادہ بہتر ہو آپس میں طے کرلیں۔

حضرت مہتمم صاحب کو رخصت کرکے حضرت مولانا واپس آئے، تو مجھے آواز دی، میں فوراً حاضر ہوا۔ فرمانے لگے معروف، میں آج بہت خوش ہوں، حضرت مہتمم صاحب نے میرے اندر ایک عجیب ولولہ پیدا کردیا۔ انشاءاللہ اب اور زور و شور سے کام ہوگا۔ قوم ہم سے زیادہ مستعد ہے۔ ہم انشاءاللہ ملک میں سلمانوں کے پاس جائیں گے اور دارالعلوم کی موجودہ ضرورت ان سے بیان کریں گے۔ وہ ہمیں ضرور نوازیں گے۔

چندہ کے لیے اسفار

چنانچہ اس کے چند روز بعد ہی حضرت نے اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا اور اپنے بعض ہونہار شاگردوں کو ساتھ لے کر ملک کے مختلف حصوں میں تشریف لے گئے۔ دیگر اور مدرسین نے بھی اسی طرح کے اسفار کیے اور سبھی حضرات اپنے اسفار میں کامیاب رہے اور بڑی رقم کا چندہ فراہم کیا، جس سے تعمیرات کے نازک مرحلہ کو تقویت پہنچی۔ جشن صد سالہ کی تاریخیں جیسے جیسے قریب آتی چلی گئیں،

مولانا نے تعمیرات کے کام کو بھی تیز تر کر دیا، دن رات کام چلتا رہا، کام کرنے والے فنکاروں کو یہ باور کرا دیا گیا کہ کچھ بھی ہو جشنِ صد سالہ کی تاریخوں سے پہلے یہ کام اپنی تکمیل کو بہر صورت پہونچنا ہے حضرت مولانا نے اس محنتِ شاقہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، انھوں نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعمیر کے اس آخری مرحلہ پر جو کم و بیش ایک ماہ کا تھا، شاید ہی کبھی سوئے ہوں۔ اس سے پہلے وہ کھانے کے لیے کسی بھی فرصت کے وقت گھر تشریف لے جایا کرتے تھے، لیکن اس مدت میں حضرت مولانا نے گھر جانا ہی بند کر دیا تھا۔ بھوک کی شدت میں وہ بہ عجلت کمرہ میں آتے اور مجھ سے فرماتے کہ معروف جلدی سے ایک کپ چائے بناؤ اور پھر چائے پیتے ہی کمرہ سے باہر تشریف لے جاتے۔ یہ معمول ہفتوں جاری رہا، میں نے ایک روز عرض کیا کہ حضرت بغیر کچھ کھائے پیئے اپنے آپ کو اسقدر مشقت میں ڈالے رکھتے ہیں، اس طرح تو صحت خراب ہو جائے گی۔ فرمانے لگے، ارے بھائی صحت کا کیا، مصروفیت اسقدر ہے کہ اتنا بھی وقت نہیں ملتا کہ نہا دھو کر کپڑے بدل لوں، جب کپڑے میلے ہو جاتے ہیں تو ایسے ہی دوسرے کپڑے پہن لیتا ہوں، کھانے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب بھوک کی شدت میں ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے ہیں، تب دوڑا دوڑا کمرے پر آتا ہوں اور تمہیں چائے کے لیے کہتا ہوں۔ بھوک کی شدت میں کئی بار میں نے ایسا بھی محسوس کیا کہ جیسے اب دماغ میں چکر سا آگیا ہے اور میں گر جاؤں گا۔ لیکن میں ہمت سے اپنے آپ کو پھر سنبھال لیتا ہوں۔ چنانچہ چائے کے ذریعے بھوک مٹانے کا یہ طریقہ اتنا غلط ثابت ہوا کہ حضرت کی طبیعت خراب رہنے لگی، پیٹ میں درد کی شکایت کرنے لگے، ٹانگوں میں شدید درد رہنے لگا۔ پاؤں کے تلوؤں سے آگ سی نکلنے کی کیفیت رہتی تھی۔ اس کے باوجود بہت برداشت سے کام لیا کرتے تھے۔ اکثر طبیعت کی خرابی کو یونہی نظر انداز کر دیا کرتے تھے، جب کسی عارضہ کی زیادہ شدت ہوتی تو مجھے ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی کے یہاں دوا لانے کے لیے بھیجتے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے طبیعت کا حال بتا کر دوا لے آیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دوا حضرت کو بہت موافق آتی تھی۔ کبھی کبھی فرماتے کہ بھئی حکیم اسحاق کی طرح ڈاکٹر شمیم صاحب بھی میرے بڑے مخلص اور کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ آجکل اپنے مطب کی مصروفیت کی وجہ سے بدھ میں تشریف نہیں لاتے۔ جی ہاں بدھ کا یہ دن خاص دن ہوا کرتا تھا، جس میں حضرت مولانا کے کمرہ پر حکیم اسحاق صاحب اور میرے طب کے استاذ ڈاکٹر نفیس احمد صاحب اور کبھی کبھی ڈاکٹر شمیم صاحب موصوف، اپنے اپنے کھانے لے کر آجایا کرتے تھے اور میں بھی حضرت کا کھانا گھر سے لاتا تھا۔ اس طرح یہ حضرات بعد نمازِ عشاء متصلاً ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد فوراً چائے کا دور چلتا اور پھر یہ حضرات اپنی بات چیت میں لگ جاتے، مختلف موضوعات پر

تبصرے، اظہارِ خیال اور پُرلطف مذاق ہوا کرتے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے یہ محفل چلتی اور پھر یہ حضرات رخصت ہوجایا کرتے تھے۔ پورے ہفتہ میں یہی ایک دن ایسا ہوا کرتا تھا جس میں حضرتؒ عشاء کے بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا کرتے تھے اور اپنے ان دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ بھائی ہمارا تو ہفتہ بھر کے کھانے کا آج کل تقریبًا روزہ سا ہی رہتا ہے۔ بھوک جب زیادہ پریشان کرنے لگتی ہے تو چائے وغیرہ سے کام چلا لیتا ہوں۔ آپ لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر اطمینان سے کھانے کا موقع مل پاتا ہے۔ ان حضرات نے متعدد بار مولانا کے اس طرزِ عمل کے طبی نقصانات بیان کیے۔ یہ حضرات مولانا سے کہا کرتے تھے کہ آپ اپنے جسم کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کر رہے ہیں۔ مولانا مسکرا کر فرماتے کہ آپ حضرات بجا کہتے ہیں، لیکن کام کا اسقدر پھیلاؤ ہے اور اس کی ساری ذمہ داری احقر ہی کے کاندھوں پر ہے اور اب انشاءاللہ یہ کام اپنی تکمیل کو پہونچتا جا رہا ہے دن رات لوگ انتہائی محنت اور لگن سے کام کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں مجھے بھی ان لوگوں کی طرح ہر وقت مستعد اور فعال رہنا ضروری ہے۔ ذمہ داریاں اس قدر ہیں اور میں اکیلا اپنے ناتواں کاندھوں پر بفضل اللہ ان کا بوجھ اٹھائے چل رہا ہوں۔ میں کوئی عابد وزاہد بزرگ تو ہوں نہیں بلکہ بڑا گنہگار ہوں لیکن دارالعلوم کی خدمت کو عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کی خدمت ہی کو میرے لیے مغفرت کا ذریعہ بنا دے۔

تعمیرات کی تفصیل

بہرحال تعمیرات کا کام خوب تیزی کے ساتھ جاری رہا اور اپنے صحیح وقت پر پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا۔ آٹھ ماہ کی اس قلیل مدت میں "ترمیم وتزئین" کے نام پر تعمیرات کے اس ہمہ گیر کام نے لوگوں کو جس مغالطے اور اندیشے میں ڈال رکھا تھا، قلیل مدت کو دیکھتے ہوئے وہ واقعی صحیح تھا لیکن حضرت کی مسلسل محنت، جانفشانی، لگن اور ہمت کے ساتھ ساتھ دوسروں سے کام لینے کے طریقے سے سب لوگوں کے اندیشے اور مغالطے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ آج ہم لوگ دارالعلوم کو تعمیرات کے لحاظ سے جس طرح دیکھ رہے ہیں، جشن صدسالہ سے آٹھ ماہ پہلے دارالعلوم اس طرح کا نہیں تھا؛ پہلے دار جدید کے نام سے موسوم موجودہ عمارت ایسی نہیں تھی۔ بلکہ ہر بڑے ہال کمرہ کے درمیان اسی طرح کا بڑا خلا تھا، جس کو اسی کے ہمشکل ہال وکمرہ کی صورت دی گئی اور یہ تسلسل حضرت مولانا کی رہائش گاہ سے لے کر معراج گیٹ، پھر باب الظاہر پھر مدنی گیٹ سے گزرتا ہوا مولانا بہاریؒ صاحب کی رہائش گاہ تک اوپر چلا گیا۔ جو زینے ہر چہار جانب اسی بالائی عمارت سے اتارے گئے، وہ بھی پہلے نہیں تھے۔ کوئی بھی جانے والا معراج گیٹ سے

اگر اوپر کی منزل پہ جاتا، تو اس کو باب الظاہر کے بڑے زینے سے ہی اترنا پڑتا تھا اور یہی انداز قبل از تعمیر ہر گیٹ کا تھا۔ ان زینوں سے اوپر کے فاصلے کم ہوئے اور آنے جانے والوں کو سہولت ہوئی۔ باب الظاہر کا بالائی حصہ بالکل ہی کسی مصرف کا نہیں تھا اور نہ ہی اس میں کسی طرح کی رہائش ممکن تھی؛ اس پر طلبہ حضرات کی سہولت کے پیش نظر کمروں کی شکل دی گئی، دارِ جدید کے بالائی حصہ کے ہر کونہ پر جہاں صرف ایک ہی کمرہ ہوا کرتا تھا، اس پر اور مزید کمرے بنائے گئے۔ آج ہم جن پُرشکوہ گنبدوں کو دیکھ رہے ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی بُرجیاں تھیں ان کو مزید اوپر اٹھایا گیا۔ اور بالکل اوپر والے حصہ کو محراب نما چھوٹے چھوٹے دروازوں کی شکل میں کھلا رکھا گیا، جس سے اس کی زینت میں اضافہ ہوا۔ عین ان دونوں گنبدوں کے نیچے والے حصوں میں تعمیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی، دونوں طرف دو بڑے بڑے درسگاہ نما ہال بنائے گئے یہ "دارالتفسیر" کے نام سے جو بڑا گنبد "قلبِ دارالعلوم" ہے، اس پر پتھر چسپاں کیے گئے، جس سے اس میں تزئین و پختگی آگئی۔ دارالحدیث فوقانی کے شمال مشرق میں جہاں صرف دفترِ تعلیمات ایک ہال نما کمرہ کی شکل میں ہوا کرتا تھا، اس کے بالمقابل ایک اور بہت بڑی عمارت بنائی گئی، جو آج کا "دفترِ تعلیمات" ہے۔ نیز اس کے سلسلہ کو نئی عمارتوں سے جوڑ کر، مسجد کے بالائی حصہ تک ملا دیا گیا۔ صدر گیٹ میں داخل ہونے کے بعد بائیں جانب جہاں گھنٹہ آویزاں ہے؛ یہ بڑا مسلسل دروازہ نہیں تھا، اس جگہ دارالعلوم کا "دفترِ برقیات" ہوا کرتا تھا۔

آپ "دفترِ اہتمام" کا جو موجودہ خوبصورت چہرہ دیکھ رہے ہیں، پہلے یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، یہ بھی حضرت ہی کے فنِ تعمیر کا نمونہ ہے؛ جس کا نقشہ خود انھوں نے اپنے ذہن سے تعمیر کیا۔ "احاطۂ باغ" کے نام سے جو عمارت جانی جاتی ہے، اس میں آمنے سامنے یہ دو بڑے مسلسل گیٹ نہیں تھے۔ احاطۂ باغ کی اس عمارت سے کوئی راستہ مدنی گیٹ یا چمن کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کتب خانہ کا زینہ پہلے پُرانے انداز کا کھلا ہوا زینہ تھا، اس کو اندرخانہ کیا گیا اور آمنے سامنے ریلنگ بنائی گئی۔ جس سے اس تعمیر میں ایک طرح کا کھلاپن اور خوبصورتی پیدا ہوئی۔ خالی پڑی ہوئی مختلف جگہوں میں چھوٹے بڑے کمرے بنائے گئے۔ جن کی تعداد ۱۰۰ سے بھی زیادہ ہے، مسجد کی موجود تعمیر میں اضافہ ہوا، بالائی منزل نئے سرے سے باقاعدگی اور سلیقے سے بنائی گئی، اوپر کی منزل سیمنٹ سے اور نیچے کا حصہ پتھر اور چونے کی تعمیر کا ہے لیکن تزئین و ترمیم اس انداز پر کی گئی کہ پوری تعمیر ایک ہی جیسی لگتی ہے۔ مسجد کا یہ موجودہ حوض پہلے اس جگہ نہیں تھا۔ آج جہاں ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں، حوض اس سے بھی ذرا ورے تھا۔ وضو کی سہولت کے پیش نظر حوض سے زیادہ ٹونٹیوں کے نظام کو اہمیت دی گئی جن کی تعداد کو پہلے سے کئی گنا بڑھا کر سابقہ حوض کی جگہ لگوایا گیا۔ دارالعلوم کی مسجد کا کوئی پُرشکوہ دروازہ نہ تھا اور نہ ہی مسجد کا چہرہ عام سڑک سے دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پیش نظر

یہ بڑا اور پرشکوہ دروازہ بنایا گیا۔ یہ دروازہ سڑک کی تنگی اور زیادہ آمد و رفت کی وجہ سے مصلحتاً بند ہے پہلے اس جگہ ڈاک خانہ ہوا کرتا تھا۔

اب آپ موجودہ دارالعلوم کا ماضی کی نگاہ سے موازنہ کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ دارالعلوم کی وہ کون سی جگہ ہے جہاں "تزئین و ترمیم" کے عنوان سے تعمیر کا سلسلہ نہ چھیڑا گیا ہو، وہ کون سی ایسی جگہ ہے جہاں حضرت نے دارالعلوم سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار نہ کیا ہو۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر انھوں نے حتی الامکان کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جس میں طلبہ کی رہائش ہو، ان کی تعلیم کے لیے درسگاہیں اور انھیں سے متعلق دیگر اور ضروری عمارتیں نہ بنائی ہوں۔ اندرونِ دارالعلوم آج جن راستوں پر آپ چل پھر رہے ہیں، یہ سبھی راستے کچے اور محض ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے تھے۔ دارالعلوم کا موجودہ سبزہ زار چمن اور اس میں پختہ مختلف راستے اور اس کی چمن بندی کا نقشہ، یہ سب حضرت ہی کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔

دارالعلوم کی مختلف گذرگاہوں پر جو لکڑی کے کتبے عربی اور اردو زبان میں، ہدایتوں کے انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سب حضرت کے جدت پسند ذہن کا ایک نمونہ ہے۔ دارالعلوم کی تمام تر تزئین و ترمیم میں جو چیز حضرت نے اپنے پیشِ نظر رکھی، وہ یہ تھی کہ قدیم تعمیرات کے ساتھ جدید تعمیرات کو کو اس طرح ضم کر دیا جائے کہ جس سے جدت کا دامن قدامت سے باہم مربوط رہے۔

دوسری چیز جس کو حضرت، تعمیرات کی تکمیل کے بعد فرمایا کرتے تھے، یہ تھی کہ پہلے کوئی بھی ایسا بڑا راستہ جس میں کوئی گاڑی یا کار وغیرہ پاس ہو کر پورے دارالعلوم میں گھوم سکے، نہیں تھا۔ اب الحمد للہ ایسا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی دارالعلوم کو دیکھنا چاہے، تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا بیٹھا گھوم پھر کر دیکھ سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ اندرونِ دارالعلوم آپ کے کاندھوں پر تعمیرات کی اتنی عظیم ذمہ داری تھی، جس کو آپ بحسن و خوبی نباہ لے گئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جشنِ صد سالہ کی دوسری اہم ذمہ داریاں بھی آپ کے سر تھیں۔ جلسے گاہ کے اسٹیج سے لے کر پنڈال، پانی کا نظام، ضروری کیمپوں کا قیام اور ان کا جائے وقوع اور علمی نمائش وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب گو کہ عارضی ہی سہی، لیکن اہم ذمہ داریاں تھیں۔ اس وقت کوئی بھی ضرورت پیش آتی تو ہر شخص کی زبان پر حضرت مولانا کا نام ہوتا اور ان کی تلاش شروع ہو جاتی۔ غرضیکہ اندرونِ دارالعلوم اور بیرونِ دارالعلوم ایک ہی شخصیت رہتی تھی، جو پارہ کی طرح کبھی اس طرف تو کبھی اس طرف، کبھی یہاں تو کبھی وہاں دارالعلوم کے سبھی کاموں میں سرگرداں نظر آتی تھی۔ ذہانت کا یہ عالم کہ کسی بھی فنکار نے آپ کو ڈھونڈ کر جہاں بھی پالیا اور اپنے کام کی الجھن بیان کی تو اسے وہیں کھڑے کھڑے سمجھا دیا کہ ایسے نہیں، ایسے کرو۔ تیز رفتاری کا یہ عالم تھا

کہ ساتھ چلنے والے کو اپنی طبعی رفتار سے تیز گام ہونا پڑتا تھا، تب کہیں جاکر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تھا۔
بہر حال جیسے ہی تعمیرات کا یہ کام مکمل ہوا اور جشنِ صد سالہ کی بھی تیاریاں ہوگئیں تو وہ ساعتِ مسعود بھی آپہونچی۔
اسٹیج کے فرائض حضرت ہی کے ذمے تھے۔ جلسہ کا پہلا ہی دن تھا اور حضرت اپنی تیاریوں میں مصروف تھے، کہ اچانک ایک زبردست دورہ پڑا، ایک کپکپی جسم پر طاری ہوئی اور وہ چلتے چلتے گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔ خرابیٔ طبیعت کی یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضرت کے کمرے پر ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔
ڈاکٹروں کو بلایا گیا، مشورہ یہ ہوا کہ ان کو دہلی لے جایا جائے۔ چنانچہ بعجلت تمام حضرت کو دہلی لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے مختلف ٹسٹ کیے۔ پتہ چلا کہ پیشاب میں شکر بہت بڑھ گئی ہے، حالات بیان کیے گئے تو ڈاکٹر حضرات نے شب و روز کی مسلسل محنت اور کم خوابی کو اس کی وجہ قرار دیا۔ بہر حال علاج کیا گیا اور حضرت کئی روز تک ہسپتال میں داخل رہے اور رُو بہ صحت ہونے لگے اور ادھر جشن صد سالہ کہ یہ بارات بغیر "دولہا" کے چڑھ گئی، سبھی لوگوں کو اس کا بہت دُکھ ہوا کہ جشنِ صد سالہ میں حضرت شریک نہ ہوسکے لیکن اس جشنِ سہ روزہ میں جگہ جگہ ہر چھوٹے بڑے موقع پر آپ کی اس کمی کو واضح طور پر محسوس کیا گیا۔

بقیہ : مردم ساز شخصیت ....

کا کمال تھا کہ تھوڑی ہی مدت میں رنگ میخانہ بدل گیا۔ آج دارالعلوم کے فیض یافتوں میں جہاں کہیں عربی تکلم و انشاء کا چرچا ہے وہ سب انہیں کا بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض ہے۔
مولانا تعلیم و تربیت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے۔ تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا کام کر ڈالنا ان کے لیے معمولی بات تھی، انتظام کے ہر شعبے پر ان کی گرفت یکساں ہوتی۔ جن دنوں وہ دارالعلوم کے معاون مہتمم تھے وہاں کا ہر شعبہ حسنِ انتظام کا آئینہ دار تھا۔
مولانا کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہے، لکھنے والے کی نگاہ قاصر ہے قلم کوتاہ ہے۔ مولانا سے کچھ لوگ ناراض بھی رہے مگر مولانا اپنی دُھن کے پکے تھے، جس کو صحیح سمجھا برملا اسے کہا اور صرف کہا نہیں اسی راہ پر خود کو ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے۔ بشری خطاؤں اور غلطیوں سے درگذر فرمائے۔ آمین

مولانا عبد العلی فاروقی
ایڈیٹر ماہنامہ "البدر" لکھنؤ

عربی زبان و ادب کا بے لوث خادم

۱۶ر اپریل ۱۹۹۵ء کو دن میں ڈھائی بجے جب اچانک یہ اطلاع ملی کہ عربی زبان و ادب کے ممتاز و منفرد خدمت گذار حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کا ۶۵ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تو بیساختہ زبان پر کلمۂ ترجیع اور ایک جھٹکے کے ساتھ یادوں کے محفوظ خزانے کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

اکہرے بدن، متوسط مائل بہ درازی قامت، کتابی چہرہ اور مسکراتے لبوں والے وہ مولانا وحید الزماں یاد آئے جن کا نام تو سن رکھا تھا مگر پہلے پہل دیدار ۱۹۶۷ء میں اس وقت ہوا تھا جب راقم الحروف ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور بار بار یہاں وہاں ایک بے داغ سفید کھدر پوش کو آتے جاتے دیکھ کر اس کے بارے میں دریافت کیا تو بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں۔ دارالعلوم میں داخل ہونے سے کچھ ہی پہلے مولانا وحید الزماں صاحب کا تحریر کردہ کتابچہ "عصر جدید کا دینی پہلو" مطالعہ سے گذر چکا تھا اس لئے "بے نام جذبہ" کے تحت انہیں دیکھتے ہی دل مچلا کہ "کوندے" کی طرح بار بار لپکنے والے اس "مرجع الانسان" سے ملاقات کروں اور اس کی باتیں سنوں ـــــ اب یہ تو یاد نہیں کہ مولانا مرحوم سے باقاعدہ پہلی ملاقات اور گفتگو کا شرف کب حاصل ہوا؟ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ مہینوں بعد اس کی نوبت آسکی تھی کیوں کہ وہ دارالعلوم کے ایک مؤقر و محبوب استاذ تھے اور میں ایک ایسا کم عمر، نو وارد اور معمولی طالب علم جس کا کوئی سبق بھی مولانا کے پاس نہیں تھا ـــــ پھر قیام دارالعلوم کی ۲ سالہ مدت میں مولانا مرحوم سے ملاقات نہیں، ملاقاتیں ہوئیں ان کے سجے سجائے اور نفاست کے آئینہ دار چھوٹے سے دفتر "دعوۃ الحق" میں بھی، ان کی درسگاہ میں بھی اور چلتے پھرتے دارالعلوم کی روشوں، برآمدوں اور چمن میں بھی۔ ان کو مسکراتے بھی دیکھا اور تیوریوں پر بل ڈالے غصہ کرتے بھی، سبق پڑھاتے بھی دیکھا اور لکھتے پڑھتے بھی، معزز مہمانوں کا استقبال کرتے بھی دیکھا اور ان کے سامنے برجستہ اور پُرجوش طور پر عربی میں تقریریں کرتے بھی۔ "النادی الادبی" کے پروگراموں کی سرپرستی کرتے بھی دیکھا اور اس کے پروگراموں کی "ریہرسل" کراتے بھی ـــــ لیکن یہ سب کچھ "حذا دب"،

میں رہتے ہوئے ایک خاص فاصلے سے دیکھا، کیونکہ میں نہ مولانا کا خصوصی شاگرد تھا، نہ معتمد، نہ "النادی الادبی" کا رکن اور نہ ہی کسی ایسے امتیاز کا حامل کہ مولانا کی کوئی خصوصی توجہ اپنی طرف مبذول کرا پاتا، تاہم یاد آرہا ہے کہ ایک دو مرتبہ نہیں، نہ جانے کتنی مرتبہ یہ تمنا ہوئی کہ میں بھی ان کی طرح برجستہ عربی لکھ پڑھ سکتا، میری بھی عربی تقریر دل کی سلاست و روانی کو دیکھ کر عرب علماء جھوم جھوم اٹھتے۔ میں بھی ان کی طرح "سراپا حرکت" بن جاتا، میں بھی ان کے سے اعتماد بھرے لہجہ میں گفتگو پر قادر ہو جاتا، اور میں بھی ان کی طرح اُجلے اُجلے سفید بے داغ کپڑے پہن کر بجتا ہوا دکھائی پڑتا۔ یادوں کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب مولانا وحید الزماں کیرانوی کا شمار ضابطہ کے لحاظ سے بڑے اساتذہ میں نہیں تھا بلکہ وہ دارالعلوم کے "طبقۂ وسطیٰ" کے استاذ اور اپنے مخصوص اندازِ فکر اور ذہنی و مزاجی کیفیات کی وجہ سے انتظامیہ اور انتظامی معاملات سے بالکل الگ ہونے کے باوجود عربی زبان پر "امتیازی قدرت" دارالعلوم کے عربی ترجمان "دعوۃ الحق" کے مدیر اور جدید عربی ادب کے اکلوتے استاذ ہونے کی وجہ سے ایک خاص امتیاز، ایک خاص محبوبیت اور ایک خاص مرجعیت کے حامل تھے۔

دارالعلوم کے دورِ طالب علمی میں مولانا سے کوئی خصوصی قرب تو حاصل نہیں ہوا لیکن "خاندانی نسبتوں" کے سہارے دیگر متعدد اساتذہ کی طرح مولانا مرحوم بھی عام طلبہ کی بہ نسبت راقم الحروف پر کچھ نہ کچھ توجہ زیادہ ضرور فرماتے تھے، اس التفات و توجہ میں اس "دعوتِ شیراز" کا بھی بہت کچھ دخل تھا جو ہر منگل کی شام کو شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کی قیام گاہ پر ہوا کرتی تھی اور جس میں حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ، حضرت مولانا انظر شاہ صاحب اور دوسرے کئی بڑے استاذوں کے ساتھ ہی حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ بھی پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے چونکہ حضرت شیخؒ کا قیام مدنی منزل کے ایک حصہ میں تھا اور اسی سے بالکل متصل اس وقت کے "دار الشفاء" نامی چند شکستہ حال کمروں میں سے ایک کمرہ میں میرا بھی رہنا سہنا تھا اور اس بہانے حضرت شیخؒ کی خدمت میں تقریباً روزانہ ہی حاضری کی سعادت حاصل ہو جاتی تھی اس لیے کم از کم ہفتہ میں ایک بار تو مولانا مرحوم کی باقاعدہ زیارت ہو جاتی اور اکثر وہ شرفِ تخاطب بھی بخشتے، مضامین نگاری اور ان کی اشاعت کا چسکا اسی وقت لگ گیا تھا۔ دہلی کے "ہدیٰ"، "ہدف" اور "نرالی دنیا"، کانپور کے "نظام" اور کراچی کے "البلاغ" میں کچھ ہلکے پھلکے اور عام دینی نوعیت کے مضامین شائع ہو جاتے، دو ایک مضامین رسالہ "دارالعلوم" میں بھی اس کے اس وقت کے مدیر مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی ہمت افزائیوں اور تقاضوں کے طفیل شائع ہوئے۔ کبھی کسی شائع شدہ مضمون پر مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کی نظر پڑ جاتی تو اگلی ملاقات میں وہ اس کا ذکر کرتے، ہمت افزائی کرتے اور چلتے پھرتے مضمون نگاری کے کچھ اصول و قاعدے بھی بتا دیتے ——— پھر جب دارالعلوم کے دورِ طالب علمی ہی میں میری پہلی کتاب "ہمارے اسلاف" شائع ہوئی تو اسے دیکھ کر بلکہ پڑھ کر

مولانا نے ہمت افزائی سے آگے بڑھ کر تحسین و تعریف کی، لکھتے رہنے پر زور بھی دیا اور اس کے فوائد بھی بتائے نیز رہنمائی کی خاطر اپنے لکھنے کے انداز کو بھی تفصیل کے ساتھ بتایا ـــــــ اب اسے میں کیونکر فراموش کر سکتا ہوں کہ دارالعلوم کے اساتذہ میں سے تنہا مولانا وحیدالزماں صاحب تھے جنہوں نے میری اس "طالب علمانہ کاوش" کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی جبکہ کتاب تو میں نے ان کے علاوہ اور بھی کئی اساتذہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

خورد نوازی

اکابر دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں مجھے اپنے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آرہی ہے کہ

"ان حضرات کی خورد نوازی، عالی ظرفی اور حوصلہ افزائی کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں تو اپنے خوردوں کی تربیتی نقطۂ نظر سے "خورد" ہی بنائے رکھتے ہیں لیکن اس دور کے ختم ہونے کے بعد یہ ایسے تواضع و انکسار اور ایسی چاہت و اپنائیت سے ٹوٹ کر ملتے ہیں گویا ان کے کل کے "اصاغر" آج ان کے "اکابر" ہوگئے ہیں"۔

اور اس کی مثال خود والد ماجدؒ ہی کے سلسلے میں میرے سامنے یوں آئی کہ جب وہ اپنی مادر علمی کے رئیس الاہتمام حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے ملاقات کے لیے "دفتر اہتمام" گئے تو انھیں دیکھتے ہی حضرت مہتمم صاحب کھڑے ہوگئے، معانقہ کیا اور پھر باصرار اپنے قریب ہی قالین پر ان کو بٹھایا ـــــــ حالانکہ وہ والد ماجدؒ کے دور طالب علمی میں بھی دارالعلوم کے مہتمم اور بہر اعتبار ان کے "اکابر" میں سے تھے۔

دارالعلوم کی رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اپنے جن بڑوں کی "اس بڑائی" کا ذاتی طور پر مجھے تجربہ ہوا ان میں ایک نام مولانا وحیدالزماں کیرانوی مرحوم کا بھی ہے۔ ۲۵ برس کے اس عرصہ میں دیوبند اور دیوبند کے باہر مولانا سے خوب خوب ملاقاتیں ہوئیں اور مولانا مرحوم کی طرف سے اکابر دارالعلوم کی "روایتی خورد نوازی" کے خوب خوب مظاہرے بھی ہوئے، یہ الگ بات ہے کہ فضل خداوندی میرے شامل حال رہا اور اپنی کوتاہ قامتی کے ادراک و احساس نے "حقیقی و واقعی حدیں" پھلانگنے نہیں دیں۔

امتیازی کمال

یوں تو مولانا مرحوم کی مدرس، خطیب، مصنف، صحافی اور منتظم ہر حیثیت سے ایک پہچان ہے لیکن ان کی اپنی امتیازی شان عربی تقریر و تحریر میں جلوہ گر ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ایسے

ممتاز، یکتا اور با فیض فرزند تھے جن پر جتنا بھی ناز کیا جاتا کم تھا ———— ان کی فیض رسانی کو سمجھنے کیلئے بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حلقۂ دارالعلوم دیوبند کے جو افراد بھی آج عربی خطابت یا تحریر میں کسی مقام کے حامل ہیں وہ سب براہ راست یا بالواسطہ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ہی کے فیض یافتہ ہیں وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ پھر حلقۂ دارالعلوم دیوبند سے باہر نکل کر بھی دیکھا جائے تو مولانا کے مرتب کردہ لغت "اَلْقَامُوْسُ الْجَدِیْد" اور "اَلْقَامُوْسُ الْاِصْطِلَاحِی" سے عربی زبان وادب کا ذوق رکھنے والے کتنے افراد مستغنی نظر آئیں گے؟ اساتذہ ہوں یا طلبہ، نجی لائبریریاں ہوں یا عربی مدارس کے کتب خانے ان کی اکثریت بلکہ غالب اکثریت کو ان لغات کی ضرورت واہمیت کا پورا پورا احساس اور یقین ہے۔

اسی طرح مولانا کے مرتب کردہ "القراءۃ الواضحۃ" نامی عربی ریڈر کے سیٹ کی اہمیت وافادیت بھی مسلم ہے اور یہ کتاب بہت سے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

عربی خطابت

جہاں تک مولانا مرحوم کی عربی تقریر وخطابت کا معاملہ ہے تو اس کی مثالیں تو کئی سامنے آئیں لیکن زمانۂ طالب علمی کی ایک مثال تو ناقابلِ فراموش ہے۔

مملکت مصر اور مملکت شام کے سفراء دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے لیے آنے والے تھے، ان کے استقبال کی ساری تیاریوں کا بوجھ مولانا کے سر تھا۔ ایک ایک چیز پر مولانا کی نگاہ تھی اور مجموعی طور پر فکر یہ تھی کہ مہمان اچھا تاثر لے کر واپس جائیں۔

بالآخر مہمانوں کا ورودِ مسعود ہوا۔ مولانا کی تربیت یافتہ طلبہ کی ٹیم نے عرب مہمانوں کا عربی نعروں ہی سے استقبال کیا اور پھر دارالحدیث (تحتانی) کے وسیع ہال میں بعد نماز عشاء استقبالیہ جلسہ شروع ہوا۔ مہمانوں کی رعایت سے جلسہ کی کارروائی مولانا کے ایک معتمد طالب علم عربی میں ہی چلا رہے تھے، عام "طالبعلمانہ مزاج" کے مطابق دورانِ جلسہ بعض طلبہ آنا جانا اور اٹھک بیٹھک لگائے ہوئے تھے۔ مولانا کی ہدایت پر ایک دو مرتبہ ناظم نے طلبہ کو اس سے روکا بھی مگر طالب علم کے لیے طالب علم کی بات، بس بات ہی تھی کوئی حکم تو نہ تھا۔ اور پھر جب یہ سب گڑبڑ مولانا کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ پورے جاہ وجلال کے ساتھ کھڑے ہو کر طلبہ کو پھٹکارنے لگے۔ تمتمایا چہرہ، تھرتھراتے لب اور شعلے برساتے الفاظ ———— یہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ "عالم وارفتگی" میں ادا ہونے والے وہ پرجوش عربی الفاظ تھے، جن پر وہاں موجود دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ تو "گوش برآواز" تھے ہی، عرب مہمان بھی "تصویر حیرت" بنے اس "جوار بھاٹے"

اور پھر لہجہ کی پختگی، الفاظ کے زیر و بم، طرزِ ادا کی بے ساختگی ـــــــ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور تکلم پر کامل قدرت سے مغلوب بلکہ مبہوت ہوکر ایک جھٹکے کے ساتھ ایک معزز عربی مہمان اور سفیرِ شام کھڑے ہو گئے اور مولانا وحید الزماں کو لپٹا کر ان کی پیشانی چوم لی اور اپنے دلی جذبات کا جن الفاظ میں اظہار کیا۔ اس کا خلاصہ یہی تھا کہ :

"مجھے اَب دارالعلوم کے بارے میں اور کیا دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے جبکہ یہاں استاذ وحید الزماں جیسے قادر الکلام، عربی متکلم اور خطیب موجود ہیں جن کی قدرتِ بیان پر مجھے بھی رشک آرہا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ مولانا وحید الزماں مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ان نامور اور ممتاز فرزندوں میں سے تھے جن کے مثل افراد روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی امتیازی صلاحیتوں کا اعتراف ان کی زندگی میں ہوا اور اب اس فانی دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان کی کمی کا احساس بار بار ہوگا۔

اپنے حصہ کا کام کر کے وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، یہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں، یہی اس دنیا میں ہوتا ہے اور یہی ہوتا رہے گا لیکن آرزوؤں، حسرتوں، امیدوں اور تمناؤں کی اس آماجگاہ میں اپنے جن خوردوں اور خوشہ چینوں کو چھوڑ کر گئے ہیں وہ یہی کہنے پر مجبور ہیں ؎

منزلوں کے سہارے گئے　　　جو بڑے تھے ہمارے گئے

بقیہ : ایسا کہاں سے لاؤں کہ .....

میں باتیں ہوتیں۔ ریاض کے پہلے سفر میں مجھے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ چنانچہ میں نے ساتھیوں اور مولانا کے شاگردوں کے بڑے مجمع میں ان سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنی آپ بیتی مرتب فرمائیں تاکہ آپ کے تجربات ہمارے لیے اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لیے مشعلِ راہ بنے رہیں، جس کی مولانا نے ہامی بھر لی تھی۔ میں نے اپنے طور پر اس کی طباعت و اشاعت کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا رضاکارانہ اعلان بھی کر دیا تھا۔ مولانا نے براہِ راست خط کے ذریعہ اور ریاض کے دوسرے سفر و قیام کے دوران بھی فرمایا تھا کہ لغت کی ترتیب و تالیف کے ساتھ سوانح پر بھی کام شروع کر دیا ہے۔ لغت تو شاید مکمل ہو گئی تھی مگر یادداشتیں اور سوانح حیات اپنے ہاتھ سے مکمل کرانے کی میری خواہش پوری نہ ہو سکی! اللہ کی یہی مرضی تھی جس کے سبب مولانا عمید الزماں صاحب اور مولانا فرید الزماں صاحب نے مولانا کی سوانح حیات کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا عزم کیا ہے اس کے لیے مولانا مرحوم کے ایک عزیز رفیق کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا کرے یہ کام جلد مکمل ہو جائے تاکہ میں اپنے ایفائے عہد کے فریضہ سے سبکدوش ہو کر اپنے ضمیر اور مولانا کی روح کو خوش کر سکوں۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی

ہر دلعزیز استاد

میں جس سال دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، اسی سال مجھے استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ سے پڑھنے اور مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا اگرچہ اُس وقت کے اکابر اساتذہ میں نہ تھے۔ اس لیے کہ اُس وقت اُن کے اساتذہ بلکہ اساتذہ کے بھی اساتذہ موجود تھے۔ اس وقت حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مرادآبادیؒ، حضرت مولانا عبدالجلیل صاحبؒ اور حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ وغیرہم، صفِ اوّل کے اساتذہ تھے۔ دوسری صف کے اساتذہ میں مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب، مولانا سیّد اختر حسین صاحب، مولانا محمد حسین صاحب بہاری وغیرہم تھے۔ مولانا شریف الحسن صاحب اسی سال دارالعلوم تشریف لائے تھے۔ یہ سب حضرات مولانا وحید الزماں صاحب سے عمر اور علمی مقام میں بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن پھر بھی مولانا مرحوم اپنے حسنِ اخلاق، علمی کمالات اور طلبار کے ساتھ شفقت و محبّت کی وجہ سے طلبار میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ مولانا اگرچہ ادب عربی کے استاد تھے جو اُس وقت ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب تھا اور طلبار کا ایک محدود طبقہ ہی ادب کے درجات سے وابستہ اور متعلق تھا، لیکن مولانا کی محبوبیت و مقبولیت اور ہر دلعزیزی عام تھی۔

مولانا عام طور پر صاف ستھرے اور سفید پوش رہتے تھے۔ اپنی رفتار و گفتار میں بہت نستعلیق معلوم ہوتے تھے۔ بہت تیز چلتے اور نگاہ ہمیشہ نیچی رکھتے۔ طلبار سے گفتگو میں بہت معیاری زبان بولتے، اپنے شاگردوں کو آپ، جناب سے ہی خطاب کرتے، ان کی عزت نفس کا بہت خیال کرتے، ان کے ذہن و دماغ اور کردار سازی کی ہمہ وقت فکر رکھتے اور کوشش کرتے۔ خود ہمہ وقت پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے، اپنے وقت کی بہت قدر کرتے اور طلبار کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

• مدیر ماہنامہ الفرقان۔ لکھنؤ

دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ ادب عربی صرف انھیں کی ذات کا نام تھا۔ دن بھر درس وتدریس کی مشغولیت کے باوجود مغرب اور عشاء کے بعد بھی اُن طلباء کو پڑھاتے جو اپنی دوسری تعلیمی مشغولیتوں کی وجہ سے دن میں مولانا سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جدید عربی ادب کا کوئی نصاب پہلے سے تیار نہ تھا۔ مولانا رات کو آئندہ دن کے لیے مختلف درجات کے مطابق عربی اسباق خود تیار کرتے، یا عرب ممالک میں رائج ابتدائی اور ثانوی درجات کی کتابوں سے انتخاب کرتے۔ پھر جب چند اسباق تیار ہو جاتے تو مولانا انھیں کتاب کے ایک دو فارم کی شکل میں چھپوا لیتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے دارالعلوم دیوبند سے دعوۃ الحق نامی ایک عربی رسالہ کا اجراء بھی کیا تھا، جس کے تمام تر کام مولانا خود ہی کرتے تھے، غالباً کتابت بھی خود ہی فرماتے تھے۔ مولانا عزم مصمم، جہد مسلسل، اور سعی پیہم کا پیکر تھے۔ کوئی کام بھی اُن کے نزدیک مشکل کام نہ تھا، جس کام کا ارادہ کر لیتے اسے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ عربی زبان وقلم پر یکساں قدرت تھی۔ فصیح وبلیغ عربی بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ تقریر کی زبان اور انداز دونوں ہی عربوں جیسا ہوتا تھا، اگرچہ اس وقت تک مولانا کسی عرب ملک نہیں جا سکے تھے۔ جیسی محنت خود کرتے تھے، اُن کی خواہش ہوتی کہ سب لوگ اسی طرح محنت کریں۔ کسی کی کاہلی اور سستی قطعاً برداشت نہ تھی اس لیے کبھی کبھی مولانا کو بعض دوسرے حضرات سے شکایت بھی ہو جاتی تھی۔

اس خالص علمی مزاج اور علمی مشغولیت کے باوجود مولانا میں غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ ہر کام بہت ہی سلیقہ سے کرتے، اُن کا رہائشی کمرہ اور ان کی درس گاہ، اُن کے اس ذوق کی علامت تھے۔ شعبۂ عربی ادب کی طرف سے ہونے والے جلسے مولانا کے حسنِ انتظام اور سلیقہ مندی کی وجہ سے دارالعلوم کے دوسرے جلسوں کے مقابلہ میں بہت ممتاز اور نمایاں معلوم ہوا کرتے تھے، انھیں انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے مولانا کچھ دنوں معاون مہتمم بھی رہے۔ لیکن قدرت نے زیادہ دنوں تک اس کام کا موقع نہیں دیا۔

مولانا کی تنہا ذات نے حلقہ دارالعلوم دیوبند میں خاصی تعداد میں عربی زبان وادب سے واقف اور اس کے اچھے مدرس اور مصنف تیار کر دیئے۔

بقیہ : مولانا وحید الزماں سے انٹرویو

جواب :۔ جی نہیں۔ انسان کی فطرت ہے جب اُسے کسی کے خلوص ومحبت کا یقین کامل ہو جاتا ہے تو اس کی کڑوی باتوں کو شہد سمجھ کر پیتا ہے۔ اور ناصح کی نصیحت اگر خلوص ومحبت سے خالی ہو یا خود ناصح کے کردار میں کوئی جھول ہو تو اس کی نصیحت میں کوئی وزن نہیں رہتا۔

مولانا عبد العظیم ندوی

دارالعلوم کا بے لوث اور بیباک خادم

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے حد درجہ جری، بے لوث اور بے باک خادم تھے۔ دارالعلوم کے نظم و نسق، اساتذہ، طلباء، اس کے شعبہ جات حتیٰ کہ در و دیوار سے والہانہ تعلق رکھتے اور اس تعلق کو اپنے لیے سرمایۂ حیات اور نجاتِ اخروی کا باعث گردانتے تھے۔ جس کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے اندر معمولی بدانتظامی اور کوتاہی پر بیتاب ہوجاتے، اصلاح کی کوشش کرتے، غفلت اور کوتاہی کے شکار عملہ کی گوشمالی کر کے ان کے اندر کام کی لگن، ہمت، تیز رفتاری اور خود اعتمادی کا صور پھونکتے، تعطل اور جمود ختم کرنے کی تلقین کرتے، بڑوں کے سامنے عاجزانہ اور چھوٹوں کے سامنے آمرانہ حق بات کہتے۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا دورِ اہتمام تاریخ دارالعلوم کا زریں باب شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی آخری دہائیوں میں جب دارالعلوم کی ہمہ گیر و عالمگیر شہرت اور درجنوں شعبوں میں درخواستوں و فائلوں کے انبار اور کام کے زبردست پھیلاؤ کی وجہ سے دارالعلوم کا میدان بڑا وسیع ہوگیا تو بیک وقت سارے شعبوں پر نگاہ، اس کی بے پناہ ضرورتوں اور خامیوں پر گرفت کا کمزور پڑ جانا فطری اور قدرتی امر تھا۔ اس زمانہ میں کیرانہ کا یہی مردِ مجاہد تھا، جس کو قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ درست عمل کی نشاندہی کرتا، برملا تنقید کرتا، ایسی تنقید جو جذبۂ اخلاص اور محبت سے لبریز ہوتی۔ حق بات پوری قوت کے ساتھ رکھتا، خامیوں پر گرفت کرتا، ایسی گرفت جس میں طریقۂ اصلاح کا راز پنہاں ہوتا۔ غرضیکہ ایسے نازک موقع پر روایاتِ دارالعلوم کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، اسلاف اور بانیانِ دارالعلوم کے زریں اصول کو اسوہ بنانے کی پُرزور وکالت کرنا، نظر انداز کرنے اور خاموش بیٹھ جانے کو بدترین جرم سمجھتا۔

مدیر ماہنامہ ریاض الجنۃ، جونپور

جب اختلافات کی خلیج بہت بڑھ گئی اور نوبت بایں جارسید کہ دارالعلوم کے دفاتر شعبہ جات درسگاہوں اور صدر دروازہ پر آہنی تالے لگا کر پولیس کی مدد سے طلبار کو علی الرغم باہر نکال دیا گیا اور طلبار در بدر کی ٹھوکر کھانے پر مجبور ہوئے ۔ تاریخ کے اس سیاہ دور اور نازک موقع پر سب سے بڑی ڈھارس مولانا وحیدالزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تھی ۔ متفقہ طور پر کیمپ کی سربراہی اور اس کے نظم ونسق کا ذمہ دار مولانا ہی کو بنایا گیا ۔ مولانا نے اپنی خداداد صلاحیت کی بنار پر چند دنوں میں بے سروسامانی کی حالت میں کئی سو طالب علموں، اساتذہ اور کارکنان کے قیام وطعام، تعلیم وتربیت، درس وتدریس کا مکمل نظم کر دیا۔ جس سے پژمردہ چہرے کھل گئے اور قدرے سکون کی فضار قائم ہوئی ۔ اسی دوران مجلس شوریٰ کے محترم اراکین نے کیمپ پہنچ کر بہ چشم خود معائنہ کے بعد اظہار اطمینان فرمایا ۔ پھر خدا خدا کر کے احاطہ دارالعلوم میں طلبار، اساتذہ داخل ہوئے ۔ دارالعلوم میں انقلاب کی اس مہم کے کارپردازوں میں مولانا کی حیثیت سالار کی تھی ۔ دارالعلوم میں بہت جلد علمی بہار لانے اور درس و تدریس کی فضار قائم کرنے میں مولانا کی نمایاں حیثیت تھی ۔

طلبار کی اصلاح اور تعلیم وتربیت میں مولانا کو بڑی مہارت تھی ۔ اپنے مخصوص انداز اور شیریں بیانی سے بہت جلد طلبار کو فریفتہ کر لیتے تھے ۔ مطالعہ کی سچی لگن، کتاب سے تعلق، زبان وقلم کی صلاحیت پیدا کر دینے میں مولانا ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ معمولی استعداد والے طالب علم کی بھی اتنی ہمت افزائی کرتے کہ اس کے اندر بھی خود اعتمادی کا جذبہ ابھر جاتا ۔ طلبار کو ایک حد تک تقریر وتحریر کی آزادی دے کر، ان پر کنٹرول رکھنا مولانا کا ممتاز وصف تھا ۔ بہت زیادہ دبا کر، جذبات کو کچل کر اور ان کی زباں بندی کے فارمولے پر عمل کر کے یہ سمجھنا کہ مکمل کنٹرول ہے، مولانا کے نزدیک یہ محض خام خیالی اور بیجا تشدد تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کی رائے کے خلاف زور دے کر مولانا مرحوم نے جمعیۃ الطلبہ بنوائی، بعد میں گوناگوں فوائد اور بہتر نتائج کے پیش نظر ہر ایک نے تائید کی ۔ آخر میں مجلس شوریٰ نے منظوری دے کر قانونی شکل دے دی ۔

عربی زبان وادب مولانا کا محبوب ترین مشغلہ تھا ۔ دارالعلوم میں مولانا کی تقرری عربی ادب اور اس کی نشرواشاعت کے لیے ہوئی تھی ۔ مولانا اس میں کھرے اور کامیاب اترے ۔ تکمیل ادب کو مستقل شعبہ کی حیثیت دے کر اس کے نصاب تیار کرائے اور طلبار کو پورے ذوق وشوق کے ساتھ عربی ادب میں لگایا، نیز طلبار کے اندر عربی ادب سے خاص لگاؤ پیدا کرنے کے لیے "النادی الادبی" قائم کی ۔ جس کے تحت عربی زبان کی مشق وتمرین اور مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے ہر ہفتہ تقریر کرواتے، عربی میں مقالے لکھواتے، خود عربی بولتے اور تکمیل ادب کے طلبار سے عربی ہی میں گفتگو کرتے ۔ مولانا کی دلی تمنا تھی کہ عربی زبان وادب کو ہمارے عربی مدارس میں زندہ زبان اور مادری زبان کا مقام دیا جائے ۔ الداعی، الکفاح، دعوۃ الحق عربی پرچوں کا اجرار یا ان کی نشرواشاعت کی تحسین وترقی

مولانا کی مرہونِ منت ہے ۔ ورنہ اس سے پہلے تک فضلائے دارالعلوم اور اس کے مؤقر اساتذہ و منتظمین کو شدید احساس تھا کہ عربی زبان وادب ندوۃ العلماء کا قدرتی حصّہ ہے لیکن مولانا کیرانوی نے اپنی محنت، صلاحیت، قوتِ بیان اور زورِ قلم سے ثابت کردکھایا کہ عربی زبان وادب پر کسی کی اجارہ داری نہیں، بلکہ جانفشانی، قربانی، سچی لگن اور ذوقِ خاص کے ذریعہ اس پر قابو پایا جاسکتا ہے اور اسی نظریہ کے تحت مولانا نے طلباء تیار کیے اور عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے تعلیم دے کر لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا۔ چنانچہ آج سیکڑوں فضلائے دارالعلوم عرب ملکوں میں ممتاز خدمات انجام دے کر دارالعلوم دیوبند کا نام روشن کررہے ہیں۔ اس طرح مولانا کا تیس سالہ دورِ تدریس کامیاب ترین دور گزرا ہے اور بجا طور پر فضلاء کی طرف سے ہزار بار خراجِ تحسین کے مستحق ہیں ۔

طلباء کے مسائل سے دلچسپی اور تدریسی لیاقت کے پیشِ نظر مجلسِ تعلیمی کی نظامت سپرد کی گئی۔ مولانا مرحوم کا بڑا وصف انتظامی و تعمیراتی صلاحیت کا تھا۔ جشنِ صدسالہ کے موقع پر دارالعلوم کی کہنہ عمارتوں کی زیبائش اور مناسب ترمیم کا ذمہ دار بنایا گیا، مولانا نے بڑی سلیقہ مندی اور حسن وخوبی کے ساتھ اس پیچیدہ کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مہمان خانہ کی اس طرح توسیع کی کہ موجودہ جگہ میں تقریباً دوگنا وسعت پیدا ہوگئی۔ دفترِ اہتمام میں آنے جانے کے لیے صدر گیٹ کے سامنے ہی زینے بنوائے جس سے کافی سہولت فراہم ہوگئی۔ اس انتظامی صلاحیت کو دیکھ کر ہی اراکینِ شوریٰ نے مولانا مرحوم کو مددگار مہتمم کے منصب جلیل پر فائز کیا۔ جس کے نتیجے میں دفتری نظام میں بڑی حد تک اصلاحات ہوئیں تعلیمات اور اہتمام سے متعلقہ تمام کارروائیوں میں تیزی کے ساتھ استحکام پیدا ہوا۔ طلباء، اساتذہ، ملازمین کے علاوہ آنے جانے والے مہمانان حضرات بھی تعریف کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان دنوں مولانا کے اندر جوش، ولولہ اتنا تھا کہ شب وروز ایک کیے ہوئے تھے حتیٰ کہ ایک دفعہ دارالعلوم کے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غایتِ شفقت کے ساتھ ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ "اتنی محنت نہ کیجئے۔ دارالعلوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے"۔ اسی طرح اراکینِ شوریٰ بھی تحریری اور زبانی طور پر اس منصبِ جدید کو سنبھالنے کے بعد مولانا کی حسنِ کارکردگی کو مختلف انداز میں سراہتے رہے۔ انہی دنوں جامعہ طبیہ کا معائنہ کرتے ہوئے جناب حکیم انعام اللہ صاحب نے فرمایا "کاش! یہ انتظامی خدمت آپ کے سپرد پہلے ہی کردی جاتی"۔ نیز حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے فرمایا کہ "ماشاء اللہ حقیقت یہ ہے کہ اتنا بہتر کام ہوجائے گا اس کی توقع نہیں تھی"۔ اسی طرح دوسرے اراکین بھی وقتاً فوقتاً مولانا مرحوم کی خدمات کو سراہتے رہے۔ افسوس کہ تھوڑے ہی دنوں بعد (رمضان ۱۴۱۰ھ مطابق اپریل ۱۹۹۰ء میں) مولانا مرحوم دارالعلوم کی جملہ خدمات سے سبکدوش کردیے گئے۔

مولانا تقریباً بیس سال تک جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے۔ اس سے علاحدگی کے بعد جب ۱۹۸۸ء میں ملی جمعیۃ علماء، قائم ہوئی تو مولانا اس کے صدر بنائے گئے۔ اکابر و اسلاف اور بانیانِ دارالعلوم کی خدمات کی توسیع کے پیشِ نظر مولانا مرحوم نے دارالمؤلفین کے نام سے اشاعتی مرکز بھی قائم کیا تھا۔ جس سے مختلف موضوع پر بڑی مفید کتابیں طبع ہوکر منظرِ عام پر آتی رہیں۔ مولانا مرحوم خود بھی کامیاب مصنف اور صاحبِ قلم تھے۔ خاص طور پر مولانا کی القاموس الجدید اور القاموس الاصطلاحی مدارس اور اہلِ علم میں بہت ہی مقبول ہوئی جو انشاء اللہ بارگاہِ خداوندی میں مقبولیت کی علامت بنے گی۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا وحید الزماںؒ سے ایک انٹرویو

مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ کے دیرینہ رفیق اور ہم سبق پروفیسر بدرالدین الحافظ سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی نے جولائی ۱۹۷۴ء (رجب ۱۳۹۴ھ) میں منعقد النادی الادبی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے بعد طلباء کی سلیقہ مندی وعمدہ کارکردگی سے متاثر ہوکر اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال ایک کتابچہ کی شکل میں قلمبند فرمایا تھا۔ اس موقع پر پروفیسر صاحب موصوف نے مولانا مرحوم سے ایک انٹرویو بھی کیا تھا اور مولاناؒ کے جوابات کا مفہوم اپنے الفاظ میں مرتب کردیا تھا۔ اس انٹرویو کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین ہیں

(ادارہ)

سوال:۔ مولانا! میں آپ سے چند تعلیمی سوالات کرنا چاہتا ہوں امید ہے کہ آپ جواب عنایت فرمائیں گے۔ میں آپ کے سالانہ جلسے سے متاثر ہوا ہوں کیوں کہ میں نے اس سے قبل بہت سے کالجوں اور اسکولوں کے سالانہ جلسے دیکھے ہیں، مجھے قطعاً اس کی توقع نہیں تھی کہ دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء بھی اتنا اچھا انتظام کرسکتے ہیں انہوں نے ایسے بے مثال ڈسپلن کے ساتھ پروگرام پیش کرنے کی صلاحیت کیسے پیدا کی۔

جواب:۔ طلباء میں انتظامی صلاحیت کا پیدا ہوجانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ آپ جانتے ہیں قدرت نے ہر انسان میں کچھ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ مگر کوئی اس سے خالی نہیں۔

ایک استاد کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کی انھیں پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کردے اور احساس دلادے کہ تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔

ان دینی مدارس کے طلباء کا قصور صرف یہ ہے کہ یہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں کیا حقائق ہیں، ان میں کمتری کا احساس کیوں رہتا ہے اس کی داستان طویل ہے۔ کیا قوم کی اکثریت نے اس طبقہ کو ہمیشہ قعر مذلت کا ایک ٹھیکرا جان کر ناقابل اعتناء نہیں سمجھا؟

ہر اس انسان کو ذلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا جس نے عربی مدرسہ کی راہ اختیار کی۔ ہر اس فرد کو

بیوقوفی کا مجسمہ قرار دیا گیا جس نے کرتے پائجامے داڑھی کو اپنا شعار بنایا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے خیالات کس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں مگر قابل غور ضرور ہیں۔ بات بڑھ گئی میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ عربی مدارس کے طلباء اسی طرح ہاتھ پیر، دل ودماغ اور غور وفکر کی صلاحیت رکھتے ہیں جس طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء مگر ان کو ان کی صلاحیتوں کا احساس دلانے کی ضرورت ہے۔

اگرچہ ان لوگوں کو ناکارہ مٹی کا ڈھیر سمجھا جاتا ہے مگر اس ڈھیر میں بڑے بڑے لعل وگہر پوشیدہ ہیں۔ ان میں جواہرات اور نگینے پنہاں ہیں ـــــ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ......اس مٹی کو گوندھ کر ذرا کام میں تو لاؤ پھر دیکھو کیسے کیسے پتلے تیار ہوتے ہیں

سوال :۔ مولانا ! میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کے طلباء میں عربی تقریر وتحریر کی صلاحیت کیسے پیدا ہوئی ؟ آخر عربی مدارس میں تو برسہا برس سے تعلیم ہوتی آرہی ہے مگر بولنے لکھنے کی صلاحیت شاید ہی کہیں کسی میں پیدا ہوئی ہو جبکہ یہاں سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ عربی کا ماحول نہیں اور گفتگو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے ماحول نہایت ضروری ہے۔

جواب :ـــ جی ہاں آپ کا فرمانا صحیح ہے۔ عربی تقریر وتحریر کے لیے ماحول بہت ضروری ہے مگر محترم ماحول خود نہیں بنتا، بنایا جاتا ہے کہ اس کے لیے ابتدا میں کوشش اور محنت کرنی پڑتی ہے پھر ماحول خود دعوت دیتا ہے کہ مجھ سے فائدہ اٹھاؤ۔

ماحول بنانے کے لیے میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں بختگی سے عمل کرتا ہوں مثلاً میں ادب کی تمام کتابیں چاہے مقامات ہو یا متنبی، حماسہ ہو یا سبعہ معلقہ سب عربی میں پڑھاتا ہوں۔ مشکل الفاظ کی تشریح اشعار کے مفہوم کی وضاحت سب عربی میں کرتا ہوں، پھر یہ نہیں کہ میں خود عربی کی دھواں دھار تقریر کرکے فارغ ہو جاؤں، طلباء کو کچھ آئے یا نہ آئے بلکہ خود طلباء سے اشعار کی تشریح وتوضیح عربی میں کراتا ہوں، زبانی سنتا ہوں، کاپی پر لکھواتا ہوں، ابتدا میں ہر کام مشکل ہوتا ہے مگر جوں جوں الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے مشکل حل ہوتی جاتی ہے، صلاحیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

درجہ میں اس کا التزام ہے کہ کوئی طالب علم اردو میں نہ بولے، خارج اوقات میں روزمرہ کی زبان بھی عربی ہو، شام کو طلباء ٹہلنے جائیں تو عربی میں بات کریں۔

جدید عربی ادب کی کتاب کا جو سبق جس دن پڑھا جائے اس کی نئی تعبیرات اور اصطلاحات لکھ کر ذہن نشین کرلی جائیں، پھر ان اصطلاحات کو گفتگو میں استعمال کیا جائے۔ جب ایک سبق پر اتنا کام ہوگا تو یقیناً وہ محفوظ ہو جائے گا۔

شروع میں ہر نئے طالب علم کو اس طریقۂ تعلیم میں دشواری ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ وہ اس میں مزہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ میں عربی سیکھ رہا ہوں تو خود بخود شوق بڑھتا جاتا ہے۔
طلباء کی حوصلہ افزائی اور مشق کے لیے ہم نے قلمی اخبارات کا طریقہ نکالا ہے، جس طالب علم میں جتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کے مطابق وہ مضمون لکھتا ہے، اس مضمون کو قلمی اخبار میں شائع کیا جاتا ہے، طالب علم اپنے کام کی قدر دیکھ کر مزید کام کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جن طلباء کی صلاحیت پختہ ہو جاتی ہے ان کے مضامین دارالعلوم کے رسالہ "دعوۃ الحق" اور جمعیۃ کے عربی ترجمان "الکفاح" میں شائع کیے جاتے ہیں۔
اس کے علاوہ ہمارے یہاں النادی الادبی قائم ہے اس کے زیر انتظام جمعرات کو طلبہ عربی میں تقریریں کرتے ہیں۔ ماہانہ بڑا جلسہ ہوتا ہے اس میں منتخب طلباء سے تقریریں کرائی جاتی ہیں۔ النادی کے کتب خانوں کے ذریعہ اس شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم نے یہاں عربی کا ماحول بنایا ہے۔
سوال :۔ مولانا میں نے یہاں رہ کر آپ کے طلباء کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ ان میں آداب زندگی نمایاں نظر آتے ہیں۔ آپ کے شاگردوں کے لباس، وضع قطع، پابندی درس، میل ملاقات اور رہن سہن میں ایک طریقہ ہے۔ بعض طلباء کے کمروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ لوگ کمرہ کی ہر چیز کو سلیقہ سے رکھتے ہیں، برتن ایک جگہ قاعدہ سے رکھے ہیں، کتابوں کی ایک جگہ مقرر ہے، کوئی چیز کمرہ میں بے تکی اور بے جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ سلیقہ مندی ان میں کیسے پیدا ہوئی
جواب :۔ میں سمجھتا ہوں کہ استاذ کا کام صرف تدریس ہی نہیں ہے بلکہ طلباء کی تربیت بھی ہے۔ اس لیے میں اپنے طلباء کو دوران سبق اور چلتے پھرتے زندگی کے آداب کی طرف توجہ دلاتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ تمہارے پاس علم کی کمی نہیں، تم نے آداب زندگی، سچائی، دیانتداری، صفائی، ایثار و محبت کے فضائل پڑھے ہیں بس ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔
تدین اس کا نام نہیں کہ آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر جاہلوں کی زندگی گذارے، نہ اسے اپنے کپڑوں کا ہوش ہو نہ رہنے کی جگہ کا، داڑھی کے بال الجھے ہوں، کپڑے گندے رہیں۔ آخر ایک دیندار آدمی کو یہ باتیں کیسے زیب دے سکتی ہیں جس کو دنیا کے سامنے خیر امت کا نمونہ پیش کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔
سوال : مولانا کیا آپ طلباء کی تعلیم و تربیت میں سختی سے بھی کام لیتے ہیں۔
جواب :۔ جی ہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے ڈانٹ ڈپٹ بھی کرنی پڑتی ہے برا بھلا بھی کہتا ہوں طلباء کے اچھے کاموں کی تعریف بھی کرتا ہوں۔
سوال :۔ کیا آپ کے طلباء سختی سے ناراض نہیں ہوتے وہ اپنی توہین نہیں سمجھتے ؟۔

(بقیہ صـ ۲۳۸ پر)

اعترافِ عظمت

مولانا محمد عبداللہ مغیثی

میرے دیرینہ رفیق

رفیق محترم مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ صاف دل، صاحب کردار، عالم باعمل، خوش اخلاق، خوش گفتار اور ملنسار انسان تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا طرۂ امتیاز تھا، خودداری تو غالباً ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ عربی زبان وادب سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ ایک طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے بہترین اور مقبول ترین مدرس رہے۔ اپنی غیر معمولی تدریسی و تربیتی صلاحیتوں کے ذریعہ انھوں نے ہزاروں فرزندانِ قاسمی کو زبان بھی دی اور قلم بھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کو کامیابی کے اس بلند مقام پر پہونچا دیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

مولانا مرحوم نے طلبائے دارالعلوم میں تحقیق و جستجو کا جذبہ بیدار کرکے ان میں یقین و اعتماد کی ایک ایسی لہر دوڑادی کہ سینکڑوں طلبا نے ان کے زیرِ تربیت پرورش پاکر عرب و عجم میں اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا اور دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور نیک نامی میں چار چاند لگادیئے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی مولانا نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے، ان کی تصانیف بہت سی جامعات اور مدارس میں داخل نصاب اور مقبول عام ہیں ان کی لغت القاموس الجدید کی تعریف و توصیف میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔

مولانا مرحوم کے اندر غضب کی انتظامی صلاحیتیں بھی موجود تھیں، انہی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو دارالعلوم دیوبند کا مددگار مہتمم بنایا گیا۔ اپنے دورِ اہتمام میں انھوں نے انتظامیہ کو اتنا منظم، مربوط اور فعال بنادیا تھا کہ چھوٹا بڑا ہر فرد اپنے کارِ مفوضہ میں ایک منٹ بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ تساہل اور بے توجہی سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا، علاوہ ازیں مرحوم کو فنِ تعمیر و تزئین سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ اس فن میں ان کی مہارت کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی سند یافتہ اور پیشہ ور انجینئر ہیں۔ صدسالہ اجلاس کے موقعہ پر دارالعلوم

• مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ، میرٹھ

کی عمارتوں کی جدید کاری انھوں نے جس سلیقہ سے کی وہ ان کی مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیت بھی مسلم تھی۔ ان کی دور اندیشی، خود اعتمادی اور معتدل رائے ان کے رفقاء اور ہم عصروں میں بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ احرار پارٹی ہو یا جمعیۃ علماء ہند، ملی جمعیۃ کی صدارت ہو، یا مرکزی جمعیۃ کا کردار، ان تحریکات اور تنظیموں میں ان کی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور بصیرت مندی کا میں ذاتی طور پر مشاہد اور گواہ ہوں۔

۴۰ سالہ رفاقت

زمانۂ طالب علمی ہی سے میری اور مولانا مرحوم کی رفاقت رہی ہے۔ چالیس سالہ دورِ رفاقت میں نہ کبھی اختلاف ہوا اور نہ کبھی جھول آیا۔ اس طویل مدت کے دوران مولانا کو ہر کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ نہ وہ حب جاہ کے مریض تھے اور نہ ہی مال و دولت کے حریص۔ خود غرضی اور چاپلوسی سے کوسوں دور تھے۔ حق گوئی اور سچائی کے علمبردار ہونے کی وجہ سے ہر کس و ناکس سے ان کا نباہ نہیں ہوتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام ناسازگار حالات کے سبب ذہنی کرب اور بے چینی میں گزرے لیکن کبھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ آخری وقت تک شجاعت و دلیری اور جرأت مندی ان کی پیشانی سے جھلکتی رہی۔

آخری ملاقات

دلی کے پنت اسپتال میں جب میں عیادت کے لئے حاضر ہوا تو مولانا کا ضعف اور نقاہت اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ بغیر سہارے کے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ سلام و دعا کے بعد مولانا کے مزاج اور طبیعت کے مطابق میں نے کہا "ارے یار! اب چارپائی پر ہی لیٹے رہو گے؟" یہ سننا تھا کہ مولانا ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور پھر کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ قریب بیٹھے ہوئے ان کے فرزند مولوی صدر الزماں سلمہٗ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ مولانا! آخر آپ نے ایسی کون سی دوا دیدی ہے کہ والد صاحب اتنے ہشاش بشاش نظر آنے لگے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اب کوئی تکلیف ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس پر مولانا مرحوم اپنے بیٹے سے فرمانے لگے کہ "صدر الزماں تمہیں کیا معلوم کہ مولانا عبداللہ صاحب کے آنے سے مجھے کتنی قوت اور فرحت ملی ہے، مولانا کے آنے سے مجھے جو سکون اور سرورِ قلب حاصل ہوا ہے، وہ ڈاکٹر کے علاج سے نہیں ہوا۔"

میں جب تک مولاناؒ کے پاس بیٹھا رہا، وہ حالِ دل سناتے رہے اور میں سنتا رہا۔ یہ میری مولاناؒ سے

بس آخری ملاقات تھی۔ افسوس کہ اس کے بعد مولاناؒ ہمارے درمیان زیادہ نہ رہ سکے۔
دورانِ مرض مولانا کے بھائیوں، اعزہ و اقارب اور شاگردوں نے جو تیارداری کی وہ بھی قابلِ رشک ہے، علاج معالجہ میں کسی طرح کی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور مولانا کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔

مقبولیت

جس طرح دارالعلوم دیوبند کے فرزند اولیں اور جہادِ حریت کے سالار قافلہ حضرت شیخ الہندؒ کے جنازہ نے دہلی سے دیوبند تک شیدائیوں اور عقیدت مندوں کے درمیان سفر آخرت طے فرمایا تھا۔ اسی طرح مولانا وحید الزماں صاحبؒ نے بھی اپنے امیر کارواں کی یاد تازہ کر دی۔ مولانا کا جنازہ اسی طرح دہلی سے دیوبند لایا گیا اور ہزاروں شیدائیوں، شاگردوں، عقیدت مندوں اور محبین و مخلصین نے احاطۂ مولسری میں نودرہ کے سامنے مولانا کی نمازِ جنازہ ادا کی۔

میں اس وقت پہنچا جب مولاناؒ کی نمازِ جنازہ تیار تھی۔ میرے ایک عزیز شاگرد مولوی رئیس الحسن فاروقی کی محنت سے شاید میں نے ہی آخری دیدار کیا تھا، اور پھر مولانا نعمت اللہ مدظلہ، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، بعد ازاں ہزاروں کی تعداد میں موجود عقیدت مند مولانا کے جنازہ کو کاندھا دیتے ہوئے ان کے علمی آباء و اجداد کی آخری آرام گاہ قبرستان قاسمی میں ان کے بڑوں کے سپرد کر آئے اور وہ چراغ جس نے اپنے علم وفضل کی روشنی سے ایک عالم کو روشن کیا ہمیشہ کے لئے گل ہو کر ہم سے جدا ہو گیا۔
حق تعالیٰ مرحوم کے اعزہ اور شاگردوں کو ان کے مشن کو زندہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا اسیر ادروی

چند یادیں اور چند باتیں

ایک بزرگ کشیدہ قامت، دبلے پتلے، رنگ صاف، روشن چہرہ، سر اور داڑھی کے بال ایک دم سفید، صاف شفاف سفید لباس میں ملبوس ایک کمرے میں تن تنہا بیٹھے ہوئے ہیں ان کی چاروں سمت عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل بکھرے ہوئے ہیں، ان کے ایک ہاتھ میں اسٹیل کی ایک چھوٹی سی قینچی ہے، سامنے ڈیسک پر ایک عربی رسالہ کھلا ہوا ہے اور انتہائی انہماک سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ دورانِ مطالعہ کبھی کبھی وہ قینچی سے رسالہ میں سے آدھی انچ کی ایک چٹ کاٹ لیتے ہیں؛ ان کی داہنی جانب لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس ہے اس پر عربی کے حروف تہجی لکھے ہوئے ہیں۔ ان حروف کے نیچے ایک انچ کا لمبا سوراخ ہے، وہ چٹ کسی سوراخ میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح وہ تمام رسالوں اور اخباروں پر عمل جراحی یکے بعد دیگرے کررہے ہیں۔ برسوں سے ان کا یہ غیر دلچسپ مشغلہ جاری ہے۔

یہ بزرگ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تکمیل ادب کے استاذ جدید عربی ادب اور عربی صحافت کے امام مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں جو جدید عربی لغت کی تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں لیکن اس تصنیف کا آغاز قلم کے بجائے قینچی سے کیا جارہا ہے۔

کوئی بھی اہم منصوبہ اور شاندار کارنامہ جنون کی حدوں تک پہونچی ہوئی جد وجہد کے بغیر وجود میں نہیں آتا، دنیا کی دلچسپیوں سے صرف نظر کرکے مکمل یکسوئی اور انہماک ہی کامیابی کی کلید ہوتی ہے، قیس ریگستان میں ریت پر انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے اور سر دھن رہا ہے۔ لوگوں نے اس کو دیوانہ کہا چھیڑنے کے لیے پوچھا اس کڑی دھوپ میں فضول کام کررہے ہو ——؟

گفت عشق نام لیلیٰ می کنم

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، وارانسی

کمالِ عشق کے لیے دیوانگی ضروری ہے کچھ ایسا ہی منظر مولانا کیرانوی کے انہماک کا ہے۔ برہا برس کی شبانہ روز کی جاں گسل جدّوجہد کے بعد جدید عربی کی تین لغتیں مرتب کیں جو ہندوستان اور پاکستان میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی لغتیں ہیں، آج یہ لغتیں تمام مدارس اسلامیہ اور جدید علوم کی یونیورسٹیوں کے شعبۂ عربی کی لائبریریوں میں موجود ہیں ان کے بغیر جدید عربی صحافت کے میدان میں کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا، رہنما کے بغیر سفر کیسے ممکن ہے؟

ہندوستان میں جدید عربی ادب وصحافت کی اشاعت کا صرف ایک ہی مرکز تھا اور دارالعلوم دیوبند جس کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کی عظیم خدمات کی وجہ سے ازہر ہند کہا جاتا ہے اس کا جدید عربی ادب و صحافت کی نشر واشاعت میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں تھا۔ مولانا کیرانوی نے اس کمی کو محسوس کیا اور جب وہ دارالعلوم آئے تو انھوں نے جدید عربی ادب وصحافت کی ترویج کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنالیا۔ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں آپ نے ایک کتاب تین حصوں میں "القراۃ الواضحۃ" کے نام سے لکھی لیکن قدیم طرز تدریس سے وہ غیر مطمئن تھے اس لیے انھوں نے ان تینوں حصوں کی الگ الگ "دلیل" بھی لکھ کر شائع کی تاکہ اساتذہ اسی انداز پر اس کتاب کو پڑھائیں۔ آج موصوف کی یہ کتاب اکثر مدارس اسلامیہ اور کئی یونیورسٹیوں کے شعبۂ عربی کے نصاب میں شامل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

مولانا کیرانوی قدرت کی عطاکردہ حیرتناک صلاحیتوں کا ایک دلنواز پیکر تھے، نیت کے سچے، دُھن کے پکے، جدّوجہد ان کا مزاج، اخلاص ان کا جوہر ذاتی دماغ اولوالعزمانہ منصوبوں اور اسکیموں کا خزانہ، اپنی ہر اسکیم اور ہر منصوبہ میں انتہا پسند، آغاز وانجام میں ان کے نزدیک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رہتا تھا، جس کام کا آغاز کرتے پوری دھوم دھام سے کرتے اور انجام تک پہونچ جانے کا حوصلہ رکھتے۔ عملی جدّوجہد کا کوئی بھی خاکہ بناتے تو اس میں رنگ بھرنے میں پے در پے ناکامیاں بھی ان کا حوصلہ پست نہیں کرسکتی تھیں، اُن کو نچلا بیٹھنا آتا ہی نہیں تھا وہ ایک سیماب صفت انسان تھے، انھیں جب احاطۂ دارالعلوم میں باریابی کا موقعہ ملا تو پہلے ہی مرحلہ پر انھوں نے سوچا کہ جدید عربی صحافت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ دارالعلوم کے طلبہ کی اس سے محرومی ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئی۔ انھوں نے عزم بالجزم کرلیا کہ وہ اس سمت میں طلبۂ دارالعلوم کی مکمل رہنمائی کرکے ان کو منزل تک پہونچا کر رہیں گے اور انھوں نے کام کا آغاز کردیا، اس منصوبہ میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں تھا وہ تن تنہا اس مہم کو سر کرنے کے لیے چل پڑے اس مرحلہ پر ان کی سیمابی فطرت کا مظاہرہ بار بار ہوتا رہا، انھوں نے پرانے طریقۂ تدریس کو بدل دیا جس میں سارا بار استاد پر ہوتا

ہے۔ انھوں نے طلبہ کی اصولی رہنمائی کرنے کے بعد سارا بار طلبہ پر ڈال دیا، وہ اپنے ذہن سے سوچیں، غور و فکر کی عادت ڈالیں، اپنی فطری ذہانت سے پورا پورا کام لیں اور قدرتی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، الفاظ کو ذہن نشین کریں، عربی تعبیرات کو حافظہ میں محفوظ کریں، ادب کے ابتدائی درجات کے طلبہ میں ایک کو سائل اور دوسرے کو مجیب مقرر کرکے درس میں کھڑا کردیتے کہ وہ سبق کے سارے الفاظ اور ساری تعبیرات کو برجستہ زبانی سوال و جواب میں ظاہر کریں، منتہی طلبہ کو عنوان دیدیا کہ اس عنوان پر لکھ کر لائیں، ان کا وقت مقرر کردیا جوں ہی وقت مقررہ ختم ہوگیا، کاپیاں ان کے ہاتھوں سے لے لی گئیں اگر کسی نے صرف ایک دو سطر لکھ کر چھوڑ دیا ہے، لاپرواہی کا ثبوت دیا ہے تو ان کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہوجاتا اور اس برہمی کی حالت میں جب اس کو عربی لب و لہجہ میں لتاڑتے تو یہ منظر قابل دید ہوتا، ایک تیز و تند آبشار کی طرح الفاظ ان کی زبان سے نکلتے اور اتنی روانی سے بولتے جیسے منہ زور سیلاب رواں دواں ہے۔ اس وقت جدید عربی میں مہارت اور عربی تعبیرات پر ان کی وسیع نگاہ اور مکمل واقفیت کا پتہ چلتا تھا، یہ ان طلبہ کے ساتھ رویہ تھا جنھوں نے اپنے ذہن پر زور نہیں ڈالا، سہل نگاری سے کام لیا اور جن طلبہ نے پورا مضمون لکھ دیا ہے، ان کی کاپیاں جانچتے ہوئے توصیفی کلمات ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کہتے جاتے، اچھا لکھا ہے لیکن یہ جملہ بدل دو تو عبارت خوبصورت ہوجائے گی، تعریف کرتے جاتے، الفاظ، جملے اور سطر کی سطر کٹتی جاتی، کوئی سطر ایسی نہیں بچتی جو نوک قلم سے مجروح نہ ہوئی ہو لیکن طالب علم کی توصیف و تحسین کا سلسلہ بھی جاری ہے تاکہ حوصلہ بلند رہے، وہ جانتے تھے کہ بیجا سختی اور حوصلہ شکنی انسانی صلاحیتوں کے ابھرنے کی راہ میں کبھی کبھی سنگ گراں بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انتہائی انہماک میں طلبہ پسینہ پسینہ ہوجاتے مگر تعمیل حکم میں غور و فکر کا کوئی پہلو سہل انگاری سے کام لے کر چھوڑتے نہیں تھے اور اپنی فطری ذہانت اور قدرتی صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم میں خود اعتمادی پیدا ہوجاتی تھی، غلطیاں تو عمر کے تقاضے کے زیر اثر ہوتی ہی ہیں لیکن ان غلطیوں پر ان کو ندامت اور شرمندگی نہیں ہوتی تھی، بس اتنا ہوتا کہ وہ سمجھتے کہ ذرا غور و فکر سے کام لیا ہوتا تو یہ غلطی سرزد نہ ہوتی اور مستقبل میں اور بھی غور و فکر سے کام لینے کا ان میں جذبہ پیدا ہوتا۔

اس لگن، محنت اور دل کی تڑپ کے ساتھ وہ طلبہ کو سکھاتے اور پڑھاتے ان کی عتاب آمیز شفقت طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی تھی، ان کے طرز تعلیم و تدریس نے جادو کا کام کیا اور حیرتناک نتائج برآمد ہوئے، جس کو دنیا نے دیکھا۔ ان کے طرز تدریس کی مکمل افادیت کا ظہور اس وقت ہوا جب تکمیل ادب کا کورس پورا ہونے کے بعد ایک پوری ٹیم سامنے آئی جو جدید عربی

صحافت کے میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے لگی۔

یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا اس مدت میں مولانا کیرانوی کے شاگردوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے ہندوستان اور پاکستان میں اپنے استاد کا نام روشن کیا اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت میں چار چاند لگا دیئے آج وہ عربی اخبارات و مجلات کے مدیر ہیں، کالم نگار ہیں، عربی کے بہترین نثر لکھتے ہیں۔ فی البدیہہ تقریریں کرتے ہیں، اپنی مادری زبان اردو سے بھی کہیں زیادہ روانی کے ساتھ وہ عربی میں مضامین لکھتے ہیں۔ مولانا کیرانوی کے تلامذہ آج ملک اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں جو اپنے استاذ کے ساتھ اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی سرخروئی کا باعث اور اس کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔

مولانا کیرانوی سیماب صفت انسان تھے، جدوجہد، تگ و دو ان کے خمیر میں شامل تھی۔ وہ جس طرف رخ کرتے تھے تو پورے عزم و ارادہ اور اپنی فطری توانائیوں کے ساتھ کرتے تھے، پھر اس کام کے لیے اپنا پورا وجود وقف کردیتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں انقلاب کے بعد نئے نظام میں اربابِ مجلسِ شوریٰ نے ان کو معاون مہتمم بنادیا۔ انھوں نے نہ اس کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور نہ اس کے طالب تھے۔ یہ دارالعلوم کا عبوری دور تھا۔ پورے نظام پر کنٹرول کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ تھا، اربابِ شوریٰ کی نگاہ میں اس کام کے لیے مولانا کیرانوی سے زیادہ موزوں کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی؛ ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر ان کو یہ عہدہ سونپ دیا گیا، اب ان کی ساری توانائیاں اسی محاذ پر صرف ہونے لگیں اور شب و روز نئے نظام کو مستحکم بنانے میں وہ مصروف ہوگئے اور اپنی ساری توانائیاں اس محاذ پر لگادیں۔

دارالعلوم کی کئی قدیم عمارتیں اٹل اور بے جوڑ سی لگتی تھیں، بلا وجہ گلیارا، اوپر جانے والے زینے غیر موزوں، چھتیں نیچی اونچی ان باتوں سے عمارت کا حسن مجروح ہوتا تھا اور کئی طرح کی زحمتیں تھیں، مولانا کیرانوی نے سب سے پہلے یہ پلان بنایا کہ ان عمارتوں میں جزوی تبدیلیاں کردی جائیں تو یہ عمارتیں مناسب، موزوں اور دیدہ زیب ہوجائیں گی، اسی طرح دارالاساتذہ کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی لیکن عملاً منصوبہ بند طریقے سے یہ کام نہیں ہوا، یہ ساری پلاننگ کرنے کے بعد مسئلہ سرمایہ کا پیدا ہوا۔ انھوں نے پہلے ہی مرحلہ پر یہ فیصلہ کرلیا کہ دارالعلوم کے بجٹ پر اس کا بار نہیں ڈالا جائے گا اس لیے انھوں نے ملک کے دورے کرنے شروع کردیئے، مختلف مقامات کے سفر کیے، ہر جگہ کامیابی ان کے قدم چومتی رہی اور ہر سفر سے واپسی کے بعد وہ اتنا سرمایہ لے کر دارالعلوم واپس ہوتے تھے کہ تعمیری سلسلہ رکنے نہ پائے، اس دھن میں انھوں نے اپنی کمزور صحت اور بیماری کو بھی پس پشت ڈال

دیا، سارا نقشہ خود ان کا بنایا ہوا، ساری ترمیمات ان کے ذہن کی سوچی ہوئی، اس کے اخراجات کا بھی اندازہ انھیں کو تھا اس لیے اتنے سرمایہ کی فراہمی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی۔ اس تمام تگ و دو نے چند مہینوں میں ایسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا کہ ہر وارد و صادر حیرت زدہ رہ گیا۔ قدیم عمارتوں میں تمام پیوندکاریوں کے باوجود کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ قدیم عمارت میں کہیں پیوندکاری کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس تمام عمارتوں کے تناسب اور موزونیت میں ایک نئے طرح کا حسن پیدا ہوگیا۔ دارالعلوم کا نظم و نسق ایسا چاق و چوبند ہوگیا کہ اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اساتذہ اپنی درسگاہوں میں اپنے وقت سے پہلے تو آسکتے تھے تاخیر اب کسی کو پسند نہیں رہی۔

مولانا کیرانوی کا ذہن بہت تیز سوچتا اور فیصلہ کرتا تھا، ان میں قوت فیصلہ بدرجۂ اتم موجود تھی کبھی وہ کسی مسئلہ میں حیص بیص کا شکار نہیں ہوتے تھے، سوچا غور کیا اور فیصلہ کرلیا اور کام کا آغاز کر دیا۔ وہ جمیعۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور اس کے شعبۂ مرکز دعوت اسلام کے سربراہ تھے، عہدہ قبول کرتے ہی انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کا دائرہ کار متعین کرلیا اور کام کا خاکہ بنالیا۔ انھوں نے اس شعبہ کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا پلان بنایا۔

وہ جب معاون مہتمم تھے تعمیر کے سلسلہ میں فراہمی سرمایہ کے لیے دورہ کرتے ہوئے بنارس آئے۔ میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ وہ جامعہ کے مہمان خانے میں قیام پذیر ہوئے، میں ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تو رفیق مکرم مفتی ابوالقاسم نعمانی نے میرا تعارف کرایا اور میری ایک کتاب کا ذکر کیا جو میں نے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں "جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب پر اُترپردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے اشاعت کے لیے امداد بھی منظور ہوئی تھی مگر میں نے قبول نہیں کیا، انھوں نے مسودہ مانگا، میں نے مسودہ ان کے حوالہ کر دیا۔ رات میں انھوں نے مطالعہ کیا اور صبح کو جاتے وقت انھوں نے فرمایا کہ مسودہ مجھے دیدیجئے میں اسے مرکز دعوت اسلام کی طرف سے شائع کرنا چاہتا ہوں، اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور چار مہینے کے بعد جب ایک کنونشن کے سلسلہ میں میں دہلی گیا تو مولانا کیرانوی نے ایک شخص کے ذریعہ پندرہ نسخے مجھے بھیج دیئے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اتنے دن تو کاتب کی خوشامد کرتے کرتے گذر جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں پونے چار سو صفحات کی کتابت پھر طباعت، جلد بندی سارے کام مکمل ہوگئے، یہ تھا مولانا کیرانوی کا طریقۂ کار۔

کتاب شاید مقبول ہوئی، اُترپردیش اردو اکیڈمی نے بہت سے نسخے لائبریریوں کو عطیہ دینے

کے لیے خریدے، اس سے مولانا کیرانوی نے اندازہ لگایا کہ کاروباری حیثیت سے اس کتاب کی اشاعت مفید ہے اور کچھ میری تحریروں کے بارے میں اُن کے تاثرات میری حیثیت سے کچھ زیادہ ہی اچھے تھے۔ ان کو مجھ سے حسنِ ظن قائم ہو گیا جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

اسی سال جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک اجلاس میں جمعیۃ کی تاریخ مرتب کرانے کا فیصلہ کیا، تاریخ مرتب کون کرے، متعدد نام پیش ہوئے مگر کسی پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا، آخر میں مولانا کیرانوی نے نہ جانے کس خوش فہمی کی بنا پر میرا نام پیش کر دیا اور پوری کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا۔ مولانا مدنی دامت برکاتہم نے کمیٹی کے اس فیصلہ سے مجھے مطلع فرمایا اور کہا کہ چھ ماہ کے لیے دہلی آجایئے، آپ کو وہاں ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں گی۔ میں نے بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر بنارس میں رہ کر اس کام کو کرنا مناسب سمجھا اور یہی میں نے کہا بھی، البتہ میٹر اور مواد کے لیے مرکزی دفتر میں حاضری ضروری ہے اس لیے جب ضرورت محسوس ہوگی۔ میں ہفتہ عشرہ کے لیے دہلی آتا رہوں گا لیکن ترتیب بنارس ہی میں رہ کر ہوگی چنانچہ یہ منظور کر لیا گیا۔

میں نے اسی سال کتاب بڑے سائز کے پانچ سو صفحات میں مرتب کر دی۔ دوسرے سال جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا سیشن بمبئی میں ہونے والا تھا۔ اب اجلاس کی تاریخوں میں چند مہینے باقی تھے، مولانا کیرانوی نے کتابت کرائی اور پریس میں بھیج دی۔ اجلاس سے چند دنوں پہلے کتاب آئی بائنڈنگ اور گرد پوش کی تیاری میں یہ دن ختم ہو گئے، اس کی رسمِ اجراء بمبئی میں ادا کی جانے والی تھی اس لیے بہت بڑی تعداد میں کتاب بمبئی بھیج دی گئی، حضرت مولانا مدنی دامت برکاتہم کے ہاتھوں اس کی رسمِ اجراء ہوئی اور اسی دن وہ تمام نسخے فروخت ہو گئے جو بمبئی میں موجود تھے، اجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد پورا ایڈیشن ختم ہو گیا تو مولانا کیرانوی نے اب کی بار آفسیٹ کی کتابت کرائی جو تقریباً آٹھ سو صفحات میں آئی۔ جب موصوف اپنے دورے کے سلسلہ میں بنارس تشریف لائے تو کتابت شدہ کاپی بھی ہمراہ لیتے آئے۔ میں نے اس پر نظرِ ثانی اور غلطیوں کی نشاندہی کی جو بعد میں کاتب سے درست کرا لی گئیں، ابھی اس کی طباعت کے سلسلہ میں بات چل رہی تھی کہ مولانا کیرانوی جمعیۃ علماء ہند سے علیحدہ ہو گئے۔ اپنے عہدے کا چارج دیتے ہوئے یہ کتابت شدہ کاپی بھی صدر دفتر کے حوالے کر دی، وہ آج بھی صدر دفتر میں موجود ہے لیکن تاریخ جمعیۃ علماء ہند دوبارہ نہیں چھپ سکی، اس میں کیا راز ہے، مجھے نہیں معلوم

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

پہلے میرا اور مولانا کیرانوی کا ذاتی تعلقات کے علاوہ ذہنی و فکری رشتہ بھی ایک تھا، ہم دونوں

ہی جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ تھے بلکہ میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو میں جمعیۃ علماء کے اکابر سے ذہنی و فکری طور پر وابستہ تھا، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی جمعیۃ علماء میں کئی بار شکست و ریخت ہوئی لیکن میں نے اس کی جانب نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، باری باری کر کے لوگ جمعیۃ سے علیحدہ ہوتے رہے۔ یہ سب میری نگاہوں کے سامنے تھا لیکن میں نے جو راہ پہلے دن اختیار کرلی آج تک پوری ثبات قدمی سے اس پر قائم ہوں ؎

اہل خرد تو روز بدلتے رہے خدا
ہم اہل عشق جس کے ہوئے اسکے ہولئے

بعض لوگوں نے مولانا کیرانوی سے میرے تعلقات کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا حالانکہ یہ حیرت کی بات نہیں تھی، یہ بہت کم ظرفی کی بات ہے کہ برسہا برس سے جس سے تعلقات ہوں اور ہر ایک نے ایک دوسرے کو ہر طرح پرکھا ہو اتفاقاً ذرا سا ذہنی یا فکری اختلاف پیدا ہوگیا تو اس اختلاف کی وجہ سے بغض و عناد اور کینہ پروری کو اپنے دل میں جگہ دے دی جائے؟ ہمارے جیسے گوشہ نشین اسی عقیدت و احترام کے ساتھ دونوں فریق سے ملتے رہے، مولانا کیرانوی کو میرے نقطۂ نگاہ سے مکمل واقفیت تھی اور میں خود موصوف کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھا لیکن اختلاف کے اس پورے دور میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی اسی بشاشت، اسی خوش دلی اور اسی اعزاز و احترام سے ملے جو ہمیشہ مجھے ان کی طرف سے حاصل تھا، کبھی بھی مجھ سے اس اختلاف کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی آئی، مجھے ہمیشہ علمی مشورے دیتے رہے، نئی کتابوں کے لیے موضوع بتاتے رہے۔ میری کتاب کا جب بھی کوئی مسودہ پہونچا بلا تاخیر وہ کاتب کے حوالے ہوجاتا تھا، میرے اوپر ان کو مکمل اعتماد تھا۔ میں ان کے اخلاص سے بہت متاثر تھا۔ ان کا ہر رویہ ان کی صاف دلی اور خلوص کا مظہر تھا۔ شرافت، عزت نفس، وضعداری، اخلاص اور حسن سلوک یہ ان کے فطری کمالات تھے اور میں ان کا ہر دم مشاہدہ کرتا رہتا تھا اور ؏

ہم تو اسیر ہیں تم زلف کمال کے

اس لیے ہمارے درمیان اخلاص و مودت کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔

جن دنوں معاون مہتمم تھے ایک بار جب وہ بنارس آئے تو میں نے بصد ادب عرض کیا کہ آپ انتظامی ذمہ داریوں سے دامن بچالے جاتے تو بہتر ہوتا، انھوں نے بڑے جھٹکے سے پوچھا "وہ کیوں" میں نے عرض کیا آپ کے علمی کارناموں کو ہر طرف سے سراہا جارہا ہے، آپ کی مرتب کردہ لغتوں نے جو قبولیت علمی دنیا میں حاصل کی ہے یہ سعادت بہت کم اہل علم کو حاصل ہوتی ہے اگر آپ اسی طرح کے علمی کاموں میں اپنے

اوقات لگاتے تو ذہنی سکون بھی رہتا اور آپ کی تصانیف آپ کی دائمی یادگار ہوتیں، پھر انتظامیہ کا کوئی بھی عہدہ جس کے زیرِ اثر طلبہ اور اساتذہ سب آتے ہوں اس عہدہ پر رُہ کر کوئی بھی اپنی عزت سلامت نہیں لے جا سکا۔ اس شخص کو اس کے حلقۂ اثر کا ہدف بننا پڑتا ہے اور جب تک کوئی کام زیرِ اثر حلقہ کے خلاف نہیں ہوتا وہ خاموش رہتا ہے اور جس دن ایک معمولی کام بھی اس کی منشاء کے خلاف ہوا تو تنقیدوں کا کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے پھر انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری زندگی کے کارناموں کو حرفِ غلط کی طرح ہٹا دیا جاتا ہے۔ ذہنی اذیت جو ملتی ہے وہ اس سے الگ ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں میں ان حالات سے گذرا ہوں۔

میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئے، کچھ سوچا مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑے ہی دنوں بعد ان کو انتظامیہ سے علیحدہ ہونا پڑا اور انھوں نے اپنی تدریسی ذمہ داری پر قناعت کر لی لیکن یہ فیصلہ انھوں نے بہت دیر میں کیا۔ جو چیز جتنی بلندی سے گرتی ہے پستی کی طرف آنے کی اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی ہے۔ معاون مہتمم کے بڑے عہدے سے ہٹ کر چھوٹے عہدے پر قناعت کر لیا لیکن جلد ہی تدریسی خدمات چھوڑنے پر مجبور ہوئے، یہی نوشتۂ تقدیر تھا۔

مولانا کیرانوی بڑے وضعدار عالم تھے، جب بہت قریب سے ملتے تب اس کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ اساتذہ ہی کو نہیں طلبہ کو بھی خودشناس بنانا چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ علماء اور طلبہ کو اس انداز سے رہنا چاہیئے کہ دوسروں کی ان پر حقارت آمیز نظر نہ پڑے، دوسروں کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل نہ ہوں اس کے لیے خودشناسی ضروری ہے، خودداری غرور نہیں ایک خوبصورت طرزِ زندگی ہے۔

من لم یکرم نفسہ لا یکرم

کو وہ عملی شکل میں دیکھنا چاہتے۔ ایک بار وہ درسگاہ سے نکلے اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک طالب علم سامنے آگیا وہ مطبخ سے کھانا لے کر اپنے کمرے جا رہا تھا، ایک ہاتھ میں روٹی دوسرے ہاتھ میں سالن کا کٹورا، آپ اس کی طرف بڑھے اور اس کے ہاتھ سے روٹی اور سالن کا برتن چھین لیا اور فرمایا جاؤ، تم کو کھانا اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک ٹفن کیریر خرید کر نہیں لاؤ گے سائلوں اور فقیروں کی وضع اختیار کرو گے تو دنیا تمہاری کیا عزت کرے گی تمہارے ہی جیسے لوگ علماء کے وقار کو مجروح کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

مولانا کیرانوی کا مزاج اور سوچنے کا یہ انداز تھا، وہ کہتے تھے کہ غربت اور امارت سے وضعداری میں فرق نہیں آنا چاہیئے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو اپنی عزتِ نفس کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، احساس

خودی انسان کی بہت بڑی دولت ہے ۔ آئینہ میں چمک نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں، تواضع اور خاکساری یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ورسوا کردو۔ وہ چاہتے تھے کہ اساتذہ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں، جو شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کے حوصلے مرجائیں گے، اس کی اُمنگیں دم توڑ دیں گی۔ ایسا آدمی کبھی بھی کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا، اس کا عزم کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا اس لیے عربی مدارس سے وابستہ ہر ایک کو خوددار انسان کی طرح دوسروں کے سامنے آنا چاہیے۔

مولانا کیرانوی نے تاریخ جمعیۃ علماء کی ترتیب میرے ذمہ ڈالی تو اس وقت میں "تفسیروں میں اسرائیلی روایات" لکھ رہا تھا اس کی تکمیل کے بعد تاریخ پر کام شروع کیا۔ دونوں کا مسودہ ایک ساتھ میں نے ان کو بھیج دیا۔ تاریخ تو انھوں نے مرکز دعوتِ اسلام کی طرف سے شائع کی لیکن تفسیروں میں اسرائیلی روایات اپنے ذاتی کتب خانہ حسینیہ کی طرف سے شائع کی۔

مولانا کیرانوی کو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت تھی اور ان سے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، جمعیۃ علماء سے سارے اختلافات کے باوجود اس عقیدت وارادت میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی، مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں نے اپنی نئی کتاب "مآثر شیخ الاسلام" کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا، میں ایک سیمینار کے سلسلہ میں جب دہلی گیا ہوا تھا وہیں میرے رفیق سفر نے ایک دن دارالعلوم دیوبند میں گذارنے کی تجویز رکھی۔ مجھے بھی اشتیاق تھا، ہم لوگ دیوبند گئے، میں شام کو مولانا کیرانوی کی خدمت میں مسودہ لے کر حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے، بہت ہی پُر تکلف ناشتہ کا انتظام کیا، کچھ دیر تک ایک دوسرے کی خیر وعافیت معلوم کی جاتی رہی، پھر میں نے عرض کیا، میں ایک تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں اور میں نے بیگ سے مسودہ نکال کر ان کے سامنے پیش کردیا۔ کتاب کا نام پڑھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی، چند منٹ مسودہ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں ایک تصنیفی ادارہ "دارالمؤلفین" کے نام سے کھولوں جس میں ذہین اہل علم کو تصنیف وتالیف کی تربیت دی جائے اور پھر ان کو شائع کیا جائے۔ اس ادارہ سے سب سے پہلے "مآثر شیخ الاسلام" کو شائع کروں، شیخ الاسلام کی ذات مقدس سے جو مجھے نسبت اور دل میں جو عظمت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ادارہ کا اسی کتاب سے افتتاح ہو۔

مولانا کیرانوی نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کے ادارہ کھولنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، یک بیک چند منٹوں میں اُنھوں نے فیصلہ کرلیا، کبھی کسی مسئلہ میں وہ تذبذب کا شکار نہیں ہوتے، ان کی

قوت فیصلہ اتنی طاقتور تھی چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد میں نے سُنا کہ انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک عمارت خرید لی ہے اس میں اپنے نفاست پسند مزاج کے مطابق ترمیم کرکے ادارہ کی بنیاد ڈال دی ہے پھر اسی ادارہ دارالمؤلفین سے سب سے پہلی کتاب "مآثر شیخ الاسلام" شائع کی جو پانچسو صفحات پر مشتمل ہے۔ فولو آفسیٹ کی کتابت و طباعت سنہری ڈائی کی خوبصورت جلد حسین وجمیل گرد پوش سے کتاب کو مزین کیا اور رو لبستانِ دیوبند کی دورِ حاضر میں سب سے محترم اور عظیم شخصیت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کے دستِ مبارک سے رسم اجراء ادا کرائی، ان کے خلوص نیت کا ثمرہ تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد دو کتابیں شیخ الاسلام کے سوانح کے سلسلہ میں شائع ہوئیں مگر مآثر شیخ الاسلام کی اشاعت پر کوئی حرف نہیں آیا ہند اور بیرونِ ہند کتاب پھیل گئی، عقیدت کے ہاتھوں سے لی گئی اور محبت کی نگاہوں سے پڑھی گئی۔

پھر اسی دارالمؤلفین سے میری کتابیں "فن اسماء الرجال، تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ، تحریک آزادی اور مسلمان" پونے چار سو صفحات میں "احیاء اسلام کی عظیم تحریک" پانچسو صفحات میں اور آخر میں "کاروانِ رفتہ" جس میں پونے پانچسو شاہیر کا تذکرہ ہے سامنے آئی۔ حضرت نانوتوی کی شخصیت پر میری کتاب پایۂ تکمیل کو پہونچی تو مولانا کیرانوی کو کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع پہونچی تو انھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ یہ کتاب دارالمؤلفین ہی کی طرف سے شائع ہوتی تو بہتر ہوتا۔ ان کے خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ اس کتاب کی ترتیب ایک ایسے مخلص کرم فرما کے ایماء سے ہوئی ہے کہ اب دوسرے ادارہ سے اس کا شائع ہونا بہتر نہیں ہوگا مولانا کیرانوی کا فوراً جواب آیا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے صحیح صورتِ حال بیان کردی، بلا تکلف یہ کتاب انھیں کے حوالے کردیجیے کیونکہ یہ ان کا حق ہے اگرچہ دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ہی اسے شائع کرتا خط کے آخر میں انھوں نے جو بات لکھی اس سے میں بہت متاثر ہوا، انھوں نے تحریر فرمایا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا ہر حال میں آپ کی تصنیفات انشاء اللہ شائع کرتا رہوں گا۔ اس جملہ پر پہونچ کر میرے دل میں کھٹک پیدا ہوگئی کہ شاید انھوں نے فرشتۂ اجل کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سن لی ہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت جلد اس دنیائے فانی سے یہ رختِ سفر اٹھ جانے والا ہے۔ میری آخری کتاب "کاروانِ رفتہ" جب پریس سے آئی تو پہلی فرصت میں انھوں نے دس نسخے بذریعہ ڈاک مجھے بھیج دیئے اس کے چند ہی مہینوں بعد انھوں نے دہلی کے ایک اسپتال میں زندگی کی آخری سانس لی، اس طرح انھوں نے اپنا وعدہ نبھادیا۔

باتوں کا دھنی، اخلاص کا پیکر، حسنِ اخلاق کا مجسمہ، بڑھاپے میں عزمِ جواں کا مالک، صدق وصفا کا

(بقیہ صفحہ ۵۱۶ پر)

مولانا اخلاق حسین قاسمی

ایک فاضل استاذ

قاسمی برادری مولانا وحید الزماں مرحوم کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور اپنے اساتذہ میں ان کا نام ادب اور فخر کے ساتھ لے گی کیونکہ مرحوم نے جدید عربی ادب میں قاسمی علماء کا دنیائے عرب میں وقار قائم کیا۔

دینی مدارس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان مدارس کے علماء عموماً عربی زبان کے تکلم اور تحریر سے بیگانہ ہوتے ہیں جبکہ انگلش مدارس کے طلباء چند سال کے اندر ہی انگریزی میں بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ جو حضرات دینی مدارس کے نصب العین سے آگاہ نہیں ہیں ان کی زبانوں پر یہ اعتراض جاری رہتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم دعوتی ہیں ــ کاروباری نہیں ہیں۔ دینی علوم پڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ طلباء ان علوم کی اشاعت کریں، تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے جو مسائل و معارف حاصل کریں انھیں مسلمانوں کے اندر پھیلائیں، ان علوم کا مقصد روزی روٹی کمانا نہیں ہے، روزی روٹی کمانا دین کے فرائض میں شامل ہے لیکن اس کے لئے دینی علوم کو وسیلہ و ذریعہ بنانا ناپسندیدہ بات ہے۔

دعوتی علوم کو پڑھانے اور پڑھنے کے لئے مادری زبان کا استعمال ضروری ہے، مادری زبان ہی میں اساتذہ دینی علوم کی باریکیاں سمجھا سکتے ہیں اور طلباء اپنی مادری زبان میں یہ علوم حاصل کر کے دوسروں کو دینی مصلحت سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

اس لئے دینی مدارس میں قدیم و جدید عربی ادب تو سکھایا جاتا ہے لیکن اس میں بولنے اور لکھنے کی مہارت پیدا کرنے پر زور نہیں دیا جاتا۔

طلباء اپنی مادری زبان ہی میں اگر دینی علوم کو سمجھانے اور ان علوم کے ذریعہ قرآن و حدیث کے پیغام

• لال کنواں دہلی

کو دل کے اندر پہنچانے کی قدرت حاصل کرلیں تو یہ بہت بڑا کام ہے۔

ہماری مادری زبان اردو ہے، اردو زبان کا ایک عام درجہ ہے اور ایک خاص درجہ ہے جس میں اردو کے محاورات اور اس کی ادبیت پوشیدہ ہے۔

فارسی کے بعد جب ہندوستان میں اردو کا عہد شروع ہوا تو یہ ولی اللٰہی خاندان کا دور تھا اور اس خاندان کے علماء سب سے پہلے قرآن حکیم کے اردو تراجم کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ قرآن کریم دینی علوم کی بنیادی کتاب ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو اردو زبان کا ادب سیکھنے کے لئے خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے پاس جانے کی ہدایت کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اردو زبان کے اولین استادوں اور ماہروں میں سے تھے، شاہ عبدالعزیز نے اپنے مواعظ میں اور شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ قرآن میں اردو زبان کی مہارت کا مظاہرہ کیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں استاد ذوق دہلوی اردو زبان کے محاورے سیکھتے کے لئے شریک ہوتے تھے اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن (موضح القرآن) بامحاورہ اردو کا پہلا بہترین ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

شاہ رفیع الدین نے بھی قرآن کریم کا لفظی ترجمہ کیا، لیکن اردو زبان کی محاوراتی زبان کی جو چاشنی شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ میں ہے وہ شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں، قرآن کریم نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں ایک خاص لفظ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ استعمال کیا، اب اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہو؟ اس لفظ کا ترجمہ اردو والے لالچی کے لفظ سے کرتے ہیں اور لالچ اور لالچی نہایت گھٹیا الفاظ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے لفظ حریص قابل تعریف مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے حریص کا ترجمہ اسی عربی لفظ حریصؐ سے کر دیا، لیکن شاہ عبدالقادر صاحب نے زبان کی مہارت کا ثبوت دیا اور ترجمہ کیا۔ نہایت خواہش مند ہے۔

شاہ صاحبان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ ہے جو بامحاورہ ہے لیکن ڈپٹی صاحب نے زبان کی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ادب رسالت کو نظر انداز کر دیا اور ترجمہ کیا۔ اسے ہوکا ہے۔ ہوکا کھانے کا پینے کا اور روپے پیسہ کا، لیکن ہوکا ہدایت پھیلانے کا دین کی اشاعت کا۔ اس جگہ یہ لفظ نہایت بھدا معلوم ہوتا ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ دینی دعوت و اشاعت کا کام کرنے والوں کے لئے اپنی مادری زبان میں

بھی مہارت کی ضرورت ہے، تب ہی وہ دعوت وتبلیغ میں کشش اور تاثیر پیدا کر سکتے ہیں۔

علمار دین کے طبقہ میں اردو کے بلیغ با اثر مقرر و اصحاب قلم گنے چنے ہی پیدا ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے ان اہل قلم کی کتابیں ہمارے طلبار پڑھنے پر مجبور ہیں حالانکہ ان میں بعض اہل قلم ہمارے نزدیک اپنے بعض نظریات میں پسندیدہ نہیں ہیں۔

تو اب آپ یہ دیکھیں کہ دعوت وتبلیغ کے نقطہ نظر سے اپنے ملک ہی کے اندر ہمارے طلبار کے لئے اردو زبان کی مہارت و بلاغت پر عبور حاصل کرنا کتنا ضروری ہو جاتا ہے؟ فارسی اور عربی پر تکلم وتحریر کا درجہ تو بعد میں آتا ہے۔

دنیوی مدارس کے علوم کا مقصد ہی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اس لئے دنیوی مدارس کے طلبار جلدی ہی انگریزی میں بولنے اور لکھنے لگتے ہیں۔

لیکن جب وہ دور آیا جب عربی زبان کا تعلق معیشت سے قائم ہوا تو پھر ہمارے اساتذہ نے بھی اس پر توجہ کی اور طلبار کے اندر عربی جدید میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے پر زور دینا شروع کیا۔

دارالعلوم دیوبند میں پہلے بھی شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب تھے اور اس کے بعد بھی شیخ الادب پیدا ہوئے ان میں مولانا وحید الزماں صاحب کا نمایاں مقام ہے۔ مولانا مرحوم کئی اہم عربی کتابوں کے مصنف بھی ہیں جو کافی مقبول ہیں۔ مرحوم نے دارالمؤلفین کے ذریعہ تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔

ان علمی کارناموں کے علاوہ مرحوم کے اندر ایک اخلاقی وصف بھی بہت بیش قیمت تھا اور وہ ان کا اخلاص وبے لوث پن تھا، ان کی رائے سے اختلاف کیا گیا لیکن ان کے اخلاص اور بے نفسی کے وصف سے ان کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی انکار کی مجال نہ تھی۔

ابنائے قدیم کی تحریک مرحوم کی یادگار ہے

تحریک ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے احیار کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی، سنہ ۱۹۹۰ء میں مولانا مرحوم کو دارالعلوم سے سبکدوش کئے جانے کا فیصلہ تنظیم ابنائے قدیم کے قیام کا فوری محرک بنا۔ اس تحریک نے قاسمی علمار کے اندر احساس خودی پیدا کی۔ اغیار قاسمی نوجوانوں سے اپنا کام نکالتے ہیں اور یہ بے سہارا طبقہ اپنی روایات سے قطع نظر کر لیتا ہے کیونکہ اعزا پروری کے فتنہ سے نوجوان قاسمی علمار اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقعہ نہیں پاتے۔

اس تحریک نے نوجوان قاسمی طبقہ کے اندر حوصلہ اور ہمت پیدا کی ہے۔ ہمارے اکابر شخصیت سازی

(بقیہ صفحہ ۱۹۰ پر)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا محمد زبیر اعظمی
ایولہ، ضلع ناسک

تصویرِ ناتمام

فقیر چمٹا بجا بجا کر زوروں سے گاتا ہے!

نظر آتی ہے مجھ کو عالم ارواح کی ہر شے
میسر ہے کہاں سبکو جو پی رکھی ہے میں نے مے

پھر وہی فقیر لوگوں کے ایک جمِ غفیر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: رُوحوں کی دُنیا میں چلو گے؟ رُوحوں کی دُنیا میں آن کی آن میں پہونچا دینا میرا معمولی کرشمہ ہے، آؤ آؤ میرے پیچھے پیچھے چلو، تھوڑی دیر میں لوگوں کا ہجوم ایک عجیب و غریب دُنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ منظر نیا، ماحول نیا، لوگ نئے، جہاں کی ہر چیز اس دُنیا سے مختلف ہے، ایک نئی دُنیا، انوکھی دُنیا اور خواب و خیال میں نہ آنے والی دُنیا۔

پہلا منظر

ایک بڑا ہال، لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ——— اعلان ہوتا ہے:

"آج مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی زندگی کی تصویر اور ان کے کارناموں کے اہم گوشے آپ کے سامنے پیش کیے جائیں گے یہاں سب کچھ خاموشی سے دیکھنا اور سننا ہے، کسی کو کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہوگی ——" پھر دارالعلوم دیوبند لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جہاں ایک نوجوان طالب علم دکھائی دیتا ہے۔ سینکڑوں طلبہ میں امتیازی شان کا مالک۔ جوش و خروش اور حرکت و عمل کا مجسمہ، اپنی ہر ادا اور ہر انداز سے اسلامی پیکر میں ڈھلا ہوا، کبھی وہ لڑکوں کو کوئی کتاب سمجھاتا ہے، کبھی عربی اور اُردو بولتا ہے، کبھی کچھ لکھتا ہے، کبھی کچھ لکھتا ہے، کبھی ایک بڑے سے کاغذ پر اپنی عربی تحریر، خوشخطی میں اپنی شال آپ، آویزاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ طلباء اسے پڑھنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑے ہیں، سب کے چہروں پر بشاشت کے آثار، لبوں پر تحسین و آفرین کے کلمات، آنکھیں داد دیتی ہوئی، دل و دماغ میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑتی ہوئی، تھوڑی دیر میں لمبے عباؤں میں ملبوس بڑے بڑے نامی گرامی مہمانوں کا اسٹیج لگا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ جلسہ مہمانوں کے اعزاز میں منعقد کیا گیا ہے۔

سامعین طلبہ سراپا شوق بن کر مہمانوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے بیتاب ہیں کہ پھر وہی نوجوان یہاں مہمانوں کا استقبال کرتا ہے۔ ان سے متانت اور وقار سے باتیں کرتا ہے۔ اس کے ہر انداز میں عالمانہ وقار ہے جس میں انکساری اور تواضع کا بھی حسین امتزاج ہے۔ پھر وہی عربی زبان میں مہمانوں کا تعارف کراتا ہے۔ عربی مقالہ پڑھ کر سناتا ہے۔ وہی عربوں کا انداز، وہی لہجہ، وہی طرزِ ادا۔ مہمان حیرت واستعجاب اور خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ اساتذۂ کرام بھی جو مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں اپنے چہیتے طالب علم کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں جس نے اپنا ہی نہیں بلکہ اپنے اساتذہ اور مادرِ علمی کا سر اونچا کر دیا ہے۔ طالبانِ علم اس کو داد دیتے ہیں اور محنتی ومخلص اساتذہ دل ہی دل میں فخر کے ساتھ دعائیں دیتے ہیں، ہر طرف سے اس پر تحسین وتوصیف کی بارش ہوتی ہے لیکن اس کی اداؤں سے فقر ومسکنت اور تواضع کی ہی جھلک نظر آتی ہے۔ کبر وغرور کا نام نہیں۔ وہ شاید اس نکتہ سے آشنا ہے کہ آدمی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والی جنس کمیاب خاکساری ہی ہوتی ہے۔ جو اس دولت سے بہرہ ور ہوتا ہے بلندیاں اس کے قدم چوم لیتی ہیں اور اکڑ رکھنے والا دیر سویر پانی کے بلبلے کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

دوسرا منظر

وہی دارالعلوم دیوبند، اعلان ہوتا ہے:

"اب مولانا وحید الزماں دارالعلوم دیوبند میں عربی کے استاذ ہو گئے ہیں، ان کی تدریس کا طریقہ مروجہ طریقوں سے بالکل الگ ہے۔ وہ صرف کتاب نہیں پڑھاتے بلکہ بہت کچھ سکھا دیتے ہیں، زبان سکھا دیتے ہیں، محاورات بتاتے ہیں، تعبیرات سے روشناس کراتے ہیں اور مشکل باتوں کو پانی کر دیتے ہیں، عربی پڑھا کر یہ قدرت پیدا کر دیتے ہیں کہ طلبہ بھی عربی میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکیں۔"

آپ حضرات غور سے سنیے:

"ان کی درسگاہ میں بیٹھے ہوئے طلبہ کے چہروں پر نظر ڈالیے۔ یہ جو مشہور ہے کہ چہرہ دلی جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے یا چہرہ دل کی کتاب ہوتی ہے، بالکل صحیح ہے۔ کیا لڑکوں کا چہرہ اس قدر ہشاش بشاش ہوتا اگر وہ درس میں بیٹھ کر کچھ حاصل نہ کرتے اور کورے کے کورے رہتے؟ دیکھئے ایک طالب علم نے کچھ پوچھ لیا۔ کس خوشی سے اس کو جواب دیا جاتا ہے، وضاحت پر وضاحت کی جاتی ہے اور مختلف انداز اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا جاتا ہے۔ الفاظ ان کے باج گذار ہیں اور تراکیب وجملے ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔" سب لوگ غور سے سنیں " ڈانٹ ڈپٹ وہ معلم کرتا ہے جو تدریس کے کوچے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کے علم کا طول وعرض بہت کوتاہ ہوتا ہے۔ تدریس بہت مشکل فن ہے مگر عجیب بات ہے کہ ـــــ لوگ آسان

سمجھتے ہیں معلم ہونا۔ ہاں ہاں مولانا کیرانوی وہ قدآور استاد ہیں جن کے سامنے بیشتر حضرات بونے نظر آتے ہیں۔ طلبہ کی ایک فوج ان کے آگے پیچھے چلتی ہے اور یہ ایک سپہ سالار کی طرح محبت اور پیار سے علمی میدان کو فتح کرنے اور علمی مہمات کو سر کرنے کا گر سکھاتے ہیں۔"

اعلان کرنے والے نے مزید کہا:

"اس گلشن علمی کو جن جلیل القدر علماء نے اپنے خون پسینے سے سینچا ہے، اس کی ترقی واستحکام کے لیے راحت و آرام کو قربان کیا ہے اور اس کو ایشیا کی عظیم ترین درس گاہ بنایا ہے انھیں میں سے ایک مولانا وحید الزماں بھی ہیں بلکہ وہ بعض کمالات میں منفرد ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی جرات اس وجہ سے ہوئی کہ وہ مجموعۂ کمالات تھے۔ زبان و ادب، حدیث و تفسیر، تصنیف و تالیف، صحافت و خطابت اور انتظامی و تعلیمی صلاحیتوں میں فرد وحید تھے۔ کسی ایک شخص میں اتنے کمالات کا جمع ہونا محض فضل خداوندی ہے جو ہر شخص کو نہیں ملتا۔ اس باب میں قدرت کی طرف سے انتخاب کا خاص دخل ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر چمنستانِ دارالعلوم کی آبیاری کی ہے بلکہ از سر نو اس کی چمن بندی کی ہے۔ اپنی جان سے زیادہ اس کو چاہا ہے، اپنی صحت کے قیمتی سرمایہ کو بھی اسی علمی دکان میں لگا دیا ہے۔ چنانچہ ان کی مساعی سے دارالعلوم ایک نیا دارالعلوم بنا ہے جو ترقی واستحکام اور جمال و کمال کا آئینہ دار ہوا۔ مولانا کیرانوی کی ان قربانیوں کو بیدرد زمانہ بھلا نہیں سکتا اور بے لاگ مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سلام اُن کی خوبیوں کو ——— تحسین و آفریں ان کے کمالات پر۔"

تیسرا منظر

مختصر وقفہ ——— اعلان کرنے والا جوشیلے اور جذباتی انداز میں کہنا شروع کرتا ہے:

"مولانا وحید الزماں کو عربی زبان و ادب میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جدید عربی کے تقریری اور تحریری میدان میں کوئی شہسوار ان سے آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ مختلف عربی مجلات کے رئیس تحریر اور مدیر تھے ———" پھر ایک مجلہ ہاتھ میں اٹھا کر چند سطریں بہ آواز بلند پڑھ کر پوچھتا ہے:۔

"آپ ہی فیصلہ کریں کہ اس سے فصیح و بلیغ، رواں دواں اور بامعنی عبارت اور کیا ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی عربی آب و ہوا کا پروردہ عرب اس سے بہتر عبارت لکھ سکتا ہے۔؟"

اَلنَّادِی العربی کا ذکر کرتے ہوئے بلند آواز اناؤنسر نے کہا:

"دیکھیے سینکڑوں طلبہ اپنی علمی سیرابی اور تحریر و تقریر کی مشق کی خاطر اس انجمن میں شریک ہیں اور شفیق استاذ و مربی کی زیر تربیت علمی پروگراموں کو چلانے، تحریر کی مشق کرنے اور انتظامی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی فکر اور لگن میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سچ ہے کہ اگر شمع کی روشنی مدھم ہوتی تو اتنے پروانے کس طرح جمع

ہوجاتے۔ ہر زبان پر انہیں کا ذکر، انہیں کی باتیں اور انہیں کی مدح سرائی۔ گویا دارالعلوم کی زبان بس مولانا وحید الزماں بن گئے تھے۔

اناؤنسر نے مزید کہنا شروع کیا:

"یہ دیکھیے میرے ہاتھ میں بڑی موٹی کتابیں ہیں۔ یہ مولانا وحید الزماں کی لکھی ہوئی لغات وقوامیس ہیں۔ ان کتابوں سے عربی کا کوئی طالب علم، کوئی استاذ، کوئی محقق، کوئی اسکالر اور کوئی مصنف بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ان سے بارش کے پانی کی طرح سب ہی استفادہ کرتے ہیں۔"

اناؤنسر تھک جانے کی وجہ سے قدرے خاموش ہوا، پھر کافی بلند آہنگی کے ساتھ گویا ہوا:

"یہ وہ کتابیں ہیں جن سے مولانا مرحوم کا بدترین دشمن بھی استفادہ اور کسب فیض کرتا ہے۔ یہ کتابیں اس کی علمی الجھنوں میں "اسم اعظم" کا کام دیتی ہیں۔ وہ ان کو شب کی تنہائیوں میں مطالعہ کے وقت سامنے رکھ کر "یا حل المشکلات" کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ بالکل اس ریاکار زاہد کی طرح جو عوام کے روبرو فلم کی قباحتوں اور برائیوں پر تقریر کرتا ہے اور رات کو چھپ چھپا کر فلمیں دیکھتا بھی ہے۔

چوتھا منظر

وہی دارالعلوم دیوبند ـــــ لیکن یہ دارالعلوم اب عجیب و غریب اور بہت ہی بدلا ہوا۔ ویران اور سنسان دکھائی دے رہا ہے جیسے یہاں پانی پت کی جنگ ہو چکی ہو۔ اناؤنسر نے لوگوں کی خاص توجہ چاہی اور کہنا شروع کیا:

"دیکھیے خاموش پانی میں اگر ہلچل پیدا کرنی ہو تو چند پتھر ڈال دینا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا وحید الزماں دارالعلوم کی آنکھوں کا تارا بن چکے تھے۔ سب کی زبان پر یہی نام تھا۔ ایسے حالات و ماحول میں بدخواہوں اور حاسدوں کے لیے کوئی فتنہ رچانا اہم فریضہ ہو جاتا ہے جس کو آج کی زبان میں دہشت گردی کہا جاتا ہے تاکہ یہ روڑا راہ سے ہٹ جائے اور سیاسی بازیگر اپنی شہرت و مقبولیت کی دکان چمکا سکیں۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ جانور کو کوئی برا نام دے دو اور مار ڈالنے کا جواز پیدا کر لو" چنانچہ مولانا کے خلاف الزام تراشیوں کا سلسلہ چل نکلا اور بدتمیزی کا وہ طوفان برپا ہوا کہ الاماں! بالآخر حاسدوں کی سازش کے نتیجہ میں مولانا کے گلے میں الزامات کا پھندہ ڈال کر انہیں جبراً ہٹا دیا گیا یا اسی پھندے سے پھانسی دیدی گئی۔" (مجمع میں گریہ زاری اور ہائے ہائے کی آوازیں)۔

اناؤنسر نے مزید کہا:

"مولانا وحید الزماں کی جبری سبکدوشی پر سیاسی بازیگروں نے جشن منایا ہو تو ہو لیکن ملک و بیرون ملک میں پھیلی ہوئی قاسمی برادری اور ہر انصاف پسند انسان کا دل خون ہو گیا۔ مولانا کی سبکدوشی سے دارالعلوم اس

طرح اُجاڑ دکھائی دینے لگا جیسے کسی مست ہاتھی کو شیشے کے سامانوں کی دُکان میں مَن مانی کرنے کی آزادی دے دی گئی ہو۔ اس سے قبل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ بھی انہی شاطر ارباب سیاست کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوئے تھے۔ موت تو اپنے وقت موعود پر ہی آتی ہے لیکن بہرحال ہمارا خیال ہے کہ تادم مرگ حضرت قاری صاحب کے دل میں اس فتنہ انگیزی کی جو پھانس تھی وہ اپنے ساتھ ہی لے کر گئے۔" یہاں پہونچکر اناؤنسر کی آواز گھٹ گئی اور وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

پانچواں منظر

دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مولسری میں مولانا وحیدالزماں کا جنازہ۔ دلخراش آواز میں اعلان:۔

وہی مولانا جو کبھی دارالعلوم میں رہ کر ہمہ دم اس میں چار چاند لگانے کی فکر میں تھے اب دنیا میں نہیں ہے۔ سچ ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ جنازہ لوگوں کے جمِّ غفیر میں رکھا ہوا ہے۔ ان میں عالم بھی ہیں، عامی بھی، اساتذہ بھی اور طلبہ بھی، عوام بھی اور عقیدتمند و محبین بھی، خیر خواہ بھی اور بدخواہ بھی۔ اتنی بڑی نماز جنازہ دارالعلوم میں کم ہی دیکھی گئی ہے۔" پھر اعلان ہوا:

"آج وہی شخصیت جو اپنی مادرِ علمی کا ہر غم اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی، آہ کہ لوگوں کے شانوں پر سوار ہو کر آئی ہے۔ کل تک جو اپنا ہر کام اپنے بل پر کرتا تھا آج مجبور محض ہے۔ آہ کہ جس کی صداؤں سے اِس مرکزِ علمی کا ہر گوشہ گونجتا رہتا تھا اب خود ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔ جس نے اپنی تمام تر توانائی، صلاحیت بلکہ زندگی یہاں کھپادی اب ہزاروں کو سوگوار چھوڑ کر آخرت کا راہی ہو گیا۔ ایک کامیاب مدرس، مقرر، مصنف، ادیب، صحافی اور منتظم کا اُٹھ جانا ملت کا عظیم نقصان ہے لیکن مالک کی مرضی کے آگے انسان بے بس اور لاچار ہے۔" آگے پھر اعلان ہوا:

"اب دیکھیے نمازِ جنازہ ادا ہو چکی۔ اب علم و ادب کے گہنائے ہوئے سورج کو مزارِ قاسمی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آج سے توقیر و اکرام بھرے القاب و خطابات "الاستاذ المرحوم" "رحمۃ اللہ علیہ" اور "نوّر اللہ مرقدہٗ" لکھا جائے گا۔ مگر ہاں (ذرا بلند آواز سے) لوحِ زمانہ پر جس کا نام ثبت ہے اس کا نشان کبھی مٹ نہیں سکتا پھر وافر مقدار میں علمی یادگاریں چھوڑ کر جانے والا آنے والی نسلوں کے دل و دماغ سے محو کیونکر ہو سکتا ہے؟ پھر بلند آواز میں "خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

لوگوں کا مجمع جب عجیب و غریب اور انوکھی دنیا سے واپس ہوا تو فقیر اب بھی چپٹا بجا بجا کر یہی گا رہا تھا ۔

نظر آتی ہے مجھکو عالم ارواح کی ہر شے ۔۔۔ میسر ہے کہاں سب کو جو پی رکھی ہے میں نے

مولانا عبدالحفیظ رحمانی

علم و اخلاق کا پیکر

مولانا وحید الزماں کیرانوی سے پہلی ملاقات ۱۹۵۹ء میں ان کے قائم کردہ ادارہ دارالفکر دیوبند میں ہوئی۔ میں اس وقت دارالعلوم میں حدیث کا طالب علم تھا اور مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی کے حلقۂ تربیت میں شامل تھا۔ عربی اور اردو کی تشنگی تو بھائی کاشف الہاشمی کے دریائے فیض سے بجھ رہی تھی لیکن انگریزی میں شدبد پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ سامنے نہیں تھا۔ مولانا کیرانوی مرحوم نے دارالفکر میں انگریزی کی تدریس کا اعلان کیا تو بلا تاخیر بھائی کاشف الہاشمی سے اجازت لے کر مولانا کیرانوی کے ادارہ دارالفکر میں حاضر ہوا۔ اندازہ تو یہ تھا کہ مولانا سے صرف رسمی اور داخلہ سے متعلق ضابطہ کی گفتگو ہوگی لیکن میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ مولانا اس قدر خندہ پیشانی سے ملے گویا کسی طالب علم سے نہیں دیرینہ رفیق سے مل رہے ہوں۔ پھر انھوں نے عربی اور انگریزی میں مہارت پیدا کرنے پر مبسوط و مدلل گفتگو کی۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے مقاصد سے پورا اتفاق ہے مگر عربی اور اردو کے سلسلے میں بھائی کاشف الہاشمی کے دامن علم سے وابستہ ہو کر فیض اٹھا رہا ہوں اور مجھے یہ اعتماد ہو چکا ہے کہ عربی میں شدبد پیدا ہو جائے گی چنانچہ سردست امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے چند رسائل کا اردو ترجمہ "آثار امام اعظمؒ" زیر ترتیب ہے۔ یہاں حاضری کا مقصد انگریزی میں شدبد پیدا کرنے کا ہے۔ مولانا مرحوم نے میری اس کتاب پر "القاسم" میں قابل توجہ تبصرہ شائع کیا۔

مولانا مرحوم کو میری اس علمی کد و کاوش سے کس قدر مسرت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر بھی مسرت کی ایک جھلک تو آپ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم بار بار فرماتے رہے کہ آپ سے مل کر

لکچرر مولانا آزاد کالج، لوہرسن، سدھارتھ نگر یوپی

تو مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے، رسمی نہیں سچی مسرت اور پھر مجھ طالب علم سے ترجمہ کے فن اور ترجمانی
کے اصول پر متعدد سوالات کئے اور چند مفید مشورے دیے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت اور ان کا عظیم
فنِ تعلیم وتربیت ان کے ایک ایک لفظ سے جھلک رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ قلبی اضطراب
بھی محسوس ہو رہا تھا جو مدارسِ عربیہ کے طلبہ میں عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کرنے سے
متعلق تھا۔ دراصل مولانا اپنے ادارہ دارالفکر کے ذریعہ مدارسِ عربیہ میں نئی رُوح پھونکنا
چاہتے تھے اور بیداری لانے کا لائحہ عمل تو میرا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں مرتب
کر چکے تھے۔ وہ قدیم طریقۂ تدریس سے متفق نہیں تھے اور نصابِ تعلیم کو بھی جامد نہیں سمجھتے تھے
چنانچہ زمانہ کے حالات اور رفتار دیکھ کر انھوں نے عربی زبان وادب میں دستگاہ کامل پیدا کرنے
کے لیے نیا نصابِ تعلیم مرتب کیا اور دارالفکر میں نیا نصابِ تعلیم اور نیا طریقۂ تدریس ہی رائج
کیا۔ بلاشبہ مولانا مرحوم کو تعلیم وتربیت میں مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور اسی بصیرت نے اُن گنت
لعل وجوہر پیدا کیے۔ دارالفکر میں مجھے بارہا مولانا مرحوم کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار عربی کے معلم کو تختۂ سیاہ استعمال کرتے ہوئے دیکھا۔ حیرت ہوئی لیکن اس
طریقۂ تدریس کی افادیت دل ودماغ میں بس گئی اور دیدہ ودل نے تسلیم کیا کہ یہی طریقۂ تدریس
زبان وادب میں مہارت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ورنہ سالہا سال عربی کی اہم کتابوں
کی ورق گردانی سے عربی میں مہارت تو کجا ممارست ومناسبت بھی پیدا نہیں ہوتی لیکن افسوس
جلد ہی انگریزی کے اُستاذ (جناب حافظ واحد علی صاحب جھنجھانوی) نے داغِ مفارقت دے دیا اور
دارالفکر سے ضابطہ کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اس کے باوجود مولانا مرحوم کی عظیم شخصیت کا جادو زندہ و
تابندہ رہا۔ دارالفکر سے تعلق ختم ہونے کے بعد ایک مہینہ مولانا مرحوم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک
دن اچانک جامع مسجد کی شمالی گلی سے گذرتے ہوئے ملاقات ہو گئی، بڑھ کر گلے سے لگا لیا فرمایا میں تو
سمجھ رہا تھا کہ آپ دیوبند سے چلے گئے۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا پھر اس کے بعد جب تک
دیوبند میں قیام رہا، ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور مولانا مرحوم خندہ زیرِ لب کے ساتھ حسبِ معمول
بٹھاتے اور کسی نہ کسی علمی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ دیوبند سے رخصت ہونے کے بعد کئی سال تک
دیوبند جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور جب مادرِ علمی میں حاضری کی نوبت آئی تو مولانا مرحوم سے
ملاقات کے لیے ان کے دولت کدہ پر نہیں دانش کدہ پر حاضر ہوا۔ اس طرح کھل کر بشاشت سے
ملے کہ اس کی منظر نگاری الفاظ میں ممکن نہیں۔ فرمایا قیام کہاں ہے؟ بتایا کہ مہمان خانہ میں حکم ہوا

کہ اس طالب علم کو ساتھ لے جائیے اور سامان سفر اٹھا کر میرے پاس آجائیے۔ میرے بہت اصرار پر اس شرط پر رضامند ہوئے کہ جب تک قیام رہے کھانا میرے ساتھ کھائیے حالانکہ مولانا مرحوم سے میرا تعلق دوستانہ نہیں نیازمندانہ تھا لیکن قربان جائیے اس محبت و شرافت پر۔ کہاں ملتے ہیں شرافت کے یہ مثالی پیکر۔

پھر جمعیۃ علماء ہند کے تعلق سے جلدی جلدی ملنے کی نوبت آتی رہی اور گفتگو کے مواقع بھی آتے رہے۔ ایک دن گفتگو تصنیف و تالیف پر آئی تو فرمایا کہ آجکل آپ کے مضامین نظر سے نہیں گذرتے اور تصنیفی کام تو غالباً بند ہی کر دیا ہے۔ عرض کیا ہاں ایسا ہی ہے، فلاں مسودہ کے سرقہ کے بعد طبیعت بجھ گئی۔ وہ سرقہ تو آپ کے علم میں ہے۔ دیر تک سمجھاتے رہے اور سرقہ والے موضوع کو نئے قالب میں ڈھالنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ راقم الحروف نے حکم کی تعمیل میں پہلے "توریت اور یہود اپنے آئینے میں" مرتب کی اور مولانا مرحوم نے اس کو اپنی نگرانی میں مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ہند سے شائع کیا۔ اس مشینی دور میں جبکہ تہذیب و شرافت، ہمدردی و حوصلہ افزائی سر پیٹ چکی ہے اس طرح کی ذہن سازی اور حوصلہ افزائی کرنے والے کب ملتے ہیں، لیکن مولانا مرحوم نے نہ صرف یہ کہ ہمدرد و ذہن ساز تھے بلکہ تعاون کی جو صورت بھی سامنے آتی اس سے بھی دریغ نہ فرماتے۔

مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ہند سے ترک تعلق اور جمعیۃ علماء ہند سے بددلی کے بعد مولانا مرحوم نے دارالمؤلفین نامی ادارہ دیوبند میں قائم کیا تو ازراہ محبت یاد فرمایا اور میرے خصوصی موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند عناوین تجویز فرمائے۔ چنانچہ بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ترتیب عمل میں آئی اور مولانا مرحوم نے اس کا پیش لفظ لکھ کر کتاب کو ذیقیع بنا دیا۔

میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت سے دور رہتے تو نہ جانے کتنے علمی کام ان کے زیر نگرانی سرانجام پا جاتے اور مؤلفین کی کتنی بڑی تعداد ملت اسلامیہ کے سپرد کر جاتے چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں مرحوم سے گفتگو بھی کی اور خطوط لکھے لیکن تھے انتہائی مخلص اور دھن کے پکے ان کو یقین تھا کہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر سایہ ملت اسلامیہ کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت یہی ہے لیکن جلد ہی ان کو جمعیۃ کے خدوخال نظر آ گئے۔ اور اس سے علیحدہ ہو کر ہی عافیت پائی۔

اندازہ تھا کہ اب مولانا مرحوم یکسو ہو کر علمی خدمات میں منہمک ہو جائیں گے اور علمی خدمات ہی ان کا بنیادی مزاج بھی تھا مگر ملت اسلامیہ کے کاموں سے دلچسپی لینے والے مولانا مرحوم

کے ملی کاموں کو نظر میں رکھے ہوئے تھے وہی مولانا کو مرکزی جمعیۃ علماء ہند میں لے آئے اور مرحوم نے اپنی علالت کے باوجود مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے منصب صدارت کا پورا پورا حق ادا کیا اور ایک نئی تنظیم کو متحرک و فعال بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، وفود کی تشکیل کرکے دور دراز مقامات کے سفر کیے اور وفد میں شریک ہر فرد میں حرکت و عمل کا بے پناہ جذبہ پیدا کردیا۔ راقم الحروف کو بھی مولانا مرحوم کے ساتھ تنظیمی سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ ان اسفار میں سچ تو یہ ہے کہ مولینا خود کار نشین بن جاتے تھے اور رفقاء سفر کو بھی حرکت و عمل کا پیکر بنا دیتے تھے۔ مشرقی اتر پردیش کے دورہ میں دو بار راقم الحروف کے غریب خانہ پر بھی قدم رنجہ فرمایا اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کو مستحکم و فعال بنانا ہی زحمت فرمائی کا مقصد تھا۔ بہرحال مولانا مرحوم کے اسفار اور تنظیمی خطبات بجائے خود ایک موضوع ہے۔ ضرورت ہے جن رفقاء جماعت نے حضرت مولانا مرحوم کے ہمراہ زیادہ سفر کیے ہیں ان کو مرتب کردیں۔ یوں تو مولانا کی ہمہ جہت شخصیت کا ہر پہلو اجاگر ہونا چاہیئے تاکہ آئندہ نسلیں مولانا مرحوم کے کارناموں کو مشعل راہ بنائیں اور عملی اور علمی جدوجہد کا سبق سیکھیں۔ بلاشبہ حضرت مولانا ایک مردم ساز شخصیت، عظیم استاذ، دیدہ ور ادیب، بلند پایہ مصنف اور بیدار مغز مفکر تھے۔ اس طرح کی ہمہ جہت شخصیت دیر سے وجود میں آتی ہے اور تادیر فراموش نہیں ہوتی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بقیہ : منفرد اسلوبِ تربیت

ہے تو اسے جلد ہی ختم کرلیں بلکہ آخر تک تمام کھانوں کے آئٹم مساوی طریقہ پر استعمال کیے جائیں۔

ضرورت ہے کہ دینی درسگاہوں کے اساتذہ ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور ان کی روشنی میں ایسے طریقے اپنانے کی جدوجہد کریں جن سے طلبہ کے اندر علمی استعداد اور ذوقِ مطالعہ پیدا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج علمی و دینی درسگاہیں اس روح سے خالی ہوتی جارہی ہیں جس کی آج شدید ضرورت ہے۔

حضرۃ الاستاذ اگرچہ آج ہمارے درمیان نہیں رہے، ہیں سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگئے ہیں لیکن ان کی یادیں، ان کے گراں نمایہ کارنامے، علمی کاوشیں، اصلاحی طریقے ہمیشہ تروتازہ رہیں گے، ان کے ہزارہا شاگرد ان کے عظیم مشن کو ان شاء اللہ زندہ رکھیں گے۔

مولانا محمد عبداللہ طارق

علوم و معارف کی ایک دنیا

یہ مقالہ حضرت مولانا کیرانوی مرحوم کے جلسۂ تعزیت منعقدہ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ۲۱ر اپریل ۱۹۹۵ء کو پڑھا گیا تھا۔

کچھ زندگیاں تو وہ ہوتی ہیں کہ ان کے باقی رہنے کی خوشی نہ کسی کو ان کے جانے کا غم، وہ باقی رہیں تو کیا اور چلے جائیں تو کیا، ان سے نہ کسی کو فائدہ پہنچتا ہے نہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی توقع ہوتی ہے ان کے چلے جانے سے کوئی کام بند نہیں ہوتا، جیسا کہ مرزا غالب نے خود اپنے ہی اوپر ڈھال کر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا: کیجیے ہائے ہائے کیوں

لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہزاروں لاکھوں انسان ان سے فیض پاتے ہیں، بے شمار لوگوں کو ان سے راحت ملتی ہے، وہ اس دنیا میں لوگوں کو بہت کچھ دے رہے ہوتے ہیں۔ اس باغ ہستی کے وہ سینچنے والے اور اس کی خوبی و عمدگی میں چار چاند لگانے والے ہوتے ہیں اور ان سے آئندہ بھی بہت کچھ امیدیں اور بڑی توقعات ہوتی ہیں۔ ان کے جانے سے بے شمار امیدوں اور آرزوں کا خون ہو جاتا ہے اور سیکڑوں منصوبے ناتمام رہ جاتے ہیں، انھیں دنیا والے تو روتے ہی ہیں قرآن مجید شاہد ہے کہ ان پر آسمان اور زمین بھی آنسو بہاتے ہیں۔ (سورہ دخان آیت ۲۹)

ظاہر بینوں کی نگاہ میں وہ ایک فرد کی موت ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک قوم، ایک گروہ ایک جماعت اور بہت سے منصوبوں کی موت ہوتی ہے۔ مشہور عرب شاعر عبدۃ بن الطبیب نے قیس بن عاصم المنقری التمیمی صحابیؓ کا مرثیہ کہتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

(یعنی قیس کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ یہ ایک قوم کی بنیاد ہی ڈھے جانے کا معاملہ ہے۔)

مولانا وحید الزماںؒ کی خوبیاں و کمالات

مولانا وحید الزماں صاحب جو اسم بامسمیٰ تھے اور واقعتاً وحید الزماں یعنی یکتائے روزگار تھے، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور علوم و معارف کی ایک دنیا تھے۔ وہ ازہر ہند اور ایشیا کی عظیم و قدیم اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے معاون مہتمم رہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہدے سے اور اس کے علاوہ بھی جس جس عہدے پر وہ رہے اس سے جتنا کچھ ان کا نام روشن ہوا اس سے زیادہ ان کی ذات سے خود اس عہدے کو چار چاند لگ گئے، تدریس و تعلیم میں ان کا حال یہ تھا کہ طلبار ان سے غیر معمولی طور پر مانوس رہتے تھے، ہر جماعت یوں تو کئی کئی اساتذہ سے سبق لیتی ہے لیکن ان کے ساتھ طلبار کا تعلق بڑا والہانہ اور شیفتگی و فریفتگی کا ہوتا تھا، طلبار ان کی ایک آواز پر سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل کام میں اس دیوانگی اور بے جگری سے لگ جاتے تھے کہ انھیں اپنے کھانے، ناشتے اور گرمی سردی کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ دارالعلوم کے حلقے میں یہ بات مشہور تھی کہ جو کام مزدوروں اور بیلداروں سے نہ ہو سکے مولانا وحید الزماں صاحب اپنے طلبہ کی فوج سے وہ کام آناً فاناً کرا سکتے ہیں۔

درس کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ میں سلیقہ و تہذیب اور شائستگی بھی پیدا کرتے تھے، جو طلبہ ان سے زیادہ قریب رہتے ان کی نشست و برخاست، ان کے لباس و رہن سہن اور ان کے ہر ہر کام میں ایک خاص قسم کی سلیقہ مندی آجاتی تھی۔

خطاطی ان کے مخصوص فنون میں شامل نہ تھی لیکن دارالعلوم دیوبند میں جدید عربی ادب کی تعلیم کے شروع دور میں جبکہ عربی ٹائپ رائٹروں کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا اور کمپیوٹر کی عربی تحریروں کا تو سلسلہ ہی ملک میں شروع نہیں ہوا تھا، انھوں نے کئی خطاطوں اور بہت سے طلبہ کو "خطِ ٹائپ" کی مشق کرائی، یعنی ان کو ایسے انداز سے لکھنا سکھایا کہ کوئی ماہر فن ہی فرق پہچان سکتا تھا کہ یہ کتابت ہے یا ٹائپ کی چھپائی ہے۔ آج بھی کئی نوجوان اسی انداز پر کتابت کرتے ہیں اور بازار میں کمپیوٹر کی عربی کمپوزنگ کے مقابلے میں بھی وہ اپنی اہمیت منوائے ہوئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور ہمارے قدیم طرز کے دینی مدارس میں جب عربی لکھنے بولنے کا رواج بالکل نہیں تھا

مولانا مرحوم نے جدید عربی کی ایسی ہوا چلائی کہ دیوبند سے عربی جریدہ شائع ہونے لگا اور طلبہ کے عربی زبان میں دیواری جریدے کئی کئی نکلنے لگے، عربی میں تقریر و تحریر کا عام رواج ہو گیا اور دیگر مدارس میں بھی جدید عربی پر خصوصی توجہ دی جانے لگی، آج دیوبند اور دیگر قدیم طرز کے عربی مدارس میں جو ایک اچھی خاصی تعداد عربی لکھنے اور بولنے والوں کی پائی جاتی ہے "یہ سب پودا انہی کی لگائی ہوئی ہے"۔ ان میں سے بہت سے عرب ممالک میں اونچی پوسٹوں پر ہیں اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انسانی تعمیر و تزئین تو چونکہ ایک مدرس کے فرائض منصبی میں شامل ہے اس لئے اس میں اسے مہارت ہو تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن عمارتوں، مکانوں اور بام و در کی تعمیر و تزئین کے فن میں بھی اچھے اچھے انجینئر ان کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ سے قبل احاطۂ دارالعلوم (بشمول کتب خانہ و دار جدید و مسجد) کی تمام عمارتوں میں جگہ جگہ انھوں نے جو رد و بدل کیا اور تعمیری ہنرمندی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تعمیرات کے بڑے بڑے ماہرین بھی اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ جب تک دارالعلوم کے موجودہ در و دیوار قائم ہیں اور دیکھنے والوں کی یادداشت اور "اعتراف فضل کی اخلاقی خوبی" قائم ہے مرحوم کی فن تعمیر کی خوبیاں بھی زندہ رہیں گی۔

سب سے عظیم کارنامہ

مرحوم کا سب سے عظیم کارنامہ جو انھیں رہتی دنیا تک زندہ رکھے گا وہ ان کی عربی ادب کی لٹریری خدمت ہے۔ ان سے پہلے عربی سے اردو لغت میں سب سے معروف خدمت مولانا عبدالحفیظ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی مصباح اللغات ہے جو بہت جامع لغت ہے۔ لیکن اردو سے عربی لغت کے موضوع پر کچھ مختصر لغات بہت عرصہ قبل شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک فیروز اللغات کے نام سے زمانۂ طالب علمی میں میرے پاس بھی رہا ہے لیکن وہ بہت مختصر اور ناکافی تھا۔

مولانا مرحوم نے عربی سے اردو لغت میں بھی جو کام کیا ہے وہ مصباح اللغات سے بالکل الگ اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے، لیکن اردو سے عربی میں جو کام انھوں نے کیا ہے ہم بڑی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تو ان کو مقام اولیت حاصل ہے، دونوں طرح کے لغات میں ان کی امتیازی شان یہ ہے کہ انھوں نے دور حاضر کی ترقی پذیر جدید عربی زبان، جدید استعمالات و محاورات اور عالمگیر صنعتی و اقتصادی اور سائنسی انقلاب کے بعد کی لسانی تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے لغات مرتب کئے ہیں۔ اس میدان میں مصباح اللغات کی اہمیت کے بھرپور اعتراف کے باوجود وہ مولانا کے مرتب کردہ لغات کی جگہ نہیں لیتی۔ وہ ایک بالکل اچھوتا میدان اور خالی

جگہ بھی جس کو انھوں نے پُر کیا ہے، وہ کسی چلتے ہوئے راستے پر نہیں چلے بلکہ انھوں نے اپنے لئے الگ راستہ بنایا ہے ایسا راستہ جس کی شدید ضرورت بھی تھی۔

مذکورہ دونوں لغات (القاموس الجدید عربی اردو و اردو عربی) کی اشاعت کے بعد انھوں نے ان دونوں کا ضمیمہ بھی تیار کیا جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ پھر ان ضمیموں اور کچھ نئے اضافوں کو شامل کر کے دونوں لغات کو مزید جامع بنا کر شائع کیا۔ ایک لغت عربی زبان کی جدید اصطلاحات کا الگ سے "القاموس الاصطلاحی" کے نام سے ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ۱۹۸۷ء میں شائع کیا، لیکن زندہ زبانیں ہمیشہ انسانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہیں اور ان میں نمود و ارتقاء اور ترمیم و اضافات کا عمل برابر جاری رہتا ہے اس لئے ان سے متعلق لغات کا کام بھی کبھی بند نہیں ہوتا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اخیر میں ایک بہت جامع لغت تیار کیا تھا اور اس کی کتابت و تصحیح کا کام بھی بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا اور کچھ کام ابھی باقی تھا کہ اس سے پہلے ان کا جام حیات لبریز ہو گیا اور وہ اپنی حقیقی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کے بعد کا پیغام

لیکن اس نالۂ و شیون، مرثیہ و ماتم اور فریاد و فغاں کے شور اور غایت تاثر میں آپ یہ نہ بھولئے کہ دنیا جب سے آباد ہوئی اسی وقت سے اس کے دامن میں یہ ویرانیاں بھی رکھی ہوئی ہیں لیکن اس دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے، دس پھول مرجھاتے ہیں تو چمن میں ہر صبح کو سو پھول اپنی رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں، ہزاروں تارے اگر فنا ہوتے ہیں تو زندگی کا پیغام لے کر صبح درخشاں سامنے آجاتی ہے "کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"۔ مولانائے مرحوم نے اپنے خاندانی افراد۔ اپنے ہونہار برادران و صاحبزادگان اپنے باصلاحیت و حوصلہ مند شاگردوں اور اپنے نہایت باوسیلہ قدردانوں کی ایک فوج اپنے پیچھے چھوڑی ہے آج کی دنیا جانے والوں کے بعد ان کے ناموں سے میموریل سوسائٹیاں اور یادگار ادارے قائم کر کے ان کے ادھورے کاموں کو مکمل اور ان کے پیغام کو زندہ رکھتی ہے، ضرورت ہے کہ مولانا کی یاد کے ان جذباتی لمحات اور گرم ماحول میں ان کے تلامذہ و منتسبین کوئی ٹھوس عملی منصوبہ بنا کر ان کے مشن کو جاری رکھیں اور ہمارے ملک کی ضرورت کے لحاظ سے عربی لغت کی خدمت کے جو بہت سے گوشے ابھی باقی ہیں تلاش کر کر کے ان پر توجہ دیں، میری نگاہ مولانا مرحوم سے گہرا تعلق رکھنے والے ایسے بہت سے ہیروں پر ہے کہ وہ اگر سنجیدگی سے کوشش کریں تو غیر معمولی کام کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رنج و غم سے مغلوب ہو کر مایوسی و کم ہمتی کا شکار نہ ہوں گے۔ اور عزم و حوصلے سے کام کا کوئی جامع اور منظم پروگرام بنائیں گے، اور اس خلا کو تا بمقدور

(بقیہ ص ۲۷۷ پر)

مولانا محمد عُزیر قاسمی

سحر انگیز شخصیت

بات تو زیادہ دنوں کی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک دن صبح کو معلوم ہوا کہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مدرسہ اشاعت العلوم، پورہ معروف (مئو۔ یوپی) میں تشریف لائے ہیں۔ میں مولانا کو غائبانہ تو اچھی طرح جانتا تھا بلکہ مدرسہ اسلامیہ قرض گرام بردوان میں ان کی تصنیف القراۃ الواضحہ زیر تدریس بھی رہی تھی مگر ان سے ملاقات کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ مدرسہ اشاعت العلوم پہنچا، مولانا مدرسہ کے اساتذہ اور دوسرے علماء کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ ناظم مدرسہ مولانا امانت اللہ صاحب نے میرا تعارف کرایا، بہت خوش ہوئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ فرمایا کہ "آپ ہی مولانا عزیر صاحب ہیں، بارہا آپ کا ذکر خیر سن چکا ہوں"۔ انہی دنوں مولانا سعودی عرب کے سفر سے واپس آئے تھے اور ہندوستان و سعودی عرب کے طرز تعلیم پر کافی دلچسپ گفتگو کر رہے تھے مولانا کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ تعلیم و تربیت کے میدان میں ان کا تجربہ کتنا وسیع اور عمیق ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات و مسائل سے کتنی بصیرت مندانہ واقفیت رکھتے ہیں۔ حاضرین مجلس مولانا کے تجربات سے خوب محظوظ و مستفید ہوئے۔

میں نے مولانا سے پوچھا کہ تشریف آوری کا کوئی خاص مقصد ہے؟ مولانا نے فرمایا جی ہاں میں دارالمؤلفین کے تعارف اور اس کی ممبر سازی کے لئے اس علاقہ کا دورہ کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات کا تعاون درکار ہے۔ دیگر ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی مولانا کی آواز پر لبیک کہا اور ان کو اپنے محلہ کے مدرسہ معروفیہ میں لایا۔ بحمد اللہ اہل مقصد میں کافی کامیابی ہوئی اور بہت سے لوگ دارالمؤلفین کے ممبر بن گئے۔ مولانا بے حد خوش ہوئے۔ میں نے مولانا کو غریب خانہ پر تشریف

• پورہ معروف ضلع مئو۔ یوپی

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

لانے کی دعوت دی جسے بخوشی قبول فرمالیا۔ مولانا دیر تک میرے گھر تشریف فرما رہے۔ آج بھی مجھے ان کی سادگی یاد آرہی ہے۔

مولانا سے تفصیلی ملاقات کے دوران اندازہ ہوا کہ ان کی شخصیت میں بلا کی سحر انگیزی اور جاذبیت تھی۔ کوئی ان سے مل کر مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا ہر انداز فاضلانہ اور عالمانہ تھا گفتگو نہایت واضح اور مربوط، زبان بڑی شستہ اور فصیح اور لہجہ انتہائی باوقار تھا۔ مولانا سے مل کر معلوم ہوا کہ ان کے تلامذہ کیوں ان پر دل وجان سے فدا رہتے ہیں۔

مولانا کو میں نے نہایت متواضع، خلیق، وقت کا پابند اور نہایت متدین اور صاف گو پایا۔ تدین سے میری مراد اس کا روایتی تصور نہیں ہے، جس میں محض ظاہری وضع قطع کی درستگی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے اور باطن کی درستگی اور اخلاق عالیہ پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ مولانا مرحوم حقیقی معنوں میں دیندار تھے۔ تواضع، ایفائے عہد، حق گوئی اور سچی دردمندی ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ تملق اور منافقت سے انھیں حد درجہ نفرت تھی۔ افسوس کہ وہ اپنے بعض "متدین" رفقا کی منافقانہ چالوں کا شکار ہوئے اور بالآخر اس دنیا کے رفقاء کو چھوڑ کر رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

مولانا کا میں ذاتی طور پر احسان مند ہوں کہ انھوں نے میرے لڑکے اسعد سلمہٗ کو دارالمؤلفین میں اپنے زیر تربیت رکھ کر اس کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور مجھ جیسے ہزاروں باپ ہیں جو اپنے نونہالوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے میری ہی طرح مولانا کے ممنون ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے پایہ کے عالم اور عربی داں اساتذہ تو مل جائیں لیکن ان جیسا معلم و مربی اب چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہزاروں فضلاء کے اس مربی کو کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔ آمین۔

بقیہ : علوم و معارف کی ایک دنیا

پورا کریں گے، ایک عرب شاعر نے کہا ہے ؎

اذا مات منا سید قام سید

قؤول لما قال الکرام فعول

(ہمارے درمیان سے جب کوئی ایک سردار مرتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے جو شرفاء کی ہی باتوں کا بولنے والا اور انہی کے کردار کا حامل ہوتا ہے)

مولانا عبد الستار سلام قاسمی

میرے مولانا

۱۶؍اپریل ۱۹۹۵ء کی دوپہر میں کشمیری گیٹ پر ایک مدرسہ کی افتتاحی تقریب میں کچھ کہہ کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ کسی نے کہا "مولانا وحید الزماں صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اُن کے لیے بھی دُعائے مغفرت کرنا" ـــــــ ان الفاظ کے کانوں میں پڑتے ہی دِل بیٹھ سا گیا، ہائے یہ سب کیسے ہوگیا۔ مولانا اتنی جلد ہم سے چھن جائیں گے یہ تو سوچا بھی نہ تھا اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون ...

مولانا سے ملے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا، کئی بار دیوبند حاضری کا ارادہ کیا لیکن حالات کی ستم ظریفی کہیے یا اپنی بدقسمتی کہ یہ ارادہ محض ارادہ ہی ہو کر رہ گیا... وانا بفراقک یا استاذ لمحزونون ...

مولانا کے باکمال شاگردوں کی طویل فہرست ہے جو برِّ صغیر ہی میں نہیں، چاردانگ عالم میں استاذِ محترم کے نام کو روشن کئے ہوئے ہیں، اپنا یہ منہ کہاں کہ ان کی عظمت و کمال کے سامنے سَر اُٹھا سکوں، ہاں یہ سعادت اس خاکسار کو ضرور حاصل ہے کہ حضرت مولانا ہی کے طفیل دارالعلوم دیوبند جانا ہوا اور وہاں کچھ پڑھنے اور سیکھنے کی توفیق ہوئی۔

اگرچہ بظاہر یہ ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے پہلے مولانا وحید الزماں کو عربی رسالہ "دعوۃ الحق" میں دیکھا اور پڑھا اور اس درجہ متاثر ہوا کہ صرف اُن سے عربی سیکھنے اور پڑھنے کے شوق بلکہ عشق میں کشاں کشاں دیوبند پہونچ گیا۔

دارالعلوم کی طالب علمی کے چھ سال مولانا ہی سے وابستگی میں گذرے، افراد سازی

مہتمم دارالعلوم دہلی (سابق نائب معتمد دارالمؤلفین دیوبند)

میں ان کے خلوص اور محنت نے ان کا گردیدہ بنا دیا تھا، طلبہ کے ساتھ ان کو کیسی سچی ہمدردی تھی۔ اس کا ایک نمونہ "النادی الادبی" کے ایک سالانہ اجلاس کے موقعے پر دیکھنے کو ملا، اجلاس سے اگلے روز چائے پارٹی کا پروگرام تھا اور بڑے سے اسٹو پر دودھ کھول رہا تھا، اچانک ایک طالب علم دودھ کے پاس غش کھا کر گر پڑا۔ ہم سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ الٰہی خیر یہ کیا ہوا؟ اتنے ہی میں مولانا کی آواز سنائی دی "ڈاکٹر کو بلاؤ، جلدی کرو" چند ہی ثانیے گذرے تھے کہ مولانا ننگے پیر وہاں سے دوڑتے ہوئے زینے سے اترے، احاطہ مولسری آئے، وہاں شاید کسی سے چپل لیے اور صدر گیٹ کی طرف دوڑے، وہاں ڈاکٹر صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے انھوں نے آکر دیکھا، کچھ دوا دی۔ خدا خدا کرکے وہ ہوش میں آیا تو تشویش دور ہوئی، ایسے میں ظاہر ہے چائے پارٹی کا نظم سب درہم برہم ہو چکا تھا لیکن یہ مولانا کی ذہانت تھی کہ انھوں نے یہ کہہ کر پھر مجلس جما دی کہ "اب ان کی صحت کی خوشی میں چائے پارٹی ہوگی"۔

مولانا کی زندگی ایک مشینی زندگی تھی، تعطل وجمود اور تساہل سے انھیں قطعی نفرت تھی، احقر کے قیام بنگلور کے دوران مولانا کا اس طرف سفر ہوا۔ احقر کی دعوت پر حضرت تشریف لائے تو حجرے کے ایک کونے میں کچھ کوڑا دیکھ کر صفائی کی طرف متوجہ فرمایا، میں نے عرض کیا حضرت! یہاں مسجد میں مستقل صفائی کرنے والا خادم موجود ہے۔ اتفاق ہے آج نہیں آیا۔ بڑی شفقت سے فرمایا "ایسی عادت نہ بناؤ کہ ملازم آئے گا تبھی صفائی ہوگی۔ اگر وہ نہیں آیا تو خود صفائی کرلو"۔ اسی موقعہ پر فرمایا تھا، یہاں اتنے دور کہاں آگئے، قریب آجاؤ، کوئی کام نکال لیں گے، میں دیوبند آگیا اور وہاں "مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ہند" کا کچھ کام سونپ دیا گیا، عربی لکھنے پڑھنے کی جو تھوڑی بہت مشق تھی دارالعلوم چھوڑنے کے بعد تقریباً ختم ہوگئی تھی لیکن مولانا میں اپنے شاگردوں کو آگے بڑھانے اور ان سے کام لینے کا جذبہ کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کی ایک چھوٹی سی مثال میں خود ہوں، مولانا نے شروع شروع میں کچھ عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا اور شائع کیا، ان کی مسلسل حوصلہ افزائیوں سے ہمت بندھی پھر اردو سے عربی ترجمے کرائے اور پسندیدگی کا اظہار کیا، اسی دور میں مولانا کی زیر نگرانی "شعبۂ عربی جمعیۃ علماء ہند" کا قیام عمل میں آیا اور احقر اس سے باضابطہ منسلک ہوگیا اور میرا کام صرف "فدائے ملت" کی تقریروں کو عربی جامہ پہنانے کا رہ گیا۔

بعد میں جب "فدائے ملت" حضرت مولانا جیسے مخلص، جاں نثار کے ذریعہ اپنے تمام

مقاصد کی برآری میں کامیاب ہو گئے اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا خون کرکے انھیں نچوڑ کر رکھ دیا تو ان کا نحیف و نزار جسم میں بھی موصوف کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگا اور آخر مکر و فریب کی سیاست نے انھیں دارالعلوم سے جس کے ایک ایک ذرّے سے انھیں عقیدت تھی، سازشیں کر کر کے الگ کرا دیا ــــــــــ اس وقت یہ شعبہ بھی انتقام کی آگ میں بھسم ہوگیا۔

مولانا اپنے معاون مہتمم ہونے کے زمانے میں ایک بار آندھرا کے سفر پر لے گئے، کوئی مہینہ بھر کا دورہ تھا، مولانا نے اس دوران، اپنے ساتھ سفر کرنے والوں کے آرام و راحت کا جس قدر خیال رکھا اور شاگردوں کو استاذ کے روایتی مصنوعی ادب و احترام کے خول سے نکال کر بے تکلف بنایا، اس سے ان کی عظمت گھٹنے کے بجائے دو چند ہوگئی۔

مولانا انتھک محنت کرنے والے مشینی انسان تھے، سفر میں ہم لوگ تھک جاتے اور ذرا رُک کر آرام کرنا چاہتے "کلوا واشربوا" بھی پیش نظر ہوتا لیکن وہ ہمت کا پہاڑ، ہشاش بشاش پوری طرح چاق و چوبند نظر آتا ہے۔ راستے میں نماز وغیرہ کے لیے اگر رُکے تو وہاں ٹھہرنے کا وقفہ متعین ہوتا، حکم تھا کہ میں اتنے بجے گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا اور ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کردے گا، اگر کوئی رہ گیا تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا ــــــــ" ہم نے سمجھا یونہی کہہ رہے ہیں، لیکن ایک مقام پر انھوں نے ایسا کرکے بھی دکھایا اور خوب دوڑایا اور تھکایا لیکن وقت کی پابندی کا ــــــــ کم از کم اس سفر کے دوران ــــــــ انمول گُر سکھا دیا۔

مولانا کو اس سفر میں دارالعلوم کی تعمیرات نو کے لیے چندہ فراہم کرنا تھا اور وہ اس میں سو فیصد کامیاب رہے، لیکن کیا بتاؤں، انھوں نے کس عزت نفس کے ساتھ یہ کام کیا اور ناموس دارالعلوم کا کس قدر خیال رکھا ــــــــ ایک جگہ ایک بڑے آدمی سے ملاقات کی، علاقے کے علماء اور سربرآوردہ شخصیتیں ساتھ تھیں، خدا جانے کیا ہوا، وہ صاحب کیا کہنا چاہتے تھے؟ لیکن تمہید سے ایسا لگا گویا وہ چندے کو ایک گھٹیا کام سمجھ رہے ہیں، بس پھر کیا تھا، مولانا ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ گئے، ان صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی، غرور و نخوت کے انجام بد سے ڈرایا اور کسی قیمت پر وہاں بیٹھنے کے لیے تیار نہ ہوئے، ہر چند اس نے بعد میں معذرت کی اور خطیر رقم پیش کرنی چاہی لیکن مولانا نے ذرا پرواہ نہیں کی اور اس بڑی رقم کے مقابلے میں دارالعلوم کی عظمت، و وقار کا خیال رکھا۔

ٹھیک اسی موقع پر مولانا کے ایک عزیز شاگرد نے بڑی لجاجت سے اپنے گاؤں چلنے کی ـــ جو قریب ہی تھا ـــ دعوت دی، مولانا نے کہا، "میرا یہ سفر دارالعلوم کے لیے ہے ذاتی دعوت کے لیے نہیں " انھوں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ اپنے گاؤں کی غربت کا ذکر کیا مولانا نے ان سے جبکہ ابھی کچھ دیر پہلے ایک بڑی رقم کو ٹھکرا دیا تھا، کہا:

"میاں! دس روپے بھی ہو جائیں گے یا نہیں!!" یہ ایسا جملہ تھا کہ وہ صاحب ہی نہیں بلکہ ہم سب بھی دم بخود رہ گئے، اور وہ سو جان سے نثار، اپنے گاؤں لے گئے، اور یقین کیجیے وہاں عزت و احترام کے ساتھ اتنا ہلا اتنا ہلا کر ہمارے ذہنوں سے وہ موٹی رقم جانے کا افسوس، قلبی راحت و فرحت میں بدل گیا۔

مولانا اپنے شاگردوں کو بہت کچھ بنانا چاہتے تھے، افراد سازی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اسی تگ و دو میں اپنے آپ کو گھلا کر رکھ دیا۔ کیسے کیسے سنگ ریزوں اور خاک کے حقیر ذرّوں کو، مولانا نے اپنی خداداد صلاحیت سے رات دن ایک کرکے لعل و گوہر بنا ڈالا۔ یہ مولانا کا وہ وصف ہے جس میں قریب کی ایک صدی بلکہ اس سے بھی زائد عرصے میں ان کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔

اپنے شاگردوں کی ترقی کے لیے جہدِ مسلسل، ان کی قدم قدم پر خیر خواہی و رہنمائی اور ان کی مصیبت و پریشانی میں نہ صرف زبانی و اخلاقی ہمدردی بلکہ مالی تعاون، یہ وہ خوبیاں ہیں جو علمائے متقدمین کے یہاں تو خوب نظر آتی ہیں لیکن بعد کے دور میں بتدریج کم سے کم تر ہوتی چلی گئیں۔ اور آج کے دور میں جہاں شاگرد اپنے اساتذہ کو گرانے اور ذلیل کرنے کی فکر میں رہتے ہوں مولانا مرحوم کی ذات عجوبہ ہی لگتی ہے۔

وہ سچ مچ "عجوبہ" ہی تھے، نہ زمانہ اُن کا ساتھ دے سکا اور نہ وہ زمانے کا ساتھ دینے پر تیار ہو سکے ... نہ ان کی جرأت و صاف گوئی، اور احقاقِ حق کے "جرم" کو بخشنے کیلئے مکر و فریب کی سیاست تیار ہوئی، اور نہ ہی وہ نفاق و مصلحت پسندی کے جامے کو زیب تن کرنے کے لیے تیار ہوئے جبکہ اس کے عوض سیم و زر کی بارش یقینی تھی لیکن پتہ نہیں کس مٹی کے بنے تھے، یہی رٹ تھی کہ کچھ ہو جائے لیکن میں عیب کو ہنر اور زہرِ ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکتا۔

وہ اپنی بات کے دھنی اور فیصلے کے پکے تھے اور اس کی خاطر کوہ وکہسار ہی نہیں،

آگ و پانی کے دریا تک سے گذر جانے کے لیے تیار رہتے تھے، حاشا و کلا، یہ کوئی مبالغہ یا عقیدت کا کوئی جوش نہیں بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے جس کا مشاہدہ بارہا دیکھنے والوں نے کیمپ دارالعلوم کے زمانے میں اور اس سے پہلے اور بعد میں کیا ہے، ہاں اُن کے عزم وارادے سے انہیں کوئی چیز روک سکتی تھی تو وہ قوتِ بازو نہیں ______ قوتِ استدلال تھی اور پھر مولانا ایک بچے کی رائے سے بھی رُک سکتے تھے، بشرطیکہ معقول دلائل سے انہیں قائل کرایا جائے۔

مولانا "المؤمن غرٌّ کریم" کا نمونہ تھے، طبیعت میں سادگی اور شرافت ایسی کہ معافی کا خواستگار ہونے پر بڑے سے بڑے دشمن اور موذی کو نہ صرف کھلے دل سے معاف کر دینا بلکہ اس پر پہلے سے زیادہ مہربان ہوجانا ایک عام اور مشہور بات تھی۔ دارالعلوم کے ایک موقر استاذ نے ایک بار مجھ سے کہا تھا: "شیخ! مولانا کو چاہے قتل کرنے کے لیے پہونچ جاؤ اور پھر آکر معافی مانگ لو وہ معاف کردیں گے۔"

مولانا نے سب کو یہاں تک کہ بدسے بدتر مخالف اور ایذا رساں کو بھی معاف کردیا لیکن ان کو کسی نے معاف نہ کیا، ان کا "جرم" سب سے بڑھ کر جو تھا ______ !

ان کی تربیت کے انداز بھی نرالے تھے، صف ثانوی کے سبق میں ایک مرتبہ کاپیاں خود جانچنے کے بجائے، طلبہ ہی کے حوالے کردیں، فرمانے لگے:

"اپنی اپنی کاپیاں خود جانچو اور غلطیوں پر نشان لگاؤ" ______ خیر یہاں تک تو کوئی خاص بات نہ تھی لیکن اس کے بعد جو جملہ کہا وہ صرف انہی کا حصہ تھا، فرمایا: "جو جتنی زیادہ غلطیاں نکال کر لائے گا وہ اتنے ہی زیادہ نمبرات کا مستحق ہوگا اور جس کی کوئی غلطی نہ نکلی وہ سزا پائے گا۔"

لیجیے! لوگ غلطیاں کم آنے پر انعام کے مستحق ہوتے ہیں، یہاں سزا کے مستوجب قرار دیے جارہے ہیں، طبیعت بہت جھنجھلائی، لیکن کیا کرسکتے تھے، طلبہ نمبرات حاصل کرنے کے شوق میں کم اور سرزنش کے خوف سے زیادہ مشق کی کاپیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنی غلطیاں نکالنے کے کام میں لگ گئے... ہفتوں، مہینوں یہ سلسلہ رہا، اس وقت تو بات سمجھ میں نہیں آئی ______ اس لیے بھی کہ میں صف ثانوی میں سب سے چھوٹا طالب علم تھا۔ لیکن ایک عرصے کے بعد احساس ہوا کہ مولانا نے کس حکیمانہ انداز میں نحوی و صرفی قواعد کا استحضار کرایا اور غلطیوں کی اصلاح کی۔

یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا ——— اس سے بھی بڑا اور زندگی کا پہلا اور انوکھا تجربہ اس وقت ہوا جب مولانا نے سہ ماہی یا ششماہی امتحان کے موقع پر یہ کہہ کر مبہوت کر دیا کہ "امتحان کے پورے وقفے (غالبًا ایک گھنٹہ) کوئی نگرانی کرنے والا نہیں ہوگا، صرف خدا کی نگرانی میں پرچہ حل کرنا ہے، اگر اس میں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں تو معاف کر دی جائیں گی، لیکن یاد رکھو، نقل کرنا تو دور کی بات ہے، اگر کسی نے گردن موڑ کر بھی پیچھے دیکھا تو وہ فیل کر دیا جائے گا" ——— یہ کہہ کر اور پرچہ تقسیم کر کے مولانا درسگاہ سے باہر چلے گئے اور ایک گھنٹے تک امتحان گاہ میں ایسا سناٹا اور ہُو کا عالم رہا کہ شاید و باید، ہم میں سے ہر ایک کو یقین تھا کہ مولانا پیچھے کھڑے ہوئے ہیں اور اس خوف سے کوئی کنکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا ... وقت پورا ہونے پر مولانا آ گئے اور سب کا پیاں لے لیں، ہم سب باہر نکل آئے۔ لیکن یہ سنکر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مولانا تو اسی وقت پچھلے زینے سے اپنے کمرے چلے گئے تھے ——— یا للعجب! یہ ایک گھنٹے تک مولانا کا جادو تھا یا کچھ اور، آج تک سمجھ میں نہ آ سکا۔

مولانا کو دارالعلوم کے ذرے ذرے سے محبت اور اپنے اکابر سے غایت درجہ عقیدت تھی، وہ چاہتے تھے کہ ان کے علوم و معارف پر اکیڈمی کے طرز کا ٹھوس، تحقیقی اور معیاری کام ہو تاکہ ہمارے اکابر کی عظمتِ شان آج کی علمی دنیا میں اور زیادہ اُجاگر ہو، انھوں نے کوشش کی کہ یہ عظیم و تاریخ ساز علمی کارنامہ دارالعلوم ہی کے زیرِ سایہ انجام پذیر ہو لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور ان کی مخلصانہ کوششیں سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئیں، کوئی اور ہوتا تو شاید ہمت ہار جاتا، لیکن اس مردِ آہن نے تو یہ سیکھا ہی نہ تھا، انھوں نے اس مقصد کے لیے ایک جگہ خرید کر تعمیر کرائی اور "دار المؤلفین" کی داغ بیل ڈال دی۔

اس ادارے کے قیام سے مولانا کے کئی مقاصد تھے، اپنے اکابر کے علوم کا احیاء اور ان کو ایڈٹ کرا کے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرنا۔ اپنے ان معاصرین و تلامذہ کے قلم کو جنہیں تصنیف و تالیف کا ذوق ہے جلا بخشنا اور پروان چڑھانا یہاں کے طلباء و اساتذہ کے لیے، عالم عرب کے نوع بہ نوع مفید لٹریچر کا ترجمہ و اشاعت۔

مولانا نے اپنے ادارے کا افتتاح شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سوانح حیات، "مآثر شیخ الاسلام" سے کیا، ان دنوں مولانا کو اس کتاب کی کتابت و طباعت سے جو شغف

تھا قریبی حضرات بخوبی واقف ہیں ... مولانا کی دلی خواہش تھی کہ اپنے تمام اکابر کی ایسی ہی جامع اور مبسوط سوانح حیات شائع ہو۔
اکابر کے علوم و معارف کو ایڈٹ کرانے کے لیے ابتدا کہاں سے کریں؟ کہ ایں خانہ تمام آفتاب است ... آخر سالارِ قافلہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر نگاہیں رُک گئیں اور کام شروع ہوگیا ... ہرچند لوگوں نے سمجھایا: حضرت! اکابر پر تحقیقات کا کام تجارتی نقطۂ نظر سے قطعی بے سود بلکہ نقصان دہ ہے لیکن وہ اس تمام قیل قال سے بے نیاز اپنے مشن میں رواں دواں تھے، شاید بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ اس خدمت کو زادِ آخرت سمجھ کر کر رہے تھے ...

ان کی ایک ایک ادا یاد آتی ہے تو دل تڑپ اُٹھتا ہے، شاگردوں کے ساتھ طرزِ تخاطب اس قدر مہذب، شائستہ اور معیاری تھا کہ اس کی مثال، طالب علمی کے دَور میں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ مجلس میں اپنے پاس بٹھاتے ہوئے، فرق مراتب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، لبا اوقات سینئر کو اپنے سے دُور اور جونیئر کو قریب بیٹھے دیکھتے تو مجلس ہی میں اٹھا کر ترتیب درست کرتے، انھوں نے ہمیشہ تلامذہ کو "رفقاء" اور "اصحاب" ہی سمجھا، خادم و کفش بردار نہیں ... حد تو یہ ہے کہ وہ نچلے درجے کے ملازمین کو "نوکر، دچپراسی" کہنے کے خلاف تھے اور انھوں نے معاون مہتمم ہونے کے دَور میں، اس طبقے کے احساسِ کمتری کو ختم کرنے کے لیے نئی نئی باوقار اصطلاحیں وضع کی تھیں۔

سچ ہے وہ وحید الزماں ہی تھے ... زمانے میں اکیلے اور نرالے ہی رہے، یقیناً ایسے ہی دیدہ ور وحید الزماں کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا غیاث الحسن مظاہری

ایک منفرد قائد و مجاہد

حریتِ آزادی کی سرزمین کیرانہ (ضلع مظفرنگر۔یوپی) نے جنگِ آزادی کے عظیم اور صفِ اوّل کے جلیل القدر بزرگ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (بانی مدرسہ صولتیہ مکۃ معظمہ) کے بعد ایک ایسا مردِ مجاہد اور بے مثال قائد اور جرأت وہمت، عزم واستقامت کا کوہِ گراں پیدا کیا جس کا نام تھا مولانا وحیدالزماں کیرانوی۔

مولانا وحیدالزماں کی عمر اگرچہ ۶۴ سال ہوئی۔ مگر اس پوری زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں وہ متحرک، مستعد اور فعال نظر نہ آتے ہوں۔ جہدِ مسلسل اور عمل پیہم کا نام تھے، مولانا وحیدالزماں کیرانوی۔

مولانا کی شخصیت ان کی تعمیری، تعلیمی طویل خدمات اور کارناموں کی وجہ سے اس قدر محبوب اور ہردلعزیز ہوگئی تھی کہ ہر خاص وعام انتہائی محبت واحترام سے ان کا نام لیتا تھا اور سر جھکاتا تھا۔ ان کی محبوبیت ومقبولیت اور مرجعیت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ رجال سازی ان کا ایک اہم اور وصف خاص تھا۔ انھوں نے بہت سے سنگریزوں کو ہم پایۂ لعل وگوہر بنایا۔ خاک سے اٹھا کر افلاک پر بٹھایا، غریب ونادار اور غیر مستطیع طلبا کی ہر محاذ پر اعانت حوصلہ افزائی اور دل جوئی کرکے ان کے لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کو حصولِ علم کے لیے مرکوز کیا۔ کڑی محنت، نظم وضبط، ڈسپلن، حسنِ اخلاق، ادب، شائستگی ان کی تعلیم وتربیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

تعلیم وتربیت کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں جس قدر لگن اور کڑی محنت سے علم حاصل کیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ ان کے تلامذہ بھی اسی نہج اور طرز کے عادی ہوں۔ وہ کسی بھی کام میں جمود اور تعطل کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ ان کے تلامذہ پوری دنیا میں عموماً اور عالمِ اسلام میں خصوصاً ہزاروں کی تعداد میں اہم اور کلیدی

ایڈیٹر ماہنامہ دینی مدارس، دہلی
(افسوس کہ مولانا سید غیاث الحسن صاحب ۲۲،۲۳ ستمبر ۱۹۹۵ء کی درمیانی شب میں اللہ کو پیارے ہوگئے)

عہدوں پر سرفراز ہیں اور پوری ذمہ داری سے مفوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ عربی زبان وادب کے رمز آشنا اور نکتہ شناس تھے۔ ان کی عربی ادبی تخلیقات مدارس عربیہ اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں۔ بلاشبہ وہ طلبا کے لیے محسن، سرمایۂ رحمت ربانی اور شفیق باپ کا درجہ رکھتے تھے۔

نظم ونسق اور حسنِ کارکردگی کے اعلیٰ اوصاف اور خوبیوں کی وجہ سے وہ دارالعلوم کے معاون مہتمم بنائے گئے ہر شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی اور تعلیمی معیار بہت بلند ہوا۔ عرصے سے چلی آرہی بدنظمی دور ہوئی اور تعطل ختم ہوا، طلبا مسرور ومطمئن اور اساتذہ وملازمین خوش ہوئے۔

مجھے یہ لکھنے میں کوئی حجاب نہیں کہ اس زمانہ میں جبکہ دارالعلوم کو مولانا کی شدید ضرورت تھی، چند سیاسی شعبدہ گروں نے ان کو دارالعلوم کی خدمات سے محروم کردیا یہ ایک سیاسی جھٹکہ تھا، جس نے برقی لہر بن کر ان کی زندگی کی ساری لطافتوں کو خاکستر کردیا۔

وہ سیاسی شعبدہ بازوں کی ستم ظریفی اور سنگ دلی سے واقف نہ تھے۔ وہ فطرتاً اور مزاجاً اتنے معصوم اور اپنے کام میں اس قدر مخلص اور سچے تھے کہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ ان کے غیر مخلص دوست ان کو دارالعلوم سے اور دارالعلوم کو ان کی خدمات سے محروم بھی کرسکتے ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے کہ جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔

ناسازگار حالات کا یہ وہ رُخ ہے جس نے ان کی صحت کو تباہ کردیا، زندگی کی حرارت چھن گئی اور عزم وہمت اور حوصلہ کی ساری توانائیاں جیسے سلب ہوگئی ہوں۔

مرض نے شدت اختیار کرلی۔ دو ماہ مسلسل وہ مردِ مجاہد موت وزیست کی کش مکش سے دوچار رہا بالآخر ان کی روح ۱۵ر اپریل ۱۹۹۵ء کو قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

بقیہ : مِلّی دردمندی کی علامت

تھا جو ان کی ذات پر حکیم الاسلام کو تھا۔ سوچئے تو سہی وہ دارالعلوم سے کب نکالے گئے؟ کس کے عہد میں یہ کارِ خیر انجام پایا۔ بس اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکیم الاسلام زندہ ہوتے تو ان کے دلی جذبات وخیالات سن کر اپنے سینے سے لگا لیتے۔ یقین ہے کہ ان کی روح خوش اور مطمئن ہوگی۔

مولانا وحید الزماںؒ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی روح ہم سے مخاطب ہوکر کہہ رہی ہے۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا ڈاکٹر فرقان مہربان القاسمی المدنی•

حضرت الاستاذ رح

بلاشبہ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمہ اللہ کی عظیم شخصیت کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کی تصویر کشی، ان کی گوناگوں خصوصیات، عظیم تر اوصاف وکمالات کے باعث دشواری نہیں بلکہ دشوار تر ہے۔ حضرت والا کی ذات ستودہ صفات ایک انجمن، ایک متحرک اور فعال تحریک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے علماء دین اور قائدین ملت کے لئے ضروری ہیں جو اداروں اور قوموں میں ایک صالح انقلاب لاتے ہیں، افسردہ قلوب میں نئی روح اور نئی زندگی ڈالتے ہیں، اگر آپ کے علمی وفطری اوصاف وکمالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے چند سطور کافی نہیں بلکہ ؎

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

علم وفضل، راست گفتاری، اصول پسندی، نظافت ولطافت، استغنار، معاملات کی صفائی، امانت ودیانت، ایمان ولیقین، عزم وہمت اور جوش وولولہ سے لبریز دل، فصیح وبلیغ زبان، خورد نوازی، اہم مجلسوں اور نازک موقعوں پر حاضر دماغی وحاضر جوابی، مربوط ومنطقی گفتگو، خلوص کا ایک دریائے بیکراں، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی وفطری محبوبیت، اپنے اسلاف سے بے مثال محبت، مظلوموں اور کمزوروں کی نصرت وحمایت۔ یہ تھے حضرت والا کے عظیم اوصاف۔

جن حضرات نے حضرت الاستاذ کو قریب سے نہیں دیکھا ان کو شاید ان اوصاف کے ذکر میں مبالغہ نظر آئے مگر جن لوگوں نے حضرت الاستاذ کو قریب سے دیکھا اور برتا ہے ان کو بالیقین ان اوصاف کے ذکر میں تشنگی محسوس ہوگی۔

• بانی ومہتمم جامعۃ القرآن الکریم، بجنور

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مجھے الحمدللہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مسلسل ۱۳ سال تک جلیل القدر اساتذہ اور ماہرین علوم وفنون سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا، مگر بیک وقت اتنی خصوصیات کی حامل و جامع شخصیت میری ان آنکھوں نے نہیں دیکھی اور طلبہ عزیز کے ساتھ بے پناہ محبت، ان کی استعداد سازی ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کے دکھ درد میں ایک باپ کی طرح شریک رہنے کا جو عظیم جذبہ آپ کے دل میں موجزن تھا اس کی تو کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ چلا گیا تو حضرت والا کی مصروفیات میں مزید اضافہ ہوا، صد سالہ کے موقعہ پر کم وقت میں جدید تعمیرات کا حیرت انگیز کارنامہ اور اس سلسلہ کی اور بہت سی خدمات کی خبریں وہاں سامعہ نواز ہوتی رہیں اور ہم بڑی دلچسپی کے ساتھ حضرت والا کی خدمات کا ذکر سنتے اور کرتے تھے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں ایک عظیم انقلاب آیا جس کے آپ روح رواں تھے، دارالعلوم کی نشأۃ ثانیہ آپ کی رہین منت ہے، مگر اس انقلاب کے بعد جب آپ کی قیادت و رہنمائی کا وقت آیا تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ سے صرف اتنا کام لیا گیا جس سے اقتدار میں استحکام پیدا ہو جائے اور دارالعلوم کے تمام شعبوں میں نئی زندگی اور نیا خون دوڑ جائے۔ اس قلیل عرصہ میں جس میں حضرت والا معاون مہتمم کے اہم اور کلیدی منصب پر جلوہ فرما تھے، آپ نے نامساعد سے نامساعد حالات میں وہ غیر معمولی کارنامے انجام دیئے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اس وقت دارالعلوم دیوبند کے تمام امور تو بحسن وخوبی انجام پا ہی رہے تھے۔ مگر اس موقعہ پر دارالعلوم کی توسیع و ترقی کے لئے آپ نے جو بے مثال اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اس وقت کا سب سے نمایاں باب ہے۔ عین اس وقت جبکہ تقریباً دارالعلوم میں جگہ جگہ تعمیر کا کام پورے زور وشور اور آب وتاب کے ساتھ چل رہا تھا اور اس کے تمام شعبوں کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے کیے گئے متعدد اقدامات کے پیش نظر اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ اچانک مالی مشکلات کا چیلنج آپ کے سامنے کھڑا کیا گیا جسے آپ نے بڑی ہمت وجرأت کے ساتھ قبول کیا اور اس کے سامنے کبھی آپ نے سپر نہیں ڈالی۔ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا ایسے نازک اور حساس موقعہ پر ہمیشہ جو کردار رہا اس کو دیکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ بلیغ تقریر یاد آنے لگتی ہے:

"بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر وسامان واسباب کار فراہم نہیں ہوتے لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر وسامان نہیں تو اپنے ہاتھ سے تیار کر لوں گا، اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیئے، اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے، اگر انسانوں کی

زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہئے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہئے، اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے، وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے وہ وقت کا خالق اور عہد کا بانی والا ہوتا ہے' وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبش لب کا انتظار کرے، وہ دنیا پر اس لئے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں، وہ یہ دیکھنے کے لئے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے، جس کو پورا کردوں "

چنانچہ آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ ان صبر آزما حالات کو برداشت کیا اور اپنے قیمتی وقت اور صحت کا خیال پس پشت ڈال کر اس پُر مشقت اور کٹھن کام کی ذمہ داری اپنے سر لی اور بنفس نفیس چندہ کے حصول کے لئے اسفار شروع کر دیئے، جس میں آپ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس وقت آپ کی مصروفیت بلکہ دیوانگی کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا۔ ایک صاحب نے مجھے بتایا جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے کہ ایک روز رات کے وقت مجھے کچھ شور کی آواز آئی، ۱۱ یا ۱۲ بجے کا عمل تھا، میں باہر نکلا تو دیکھا کہ گیس کی لالٹین لئے کچھ لوگ دوڑ رہے ہیں، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب چندہ کے سفر سے اسی وقت واپس تشریف لائے ہیں اور رواق خالد کی بالائی منزل جو اس وقت زیر تعمیر تھی اس کا معائنہ فرمارہے ہیں۔

بہرحال اس وقت آپ نے دارالعلوم کے ہر مسئلہ کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا مگر اس وقت بھی اصل اور مکمل زمام کار آپ کے ہاتھ میں نہ تھی، حالات مزید نامساعد ہوئے، چندہ کے اسفار میں بھی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، آپ سے بہت سے اختیارات لے لئے گئے، جب آپ نے اپنی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا خون ہوتے دیکھا تو آپ نے اس اہم عہدہ سے استعفا دے دیا اور آپ کی فطرت و طبیعت آپ کو پھر درس و تدریس پر لے آئی۔ مگر اس وقت طبیعت کی پہلی سی شگفتگی اور رعنائی باقی نہ تھی۔ حوادث اور مصائب و آلام نے آپ کے قلب و دماغ کو غیر معمولی متاثر کر دیا تھا، رفقاء کار کی کرم فرمائیوں سے آپ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا دل زخموں سے چور چور تھا اور جسم بیماریوں سے زار و نزار۔ ان تمام رکاوٹوں اور موانع کے باوجود نہ عزم و ہمت میں کوئی کمی تھی، نہ جذبات و احساسات سرد تھے، اندرون دارالعلوم جب آپ کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر آپ نے محض اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اور ظاہری بے سروسامانی

کے باوجود ایک علمی وتصنیفی ادارہ قائم فرماکر اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور عواقب ونتائج سے بے پرواہ ہوکر میدان عمل میں قدم رکھا اس وقت کی آپ کی قوت ارادی، بلند حوصلگی کی ترجمانی کے لیے اگر اسلامی شاعر سعد بن ناشب کا یہ شعر پیش کیا جائے تو برمحل ہوگا۔

اذا هم القى بين عينيه عزمه　　　وينكب عن ذكر العواقب جانبا

شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو اپنے مقصد کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ لیتا ہے اور نتائج سے بالکل آنکھیں بند کرلیتا ہے، چنانچہ آپ کی یہ کوشش بھی خوب ثمرآور ہوئی اور چند سال کے دوران وسائل کی قلت کے باوجود دو درجن سے زیادہ علمی تحقیقی کتابیں دارالمؤلفین سے شائع ہوکر مقبول ہوئیں اور ایک درجن کے قریب مسودات اب بھی ایسے موجود ہیں جو طباعت کے لئے تیار ہیں یا پھر زیر کتابت وتالیف ہیں اور شاید بہت سے لوگوں کے لئے یہ بات ایک انکشاف ثابت ہوکہ حضرت رحمہ اللہ کی سب سے عظیم اور شاہکار تصنیف ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے جس کو آپ نے دارالعلوم دیوبند سے جبری سبکدوشی کے بعد تصنیف فرمایا ہے وہ ہے عربی اردو ڈکشنری جو مصباح اللغات کے سائز کے تقریباً اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے جو موجودہ تمام اردو عربی ڈکشنریوں سے بہت زیادہ ممتاز اور ان کا نعم البدل ہے۔ حضرت والا کی خواہش تھی کہ میری حیات میں یہ عظیم کتاب منظر عام پر آجائے۔ مگر ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دارالعلوم دیوبند سے جبری سبکدوشی کا جام جب آپ کے لبوں سے لگا جس کی تلخی تادم زیست حضرت والا کے گلوگیر رہی مگر اس وقت بھی آپ مایوسی کا شکار نہیں ہوئے۔ دارالمؤلفین کی شکل میں اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مدارس اسلامیہ کی رہنمائی میں قائدانہ رول ادا کیا، ان کے لئے اساتذہ مہیا کئے، وہاں جاجاکر تعلیمی تربیتی اور انتظامی امور میں مفید ترین مشورے دیئے، اس فہرست میں جامعۃ القرآن بجنور جس کی نگرانی کا بار میرے ناتواں کندھوں پر ہے بھی شامل ہے۔ حضرت والا وقتاً فوقتاً تشریف لاتے اور اپنی قیمتی آراء سے نوازتے، یہیں آپ کی آخری اور تاریخی تقریر بھی ہوئی، جس میں اہل علم اور اہل سیاست سبھی لوگوں کے لئے رہنمایانہ باتیں ہیں اور جو ہم سب کے لئے ایک کیسٹ کی شکل میں بہترین یادگار ہے۔

طالب علمی کا بے مثال دور تو ہم سے بہت پہلے کا ہے البتہ دارالفکر میں قیام کے دھندلے دھندلے نقوش اب بھی ذہن میں تازہ ہیں مگر ۱۹۶۳ء میں جب مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے لئے باضابطہ آپ کی خدمات حاصل کی گئیں وہ میرے شعور کا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد کی تمام علمی، ثقافتی، تصنیفی اور تربیتی سرگرمیاں میرے دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہیں، تقرر کے وقت کا زمانہ آپ کے شباب کا زمانہ تھا اس دور شباب کے طویل اور بیش قیمت اوقات، مادر علمی کی خدمت، طلبہ کی تعلیم و تربیت، ان کی استعداد سازی، رجال کار کی تیاری، تصنیف و تالیف اور عربی زبان و ادب کی خدمت میں اس طرح گذرے کہ نہ کبھی طاقت و ہمت نے ساتھ چھوڑا، نہ عزم و ارادہ میں کمی آئی، نہ راحت پسندی اور آرام طلبی کا خیال آیا، نہ علمی جولانیوں، تربیتی سرگرمیوں اور قلمی کاوشوں کی آنچ مدھم ہوئی، اور نہ حالات اور مصائب و آلام کے سامنے سپر انداز ہوئے۔ وہی جہد مسلسل، پیہم رواں اور ہر دم جواں زندگی جس میں افسردگی کا نام و نشان نہ تھا۔ آپ کا دل آئینہ کی طرح صاف شفاف تھا، دماغ آسمان کی طرح بلند تھا، نظر آفتاب کی طرح روشن تھی، فکر دریا کی طرح رواں دواں تھا۔ زندگی کے سفر میں ہمیشہ اس طرح تازہ دم رہے کہ نہ کبھی تکان محسوس کی، نہ منزل کی دوری سے گھبرائے، نہ راستے کی مشکلات کا احساس کیا، نہ صبر و شکیب کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہوئی، نہ آپ کے بلند حوصلوں پر افسردگی چھائی۔ گرم و سرد دن آئے، راحت و سکون کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ مشقت و کلفت کی آندھیاں بھی چلیں مگر آپ کے قدم کسی موقعہ پر نہیں لڑکھڑائے ہر طرح کے حالات کا آپ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا، اس عہد زریں کا قیمتی اثاثہ و سرمایہ آپ کی ڈکشنریاں ہیں جو مقبولیت کے اندر اپنی مثال آپ ہیں، عربی زبان و ادب کا کوئی بھی طالب علم بلکہ استاذ بھی ان سے مستغنی نہیں، اسی طرح آپ کے وہ باکمال اور باصلاحیت شاگرد ہیں جو ہر جگہ اپنا لوہا منوائے ہوئے ہیں اور اپنے کام میں نمایاں اور امتیازی شان رکھتے ہیں، راقم سطور کو بھی الحمد للہ حضرت والا سے استفادہ کی سعادت حاصل ہے، دوران تعلیم حضرت والا کی جو پدرانہ شفقتیں اور عنایتیں تھیں اور خاص طور پر میرے ساتھ جو خصوصی معاملہ فرماتے تھے اور الحمد للہ وہ تادم آخر پورے طور پر قائم رہا اس کے پیش نظر آج میں اپنے آپ کو بے سہارا اور یتیم محسوس کر رہا ہوں اور میں ہی نہیں بلکہ میرے اس احساس میں ہند و بیرون ہند کے بے شمار لوگ شریک ہیں۔ جب بھی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا تصور آتا ہے تو فوراً دو شخصیتوں کی طرف ذہن سبقت کرتا ہے، ایک میرے مربی و مشفق حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب رحمہ اللہ، دوسرے میرے ہی نہیں بلکہ ایک نسل کے مربی حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رحمہ اللہ جو بالیقین اسم با مسمی تھے۔

مولانا حبیب الرحمن کیرانوی بہر

حکیم محمد احمد قاسمی

گلشنِ دارالعلوم کا گلِ سرسبد

کسی نے کہا ہے اور سچ ہی کہا ہے کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لسان العصر مولانا وحید الزماں کیرانوی کی جلیل القدر شخصیت مکمل طور سے اس خیال کی مصداق تھی، یقیناً مولانا جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ روزِ ازل سے روزِ ابد تک انسانوں کی پیدائش اور موت کا سلسلہ جاری رہے گا لیکن انھیں میں جب کوئی مردِ کامل مرتا ہے تو اس کی موت سے ایک دنیا اُجڑ جاتی ہے، مولانا کی موت ایک ایسا ہی المیہ ہے جس کی تلافی اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی یادیں اور باتیں دلوں میں پیوستہ اور فکر و احساس پر چھائی ہوئی ہیں۔ ان کی فعال شخصیت، مشفقانہ طرزِ عمل، مخصوص لب و لہجہ، دلچسپ اندازِ بیان، جولانیٔ طبع اور شوخیٔ گفتار نیز ان کا نظم و ضبط اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ آج بھی محرکِ خیال بنا ہوا ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہمیشہ سے اہلِ کمال کی آماجگاہ اور فکر و فن کا مرکز رہا ہے۔ اس خاک سے ایک سے ایک تاریخ ساز اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ لیکن مولانا وحید الزماں کی سحر آگیں شخصیت اپنی ذات میں خود ایک دبستان تھی۔ موصوف نے اپنے لئے ایک الگ راہ متعین کی، جس پر وہ تنہا مسافر تھے، دوسرا پاؤں نہ دھر سکا۔

• علیگڑھ دواخانہ، قاضی پور خورد، گورکھپور

وہ پُرانی لکیر کے شیدائی نہیں تھے، ان کے اندر مجتہدانہ بصیرت اور فکر و نظر کی بلندی اور وسعت بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتویؒ کے سوز دروں کا پرتو تھی۔ یہ انھیں کا جگر تھا کہ دارالعلوم دیوبند کو قدیم رسمی طرز تعلیم کی قید و بند سے آزاد کر کے تدریس کے نئے طریقوں سے طلبار دیوبند کو روشناس کرایا۔

وہ ایک قائد کی حیثیت سے مومن کا دل و نگاہ لے کر پیدا ہوئے اور مذہب و ملت کی پاسبانی و ترجمانی میں، زندگی کی آخری سانس تک سعی پیہم کرتے رہے۔ بعید از حقیقت نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ مولانا سدرہ وطوبیٰ کے مرغ لاہوتی تھے۔ ان کے ہر عمل میں ایک مفکر کی ہوش مندی جھلکتی تھی اور ان کے سینے میں ایک مخلص مجاہد کا دل پیوست تھا یہی سبب ہے کہ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑ گئے۔ ان کی زبان اگرچہ عربی نہیں تھی تاہم انھوں نے جب عربی سے رشتہ قائم کیا تو بڑے بڑے اہل زبان کو پیچھے چھوڑ دیا۔ درس و تدریس کے آسمان پر آفتاب نو بن کر طلوع ہوئے تو ان کی علمی ضیاپاشیوں سے دیوبند کی بہت سی تاریک وادیاں جگمگا اٹھیں۔

الغرض وہ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ گلشن دارالعلوم دیوبند کے گل سرسبد تھے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے، طالب علمی کے زمانہ کی بے اعتنائیاں، آغاز سے ناآشنا، انجام سے بے خبر، نہ کوئی جادہ تھی نہ منزل نہ ہی فکر و احساس میں استقامت، اسی بے راہ روی اور بے ڈھنگے پن میں زندگی پرکیف اور کامیاب نظر آتی تھی۔ اسے حسن اتفاق کہئے کہ اس عالم لاابالی پن میں نعمت غیر مترقبہ کی طرح حضرت مولاناؒ ہاتھ لگ گئے۔

گو راقم السطور کو مولانا سے براہ راست شرف تلمذ حاصل نہیں رہا مگر بالواسطہ ان کی استادانہ سرپرستی اور مشفقانہ تربیت نے زندگی کے لئے راہ متعین کر دی اور زندگی زندگی کے لئے خود رہنما بن گئی۔

مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ کی خوبیوں اور محاسن کا احاطہ اس مختصر سے مقالہ میں اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، وہ مرقع صفات تھے، ان کی ایک ایک ادا دلوں کو مسحور کر دینے والی تھی — یہ میرا نصیب تھا کہ مولانائے محترمؒ کو بہت ہی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ دار جدید میں ان کی جائے قیام پر بھی اکثر و بیشتر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ اب نہیں رہے مگر ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں آج کتنی گراں مایہ نظر آتی ہیں۔ بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، اعزہ سے ہمدردی ان کے ضمیر میں رچی بسی تھی۔ تصنع اور تکلف سے عاری، اونچ نیچ کے فرق سے پرے، ظاہر و باطن میں یکسانیت اس مرد مجاہد کے جوہر خاص تھے، حق گوئی و بیباکی ان کی فطرت ثانیہ تھی، انتہائی حلیم و متین اور نفاست پسند تھے۔

مہمان نواز اور انتہائی مخیر، مہمان نوازی میں اپنی آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ ان کی شخصیت اعلیٰ کردار اور جمال وجلال کا پیکر تھی، شیریں زبان اور جمال کا یہ عالم تھا کہ مولانا کی ایک آواز پر طلبائے دارالعلوم کا ایک طوفان امڈ پڑتا اور جلال کا یہ حال تھا کہ طلبا کا بڑے سے بڑا مجمع ان کی ایک آواز پر منتشر ہو جاتا تھا۔

مولانا کو قدرت نے وہ جذبۂ علمی، ملی وایمانی عطا کیا تھا کہ پہلی ملاقات میں لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے وہ صاحب کردار تھے اور وہ "یک ساعت با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا" کے صحیح مصداق تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کی ہمہ جہتی کامیابی کا سہرا بھی بڑی حد تک مولانا وحید الزماں کے ہی سر ہے۔ اس سلسلے میں مولانا گورکھپور تشریف لائے، ناچیز کے غریب خانے پر قیام فرمایا، بعد ازاں اطراف وجوانب میں ان کی قیادت میں فراہمی سرمایہ کا کام ہوا۔ اسی سفر کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ خلیل آباد میں ایک عالمی جماعت کے اہم ذمہ دار سے ملاقات ہوئی، انھوں نے حوصلہ افزا بات کرنے کے بجائے اس اجلاس کے خلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنی جماعت کی برتری واضح کی اور ایک ناصحانہ تقریر کے بعد دس روپے کی رقم اجلاس کے لئے بادل ناخواستہ پیش کی۔ مجبوری یہ تھی کہ ان کے صاحبزادگان حضرت والا کے شاگرد تھے۔ یہ مولانا کا ظرف تھا کہ اس حقیر رقم کو انتہائی خندہ پیشانی سے قبول فرمایا، جبکہ حضرت مولانا کی ایک گذارش پر دارالعلوم کی محبت میں لاکھوں روپیہ عقیدت مندوں نے ان کے قدموں میں ڈال دیا۔

حضرت مولانا کی معیت میں ایک دوسرا سفر دارالمؤلفین کی توسیع کے سلسلے میں ہوا، جو بڑا ہنگامی سفر تھا۔ مختصر سے وقت میں گورکھپور، دیوریا اور نیپال کی سرحدوں تک جانا ہوا، یہ سفر نہایت بابرکت ثابت ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دوریاں سمٹ آئی ہیں اور مولانا کے حوصلوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اپنے نصب العین کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی دھن میں وہ ہر مشقت کا سامنا کرنے کو تیار ہیں۔ یہ میرا نصیب تھا کہ حضرت کی معیت میں دور دراز علاقوں کے مدارس تک پہونچنے کا موقع ملا۔ نیز اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ بے شمار مدارس میں حضرت کے شاگرد علم وایمان کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ انھیں مدارس کی ایک کڑی مولاناؒ کے ایک شاگرد مولانا عظمت اللہ صاحب قاسمی کا مدرسہ ہرا اسٹیٹ بھی ہے جہاں وہ بحیثیت مہتمم تھے۔

بہت رات گئے ہمارا قافلہ بھوکا پیاسا، تھکا ہارا وہاں پہونچا، مولاناؒ ہی کی تربیت اور جذبۂ خدمت کا اثر تھا کہ ہم لوگوں کے پہونچنے پر رات کی تاریکی اور سناٹے میں کھانے پینے کا نظم فرمایا اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی منتظمین مدرسہ نے بڑی خوشی ومسرت کا اظہار کیا نیز ممکن حد تک ان تھکے مسافروں کو آرام پہونچانے کی کوشش کی۔ یہ ایک جھلک تھی مولانا وحید الزماںؒ کی مخصوص تعلیم وتربیت کی جو انھوں نے اپنے شاگردوں کو دی تھی۔

(بقیہ صـ ۱۰۶ پر)

مفتی جمیل الرحمان قاسمی

جہدِ مسلسل کی آئینہ دار عظیم شخصیت

دارالعلوم دیوبند کی ایک عظیم علمی، ادبی، عبقری شخصیت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی ہیں جن کے عظیم کارناموں پر دارالعلوم اور ابنائے دارالعلوم کو ناز ہے اور برِ عظیم ہند و پاک، بلادِ عرب اور دوسری ریاستوں میں ان کی تصنیفات و تخلیقات سے علماء، طلباء اور اربابِ فکر و ادب استفادہ کر رہے ہیں۔

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی وفات کے بعد لگتا تھا کہ دارالعلوم ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا۔ چند سال یہ خلاء محسوس ہوا لیکن جلد ہی حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کے رواں دواں قلم اور شستہ و شگفتہ زبان و بیان سے یہ خلاء پُر ہو گیا۔ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب دورِ طالب علمی میں ہی اساتذہ و طلبہ کے محبوب و مرنجاں مرنج رجالِ علم میں شمار ہوتے تھے۔ استاذ اور معلم کی حیثیت سے مادرِ علمی میں داخل ہو جانے پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ حضرت مولانا مرحوم علم و ادب کے افق پر جلوہ گر رہتے ہوئے بھی طلبہ کے ساتھ بے تکلفی، بذلہ سنجی اور ظرافت کا ماحول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بعض بزرگوں نے روایتی ادب و احترام کا ماحول مفقود ہونے کی شکایت کی۔ مولانا نے فرمایا۔ طلبہ میرے عزیز ہیں، میرے دوست ہیں۔ اگر میں آزاد فضا میں گفتگو کا موقع نہ دوں گا تو وہ ما فی الضمیر کو ادا کرنے پر کب قادر ہوں گے، ان کے ذہن میں جو اشکالات آتے ہیں کس طرح وہ اساتذہ کے سامنے ان کو رکھیں گے اور جواب شافی کے مستحق ہوں گے۔ میں طلبہ میں جرأت اور حوصلہ پیدا کرنا چاہتا ہوں، احساسِ کمتری زہرِ ہلاہل ہے۔ اس نے دارالعلوم کے علمی معیار کو تنزلی کی طرف دھکیل دیا ہے۔

دارالعلوم کے روایتی ماحول میں مولانا مرحوم کو ایک مسیحا گردانا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ طلبہ میں احساس و شعور اجاگر کرنا جذبۂ خودداری زندہ کرنا، علم و ادب کا ذوق بیدار کرنا حضرت مولانا کا اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ قاسمی برادری کی آنے والی نسلیں مولانا کے اس انقلابی عمل کو خراجِ تکریم پیش کرتی رہیں گی اور ان کے

جامعہ رحمانیہ ہاپوڑ

نکر و عمل کو مشعلِ راہ بنا کر علم و ادب کے میدانوں میں تیز گام رہیں گی ۔ ایک وقت تھا کہ بعض اداروں کے طلبۂ قاسمی برادری کو ادب سے نا آشنا گردانتے تھے ۔ حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ نے ادب میں امتیازی شان پیدا کی ۔ علمی و ادبی جرائد میں ان کے مقالے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ۔ چند سالوں میں کایا پلٹ ہو گئی ۔ زبان و بیان کا جادو چار سو پھیلا ۔ خلیجی ریاستوں کی یونیورسٹیوں نے طلبۂ دارالعلوم کی اہمیت محسوس کی ۔ حرمین شریفین کے علمی مراکز میں طلبہ کو داخلے ملے ، وہاں کے اداروں میں ان کی تقرریاں ہوئیں ۔ اس طرح دارالعلوم نے شہرۂ آفاق امتیاز حاصل کیا ۔ افادہ اور استفادہ کی راہیں وسیع تر ہوئیں اور مولانا کی جدّوجہد کے برگ و بار منصۂ شہود پر آئے ۔

حضرت مولانا مرحوم طلبۂ عزیز کو علم و ادب میں پختہ تر کرنے کے ساتھ قومی ، ملی اور عالمی مسائل کا رازداں ، خبرداں اور مدبّر کار بھی بنانا چاہتے تھے ۔ تاریخ ، جغرافیہ ، فلسفہ ، سائنس اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ معلوماتِ عامّہ کو طالبِ علم کی بنیادی ضرورت قرار دینا ان کا مشن تھا ۔ مختلف علوم و فنون کے طلبا اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ، یہ گفتگو ، مباحثہ اور مجادلہ کا رُخ اختیار کرتی ! اور بالآخر حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے درِ تحقیق پر دستک دی جاتی ۔ مولانا باہر تشریف لاتے ، طلبہ کو وقار کے ساتھ بٹھاتے اور پھر زیرِ بحث موضوع پر اس انداز سے تبصرہ فرماتے کہ ہر فریق مطمئن ہو جاتا اور یہ سمجھتا کہ مولانا نے میرے مؤقف کی تائید کی ہے ۔ یہ مولانا کے کمالِ علمی اور اعلیٰ ذکاوت و ذہانت کا ایک نادر نمونہ ہے ۔

مجھے یاد آتا ہے ساتویں دہائی کے تین چار سال گذرے تھے ۔ مصر کے حکمراں جمال عبدالناصر نے سید قطب شہید کو تختۂ دار پر پہونچایا ۔ دنیا میں ہر طرف یہ واقعہ موضوعِ بحث تھا ۔ دارالعلوم کے طلبا اس تحقیق و جستجو سے کیوں نابلد رہتے ۔ فرصت کے لمحات میں اس موضوع پر طلبہ کی طویل ترین بحثیں شروع ہوئیں اور تمام ہوئے بغیر ختم ہو جاتیں ۔ ایک دن طلبہ کے دو گروپوں کا یہ مباحثہ اخلاقی حدود کو پامال کرنے لگا ، ضرب و حرب کا میدان گرم ہونے والا تھا ۔ معاملہ فہم طلبہ نے دونوں گروپوں کو حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے پاس جانے پر آمادہ کیا ، حضرت مولاناؒ نے دونوں گروپوں کی بحثیں دلائل کے ساتھ سنیں ، مسکرائے اور ایسے پیارے دلنشین انداز میں نصف گھنٹہ تقریر کی کہ دونوں گروپ مطمئن ہو گئے اور ظالم کون ہے اور مظلوم کون کی بحث ختم ہو گئی ۔

حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کا ایک بڑا کارنامہ مدارسِ عربیہ کے طلبہ سے احساسِ کمتری و محرومی کا احساس ختم کرنا ، تعطّل اور جمود و خمود کی لعنت کو نابود کرنا ہے ۔ مولانا اپنے قول و عمل کے آئینہ میں علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق تھے ؎

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

مولانا مرحوم اپنے ذوق و مشرب کے اعتبار سے فَنَافِی العِلْم کا مقام رکھتے تھے۔ یہی جوہر گراں مایہ طلبۂ عزیز کے قلب میں ودیعت فرماتے تھے۔

حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب متحدہ قومیت اور اتحاد و یک جہتی کے علمبردار رہے، اپنے موقف میں پختگی، قول و عمل میں یکسانیت اور حق و صداقت کا بے ٹوک برملا اظہار ان کی طبیعت ثانیہ رہی۔ تقسیم وطن کے وقت مولانا مرحوم اور ان کے خاندانی اکابر انڈین نیشنل کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کے پرچم تلے قومی اتحاد اور ملی استحکام کے لیے سرگرم عمل رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے جلسوں میں بے باکی اور حق گوئی کی زریں مثال مولانا مرحوم کی ذات عالی تھی۔ کسی لیڈر، کسی امیر اور کسی صاحب اقتدار کی کبھی پرواہ نہ کی۔ جب تک صحیح مقصد کے لیے صحیح رُخ پر کام ہوتا دیکھا ساتھ رہے اور جب مفاد پرستی، خود غرضی اور انانیت کا ماحول دیکھا برملا تنقید کی۔ اصلاح حال کے لیے فکر و عمل کی تمام توانائیاں صرف کیں، مجلس اور جماعت کو صحیح سمت کی طرف گامزن کیا۔ اور جہاں اصلاح کی تمام تر کوششیں رائیگاں ہوتی دیکھیں اور اصلاحِ حال کی توقع ختم ہوگئی فوراً علیحدگی اختیار کی اور ترغیب و ترہیب کے تمام ہتھکنڈے ناکام بنا دیئے۔ مولانا کا تابناک کردار اس حقیقت کا آئینہ دار رہا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

زہرِ ہلاہل کو قند نہ کہنے کی پاداش میں مولانا مرحوم کو نت نئی سازشوں اور آزمائشوں کا شکار بھی ہونا پڑا مگر تادم آخر انہوں نے حق پرستی اور اصول پسندی کی خُو نہ چھوڑی۔

مولانا مرحوم ۱۹۸۷ء تک جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، اپریل ۱۹۸۸ء میں نئی دہلی کے کنونشن میں ان کو ملی جمعیۃ علماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے نمائندہ اجتماع میں ان کو مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی صدارت سونپی گئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تینوں تنظیموں کے اس سفر میں راقم بھی مولانا کے ہمراہ رہا اور خلوص و ایثار، حق گوئی و حق پسندی کے میدان میں جدّ و جہد کی سعادت نصیب ہوئی۔

راقم نے مولانا مرحوم کے سامنے رسمی طور پر زانوئے تلمذ طے نہیں کیے تاہم علمی اور لغوی تحقیقات، پیرائیہ ادب کے نکات اور اہم ملی و سیاسی مسائل میں مولانا سے استفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مولانا کی فصاحتِ کلامی، بلاغتِ بیانی اور طلاقتِ لسانی سے جب جب خوشہ چینی کی۔ مولانا کا تبحر، تدبر راہنما بنا اور اجتماعیت کے مختلف میدانوں میں مولانا کی اصابتِ رائے معاون ثابت ہوئی ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

مولانا کی پُرخلوص شفقت و محبت رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ مولانا نے دیوبند میں دارالمؤلفین قائم کیا۔ اہم کتابیں شائع فرمائیں۔ مزید تصنیفات و تالیفات تیاری کے مرحلہ میں ہیں۔ آخر کے چند سالوں میں جب بھی مولانا سے ملاقات ہوئی فرمایا کہ ہمارا دارالمؤلفین مفتی صاحب کی تصنیف و تالیف سے محروم ہے۔ ہر بار زور دیا کہ کوئی کتاب ہمارے یہاں کے لیے تیار کرو۔ ایک مرتبہ کافی دیر تک گفتگو فرمائی اور چند موضوع دیئے، مواد وغیرہ کی نشاندہی کی۔ مگر میری بدقسمتی تھی کہ اپنے کثیر مشاغل و مصروفیات کے سبب کچھ نہ لکھ سکا اور مولانا کے پیار بھرے ارشاد کی تعمیل نہ ہو سکی۔

مولانا مرحوم کی آخری زیارت مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ہوئی۔ ضعف و نقاہت کی تصویر بنے بیٹھے تھے، چہرہ سے اداسی پژمردگی عیاں تھی مگر قومی مسائل سے دلچسپی اور غیر معمولی لگاؤ کی دلیل تھی کہ مولانا کو آرام کی سخت ہدایت تھی۔ اس کے باوجود وہ عاملہ کے اجلاس میں رونق افروز تھے۔ ایک گھنٹہ مختلف مسائل پر بحث ہوتی رہی۔ مولانا خاموش رہے، کہیں کہیں ایک دو لفظ کہہ کر رہنمائی فرماتے رہے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کانگریس اور اس کے لیڈروں کو بے جا تنقید کا ہدف بنایا جانے لگا، مولانا نے ضبط نہ کر سکے فرمایا۔ کانگریس کا متبادل پیش کیجیے۔ کس پارٹی کے دور میں اقلیتوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوا، کن لیڈروں سے اقلیتوں کو کتنا فائدہ پہونچا اور کتنا نقصان۔ انصاف سے جائزہ لیا جائے، اور پھر صحیح بات پیش کی جائے محض عوامی ذہن دیکھ کر کسی پارٹی کو ہدف تنقید بنانا مناسب نہیں۔ اس طرح کی پالیسی سے بعض افراد کو وقتی فائدہ ضرور پہونچ سکتا ہے لیکن ملک کا اتحاد و استحکام پارہ پارہ ہو جائے گا۔ مولانا کی باغ و بہار اور مرنجاں مرنج شخصیت اب ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ مگر علم و ادب کی خدمات جو مولانا کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ روشن اور تابندہ ہیں۔ مدارس عربیہ کے طلبہ روایتی تعطل توڑنے اور امنگوں ترنگوں سے سرشار نئی زندگی عطا کرنے کے سلسلہ میں مولانا کی عظیم ترجدو جہد کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ قومی اتحاد و یکجہتی کے لیے مولانا کی ناقابل فراموش مساعی تاریخ کا اہم حصہ شمار کی جائیں گی۔

بقیہ : زندگی کا آخری دور

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری ۔۔۔ کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

خوف طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو میں حضرت الاستاذ کے متعلق کچھ اور باتیں اور واقعات زیب قرطاس کرتا مگر بقول حسرت ؂

شب وصال ہے کوتاہ نازِ یارِ دراز ۔۔۔ ہجوم شوق سے کہہ دو کہ اختصار کرے

مولانا حبیب الرحمٰن (؟) نمبر

محمد عارف الدین کلیم العمری

علم و دانش کا پیکر

درمیانہ قد، دُبلے پتلے، گورے چِٹے، نورانی چہرہ، اونچی پیشانی، روشن آنکھیں، ستواں ناک مخروطی داڑھی، سفید براق کُرتا پاجامہ اور دوپلی ٹوپی کے تصور سے جو وجیہہ اور بشاش صورت ابھرتی ہے اور جن کی نفاست، پاکیزگی اور شرافت دیکھ کر" دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں" کا احساس ہوتا ہے وہی مولانا وحیدالزماں قاسمی کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

مغربی اترپردیش کے ضلع مظفر نگر کے مردم خیز قصبہ "کیرانہ" کے علمی خانوادے میں آپ نے ۱۷ر فروری ۱۹۳۰ء کو آنکھیں کھولیں، یہی وہ کیرانہ ہے جہاں مشہور زمانہ کتاب "اظہار الحق" کے مصنف علامہ رحمۃ اللہ پیدا ہوئے، مولانا وحیدالزماں کے والد، دادا، پردادا، سبھی عالم دین اور اپنے اپنے وقت کے معتبر و معتمد اور ذی وقار شخصیتیں رہی ہیں۔ آپ کا خاندان متمول اور برکھوں سے زمیندار رہا۔ اس طرح آپ کو دین و دنیا حسنین وراثت میں ملے، ادھر آپ کی تین نرینہ اولاد ہیں، دو فاضل دارالعلوم اور تیسرے فرزند دارالعلوم ہی حصول علم میں مصروف ہیں اور والد مرحوم کے مکتبہ حسینیہ کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

مولانا کے بڑے فرزند مولوی بدرالزماں قاسمی کیرانوی میرے ہم شغل ساتھی اور نہایت قریبی دوست ہیں گویا "پسر نمونہ پدر راست"

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم کیرانہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں تعلیم کی غرض سے حیدرآباد کا سفر کیا، ان دنوں حیدرآباد دکن دانش گاہ علم و ادب بنا ہوا تھا۔ سیکڑوں علماء، مفکر، ادیب، شعراء ملک و بیرون ملک سے دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، جامعہ عثمانیہ، جامعہ نظامیہ کے علاوہ دولت آصفیہ کے مختلف شعبوں کی خدمات انجام دے رہے تھے، ان میں علامہ امون الدمشقی ایک معتبر نام تھا۔ مولانا وحیدالزماں کو علامہ

مقیم دوحہ، قطر

سے شرف تلمذ حاصل ہوا، قابل عربی استاذ کی صحبت اور لائق شاگرد کی محنت رنگ لائی۔ دو سال کی جہد مسلسل سے عربی زبان پر غیر معمولی عبور حاصل ہوا۔ آزادی کی شورش، پولیس ایکشن اور سقوط حیدر آباد سے تعلیم متاثر ہوئی۔ دو سال رہ کر وطن واپس ہوئے اور دارالعلوم دیوبند رخت سفر باندھا۔ پھر کیا تھا ۱۹۴۸ء سے اور اب ۱۹۹۵ء آپ اور دارالعلوم دیوبند لازم و ملزوم ہو گئے۔ اور اب آپ کی آخری خواب گاہ بھی یہی ہے۔

ع لوگ رخصت ہوئے اور لوگ بھی کیسے کیسے

آپ کی طالب علمانہ زندگی نشاطات سے اتنی بھرپور تھی کہ آپ کی علمی صلاحیتوں کو دارالعلوم کی انتظامیہ نے تاڑ لیا اور دارالعلوم کے لیے آپ کی تدریسی خدمات حاصل کر لیں، اس طرح دارالعلوم میں سبھی مراحل کے طلبار آپ سے برابر علمی استفادہ کرتے رہے۔ کسی بھی فاضل دیوبند یا قدیم طالب علم سے دارالعلوم کے اساتذہ کے بارے میں اگر آپ پوچھیں گے تو دو نام گرامی آپ ضرور سنیں گے، ایک مولانا انظر شاہ کشمیری اور دوسرے مولانا وحید الزماں کیرانوی۔

مولانا کیرانوی استاذ کی حیثیت سے جتنے مقبول تھے اس سے کہیں زیادہ وہ مربی اور اتالیق بھی تھے استخاص سازی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کی تربیت اور نگہداشت میں جو طلبہ رہے ہیں ان میں نامور علمار کی ایک طویل فہرست ہے۔ مولانا کی انتظامی صلاحیتیں بھی اپنی مثال آپ تھیں، اسی لئے آپ کو دارالعلوم کا معاون مہتمم بنایا گیا اور آپ بحسن و خوبی اپنے عہدہ سے عہدہ برآ ہوئے۔

جشن صد سالہ کے موقعہ پر انتظامی امور کے ساتھ آپ نے علم ہندسہ کے وہ داؤ پیچ دکھلائے کہ اچھے اچھے معمار اور مہندسین بھی اس قال اللہ اور قال الرسول کہنے والے کی دقیق گرافنگ اور اعلیٰ تعمیراتی پلاننگ دیکھ کر داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء

ان ساری مصروفیات کے باوجود آپ کی تصنیفی خدمات کا میدان بہت وسیع رہا ہے، ہند و پاک میں عربی ادب پر دسترس رکھنے والے سیکڑوں علمار مل جائیں گے لیکن ماہر لغت کی حیثیت سے آپ کی انفرادیت لاکھوں اہل علم ستاروں میں چودھویں کے چاند کی طرح نمایاں ہے۔

عربی ادب کے طلبار و اساتذہ خواہ مدارس و جامعات میں ہوں یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، مولانا کے نام نامی سے ناواقف نہیں ہو سکتے۔ مولانا نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن کی ضرورت کا احساس ہندو پاک میں عرصہ سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ آپ نے ساٹھ کی دہائی میں "القاموس الجدید" عربی اردو اور اردو عربی ترتیب دے کر عظیم خلا کو پر کیا اور برصغیر کے طلبہ و اساتذہ کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر کے جدید عربی سے واقفیت کے لئے مستغنی کر دیا۔ اس کام کی اہمیت اور اس سلسلہ کی جانفشانی اور عرق ریزی

کا صحیح اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جس کو لغات کے بحر ذخار کی ادنیٰ سی بھی شُد بُد ہو۔ ہند و پاک کے سیکڑوں عربی داں اور ہزاروں علماء میں سے کسی نے اس پُرخار وادی کا سفر نہیں کیا۔ دراصل طالب علمی ہی کے زمانہ میں مولانا نے اس ضرورت کو محسوس کیا پھر فراغت کے بعد طلبہ کو درپیش ہونے والے مسائل کا آپ کو بخوبی اندازہ تھا اس لئے آپ نے زندگی کی بیشتر اہم مصروفیتوں کے ساتھ اس کو اولیت دی اور عنفوانِ شباب ہی میں القاموس الجدید کو مکمل کیا۔

ایک ماہر لغات بنیادی طور پر لغوی کے ساتھ ادیب بھی ہوتا ہے اور آپ نے اپنے ادب کے جواہر پارے "نفحۃ الادب" اور "القراۃ الواضحہ" کی شکل میں پیش کئے۔ نفحۃ الادب متوسط درجوں کے طلبہ کے لئے ہے اور القراۃ الواضحہ تینوں مراحل کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، جس کی زبان نہایت سلیس صاف وشستہ اور معیاری ادب کا شہ پارہ ہے اس کے تینوں حصے بیشتر مدارس، جامعات اور کالجوں میں داخل نصاب ہیں۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، مولانا نے طالب علمی ہی کے زمانہ سے ادب کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ دارالعلوم کی دیواروں کو سب سے پہلے مولانا نے ہی مجلہ حائطیہ سے زینت بخشی اور سلسلۃ الدروس العربیہ شروع کرکے طلبہ میں منافست کا ذوق پیدا کیا۔ آپ کا یہ قدم انقلابی ثابت ہوا ابھی تک دارالعلوم میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ چہ خوش رسم بنا کردن۔

مولانا وحید الزماں کی لغت سے دلچسپی اور اس میں عمق نظر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نے کل پانچ ڈکشنریاں ترتیب دی ہیں۔ القاموس الجدید اردو، عربی اور عربی اردو کے بعد آپ نے "القاموس الاصطلاحی" اردو عربی اور عربی اردو مکمل کی۔ یہ دونوں ڈکشنریاں اردو کے لئے ایک نادر تحفہ ہیں اور اپنی نوعیت کی منفرد اور معیاری قوامیس ہیں۔ جن سے اہل علم اور اسکالرس اپنے تحقیقی مقالوں اور علمی تصانیف کے لئے لغات میں مرجع کا کام لیتے ہیں۔

لغات کی دنیا میں ہر سال بہت سے الفاظ کے اضافے کے ساتھ نئے ایڈیشن آتے ہیں۔ "آکسفورڈ" سے شائع ہونے والی ڈکشنریوں نیز "المنجد" اور "المورد" کے ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ملے گا لیکن اردو میں قدیم معاجم و قوامیس ہی کل کائنات سمجھی جاتی ہیں۔ جدید اضافے، تہذیب و تنقیح کا کام برسوں سے رکا پڑا تھا، لیکن مولانا نے اس میدان میں اپنی پیرانہ سالی، کمزوری صحت اور ذیابیطس کے مرض کے باوجود دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل تمام جدید تقاضوں اور مناسب ترمیموں کے ساتھ "القاموس الوحید" ترتیب دی ہے۔ درحقیقت اٹھارہ سو صفحات کئی ہزار الفاظ کا

دقیق مطالعہ و تحقیق، دیگر معاجم و قوامیس سے موازنہ اور لفظ لفظ کے معانی اور صحت املا تک کو جانچنا یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ عزم و حوصلہ اور ہمت و جوانمردی مولانا ہی کا حصہ ہے۔ ؎

یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

لغت اور ادب کے علاوہ بھی مولانا نے اسلامیات پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں "آخرت کا سفر نامہ" "شرعی نماز" "انسانیت کا پیغام" "اچھا خاوند" اور "اچھی بیوی" شامل ہیں۔ مولانا نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا تفسیر "معارف القرآن" کی آٹھ جلدوں سے منتخب علمی مضامین کو دو جلدوں میں "جواہر المعارف" کے نام سے ترتیب دیا ہے جس کی پہلی ضخیم جلد شائع ہو چکی ہے اور دوسری ویسی ہی ضخیم جلد اشاعت کے مراحل میں ہے، مولانا نے ترجمہ میں بھی اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ "تقسیم الهند والمسلمون فی الجمهورية الهندية" کے نام سے کتاب "تقسیم ہند اور مسلمان" کا کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ مولانا اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں "ختامہ مسک" کے مصداق قرآن مجید کا عام فہم اور سلیس ترجمہ شروع کر چکے تھے لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔

تجری الرياح بما لا تشتهي السفن

حدیث شریف ہے کہ "اذا مات الرجل انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية، علم ينتفع به الناس ولد صالح يدعوله" یعنی مرنے کے بعد انسان کے اعمال کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے لیکن تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرے علم نافع اور تیسرے صالح اولاد۔

اس حدیث کے مصداق آپ وہ خوش قسمت انسان ہیں جن کے حصہ میں مذکورہ تینوں سعادتیں آئی ہیں۔ آپ کے لئے صدقہ جاریہ دار المؤلفین کا قیام، علم ينتفع به الناس آپ کا علمی ورثہ آپ کی تصانیف اور آپ کے تیار کردہ اشخاص و علماء، ولد صالح يدعوله تینوں فرزند عالم باعمل باپ کے علمی اور حقیقی وارث و دعاگو وجہ۔

مولانا ۱۹۹۱ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد دوحہ قطر اپنے بڑے فرزند مولوی بدر الزماں قاسمی کیرانوی کے یہاں سعودی عرب سے تشریف لائے، کچھ عرصہ قیام رہا۔ اسی اثنا ملاقات کا موقعہ نکل آیا۔ آپ نہایت ملنسار، بذلہ سنج اور خوش مذاق طبیعت رکھتے تھے۔ گفتگو ٹھہر ٹھہر کر کرتے، نفیس اور شائستہ اردو بولتے، مخاطب کی بات کو بلا لحاظ عمر پوری توجہ سے سنتے، استفسار پر تشفی بخش جواب دیتے۔ مولانا

سے ملاقات کے وقت کئی اور ساتھی بھی تھے سب نے مختلف سوال کئے، جس میں حالات حاضرہ، نظام تعلیم اور قومی وملی مسائل پر بھی سوالات کئے گئے۔ ہم نے محسوس کیا مولانا زیادہ تر ڈسپلن، اتحاد، خلوص نیت اور عمل صالح پر زور دے رہے تھے۔

مولانا نظم وضبط کے بڑے پابند تھے، بدنظمی اور بے اعتدالی ان کو سخت ناگوار تھی، الجھے مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتے۔ بڑے نازک مواقع پر آپ نے ثالثی کا کامیاب کردار ادا کیا، آپ روایتی نہیں اختراعی ذہن رکھتے تھے اس کے اثرات وثمرات زندگی کے ہر مرحلہ میں دیکھ سکتے ہیں ۔ طالب علمانہ زندگی کی سرگرمیوں کا مختصر ذکر ہوچکا ہے۔ فراغت کے بعد آپ نے ۱۹۵۹ء میں "دارالفکر" کی داغ بیل ڈالی جس کے ذریعہ عربی انگریزی تدریس کے ساتھ ماہنامہ "القاسم" کا اجراء کیا جو فکری اور دعوتی مجلہ تھا۔

۱۹۶۵ء میں آپ نے "دعوۃ الحق" کی ادارت سنبھالی پھر "الداعی" کے مدیر بنے۔ دارالعلوم میں اونچے درجوں کے طلبہ کے لئے " النادی الادبی" عربی انجمن کی بنیاد ڈالی جس کے تحت طلبہ تحریر وتقریر کی مشق کرتے، نیز قلمی رسالوں کا بھی آپ نے طلبہ میں شوق پیدا کیا جس کے نتیجہ میں دسیوں قلمی رسالے منظر عام پر آئے۔

نفاست اور انفرادیت آپ کا خاصہ تھی، خوش خطی کے سیکڑوں نمونے ہیں لیکن اس راہ میں بھی آپ نے ندرت پیدا کی۔ کتابت کے لئے بعینہٖ ٹائپ کے طرز کو اپنایا، خود کتابت کرتے اور طلبہ کو مشق بھی کراتے۔

کئی تحریریں میں نے ٹائپ کی شکل میں دیکھیں استفسار پر معلوم ہوا کہ اس اکتساب فیض کا سرچشمہ مولانا وحید الزماں ہی ہیں۔

۱۹۷۰ء میں کچھ عرصہ عربی کے مشہور ومعروف رسالہ " الکفاح " کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ نے ۱۹۸۸ء میں تصنیف وتالیف کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دارالمؤلفین کی بنیاد ڈالی۔ دارالمؤلفین کے قیام کا مقصد اکابرین دیوبند کی تصانیف وافادات کو تصحیح وتنقیح کے ساتھ اہل علم اور عوام الناس تک پہونچانا ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والی کتابیں بلا نفع فروخت کی جاتی ہیں۔ اب تک بیس سے زائد کتابیں شائع ہوکر قبول عام حاصل کرچکی ہیں۔ جن میں "مقالات عثمانی" "مجموعۂ افادات قاسمی" "جواہر المعارف" "صداقت اسلام" "عظمت اسلام" "دارالعلوم دیوبند احیائے اسلام کی عظیم تحریک" اور فن اسماء الرجال جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ ۱۹۸۸ء ہی میں ملی جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تو آپ

(بقیہ صفحہ ۳۱۲ پر)

مولانا حفظ الرحمٰن ملک قاسمی

ہمارے مولانا

حضرۃ الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی اب اس دنیا میں نہیں رہے، یہ خبر سنی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، زبان گنگ ہو گئی، محسوس ہوا کہ والدین کے رہتے ہوئے یتیم ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

گمان بھی نہیں تھا کہ ابھی چند ماہ قبل جس مرد مومن کی معیت میں ادائیگی عمرہ اور زیارت مدینہ منورہ کا شرف حاصل ہوا تھا، اچانک ہمیں چھوڑ کر رخت سفر باندھ لیں گے اور اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے جائیں گے۔ کسے پتہ تھا کہ ریاض میں مقیم اپنے تلامذہ سے اگلے سال اپنی زوجۂ محترمہ کے ساتھ تشریف آوری کا کیا ہوا وعدہ اب کبھی وفا نہ کر پائیں گے۔

ع کہاں سے لائیں گے اب تجھ سا اس جہاں میں ہم

ہمارے مولانا واقعی وحید الزماں تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے جہاں تشنگانِ علم و معرفت آتے اور اپنی پیاس بجھا جاتے تھے، وہ ایک کامیاب معلم و مدرس، شعلہ بیان مقرر، شستہ بیان ادیب، مخلص رہنما، کامیاب مؤلف و مصنف، اور مشفق مربی ہونے کے ساتھ ایک بے مثال انسان گر بھی تھے۔ شخصیت سازی ان کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ ہر علمی میدان کے لئے موزوں افراد کی تیاری ان کا مشن تھا۔ چنانچہ ہم میں سے کتنے لوگ کوڑہ کرکٹ کے ڈھیر سے نکل کر آئے تھے مگر اس کارخانہ وحیدی سے بیش قیمت گوہر اور انمول ہیرا بن کر نکلے۔ ہندو پاک میں عربی زبان و ادب کو فروغ و ارتقاء

مقیم ریاض (سعودی عرب)

دینے والوں میں ان کا نام سب سے اوپر رہے گا۔ کیونکہ اس میدان میں سارے مدارس اور یونیورسٹیوں نے مل کر جتنے افراد پیدا کئے اس سے کہیں زیادہ آپ نے تن تنہا تیار کئے ہیں جس کا اعتراف دوست و دشمن سب کو ہے۔ بقول احسان دانش ؎

میرے شہ پاروں کی کھائیں گے قسم اہل ادب
میں نے سیارے تراشے ہیں چراغِ شام سے

ہمارے مولانا کو دارالعلوم دیوبند سے جو بے پناہ محبت اور طلبہ برادری سے جو عدیم المثال تعلق تھا اس کی بہت کم مثالیں آنکھوں نے دیکھی اور کانوں نے سنی ہوں گی، مادر علمی سے محبت تو فطری امر ہے۔ جہاں سے آپ کی فراغت ہوئی، یہیں پہلے مدرس پھر شعبۂ عربی کے صدر اور عربی مجلہ "دعوۃ الحق" کے نگراں بنائے گئے۔ اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند کے بعد ناظم تعلیمات اور پھر معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند کے معزز عہدوں پر فائز ہوئے جو "حق را بحق دار رسید" کا صحیح مصداق تھا، آپ کے مختصر زمانۂ نظامت تعلیمات و اہتمام میں دارالعلوم نے جو ہمہ جہتی ترقی کی اسے آنے والی نسلیں ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ ایسا لگتا تھا کہ آپ دارالعلوم کے لئے ہی پیدا ہوئے، اسی کے لئے زندہ رہے اور اسی کے لئے مرے۔

طلبہ ہمارے مولانا کی کمزوری بھی تھے اور طاقت بھی۔ وہ ان سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے تھے؛ ان کے دکھ درد اور ان کی کامیابی و ناکامی کو اپنی کامیابی و ناکامی تصور فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے آپ نے اپنا آرام و سکون قربان کر دیا، جس کے نتیجے میں آپ کی صحت بھی خاصی متاثر ہوئی، مگر آخری لمحہ تک آپ کے حوصلے بلند اور عزائم جواں رہے۔

یوں تو ہمارے مولانا کو سبھی طلبہ سے محبت و ہمدردی رہتی تھی، مگر اپنے تلامذہ اور شاگردوں کو بالکل اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ اس ناچیز کو کم و بیش دس سال تک براہ راست شرف تلمذ رہا۔ اس طویل عرصہ میں آپ کی زندگی کے متعدد نشیب و فراز دیکھنے کا موقع ملا۔ اور بلا مبالغہ ہر موقع پر آپ کو خوب سے خوب تر ہی پایا۔

حضرۃ الاستاذ رحمہ اللہ کو اللہ نے اپنی تمام نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا، نیک و صالح اولاد، بھائیوں کا باہمی میل ملاپ اور اتحاد، شاگردوں کی جاں نثاری، عزت و شہرت سبھی کچھ میسر تھا، مگر مسلمانوں کی علمی و اقتصادی پسماندگی انھیں مضطرب کئے رہتی تھی جس کے ازالہ کے لئے حتی المقدور کوشاں رہے۔ مجلس عاملہ جمعیۃ علمائے ہند کی ممبری اور اس کے مختلف شعبوں کی نگرانی، مرکزی جمعیۃ علمائے ہند

(بقیہ ص ۳۲۶ پر)

مولانا منظور احمد القاسمی

اندازِ تربیت کے چند نمونے

زمانہ اپنی رفتار سے شب و روز کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ اچانک ۱۵؍ ذوقعدہ ۱۴۱۵ھ کو عربی زبان و ادب کی معروف شخصیت حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی وفات حسرت آیات نے ان کے تلامذہ و متعلقین و منتسبین کے سروں پر رنج و غم اور کرب و الم کا ایک کوہ گراں توڑ کر رکھ دیا، ان کے وفات کی خبر ہند و بیرونِ ہند کے تمام علمی حلقوں میں ایک صاعقہ بنکر لوگوں کے دل و دماغ پر گری۔ مولانا کے حادثۂ رحلت سے حزن و ملال اور حسرت و یاس کا وہ شدید احساس ہوا جس کی تعبیر زبان و قلم سے ممکن نہیں۔

مولانا موصوف گوناگوں اوصاف و کمالات، خصوصاً عربی ادب، تعلیم و تربیت، نظم و ضبط، فکر و نظر، عزم و ثبات، اصابت رائے، یقینِ محکم، مذاقِ سلیم، جہدِ مسلسل، مردم سازی اور جرأت و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے ساتھ ساتھ ایسی بالغ نظری، محققانہ ہوشمندی، مجتہدانہ شان اور ژرف نگاہی عطا فرمائی تھی کہ وہ گلشن علم کے گل سرسبد بن گئے تھے۔ مولانا مرحوم کے عظیم علمی کارنامے دارالعلوم میں ان کی خدمات جلیلہ اور عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ان کے تلامذہ ان کے کمالات و خصوصیات کے آئینہ دار ہیں، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایسی باکمال اور عبقری شخصیات کبھی کبھی ہستی وجود میں آتی ہیں۔

مولانا مرحوم کے کمالات میں حسن تربیت کی بھی ایک امتیازی شان تھی اور اس وقت یہی میرا موضوع قلم ہے جس کو "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سنہ ۱۴۰۹ھ میں (جو کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا مرحوم کی تدریسی خدمات کا آخری سال تھا) راقم الحروف دارالعلوم کے شعبۂ تکمیل ادب کا طالب علم تھا، اس وقت مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تو تعلیم و تربیت اور تعمیر اخلاق کی ایسی قابلیت دیکھنے اور سیکھنے میں آئی جو محض اس حکیم مطلق کے فضل سے ملتی ہے جس کی طاقت و حکمت، ذرہ کو آفتاب اور آفتاب کو ذرہ بنا سکتی ہے۔ آپ بڑی غلطیوں، غیر سنجیدہ و ناشائستہ

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ یوپی

حرکتوں پر تنبیہ اور روک ٹوک کے ساتھ ایسی باریک باریک باتوں پر گرفت کرتے تھے، جن تک عام نگاہیں نہیں پہونچ پاتیں، لیکن تربیت کا فن اور جوہر انھیں باریکیوں اور دقائق سے نکھرتا اور ابھرتا ہے جنھیں سرسری نگاہیں نظر انداز کردیتی ہیں۔

مثلاً آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونے کے بعد سب سے پہلے صحیح تلفظ کے ساتھ "اسم الٰہی" کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے سلام کرنے کا سلیقہ سکھلایا جاتا، آپ طلبہ کو سلام کے مکمل الفاظ صاف طور پر ادا کرنے کی عادت ڈلواتے تاکہ معلوم ہو کہ وہ اسلام کے ایک شعار اور سنتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بروئے کار لارہے ہیں، یہ نہ ہو کہ لفظ "السلام" کے سین کی سیٹی نکلے اور بس۔ یا یہ کہ تمیز ہی نہ ہوسکے کہ وہ "السلام علیکم" کہہ رہے ہیں یا "السام علیکم" یا الفاظ منھ میں اور کچھ باہر۔ اگر کبھی کوئی طالب علم ان کے معیار کے مطابق سلام نہ کرتا تو اس پر سخت تنبیہ فرماتے اور اس کی تصحیح کی تاکید کرتے، بار بار خود ادا کرکے بتلاتے، کبھی کسی کو درسگاہ سے باہر نکل کر دوبارہ سلام کرکے آنے کا حکم دیتے، پھر تو چند ہی دنوں میں سارے طلبہ صحیح انداز میں سلام کرنے کے عادی ہوجاتے، حتیٰ کہ سلام کرنے کا خاص انداز، تلفظ کی صحت اور مکمل جملہ کی ادائیگی "شعبۂ تکمیل ادب" کے طالب علم ہونے کی دلیل بن جاتی۔

مولاناؒ اپنے تلامذہ و متعلقین کو اخلاق، سنجیدگی، شائستگی اور آدابِ مجلس کی رعایت و اہتمام کا خاص درس دیتے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر ان اسلامی آداب کو برتا جائے تو نہ کسی کو ایک دوسرے سے تکلیف ہو اور نہ کسی درجہ میں کسی کو الجھن اور کبیدگی پیدا ہو۔ ان اسلامی تعلیمات کو دیکھ کر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند ساتھی مولانا کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے، کمرہ میں چادریں بچھی ہوئی تھیں، بیٹھنے کا حکم ہوا، باتیں ہونے لگیں، اسی دوران کچھ اور لوگ بھی بغرض ملاقات آگئے، مولانا نے ہمارے بعض ساتھیوں کو ذرا سا پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا، تاکہ جگہ کشادہ ہوجائے ایک طالب علم اس طرح سے پیر گھسیٹ کر پیچھے ہٹا کہ چادر میں سلوٹیں پڑ گئیں، آپ نے دیکھا تو آپ کی طبیعت مکدر ہوگئی مگر ضبط سے کام لیکر شفقت کے ساتھ تنبیہ فرمائی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چادر پر تشریف لائے، بیٹھے اور پیچھے ہٹ کر دکھلایا اور کہا کہ اس طرح سے تھوڑا سا کھڑے ہوکر ہٹنا چاہیے تاکہ سلوٹیں نہ پڑیں، اسی طرح اگر درسگاہ میں کبھی تپائی وغیرہ آگے پیچھے یا دائیں بائیں کھسکانے کی ضرورت پیش آتی تو ان کی تعلیم یہ تھی کہ تپائیوں کو اٹھا کر اپنی جگہ سے ہٹایا جائے ورنہ فرش کے خراب ہونے کا بھی امکان ہے اور پھٹ جانے کا بھی اندیشہ۔

آپ کی مجلس میں بار بار چائے پینے کا اتفاق ہوا، چائے کی چسکی لیتے وقت بعض لوگوں کے منھ سے نامناسب آواز نکلتی ہے جس سے ذوقِ لطیف کو ایک چوٹ سی لگتی ہے اور اگر مجلس میں بہت سارے لوگ

اسی انداز سے چائے پیتے ہوں تو ایک عجیب ناگوار سماں پیدا ہو جاتا ہے، مولانا بھی اس کو برداشت نہ کرتے بلکہ فی الفور ٹوکتے اور پھر پی کر بتلاتے۔

مولانا مرحوم کے پاس طلبہ خام کی صورت میں آتے اور انھیں کندن بنانے کی سعی کرتے، طلبہ کی ہر ایسی حرکت کو ناپسند کرتے اور حکمت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے، جو ان کے وقار کو مجروح کرنے کی باعث ہوتی، خصوصاً درسگاہ میں دوران درس متانت، تیقظ و بیداری کا دامن چھوڑ دینے سے سخت ناراض ہوتے، فرماتے کہ علوم نبوت کے حصول کے وقت ہمہ تن متوجہ ہو کر اس طرح بیٹھئے کہ معلوم ہو کہ آپ اسلام کے سپاہی ہیں نہ اس طرح کہ معلوم ہو آپ جبراً، بادلِ نخواستہ بٹھائے گئے ہیں اور احساس کمتری کے شکار ہیں، بالکل مریل، بے جان اور دبک کر بیٹھے ہوں۔

طالب علم کو اس بات کی تاکید کرتے اور عملی مشق کراتے کہ استاذ سے صاف گفتگو کرے اتنی آہستہ اور ناصاف گفتگو نہ ہو کہ استاد کو بار بار پوچھنے کی زحمت کرنی پڑے۔ طالب علم اگر کسی سوال کا جواب دے رہا ہے اور اسے اس کے صحیح ہونے میں شک ہے، تب بھی بالکل صاف اور واضح جواب دے، اکثر طلبہ ناصاف اور بہت آہستہ استاذ سے گفتگو کرتے ہیں جس کی وجہ سے بار بار پوچھنے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور اس کو از قبیل ادب شمار کرتے، مولانا فرماتے کہ یہ کون سا ادب ہے؟ ارے یہی تو ہوگا کہ آپ کی غلطی واضح ہو جائے گی لیکن جب تک غلطی ظاہر نہیں ہوگی اس کی اصلاح کیسے ہوگی؟ اور آپ لوگ اپنی اصلاح کے واسطے ہی تو مدرسہ میں آئے ہیں۔ چنانچہ طلبہ کے اندر اسی وصف کو اجاگر کرنے کی خاطر، راقم نے پورے سال مولانا کا معمول دیکھا کہ کبھی کسی مضمون، مقالہ یا انشاء کی کاپی خود ملاحظہ فرما کر اس کی اصلاح نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ایک سے فرداً فرداً صحیح تلفظ کے ساتھ صاف صاف پڑھواتے، اردو ہو تو اردو لہجہ میں اور عربی ہو تو عربی لہجہ میں اور غلطیوں پر گرفت کر کے قاری ہی سے درست کرواتے۔

آپ کے کمرے میں اگر کوئی جاتا اور بار بار کمرہ کے سامان پر نظر ڈالتا رہتا، ادھر ادھر کی چیزوں کو نظریں گھما گھما کر اوپر نیچے، دائیں بائیں بار بار دیکھتا رہتا، جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے تو اس پر گرفت کرتے اور بتلاتے کہ یہ سب حرکتیں آدمی کو بے وقعت کرنے والی ہیں، جب کوئی آپ سے مخاطب ہے تو اس کے لیے یہ باعث تکلیف ہے کہ آپ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوسری طرف التفات کیے ہوئے ہیں، اسی طرح سے حاضرین جب کبھی کمرہ سے باہر نکلتے اور ساتھ میں مولانا بھی نکل رہے ہوتے تو بعض لوگ از روئے ادب دروازے سے نکلنے سے پہلے رک جاتے کہ مولانا پہلے نکل جائیں، ایسے موقع پر فرماتے کہ نہیں، پہلے مہمان پھر میزبان، پہلے آپ لوگ چلیں گے، پھر صاحب حجرہ نکلے گا۔

ایک مرتبہ مولانا مرحوم نے اپنے دولت کدہ پر "تکمیلِ ادب" کے طلبہ کی دعوت کی، دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے اپنی نگرانی میں انتہائی سلیقہ سے چنوا رہے تھے، خود ہی جگہ متعین فرماتے کہ یہ چیز یہاں رکھیے، وہ چیز وہاں رکھیے، پانی یہاں ہونا چاہیے، دورانِ طعام پانی کس کو کتنا دینا چاہیے، پورا گلاس بھر کر یا کم۔ پھر مولانا نے سب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ صرف مقصود کھانا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ آج کی اس دعوت سے سبق سیکھ کر اٹھیے، کسی کے یہاں جائیے تو کھانے کے آداب اور مہمانوں کو کھلانے کا سلیقہ اور طریقہ کار سیکھ کر جائیے۔ دسترخوان کے سبھی شرکاء کا خیال مدنظر رکھیے، سالن وغیرہ اس طرح سے نہ نکالیے کہ جس کے سامنے سالن کا برتن اول اول پڑ جائے وہ اوپر کا روغن یا اچھی بوٹیاں زیادہ سے زیادہ نکال لے اور دوسروں کا خیال مطلق نہ رکھے، بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اخیر تک بھی اگر سالن برتن میں بچا رہے تو کچھ روغن بھی ضرور رہے۔

بارہا مولانا سے یہ ہدایت سنی کہ اپنے کسی بھی مضمون، مقالہ، انشاء، تحریری یادداشت، شب و روز کے مندرجات ڈائری اور نوٹ وغیرہ پر تاریخ مع سن اور اپنا نام ضرور لکھنے کا اہتمام کیجیے، آپ کاپی یا ڈائری میں اگر کوئی بات کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں تو مع حوالہ کتاب و صفحہ لکھیے، اگر کسی کے اقوال یا افادات درج کر رہے ہیں تو اشارۃً ضرور لکھ لیجیے تاکہ جب کبھی عرصۂ دراز کے بعد آپ انھیں دیکھیں تو بغیر کسی ذہنی کاوش کے معلوم ہو جائے کہ یہ قلمی مخطوطہ کس کا ہے؟ اور کب کا ہے؟ خود نوشت ہے یا کہیں سے ماخوذ ہے۔

یہ ہیں کثیر الجہات، متنوع الصفات، مربی جلیل حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی بے مثال تہذیب و تربیت، درسِ شائستگی اور اخلاقی تعلیم کے لاثانی نمونے کہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرکے اس کی اصلاح کی فکر کرتے اور اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے، ان دقائق پر ایسی ہی یگانۂ روزگار شخصیات کی عقابی نظر پہونچ سکتی ہے۔

یہ تو مولانا مرحوم کے کمالات کے صرف ایک پہلو یعنی اخلاقی تعلیم و تربیت کے چند نمونے ہیں اور صرف وہ نمونے ہیں جن کا راقم نے صرف ایک سال کی مدت میں مشاہدہ کیا ہے اور وہ بھی اس وقت جبکہ مولانا بڑھاپے کی عمر میں قدم رکھ چکے تھے اور کچھ ناساعد حالات اور پے در پے بیماریوں کی وجہ سے مضمحل رہا کرتے تھے، شعبۂ تکمیلِ ادب میں صرف ایک گھنٹہ پڑھایا کرتے تھے، اسی سے اندازہ لگائیے کہ اس دورِ اخیر سے پہلے جبکہ مولانا دارالعلوم اور طلبۂ دارالعلوم کی ترقی کے لیے ہمہ دم کوشاں رہا کرتے تھے، اس وقت تربیت کا رنگ کتنا تیز رہا ہوگا۔ اپنے پیشروؤں سے سنا ہے کہ طلبہ کی اخلاقی تعمیر اور علمی استعداد میں ترقی کی جتنی تدبیریں ہو سکتی تھیں، اس کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے لیکن اس وقت کے حالات و کمالات پر قلم اٹھانے کا حق اس وقت کے شاہدین و مستفیدین کا ہے۔

مولانا عقیل احمد قاسمی
صدر المدرسین جامعہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ

ایک نابغۂ روزگار شخصیت

استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نوراللہ مرقدہٗ کی باکمال اور پُر وقار شخصیت نے زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ مثالی کارنامے انجام دیئے ہیں جن کو ہر طبقہ نے سراہا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی زندگی حرکت وعمل سے عبارت تھی، علمی میدان ہو یا عملی زندگی، تصنیف و تالیف کا میدان ہو یا درس وتدریس کی مسند، تنظیمی ادارے ہوں یا سیاسی تحریکات جماعتی زندگی ہو یا انفرادی طریقۂ حیات۔

جہاں آپ نے اپنی وسعتِ علمی سے تشنگانِ علوم کو سیراب کیا اور مختصر وقت میں اس میدان میں وہ عظیم کارہائے نمایاں انجام دیے جو علمی کام کرنے والوں کے لیے مینارۂ نور اور مشعلِ راہ ثابت ہوئے وہیں اپنی فعال اور متحرک زندگی سے علمی میدان میں کام کرنے والوں کی رہنمائی فرمائی اور طلباء کو جمود وتعطل سے نکال کر حرکت و فعالیت کی روح پھونک دی۔

آپ نے جس طرح اپنی خداداد صلاحیت اور فکر وتدبر سے تصنیف وتالیف کے شعبہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے قلم سے ایسی کتابیں تحریر فرمائیں جو عوام وخواص میں مقبول ہوکر علماء اور طلبہ کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئیں، اسی طرح آپ نے اپنے انوکھے اندازِ تدریس سے اساتذہ اور مدرسین کو اس طریقۂ درس کی رہنمائی فرمائی جو طلبہ کے لیے زیادہ مفید ہوسکے اور تھوڑے وقت میں ان سے زیادہ کام لیا جاسکے۔

آپ نے مختلف علمی اداروں کو حسنِ انتظام کا سلیقہ بخشا اور متعدد ملی تنظیموں میں اپنے صحیح فکر اور قوتِ فیصلہ کا مظاہرہ کیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ کمال عطا فرمایا تھا کہ علماء کا طبقہ ہو یا جدید تعلیم یافتہ حضرات سب ہی نے آپ کی وسعتِ علمی، فکر کی بلندی، سیاسی شعور، متانت وسنجیدگی، اور آپ کے اخلاق وکردار کا اعتراف کیا اور آپ کی پُر وقار و پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے۔ آپ کی مختلف النوع خدمات کو دیکھ کر ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ نے تن تنہا جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ بہت سی جماعتوں اور تنظیموں کی خدمات پر بھی بھاری ہیں۔ آپ کی زندگی کا حقیقی میدانِ عمل دارالعلوم اور طلبۂ دارالعلوم رہا ہے اور ان دونوں سے آپ کو ایسی محبت اور مخلصانہ تعلق تھا کہ یہ دونوں ہی زندگی بھر آپ کی سرگرمیوں کا محور رہے۔ بس ایک ہی نعرہ تھا دارالعلوم

کی ترقی اور اس کے طلبہ کی ہر طرح سے فکر۔ آپ کے شب و روز اسی فکر میں گذرتے تھے۔

آپ نے اپنی پوری زندگی دارالعلوم کے لیے وقف کر دی تھی اور دارالعلوم کو چار چاند لگانے میں آپ نے وہ کردار ادا کیا ہے جس کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی، دارالعلوم کا اہتمام ہو یا نظامت تعلیم، تعمیراتی ترقی ہو یا طلبہ کے لیے سہولتوں کی فراہمی ان تمام شعبوں میں آپ کی وہ مثالی خدمات ہیں جن کو دارالعلوم کا مؤرخ آب زر سے لکھنے پر مجبور ہوگا اور ان پر پردہ فراموشی ڈالنا تاریخ کے ساتھ دھوکہ کے مترادف ہوگا۔

دارالعلوم کے طلبہ کے مستقبل کو سنوارنے، ان کی علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، ان کے اندر احساس کمتری کو ختم کر کے خود اعتمادی پیدا کرنے، اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی مخلصانہ رہنمائی کرنیکا جو جذبہ اور لگن ان میں تھی وہ اپنی آنکھوں نے کسی میں نہیں دیکھی۔

میرا زمانہ طالب علمی سے آپ کے آخری ایام تک تعلق رہا اور بہت قریب رہ کر آپ کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، طلبہ دارالعلوم کے روشن مستقبل کے لیے آپ کی مساعی اور شب و روز کی غیر معمولی جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا کہ اگر دارالعلوم میں طلبہ کی نظریں کسی شخصیت پر تھیں تو وہ صرف آپ کی ذات تھی۔

آپ کی ذات سے طلبہ کو جو عقیدت اور محبت تھی اس کا ایک طالب علم کی حیثیت سے میری آنکھوں نے خود مشاہدہ کیا ہے طلبہ آپ کی ہر بات کو ہر حرکت کو ہر عمل کو ورد زبان رکھتے تھے اور اگر دارالعلوم میں کسی کا چرچا تھا، والہانہ انداز میں اگر طلبہ کو کسی سے محبت تھی اور ان پر اگر کسی کا رعب اور دبدبہ تھا تو وہ آپ کی ذات تھی۔

اس لیے کہ آپ نے طلبہ کے مستقبل کو تابناک بنانے اور ان کی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی ہر طرح سے تربیت کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اور ان کی خیر خواہی اور محبت میں جس طرح آپ نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا اس کی مثال ملنی مشکل ہے

النادی الادبی

آپ نے طلبہ کو ہر شعبۂ حیات میں تربیت دینے اور رجال سازی کی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے ایک انجمن قائم کی۔ اگرچہ اس انجمن کے قیام کا مقصد طلبہ کو عربی زبان کی طرف متوجہ کرنا اور ان کو عربی بولنے اور اس میں لکھنے کا ذوق پیدا کرنا تھا لیکن آپ نے اپنی وسعت ذہنی اور بلند فکری سے اس پلیٹ فارم کو طلبہ کی ہر طرح کی تربیت کا میدان بنا دیا۔ اور اس کے ذریعہ جہاں آپ نے طلبہ سے علمی اور تصنیفی کام لیے اور ان کو عربی زبان بولنے اور اس کو سمجھنے کا ملکہ دیا، اسی طرح ان کے جمود و تعطل کو توڑ کر فعالیت پیدا کرنا طلبہ میں اخلاقی قدروں کو بحال کرنا، ان کو اپنے مرتبہ اور مقام کی شناخت کرانا ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، تھوڑے وقت میں بہت کام کرنے کا گر سکھانا اور ان میں خود اعتمادی، سلیقہ اور شائستگی پیدا کرنا اور اسلامی طرز معاشرت کی طرف عملی رہنمائی کرنا، آپس میں جذبۂ اخوت

وبھائی چارگی پیدا کرکے آپسی تعاون پر آمادہ کرنا اور اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گذارنے کا سلیقہ دینا، غرض کہ آپ نے النادی الادبی کے ذریعہ طلبہ میں علمی وعملی بیداری کی وہ روح پھونکی کہ ہر طرف دارالعلوم میں النادی کے پروگراموں کا چرچہ ہونے لگا اور ہر آنے والا طالب علم اس سے وابستہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

النادی کے ہفتہ واری پروگراموں سے طلبہ نے عربی میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا سلیقہ سیکھا، اور اس کی بدولت علم مجلسی سے آراستہ ہوئے۔

النادی کے خاص مکتبہ نے طلبہ میں مطالعہ وتحقیق کا شگفتہ ذوق پیدا کیا اور اس کے شعبۂ تصنیف وتالیف نے طلبہ میں عربی زبان میں مضمون نگاری کا جذبہ پیدا کرکے دیواری پرچوں کے ذریعہ اظہار خیال کے مواقع دیے۔ اس کے نظام ترکیبی نے طلبہ میں حسنِ انتظام اور اپنی زندگی کو منظم کرنے کا طریقہ سکھایا، یہی وجہ تھی کہ النادی کا بڑے سے بڑا پروگرام طلبہ خود کر لیا کرتے تھے اور اس میں اپنی انتظامی صلاحیتوں کا وہ مظاہرہ کیا کرتے تھے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔

النادی سے متعلق کچھ صندوق آویزاں کیے گئے جن کو صناديق النادی کا نام دیا گیا۔ صندوق النادی میں طلبہ وہ رقومات جمع کیا کرتے تھے جو النادی کے پروگراموں پر خرچ کی جاتی تھیں اور اس کے کاز کو آگے بڑھانے میں استعمال ہوتی تھیں۔

صندوق الاستقراض سے ضرورت مند طلبہ کو ایک وقت کے لیے قرض دیا جاتا تھا اور اس طرح اس کے ذریعہ دوسروں کے کام آنے کے جذبہ کو فروغ دینا تھا۔

صندوق المساعدة النادی کا وہ فنڈ تھا جس سے مستحق طلبہ کی مدد کی جاتی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں آپسی تعاون، خیر خواہی اور ایک دوسرے کے کام آنے اور انسانیت نوازی جیسی صفات پیدا ہو جائیں۔

صندوق التوفیر (بچت فنڈ) کے ذریعہ طلبہ کفایت شعاری کے اصول کو اپنا کر اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بچا کر اس میں جمع کیا کرتے تھے، اس کے ذریعہ طلبہ کو بتایا جاتا تھا کہ اسراف بیجا شرعاً مذموم ہے اور اپنے پورے سرمایہ کو خرچ کرکے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔ اس لیے اپنے مصارف پر کنٹرول کرکے کچھ جمع کرنے کی عادت ڈالنا اچانک آنے والی پریشانیوں کا علاج ہے۔

طلبۂ دارالعلوم کے لیے یہ آپ کی وہ خدمات ہیں جن کے ذریعہ آپ نے ان کو ممتاز بنا کر پیش کیا اور ان کی ہر طرح کی صلاحیتوں کو اجاگر کرکے قوم کی اس امانت کو اس طرح واپس کیا کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنیں بلکہ قوم کے لیے ایک تحفہ اور اللہ کی جانب سے ایک ایسا ہدیہ ثابت ہوں کہ لوگ ان کی بات کو سننے کو دوڑ کر آئیں اور ان کے پاس بیٹھنے کو سعادت سمجھیں، ان کی اخلاقیات سے متاثر ہوں اور ہر شعبہ زندگی میں ان سے سبق حاصل کریں۔

(بقیہ صفحہ ۱۶۶ پر)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

ڈاکٹر عبدالقادر خان (فاضل دیوبند)

منفرد اسلوبِ تربیت

بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جن کو سنکر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، کلیجے منھ کو آجاتے ہیں، دل و دماغ اتنے متاثر اور رنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ برسہابرس تک ان کی کسک اور چبھن محسوس کرتے ہیں، جن سے نہ صرف ان کے گزر والے متاثر و غمگین ہوتے ہیں بلکہ ایک پورا معاشرہ، ایک پوری نسل غم و اندوہ میں ڈوب جاتی ہے۔

۱۵ر اپریل ۱۹۹۵ء کی رات میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ کا اس دُنیائے فانی سے رحلت فرما جانے کا حادثہ اسی نوعیت کا ایک سانحہ ہے جس سے تمام علمی و ادبی حلقے سوگوار اور رنجیدہ ہو گئے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ موجودہ نسل ایک عظیم عالم دین، مفکر، ادیب، مربی سے محروم ہو گئی ہے۔

حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت یوں تو گوناگوں خوبیوں اور مختلف النوع صلاحیتوں کی حامل تھی جن کا احاطہ یہاں مشکل ہے۔ البتہ آپ کی تدریسی زندگی کا ایک نصیحت آمیز واقعہ یہاں درج کیا جاتا ہے جو اسلوبِ تعلیم و تربیت میں خاص طور پر مدارس کے اساتذہ کے لیے منارۂ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

درحقیقت حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ رسمی اور روایتی طریقہ تدریس کے قائل نہیں تھے، آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ درس میں طلبہ صحیح طور پر اسباق کو سمجھیں، محض خانہ پری کے لیے درس میں حاضری آپ کو نہایت ناگوار تھی، یہی وجہ تھی کہ دورانِ درس طلبہ کی جانب سے بے توجہی محسوس کرنے کے بعد سخت تنبیہ کرتے اور بعض اوقات گوشمالی سے بھی دریغ نہ کرتے، جس کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ طلبہ واقعی اسباق سمجھیں تاکہ ان میں علمی ذوق پیدا ہو اور مطالعہ کے شوقین ہو جائیں۔

۱۹۷۶ء کے ایک درس کا واقعہ ہے، آپ کا سفِ ثانوی عربی کا درس عصر کی نماز کے بعد ہوا کرتا تھا جس میں جماعت پنجم اور ششم کے طلبہ شریک ہوتے تھے، راقم اس وقت سال ششم کا طالب علم تھا، آپ

درجہ قطر

حسب معمول نہایت وقار کے ساتھ مغرب کی نماز کے بعد درس گاہ میں تشریف لائے، القراۃ الواضحۃ جزء ثالث کا درس شروع ہوا، اس درس کا اسلوب یہ تھا کہ ایک دن پہلے کے سبق کا اعادہ سوال و جواب کی شکل میں ہوا کرتا تھا۔ آپ باری باری سبھی شرکاء درس سے سوال کرکے جواب طلب کرتے تھے، جو طالب علم سبق کا مطالعہ کرکے نہ آتا وہ صحیح اور بروقت جواب دینے سے قاصر رہتا۔ اس دن درس میں خاص طور پر آپ کو طلبہ کی جانب سے بے توجہی اور مطالعہ کی کمی کا شدید احساس ہوا۔ سبق کے اختتام پر اپنے طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا: بھائی آپ حضرات سے عشاء کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ کے لیے ایک کام لینا ہے، کیا آپ سبھی حضرات تیار ہیں؟ تمام طلبہ نے بیک آواز اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ دراصل ہمارے یہاں گھر کی تعمیر کا کام چل رہا ہے آپ سے صرف یہ درخواست ہے کہ روزانہ ایک گھنٹہ تک روڑے اینٹیں اٹھا کر گھر کے قریب پہونچا دیا کریں، کیا آپ سبھی اس کام کے لیے تیار ہیں؟ تمام شرکاء درس بخوشی راضی ہوگئے اور تمام لوگوں نے دل میں یہ طے کرلیا کہ کل عشاء کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ کے لیے ضرور اینٹیں اٹھانے کے لیے جانا ہے۔ طلبہ کی نفسیات جاننے کے بعد ایک قلیل وقفہ کے بعد آپ نے مسکرا کر فرمایا: عزیز طلبہ مجھے آپ حضرات سے مکان کی تعمیر میں کام نہیں لینا ہے میں تو صرف آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ عشاء کی نماز کے بعد صرف ایک گھنٹہ کے لیے اسی درسگاہ میں آجایا کریں، یہاں لائبریری کھلی رہتی ہے آپ پابندی سے آکر مطالعہ کرتے رہیں گے تو معلومات میں کافی اضافہ ہوگا اور صلاحیت میں چار چاند لگ جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعی بیشتر طلبہ پابندی سے دارالمطالعہ میں حاضر ہونے لگے۔

طلبہ کے اندر ذوقِ مطالعہ کی روح پیدا کرنے کا یہ ادنیٰ واقعہ ہے جو واقعی سبق آموز ہے اور انوکھا و دلچسپ بھی۔

طلبہ کے اندر علمی لیاقت و استعداد پیدا کرنے کا درد تو آپ کو ہمیشہ رہتا ہی تھا، آپ کی ہمیشہ یہ بھی خواہش رہتی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام طلبہ اپنے طور طریقے، رہن سہن عادات و اخلاق میں سب سے منفرد نظر آئیں، یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر ہوسٹل کے کمروں میں جا جا کر طلبہ کے طرز رہائش کا معائنہ کرتے، چارپائیوں پر اگر بستر ڈھنگ سے ترکیا ہوا نہ پاتے تو انھیں تنبیہ کرتے اور سلیقے سے بستر وغیرہ منظم کرنے کا ڈھنگ بتلاتے، نیز کھانے پینے کے آداب سکھانے کی خاطر اپنے سے متعلق طلبہ کو گاہے بگاہے ایک ساتھ کھانا تناول کرنے کا اہتمام فرماتے، خود بھی اپنا کھانا گھر سے منگواتے اور طلبہ بھی اپنا اپنا کھانا ساتھ لے کر آتے، آغاز میں آپ کھانے کے آداب بیان فرماتے۔ خاص طور پر اس بات پر زیادہ زور دیتے کہ سبھی حضرات کھانے کے دوران اپنے ساتھی کا خیال رکھیں، اس بات کی ہرگز کوشش نہ کریں کہ اگر کوئی زیادہ لذیذ چیز

(بقیہ صفحہ ۲۷۱ پر)

مولانا طاہر الاسلام قاسمی

ایک مختصر تعارفی خاکہ

زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں سمیت . بے وفا بھی ہے اور فانی بھی ـــ لیکن
زندگی میں کچھ کر جانے والے نہ بے وفا ہوتے ہیں اور نہ فانی ! ـــ وہ اپنے کاموں اور کارناموں
کے ذریعے صدیوں زندہ رہتے ہیں، اور آنے والی نسلوں کے ساتھ اپنا عہدِ وفا استوار رکھتے
ہیں ! ـــ مولانا وحید الزماں صاحب ایسے ہی غیر فانی انسان ہیں ۔

میں مولانا کا براہ راست شاگرد نہیں، لیکن عربی زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت
سے مجھے یہ اعتراف ہے کہ پہلے پہل جدید عربی سیکھنے کا شوق مولانا کے شاگردوں، ان کے دواری
عربی پرچوں اور النادی کے عربی جلسوں کو دیکھ کر ہی پیدا ہوا ۔ بعد میں ان کی کتابوں سے استفادہ
بھی کیا ۔

مولانا سے کون واقف نہیں تھا لیکن میرے لئے اب یہ کسی شرف سے کم نہیں کہ مولانا
بھی مجھ سے واقف تھے ـــ آخری ملاقات مولانا سے جدہ میں دو سال پہلے ہوئی ۔ یہ بہت
مختصر ملاقات تھی ۔ انھوں نے دوسرے سفر پر طویل ملاقات اور گفتگو کا وعدہ کیا ـ لیکن افسوس
کہ وہ دنیا سے ہی سفر کر گئے ـــ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر میں نے پندرہ روزہ نگر اسیاٹ
دیوبند کا ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا تھا، اور اس میں میں نے مادرِ علمی کے بعض بقید حیات اساتذہ
کے تعارفی خاکے لکھے تھے ۔

مقیم جدہ (سعودی عرب)

مولانا کے تعارف کے سلسلے میں جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کی اساس مولانا سے بالمشافہ گفتگو تھی۔ مجھ سے پہلے شاید ہی کسی نے ان کا اتنا مختصر اور جامع تعارف زیب قرطاس کیا ہو۔

آپ کے پرچے کے مولانا نمبر کے لئے میں یہ تحریر بھیج رہا ہوں کہ میرا نام بھی بزم وحیدی کے پروانوں میں آجائے گا کہ سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبیں کی!

مولانا پر ایک طویل مضمون کی بنیاد میں نے رکھ دی ہے، دیکھئے وہ کب پایۂ تکمیل کو پہنچے — دعا کیجئے کہ میں مولانا سے متعلق میں اپنی منتشر یادوں اور خیالوں کو سمیٹنے میں کامیاب ہو سکوں اور جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ سکوں۔ واللہ المستعان!

طاہر الاسلام قاسمی

مولانا وحید الزماں کیرانوی

درجۂ علیا کے اساتذہ میں ہیں اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ذہانت وذکاوت میں یکتا، طلبہ کی نفسیات کے ماہر، انتظامی صلاحیتوں میں برق، قوت ارادی کے اعتبار سے چٹان، عزم وارادہ کے لحاظ سے پہاڑ، عربی زبان وادب کے دریائے زخار، اس خاکہ میں رنگ بھر دیجئے تو مولانا وحید الزماں صاحب کی شبیہ صاف نظر آنے لگے گی۔

۱۹۳۰ء میں قصبہ کیرانہ (ضلع مظفر نگر) کے شیوخ میں ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن مجید۔ فارسی اور ابتدائی عربی کیرانہ میں پڑھنے کے بعد ۱۹۴۶ء کے وسط تک حیدر آباد قیام رہا، جہاں آپ کے ماموں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران علامہ المامون دمشقی سے چند مہینہ عربی زبان کا استفادہ کیا۔

۱۹۴۰ء میں دارالعلوم دیوبند چلے آئے، شرح وقایہ وغیرہ کتابوں میں داخلہ لیا، ۱۹۵۲ء میں فارغ ہو گئے۔ حضرت مدنیؒ، حضرت شیخ الادبؒ اور خاص طور پر حضرت علامہ بلیاویؒ کی ذہانت نے بہت متاثر کیا۔ بعد کے لوگوں میں حضرت مولانا فخر الدینؒ کے استحضار علم نے بھی گہرا اثر چھوڑا۔

حضرت نانوتویؒ کی کتابوں سے آپ کی دلچسپی دیکھتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی خواہش تھی کہ آپ فراغت کے بعد دارالعلوم میں قیام کریں۔ اور حضرت نانوتویؒ کی کتابوں پر کام کریں، مگر بعض وجوہ کی بنا پر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

دارالعلوم کی ملازمت سے پہلے کچھ دنوں دلی قیام کیا اور وہاں کے ایک ناشر کے لئے اردو کی کچھ کتابیں لکھیں، اس کے بعد دیوبند میں ادارۂ دارالفکر کی بنیاد ڈالی اور ماہنامہ القاسم جاری کیا۔
سنہ ۱۹۶۳ء میں حضرت علامہ بلیاویؒ کی تحریک پر ارباب دارالعلوم نے آپ کو بحیثیت استاد اپنے ہاں بلالیا۔

دارالعلوم میں استاذ ہوجانے کے بعد تصنیفی مشاغل برابر جاری رہے۔
القاموس الجدید (ڈکشنری) عربی سے اردو، اردو سے عربی، جدید عربی کے آسان کورس، القراۃ الواضحہ کے تین جزو (مع ان کی تین دلیلیں) عربی کے مبتدی طلبہ کے لئے نفحۃ الادب، اور المطالعۃ المحمودہ (عربی) کے تین حصے آپ کے قلم سے نکل کر طبع ہوچکے ہیں۔
دارالعلوم کے سہ ماہی عربی مجلہ دعوۃ الحق اور پندرہ روزہ الداعی کے مدیر بھی رہے۔
اس وقت جمعیۃ العلماء کے آرگن پندرہ روزہ عربی جریدہ الکفاح کے مدیر ہیں۔ عربی زبان وادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ان دنوں فن حدیث سے دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔
'مفتاح السنۃ' اور 'مباحث السنۃ' کے نام سے علم حدیث پر عربی و اردو میں دو ضخیم کتابیں زیر تالیف ہیں۔

عربی اخبارات کی اصطلاحات پر ایک ڈکشنری، جدید وقدیم الفاظ کی جامع ایک بڑی ڈکشنری جدید عربی تعبیرات کے نام سے ایک موضوعی ڈکشنری وغیرہ کتابیں بھی زیر ترتیب ہیں۔
بہرحال مولانا اپنے علم، اپنی صلاحیتوں اور وقت کی قدر وقیمت کو سمجھتے ہوئے بلندی کی آخری حدوں کو بھی پار کرجانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پندرہ روزہ نگراسپاٹ دیوبند

خصوصی اشاعت بموقع اجلاس صدسالہ دارالعلوم دیوبند

مولانا عبدالحمید نعمانی

ایک یادگار و باکردار شخصیت

عام طور پر کسی فاتح اور بہادر کی بہادری کا اندازہ اس کے میدان جیت لینے سے لگایا جاتا ہے، لیکن کچھ ایسے فاتح اور بہادر بھی ہوتے ہیں جن کی شجاعت اور کشورکشائی کا اندازہ ان کی ٹوٹی ہوئی تلواروں اور خون کے چھینٹوں سے ہوتا ہے۔ ہم نے وحیدِ عصر مولانا وحیدالزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی دونوں قسم کے بہادروں کی فہرست میں دیکھا ہے۔ جو لوگ ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سے تھوڑی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ ہماری بات کی یقیناً توثیق و تصدیق کریں گے۔ ہم نے انھیں معرکہ سر کرتے اور میدان جیتتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور ٹوٹی ہوئی تلواروں اور خون آلود وجود کے ساتھ میدان سے واپس آتے ہوئے بھی۔ یہ اشارے کنائے ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے جنہوں نے وحیدِ عصر، فرید زمانہ کو نہیں دیکھا ہے یا ان سے دور رہے ہیں، یا جو نزدیک رہ کر دور رہے لیکن جو بابصیرت ہیں وہ اشارے کنائے بھی سمجھ رہے ہوں گے اور ہماری اَن کہی باتوں کو بھی۔ ان لوگوں کا شمار ہمارے نزدیک "محرومین" میں ہے جو دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے بنے رہے اور وہ پانے والے ہیں جو نہ دیکھ کر بھی مولانا کو اپنے قریب سمجھتے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ چاہے میدان جیت کر آئے یا ٹوٹی ہوئی تلواروں اور لہولہان جسم کے ساتھ راقم الحروف دونوں حال میں ان کو فاتح اور بہادر سمجھتا ہے۔ جو لوگ سطح بیں ہوتے ہیں وہ ٹوٹی ہوئی تلواروں سے مجاہد کی بہادری کا اندازہ نہیں لگا پاتے، اس لیے وہ بڑی جلدی اور آسانی سے اس کی طرف ہار کا انتساب کر دیتے ہیں۔ وحیدِ عصر، فرید زمن کے بارے میں بعض بہت سے حضرات کہتے سنے جاتے ہیں کہ ان کو اپنی حیات کے جہاد میں متعدد بار شکست سے دوچار

۱۔ بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی ۲

ہونا پڑا۔ ایسا اس لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ لوگوں کی نظر شکستہ تلواروں پر تو پڑتی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ آخر تلواریں کیوں ٹوٹیں؟ —— البتہ ایسا کہنے والے یہ جانتے ہیں کہ مولاناؒ نے اپنے ضمیر و کردار کا کبھی سودا نہیں کیا۔ اگر یہ بات ہے تو انؒ کی طرف انتساب شکست چہ معنی دارد؟ آخر فتح و شکست کا معیار کیا ہے؟ بااصول زندگی، مکاری و فریب سے پاک کردار یا حیات بے اصول اور چالاکی سے پر کردار و عمل؟ —— پہلی زندگی میں اصول کی اہمیت و قیمت ہوتی ہے جبکہ دوسری قسم کی زندگی کا نشانہ مفاد اور صرف مفاد ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسی دوسری زندگی کو عموماً کامیاب زندگی سمجھا جاتا ہے لیکن اہلِ نظر و بصیرت تو باکردار و بااصول زندگی ہی کو کامیاب زندگی سمجھتے ہیں اور اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ باکردار و بااصول انسان ہار کر بھی جیت جاتا ہے اور بے کردار لوگ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ اسی لیے ہمارا ماننا ہے کہ فریدِ زمن وحیدِ عصر جیت کر بھی جیتے اور ہار کر بھی جیتے ہیں۔ فاتح کی جیت کو تو سب جانتے ہیں لیکن جو شکست کھا کر بھی فاتح کی فہرست میں اپنا نام درج کرالیتا ہے اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں صرف اہلِ بصیرت کا گروہ!

۱۵؍اپریل ۱۹۹۵ء کو مولانا سب کو داغِ مفارقت دے کر چلے گئے لیکن ہم ان کی رحلت کو اوروں کی طرح چلے جانے میں شمار نہیں کرتے۔ صاحبِ کردار کبھی بھی اوروں کی طرح نہیں چلے جاتے، بالخصوص جبکہ ان کے زندہ کارنامے بھی ہوں۔ میں مولاناؒ کی بزرگی، تقویٰ اور مقام ارشاد کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ "کارناموں" کی بات کر رہا ہوں، خاص طور سے فکری علمی کارناموں کی۔ ایسے لوگ ظاہر ہے کہ زندگی میں بھی ہمارے آپ کے ساتھ رہتے ہیں اور جا کر بھی نہیں جاتے ہیں جبکہ بے کردار لوگ جن کا کوئی کارنامہ نہیں ہوتا وہ ہم میں رہتے ہوئے بھی نہیں رہتے ہیں اور جا کر رہنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مولانا علیہ الرحمہ نے ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے بام و در اور اس کی عمارتوں کے گارے میں اپنے دل و دماغ کا جو قیمتی لہو لگایا ہے وہ دارالعلوم کے وجود کا لاینفک حصہ بن گیا ہے جس پر وقت کی بھیانک سے بھیانک آندھی بھی کوئی گرد و غبار نہیں ڈال سکتی بلکہ وقت کے ساتھ اس کی سرخی میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے صاحبِ کارنامہ لوگ جا نے کے بعد اور زیادہ شدت کے ساتھ یاد آنے لگتے ہیں "اور طرح" کے لوگ تو بھول جانے کے لیے جاتے ہیں لیکن وحیدِ عصر شدت سے یاد آنے کے لیے گئے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا

ہوں کہ وہ گئے بھی اور نہیں بھی۔ گویا کہ یاد کے ساتھ ! ان کا جانا رہنا برابر ہے، اس کے برعکس فراموشی کے ساتھ کچھ لوگوں کا رہنا جانا برابر ہوتا ہے۔

دیوبند میں کیے گئے ان کے خطابات دل و دماغ کے آسمان پر ابتک سنہری لکیر کی شکل میں جگمگ کر رہے ہیں اور رہ رہ کر ان کی فعال و متحرک شخصیت دل کی دنیا میں ہلچل مچاتی ہوئی دماغ کے اسکرین پر ابھر آتی ہے۔ طلباء کے ساتھ وہ جس مشفقانہ اور کریمانہ انداز میں پیش آتے تھے اسے الفاظ میں قید و بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کا تعلق بیان کرنے سے کم اور دیکھنے اور محسوس کرنے سے زیادہ ہے۔ جس کا واسطہ، سابقہ مولانا رحمہ سے کبھی بھی پڑ گیا اس کے لیے انھیں بھول جانا ناممکن ہے۔ یہ شریف لوگوں کے تعلق سے کہہ رہا ہوں ورنہ جہاں تک بے ضمیر، کم ظرف اور غیر شریف لوگوں کی بات ہے تو وہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کیا خود کو بھی بھول جاتے ہیں، باپ دادا کو بھولنا تو اور آسان ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وحید عصر میں خدائے قدیر نے تعلیم و تربیت کی ایسی صلاحیت رکھ دی تھی کہ کوئی بیدار ذہن آدمی جب بھی ان کے پاس جاتا تھا کچھ نہ کچھ ضرور سیکھ کر آتا تھا۔ اگر کوئی فطرتاً ہی کورا ہو تو الگ بات ہے۔

اس بنیاد پر یہ کہنے میں ذرا مبالغہ نہیں کہ مولانا رحمہ نہ تو اوروں کی طرح تھے اور نہ "اوروں کی طرح" گئے۔ وہ کھرے تھے کھرے رہے اور کھرے گئے بھی، اس لئے وہ گئے بھی نہیں ہیں۔ وہ بات اور عمل دونوں کے دھنی تھے اس لیے اپنے کردار اور کارناموں کا دھن اپنے ساتھ نہیں لے گئے بلکہ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں اور جو اپنے پیچھے یادگار کارنامے چھوڑ جاتا ہے اسے آدمی اگر بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔ مولانا رحمہ کو بھی شریف چاہنے والے کبھی نہیں بھولیں گے بلکہ گذرتے دنوں کے ساتھ ان کی یادوں کا دائرہ مزید پھیلے گا اور جو کام وہ چھوڑ گئے ہیں ان کے نامور تلامذہ ان کی تکمیل کی سمت میں پیش رفت جاری رکھیں گے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندہ تصنیفات (نامور وارشد تلامذہ) کے ساتھ ان کی یادگار غیر زندہ تصنیفات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، دیگر تصنیفات اور ان کی عظیم ڈکشنری (ہنوز غیر مطبوعہ) سے قطع نظر صرف القاموس الجدید، و القاموس الاصطلاحی (اردو عربی، عربی اردو) نے ان کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اگر وحید عصر اور کوئی تصنیف نہ فرماتے تو یہی دونوں کتابیں انھیں رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کے لیے کافی تھیں۔ کون ایسا مدرسہ، عربی کا طالب علم یا لائبریری ہے جو مذکورہ لغات سے خالی ہو۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی زندگی کی متعدد تصنیفات میں سے ایک تصنیف "آخرت کا سفرنامہ"

(بقیہ ص ۱۶۳ پر)

اشرف عثمانی دیوبندی

روشن عہد کا نقیب

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے یہ سچ ہے کہ ہر طویل تحریک اپنے محرک کے ساتھ ادوار میں بٹی ہوتی ہے۔ تحریک دارالعلوم دیوبند کا ایک دور اس کے بانی کا دور ہے، دوسرا دور مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا دور ہے تیسرا دور مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ انور شاہ کشمیری کا ہے، چوتھا دور قاری محمد طیب کا دور تھا اور موجودہ دور مولانا مرغوب الرحمٰن کا دور ہے، ان مختلف ادوار میں متفرق رنگ نظر آتے ہیں، لیکن ایک رنگ جس کو قدامت پسندی کہا جاتا ہے ہر دور میں یکساں طور پر گہرا دکھائی دیتا ہے، اس کو ہر دور کی قدر مشترک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مولانا وحید الزماں کیرانوی کا زمانہ ان سب سے جدا دکھتا ہے جس میں ہر نوخیز ذہن سے اٹھنے والے سوالوں کا جواب بھی ہے اور اسلاف کی سنہری اقدار کے لئے محفوظ حصار بھی۔ اس دور میں نئے زاویوں سے شخصیت تراشی بھی ہے اور عصری تقاضوں کے لحاظ سے ذہن سازی بھی۔

مدارس عربیہ سے وابستہ دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ مولانا وحید الزماں کیرانوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے دارالعلوم تحریک میں جدید عربی زبان وادب کی داغ بیل ڈالی اور اس کو پروان چڑھایا یہ بات کہنے کی نہیں مگر کہنی پڑتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا وحید الزماں کیرانوی کے آنے سے قبل یہاں کے فارغین اپنے زمانہ میں رائج عربی زبان نہ لکھ سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، ان اداروں کے فارغین کے مقابلے جن میں عربی زبان وادب پر بھی توجہ دی جاتی ہے دارالعلوم کے طلباء احساس کمتری میں مبتلا رہتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں بحیثیت استاد مولانا وحید الزماں کا دارالعلوم میں تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت سے عربی زبان وادب کے میدان میں ایک نیا انقلاب آیا۔ انتہا یہ ہوئی کہ وہی ہنسی اڑانے والے جدید ادارے مولانا وحید الزماں کی عربی تصانیف (القاموس الجدید عربی اردو اور اردو عربی، القراۃ الواضحہ اور نفحۃ الادب) کے محتاج ہوگئے۔ مولانا کی مرتب کردہ ڈکشنری القاموس الجدید کے بارے میں یہ بات وثوق

سے رکھی جا سکتی ہے کہ ہر عربی زبان پڑھنے پڑھانے والے کی مطالعہ کی میز پر رکھی نظر آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کیرانوی ایک عہد تھے، ایک دور تھے، ایک زمانہ تھے، مولانا اپنی تمام عمر جہالت کی تاریکیوں سے جنگ کرتے رہے، اس کے لئے انھوں نے قدم قدم پر علم کے چراغ روشن کیے۔ نیکی و شرافت، حق شناسی اور حق گوئی ان کی سرشت کا حصہ تھیں۔ ہر زمانہ میں بے باک حق گوئی کا انعام زہر کا پیالہ رہا ہے، یہی منصور کا مقدر رہا لیکن منصور نے اس کی تلخی اور زہرناکی کا مزہ ایک مرتبہ چکھا، مولانا کیرانوی زندگی کے ہر موڑ پر اس کی تلخی برداشت کرتے رہے۔

اس موجودہ دنیا میں ہر انسان کو اپنی شرافت اور حق گوئی کا خراج ادا کرنا ہوتا ہے، مولانا کیرانوی بھی زندگی بھر یہ خراج ادا کرتے رہے، لیکن مولانا زندگی کے ایک گہرے موڑ پر اپنے ظاہری رفیقوں کی ریشہ دوانیوں اور بے اعتنائیوں سے ہار گئے تھے، چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اس ظالم دنیا اور سفاک دوستوں سے کنارہ کشی کی خاطر دو گز زمین کے گوشہ میں حشر تک کے لئے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ یہ خاموشی بارگاہِ ایزدی میں طلب انصاف کے لئے ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اس وقت بہت سے دوست نما دشمن، اپنی عاقبت کے لئے ان سے شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں گے۔

قلم کچھ اور لکھنا چاہتا تھا
مگر کاغذ کہ بھیگا جا رہا ہے

بقیہ : میرے خسرِ محترم ....

صاحبزادے نے افسردگی کی حالت میں آکر بتایا کہ فلاں صاحب نے آج درس میں آپ سے متعلق بہت ہی نامناسب تقریر کی اور کل سے ان کے درس میں میں نہیں جاؤں گا۔ مولانا نے سن کر بیٹے کو سمجھایا کہ وہ تمہارے استاذ ہیں، تم پر ان کا ادب واحترام اور پابندی درس لازم ہے۔ ہاں اس موقع پر اتنا ضرور کہا کہ فلاں صاحب تو اپنے ہی تھے، ان سے میری کوئی خلش نہیں تھی، ان کو کیا ہو گیا، کاش وہ اپنا قیمتی وقت کسی مفید اور علمی کام میں لگاتے۔ مولانا کا رویہ یہ رہا کہ جن حضرات کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گھر پر آکر یا کسی کے ذریعہ معافی کے خواستگار ہوئے تو سینہ سے لگا لیا اور مرض الموت میں تو اعلان عام کر دیا کہ میری ذاتی کسی سے رنجش نہیں تھی۔ میں نے یک طرفہ طور پر سب کو اللہ کے لئے معاف کیا، اب وہ جانیں اور ان کا ضمیر، اگر مزاج پرسی کے لئے آئیں تو رد کنا مت۔

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کیرانوی نمبر

مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی

زندگی کا آخری دور

حضرۃ الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ گھر کی دنیا سے باہر سب سے بڑے کرم فرما اور محسن تھے۔ شرفِ نیاز اگرچہ ۱۴۰۴ھ سے حاصل تھا جبکہ میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا، مگر باضابطہ وابستگی اور باقاعدہ استفادہ کا موقع ۱۴۰۹ھ سے حاصل ہوا جبکہ میں اپنے گرد و پیش کے حالات سے انتہائی پریشان خاطر اور اپنے کچھ کرم فرماؤں کے جور و ستم سے بہت زیادہ دل برداشتہ تھا۔ قسمت نے یاوری کی کہ میں نے اپنے تمام حالات حضرت کو لکھے اور اپنے لیے مشورہ طلب کیا، جس کا نتیجہ حضرت الاستاذ سے وابستگی اور دارالمؤلفین دیوبند میں مستقل قیام پر مرتب ہوا یہ آپ کے آخری دور کی بات ہے۔

حضرۃ الاستاذؒ کی زندگی کے مختلف ادوار ہیں۔ ایک طالب علمی کا دور، دوسرا دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد تدریس سے پہلے تک کا دس سالہ عبوری دور جو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے ساتھ پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے قیام، مختلف کتابوں کی تصنیف، عربی میں ترجمے، دیوبند میں دارالفکر کی تاسیس اور ماہنامہ "القاسم" کے اجراء وغیرہ جیسی سرگرمیوں کو محیط ہے۔ تیسرا دور دارالعلوم دیوبند میں تدریس سے شروع ہوتا ہے جسے مردم سازی اور رجال کار کی تربیت کے لحاظ سے آپ کی زندگی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ چوتھا دور دارالعلوم دیوبند کے انقلاب، اس کے پس منظر اور پیش منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ پانچواں دور آپ کی زندگی کا آخری دور ہے جو دارالمؤلفین کے قیام، دارالعلوم دیوبند سے جبری سبکدوشی اور اس کے بعد کے حالات پر مشتمل ہے اس دور کا بیشتر حصہ میری چشم و گوش کی رفاقت داشتی کا ہے۔ اسی سے متعلق میں نے کچھ یادیں اور باتیں قلمبند کی ہیں

حضرۃ الاستاذ کا آخری دور

شوال المکرم ۱۴۰۹ھ کی بات ہے جب میں حضرت سے وابستہ ہوا اس وقت آپ کی عمر کا کارواں اپنی

استاذ جامعۃ القرآن الکریم بجنور

منزل کے ۵۹ مراحل طے کر چکا تھا۔ ادھر ذیابیطس کے باعث آپ کی صحت و طبیعت خاصی متاثر ہو گئی تھی اور ان سب سے بڑھ کر تکلیف دہ اور جاں گسل دار العلوم دیو بند میں آپ کے تعلق سے پیش آنے والی صورت حال تھی۔ اس وقت اپنی مادرِ علمی دار العلوم دیو بند کے مفاد اور اس کے تئیں اپنے بے پایاں اخلاص کے پیش نظر آپ نے اس کے انتظام و انصرام سے خاموشی کے ساتھ علیحدگی گوارا کر لی تھی، اندرونِ دار العلوم آپ کی علمی و تدریسی سرگرمیوں کو طلبہ تکمیل ادب کے ایک گھنٹے اور تخصص فی الادب العربی کے دو طالب علموں کی رہنمائی تک محدود کیے جانے پر بھی صبر کر لیا تھا۔ اگرچہ ان سب باتوں کا آپ کی حد درجہ حساس طبیعت پر غیر معمولی اثر تھا مگر اس کے باوجود آپ کے شب و روز کی دنیا گوناگوں سرگرمیوں سے معمور تھی جن میں تصنیف و تالیف، دار المؤلفین کا انتظام نیز متعدد مدارسِ اسلامیہ کی سرپرستی اور کئی ایک ملی تنظیموں کی قیادت شامل ہے، بڑے بڑے حوادث یا بیماری کے پے بہ پے حملے آپ کی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے، اور جب کبھی علالت کے سبب آپ کو بستر پر معمول سے زیادہ لیٹنا پڑتا اور آپ کے یومیہ معمولات متاثر ہوتے بالخصوص اس دور میں زیر تالیف اور آپ کی سب سے شاہکار تصنیف "القاموس الوحید" پر کام نہ ہو پاتا تو یہ بات آپ کے لیے سوہانِ روح بن جاتی اور بیماری کے شکوہ کے بجائے تصنیفی کام نہ ہونے پر تاسف کا اظہار فرمانے لگتے۔ اس دور میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تکمیل ادب کے طلبہ کا ایک گھنٹہ آپ کے پاس تھا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ دفتر تعلیمات نے تکمیل ادب کی کوئی کتاب آپ سے متعلق نہیں کی تھی۔ انتظامیہ کے اس درجہ نظر انداز کرنے پر آپ کو افسوس تھا جس کی طرف ایک دو بار سرسری اشارہ فرمایا۔

حضرۃ الاستاذ اپنے اس متعلقہ گھنٹے کی حد درجہ پابندی فرماتے تھے۔ کسی بھی عذر یا بیماری سے یہ گھنٹہ متاثر نہ ہوتا تھا۔ اس دوران جو ضروری اور مختصر مدتی اسفار پیش آئے۔ آپ نے ان کی تلافی اضافی وقت سے فرمائی۔ کئی ہفتوں تک عشاء کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی سلسلہ کا ایک روز کا واقعہ ہے کہ آپ کی طبیعت خاصی خراب تھی، میں حسب معمول گھنٹے کے وقت سے دس منٹ قبل درسگاہ چلنے کے لئے حضرت الاستاذ کی خدمت میں پہونچا۔ فرمایا "آج درسگاہ تک جانے کی میری ہمت نہیں ہے۔ آپ جائیے اور طلبہ سے کہیے کہ وہ درسگاہ میں بیٹھ کر مطالعہ کریں"۔ میں حسب الحکم درسگاہ پہونچا اور طلبہ کو حضرت کے حکم سے مطلع کیا، طلبہ درس گاہ میں بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ شریک مطالعہ ہو گیا۔ میرے ایک مخلص ساتھی کہنے لگے کہ مجھے فلاں کتاب کی ضرورت ہے براہ کرم وہ عنایت کر دیں۔ میں نے ان سے کہا ٹھیک ہے، گھنٹے کے بعد دار المؤلفین چلیں گے۔ میں آپ کو مطلوبہ کتاب دے دوں گا لیکن انھوں نے اتنا اصرار کیا کہ میں اسی وقت اپنی قیام گاہ دار المؤلفین آنے پر راضی ہو گیا۔ ادھر حضرت الاستاذ کی طبیعت اپنے عذر کے

باوجود اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ سبق کا ناغہ ہو چنانچہ آپ اس بیماری اور نقاہت کے عالم میں بھی درسگاہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ درس کی پابندی اور اس کا خصوصی اہتمام آپ کے اصول اور مزاج کا ایک حصہ تھا اور کسی مجبوری کی وجہ سے درس کا متاثر ہونا آپ پر بہت گراں گزرتا تھا۔

حضرۃ الاستاذ کے درسگاہ پہونچنے سے قبل دوسرے راستہ سے ہم لوگ درسگاہ پہونچ گئے، مسندِ درس پہ بیٹھتے ہی سرزنش شروع ہو گئی، مخاطب میں بھی تھا، خاموش بیٹھ کر سنتا رہا پھر ساتھ چل کر کمرہ پر حاضر ہوا، وہاں بھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ فرمایا کہ دارالعلوم میں میرا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ اگر کسی عذر کی وجہ سے میں گھنٹہ میں نہ جا سکا تو طلبۂ تکمیلِ ادب حسبِ معمول آتے اور باقاعدہ مطالعہ کر کے واپس جاتے، وہ میری طرف سے اس کے پابند تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دورانِ گفتگو مجھ سے تلفظ کی کوئی غلطی ہو جاتی تو اسی برافروختگی کی حالت میں اصلاح بھی کرتے جاتے۔ میں نے اسی دوران کسی بات کے جواب میں کہا "نہیں جی" حضرۃ الاستاذ نے اصلاح کرتے ہوئے فرمایا "جی نہیں" یا "نہیں"۔ بہرحال معافی کے بعد فوراً حضرۃ الاستاذ اپنی عادت کے مطابق مجھ پہ پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہو گئے۔ اس کے بعد شاید اس کا موقع نہیں آیا کہ مجھ سے خلاف ورزی کی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔

ایک سازش

اسی سال ماہ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ میں تبلیغی جماعت سے وابستہ کچھ طلبۂ دارالعلوم نے اپنے ہفتہ واری تبلیغی جلسہ میں شرکت کی آپ کو دعوت دی اور تقریر کی درخواست کی۔ اولاً حضرۃ الاستاذ نے انکار فرمایا مگر ان کے پیہم اصرار کے باعث قبول فرمالیا۔ سوئے اتفاق کہ میں ایک ضروری امر کے پیش آجانے کے باعث حضرت کی تقریر سے مستفید نہ ہو سکا تاہم دیوبند آکر جو تقریر کے مشمولات تھے اور طلبہ کی گرویدگی کا جو عالم سننے میں آیا وہ میرے لیے خلافِ توقع نہ تھا اس لیے کہ طلبہ میں آپ کی مقبولیت مسلّم ہی نہیں بلکہ ضرب المثل تھی اور ان کی شیفتگی اور محبت کے نظارے موقع بموقع نظر نواز ہوتے رہتے۔ تقریر میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ بھی آپ کی روزمرہ کی بات تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ کسی پلان کے تحت آپ نے یہ خطاب فرمایا ہو۔

اس کے دو چار روز بعد عشاء کا وقت تھا کہ تکمیلِ ادب کے طلبہ دارالمؤلفین آئے، کہنے لگے کہ آج ڈاکخانہ پر حضرت مولانا کی تقریر کا پروگرام ہے۔ میں نے فوراً اس کی تردید کی اور کہا اگر ایسا ہوتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا اور ابھی کچھ دیر قبل میں حضرت کے پاس سے آیا ہوں۔ خیر انھوں نے اصرار کیا کہ چلو چل کر حضرت والا سے خود معلوم کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کے کمرہ کے باہر طلبہ کا

ہجوم ہے اور آپ اُن سے مخاطب ہیں۔ جیسے ہی آپ کی نظر مجھ پر پڑی فرمایا " مولوی عبدالقدوس! ذرا دارالعلوم جایئے اور دیکھیے کہ کیا معاملہ ہے"۔ چنانچہ میں دارالعلوم گیا، جگہ جگہ طلبہ کی ٹولیاں محوِ گفتگو نظر آئیں، دارالقرآن جا کر میں اپنے ایک ساتھی سے اسی سلسلہ میں کچھ باتیں کرنے لگا۔ وہیں کسی نے بتایا کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب صدر گیٹ پر تقریر فرما رہے ہیں۔ میں جلدی سے دوڑ کر آیا تو آپ کو یہ کہتے سنا "عزیز طلبہ! میری تقریر کا کوئی پروگرام نہیں ہے یہ میرے خلاف ایک سازش ہے"۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران ایک استاد کا حوالہ دے کر جنہوں نے دورانِ درس آپ کے متعلق ناگفتہ بہ باتیں کہی تھیں۔ ان کے اس نامناسب طرزِ عمل کی مذمت فرمائی۔ مذکورہ استاذ کی تقریر کا واقعہ انہی چند دِنوں کے دوران پیش آیا تھا۔ جس روز یہ واقعہ پیش آیا فوری طور پر میرے علم میں آگیا تھا مگر میں نے حضرت سے کچھ ذکر نہیں کیا۔ جب کسی ذریعہ سے حضرت الاستاذ کے علم میں یہ واقعہ آیا تو آپ نے مجھے بُلا بھیجا۔ میں نے اس روز جو حضرت کا درد و کرب دیکھا وہ معرضِ تحریر میں نہیں لا سکتا۔ شاید یہ غایت تاثر اس وجہ سے بھی تھا کہ ؎

مَن از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با مَن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

آپ نے صدر گیٹ کی تقریر میں اس واقعہ کی مذمت فرمائی۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ گھر تشریف لے گئے اُدھر دارالعلوم دیوبند میں اس کے ردِ عمل میں تقریر ہوئی اور اس میں بہت سی خلافِ واقعہ باتیں کہی گئیں جن کو سن کر حضرت الاستاذ کو مزید دُکھ پہونچا پھر مزید یہ کہ صدر گیٹ کی تقریر کی تشہیر اس عنوان سے کی گئی کہ مولانا وحید الزماں صاحب نے جامع مسجد کے لوگوں کو لے کر دارالعلوم دیوبند پر چڑھائی کی ہے۔ اس طرح کی باتیں حضرت الاستاذ کے دل و دماغ کو چھلنی کرتی رہیں اور پھر آخر سال میں رمضان المبارک سنہ ھ کی ۱۴ تاریخ کو وہ وقت بھی آیا جس میں آپ کی سبکدوشی کا فیصلہ بڑی شطارت کے ساتھ آپ کو لا کر پیش کر دیا گیا، دارالعلوم سے علیحدگی آپ کے لیے معمولی بات نہ تھی، وہ دارالعلوم جس کے در و دیوار بلکہ ذرہ ذرہ سے آپ کو بے پناہ محبت تھی جو آپ کی علمی و تصنیفی، تدریسی و تربیتی نیز افراد سازی و مردم آفرینی کی سرگرمیوں کی سب سے بڑی جولان گاہ رہ چکی تھی، جس کی خاطر آپ نے اپنے آپ کو تج دیا تھا اور جس کی نشاۃ ثانیہ آپ ہی کی رہینِ منت تھی۔ آپ پہ کیا گزری ہوگی بس خدا ہی جانتا ہے۔ دوپہر کو یہ لفافہ پہنچا تھا اور میری ملاقات شام کو ہو سکی اگرچہ آپ بظاہر حسبِ معمول نظر آرہے تھے مگر آپ کے مزاج شناس کے لیے آپ کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

افراد سازی کا فن

رمضان المبارک کے بعد ایک غیر معمولی حادثہ کی وجہ سے کافی دِنوں تک حضرت کی خدمت میں حاضری نہ ہو سکی محرم میں جب میں حضرۃ الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ میں کیا کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ دارالمؤلفین میں رہو۔ چنانچہ میں نے پھر دارالمؤلفین میں ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا لیکن مجھے اس ادارہ میں مستقل طور پر اپنا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آرہا تھا، تین چار روز بعد حضرۃ الاستاذ دہلی تشریف لے گئے، وہاں سے مجھے عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن شیخ محمد علی صابونی کی عربی تفسیر "قبس من نور القرآن الکریم" کی دو جلدیں لاکر دیں اور فرمایا "آپ کو ان دونوں جلدوں کا ترجمہ کرنا ہے" میں دِل دِل میں پریشان ہوا، سوچتا رہا کہ ترجمہ کا کام تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ میں نے اس سے قبل اردو یا عربی میں سے کسی ایک زبان میں بھی مضمون نویسی یا ترجمے کا کام نہیں کیا تھا۔ حضرت نے فرمایا "جائیے اور کہیں سے بھی کم ازکم ایک صفحہ کا ترجمہ کرکے مجھے سنائیے"۔ میں خوف و مسرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ اپنے کمرہ آیا، دو تین دِن کے بعد ایک آسان سے تاریخی واقعہ کا ترجمہ کرکے حاضر خدمت ہوا سنکر مسرور ہوئے، شاباشی دی اور اتنی ہمت افزائی فرمائی کہ مجھے لگا کہ میں چند مہینوں میں یہ کام مکمل کردوں گا۔ مگر جب میں نے عملاً ترجمے کا کام شروع کیا تو بہت ساری مشکلات پیش آئیں اور کئی دِن تک پوری کوشش اور پیہم جدّوجہد کے بعد بھی ایک صفحہ کا ترجمہ نہ کرسکا۔ ترجمہ کرتا پھر اس کو پڑھتا، پڑھنے کے بعد اطمینان خاطر نہ ہونے کے باعث کاغذ کو پھاڑ دیتا! ادھر حضرت والا کی طرف سے برابر عزم و ہمت کو مہمیز کیا جارہا تھا۔ ترجمے کے طریقے اور اس کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالی جارہی تھی، دوسرے حضرت والا کے سامنے پست ہمتی کا اظہار ایک طرح کا جرم تھا اس لیے خواہی نہ خواہی میں نے اللہ کا نام لےکر ترجمے کا کام شروع کردیا۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوئی اور ظاہری اسباب میں حضرت کی رہنمائی و ذہن سازی۔ آخری سال تک پہلی جلد کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا جو "تجلیاتِ قرآن" کے نام سے طبع بھی ہوگئی ہے۔

مدرسہ کولہارپور کی سرپرستی

ادھر چونکہ دارالعلوم سے حضرت الاستاذ کی علیحدگی عمل میں آچکی تھی اب آپ کا اکثر وقت تصنیف و تالیف میں ہی گزرتا، مختلف اسلامی مدارس میں اُن کے ذمہ داروں کی دعوت پر تشریف بھی لے جاتے اور بہت سے مدارس والے اصرار کرتے کہ آپ ہمارے یہاں مستقل قیام فرمالیں مگر آپ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مدرسہ چندگڑھ ضلع کولہاپور مہاراشٹر کے ذمہ داروں نے اتنا اصرار کیا کہ حضرت الاستاذ نے عملاً سرپرستی کا فیصلہ فرمالیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں نہ مستقل قیام کرسکتا ہوں اور نہ سال کے بیشتر ایام وہاں گزار سکتا ہوں؛ جب میری طبیعت چاہے گی مدرسہ پہونچ جاؤں گا۔ انھوں نے ہر طرح منظور کرلیا مگر اس سال حضرتؒ حکومت سعودیہ کی دعوت پر حج کو تشریف لے گئے پھر قطر وغیرہ چلے گئے۔ ادھر حضرۃ الاستاذ کے ایماء پر جو طلبہ و اساتذہ چندگڑھ گئے تھے وہ آب وہوا کی ناموافقت اور کچھ ذمہ داروں سے شکایت پیدا ہونے کے باعث وہاں نہ جم سکے اور حضرت والا سے اجازت لے کر وہاں سے آگئے۔ حضرت الاستاذ نے بھی اپنی سرپرستی ختم فرمادی۔ میں خود بھی چندگڑھ جانے والوں میں تھا۔ وہاں سے آکر میں نے دارالمؤلفین میں قیام کیا اور ”قبس من نور القرآن الکریم“ کی جلد ثانی کا ترجمہ مکمل کیا۔ اس کے بعد حضرت الاستاذ کے مشورہ سے جامعۃ القرآن الکریم بجنور میں تدریسی خدمت انجام دینے لگا۔

دارالمؤلفین دیوبند سے بھی عملاً رابطہ رہا، گاہے گاہے حضرت والا کی بھی جامعہ ہذا میں تشریف آوری ہوئی اور میری اکثر چھٹیاں حضرت الاستاذ کی خدمت میں گزرتی رہیں۔ اس دوران آپ نے القاموس الوحید کو مکمل فرمایا۔ معارف القرآن کے مضامین تقریباً تین جلدوں میں مرتب فرماکر اس کی پہلی جلد شائع فرمائی، نفحۃ الادب کی شرح تصنیف فرمائی۔ قرآن کریم کے ایک پارہ کا ترجمہ فرمایا۔ ترجمہ کے متعلق ایک روز مجھ سے فرمایا کہ میں اسے طبع کرکے صائب الرائے اہلِ علم کی خدمت میں مشورہ اور رائے طلبی کے طور پر بھیجنا چاہتا ہوں اس کے بعد اس سلسلہ کو آگے بڑھاؤں گا۔ آپ نے ترجمۂ قرآن میں اس بات کا اہتمام فرمایا تھا کہ اردو کے معتبر تراجم خاص کر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کو سامنے رکھ کر ایک ایسا ترجمہ کیا جائے جس کی روح میں تو کوئی تغیر اور فرق نہ آئے البتہ زمانے کی ضرورت اور اردو زبان کی نئی تبدیلیوں کے پیشِ نظر اس کو مزید سلیس اور شگفتہ زبان کے قالب میں ڈھال دیا جائے، جہاں الفاظ کی تقدیم وتاخیر سے کام چل جائے وہاں بس اسی پر اکتفا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آپ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کی مثال پیش فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ان کے ترجمے کی تسہیل اپنے زمانے کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق فرمائی تھی۔ آخر میں آپ نے مدارسِ اسلامیہ کے عربی نصاب کے لیے احادیث نبوی کا مجموعہ ”نخبۃ الاحادیث“ کے نام سے مرتب کرنا شروع کیا جس میں ہر حدیث کے ساتھ ایک مختصر سا تشریحی نوٹ عربی زبان میں ہی تحریر فرمایا۔ غالباً ابھی نصف کام مکمل ہوچکا تھا۔

رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ میں حضرت الاستاد کی دو مرتبہ زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک ۲ر رمضان کو جس کے دوران فرمایا کہ میں رمضان بعد حضرت مولانا قاری صدیق صاحب مدظلہٗ کے یہاں بلانا چاہتا ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ اگر مناسب ہو تو میں خادم سفر کی حیثیت سے چلنے کو تیار ہوں۔ حضرت نے فرمایا "اگر ایسا ہے تو میں پروگرام بنا ہی لوں گا" مگر آہ! کسے خبر تھی کہ رمضان المبارک کے بعد حضرت قاری صاحب مدظلہ کے یہاں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں باریاب ہونا ہے تاہم واصل بحق ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ خواہش بھی پوری فرمادی اور مرض الوفات میں خود حضرت قاری صاحب مدظلہ عیادت کے لیے آپ کے پاس تشریف لے آئے۔

میری آخری ملاقات ۲۸ رمضان ۱۴۱۵ھ کو ہوئی، اس وقت ضروری بات کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہ ہوسکی، رمضان بعد متصلاً آپ برائے علاج دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی شفایابی کے لیے ہر ممکن تدبیر کی گئی مگر تمام کوششوں کے باوجود انسانی تدبیر پر اللہ کی تقدیر غالب آئی اور شاخ طوبیٰ کا یہ بلبل خوشنوا ہمیشہ کے لیے باغ جنت کے لیے اڑ گیا۔

اوصاف و کمالات کی ایک جھلک

بلاشبہ حضرت الاستاذؒ کی شخصیت بڑی ہمہ گیر، عہد آفریں اور انقلاب انگیز تھی۔ آپ گوناگوں خوبیوں، ہمہ جہت صلاحیتوں اور منفرد افکار و خیالات کے مالک تھے۔ آپ نے عملی طور پر جس میدان میں بھی قدم رکھا اور آپ کے عقابِ دانش نے جن علوم و فنون کو اپنا آشیانہ بنایا اس میں کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ ناساعد حالات اور ناسازگار ماحول میں آپ نے اپنے علمی، ادبی، تصنیفی، تربیتی، ملی اور انتظامی سرگرمیوں کے کارواں کو بڑی کامیابی کے ساتھ اس طرح پیہم رواں دواں رکھا کہ نہ حالات و مصائب سے گھبرائے، نہ عزم و ہمت نے ساتھ چھوڑا، نہ راحت پسندی اور آرام طلبی کے خیال نے انگڑائی لی، نہ بیماریاں اور حوادث رکاوٹ کھڑی کرسکے۔ آپ کی شخصیت بحیثیت عالم دین، مدرس، مصنف، مربی، مقرر، لغت نگار، انشاء پرداز، خوش نویس، مفکر و منتظم تمام معاصرین میں مسلّم تھی اور اس کا اعتراف دوست و دشمن سبھی کو تھا لیکن اس سے بڑھ کر آپ کی شان عبقریت یہ تھی کہ ان سب اوصاف اور صلاحیتوں کو بڑی چابکدستی سے اور بڑے آسان اور منفرد انداز میں دوسروں تک منتقل فرما دیتے۔ آپ سے وابستہ لوگوں کا تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہوتا کہ ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہے تھے کسی کی نگاہ میں

دار العلوم دیوبند میں جب آپ نے عربی زبان وادب کے میدان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا اور چند سال ہی میں اس کے غیر معمولی اور حیرت انگیز نتائج سامنے آئے تو حضرت مولانا فخر الدین رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے آپؒ سے فرمایا تھا کہ فضلاء دار العلوم دیوبند کے دامن پر جو عربی

زبان وادب سے ناواقف ہونے کا دھبا تھا وہ آپ نے اپنی محنت و صلاحیت سے دھو دیا۔ ذاتی طور پر تصنیف و تالیف کے علاوہ "مصنف گری" کا جو ملکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عنایت فرمایا تھا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا، درجنوں ایسے موضوعات آپ کے قرطاسِ ذہن پر مرقوم تھے جن پر تدریجاً کام ہونا تھا لیکن صد افسوس! وہ تشنہ قلم رہے۔ وابستگان میں سے اگر کوئی شخص ان میں سے کسی موضوع کا انتخاب کرتا تو اس کا ایک سہل اور مفید ترین نقشہ بنا دیتے جو بہترین رہنمائی کا کام دیتا۔ ایک روز مجلس میں اخلاقیات پر چھوٹے چھوٹے پمفلٹ تیار کرنے کی بات چل نکلی۔ اتنے میں کچھ طلبہ ملاقات کے لیے آگئے، ان میں کوئی "ہدایہ" کا بھی طالب علم تھا مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہدایہ کی کتاب البیوع سے بھی اخلاقیات پر ایک کتابچہ مرتب ہو سکتا ہے، مثلاً آپ باب الاحتکار کو لے لیجیے اس کی ممانعت کے سلسلہ میں جو کچھ احادیث میں وارد ہوا ہے یا فقہاء نے جو اس پر روشنی ڈالی ہے اس میں جہاں شرعی حکم کا بیان ہے اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقی درس بھی موجود ہے اور وہ ہے خود غرضی، مفاد پرستی اور اضرار سے ممانعت۔

تعلیمی نظریات

نصابِ تعلیم کے سلسلہ میں بھی اظہارِ خیال فرماتے۔ فرمایا کرتے کہ اسلامی مدارس میں فارسی زبان کو بحیثیت زبان پڑھانا معقول بات ہے لیکن عربی زبان کے لیے موقوف علیہ بنا دینا قرینِ عقل نہیں درس نظامی کے نصاب کے لیے نئی اور مفید کتابوں کو تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے جس میں نئی نسل کی کی ذہنی ساخت اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ فرماتے کہ تفسیر، حدیث، فقہ و اصول وغیرہ تو مسلمات میں سے ہیں ان میں جو تبدیلی ممکن ہے وہ طریقۂ تعلیم اور زیادہ سے زیادہ کتابوں کے انتخاب میں ہونی چاہیے البتہ دیگر علوم و فنون جن کی حیثیت مقاصد کی نہیں ان میں جو غیر ضروری فن ہے یا جس کی افادیت کم ہو گئی ہے اس کو نکال کر یا صرف حسبِ ضرورت باقی رکھ کر دیگر ضروری اور مفید فنون کو داخلِ نصاب کرنا چاہیے لیکن یہ بھی فرماتے کہ اصل مقصود نصاب نہیں بلکہ طلبہ میں صلاحیت و استعداد پیدا کرنا ہے اس کے لیے نصابِ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے بعد طریقۂ تعلیم میں بھی حتی المقدور اصلاح کی ضرورت ہے۔ آپ کے الفاظ میں "ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ استاذ رات بھر مطالعہ کے نام پر جو ہضم کرے مسندِ تدریس پر بیٹھ کر اس کی قے کر دے بلکہ سبق کے وسیع تر مطالعہ اور مکمل تشفی حاصل کرنے کے بعد طلبہ کی عقل و فہم کا لحاظ اور غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے درس دے"۔ کبھی کبھی اس کا شکوہ فرماتے کہ ہمارے یہاں درسِ حدیث میں کتاب کے آغاز میں یا اسی طرح فقہی یا کلامی مختلف فیہ

مسائل میں طول طویل تقریریں کی جاتی ہیں اور جہاں اخلاق و معاملات اور آداب زندگی کے متعلق احادیث آتی ہیں ان سے سرسری طور پر اساتذہ گزر جاتے ہیں یا وہاں تک پہونچنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ سال ختم ہو جاتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے عملاً اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ دین میں صرف عقائد و عبادات کی اہمیت ہے معاملات و اخلاقیات وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں حالانکہ اگر معاملات درست نہ ہوں تو عبادات بھی عنداللہ مقبول نہ ہوں۔ اتباع سلف یہ نہیں کہ مخصوص ماحول کے پیداوار قدیم معتقدات و خیالات کی تردید میں پورا زور صرف کریں اور جہمیہ معتزلہ اور خوارج جیسے قدیم اور بے نام و نشان فرقوں کی تردید نیز صفات باری تعالیٰ کے عین و غیر اور قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کے سلسلہ میں فلسفیانہ موشگافیاں زیر بحث لائیں بلکہ اکابر و اسلاف کا اتباع تو یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے اپنے دور کے باطل فرقوں کے افکار و نظریات کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے تار و پود بکھیر دیے اسی طرح ہم بھی دور حاضر کے باطل فرقوں اور اسلام مخالف تحریکوں کا جائزہ لے کر مدلل طریقے سے ان کا جواب دیں۔ اگر ہمارے اسلاف آج زندہ ہوتے تو دور حاضر کے پیچیدہ مسائل ان کی تقریر و تحریر اور سرگرمیوں کا محور ہوتے، وہ وقت کی ضرورتوں سے ہرگز آنکھ نہیں بند کر سکتے تھے۔

بے مثال مستعدی

حضرت الاستاذ کی زندگی ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے قارئین کے لیے تجربہ کار معلم کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ تادم آخر جبکہ پہلے کی سی شگفتگی تھی اور نہ رعنائی۔ اپنے اصول کار، آداب زندگی اور طور طریق سے دستبردار نہیں ہوئے۔ اس آخری دور میں بھی آپ کی چستی و پھرتی کا یہ حال تھا کہ نوجوانوں کے لیے بھی آپ کا ساتھ دینا مشکل تھا۔ اس سلسلہ کا اپنے ساتھ گذرا ہوا ایک واقعہ شاید میں کبھی نہ بھلا سکوں۔ ۱۴۰۹ھ میں جب میں حضرت الاستاد سے وابستہ ہوا تو اگلے ہی روز حضرت کے کمرہ کی صفائی اور کتابوں کی ترتیب کی سعادت مجھے میسر آئی۔ صبح ۹ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرے ساتھ اول سے آخر تک حضرت الاستاذ بھی مصروف عمل رہے۔ یہ آپ کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ کام بتا کر الگ نہیں ہو جاتے بلکہ سب کے ساتھ اور سب کاموں میں ہاتھ بٹاتے، رات کو جب خاصی دیر ہو گئی تو حضرت نے فرمایا کہ آرام کر لیجیے صبح انشاء اللہ بقیہ کام سے فارغ ہو جائیں گے۔ چنانچہ علی الصباح جب میں نماز سے فارغ ہو کر کام کی تکمیل کی غرض سے کمرہ پہونچا تو دیکھا کہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ صبح ۴ بجے تک میں نے کام مکمل کرا لیا تھا، میں دم بخود رہ گیا اور حد درجہ پشیماں بھی ہوا۔ حیرت کی

بات یہ تھی کہ صبح آپ پھر حسب معمول تازہ دم ہو کر کام کرنے لگے تھے۔

وفات سے چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے، جواہر المعارف طباعت کے لیے پریس میں جانے والی تھی، اس میں جو کاتب صاحب کام کر رہے تھے وہ بجنور کے رہنے والے تھے، ہنگامی طور پر کام کے لیے آپ نے ان کو دیوبند ہی بلا لیا تھا۔ انھوں نے بڑی عجلت کے ساتھ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔ آپ کو اس کا اندازہ نہ تھا، آخری روز کاتب صاحب نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ اصل کتاب کا کام ابھی رات میں مکمل ہو جائے گا اور مجھے چونکہ کل گھر جانا ضروری ہے اس لیے آپ شروع کے صفحات دیدیجیے، میں گھر جا کر ان کی کتابت کروں گا اور پھر آپ کے پاس بھجوا دوں گا۔ مولانا نے پوچھا کہ آپ کس وقت جائیں گے، کاتب صاحب نے کہا کہ مجھے صبح فجر کے فوراً بعد جانا ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ پھر آپ ان کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرہ واپس تشریف لے گئے، صبح ہوئی اور نماز کے فوراً بعد مطلوبہ صفحات لے آئے اور کاتب صاحب کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔ لیجیے، جناب! یہ صفحات پہلے سے تیار نہ تھے۔ صبح تک ہی انھیں مکمل کر پایا ہوں۔ یہ اس وقت بھی تیار کیے جا سکتے تھے مگر میں نے آپ کے پروگرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ تھی حضرت والا کی مستعدی، آخری عمر میں بھی جس میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ حد درجہ ضعف و کمزوری کے باوجود ہنگامی حالات میں آپ پوری پوری رات جاگ کر کام مکمل فرماتے۔ یہ آپ کے لیے آسان تھا مگر یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ کام کو ٹال دیں۔

ذکاوتِ احساس

مولانا کو ہرگز گوارا نہ تھا کہ ان کی وجہ سے کسی کا کوئی پروگرام متاثر ہو، ہر خورد و کلاں کی پوری رعایت آپ کے مزاج میں رچی بسی تھی، آپ کے یہاں معاملات و آدابِ حیات میں چھوٹے بڑے کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ آپ کے یہاں ملاقات اور مجلس میں جن آداب کی رعایت رکھنا ضروری تھا اس کے آپ بھی پورے پابند تھے۔ چنانچہ آپ دارالمولفین جب بھی تشریف لاتے جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا تو استیذان و سلام کے بعد ہی قدم رنجہ فرماتے اور اگر دورانِ مجلس کسی کی نگاہ گھڑی پر اُٹھ جاتی تو آپ کے لیے مجلس میں بیٹھے رہنا ممکن نہ تھا، کبھی کبھی مزاحًا فرماتے کہ بھئی الارم بج گیا، حالانکہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ ہوتی کہ حضرت والا تشریف لے جائیں مگر آپ کی حساس طبیعت کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کی وجہ سے کسی کو ادنیٰ سی بھی زحمت ہو۔

(بقیہ صفحہ ۲۹۸ پر)

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی نمبر

مولانا محمد رفعت قاسمی

میرے خسرِ محترم

مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ کو مبداِ فیاض سے گوناگوں صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں، اور ان کے آثار بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ مولانا کے برادر خورد چچا حمید الزماں مرحوم (جن کا انتقال مولانا کی وفات سے ٹھیک پانچ سال قبل اسی ماہ اور اسی تاریخ و دن یعنی ۱۵ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ بروز ہفتہ ہوا) بتلایا کرتے تھے کہ مولانا بچپن میں کبڈی، پتنگ بازی، گلی ڈنڈا اور اس طرح کے دوسرے کھیلوں میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی دل چسپی کا کھیل اگر کوئی تھا تو یہ تھا کہ کاغذ پر مکانات کے نقشے بناتے، قینچی سے خوبصورت مساجد اور تعمیرات کے فوٹو تراشتے اور اچھے اچھے ڈیزائن تیار کرتے۔ بچپن ہی میں مرحوم نے اپنے ہاتھ سے مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کو تراش تراش کر اینٹیں بنائیں اور ان سے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تیار کیا جو فنی اعتبار سے بڑا عمدہ اور خوبصورت تھا۔ مولانا کے والد مرحوم کے پاس علامہ شبیر احمد عثمانی رح کی آمد و رفت رہتی تھی، جب علامہ عثمانی رح نے مولانا کا بنایا ہوا کمرہ دیکھا تو بہت تعجب کیا کہ یہ کم سنی اور اتنی فنکاری!

بچپن میں مولانا مرحوم نے خواب دیکھا کہ میں جامع مسجد کے حوض میں وضو کر رہا ہوں اور حوض سے روئی کے گالے اُبل اُبل کر آسمان پر پھیل گئے۔ والدہ صاحبہ سے خواب بتایا، انھوں نے اپنے بھائی حافظ محمد عیسیٰ مرحوم کو بتایا کہ آپ کے بھانجے نے یہ خواب دیکھا ہے۔ انھوں نے تعبیر بتائی کہ اس بچہ کے علم سے ایک دنیا فیضیاب ہوگی۔ قابل ذکر ہے کہ حافظ عیسیٰ مرحوم ایک متقی بزرگ تھے جو بہ سلسلۂ ملازمت حیدرآباد دکن میں مقیم رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے آبائی وطن جھنجھانہ واپس آگئے۔ جھنجھانہ کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہاں ہر دور میں کچھ بزرگ رہے ہیں۔ آپ بھی اپنے دور

• مدرس دارالعلوم دیوبند

میں اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ زمانہ قیام حیدرآباد میں مولانا وحیدالزماں مرحوم کا قیام انہی کے ساتھ رہا۔

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم کچھ کیرانہ اور کچھ جھنجھانہ میں ہوئی۔ تکمیل حفظ کے بعد فارسی وعربی کتابیں چل رہی تھیں کہ مولانا کے دوسرے ماموں حافظ محمد واحد علی صاحب اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے وہاں علامہ المامون دمشقی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ نہایت ذکی وفہیم تھے۔ پہلی ہی نظر میں بھانپ گئے کہ یہ لڑکا اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ علامہ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان میں علماء کی کمی نہیں لیکن عربی زبان پر جیسی قدرت ہونی چاہیئے وہ بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہے، مولانا کو عربی زبان سکھانے پر خصوصی توجہ دی چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں مولانا کو عربی بولنے اور لکھنے پر خاصی قدرت حاصل ہوگئی۔ قیام حیدرآباد کے حالات مولانا نے اپنی نامکمل خودنوشت سوانح میں تفصیل سے لکھے ہیں۔

ایک عرصہ حیدرآباد رہ کر مولانا مرحوم اپنے وطن کیرانہ آگئے اور پھر کچھ عرصہ یہیں زیر تعلیم رہنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے جہاں تقریباً چار سال تعلیم حاصل کی۔ ذاتی شرافت وشائستگی اور عربی زبان دانی کی بدولت تمام اساتذہ کے دلوں میں اچھا مقام حاصل کرلیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا نے طلباء دارالعلوم کے اندر عربی کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس زمانہ میں جن طلباء نے آپ سے عربی زبان پڑھی ان میں مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا زبیر احمد دیوبندی، مولانا سید ارشد مدنی (حال اساتذہ حدیث دارالعلوم دیوبند) اور مولانا لقمان الحق بجنوری مرحوم سابق استاذ دارالعلوم قابل ذکر ہیں۔ پھر دارالعلوم میں باضابطہ مدرس ہونے کے بعد مولانا نے جس بڑے پیمانے پر عربی کا غلغلہ بلند کیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مولانا کی اپنے مشن میں کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ آج دارالعلوم میں کم از کم بیس اساتذہ ایسے ہیں جن کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں مولانا کے فیض صحبت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح وقف دارالعلوم دیوبند کے متعدد اساتذہ بھی ان کے خصوصی فیض یافتگان میں شامل ہیں۔ جو تلامذہ ہند وبیرون ہند کے مدارس اور دوسرے اداروں میں اہم عہدوں پر فائز ہیں ان کا تو شمار بھی مشکل ہے

مرحوم کے زمانہ طالب علمی میں مصر کے ایک مشہور عالم وادیب دیوبند تشریف لائے تو دسترخوان سے لے کر اسٹیج تک ترجمانی کے فرائض آپ ہی نے انجام دیئے۔ جب مصری مہمان کو معلوم ہوا کہ وحید الزماں دارالعلوم کے استاذ نہیں بلکہ ایک طالب علم ہیں تو بہت ہی متاثر ہوئے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

دارالعلوم سے فراغت کے بعد چند سال کیرانہ اور دہلی میں رہ کر مرحوم دیوبند تشریف لائے اور طلبار کو عربی اور انگریزی سکھانے کے لئے دارالفکر نامی ادارہ قائم کیا اور اس سے ایک اردو ماہنامہ القاسم بھی جاری کیا۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ مہتمم دارالعلوم نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی کتابوں پر کام کرنے کے لئے مولانا مرحوم کو دارالعلوم میں بلانا چاہا مگر بعض حضرات کی بے جا مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوسکی۔ آخر کار ایک دن وہ آیا کہ دارالعلوم کو مولانا کی خدمت کی ضرورت محسوس ہوئی اور حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی رح کی تحریک و تجویز پر دارالعلوم میں بحیثیت استاذ ان کا تقرر ہوگیا۔ فکر و نظر کی بلندی، خلوص و بے لوثی اور انتھک جدوجہد کی بدولت بہت جلد طلبار میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔

اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کی بوسیدہ اور مرمت طلب عمارتوں کی اصلاح و ترمیم اور تحسین و تزئین کے لئے مرحوم نے جس طوفانی انداز میں اپنی صحت کی پروا کئے بغیر جدوجہد کی اور اس کا جو خوشگوار اور حیرت انگیز نتیجہ سامنے آیا وہ محتاج بیان نہیں۔ کام میں خلوص کا یہ عالم تھا کہ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ دارالعلوم کی عمارتوں پر مختلف ناموں کے پتھر لگے ہوئے ہیں، آپ بھی پتھر نصب کرادیں تاکہ یادگار رہے۔ سن کر ناراضگی کے انداز میں فرمایا کہ میں نام کے لئے کام نہیں کر رہا ہوں۔

مولانا اپنے ملنے والوں سے نہایت بے تکلفی سے پیش آتے اور مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ اپنے خوردوں سے بھی تواضع اور منکسر المزاجی کے ساتھ پیش آتے حق گوئی و بے باکی انھیں اپنے والد محترم سے ملی تھی۔ جس بات کو حق سمجھتے اس کے برملا اظہار میں جھجک محسوس نہ کرتے۔ بحث و تمحیص کے عادی نہیں تھے لیکن اگر کوئی موقع آہی جاتا تو پھر کوئی ان کے معقول طرز استدلال اور منطقی و مربوط گفتگو کے سامنے جمتا دکھائی نہیں دیتا۔

زندگی کے طویل عرصے میں خدا جانے کتنے نشیب و فراز آئے، فتنوں کے سیلاب امنڈے عداوتوں کی آندھیاں چلیں، مخالفتوں اور مخاصمتوں کے بگولے اڑے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ سوائے عداوت و مخالفت کے اور کچھ نہ رہا۔ لیکن حلم و وقار کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلا، استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سب سنا اور بہت کچھ سنا، حریف دست بہ گریباں ہوئے، دوست پرائے ہوئے چھوٹوں نے بھی ان کی دستار فضیلت سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی، لیکن تلخ سے تلخ بات کا جواب بھی درشتی و تلخی سے نہیں دیا۔ نہ کوئی انتقامی کارروائی کی، نہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا۔ ایک مرتبہ تو منجھلے

(بقیہ صفحہ ۳۲۲ پر)

مولانا عبد الرشید بستوی

تاریخ ساز معلّم

راقم الحروف نے سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق سنہ ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے بعد اگلے تعلیمی سال میں تکمیلِ ادب عربی میں داخلہ لیا۔ حسبِ معمول شوال کے آخری ایام میں تعلیم کا آغاز ہوا، ذی قعدہ کی آخری تاریخوں میں دارالعلوم کے دفترِ تعلیمات کی طرف سے یہ اعلان آویزاں کیا گیا کہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب تکمیلِ ادب عربی کے طلبہ کو "تمرین عربی" کے عنوان سے درس دیں گے۔

دارالعلوم کے نئے انتظامیہ کے تحت دوبارہ کھلنے کے بعد حضرت مولاناؒ طویل عرصہ تک مختلف طرح کی انتظامی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں ہمہ تن مشغول رہے تھے اور پانچ سال کے بعد آپؒ کی تدریس میں یہ واپسی ہوئی، ایک لمبی مدت تک تشنگانِ ادب عربی کی باضابطہ طور پر حضرتؒ کے چشمۂ ادب و ثقافت سے محرومی کے بعد ہم شرکاءِ درس کو براہِ راست اس سے سیرابی کا سنہرا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ اس اعلان سے احقر اور اس کے دوسرے رفقاءِ درس کو کتنی مسرت اور خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کچھ وہی خوش قسمت لوگ کر سکتے ہیں جنہیں حضرتؒ سے تلمذ اور استفادہ کا تھوڑا بہت موقعہ میسر آیا ہو۔ اس سال تکمیلِ ادب کی کوئی مستقل کتاب حضرتؒ کے زیرِ تدریس نہیں رہی کہ اسباق کی تقسیم کا مرحلہ اس سے ایک ماہ پہلے طے ہو چکا تھا۔ بلکہ آپؒ نے دلچسپ اور عام فہم کہانیوں پر مشتمل دو تین عربی کتابچوں کے ذریعہ (جو بعد میں دیگر سات ادبی کتابچوں کے ساتھ کتبخانہ حسینیہ دیوبند سے "مجموعة من القصص الادبية" کے نام سے شائع ہوئے) عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے، تعبیرات اخذ کرنے، عربی عبارات کو رواں اردو زبان میں منتقل کرنے کی بے حد مفید مشق کرائی۔

یہ حضرت سے باضابطہ تعارف کی ابتدا تھی، اگرچہ آپ کے تئیں عقیدت و محبت کے جذبات دل و دماغ کی رگ رگ میں اس سے بہت پہلے ہی سما گئے تھے، جب راقم مدرسہ "انوار الاسلام" ضلع گونڈہ میں

مبتدی طالب علم تھا۔ عقیدت و احترام کا یہ رنگ حضرت کے شاگرد اور راقم کے شفیق استاذ مولانا حفظ الرحمن صاحب اعظمی حال مقیم مکہ مکرمہ نے بھرا تھا جس کو بعد میں لائق صد احترام حضرۃ الاستاذ مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی استاذ ادب عربی و ایڈیٹر ماہنامہ "الداعی" دارالعلوم دیوبند سے تلمذ اور پھر براہ راست وابستگی نے مزید شوخ اور گہرا کر دیا! اسی وقت سے احقر پر حضرت کی خصوصی عنایات و الطاف مبذول اور زندگی کے آخری دنوں تک برقرار رہیں۔ حضرت سے میری آخری ملاقات وفات حسرت آیات سے صرف دو روز پہلے ۱۳ اپریل ۱۹۹۵ء کو ذاکر نگر نئی دہلی میں ہوئی۔ اس وقت آپ پر اکثر اوقات غشی کی سی کیفیت طاری رہا کرتی تھی، کھانا پینا کئی روز پہلے ہی سے بند ہو چکا تھا اس لیے گفتگو کرنے کی سعادت سے محروم رہی۔ حضرت کی حالت دیکھ کر اسی وقت دل میں نہ جانے کیوں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ آپ شاید اب کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں۔ آخر جس بات کا اندیشہ تھا وہ ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء کو بعد نماز مغرب حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔

احقر جب تکمیل ادب عربی سے فارغ ہوا تو عربی زبان و ادب کی مزید تعلیم اور حضرت کی سحر آفریں اور مردم ساز شخصیت سے بھرپور استفادہ کی غرض سے اگلے سال کے شروع میں دیوبند آیا، کیوں کہ تخصص ادب عربی کا شعبہ اس وقت آپ ہی سے وابستہ تھا۔ احقر تکمیل ادب میں امتیازی نمبرات سے پاس ہوا تھا جس کی وجہ سے تخصص میں داخلہ یقینی تھا مگر حضرت نے اپنے نوخیز تالیفی و تحقیقی ادارہ "دارالمؤلفین" کی گوناگوں ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے فرمایا کہ اس سال میں شعبۂ تخصص کی نگرانی کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکوں گا اس لیے میری رائے یہ ہے کہ تم اس سے وابستہ ہونے کے بجائے کسی مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دو، اور عربی ادب کی فلاں فلاں کتابوں کو مطالعہ میں رکھو، ان شاء اللہ دوہرا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت کے حکم پر دارالعلوم الاسلامیہ بستی بغرض تدریس چلا گیا، وہاں طلبہ کو عربی زبان کی تحریری و تقریری مشق کرانے کے لیے "النادی" قائم کی اور حضرت کی ہدایات کے مطابق "النادی" کی ہر طرح سے نگرانی، طلبہ کی رہنمائی اور خارج اوقات میں بعض طلبہ کو عربی زبان کی تعلیم دینی شروع کی، جس کا بہت جلد خوش آئند اور حوصلہ افزا نتیجہ برآمد ہونا شروع ہو گیا۔ میری اس دلچسپی کی تفصیل جب حضرت کو میرے خطوط کے علاوہ بعض ذمہ داران مدرسہ کی زبانی معلوم ہوئی تو آپ نے بے پناہ خوشی کا اظہار فرمایا اور راقم کو اپنے والا نامہ سے سرفراز فرمایا جس کا متن حسب ذیل ہے:

مولانا حبیب الرحمن قاسمی گونڈوی نمبر

عزیزم مولوی عبدالرشید بستوی زادک اللہ علما وصلاحا
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے تم بعافیت ہو، ادھر کچھ دنوں سے بیمار چل رہا تھا، اب الحمدللہ قدرے ٹھیک ہوں مولوی سعید الرحمن بستوی کی معرفت تمہاری خیریت برابر معلوم ہوتی رہتی ہے، تمہارا بھیجا ہوا خط ایک مہینہ پہلے موصول ہوا مگر مسلسل مرض کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

جناب مولانا باقر حسین صاحب اور مولانا ظہیر الانوار صاحب سے "النادی" کے قیام، طلبہ کی تعلیم سے تمہاری دلچسپیوں اور عربی زبان کے تئیں تمہارے شوق وجذبہ کے بارے میں معلوم ہوا، دلی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ تمہیں مزید حوصلہ اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی توفیق دے۔

الحمدللہ ذمہ داران مدرسہ تمہارے کام سے بہت مطمئن ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ باقی حالات قابل شکر ہیں اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہو۔

والسلام
مخلص
وحید الزماں
۸/۲/۱۴۰۸ھ

دارالعلوم الاسلامیہ بستی کی چار سالہ مدت تدریس کے دوران احقر کو حضرتؒ کے تقریباً پچیس خطوط موصول ہوئے جن میں سے پندرہ خود حضرت کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے تھے؛ طوالت کے خوف سے صرف ایک خط پیش کیا جارہا ہے۔

اس کے چند سال بعد حضرتؒ کے حکم پر احقر کا "مدرسہ قاسم العلوم" چندر گڑھ، ضلع کولہاپور حضرتؒ ہی کے ہمراہ تدریس کے لیے جانا ہوا، اتنے طویل سفر میں آپ کے ساتھ رہنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ پورے سفر کے دوران آپ نے احقر کے ساتھ انتہائی شفقت کا معاملہ کیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے کچھ لوگوں نے ایک شخص کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف کی تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم لوگوں نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا؟ کیا کبھی اس کے ساتھ کسی طرح کا لین دین ہوا؟ کیا تمہاری کبھی اس سے کسی مسئلہ پر مخاصمت ہوئی؟ ان لوگوں نے جواب دیا، نہیں! تب حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا: کیا تم لوگ اس وجہ سے اس کی تعریف کرتے ہو کہ وہ پانچ وقت مسجد میں آکر پابندی سے چونچ مارتا ہے جس طرح پرندے مارتے ہیں؟

صفائی معاملات کا حضرتؒ کے یہاں اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ جو بھی معاملہ کسی سے کرتے، اس کے تمام گوشوں کی پوری وضاحت کے ساتھ اجرت، قیمت اور ادائیگی کے وقت کا تعین فرماتے اور ہر

چھوٹے بڑے کاروباری معاملے کو اہم دستاویز کی طرح نہایت اہتمام کے ساتھ تحریر فرماتے اور طے شدہ امور کی بابت کبھی تخلف کو راہ پانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کا دل اپنے شدید ترین مخالفین کے تئیں بھی انسانی ہمدردی کے جذبات سے معمور رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ایک موقع پر بعض طلبہ کے انتہائی گستاخانہ برتاؤ کو ان کی طرف سے زبانی معافی کی درخواست پر یکسر معاف فرما دیا اور ان کے تئیں دل میں کسی طرح کی کوئی بات نہ رہ گئی۔

حضرت مولاناؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں بہت سی انسانی خوبیوں، علمی کمالات اور عزم وحوصلہ کی بلند پروازیوں سے نوازا تھا وہیں "افراد سازی" کے بیش بہا جوہر سے بھی فیاضی کے ساتھ بہرہ ور فرمایا تھا۔ آپ ہمیشہ اپنے خوردوں، شاگردوں اور زیر تربیت طلبہ کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ افزائی کرتے، ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرتے اور ترجمہ و تالیف کے تئیں ان کی معمولی سی کوششوں کو اتنا سراہتے کہ ان کے اندر اپنی صلاحیت اور اہلیت کا گہرا احساس اجاگر ہو جاتا اور وہ اس بے پناہ حوصلہ افزائی کی بدولت اپنی محنت و جانفشانی سے بہت کچھ بن جانے کی سعی میں لگ جاتے۔

ایک مربی کا کمال یہ ہے کہ وہ زیر تربیت لوگوں کی ہر چھوٹی بڑی غلطی پر "درشتی و نرمی بہم داشتن" کے اصول کی روشنی میں مناسب انداز میں تنبیہ اور ان کو ان کے نفع و نقصان سے مؤثر طور پر آگاہ کرتا رہے، نیز زندگی کی مختلف النوع ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونے کا ہنر سکھلا دے اور کسی غلطی کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کرے، حضرت مولاناؒ اس مربیانہ صفت میں اپنی نظیر آپ تھے۔ وہ نہ صرف اپنے خوردوں، نیاز مند شاگردوں اور متعلقین کو ان کی غلطی پر نہایت بلیغ انداز میں تنبیہ کرتے بلکہ بسا اوقات اپنے آپ کو قابل احترام اور باوقار خیال کرنے والے حضرات کو بھی ان کی نازیبا اور خلاف ادب حرکتوں پر مناسب انداز میں تنبیہ کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ حضرت مولاناؒ کسی غلط بات یا ناشائستہ حرکت پر خاموش رہنے پر نہ تو قدرت رکھتے تھے اور نہ ہی نفاق آمیز مصلحت اندیشی سے وہ آشنا تھے۔ اس طرح کے اپنے اور عزیزوں کے متعدد واقعے خود احقر کو اب تک یاد ہیں جن سے زندگی گذارنے کا سلیقہ اور ہر مجلس کے مناسب حال آداب کا خیال رکھنے اور ان کو برتنے کا شعور پیدا ہوتا۔

احقر کے ساتھ حضرتؒ کی پدرانہ شفقت کی تاثیر تھی یا ان کی پرکشش ساحرانہ شخصیت کا کمال کہ راقم سطور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا اسی قدر اسکے دل میں حضرتؒ کے تئیں عقیدت و محبت اور نیازمندی کے نقوش گہرے اور انمٹ ہوتے گئے۔ احقر اسکو اپنی سعادت اور نیک بختی سمجھتا ہے کہ وہ آخری دنوں تک حضرتؒ کی خصوصی شفقتوں اور نظر کرم سے بہرہ ور رہا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیرانوی نمبر

مولانا محمد اکرام القاسمی

شخصیت کے چند گوشے

استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی خورد نوازی تھی۔ علم و ادب کے اس آفتاب و ماہتاب کے اندر کبر و غرور کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا ہم جیسے ان کی خاک پا کے بھی برابر نہ تھے مگر ہماری باتوں کو وہ نہایت توجہ سے سنا کرتے تھے۔

دارالمؤلفین دیوبند (جس کو مولانا مرحوم نے اکابر علماء دیوبند کے علمی ورثہ کو عصری تقاضوں کے مطابق منظر عام پر لانے کے لئے قائم فرمایا تھا) میں قیام کے دوران حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی رحمہ اللہ کی نامکمل کتاب قصص القرآن کا تکملہ لکھنے کی ذمہ داری استاذ محترم نے میرے سپرد فرمائی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس اہم کام کی تکمیل کر سکوں گا۔ مگر حضرت مولانا کی توجہات اور تسلیوں نے میرے اندر عزم و اعتماد پیدا کیا۔

میں نے آہستہ آہستہ کام شروع کیا اور جھجکتا ہوا حضرت مولانا کی خدمت میں مضمون سنانے کے لئے پہونچا، استاذ محترم نے میری حوصلہ افزائی کے لئے مضمون کی ستائش فرمائی اور نہایت شفقت آمیز لہجے میں اس کی اصلاح بھی فرمائی، ساتھ ہی ایک ایسی حکمت آمیز نصیحت فرمائی جس نے بہت سی تاریک راہوں کو روشن کر دیا۔ مولانا نے فرمایا:

> "جس طرح کپڑے پر پریس کرنے سے کپڑے کی سلوٹیں کھلتی ہیں، اسی طرح مضمون کو بار بار پڑھنے اور صاف کرنے سے مضمون کی سلوٹیں کھلتی ہیں اور مضمون صاف ہوتا ہے، (اس لئے بار بار پڑھ لیا کرو۔)"

• استاذ جامعۃ القرآن الکریم، بجنور

مولانا کی نصیحتیں ان کے سوز دروں اور اخلاص کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں، جو سامع کے دل ودماغ کو چھو جائیں اور اس کو متاثر کئے بغیر نہ رہتیں۔

دوسری چیز جس نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ مولانا کا اخلاص، ہمدردی، صاف گوئی اور معاملہ کی صفائی تھی جو آج کی اس مادی اور مطلبی دنیا میں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں مولانا سے زیادہ صاف گو نہیں دیکھا، گویا استاذ محترم قل الحق وان کان مرّاً کے عملی پیکر تھے۔ باطل کے خلاف مولانا ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے۔ ہر موڑ پر حق بولنا ان کا اپنا شیوہ تھا، اس میں ذرا بھی جھجک یا کسی کا دباؤ محسوس نہ فرماتے۔ بقول اقبالؒ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

استاذ محترم کا یہ وہ وصف ہے جس سے آپ کے مخالفین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مولانا کے اسی اخلاص وہمدردی کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف کرکے معافی چاہ لیتا تو مولانا اسے صدق دل سے معاف فرمادیتے۔ پھر گویا اس نے کوئی غلطی ہی نہ کی ہو۔

تیسری چیز جس نے مجھے حد سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا کی استقامت اور عزائم کی پختگی تھی۔ مولانا نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جن میں خاص کر دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی اور تعمیری خدمات اور دارالمؤلفین دیوبند کا قیام تھا۔ استاذ محترم کے یہاں مایوسی کا نام ونشان تک نہ تھا۔

خاندانی وراثت

حضرت مولانا کے بہت سے کمالات خاندانی وراثت میں ملے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مسیح الزماں صاحب کیرانویؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار تھا۔ برطانوی سامراج کا تختہ پلٹنے کے لئے اکابر علماء دیوبند کے قدم بہ قدم قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کیا تھا۔

وہ علمی اعتبار سے اگرچہ استاذ المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے شاگرد تھے مگر فکری اور سیاسی اعتبار سے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ہمنوا تھے۔ مولانا کی بیشتر مزاجی خصوصیات

ان کے والد محترم سے ورثہ میں ملی تھیں جیسے خودداری، شجاعت، صاف گوئی، اوقات اور وعدوں کی پابندی، نظم وسلیقہ، خلاف مزاج بات پیش آنے پر غصہ آنا اور ناگواری کا کھل کر اظہار کرنا اور متعلقہ شخص کی طرف سے معافی مانگ لینے پر دل سے معاف کردینا وغیرہ۔

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا انداز تربیت تھا۔ مولانا کا یہ وہ امتیاز ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں، خود راقم کا واقعہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد جب مولانا سے وابستگی ہوئی تو میری زبان بہت تیز چلا کرتی تھی۔ گفتگو کے دوران سامع کو میرے الفاظ سمجھ میں نہ آتے اور اس کو پریشانی محسوس ہوتی۔ حضرت مولانا نے مجھے پہلی ہی مجلس میں سرزنش فرمائی کہ تیز نہ بولا کرو، آہستہ آہستہ بات کرو۔ اس کے بعد مجھے پھر تیز بولنے کی ہمت نہ ہوئی اور زبان پر کنٹرول ہوگیا۔

حضرت مولانا کی شخصیت سے بے انصافی ہوگی اگر ان کو صرف عربی زبان وادب کے ماہر کی حیثیت سے یاد کیا جائے۔ مولانا ہشت پہلو شخصیت اور گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے، وہ ایک بہترین ادیب، بے مثال معلم ومربی، زبردست مدبر ومنتظم اور لائق انجینئر تھے۔ ساتھ ہی ان کو ملت اسلامیہ کے مشکلات ومسائل کا بڑا درک تھا۔ وہ موجودہ ملی قائدین کے طرز عمل سے بڑے نالاں تھے فرمایا کرتے تھے کہ:

"موجودہ قائدین ومفکرین صرف ملی امراض کی تشخیص کرتے ہیں اس کا کوئی علاج تجویز نہیں کرتے۔ اور یہی ملت کا بہت بڑا المیہ ہے۔"

مجلسوں میں مولانا ملی مسائل پر ایسی گل افشانی فرماتے کہ سامعین انگشت بدنداں رہ جاتے۔ دارالعلوم دیوبند جس کے در ودیوار سے مولانا کو قلبی لگاؤ تھا جہاں پر آپ نے ایک طویل عرصہ تک علم وادب کی بے لوث خدمات انجام دی تھیں اس دارالعلوم سے ناوقت اور بے وجہ سبکدوشی مولانا کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی جس کا اثر براہ راست ان کی صحت وطبیعت پر پڑا۔ اگرچہ مولانا اپنی بے پناہ ہمت سے اس صدمہ کو جھیل لے گئے اور سبکدوشی کے بعد بھی بڑے اہم علمی کارنامے انجام دیئے لیکن اس واقعہ نے قدرتی طور پر ان کی فکری جولانیوں اور ولولوں اور خوش مزاجی کو متاثر کیا۔ کاش مولانا کو زندگی نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو ان کے جدت طراز ذہن کے اور بہت سے منصوبوں کو عملی شکل مل گئی ہوتی۔

اسعد الاعظمی

"وہ کوہ کن کی بات"...
مولانا وحید الزماںؒ کو ایک خوبصورت نذرانۂ عقیدت

عصر حاضر کے منفرد معلم و مربی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے سانحۂ ارتحال کے چند ماہ بعد ہی ان کے ایک نمایاں شاگرد اور دار العلوم دیوبند میں ان کے علمی جانشین مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب نے اپنے محبوب استاذ کو کتابی شکل میں ایک ایسا دلکش اور خوبصورت ہدیۂ عقیدت پیش کیا کہ ایک تلمیذ رشید کی طرف سے اپنے استاذ کے لئے اس سے بہتر خراج عقیدت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک معروف اہل قلم نے مولانا نور عالم صاحب کی کتاب "وہ کوہ کن کی بات" پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دل لگتی بات کہی کہ جو بھی اہل دل اس کتاب کو پڑھے گا وہ تمنا کرے گا کہ "کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مر جاتا۔"

"وہ کوہ کن کی بات" کئی حیثیتوں سے ایک منفرد اور انوکھی کتاب ہے اور یہ اس کی انفرادیت ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک ڈیڑھ ماہ کی مختصر مدت کے دوران کتاب کا پہلا ایڈیشن نایاب ہوگیا۔ فاضل مصنف نے ارباب ذوق کے شوق بے پناہ کا خیال کرتے ہوئے بڑی عجلت کے ساتھ کتاب کا دوسرا ایڈیشن مزید آب و تاب اور ایک دل چسپ اور طویل مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا اور اس ایڈیشن کو بھی اسی ذوق و شوق اور اتنی ہی تیز رفتاری کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ مصنف محترم ان دنوں اپنی کتاب کے دامن میں کچھ اور ستارے ٹانکنے میں مصروف ہیں اور عنقریب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کرکے اہل ذوق کی قوت خرید کو ایک بار پھر آزمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی پہلی انفرادیت اس کا پرکشش اور نرالا عنوان ہے جو مدارس عربیہ کے روایتی انداز سے مختلف ہونے کی بنا پر دیکھنے والے کی توجہ کو فوری طور پر مبذول کرتا ہے اور ساتھ ہی مولانا

وحید الزماں علیہ الرحمۃ پر حرف بحرف منطبق بھی ہے۔ طبع دوم کے مقدمہ میں مصنف نے کتاب کی وجہ تسمیہ اتنے دل چسپ و دلآویز انداز میں بیان کی ہے کہ صرف اس مقدمہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہی اگر دوسرے ایڈیشن کو خرید ا جائے تو ہمارے خیال میں کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ کتاب کی طباعت، کتابت، کاغذ اور خصوصاً اس کا سرورق اتنا پرکشش اور جاذب نظر ہے کہ مدارس کے ماحول میں اس کی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

لیکن کتاب کی اصل انفرادیت اس کے پر مغز و پُر اثر مندرجات اور اس کے دل نشین و دل پذیر انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے فکر و عمل کے دورانیہ کا اتنی خوبصورتی سے احاطہ کرتی اور ان کے کمالات و خصوصیات کی ایسی مؤثر تصویر کشی کرتی ہے کہ کتاب کا مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری اس میں کھو سا جاتا ہے اور مصنف کی جادو بیانی سے مسحور ہو کر کتاب کو ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔ کتاب کی ہر سطر سے فاضل مصنف کا جوش و جذبہ اور اپنے استاد سے ان کی گہری اور والہانہ عقیدت و محبت چھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

" وہ کوہ کن کی بات " کوئی مکمل اور باضابطہ سوانح عمری نہیں ہے بلکہ (جیسا کہ مصنف نے حرف اول کی ابتدائی سطور ہی میں وضاحت کر دی ہے) مولانا وحید الزماں صاحب کے بارے میں مصنف کے جذبات و تاثرات اور احساسات و مشاہدات اور مدارس عربیہ کی نئی نسل پر ان کے دیر پا اثرات و احسانات کا ایک مرقع ہے، اس لئے مصنف نے بجا طور پر کتاب کو صاحب سوانح کی زندگی کی ان تفصیلات سے بوجھل نہیں کیا ہے جو عموماً سوانح عمریوں میں بیان کی جاتی ہیں اور جن سے بسا اوقات قاری کو اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس میں صرف وہی باتیں شامل ہیں جو کسی بھی قاری کے لئے قابل توجہ اور سبق آموز ہو سکتی ہیں، بنابریں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب میں وہ بہت کچھ ہے جو ہونا چاہئے اور وہ بالکل نہیں ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔

البتہ باخبر لوگوں کو ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ مصنف نے مولانا وحید الزماں صاحب کے آخری دور بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ان کی علاحدگی کے معاملہ سے غالباً بالقصد دامن بچا کر گذرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک خالی الذہن اور باشعور قاری جب مولانا مرحوم کے گوناگوں اوصاف و کمالات کے تذکرہ کے بعد اچانک یہ دیکھتا ہے کہ اتنی باکمال اور مفید شخصیت کو دارالعلوم

سے سبکدوش کر دیا گیا اور وہ بھی "بیماری اور اس کی بنا پر مشتعل اور بے قابو ہو جانے" کو بنیاد بنا کر، تو فطری طور پر اس کو اچنبھا ہوتا ہے اور اس کا متجسس ذہن حیرت و مایوسی کی ایک پریشان کن کیفیت سے دو چار ہو جاتا ہے۔ اس کو سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک اور یک لخت یہ کیا ہو گیا۔ اس کی طبیعت یہ جاننے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم جو مصنف کے بقول مولانا وحید الزماں صاحب کی عقیدت و محبت کا محور تھا، اس سے اس عاشق کی علاحدگی کے پیچھے فی الواقع کیا اسباب و عوامل کارفرما تھے۔ ہمارے خیال میں مصنف کو ایک عام قاری کے ذہن میں اٹھنے والے ان سوالات کا جواب ضرور دینا چاہئے تھا ورنہ سبکدوشی کے ادھورے اور تشنہ ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

بہرحال اس کمی کے باوجود "وہ کوہ کن کی بات" ایک بھرپور اور جامع کتاب ہے اور اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب بھی۔ مصنف نے مولانا وحید الزماں صاحب کی ہشت پہلو شخصیت ان کی تعلیمی و تربیتی و انتظامی انفرادیت، ان کی بیدار مغزی و دیدہ وری، بالغ نظری و روشن دماغی اور عالی ظرفی و حوصلہ مندی کی اتنی موثر منظر کشی کی ہے کہ مولانا مرحوم اس کتاب کے اوراق میں چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں اور قاری کے دل و دماغ پر ان کی عظمت و عبقریت کا گہرا نقش قائم ہو جاتا ہے۔

مولانا نور عالم امینی صاحب اصلاً عربی زبان کے انشاء پرداز ہیں اور ہندوستان میں عربی کے چند گنے چنے انشا پردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن "وہ کوہ کن کی بات" لکھ کر انھوں نے اردو زبان میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا ہے۔ مولانا کے وہ قدر داں جو ان کو عربی رائٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر حیرت و تذبذب میں مبتلا ہیں کہ ان کو عربی کا بڑا انشاء پرداز قرار دیں یا اردو کا۔ کتاب کی خوبصورت اور معیاری زبان و بیان کو دیکھتے ہوئے اسے بجا طور پر اردو کے ادبی ذخیرہ میں بھی ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے کتاب میں کسی مناسبت سے جن شخصیات کا ضمناً ذکر آگیا ہے ان کے بارے میں مصنف محترم نے بڑے دلچسپ، لطیف، ظرافت آمیز اور نپے تلے حواشی لکھ دیئے ہیں۔ ان تعارفی خاکوں نے کتاب کی اہمیت دوچند کر دی ہے۔

"وہ کوہ کن کی بات" ہر خاص و عام بالخصوص مدارس اسلامیہ کے اساتذہ اور طلباء کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے، کہ وہ اس سے نہ صرف جوش عمل، سعی پیہم، سلیقہ مندی اور تہذیب

وشائستگی کا درس حاصل کر سکتے ہیں بلکہ کتاب کی مرصع زبان اور اس میں جا بجا بکھری ہوئی ادب کی جاشنی اور انشار کی حلاوت سے بھی محظوظ و مستفید ہو سکتے ہیں۔

ناشر کتاب ادارہ علم وادب نے طبع دوم کے ساتھ کتاب کے بارے میں ممتاز علمار ادبا ر اور مفکرین کے تاثرات بھی علاحدہ کتابچہ کی شکل میں شائع کر دیئے ہیں۔ اتنی اھم شخصیات کے اتنے اچھے تاثرات عموماً کسی کتاب کے سلسلے میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے "وہ کوہ کن کی بات" کا ایک مختصر اقتباس صد ۱۲۲ پر شائع کیا جارہا ہے، لیکن کتاب کی اہمیت وافادیت اور اس کی لذت وحلاوت کا صحیح اندازہ پوری کتاب کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ انمول کتاب درج ذیل پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہے:

ادارہ علم وادب، افریقی منزل قدیم، دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ (یوپی)

بقیہ : ہمارے مولانا

کی تاسیس وصدارت، دارالمؤلفین دیوبند کا قیام تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی رکنیت اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

نابغۂ روزگار مولانا نانوتویؒ کی تواضع وانکساری، شیخ الہندؒ کی قائدانہ صلاحیت، مولانا تھانویؒ کی حکیمانہ ذہانت، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی عبقریت، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی مردم سازی، مولانا مدنیؒ کی شجاعت وبہادری اور حق گوئی وبے باکی، مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی قوت خطابت، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ کی ادبیت، مرزا مظہر جان جاناںؒ کی ذکاوت احساس اور شیخ الحدیث مولانا فخرالدینؒ کی نفاست طبع کے قصے اپنے بزرگوں اور اساتذہ کرام سے سنے اور کتابوں میں پڑھے تھے، مگر ان اوصاف حمیدہ کا چلتا پھرتا نمونہ حضرت رحمہ اللہ کی زندگی میں دیکھنا نصیب ہوا۔ آپ کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ خیرالقرون کا کوئی ستارہ چودھویں صدی میں جگمگا رہا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اصلاحِ وانقلاب کی قیادت

- دار العلوم کی اندرونی کشمکش
- کیمپ دار العلوم
- تبدیلیِ اقتدار

مولانا انظر شاہ مسعودی

وہ فریب خوردہ شاہیں

یہ مضمون نہ کسی مرید کا نہ شاگرد کا، نہ محب کا، نہ معتقد کا، مرید کے مندرجات "پیراں نمی پرند، مریداں پرانند" کا مظہر ہوتے ہیں، اُسے اپنے شیخ کی سوانح میں جب ایسی ٹھوس چیزیں نہیں ملتیں جو قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرسکیں، تو اِدھر اُدھر کے واقعات جمع کرتا ہے یا کرامات کا سہارا لیتا ہے، یہ بادلی ہنڈیا جس کا ذائقہ عوام پسند مگر حقیقت شناس کے لیے بڑی بے مزہ اور بے لطف ہوتی ہے، شاگرد کچھ لکھے گا تو اُستاذ کی واقعی کمزوریوں سے صرف نظر، اسی کا نام عام حلقوں میں "سعادت" ہے، نکتہ چینی کرے گا تو اس کا نام "بغاوت" ہوگا، محب قلم اٹھائے گا تو پوری نگارش حبك الشئ يُعمى ويُصم کی آئینہ دار ہوگی، اُسے پیکر محبوب میں دلنوازی و دلبرائی کے سارے سامان جلوہ افروز نظر آئیں گے، کردار کے کسی سُقم پر اس کی نظر نہ ہوگی، اُس کی تحریر و تقریر پر کوئی نکتہ چیں ہوگا، تو وہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں بباید دید" کہہ کر معترضین کا منہ نوچ لے گا یا اسے خاموشی سے پڑھ کر اپنے دل کو مطمئن کرے گا۔

یہ نگارش کسی تملق پسند کی بھی نہیں جو زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے، کسی ضرورتمند کی بھی نہیں جس کے دل میں ڈھیروں اعتراضات، مگر خود کو قیس صحرائی کے روپ میں پیش کرتا ہے، پھر یہ تحریر کس کی ہے؟

مولانا مرحوم کے ایک معاصر، ہم درس، ہمنشیں کی جو صرف نام کا "انظر" نہیں بلکہ اپنے مأخذ سے وافر حصہ لئے ہوئے جو کسی شخصیت کو دبیز پردوں میں جھانک کر دیکھ لیتا ہے جس کی نظر چہار جہت پردوں کے آویزاں ہونے کے باوجود اپنے کام سے نہیں چوکتی وہ اس خدائی عطیہ یعنی صلاحیت

شیخ الحدیث وقف دارالعلوم دیوبند

مردم شناسی پر بطور تحدیث نعمت کہہ سکتا ہے ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے چھپیں گے وہ کہاں ایسے کہاں کے ہیں

اس تمہید کے بعد کیا راقم الحروف مطمئن رہے کہ آنے والے مندرجات کو آپ صحیح چوکھٹے میں دیکھنے کی کوشش کریں گے، آپ کی سعادت کو ٹھیس نہیں پہونچے گی، آپ کے جذبات محبت زخمی نہ ہوں گے اور آپ کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نہ ابھریں گی؟ اور اگر آپ خفا ہوتے ہیں تو یہاں سے بھی اعلان ہے - کہ

بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے، ہاں تو سنئے ——— ! اک دبلا پتلا، نحیف و نزار، سفید پوش، صاف پوشاک دارالعلوم میں داخل ہوا، مختصر المعانی سے تاجلالین میرا ہم سبق، فراغت میں میرے اور سفید پوش کے درمیان ایک سال کا فرق یعنی میری فراغت ۱۳۷۲ھ میں ان کی ۱۳۷۳ھ میں مشہور ہے کہ اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ، عام ذہنوں نے اس مقولہ کا مطلب پوشاک سے شخصیت کا طمطراق قرار دیا اور اپنا خیال یہ ہے کہ پوشاک کا انتخاب، اندرونی رجحانات و میلانات کا مظہر رہے الا ماشاء اللہ نظافت طبع، نظیف لباس کی طرف لے جاتی ہے، قلب و دماغ کی کثافتیں غلیظ پوشاک پہنواتی ہیں، مرحوم کھدر پوش تھے لیکن کھردرے نہیں، ہمیشہ صاف ستھرے رہتے، کبھی پراگندہ حال و بال نظر نہ آئے، سنجیدگی و متانت کا پیکر! لیکن اندرون، جوش و خروش سے لبریز، باہر سے سعادت مند لیکن بباطن باغیانہ جذبات موجزن جنہیں معنی خیز خاموشی سے کنٹرول کرتے، زندگی اتنی پرتکلف کہ بے تکلف مجلسوں میں بھی حجاب تکلف میں مستور، پردہ ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھا! رہائشی کمرہ میں بھی ایسا زاویہ تلاش کر لیتے جس کے چہار جانب پردے پڑے ہوتے -

حضرت مولانا فخر الحسن مراد آبادی مرحوم کا سبق جس کی گرمئی میدان، تلامذہ کو ہمیشہ یاد رہے گی! مرحوم استاد سبق میں بیٹھتے ہی ٹوپی اتار کر ڈیسک پر رکھ دیتے اور پھر ان کی تقریر دلپذیر شروع ہوتی، وہ افہام و تفہیم کے بادشاہ تھے لیکن تلامذہ کو معلوم ہے کہ درس کے لیے مطالعہ کا اہتمام ان کے یہاں نہ تھا، جس دن ضروری تیاری نہ ہوتی تو پھر واقعی میدان گرم ہوتا جس میں عربی آمیز اردو، شوکت لب و لہجہ، آواز کا اتار چڑھاؤ، اس پر سب قہقہہ زن ہوتے لیکن مولینا وحید الزماں صاحب کے چہرہ پر ایک ہلکا سا تبسم، اس سے زیادہ کچھ نہیں، جس سنجیدگی کو انھوں نے اپنایا اس کا کچھ حصہ خلقی اور کچھ کسبی تھا، مجھے مولاناؒ کی سوانح نہیں لکھنا، کچھ لکھ چکے کچھ لکھیں گے،

میں تو مولانا کے کردار و عمل پر ایسی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جسے اگر غور سے پڑھا جائے گا تو بعد کے حوادث و واقعات کی بہت سی گرہیں کھلیں گی اور مولاناؒ کی ڈگر پر کام کرنے والوں کے لیے اس میں عبرت پنہاں ہوگی۔

قصہ مختصر! دیوبند سے فراغت کے بعد اِدھر اُدھر گھوم کر مولاناؒ پھر دیوبند آپہونچے، چوں کہ وہ عربی تحریر و انشار پر قادر تھے اور پریشانی روزگار میں اسی کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے، دیوبند اس کیلئے بہترین زمین تھی، یہاں پر ان طلبہ کا ہجوم تھا جو عربی لکھنے، بولنے کی اہمیت جان چکے تھے لیکن کوئی ایسا معلّم نایاب تھا جو ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو مہمیز دے، اس کام کی مرحوم میں پوری صلاحیت تھی، چنانچہ "دارالفکر" کے افتتاح کے ساتھ ہی طلبہ دارالعلوم کی اچھی تعداد ان سے جڑ گئی، جن کو ان کے ذوق کی چیز مہیا کرنے اور مزید اپنے لب ولہجہ کی لطافت سے خود سے مانوس کرلیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی حریف پارٹی جو دارالعلوم پر قبضہ کے لیے بے باک اور جری قائد کی تلاش میں تھی جس کے لیے پہلی ضرورت اس قائد سے طلبہ کا مانوس ہونا تھا، وہ مولاناؒ کے اُٹھان کو گہری دلچسپی سے دیکھ رہی تھی، کچھ اور مرحلے پیش آئے، جن کی تفصیل قصداً قلم زد، تا آنکہ مولانا دارالعلوم کے استاذ مقرر ہوئے اور "عربی ادب" مع اپنے برگ وبار کے ان کا خصوصی سبق، یہاں دارالعلوم کے طلبہ مولانا کے حلقہ بگوش ہوگئے جنہیں کھینچنے میں مولانا کا سلیقہ و قرینہ، خصوصی مؤثر تھا۔ رفتہ رفتہ بڑے سیاسی انداز میں مولانا قاری طیب صاحب کی حریف پارٹی نے مولانا کو خود سے قریب کیا اور مولاناؒ پر نوازشوں کی بارش شروع ہوگئی۔ صورتِ حال کی مزید وضاحت کے لیے کچھ "آپ بیتی"، بھی سن لیجیے۔

میں فراغت کے ساتھ دارالعلوم میں تدریس کے لیے منتخب ہوچکا تھا، کامیاب تدریس، شعلہ بار تقریر، اردو و انشار کی وجہ سے طلبہ میں خاصا مقبول تھا۔ سیاسی نظریات میں پکا کانگریسی، پختہ "جمعیتہ العلمائی"، میں نے جمعیۃ العلماء کی ممبرسازی کے لیے طلبہ کے حجروں پر دستک دی، دیوبند کے محلوں کی گرد چھانی، جمعیۃ العلماء کے اکھاڑے کے جلسے سر کئے، گیا میں جب جمعیۃ العلماءؒ کا سالانہ جلسہ ہوا، وہاں کی فضار کو "جمعیۃ" کے لیے سازگار کرنے کے لیے پہلے بعد دیگرے سفر کئے، جن میں ہفتے صرف ہوئے، ضلع سہارنپور میں جمعیۃ کے مخالفین کے ہاتھوں اپنی پگڑی اچھلوائی، سہارنپور کے ایک جلسہ میں مخالفین کی سنگ باری، سبّ وشتم اور دور تک تعاقب کا مزہ چکھا، اس کے باوجود مجھے جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا کبھی ممبر منتخب نہیں کیا گیا جبکہ مولاناؒ کو یہ عہدہ

رسمی تاخیر و تعویق کے بغیر مل گیا۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ مرحوم ذہنی طور سے جمعیۃ سے وابستہ نہ ہوں گے مگر جہاں تک جمعیۃ کے لیے حرکت و عمل کا تعلق ہے، وہ کتنی ہی حقیر بھی مگر میرے ہی حصہ میں آئے گی پھر یہ امتیاز کیوں برتا گیا؟؟ یہاں میں حریف پارٹی کی بصیرت کی داد دینے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے پہلے لمحہ میں میری مزاجی ساخت سے اندازہ لگایا کہ یہ دارالعلوم میں کسی انقلاب لانے میں مفید و کارآمد نہیں ہوگا۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کا حلیف طبقہ لیکن ناآشنائے عقل، جب میں مولانا اسعد صاحب کے دوش بدوش کھڑا تھا، اس وقت تو مجھے مولانا کا زرخرید سمجھتا، حیرت تو اس پر ہے کہ اب بھی کچھ ایسے محروم عقل ہیں جو دارالعلوم کے انقلاب میں اور انقلاب کے لیے مختلف اوقات برپا کی ہوئی تحریکات میں مجھے حریف پارٹی کے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم سمجھتے رہے، حالانکہ خدا شاہد اور اب واقعات سب سے بڑی برہان کہ حریف پارٹی نے مجھ سے دارالعلوم میں اپنے مقصد کے مطابق کوئی کام لینا تو درکنار اس موضوع سے متعلق کبھی کسی خفیہ میٹنگ میں بھی مجھے شریک نہیں کیا۔ ایسے ہی کچھ بدنیت کہتے اور سمجھتے ہیں کہ میں دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لیے اہتمام کی ہنوائی میں تھا۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے مولوی طاہر گیاوی کی اسٹرائیک کی اس وقت مخالفت کی تھی جبکہ میں طبقۂ وسطیٰ (ب) کا مدرس تھا اور اس وقت صدارتِ تدریس کا تصوّر نہیں کرسکتا تھا۔ میرے بلند پایہ اساتذہ حیات تھے انھیں پھلانگ کر صدارت کے تختِ طاؤس تک پہونچنا کارِ دشوار نہیں، بلکہ امرِ محال تھا۔

اب آیئے اس طرف کہ مولانا وحید الزماںؒ کیا دارالعلوم میں اصلاحی انقلاب کی خود ضرورت محسوس کررہے تھے؟ اور اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے انھوں نے ایک طاقتور گروپ کی پشت پناہی حاصل کی، اگر ایسا تھا تو اس کا پہلا طبعی مرحلہ رئیس الاہتمام سے براہِ راست گفتگو تھی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے مزاج و کردار سے آشنا اس کی شہادت دیں گے کہ مرحوم گوش شنوار کھتے اور دلیل کی قوت کے ساتھ آنے والی بات کو فوراً قبول کرتے، ان کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی خاص نگارش کو نہ صرف مجمع اساتذہ بلکہ رسمی علوم سے ناواقف لیکن معلومات رکھنے والے اور انشاء کے پیچ و خم سے واقف، مثلاً سید محبوب صاحب رضوی براد راکبر ازھر شاہ صاحب قیصر کو بھی سناتے، پھر قاری صاحب جیسا جلیل الشان، آدمی ان کے مشورہ پر اپنی مرصّع نگارش کے کئی کئی صفحات کاٹ دیتا۔ لکھنے کا جنھیں تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اپنی نگارش کو کہنے سننے پر قلمزد کرنا، اپنی عزیز

اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنے کے ہم وزن ہے، پھر بسا اوقات یہ بھی دیکھا درآنحالیکہ مولانا وحیدالزماںؒ کا رخ متعین ہو چکا تھا، اہتمام کی بیشتر مجالس میں ان کی تنقیدی یلغار کو نہ صرف مہتمم صاحب برداشت کرتے بلکہ اس میں سے موتی چن لیتے، اجلاس صدسالہ سے پہلے دارالعلوم کی تزئین کاری میں مہتمم صاحبؒ نے مولانا کو ایسا خود مختار بنایا کہ وہ ان تازہ و پختہ عمارتوں کو جن پر صرف کثیر ہوا تھا۔ دھڑا دھڑ گرا رہے تھے جس سے بہت سوں کے دل کانپ اٹھے اور مہتمم صاحبؒ سے عرض و معارضہ کیا گیا مگر انھوں نے موصوف کے کام میں مداخلت نہیں کی، اس مزاج و کردار کے امیر سے دارالعلوم کی اصلاح کے لیے پرسکون انداز میں بہت کام لیا جاسکتا تھا مگر یہ حکمت عملی حریف گروپ کے مقصد کی تکمیل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ یہ جال بھی تیار کیا گیا کہ مرحوم اگر قاری صاحبؒ سے کوئی بات کرنا چاہتے تو سب سے پہلے وہی کاٹ کرتے جو آج دوسری جانب مقربین میں ہیں، میں ان کے شین و مزین چہروں سے نقاب اٹھا سکتا ہوں لیکن سردست مصلحت نیست کہ راز پردہ بروں انتد راز" اس لیے آہ، آہ، آہ، وہ شخص جو خاموش علمی خدمت کے لیے باہنر و باصلاحیت تھا، اس کی صلاحیتوں پر دن دھاڑے ڈاکہ ڈال دیا گیا۔

بقول احسان دانش، ع لٹ گیا پردیس میں مزدور شاعر لٹ گیا . . . . پھر تو مولاناؒ یہ عاشقانہ نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے خودکشی کا ایک ایک مرحلہ طے کرتے رہے ؎

اٹھا او نہ خنجر دکھے گی کلائی
گلا کاٹ لو گلبدن دھیرے دھیرے

بہر حال دارالعلوم میں اس کی پرانی لیکن اجلی روایات و اقدار کو پامال کر کے انقلاب برپا کردیا گیا، علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ حریف گروپ کی تمام کوششوں کے باوجود اقتدار پر قبضہ کا یہ منصوبہ مولانا وحیدالزماں کے بغیر قطعاً پروان نہ چڑھتا، چونکہ انقلاب کا طاقتور عنصر اندرون دارالعلوم، طلبۂ دارالعلوم تھے اور ان کو دل پسند غذا دینے کا مولانا بہترین سلیقہ رکھتے تھے غرضیکہ وہ انقلاب کے واحد وحید علمبردار ہیں، باقی انگلی کٹا کر مجاہدین میں شریک ہونے والے انقلاب کے بعد جب مرحوم کی چوکڑیاں ارباب اقتدار کے لیے پریشان کن بنیں، تو جمعیۃ الطلبا جو مولانا کا سب سے بڑا طاقت کا مخزن اور کشتی بان تھا۔ پوری سیاسی حذاقت سے اس سفینے کے ایک ایک تختے کو مولانا ہی سے اکھڑوا دیا گیا۔ مرحوم کے بعض ہوا خواہوں نے اس "چال" پر متنبہ بھی کیا مگر وہ جوش اخلاص میں خود اپنی کشتی غرقاب کرنے میں مصروف رہے، شاخیں، ٹہنیاں

سب کاٹ دینے کے بعد "ٹھنڈ" رہ گیا جسے ذرا سی حرکت سے برابر زمین کرنا مشکل نہ تھا۔
رُکیے! اور ذرا سوچیے! ایک جانب مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وسعت ظرفی و حوصلہ کہ مرحوم نے مرحوم کی منحرفانہ تمام زیادتیوں کو برداشت کیا۔ دوسری طرف جن کے لیے مولانا نے اپنی صلاحیتوں کے جنازہ کو خود اپنے کاندھے پر ڈھو کر مرقد تک پہونچایا۔ انقلاب کے بعد وہی مولاناؒ برسرِ اقتدار طبقے کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے اور انھیں یکسو کرنے میں کوئی رُواداری نہیں برتی۔

میرا وہ سوال کہ مولانا دارالعلوم میں خود اصلاح چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے طاقتور گروپ سے مدد لی، پیش کردہ تفصیلات اس مفروضہ کی نفی کرتی ہیں۔

دوسری بات کہ مولانا بعض ہوشیاروں کی ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئے، واقعات و شواہد اسی کی تصدیق کرتے ہیں، کمال اتاترک کے شریک جدّوجہد ایک یارِ غار کی ترک انقلاب کے بعد فعالیت، مصطفےٰ کمال کے اقتدار کیلئے خطرہ بن گئی۔ تو اس پر بغاوت و نزاع کا الزام عاید کیا، عدالتی کارروائی تمام مراحل سے گذر کر اس وفادار کی پھانسی پر منتج ہوئی۔ آخری دستخط کے لیے دستاویز مصطفےٰ کمال کے سامنے آئی تو اتاترک لکھتا ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے میرا قلم جھجکا مگر دوسرے لمحے نے مجھے سمجھایا کہ اس کی بقا میں تیری فنا ہے، میں نے اپنی بقا کے لئے بے تکلف دستخط کر دیئے۔۔۔ مصر میں انقلاب لانے والے جنرل نجیب کو آغوشِ لحد میں انھی جمال عبدالناصر نے سلایا جو نجیب کے دستِ راست تھے، مقصد برآری اور بعد میں تہ تیغ کر دینے کی داستانیں پہلے نادر تھیں، اب تو روزمرہ کے انقلابات میں عام ہو گئیں۔

مجھے کہنا یہ ہے کہ مرحوم کا اخلاص غیر مشتبہ لیکن عاقبت بینی مشکوک، اس تلخ نوائی پر ناراض نہ ہوئیے! بلکہ سوچیے! کہ غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؛ آخر میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ؎

سادگی اپنی بھی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

افسوس کہ مولاناؒ کسی مرحلے پر یہ نہ سمجھے کہ دارالعلوم میں اصلاح کا نعرہ، طلبہ کے حقوق، جمیۃ الطلباء، مؤتمر ابنائے قدیم، "جلسہ القاسم" سب دام ہم رنگ زمیں ہیں، ٹھیک اسی طرح آج عوام و خواص یہ نہیں جانتے کہ تحفظِ ختمِ نبوت، تردید شیعیت، نصاب جدید، وفاق المدارس کچھ عوامی توجہات کو کھینچنے تو کچھ۔ سے مدارس عربیہ کی سیادت و قیادت کے عزائم، تو کچھ کا مقصد

دارالعلوم کے المیہ سے اس کی عالمی شہرت کو دھچکا لگنے پر تدارک کی کوششوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

مجھے اس موضوع پر مختصر لکھنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ حال ہی میں مرحوم کی ایک سوانح آئی جس میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں! یعنی مرحوم کی زندگی کا وہ باب جہاں سے ٹریجڈی شروع ہے۔ صاف ہے مولانا کی جبری معزولی کی تحریر کو تو نقل کیا لیکن مجوزین سے یہ چبھتا ہوا سوال نہ کرسکے کہ جس کی کمر تھپ تھپا کر زبردستی چڑچڑا بنایا گیا تھا تاوقتیکہ رُخ اس چڑچڑے پن کا مرحوم قاری صاحبؒ کی طرف رہا یہ چیز نہ صرف مباح بلکہ واجب رہی اور جب بقول رب: الایام دالیالی" تلک الایام نداولھا بین الناس" توجہ آپ کی طرف ہوئی تو یہ نہ صرف مکروہ بلکہ ایسا حرام قطعی ہوا کہ جرم قابلِ معافی بھی نہ تھا۔ اس تفریق وامتیاز کی وجہ کیا ہے؟

سوانح نگار یہ کیسے پوچھتے؟ ملازمت کی بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں یا مطابق مشہور قول "عربی پٹے تازی کانپے" کا حادثہ رونما ہوا لیکن انصاف پسند مؤرخ اس سوال کو ضرور اٹھائے گا اور کچھ نہ سہی تو بروز حشر، داور محشر تو ضروری نمٹے گا۔

اب گورستانِ قاسمی میں آپ کو ایک ایسا تودہ خاک ملے گا جس سے اگر آپ کان لگائیں تو مدھم اور مغموم لہجہ میں یہ سنا جا سکتا ہے ؎

قبر میں حسرت وارمان غنیمت ہیں اے داغ
رفتہ رفتہ اِن ہی یاروں سے بہل جاؤں گا

یہ آواز اس فریب خوردہ کی ہے جو اصلاح کے ارمان اور ان ارمانوں کی عدم تکمیل کی حسرت کے ساتھ، دنیا کے دون سے منھ موڑ گیا (فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ فانہ کان عبداً صبوراً)

نوٹ

مندرجہ بالا مضمون میں مولانا انظر شاہ مدظلہ العالی کا انداز اس تقریر سے نمایاں طور پر مختلف ہے جو انھوں نے ۶۔مئی ۱۹۹۵ء کو مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام دہلی میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں فرمائی تھی۔ غالباً بلاغت (موقع ومحل کی رعایت) اسی کو کہتے ہیں۔ مذکورہ تقریر کا متن حسب ذیل ہے ——— ادارہ

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

"مولانا کشمیری نے فرمایا کہ یہ جلسہ ہائے تعزیت جو دہلی یا ہند و بیرون ہند میں ہو رہے ہیں مولانا وحیدالزماں مرحوم کے تلامذہ و محبین کے جذبات عقیدت کا مظہر ہیں لیکن اصل جلسۂ تعزیت تو دارالعلوم دیوبند میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ مولانا نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، اپنے خون کا ایک ایک قطرہ دارالعلوم کی تعمیر میں صرف کیا۔ وہ دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کے معمار تھے مگر افسوس کہ دارالعلوم نے ان کو فراموش کر دیا۔ یہ ایک تاریخی المیہ ہے اور آنے والا مؤرخ اگر انصاف سے کام لے گا تو اس ظلم کو فراموش نہیں کرے گا اور اس عنوان سے خاموشی کے ساتھ نہیں گذرے گا

مولانا نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ اس جلسۂ تعزیت میں یوں تو سب موجود ہیں یقیناً یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل و دماغ میں مولانا کی عظمتوں کے نقوش قائم ہیں لیکن وہ تو یہاں موجود نہیں جن کے لیے مولانا نے اپنی زندگی کو قربان کیا، اپنے آرام و راحت کو تج دیا، اپنے مستقبل کو برباد کیا! جن کے لیے مولانا نے ایثار و قربانی، جد و جہد اور مجاہدہ کی ایک حسین و جمیل اور پرشکوہ تاریخ بنائی!! یہ ظلم اور زیادتی ہے کہ اپنے محسن کو اتنی جلد فراموش کر دیا جائے۔ محسن کو فراموش کرنے والے چاہے عارضی آب و تاب حاصل کر لیں لیکن دنیا ایک دن ان سے انتقام لیتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ دنیا ان سے انتقام لے کر رہے گی۔

مولانا نے کہا کہ اس اسٹیج پر کچھ لوگ مولانا سے بڑے ہوں گے، کچھ ان سے چھوٹے ہوں گے لیکن غالباً میں واحد شخص ہوں جو مولانا کا رفیق درس رہا ہے اور جس نے مولانا کی طالب علمی کی زندگی دیکھی، ان کا عسر و یسر دیکھا، ان کا عروج دیکھا اور پھر ان کو زبردستی ایک خوفناک و المناک زوال میں مبتلا کرنے کی کوشش کا بھی مشاہدہ کیا۔ میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انھوں نے عسر کے باوجود کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے توکل، اپنی عزت نفس اور قناعت کو جو ان کے قلب و روح میں ودیعت تھی کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔

مولانا موصوف نے زور دے کر کہا کہ مولانا وحیدالزماںؒ اپنے بڑوں کی شان میں قطعاً گستاخ نہیں تھے، وہ جس بات کو حق سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے لیکن اگر کبھی ان سے چوک ہو جاتی اور پھر انھیں معلوم ہو جاتا کہ سیدھی راہ یہ نہیں بلکہ وہ ہے تو مولانا کو راہ بدلنے اور صراط مستقیم کے اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ مجھے بارہا اس کا تجربہ ہے۔

مولانا کا ذہن انقلابی اور تعمیری تھا، وہ جدّوجہد کے خوگر تھے لیکن ان میں ضد اور ہٹ دھرمی یا کسی کی توہین کا جذبہ بالکل نہیں تھا۔ اگر وہ دیکھتے کہ کسی معاملہ میں انصاف دوسری جانب ہے تو اپنے فیصلے سے رجوع کرنے میں نہ ان کو حجاب محسوس ہوتا تھا نہ عار۔

مولانا کشمیری نے فرمایا کہ مولانا وحید الزماں ایک مردم ساز شخصیت تھے اور مردم ساز شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ عالم، علامہ، بحر العلوم اور ملک العلماء بہت مل جاتے ہیں لیکن مردم ساز شخصیتیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے کہا کہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں، خود دیوبند کے سوا سو سالہ دور میں مردم ساز شخصیتیں دو چار ہی ہوئی ہیں جن میں ایک مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی شخصیت تھی اور (بیچ کی کڑیوں کو چھوڑتے ہوئے) دوسری شخصیت مولانا وحید الزماں صاحب کی تھی۔

مولانا انظر شاہ نے فرمایا کہ آپ یوں نہ کہیے کہ مولانا وحید الزماں صاحب علامہ، بحر العلوم اور ملک العلماء تھے، وہ سب کچھ تھے لیکن ان کا اصل جوہر یہ تھا کہ وہ انسان کو انسان بناتے تھے۔ اپنی دیدہ وری اور تربیت سے وہ بہت سی زندگیوں کو سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔

مولانا نے مزید کہا کہ جہاں تک یادگار کا معاملہ ہے تو کان کھول کر سن لیا جائے کہ مولانا وحید الزماں کسی کے محتاج نہیں ہیں، انھیں زندہ رکھنے کے لیے تو "القاموس الجدید" اور ان کی دوسری تالیفات ہی کافی ہیں۔ اگر آپ ان کو یاد رکھنے کے لیے کوئی یادگار قائم کرتے ہیں تو ان پر کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ان کے غیر معمولی احسانات کے تئیں آپ کی ممنونیت کا معمولی اظہار ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ مولانا مرحوم کے بہت سے تلامذہ ہند و بیرونِ ہند میں عہدہ ہائے جلیل پر فائز ہیں، انھیں چاہیے کہ مولانا کی یادگار باقی رکھیں اور ایسی صورت میں تو مولانا وحید الزماں صاحب کو زندہ رکھنا اور پایندہ بنانا اور ضروری ہو جاتا ہے کہ جب ایک ادارہ اور اس کے ارباب حل وعقد ان کو فنا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مولانا کے تلامذہ اور محبین کا فرض ہے کہ ان کو زندہ رکھنے کی جد وجہد کریں۔

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

مولانا وحید الزماں اور دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کے دور میں سب سے بڑا کارنامہ صد سالہ اجلاس تھا، جس میں حضرت قاری صاحب نے خود اپنی تین نسلوں کی دستار بندی دیکھی اور حضرت شیخ الحدیث صاحب نے خود اس بڑھاپے میں قاری صاحب کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی تھی ـــــ حضرت قاری صاحب کے دور کی تاریخ مؤرخ لکھے گا تو اسے بڑی تفصیل سے لکھنا ہوگا تب جا کر حق ادا کر سکے گا ـــــ مگر اجلاس صد سالہ میں اور اس کے بعد مولانا وحید الزماںؒ صاحب نے دار العلوم کے لیے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ اس کو مختصر مختصر طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تاریخ بہر حال تاریخ ہے بقول مولانا انظر شاہ صاحب کے ایک بے رحم تلوار ہے جو کسی کی رعایت نہیں کرتی اس لیے تمام متعلقین دار العلوم سے معافی کے ساتھ قلم اٹھا رہا ہوں۔ اس سے آپ معلوم کر سکیں گے کہ دار العلوم میں مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی کیا حیثیت تھی۔ دار العلوم کو سنبھالنے کے لیے انھوں نے کیا کچھ کیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے وہ حضرت قاریؒ صاحب سے علیحدہ ہو کر کام کرنے لگے اور کہاں تک پہونچے۔

صد سالہ اجلاس ۱۴۰۰ھ میں ہوا تھا جس کو آج ۱۴۱۶ھ میں ۱۶ برس پورے ہو چکے ہیں۔ روئے زمین پر اسلامی اجتماعات میں یہ ایک نمایاں اجلاس تھا جس میں عالمی پیمانے کے اہل علم، اہل دل اور اہل قلم سر کے بل آئے تھے۔ مولانا وحید الزماں صاحبؒ اجلاس کی متعدد کمیٹیوں کے کنوینر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی عربی دانی، خطابت اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اجلاس کی کارروائی چلانے کے ذمہ دار بھی بنائے گئے تھے مگر کاموں کے ہجوم میں اس قدر بیمار ہوئے کہ اجلاس تک پہونچ بھی نہ سکے پھر بھی ایک ایک منٹ سے واقفیت رکھتے تھے۔

• صدر تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند و مہتمم دار العلوم گورکھپور

اجلاس کا جو پروگرام پہلے بنا تھا اس میں کئی باتوں میں ایک بات تنظیم ابنائے قدیم کی تجویز بھی تھی مگر نامعلوم اسباب کی وجہ سے نہ مجلس مضامین بلائی گئی، نہ تجاویز تیار کی گئیں، تو مایوس ہوکر ۲۲ مارچ ۸۰ء کو ہم لوگوں نے ایک اشتہار چھاپ کر بانٹ دیا کہ آج شام کو ۴ بجے معراج گیٹ کے پاس والے خیمے میں آزادانہ طور سے ابنائے قدیم کی تنظیم کی جائے گی، چنانچہ پاکستان، افغانستان، افریقہ اور ہندوستان سے گجرات، اترپردیش اور آسام وغیرہ کے ہزاروں فرزندانِ دارالعلوم ٹوٹ پڑے اور مغرب سے پہلے تک عالمی مؤتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند" قائم کردی گئی۔ پاکستان کے مفتی محمود صاحبؒ اور ہندوستان کے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سرپرست بنائے گئے، مولانا اسعد صاحب صدر اور مولانا قاضی زین العابدین صاحب ناظم عمومی۔ قاضی صاحب ہی نے تنظیم کی تحریک کی تھی اور اس کی تجویز مرتب کرکے دفتر اہتمام کو پیش کی تھی مگر وہ نظر انداز کردی گئی تھی۔ ۲۲ مارچ کی صبح کو اعلان کے مطابق عالمی مؤتمر کے دفتر کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس میں مولانا علی میاں نے بھی شرکت فرمائی۔ شام کو مفتی محمود صاحب موصوف کی قیام گاہ پر مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا۔ اس میں مولانا وحید الزماں صاحب ممبر نامزد کیے گئے اور وہیں ہندوستان کے مختلف صوبوں اور بیرونی ملکوں کے لیے کنوینر نامزد کیے گئے۔ دوسرے ضروری فیصلے بھی میں نے خود تحریر کیے تھے۔

اجلاس کے ۱۵ دن بعد دہلی میں دارالعلوم دیوبند کے دفتر رابطہ کی جانب سے ۸ اپریل ۸۰ء کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ اجلاس کے اندر کئی تجویزوں کے ساتھ ابنائے قدیم کی تنظیم کی تجویز بھی پاس ہوئی تھی جس کے صدر حضرت حکیم الاسلام بنائے گئے۔ اس تنظیم کا نام "تنظیم فضلاء و ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند" تھا۔ اس اخباری اطلاع سے ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اجلاس میں کوئی تجویز بھی پاس ہوئی تھی اور یہ کہ ابنائے قدیم کی تنظیم کی تجویز بھی پاس ہوچکی ہے۔ گویا وہ فضلائے دیوبند کی آزادانہ تنظیم نہیں بلکہ دفتر اہتمام کی سرکاری تنظیم ہے اور عالمی مؤتمر کے بالمقابل قائم کی گئی ہے۔

تصادم کے اسباب

جب فرزندانِ دارالعلوم کی دو تنظیمیں قائم ہوگئیں تو قدرتاً پہلے فضلاء تقسیم ہوئے پھر ایک ایک صوبہ اور پورا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا حتیٰ کہ دارالعلوم کے بڑے طلبہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ "عالمی مؤتمر" نے ماہنامہ "القاسم" جاری کرکے نشر و اشاعت اور تنقید و تبصرہ

کا کام شروع کر دیا اور "تنظیم فضلاء" نے امام انقلاب دہلی اور دیوبند ٹائمز جیسے ہفتہ وار رسالوں سے کام لینا شروع کر دیا اور انھیں آب حیات پلا کر میدانِ جنگ میں آتار دیا تو گرم گرم سرخیوں، تیز تند جملوں اور جلی کٹی باتوں کا طومار لگ گیا۔ اس طرح دارالعلوم کی اندرونی ہر حرکت و عمل کی خبریں دیوبند سے اڑ کر دہلی بمبئی اور کلکتہ تک بے پر کے اڑنے لگیں اور ہر طرف ایک فضیحتہ کھڑا ہوتا چلا گیا۔

۲۲ راپریل ۸۰ء کو دفتر اہتمام نے اساتذۂ دارالعلوم کی میٹنگ کر کے فرمائش کی کہ آپ سب لوگ "تنظیم فضلاء و ابنائے قدیم" کو مضبوط کریں اور اس کی آواز دور دور تک پھیلا دیں۔ اس پر مولانا معراج الحق صاحب اور مولانا وحید الزماں صاحب نے فرمایا اور دوسرے اہم اساتذہ بھی کہنے لگے کہ پہلے آپ تنظیم فضلاء کی تجویز کو مجلس شوریٰ سے منظور کرائیے تب ہم پر نافذ ہوگی۔ چنانچہ ۲۴ راپریل ۸۰ء کیلئے اسی وقت مجلس شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ طے کر دی گئی اور وہ بلا بھی لی گئی لیکن ممبران شوریٰ اس میں شریک نہ ہو سکے لہذا میٹنگ ملتوی کر دی گئی مگر ۲۵ راپریل کو اہتمام نے اعلان کر دیا کہ تنظیم کے لیے مولانا اخلاق حسین قاسمی ناظم اعلیٰ ہوں گے۔

۳۰ راپریل ۸۰ء کو مراد آباد میں عالمی مؤتمر کا ریاستی اجلاس تھا۔ پہلا اجلاس تھا اس لیے فضلاء نے توجہ فرمائی تو دفتر اہتمام نے ۳۰ راپریل کو جلسہ تقسیم انعام رکھ دیا اور اس تاکید کے ساتھ کہ تمام متعلقین دارالعلوم اس میں حاضر رہیں۔ اہتمام کے پیشکار مولوی عبدالحق نے اعیان مراد آباد کو بقلم خود خطوط لکھ لکھ کر اجلاس میں شرکت سے روکا۔ ایک خط میں نے بھی وہاں دیکھا تھا اور پیشکار کی اس جسارت پر حیرت ہوئی تھی۔ اتنے امتناعی احکام کے باوجود مولانا معراج الحق اور مولانا وحید الزماں صاحبان مراد آباد کے اجلاس میں شریک ہوئے اور وہ بحمدللہ بہت کامیاب رہا، پھر پورے ملک میں شاخیں قائم ہونے لگیں۔

اندرونی خلفشار

مئی ۸۰ء میں پیشکار کی پوتی کی شادی تھی۔ بارات دارالعلوم کے مہمان خانے میں ٹھہرائی گئی اور وہاں وہ سب کچھ ہوا جو باراتوں میں رواج ہے۔ دارالعلوم کی بجلی ہی نہیں بلکہ بجلی کا پورا عملہ اس میں مشغول ہو گیا۔ حتیٰ کہ جنریٹر سے بھی شام کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا بلکہ بارات میں اسے مصروف کر دیا گیا کیونکہ اہتمام کے پیشکار کی پوتی کی بارات تھی۔ مولانا سید پالنپوری سبق پڑھا رہے تھے اسی دوران بجلی چلی گئی اور جنریٹر مہمان خانے میں مشغول تھا۔ جب طلباء نے شکایت کی تو انھیں

گستاخ اور سرکش قرار دیا گیا۔ مولانا نصیر احمد صاحب نائب مہتمم سے کہا گیا تو فرمایا کہ پیشکار صاحب کے یہاں کام ہو رہا ہے۔ جب یے حسی اس حد تک پہونچ گئی تو دار جدید میں جمع ہو کر طلبار نے احتجاج کیا اور چند تجویزیں پاس کرکے دفتر اہتمام میں تحریری شکایت پہونچا دی تو پیشکار کے دفتر نے طلبار کو شورش پسند، غنڈہ اور امن دشمن قرار دے کر ایک انکوائری کمیٹی بٹھا دی۔ اس کا کام تھا احتجاج کرنے والوں میں جو لیڈر تھے ان کے نام، ان کے کمرول اور ان کے حالات کی فہرست بناکر دفتر اہتمام میں پیش کرنا۔

انکوائری کمیٹی رات میں کمروں پر جاکر پوچھ گچھ کرنے لگی۔ ایک آسامی لڑکے وہاج الدین نے اس میں مداخلت کی تو رات میں اس کے کمرے پر غنڈوں نے پہونچ کر اس کی خوب پٹائی کی اور پکڑ کر دارالعلوم لائے اور شرپسندی کے الزام میں اسے پولس کے سپرد کر دیا گیا۔ صبح کو جب طلبار کو معلوم ہوا تو پیشکار وغیرہ کے خلاف دارالعلوم کے طلبار نے خوب نعرے لگائے اور آسامی طلبار نے سخت احتجاج کے لیے اطراف و جوانب کے آسامی اور بنگالی طلبار کو بلالیا۔ اس سے گھبراکر مولانا انظر شاہ نے کوتوالی جاکر وہاج الدین کو واپس لانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا کہ آپ ہی نے رات میں بند کرایا ہے پھر آپ ہی چھڑانے آئے ہیں۔ تب مولانا نصیر احمد نے دارالعلوم کی لاج رکھنے کے لیے اس کو راضی کیا اور اپنے ساتھ لائے۔ شام تک ہنگامہ رفع دفع ہو گیا۔

اس طرح ماحول میں انتشار شدید کی اور غصہ بڑھتا چلا گیا۔ اتنے میں دفتر اہتمام نے ۷۔۸۔۹ جون ۸۰ء کو ہنگامی مجلس شوریٰ طلب کرلی تو دونوں طرف تیاریاں شروع ہو گئیں، لمبی لمبی اسکیمیں بننے لگیں اور طاقت آزمائی کے لیے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لانے کی آمادگی ظاہر ہونے لگی۔

شوریٰ کا ماحول

۷ جون کو دارالعلوم کا مہمان خانہ، شوریٰ کے ممبران، ملاقاتیوں اور رقد دانوں سے بھر گیا۔ ان میں بہت سے اجنبی اور نامانوس چہرے بھی نظر آئے جن کو "مجلس تحفظ دارالعلوم" نے باہر سے طلب کیا تھا جس کے کرتا دھرتا مولانا محمد سالم صاحب کے داماد اعجاز صاحب تھے۔ اس ماحول میں عالمی مؤتمر کے جنرل سکریٹری قاضی زین العابدین صاحب آگئے۔ ان کے آنے کے بعد چند لوگوں نے ان سے سوال جواب شروع کر دیئے، کچھ نے قہقہے لگائے مگر قاضی صاحب کے صاحبزادے اور دارالعلوم کے طلبار قاضی صاحب کو اپنے ساتھ الگ لے کر چلے گئے۔ پھر مغرب بعد قاضی

صاحب کو چند نوجوانوں نے گھیر لیا اور ان سے سوالات شروع کر دیئے۔ ادھر اعجاز صاحب پروپیگنڈہ سکریٹری نے کھڑے ہو کر مہمان خانے کا گیٹ بند کرا دیا اور پہرے دار مقرر کر دیئے۔ اتنے میں طلباء نے مولانا وحید الزماں کو اطلاع دے دی کہ قاضی صاحب کو لوگوں نے گھیر رکھا ہے۔ مولانا اپنے گھر جا رہے تھے، راستے میں سے واپس آ گئے تو مہمان خانہ بند تھا، پہرہ دار کھڑے تھے مگر وہ مولانا وحید الزماں تھے، انھیں اندر جانے سے کوئی روک نہیں سکا۔ انھوں نے گھیرا توڑ کر قاضی صاحب کو غنڈوں کے نرغہ سے نکالا اور چند طلباء اور ان کے صاحبزادے کی مدد سے مہمان خانے سے باہر لے گئے اور مولانا اسعد صاحب کے مکان کی طرف بھیج دیا۔ خدا کا شکر کہ نہ کوئی تصادم ہوا، نہ مولانا وحید الزماں صاحب کو کسی طرح روکا جا سکا۔ یہ تھے مولانا وحید الزماں۔

۸ جون ۸۰ء کی صبح آئی تو مولانا اسعد صاحب ہمت کر کے حضرت قاری صاحب کے گھر پر گئے اور اپنے ہمراہ صاحبزادہ محترم مولانا اسلم صاحب کو لے لیا جو نسبتاً سنجیدہ اور سلجھے ہوئے ہیں۔ مولانا نے آدھ گھنٹے قاری صاحب سے گفتگو کی اور کہا کہ دارالعلوم کو ناپسندیدہ لوگوں سے بچائیے اور اس علمی ادارے کو سنجیدگی، متانت اور یکسوئی سے چلنے کے لیے اقدام کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اگر مؤتمر اور تنظیم کا جھگڑا ہے تو ہم اسے ختم کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ حضرت قاری صاحب بہت خوش ہوئے، فرمایا کہ میں بھی غور کروں گا اور ممبران شوریٰ کے سامنے بھی رکھوں گا۔

صبح کے اجلاس میں حضرت قاری صاحب نے مجلس شوریٰ کو متوجہ کیا تو وہ لوگ رات کے واقعات سے متاثر تھے۔ سب نے طے کر دیا کہ آج ہی شام کو ممبران کی ایک کمیٹی مؤتمر کے نمائندوں سے گفتگو کر کے کوئی لائحہ عمل طے کر دے۔ اس کے لیے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری کو نمائندگی دے دی گئی کہ وہ بات چیت کریں۔

ظہر بعد مولانا اسعد صاحب کو مہمان خانے میں بلایا گیا کہ شوریٰ کے نمائندوں سے گفتگو کرنے کے لیے آپ اور آپ کا نمائندہ آ جائے، چنانچہ مولانا اسعد صاحب اور راقم الحروف افضال الحق قاسمی مہمان خانہ گئے، وہاں حضرت قاری صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ گفتگو کا آغاز حضرت امیر شریعت نے کیا۔ بات سنجیدہ، معاملاتی اور لب و لہجہ خوشگوار تھا اور عصر کی اذان تک دونوں میں مصالحت طے ہو گئی۔ چند نکات پر اتفاق رائے ہو گیا۔ فارمولا میں نے لکھا تھا جس کی نقل کر کے امیر شریعت صاحب کے حوالہ کر دی۔ پھر انھوں نے اصل تحریر دیکھی اور مسکرا کر اصل واپس کر دی، نقل رکھ لی۔

مصالحت کا فارمولا

طے شدہ امور یہ تھے (۱) عالمی مؤتمر اور تنظیم فضلاء دو ابناء قدیم دونوں ایک کردی گئیں اور دونوں کے صدر حضرت قاری صاحب ہوں گے، مولانا اسعد صاحب نائب صدر رہیں گے۔ (۲) مجلس عاملہ ۲۱ ارکان کی ہوگی۔ اس میں ۱۲-۱۲ دونوں طرف کے افراد ہوں گے۔ باقی ارکان غیر ممالک سے پورے ہوں گے (۳) ناظم اعلیٰ مولانا قاضی زین العابدین ہوں گے۔ (۴) ایک ناظم مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی ہوں گے۔ دو نظار کا تقرر صدر محترم کریں گے۔ (۵) خازن حضرت قاری صاحب نامزد کریں گے۔ (۶) صدر دفتر دیوبند میں ہوگا۔ وغیرہ۔

چلتے چلاتے حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ دو طرفہ نشر و اشاعت بند کردی جائے اور عشاء کے بعد بیٹھ کر دوسری ضروری باتیں طے کرلی جائیں، سب کے دستخط ہو جائیں اور مشترکہ اعلانیہ جاری کردیا جائے۔ ہم دونوں تینوں حضرات سے مصافحہ کرکے مدنی مسجد واپس آگئے، اور انہیں بہت مسرور اور مطمئن چھوڑ کر لوٹے۔

ہمارے بغیر کیسی مصالحت

عشاء بعد ہم دونوں پھر مہمان خانے جانا چاہتے تھے جب تک یہ منحوس خبر آگئی کہ مہمان خانے میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا انظر شاہ صاحب اور مولانا سالم صاحب نے حضرت قاری صاحب اور حضرت مولانا رحمانی سے بحث شروع کردی کہ ہمارے بغیر صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ اس میں ناظم اعلیٰ دو رہیں گے، نائب صدر دو ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ہماری ترمیم آپ اس میں شامل نہیں کریں گے ہم کوئی مصالحت چلنے نہیں دیں گے۔

کمرے کے اندر یہ باتیں چل رہی تھیں اور کمرے کے باہر صحن میں عبدالقیوم میرٹھی نام کے ایک صاحب نے جو مجلس تحفظ دارالعلوم کی طرف سے بلائے گئے تھے۔ اساتذہ کا نام لے لے کر جو اس شروع کردی اور گالیوں پر اتر آیا تو کسی طالب علم نے اُسے ٹوک دیا۔ اس پر وہ برہم ہوگیا اور لڑکے پر ہاتھ چلا دیا۔ یہ دیکھ کر دوسرے طلباء متوجہ ہوگئے، اور عبدالقیوم کو پکڑنا چاہا مگر وہ صحن سے برآمدے کی طرف بھاگ کر ایسا غائب ہوا کہ اوپر نیچے، دائیں بائیں کہیں پتہ نہیں چلا۔ بعد کو دیکھا گیا کہ مہمان خانے میں پیچھے کی طرف ایک سیڑھی کا انتظام تھا جس سے اتر کر وہ چھپتا چھپاتا

قاری صاحب کے گھر کی طرف چلا گیا۔
ہنگامہ کی خبر دارالعلوم میں پہونچ گئی تو تمام طلبہ اور اساتذہ مہمان خانہ پہونچ گئے اور طلبہ نے چاروں طرف سے مہمان خانے کو گھیر لیا اور مطالبہ کرنے لگے کہ عبدالقیوم کو ہمارے حوالہ کرو۔
مولانا معراج الحق صاحب، مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا ریاست علی صاحب، مولانا سید حسن صاحب نے صورت حال نازک دیکھی تو مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کردیا کہ تمام طلبہ فوراً دارِ جدید میں آجائیں، اساتذہ تقریر کریں گے۔ چنانچہ طلبار مہمان خانہ چھوڑ کر دارِ جدید آنے لگے تو انتظامیہ کی طرف سے پولیس پر زور دیا گیا کہ ان پر لاٹھی چارج کرے، یہ شورش پسند ہیں مگر پولیس کسی کے چکمے میں نہیں آئی، طلبار کو دارِ جدید جانے دیا۔ وہاں مولانا معراج الحق صاحب، مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا ریاست صاحب وغیرہ نے تقریریں کر کے طلبار سے کہا کہ تم مشتعل نہ ہو، عبدالقیوم کا معاملہ ہمارے سپرد کرو، تم جا کر اپنے اپنے کمرے میں آرام کرو اور سالانہ امتحان کی تیاری کرو۔ اس پر طلبار واپس چلے گئے۔ ۱۲ بجے رات کے بعد بالکل سکون ہوگیا۔

ریڈیو کی بکواس

صبح صبح حضرت قاری صاحب مہمان خانے آئے تو معلوم ہوا کہ تمام ممبران شوریٰ دارالعلوم کی گاڑی سے دہلی چلے گئے، صرف مولانا مرغوب الرحمٰن ملے۔ قاری صاحب اُن سے باتیں کرنے لگے اور پھر اساتذہ کو بلا کر سالانہ امتحان کے متعلق مشورہ فرمایا۔ ادھر ریڈیو اور اخبارات نے صبح کو بتایا کہ دارالعلوم کے طلبار کے دو گروہوں میں تصادم کی وجہ سے دارالعلوم بند کردیا گیا، پولیس کے حوالہ کردیا گیا، پولیس نے ہاسٹل خالی کرا کے دارالعلوم بند کردیا (خبر پی ٹی آئی کی تھی اور دیوبند سے ناظم نشر و اشاعت اعجاز صاحب کی تھی) ہم لوگوں نے اور شہر والوں نے آکر دیکھا تو دارالعلوم حسب سابق چل رہا تھا، تعلیم جاری تھی، مگر سارے مُلک میں خبر پھیلا دی گئی کہ دارالعلوم بند کردیا گیا۔ پولیس والوں کو بھی حیرت ہو گئی کہ ایسے ذمہ دار دینی ادارے سے ایسی بے بنیاد خبریں، ہمارا قبضہ اور ہمیں ہی نہیں معلوم۔ مگر اس سے اندازہ ہوا کہ اربابِ دارالعلوم کہاں تک جانا چاہتے ہیں اور کس طرح۔ استغفراللہ
حضرت قاری صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد مہمان خانے میں اکابر اساتذہ کو بلوایا تو ۱۲ حضرات آگئے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن کی موجودگی میں حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ طلبار نے امتحان

منسوخ کرنے کی درخواست دی ہے۔ رجب کا مہینہ چل رہا ہے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔ پھر بحث و تمحیص کے بعد طے ہو گیا کہ اجلاس کی وجہ سے پڑھائی بھی کم ہوئی ہے اس لیے شعبان کے بجائے رجب ہی سے سالانہ تعطیل کر دی جائے اور امتحانات معاف کر دیے جائیں۔ چنانچہ اہتمام سے اعلان ہو گیا اور طلباء وطن جانے لگے۔ مگر تیسرے دن اخبارات میں پھر خبر آئی خصوصاً "پرتاپ" اخبار دہلی نے لکھا کہ "اعجاز حسین صاحب (ناظم نشر و اشاعت دارالعلوم) نے خبر دی ہے کہ شورش پسندوں سے مجبور ہو کر امتحان سالانہ منسوخ کرنا پڑا اور دارالعلوم بند کر دیا گیا۔"

تعطیل ضرور ہوئی مگر دارالعلوم اس وجہ سے کھلا ہوا تھا کہ کئی سو لڑکے ابھی موجود تھے۔ اچانک تعطیل ہو جانے کی وجہ سے سفر کے مصارف کے منتظر تھے اور کچھ طلبہ ہمیشہ کی طرح دارالعلوم میں رمضان گذارتے ہیں۔

رجب میں تعطیل ہوئی تو اس سے تین ہفتہ پہلے طلباء دارالعلوم کی صوبائی و ضلعی انجمنوں کے صدور و نظماء نے ایک جلسہ منعقد کر کے مرکزی جمعیۃ الطلبہ کے قیام کا پُر زور مطالبہ کیا کیوں کہ اس سے ایک ماہ پہلے چھتہ مسجد میں "مرادآبادیوں" کو جمع کر کے مولانا انظر شاہ صاحب نے طلبہ کی ایک جمعیۃ قائم کی تھی جس کا نام جمعیۃ الاتحاد" رکھا تھا اور یہ سب امتحان کی منسوخی کے طالب تھے جو ہو گیا۔

سالانہ تعطیل کے بعد دارالعلوم ۸ کے بجائے ۲۰ شوال کو کھولا گیا اور ۴۸ طلبہ کے اخراج کی پہلی فہرست آویزاں کر دی گئی، دوسری مرتب ہو رہی تھی۔ قدیم طلبہ کا اصرار تھا کہ اخراج واپس لیا جائے اور انتظامیہ کو اصرار تھا کہ ان باغیوں کو اور ان کے ساتھیوں کو ضرور خارج کرایا جائے۔ اس سلسلے میں طلبہ کے مختلف وفود حضرت قاری صاحب سے ملے، انہیں درخواستیں دیں، اپنی صورتِ حال کی تحریری و زبانی وضاحت بار بار کی گئی۔ فضا دونوں طرف سے گرم ہونے لگی۔ ایک دن مغرب بعد مولانا وحید الزماں صاحب حضرت قاری صاحب کے گھر حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ آپ کچھ اس طرح کے اقدام کریں کہ سکون بحال ہو جائے تاکہ تعلیم شروع ہو سکے قاری صاحب نے فرمایا کہ "میرا مزاج بھی سنجیدگی و سکون سے کام کرنے کا ہے اس لیے میں نے مفتی (عتیق الرحمٰن) صاحب وغیرہ سے کہہ دیا ہے کہ اگر آپ لوگوں کو لڑنا ہی ہے تو کمانڈر بدل لیجیے اور صلح رکھنی ہے تو مجھے مزید اختیارات دیجیے۔" اس کے بعد رشید مسعود ایم۔ پی آ گئے دوسرے تیسرے دن ڈاکٹر اعظمی اور مولانا سید احمد ہاشمی آ گئے، اسی طرح مختلف وفود آئے

اور سب نے امن وسکون بحال کرنے کے لیے مختلف تجاویز رکھیں اور اہتمام اور طلبار کے درمیان مسائل حل کرنے کے لیے جمعیۃ الطلبہ نہیں تو رابطہ کمیٹی پر اصرار کیا۔

اواخر شوال ۱۴۰۱ھ میں جمعیۃ الطلبہ کے قانونی وغیر قانونی ہونے کی بحث جاری تھی کہ مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا وحید الزماں صاحب کے یہاں آئے اور اصرار کیا کہ آپ میرے کمرے پر آیئے کوئی راہ نکالی جائے۔ مولانا وہاں پہونچے تو مولانا انظر شاہ صاحب موجود تھے دو گھنٹے کے بعد مجلس ختم ہوئی تو یہ حضرات ایک مصالحت کے فارمولے پر دستخط کرچکے تھے جو دس دفعات پر مشتمل تھا۔ اہم دفعات یہ تھیں:-

(۱) دورۂ حدیث کے طلبار کا اخراج نہ کیا جائے، انھیں سند دے کر رخصت کردیا جائے۔ (۲) باقی طلبار کی تفتیش کرکے فیصلے کیے جائیں۔ (۳) جمعیۃ الطلبہ کی جگہ ۷ رکنی رابطہ کمیٹی مقرر کی جائے (۴) تنقید و تبصرہ دونوں طرف سے بند کردیئے جائیں بقیہ معاملات داخل دفتر کیے جائیں۔

مولانا انظر شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں کل اس صلح نامے کی منظوری حضرت قاری صاحب سے لوں گا۔ اسی دن صدر المدرسین مولانا فخر الحسن صاحب کا انتقال ہوگیا تو مراد آبادی طلبار کی طرف سے جلسۂ تعزیت کیا گیا۔ طلبار نے بھی صلح نامے پر مبارکباد دینے کے لیے دارالحدیث میں ایک جلسہ کا اعلان کر رکھا تھا مگر مولانا وحید الزماں اور مولانا معراج الحق صاحب نے اس جلسہ کو منسوخ کرادیا تاکہ کہیں طلبار میں تصادم نہ ہوجائے۔

تعزیتی جلسہ میں شہری حضرات بھی تشریف لائے اور وہ شرپسند عناصر بھی آئے جن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ دارالعلوم کے اندر نہ آیا کریں مگر وہ آئے اور کوئی پلان بنا کر لائے؛ چنانچہ دفتر اہتمام کے حامی کچھ طلبار نے احاطہ مولسری میں بعض اساتذہ کا نام لے کر برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ جب طلبار نے روکا ٹوکا تو ہاتھا پائی شروع ہوگئی مگر جب طلبار ہجوم کرکے آنے لگے تو زبان درازی کرنے والے وہ طلبار ادھر ادھر بھاگنے لگے اور لڑکوں نے تعاقب کرنا شروع کردیا۔ ان میں سے اکثر پھاٹک سے نکل کر شہر میں بھاگ گئے، کچھ ادھر ادھر چھپ گئے۔ طلبار نے آکر صدر گیٹ کو بند کردیا کہ شہری عناصر نہ آسکیں اور شہر والوں سے خواہ مخواہ کوئی تصادم نہ ہوجائے۔ مولانا وحید الزماں صاحب کو معلوم ہوا تو گھر سے صدر گیٹ پر آئے۔ چند لڑکے وہاں پہرہ دے رہے تھے ان سے معلوم ہوا کہ شہر والوں سے تصادم کا خطرہ ہے اس لیے اپنی حفاظت

کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے حکم دیا کہ دروازہ بند رکھو لیکن کھڑکی کھول دو، وہ صبح تک کھلی رہے۔ پھر پولیس آئی تو طلبا نے ان سے بھی یہی کہا اور انھوں نے دیکھا کہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور چند طلبا پہرہ دے رہے ہیں باقی طلبا اپنے اپنے کمروں میں ہیں اور یہاں اساتذہ بھی نہیں ہیں تو پولیس والے چلے گئے۔ ۲ بجے رات کو کوتوال نے مولانا وحید الزماں کے یہاں جاکر بات کی پھر صدر گیٹ پر آکر صورتِ حال دیکھی تو مطمئن ہو کر چلا گیا کہ یہ لوگ جھگڑا نہیں کرنا چاہتے، صرف روکنا چاہتے ہیں کہ کہیں تصادم نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء کا ہے۔ صبح ہوئی تو پھاٹک کھلے ہوئے تھے اور سارے دارالعلوم میں سکوت تھا مگر دوسرے تیسرے دن صبح صبح اخبارات میں شاہ سرخیوں سے خبر آئی کہ (۱) مولانا وحید الزماں اور مولانا معراج الحق وغیرہ نے دارالعلوم پر قبضہ جمانے کے لیے دارالعلوم کے پھاٹک بند کرائے، (۲) معزز شہریوں پر حملے کیے گئے اور طلبار کی طرف سے دارالعلوم میں توڑ پھوڑ کی گئی ـــــ وغیرہ۔ پھر ان اخبارات کے ضمیمے چھاپ کر گاؤں گاؤں تقسیم کرائے گئے اور ملک بھر میں پہونچا دیے گئے جبکہ اصل قصہ وہی تھا جو ابھی گذرا ہے مگر پروپیگنڈہ کا خدا بھلا کرے اس نے دارالعلوم میں اندر سے لے کر باہر تک کا سکون غارت کر رکھا تھا اور جھوٹ سچ کی تمیز ختم کر دی تھی۔

دراصل وہ دنیا کو باور کرانا چاہتے تھے کہ دارالعلوم میں خونخوار لوگ موجود ہیں اور وہاں کے کچھ اساتذہ بغاوت پھیلا رہے ہیں۔ جب دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے گی تو دارالعلوم کو بند کر دینا اور منمانے طور پر چلانا اور حسبِ منشار لوگوں کو برطرف کر کے چلانا آسان ہو جائے گا۔ رائے عامہ ہمارا ساتھ دے گی اور یہ جذبہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اجلاس صدسالہ کی کامیابی نے ان کو مغرور کر دیا تھا کہ ہم بھی قابلِ فخر ہیں اور اب ہمیں عالمی تائید حاصل ہو جائے گی حالانکہ قابلِ فخر دارالعلوم تھا نہ کہ یہ کارندے۔

اس واقعہ کے بعد اور اخبارات کی خبریں پڑھ کر لوکل حکام، بڑے افسران اور اکابرینِ ملت متوجہ ہوگئے، چنانچہ کلکٹر نے آکر دونوں گروپ کے لیڈروں سے مصالحت اور سکون کی اپیل کی، گفتگو کی اور تجاویز پیش کیں مگر دارالعلوم کے ذمہ داران ۱۸ ستمبر کے واقعات کو بغاوت تسلیم کرنے پر کسی کو آمادہ نہ کر سکے اور مولانا وحید الزماں وغیرہ مؤتمر کی مصالحت، جمعیۃ الطلبہ کی مصالحت کا حوالہ دے کر باور کرا لے گئے کہ یہ ایک واقعہ تھا بغاوت نہیں تھی مگر دارالعلوم والے اپنے مؤقف سے نیچے اترنے کے لیے تیار نہیں ہو سکے اور مولانا معراج اور مولینا

وحید الزماں صاحبان بھی جھوٹ کو سچ ماننے کے لیے آمادہ نہ ہو سکے۔

تین چار دن کے بعد حضرت قاری صاحب نے مولانا وحید الزماں صاحب کو گھر پر بلا بھیجا، وہاں بات چیت کے بعد مصالحت کے فارمولے میں چند ترمیمات کی بات آئی اور وہ تحریری شکل میں مولانا کے سامنے رکھ دی گئیں اور کہہ دیا گیا کہ یا تو آپ اس فارمولے کو تسلیم کرلیں ورنہ ہم دارالعلوم کو بند کردیں گے اور اسے پولیس کے حوالے کردیں گے۔ پھر اندر لے جاکر حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ مولوی وحید الزماں آج تو میری لاج رکھ لو، معاملات کو اس وقت آگے چلنے دو اور پھر جیسا کہو گے کردیا جائے گا۔ اس پر مولانا نے دستخط کردیئے تاکہ دارالعلوم بند نہ ہو، طلباء پریشان نہ ہوں، اساتذہ کا انتشار ختم ہو، پوری جماعت کو بدنامی ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے۔

مولانا کے دستخط کے دوسرے دن انتظامیہ نے جشن فتح منایا، شہر والوں کی دعوت کی اور ایک دوسرے کو مبارکبادیاں دی گئیں کیوں کہ اس نئے فارمولے میں ان کی منشاء بھی پوری ہو رہی تھی اور اسے آگے چل کر اعترافِ جرم کے طور پر پیش کیا جاسکتا تھا چنانچہ حضرت قاری صاحب نے فوراً ایک ہنگامی مجلسِ شوریٰ کے لیے ایجنڈا جاری کردیا۔

مولانا وحید الزماں کے دستخط ۱۲ ذی قعدہ کو ہو سکے تھے جب ستمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ حضرت قاری صاحب نے اس کے فوراً بعد مجلسِ شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ اکتوبر میں طلب کرلی اور اس عزم سے طلب فرمائی کہ دارالعلوم کا اندرونی خلفشار ختم کردیا جائے گا، اگر صلح سے نہیں ہوسکا تو طاقت کے بل پر۔ چنانچہ دفترِ اہتمام نے ایک مفصل رپورٹ مرتب کی اور اسے ۷۰ صفحات پر چھپا کر ۱۱، ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی میٹنگ میں پڑھ کر سنایا اور ان ممبران کو سنایا جو ابھی ۹ جون کو مؤتمر اور تنظیم میں باہمی مصالحت کرا کے گئے تھے اور اس کی ناکامی کے اسباب سے بھی واقف تھے بلکہ فکرمند تھے مگر رپورٹ میں اس قضیئے کو پھر اسی جگہ سے بیان کیا گیا تھا جہاں وہ مصالحت سے پہلے تھا۔ یہ عجیب بات تھی۔

مفصل رپورٹ اور اس کا لب ولہجہ

اس رپورٹ میں دفترِ اہتمام نے (۷) اکابر اساتذہ پر بغاوت کا الزام عائد کیا تھا اور معراج الحق صاحب، مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا ریاست علی صاحب، مولانا سعید احمد پالنپوری

صاحب، مولانا عبدالخالق صاحب جیسے حضرات کو سخت سے سخت سزا کا مستوجب قرار دیا تھا بلکہ مطالبہ کیا تھا مگر کسی سے کبھی جواب بھی طلب نہیں کیا تھا۔

(۲) دارالعلوم میں خلفشار اور بغاوت کی ساری ذمہ دار عالمی مؤتمر کو قرار دیا تھا، پھر اس کے لیے مولانا اسعد صاحب کا نام لے لے کر اور ان کی تقریروں کو پیش کر کے اور سنی سنائی باتوں کو حجت قرار دے کر ایک سماں باندھ دیا تھا۔ یہ تحریر جس غصہ اور جذبہ سے لکھی گئی تھی اس کی حرارت سن کر بھی محسوس ہوتی ہے پڑھ کر بھی۔

(۳) خلفشار کے دوسرے بڑے ذمہ دار ان کے نزدیک وہ طلبہ تھے جو جمعیۃ الطلبہ کے قیام کا پرزور مطالبہ کر رہے تھے اس لیے وہ سب اخراج کے قابل تھے حالانکہ وہ اس وقت دارالعلوم کا عطر تھے۔

(۴) دارالعلوم میں کئی نقطۂ نظر کے اساتذہ، طلبا ہمیشہ موجود رہتے تھے لیکن دفتر اہتمام نے صرف یکطرفہ رپورٹ مرتب کر کے مجلس شوریٰ کی غیر جانبداری کو آزمائش میں ڈال دیا تھا مگر اس میں مہتمم بھی تھے مہتمم گر بھی، اس لیے چوکنے ہو گئے۔

اس اجلاس میں محدث عصر مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، حکیم محمد زماں (کلکتہ) مولانا مرغوب الرحمن صاحب بجنوری، مولانا عبدالقادر (مالیگاؤں) جیسے تمام حضرات موجود تھے جن کی امانت و دیانت اور علم و فضل پر پورا ملک متفق تھا۔

یہ رپورٹ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو پیش کی گئی تھی مگر آج بھی پڑھیے تو اس میں سے صلح کی نہیں جنگ کی اور سنجیدگی کی نہیں جارحیت کی بو آتی ہے حضرت قاری صاحب کے علم و فضل اور عمر بھر کی سنجیدگی و متانت سے جوڑ نہیں کھاتی مگر جو کچھ بھی تھا وہ حضرت قاری صاحب کے نام سے تھا مگر دارالعلوم کی ہیأۃ حاکمہ کے سامنے تھا۔

رپورٹ سن کر ممبران شوریٰ دنگ رہ گئے اور اس کے بین السطور میں جو کچھ تھا اسے پڑھ کر اور حالات و واقعات کے چوکٹے میں فٹ کرنے میں امانت و دیانت کے جتنے تقاضے تھے ان کو سوچ کر حیران رہ گئے اس لیے جب مجلس شوریٰ شروع ہوئی تو امید و بیم، بے یقینی اور کشاکشی کے عجیب ماحول میں شروع ہوئی تھی۔ پھر بھی انھوں نے فیصلے کیے اور اہم سے اہم فیصلے کیے۔ ان فیصلوں کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ ایک ایک دفعہ اتفاق رائے سے طے ہوتی چلی گئی

اور وہ طے کیا گیا جس سے حضرت قاری صاحب بھی اختلافِ رائے کی ہمت نہ کر سکے مثلاً:

شوریٰ کے اہم فیصلے

(۱) عالمی مؤتمر اور تنظیم فضلاء دارالعلوم قدیم کے درمیان جون ۱۹۸۰ء میں جو مفاہمت طے ہو گئی ہے اسے آگے بڑھایا جائے اور اس کے لیے مولانا سعید اکبرآبادی اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔

(۲) جن اساتذہ پر فردِ جرم عائد کی گئی ہے ان کو صفائی کا موقعہ دیا جائے اور ان سے جواب طلب کیا جائے پھر ان جوابات کو مجلسِ شوریٰ کے سامنے رکھا جائے تاکہ مجلس فیصلہ کر سکے۔

(۳) صد سالہ اجلاس کی بچی ہوئی رقمیں بینکوں سے نکال کر اس سے یونٹ ٹرسٹ بمبئی کے حصص خریدے جائیں۔

(۴) صد سالہ کے حسابات، مختلف شعبہ جات کی کارکردگی اور کارگذاری کا جائزہ لے کر دو ماہ کے بعد رپورٹ پیش کی جائے۔ اس اہم کام کے لیے اکابرینِ ملت کا سہ نفری کمیشن مقرر کر دیا گیا۔

(۵) دارالعلوم کا جو دفترِ رابطہ اور نشر و اشاعت کے لیے دہلی میں قائم کیا گیا تھا اسے بند کر دیا جائے۔

(۶) رپورٹ کے مطابق چند سرغنہ قسم کے طلبہ کا اخراج کر دیا گیا۔

(۷) پیشکار عبدالحق کا دوسرے دفتر میں تبادلہ کیا گیا۔

(۸) کئی اور دفتری امور جو کارکردگی کے لیے ضروری تھے طے کر دیے گئے۔

اس طرح تقریباً ۱۴ فیصلے کر کے ممبرانِ شوریٰ چلے گئے اور چند ہی روز بعد حضرت قاری صاحب بھی غیر ملکی سفر پر چلے گئے تو دسمبر ۱۹۸۱ء تک واپس تشریف لائے۔

غلط پروپیگنڈہ

شوریٰ کے دوسرے تیسرے دن اخبارات میں اس کی رپورٹ آئی تو عجیب و غریب آئی "امامِ انقلاب" نے شاہ سرخی سے تبصرہ بھی کیا خبر بھی دی تو پہلی سرخی یہ چپکائی کہ "مجلسِ شوریٰ کی میٹنگ بغیر کسی فیصلے کے ختم" دوسری سرخی میں دل کی بھڑاس نکالی کہ "ہوائی جہازوں

کا کرایہ وصول کرنے والے قوتِ فیصلہ سے محروم، بزدل اور اپاہج ممبرانِ شوریٰ کو کیا دارالعلوم کا امین و محافظ سمجھا جا سکتا ہے؟" (امام انقلاب ۱۵ اکتوبر)۔

ایک دوسرے اخبار نے لکھا "آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا"۔ آگے لکھا کہ ہمارے خیال میں دارالعلوم کے مسائل حل کرنے میں ممبران شوریٰ پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ حضرت مہتمم صاحب مجلس شوریٰ بلانے کی جگہ مسائل کو خود حل کریں۔ اجتماع دیوبند) یہی انداز "دیوبند ٹائمز" وغیرہ کا بھی تھا۔

یہ عجیب و غریب اطلاعات دفتر رابطہ (دہلی) نے فراہم کی تھیں۔ اس کو غصہ اس پر تھا کہ شوریٰ نے اس کو بند کرکے دارالعلوم کو غلط پروپیگنڈے سے کیوں بچایا تھا اور اس کے وجود کو کیوں چیلنج کیا تھا۔ مگر ان اخبارات اور دفتر رابطہ کا رُخ دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس لیے مجلس شوریٰ کے اختیارات اور حضرت قاری صاحب کے اختیارات کی بحث زور پکڑے گی۔ مگر کہاں تک جائے گی اس کا اندازہ ممکن نہیں تھا۔

دارالعلوم کی هیأۃ حاکمہ

دیوبند کے یہ اخبارات لکھنؤ پہونچے تو لوگوں کو مجلسِ شوریٰ کی ناکامی پر سخت افسوس ہوا، چنانچہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اخبارات لے کر ندوہ گئے اور وہاں مِنّت اللہ صاحب، مولانا اکبرآبادی جیسے حضرات سے پوچھا کہ آپ بلا فیصلہ کے کیسے چلے آئے تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے ایک درجن سے زیادہ فیصلے کیے ہیں اور اپنی دیانت اور امانت سے جو ہو سکا وہ فیصلے کئے ہیں، نہ کسی دباؤ میں آئے، نہ کسی کے دھوکے میں۔ چنانچہ ان حضرات نے ایک وضاحتی بیان شائع کیا اور اس میں تمام فیصلوں کو دُوہرا کر واضح کر دیا گیا کہ دارالعلوم میں مجلس شوریٰ ہمیشہ هیأۃِ حاکمہ رہی ہے۔ یہ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے کہنا پڑا کہ مجلسِ شوریٰ کو کالعدم کرنے کی باتیں بھی چل رہی تھیں۔ بیان کے الفاظ یہ تھے:

> "اس موقع پر ہم یہ امر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک دستور ہے جس کے تحت زمانہ قدیم سے دارالعلوم کا پورا انتظام چل رہا ہے۔ شوریٰ اس دستور

کی روشنی اور تصریحات کی بنا پر "ہیأۃ حاکمہ" ہے اور دارالعلوم کے تمام معاملات میں اس کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔" (عزائم ۔ یکم نومبر ۱۹۸۱ء)

جب یہ رپورٹ دوسرے اخبارات میں آئی تو دنیا کو معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے اور کیوں اس کی مخالفت ہونے لگی ہے۔

حضرت مہتمم کا بیان

انتظار تھا کہ مہتمم صاحب امریکہ سے واپس آئیں گے تو سرکشوں کو لگام دیں گے اور دارالعلوم کو اپنی روایتی سنجیدگی اور اصول و ضوابط کے ساتھ لے چلیں گے مگر جب دسمبر ۱۹۸۱ء میں وہ تشریف لائے تو چند ہی دنوں کے بعد دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو ۱۶ر دسمبر کو اخباروں میں آپ نے بیان دیا کہ:

(الف) سفر انگلستان سے واپسی کے بعد چند مضامین نظر سے گذرے جو دارالعلوم کی ہمدردی پر مشتمل تھے لیکن مقالات میں مجلس شوریٰ کو مستقلاً ہدف بنایا گیا ہے۔ میرے خیال میں عموم کے ساتھ سب کو ایک ذیل میں رکھ کر ہدف تنقید بنانا موزوں نہیں ہے۔

(ب) دارالعلوم کا دستور اساسی زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ اس حد تک صحیح ہے کہ وہ بہت حد تک قابل اصلاح اور غیر مکمل ہے۔ سعی کی جاوے گی وہ دستور از سر نو مرتب کر دیا جائے ۔۔ اور یہ شکایات رفع ہو جائیں۔

(ج) جن جرائد نے دارالعلوم کی حمایت میں مضامین لکھے ہیں ہم خدام دارالعلوم صمیم قلب سے ان کے شکر گذار ہیں۔ (قومی آواز)

حضرت قاری صاحب کے اس وضاحتی بیان سے ان لوگوں کو ہوا کا رخ معلوم ہو گیا جو دارالعلوم کی زبان سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کو اب بھی سنجیدگی و اصول پرستی کی امید تھی ان کو حضرت قاری صاحب کے اس فرمان کے بعد اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا۔ قاری صاحب نے مجلس شوریٰ کے بغیر خود اپنی مرضی سے دفتر کو حکم دیدیا کہ ملازمین و مدرسین کی تنخواہ دوگنی کر دی جائے اور طلباء کا وظیفہ بھی دوگنا۔ فرق یہ کیا کہ ملازمین کا اضافہ شوال سے ہو گا اور طلباء کا اضافہ صفر سے ہو گا۔

دوسرا اہم ترین فیصلہ اور اعلان یہ فرمایا کہ مولانا سالم صاحب نائب مہتمم بنا دیئے گئے اور

مولانا انظر شاہ صاحب قائم مقام صدر مدرس۔

ان فیصلوں پر دارالعلوم کی انتظامیہ نے زور دار شکریہ ادا کیا اور مولانا انظر شاہ کشمیری نے بڑے طنطنے سے فرمایا:

"کون کہتا ہے کہ اسلام میں مناصب وراثت کی بنیاد پر نہیں تقسیم ہوتے۔ ہم اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مسند خلافت پر ۲-۲ خسر اور ۲-۲ داماد نظر آتے ہیں اور اگر چھ ماہ کی خلافت خلافت تھی تو ایک نواسہ بھی۔"

حضرت قاری صاحب کی اس فرمارَوائی سے ثابت ہوا کہ اب مجلسِ عاملہ یا مجلسِ شوریٰ کی وہ حیثیت نہیں رہی جو اب تک قاری صاحب کے نزدیک تھی، اب وہ مُطلق العنانی کی طرف چلنے لگے۔ نیز اکتوبر میں مجلسِ شوریٰ نے جو فیصلے بہ اتفاق رائے کئے تھے ان میں سے کسی ایک کا بھی نفاذ نہیں کیا گیا۔ اس سے بھی ہوا کا رُخ متعین ہوگیا کہ اب شورائیت ختم، مطلق العنانی شروع۔ نیز یہ کہ (۱) موجودہ انتظامیہ کو اب دارالعلوم کے بڑے اساتذہ کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ (۲) دستورِ اساسی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔ (۳) مؤتمر والوں سے مفاہمت کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مولانا اسعد صاحب نے بغاوت پھیلا رکھی ہے اور مفاہمت کے بعد بھی جاری ہے۔

مقامِ غیر محمود

یہی وہ مقام تھا جہاں سے دارالعلوم کا میدانِ جنگ نظر آنے لگا تھا اور آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

(الف)۔ بڑے بڑے اساتذہ حضرت قاری صاحب سے مایوس ہوگئے، اور ان کی انتظامیہ کے ذمہ داروں سے دل برداشتہ۔ وہ سخت حیران تھے کہ دارالعلوم کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

(ب) اسی مقام پر حضرت قاری صاحب کو مجلس شوریٰ کے بالمقابل کھڑا کردیا گیا اور دفتر دارالعلوم دستورِ اساسی کے بالمقابل چلنے لگا۔

(ج) یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا محمد منظور نعمانی جیسا علمی مجاہد اور ان کا الفرقان دونوں نے حضرت قاری صاحب کا ساتھ چھوڑ کر مجلسِ شوریٰ کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھ کر انجام

دیا اور ملک کو مجلس شوریٰ سے مطمئن رکھا۔

(د) اسی مقام پر پہونچ کر عوام و خواص کو محسوس ہونے لگا کہ دارالعلوم اگر محفوظ رہ سکتا ہے تو مجلسِ شوریٰ کے ہاتھوں اور دستورِ اساسی کی حمایت سے رہ سکتا ہے ورنہ مجلسِ شوریٰ، دستورِ اساسی اور خود دارالعلوم داؤں پر لگ گیا ہے۔

جنوری فروری جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے دارالعلوم کا اندرونی انقلاب رنگ لاتا چلا گیا۔ ایک طرف حضرت قاری صاحب کے رفقار کار مجلسِ شوریٰ کو چیلنج کرتے چلے گئے اور مولانا منظور نعمانی، مولانا اکبرآبادی، مولانا معراج الحق اور مولانا وحید الزماں جیسے تمام حضرات مجلسِ شوریٰ کی طرف ہوتے چلے گئے اور ملک و قوم کی رائے عامہ ان کے ساتھ ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف مولانا سالم صاحب، مولانا انظر شاہ اور میرٹھ و مظفر نگر کے بڑے وکلاء اور دہلی و لکھنؤ کے قانون داں لوگوں کا محاذ وسیع اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔

اس محاذ آرائی کا بڑا اثر یہ ہوا کہ اندرونی کشاکش دارالعلوم کے باہر جاکر عوامی اور عدالتی میدان میں لڑی جانے لگی جس کی تفصیل میرے موضوع سے باہر ہے لیکن چند تاریخی واقعات عرض کردوں تاکہ صحیح صورتحال واضح ہوجائے۔

حضرت قاری صاحب کا استعفیٰ

(۱)۔ ۱۱، ۱۲، اکتوبر (عیدالاضحیٰ) کا اجلاس ہنگامی تھا عام اجلاس نہ تھا، مگر عام اجلاس وقت پر بلایا گیا تو مجلسِ شوریٰ کے ۷ اراکین کے دستخط سے دستورِ اساسی کی رُو سے شوریٰ طلب کی گئی اور وہ رجب ۱۴۰۱ھ مطابق اگست ۱۹۸۱ء میں مجبوراً کی جاسکی۔

(۲)۔ اس اجلاس کو چونکہ قاری صاحب کی مرضی کے خلاف دستوری طاقت سے بلایا گیا تھا اس لیے قاری صاحب نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے عصر بعد مہمان خانے میں بیٹھ کر اپنے قلم سے استعفیٰ لکھا اور مغرب بعد شوریٰ میں پیش کردیا۔ دوسرے کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ تحریر حقیقی تھی، لہجہ درد آمیز تھا اور ثقل سماعت، قویٰ کی کمزوری کا عذر واقعی تھا اس لیے متفقہ طور سے مولانا عثمان صاحب کو نائب مہتمم اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو مددگار مہتمم مقرر کردیا گیا۔ مولانا معراج الحق صاحب کو کثرت رائے سے صدر مدرس بنادیا گیا۔ حضرت قاری صاحب نے اس سے پہلے دستور کے حوالے سے مولانا سالم صاحب کی نیابت منسوخ کردی تھی مگر اس اجلاس میں ان کا نام مجلس کے سامنے انھوں نے پھر رکھا مگر مجلس

اسے قبول نہیں کر سکی اور حضرت قاری صاحب اسے نظر انداز نہ کر سکے اس لیے استعفیٰ کے بعد بھی نزاع بڑھ گئی اور بے پناہ ہو گئی۔

(۳) اجلاس ختم ہونے کے بعد حضرت قاری صاحب کی طرف سے ستمبر ۱۹۸۱ء کے وسط میں مظفر نگر و میرٹھ کے وکلاء کی مجلس بلائی گئی اور اس میں مجلس شوریٰ اور دستور کی بابت ایک محاذ جنگ کھول دیا گیا۔

(۴) - اس مجلس نے طے کیا کہ مجلس شوریٰ کالعدم کر دی جائے اور دستور میں ترمیمات کر دی جائیں اور ان دونوں خطرناک کاموں کے لیے کوئی آل انڈیا نمائندہ اجتماع دہلی میں بلایا جائے۔

(۵) - ۴ را کتوبر ۱۹۸۱ء کو مہندیان نئی دہلی میں صبح ۱۰ بجے نمائندہ اجتماع بلا لیا گیا جس میں چند ممبران شوریٰ اور باقی عہدیداران مدارس عربیہ اور وکلاء محترم مدعو کر لیے گئے۔

(۶) - اور اجتماع کا پس منظر تحفظ دارالعلوم کمیٹی کی طرف سے ایک کتابچے میں مرتب کر دیا گیا اور اسے شائع کر دیا گیا۔ اس کی پہلی کاپی پریس سے لے کر ہم لوگ لکھنؤ گئے۔ پھر میں تیسرے دن بجنور گیا تو مولانا منظور صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اس وقت بھی یہ مان نہیں سکے کہ حضرت قاری صاحب مجلس شوریٰ کو توڑنے کا اعلان کر دیں گے۔ جب انھیں یہ کتابچہ دکھایا گیا اور اس کے مضامین دکھائے گئے تو بمشکل باور کر سکے کہ اتنا غلط کام بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۷) ۴ را کتوبر کی دوپہر کو مہندیان کے اندر حضرت قاری صاحب نے خود مجلس شوریٰ کو کالعدم کرنے کا اعلان فرما دیا اور دستور معطل کر کے ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا کہ اس میں ترمیمات پر غور کریں۔

(۸) - مجلس شوریٰ کی جگہ چند افراد کی ایڈہاک کمیٹی کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ اجلاس میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب موجود تھے۔

(۹) - ۲۲ را کتوبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم میں حضرت قاری صاحب نے ایڈہاک کمیٹی کا اجلاس بلا لیا مگر ممبران کی لاپروائی کی وجہ سے میٹنگ نہیں ہو سکی، پھر بھی شرکاء محترم نے مجلس شوریٰ کو کالعدم کرنے اور دستور کی ترمیم کی توثیق فرما دی۔

(۱۰) - سارا دارالعلوم دم بخود تھا کہ کیا ہو رہا ہے کیا ہونے والا ہے۔ بڑے اساتذہ کو

یقین ہونے لگا کہ دارالعلوم پر اپنا قبضہ بحال کرنے کے لیے یہ لوگ دارالعلوم کو بند کردیں گے پھر اپنی شرطوں پر کھولیں گے اور وکیلوں کے مشوروں سے چلائیں گے۔

(۱۱) - اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے مؤتمر کے خاص لوگوں کی ایک میٹنگ ہم لوگوں نے دیوبند میں بلائی اور اس میں کھل کر بحث ہوئی کہ اگر دارالعلوم بند ہی کردیا گیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ یہ سوال عجیب بھی تھا مشکل بھی' اس لیے مختلف قسم کی رائیں آئیں مگر مولانا وحیدالزماں صاحب نے یہ کہہ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا کہ اگر ایسا ہو ہی گیا تو ہمیں طلباء کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ جی ہاں ممکن ہے' بہت مشکل ہے وغیرہ وغیرہ۔ میٹنگ بغیر کسی فیصلے کے ملتوی ہوگئی۔

(۱۲) - ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم کے صدر گیٹ پر چند طلبار میں کہا سنی ہوئی اور بات بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ انتظامیہ کے مسلح عناصر نے طلبار پر زبردست حملہ کردیا جس میں ایک لڑکا شدید زخمی ہوکر گر پڑا اور اسے اسپتال پہونچا دیا گیا۔ حالات خراب ہوگئے اور دارالعلوم پولیس کے سپرد کردیا گیا۔ اور شام ہوتے ہوتے پولیس نے اعلان کردیا کہ طلبار ایک گھنٹے کے اندر دارالعلوم خالی کردیں' مدنی گیٹ پر بسیں آرہی ہیں وہ اسٹیشن پہنچا دیں گی۔ پھاٹک بند کردیے گئے' اور دارالعلوم غیر معینہ مدت کے لیے پی۔ اے۔ سی کی تحویل میں آگیا تو اس نے اسے بند کردیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کیمپ دارالعلوم

اکتوبر میں مجلس شوریٰ کالعدم کردی گئی تو اس مہم کو مولانا اسعد صاحب' مولانا محمد منظور صاحب نعمانی' مولانا عثمان صاحب وغیرہ نے سنبھال لیا اور قدم قدم پر مقدمۂ شوریٰ کے انعقاد' ممبران کے آنے' قیام کرنے اور مجلس کرنے کے انتظامات لکھنؤ' دہلی' سہارنپور اور دیوبند تک پھیلتے چلے گئے۔

دوسری طرف ۳۰ اکتوبر کو دارالعلوم کے بند ہوجانے کے بعد دارالعلوم کے طلبار کی علمی تعلیمی اور انتظامی خدمت مولانا وحیدالزماں صاحب نے سنبھالی۔ مدنی گیٹ پر جب بسیں آکر رک گئیں تو مولانا بھی وہاں تن تنہا پہونچ گئے۔ ان کے ساتھ تھا تو راقم الحروف افضال الحق۔ مولانا نے طلبار کو سامان لے کر نکلتے دیکھا تو داروغہ سے پوچھا کہ طلبار کا ان بسوں میں بیٹھ کر جانا ضروری ہے؟ اس نے کہا نہیں' صرف سہولت کے لیے وہ آئی ہیں تاکہ اسٹیشن تک پہونچا دیں۔ مولانا نے لپک کر طلبار سے کہا کہ بسوں سے اترآؤ' مؤتمر کے دفتر چلو۔ طلبار نے یہ آواز دور تک پہونچا

دی ۔ میں نے آگے بڑھ کر طلبار سے کہا کر جا کر اپنی کتابیں لیتے آؤ چنانچہ طلبار سامان اور کتابیں لے کر مؤتمر کے دفتر آگئے اور مغرب تک محمود ہال کی تینوں منزلیں طلبار سے بھر گئیں۔ سیکڑوں طلبار شہر کی مسجدوں میں بھی چلے گئے، شہر میں ہلچل مچ گئی، بعض لوگ یہ منظر دیکھ کر رو پڑے کہ طلبار بے سروسامانی کے ساتھ اچانک نکال دیئے گئے، رکشے والے طلبار کو جہاں انھوں نے کہا پہونچا دیا اور پیسے نہیں لیے۔

ابتدائی انتظامات

محمود ہال میں طلبار کے قیام کا انتظام کرنے کے بعد مولانا وحیدالزماں کو فوری طور پر طلبار کے شام کے کھانے کی فکر ہوئی چنانچہ انھوں نے دیوبند کے مختلف محلوں میں جاکر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ طلبار کے لیے اپنے گھروں کا کھانا فوری طور پر پہونچا دیں اور اپنے بچوں کے لیے دوسرا کھانا پکوالیں، چنانچہ عشار تک اتنا کھانا آگیا کہ تقریباً ایک ہزار مہمانانِ رسولؐ کے لیے کافی ہوگیا۔

دوسرے دن دہلی، سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ وغیرہ کے لوگ دیکھنے آئے کہ دارالعلوم اور طلبار کا کیا حال ہے؟ کیونکہ ریڈیو سے باضابطہ دارالعلوم کے بند ہونے کا اعلان کردیا گیا تھا مگر لوگوں کو دیوبند پہونچ کر جب معلوم ہوا کہ طلبار رُک گئے ہیں اور ان کی تعلیم جاری رہے گی تو لوگ بہت متاثر ہوئے۔ شام کو جب میٹنگ ہوئی تو متفقہ طور پر طے ہوا کہ جو طلبار ٹھہر گئے ہیں ان کے قیام وطعام کے ساتھ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔ اسی وقت مؤتمر کے بھرے ہوئے دفتر کا نام کیمپ دارالعلوم رکھ دیا گیا اور کیمپ کے ناظمِ اعلیٰ مولانا وحیدالزماں صاحب سب کے اتفاق سے منتخب کرلیے گئے، مگر اس ناظم اعلیٰ کو کنویں کھود کر پانی پینا تھا۔ طلبار کے قیام، چٹائیاں، خوردونوش اور برتن لکڑی وغیرہ، ایک ایک چیز کا انتظام کرنا تھا اور نہ صرف انتظام بلکہ اس کے لیے غلّہ اور پیسوں کا اکٹھا کرنا اس سے بڑا مسئلہ تھا ۔ اور اس مردِ میدان نے اپنے رفقارِ کار کے ہمراہ سارے انتظامات کیے اور بحسن وخوبی کیے۔ وہاں کا سب سے اہم کام تھا سردی کے موسم، بارش اور بے سروسامانی میں پریشان ہوجانے والے طلبار کو مطمئن رکھنا تاکہ مصائب سے اکتا کر بھاگ نہ جائیں۔ اس کے لیے مولانا کو بار بار تقریریں بھی کرنی پڑیں اور دوسرے آنے والے مقتدر لوگوں کی تقریروں کا بھی انتظام کرنا پڑا۔ وفود کے سوالات سے

جوابات بھی دینے تھے، افسرانِ بالا سے بھی نمٹنا تھا۔
مولانا نے تیسرے دن مجھ سے فرمایا کہ کتابیں تقسیم کرکے اسباق شروع کرواؤ چنانچہ میں نے ہر جماعت کے لیے ایک کمرہ یا برآمدہ مقرر کر دیا اور اساتذہ سے کہہ دیا کہ اپنے گھنٹے میں وہاں پہونچ کر پڑھائیں۔ دورہ کے لیے مدنی مسجد مقرر کر دی گئی۔ اس طرح آمدنامہ سے لے کر بخاری شریف تک تعلیم کا نظم ہوگیا۔ میں نے بھی ۴ بلکہ ۵ سبق شروع کرا دیے اور تمام حضرات کو ان کی مرضی سے کتابیں دیدی تھیں۔ تعلیم بھی جاری ہوگئی اور تربیت اور نماز کا بھی نظم قائم کر لیا گیا۔

جاڑے کی جدوجہد

ادھر دارالعلوم بند کرنے کے بعد ذمہ داران دارالعلوم کو تشویش ہوئی کہ طلبار کیسے رک گئے، ان کو کس طرح دیوبند سے باہر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مقامی حکام آئے تو ایس پی نے کلکٹر سے شکایت کی کہ طلبار کو یہاں کے "مؤتمر" صاحب نے روک لیا اور وہاں سارا انتظام کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں پولیس حکام اور مجسٹریٹ وغیرہ سے مولانا وحید الزماں نے بار بار باتیں کیں، ان کی دھمکیوں کا سامنا کیا اور انھیں صاف صاف جوابات دیے۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی موقعہ پر کہیں قدم نہیں ڈگمگائے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ مولانا وحید الزماں نے پولیس سے کہہ دیا کہ طلبار یہاں مر سکتے ہیں جا نہیں سکتے۔ چنانچہ طلبار کو کھڑا کر کے کہہ دیا کہ سینہ سپر ہو جاؤ۔ وہ سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور پولیس واپس چلی گئی۔ اس طرح ہر ممکن کوشش کی گئی کہ طلبار کو بھگا دیا جائے مگر ہر کوشش ناکام ہوتی چلی گئی۔ طلبار پڑھتے رہے، اساتذہ پڑھاتے رہے اور ان کی ضرورتوں کے لیے سہارنپور، میرٹھ اور مظفر نگر کے لوگ غلے، روپے اور دوسرا سامان دل کھول کر پہونچاتے رہے اور کیمپ سے ان کو پمفلٹ اور کتابچوں کے ذریعہ اطلاعات بہم پہونچائی جاتی رہیں۔

دارالعلوم کی واپسی

دارالعلوم کی انتظامیہ اور کیمپ دارالعلوم کے ذمہ داروں میں یہ جنگ تین چار مہینے تک ہوتی رہی۔ آخر وہ لوگ کیمپ کو اجاڑنے میں ناکام ہو گئے اور مان گئے کہ پولیس یا اخبارات

یا وفود یا اعلیٰ افسران میں سے کوئی نہ تو زبردستی اُسے تباہ کرسکتا ہے، نہ بات چیت اور معقولیت سے قائل کرسکتا ہے اور کیمپ والے بھی یہ دیکھتے دیکھتے مایوس ہوتے چلے گئے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ کسی بھی مصالحت، معقولیت یا دباؤ سے اپنے سوا کسی اور کو دارالعلوم میں دخیل تسلیم کرلے گی۔ اور بالآخر ۲۲ رمارچ ۱۹۸۲ء کی رات میں دو بجے چند اساتذہ نے ۶۰-۷۰ طلبار کو لے کر چار جانب سے دیواریں پھاند کر اپنے کو دارالعلوم کے اندر پہونچا دیا اور ہمت کر کے کھڑکیاں اکھاڑ دیں یا کھول دیں جس سے تمام طلبار اندر آگئے اور نیچے سے اوپر تک قبضہ کرلیا۔ نوجوان اساتذہ اور طلبار کا یہ مشن اس قدر خفیہ تھا کہ خود کیمپ کے ذمہ داروں کو اس کا کوئی علم نہیں تھا اور جسے بھی اس کی اطلاع ملی حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے اس واقعہ کی اطلاع دہلی میں ملی۔

قبضہ کے بعد پہلی مرتبہ جب میں باب الظاہر کی طرف سے دارالعلوم میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بلیاں لگا کر اسے جام کردیا گیا تھا پھر سیمنٹ کی دیوار کھڑی کردی گئی تھی مگر طلبار نے کھڑکیاں اکھاڑ کر دارالعلوم کھول دیا۔ دارالعلوم کھلنے کے بعد مولانا وحید الزماں صاحب نے دفتر اہتمام میں بیٹھ کر طلبار کے قیام وغیرہ کا انتظام کیا، مطبخ کے ملازمین کو اشرف صاحب کی نگرانی میں متحرک کردیا، کتابیں تقسیم کروائیں اور اسباق کا انتظام کیا، تنخواہیں اور فرائض مقرر کرکے دارالعلوم کا نظام باضابطہ بحال کردیا اور جب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے مجلس شوریٰ بلائی تو اس میں سب اراکین محترم کے سامنے مولانا وحید الزماں نے پورے کیمپ کو مجلس شوریٰ کی سپردگی میں دے دیا۔ مجلس شوریٰ نے مولانا کے مقرر کردہ ملازمین و مدرسین کو پھر سے انٹرویو لے کر ان کی جگہوں پر مستقل کردیا، مگر اس نئے نظام میں کیمپ دارالعلوم کا ناظم اعلیٰ ایک مدرس تھا اور بس۔ یہ تھا مولانا وحید الزماں کا کردار، خلوص اور بے نفسی اور عہدوں سے بے نیازی کی ایک انوکھی مثال۔ انشاء اللہ یہی جذبہ ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائے گا۔

۲۴ رمارچ ۱۹۸۲ء کو کیمپ دارالعلوم مؤتمر کے دفتر سے دارالعلوم میں آکر آباد ہوگیا اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے کار اہتمام سنبھال لیا تو سب سے پہلے مجلس شوریٰ بلائی جو اپریل میں دارالعلوم کے اندر ہوئی۔ اس نے جمعیۃ الطلبہ بنانے کی اجازت دیدی اور حافظ محمد عثمان اس کے صدر منتخب ہوگئے۔ یہ جمعیۃ جائز طور پر ایک طویل عرصہ کے بعد قائم ہوئی۔ اس

کے عہدیدان بھی نئے اور ناتجربہ کار تھے اس لیے جوشِ جوانی اور جوشِ فتح میں انھوں نے الٹے ہی
سے بعض کام کر کے دارالعلوم کو پریشانی میں ڈال دیا۔ اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جو حافظ عثمان
کو متنبہ کرتا مگر مولانا وحید الزماں کا دل گروہ تھا کہ صدر جمعیۃ الطلبہ کو بلا کر سخت سے سخت تنبیہ
کی۔ اس وقت مولانا کے سامنے نہ حافظ عثمان تھے نہ جمعیۃ الطلبہ تھی، اگر تھا تو صرف دارالعلوم
تھا، اس کی آبرو تھی۔

۱۹۸۳ء آیا تو مولانا وحید الزماں صاحب ناظم تعلیمات بنا دیئے گئے۔ انھوں نے طلبا،
اساتذہ اور ملازمین کی اتنی سخت نگرانی کی کہ درس گاہیں طلباء سے اور اسباق سے آباد
ہوگئیں، اور اگر کسی مدرس نے ۱۵ منٹ سے زیادہ تاخیر کی تو رجسٹر اٹھوا لیا گیا، طلباء کی چھٹی
کردی گئی اور مدرس کو غیر حاضر مان لیا گیا۔ پھر انھوں نے افریقہ، انگلستان اور مصر کا سفر
کیا اور وہ بہت کامیاب رہا مگر اس کی کامیابی بعض نگاہوں کو کھٹکنے بھی لگی۔

۱۹۸۵ء آیا تو مجلسِ شوریٰ نے مولانا وحید الزماں کو مددگار مہتمم کا عہدہ دے کر اہتمام
کی ذمہ داریاں دے دیں۔ مولانا اہتمام میں آئے تو انھوں نے روز کا کام روزانہ نمٹا کر
اور ہر کاغذ پر حکم اور جواب لکھ کر دفتر کو متحرک کر دیا۔ کسی کلرک، کسی دفتر یا کسی انچارج کی مجال
نہیں رہ گئی کہ وہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں اگر مگر کر سکتا۔ انھوں نے عملی طور سے بتادیا
کہ مولانا نصیر احمد خاں کی نرمی، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی مروت اور مولانا محمد عثمان صاحب
کی لاپرواہی نہیں وحید الزماں کا حکم ہے اور اس کی تعمیل نہ ہونا اپنی ملازمت سے کھیلنا ہے
اس لیے پورا دفتر چاق و چوبند ہوگیا، ہر دفتر کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔ ہر شخص کی
ذمہ داریاں اسے بتادی گئیں۔ میں ایک دفعہ ان کو دیکھنے دفتر اہتمام میں گیا تو بیٹھے درخواستیں
لے رہے تھے، لائن میں لوگ بیٹھے تھے، قلم تیزی سے چل رہا تھا، کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا
تو سلام دعا ہوئی، بہت شرمندہ سے ہوئے مگر میں نے معاون مہتمم کو مبارکباد دی کہ کام اسی
طرح ہوگا۔

نئی تعمیرات

معاون مہتمم بننے کے بعد انھیں بے ڈھنگے راستے سے دفتر اہتمام میں جانا گراں گذرا تو سامنے
سے سیڑھیاں کھڑی کر کے راستہ بھی شاندار کر دیا۔ دفتر محاسبی میں پھاٹک لگا کر ماستھرا

راستہ مہیا کردیا۔ اس طرح دارالعلوم کی عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کردیا۔ آپ سہارنپور والی سڑک سے گذریں تو دائیں طرف کا شاندار پھاٹک آپ کو بتادے گا کہ دارالعلوم آگیا، باادب' باتمیز ہوکر اتر جایئے۔ چوں کہ تعمیری کام نئے انداز کے تھے اس لیے انھوں نے الگ سے اس کے لیے چندہ کیا اور نئی عمارتوں کے لیے ۱۴ لاکھ روپے جمع کرکے لگادیے۔

مولانا اسعد صاحب کی ممبری

مجلس شوریٰ نے جب ممبران کی خالی جگہیں پُر کیں تو مولانا اسعد صاحب کا احسان چکانے کے لیے ان کی ۲۵ سالہ خواہش کی تکمیل کردی اور مجلس کا ممبر بنادیا۔ ہم لوگ خوش تھے کہ دونوں شیر اکٹھا ہوکر دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کی اچھی تعبیر عنایت کریں گے جس کی ابتدا ہم لوگوں نے مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کو باہر سے دارالعلوم میں لاکر کردی تھی، مگر یہ خیال ایک داعیہ تھا بلکہ ایک مفروضہ تھا۔ ہمیں یاد نہیں رہا تھا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ، ایک جنگل میں دو شیر اور ایک ادارے میں دو سربراہ ساتھ ساتھ نباہ نہیں سکتے۔

دارالعلوم کیلئے غلہ وصولی

اسی دوران دہلی میں دارالعلوم کا ایک معزز وفد آیا جس میں مولانا مرغوب الرحمن صاحب کو ساتھ لے کر مولانا اسعد صاحب تشریف لائے تھے، محلے محلے کی جامع مسجدوں میں اجتماعات ہوئے، دارالعلوم کے لیے روپے، وعدے اور غلے طلب کیے جاتے کہ دارالعلوم دیوالیہ ہوگیا ہے، بچوں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ میں بھی قصاب پورہ اور چاندنی چوک کے چندوں میں شریک رہا تھا۔

مجھ کو غلے کی وصولی وہ بھی دہلی ایسے شہر میں سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے مولانا اسعد صاحب سے پوچھا کہ آپ لوگ محلہ محلہ غلہ کیوں مانگ رہے ہیں، کیا دارالعلوم اتنا گر گیا ہے، بڑی توہین کی بات ہے۔ مولانا اسعد صاحب نے برہمی کے انداز میں فرمایا کہ مولوی وحیدالزماں نے ساری رقم فضول عمارتوں میں لگاکر دارالعلوم کو دیوالیہ بنادیا ہے، طلبہ کے کھانے میں پریشانی ہورہی ہے ـــ یہ بات مولانا اسعد صاحب کے منھ سے اچھی نہیں لگی۔ مگر اتنا معلوم ہوگیا کہ دارالعلوم

ہیں کچھ ہونے والا ہے اور مولوی وحید الزماں جو فضول عمارتوں میں روپے برباد کر رہے ہیں وہ نشانے پر آ گئے ہیں مگر ان کے خلاف جب تک فضا ہموار نہ ہو جائے کوئی اقدام مناسب نہیں ہے' یہ سفر اسی ہمواری کے لیے اختیار کیا گیا ہے فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے دیوبند جا کر مولانا وحید الزماں سے پوچھا کہ جب دارالعلوم میں کھانے کو غلہ نہیں رہ گیا ہے تو آپ خزانہ کا روپیہ نئی عمارتوں میں کیوں ختم کر رہے ہیں؟ کہنے لگے ان عمارتوں کا دارالعلوم کے بجٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے' ان کے لیے اسی لیے میں نے سفر کر کے اجلاس صد سالہ کی طرح الگ سے چندہ کیا ہے اور دارالعلوم میں لاکھوں کا حساب داخل کر چکا ہوں مگر غالباً یہ کام مولانا اسعد صاحب کو پسند نہیں ہے تو انہیں مجھ سے کہنا چاہیے' ادھر ادھر شکوہ کرنے سے کیا فائدہ۔ پھر مولانا نے اس کی وجہ بتائی کہ مجھے پورے وثوق سے معلوم ہے کہ دارالعلوم کی رقوم جہاں تہاں روک دی گئی ہیں اور یہ خود ساختہ دیوالیہ پن ایک خاص مقصد سے پیدا کیا گیا ہے۔

دفتر اہتمام سے علاحدگی

ان باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ مولانا وحید الزماں اب دفتر اہتمام میں نہیں رہ سکتے' چنانچہ ۱۹۸۶ء آیا تو انہیں معاون مہتمم کے عہدے سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس طرح مولانا وحید الزماں نے روز روز کے خرخشے سے نجات حاصل کر لی اور مولانا اسعد صاحب کا دل ٹھنڈا ہو گیا کہ اس وسیع جنگل میں کوئی ان کی راہ کا کانٹا نہیں رہ گیا، ایک ہی مد مقابل تھا اس سے چھٹی مل گئی۔ وہ دارالعلوم کے لیے' تعلیم و تربیت کے لیے' انتظام کے لیے' حل مشکلات کے لیے خود مفید تھا یا مضر' اس سے کوئی غرض نہیں. مطلب اس سے تھا کہ ان کی من مانی کارروائی میں معاون ہے یا رکاوٹ۔

دراصل تین طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ مولانا حسین احمد مدنیؒ صاحب کا تھا کہ وہ حاجی محمد سلیم اور مولانا حفظ الرحمان بلکہ قاری طیب صاحبؒ سے بھی عمر بھر نباہ کرتے چلے گئے۔ دوسرا طبقہ حضرت تھانویؒ اور حضرت نانوتویؒ کا تھا کہ وہ ذہین سے ذہین لوگوں کو مطمئن کر سکتے تھے اور ان سے عمر بھر نباہ کرتے تھے۔ تیسرا طبقہ مولانا اسعد صاحب کا ہے جو اپنے عزائم کے لیے لوگوں کو بڑے شوق سے استعمال کیا کرتے ہیں مگر ذہین لوگوں کو نہ مطمئن

کر سکتے ہیں نہ نباہ سکتے ہیں، اسی طرح کمتر لوگوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتے۔ اسی کا اثر ہے کہ وہ ہر جگہ ہیں مگر تن تنہا۔ انھیں یاد ہوگا میں نے ایک دفعہ مسجد عبدالنبی میں ان سے پوچھا تھا کہ دہلی سے دیوبند تک آپ کا کوئی مخلص بھی ہے؟ تو خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد سنجیدگی سے جواب دیا کہ ویسا تو ں میں مخلصین ہیں۔

اس ماحول سے مولانا وحیدالزماں کی علیحدگی ناواقف لوگوں کو بہت شاق گذری مگر مولانا مطمئن تھے اور صرف مدرسی پر اس وجہ سے قانع رہ گئے کہ دارالعلوم کا تعلق عزیز تھا جسے وہ زادِ آخرت سمجھتے تھے مگر لوگوں کے لیے وہ بھی بارِ خاطر تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولانا وحیدالزماں صاحب کو جمعیۃ علماء ہند کا باغی سمجھ کر مولانا اسعد صاحب نے ورکنگ کمیٹی سے الگ کر دیا تھا تو ایسا ممبر دارالعلوم میں کیسے رہ سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا اسعد صاحب جمعیۃ علماء کے صدر تھے اور مولانا وحیدالزماں ملی جمعیۃ علماء کے صدر۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ دارالعلوم میں وہ تنہا آدمی تھے جو مولانا اسعد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا وحیدالزماں جس تعلیمی ترقی کو نشاۃ ثانیہ سمجھتے تھے وہ مولانا اسعد صاحب کے نزدیک قطعاً غیر اہم تھی اور مولانا اسعد صاحب جس جاگیرداری کو حاصل عمر بنانا چاہتے تھے مولانا وحیدالزماں کے نزدیک وہ قابلِ مذمت اور قطعاً ناقابلِ برداشت تھا مگر انھیں حاصل ہو چکا تھا اس لیے مولانا وحیدالزماں کی ضرورت بھی ختم ہوگئی تھی۔ انہی وجوہ کے ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہوگئی کہ مجلس شوریٰ میں اکابر کی جگہ ایسے اصاغر بھر لیے گئے جو مولانا اسعد صاحب کی منشا پوری کرنا اپنی سعادت نہیں بلکہ عبادت سمجھتے ہیں لہٰذا وہ جس کی بھی پگڑی چاہیں گے اچھال دی جائے گی، اور نہ جمعیۃ الطلبہ ہے جو مولانا وحیدالزماں کا ماتم کر سکتی تھی، نہ جامعہ طبیہ ہے جہاں ان کے طلباء تھے۔

اور جب اتنے اسباب موجود تھے تو پھر دارالعلوم کے اندر مولانا وحیدالزماں کا باقی رہنا ایک عجوبہ تھا جسے سنہ ۱۹۹۰ء میں حرفِ مکرر کی طرح لوحِ دارالعلوم سے مٹا دیا گیا اور مولانا اسعد کی جاگیرداری اور مستحکم ہوگئی، اسی لیے جب مولانا وحیدالزماں کی علیحدگی پر نظر ثانی کی درخواست لے کر ہم دارالعلوم گئے تو دیکھا کہ مولانا نصیر احمد خاں صاحب نائب مہتمم کو بھی مولانا وحیدالزماں کی علاحدگی پسند نہیں آئی مگر دم بخود تھے۔ درخواست ہم حوالے کر کے واپس دہلی چلے گئے مگر کون اس پر غور کرتا، اس لیے ہمیں کوئی انتظار بھی نہیں تھا۔

دارالعلوم سے علاحدگی کے بعد دہلی کے مختلف حلقوں نے مولانا وحیدالزماں کو قسم قسم کی رائیں دیں مگر وہ کسی پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکے۔ وہ کہتے تھے کام کرنے والے کے لیے راستے بہت ہیں میں اپنی ذات کے لیے ہرگز نہیں لڑوں گا۔

علاحدگی کے بعد

مولانا وحیدالزماں جب ۱۹۸۸ء میں دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں سے علاحدہ ہو گئے تو انھوں نے کام کرنے کی نئی راہیں تلاش کر کے ان پر اپنا کاروانِ علم رواں دواں کر دیا چنانچہ دارالمولفین قائم کر کے اس میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترتیب و اشاعت شروع کر دی، پھر ایک عربی اردو ڈکشنری تیار کر دی جس کی نظیر ہند و پاک میں کہیں نہیں ہے اور جو ۱۸سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرا علمی کارنامہ یہ انجام دے ڈالا کہ مولانا مفتی شفیعؒ صاحب کی تفسیر معارف القرآن کی ۸ جلدوں کو ۲ جلدوں میں سمیٹ دیا۔ تیسرا کام یہ کہ حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن کو سامنے رکھ کر عام فہم عصری زبان میں ایک نئے ترجمے کا آغاز کر دیا، مگر یہ کام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۱۵ راپریل ۱۹۹۵ء کو دارِ آخرت کی طرف پرواز کر گئے۔

لوگ سمجھتے تھے کہ ہم نے مولانا کو دارالعلوم سے علاحدہ کر کے بیکار ڈال دیا ہے مگر یہ علمی سرگرمیاں گواہی دیتی ہیں کہ اگر انھیں تھوڑی سی اور مہلت ملی ہوتی تو کئی اور علمی کارنامے انجام دے کر گئے ہوتے، پھر بھی آخر عمر کو تفسیر و ترجمہ میں منہمک کر کے قرآنی خدمت کو زادِ آخرت بنا کر بڑا کام کر گئے اور آنے والی نسلوں کو انتھک کام کرنے کی راہ دکھلا گئے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اللہ تعالیٰ انھیں شہداء و صدیقین میں شمار کرے اور ان کی خوبیوں کو صدقۂ جاریہ بنائے ان کی علمی کاوش اور ذہنی بالیدگی کے وارث پیدا کرے۔ آمین۔

مولانا محمد مزمل الحق الحسینی

کیمپ دار العلوم

ترجمان دارالعلوم نے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے کارگزار ناظم اعلیٰ مولانا محمد مزمل الحق الحسینی سے گذارش کی تھی کہ وہ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نمبر کے لئے اجلاس صد سالہ کے بعد دار العلوم دیوبند میں رونما ہونے والے انقلاب سے متعلق تمام حالات و واقعات قدرے تفصیل سے قلم بند فرمادیں، کیونکہ مولانا موصوف ایک نمایاں طالب علم کی حیثیت سے مذکورہ انقلاب سے پہلے اور بعد کے تمام حالات کے نہ صرف عینی شاہد رہے ہیں بلکہ انھوں نے تقریباً ہر مرحلہ پر اپنے استاذ گرامی مولانا وحید الزماں صاحب کے جاں نثار خادم اور معاون کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ مولانا موصوف نے مقالہ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو مضامین کی آمد نے ان کے قلم کو کچھ ایسا سیال بنادیا کہ وہ بے تکان لکھتے چلے گئے، اور جب لکھ کر فارغ ہوئے تو زیر ترتیب مضمون ایک کتاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کتاب میں مولانا ممدوح نے بڑی تفصیل سے اور انتہائی مرتب انداز اور شگفتہ زبان میں ان تمام حالات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مولانا وحید الزماں صاحب کو اس وقت کی انتظامیہ کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ اور بالآخر ان کی جد و جہد ایک انقلاب پر منتج ہوئی۔ انقلاب کے بعد اور

کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

اس سے پہلے مولانا وحید الزماں صاحب کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیلات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی قیمتی دستاویز ہے جو مستقبل کے مؤرخ کے لئے مستند ماخذ کا کام دے گی۔

ہماری دلی خواہش تھی کہ مولانا کے اس طویل مقالہ کو من وعن شائع کرتے کیونکہ اس میں مولانا وحید الزماں صاحب کی زندگی کے ایک اہم اور ہنگامہ خیز دور پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن افسوس کہ صفحات کی تنگ دامانی اور مالی وسائل کی قلت کے باعث ایسا ممکن نہیں ہے، اس لئے اس کا صرف ایک باب جو کیمپ دارالعلوم سے متعلق ہے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ کی مزید دلچسپ اور چونکا دینے والی تفصیلات کے لئے ناظرین کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب مولانا موصوف اپنے مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کریں گے اور ان شاء اللہ وہ بہت جلد اس کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

یکم نومبر ۱۹۸۱ء کو دارالعلوم کے انخلاء کے بعد طلبہ کا تعلیمی کیمپ قائم ہوا تو میں سہارنپور جیل میں تھا، جیل سے رہائی کے بعد دیوبند پہنچا تو دیکھا کہ قبرستان قاسمی کے برابر میں "محمود ہال"[1] کے نام سے زیر تعمیر سہ منزلہ عمارت اور جامعہ طبیہ[2] دارالعلوم دیوبند کے کچھ کمروں میں تقریباً دو ہزار طلبہ

---

[1] ۱۹۸۰ء میں اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا اسعد صاحب نے اس عمارت کا سنگ بنیاد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب ملتان پاکستان کے ہاتھوں سے عالمی مؤتمر فضلاء وابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کے مرکزی دفتر کے نام سے رکھوایا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کی پراپرٹی ہے اور اب اس عمارت میں مسلم فنڈ ہی کے پروگرام مدنی آئی ہسپتال اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ وغیرہ جاری ہیں۔

[2] "جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کا ایک نہایت قابل قدر اور فعال شعبہ تھا جس نے حضرت مہتمم صاحب (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) کی خصوصی دلچسپیوں کی وجہ سے ہندوستان کے طبی اداروں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس کے فضلاء کامیاب اطباء کی حیثیت سے ملک کے طول وعرض میں آج بھی فن طب کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ افسوس کہ دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ نے ایک خاص پس منظر کے تحت قانونی مجبوریوں کا بہانہ لے کر اس اہم شعبے کو بند کر دیا۔ اس شعبے کے بند ہونے پر عالی جناب

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

اس طرح مقیم ہیں کہ جیسے کسی آفت زدہ بستی کے لوگ قدرے محفوظ مقام پر اپنی بھاجڑ رکھ کر مصیبت کے بادل چھنٹنے کا انتظار کیا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان مصیبت کے ماروں کے دل پژمردہ اور چہرے اداس ہوا کرتے ہیں جب کہ کیمپ کے ان مکینوں کی آنکھوں میں عزائم کی بجلیاں، سینے امنگوں سے بھرپور اور دماغ اپنی تقدیر آپ بدل لینے کے حوصلوں اور منصوبوں سے معمور ہیں۔ اور ان کے اندر ان تمام خوبیوں کا وجود مولانا وحید الزماں کیرانوی ناظم کیمپ کا مرہون منت ہے۔

"محمود ہال کی مذکورہ عمارت میں تیسری منزل پر چونکہ چھت ابھی نہیں پڑی ہے اس لئے اس کی دیواروں پر ترپال سامیانہ لگا کر دسمبر کی سخت سردی سے بچاؤ کیا گیا ہے۔ فرشی منزل پر واقع ایک کمرے میں اینٹیں بچھی ہوئی ہیں اور اس کے ایک کونے میں چند اینٹیں لگا کر ان کے اوپر ایک لکڑی کا تختہ رکھ لیا گیا ہے جو ڈیسک کا کام دیتا ہے، یہی ڈیسک دفتر اہتمام، دفتر تعلیمات، دفتر محاسبی دفتر دار الاقامہ ذوران تمام دفاتر کا قائم مقام ہے جن سے دار العلوم کے اندر ان دو ہزار طلبہ کا تعلیمی اور رہائشی نظم و نسق چلایا جاتا تھا۔ اسی کمرے کے دوسرے کونے میں تقریباً دو ڈھائی فٹ کے عرض میں ایک شفاف بستر لگا ہوا ہے جس پر ناظم کیمپ مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ فرصت کا پاتے ہیں تو سکڑ سکڑا کر کچھ دیر کے لئے آنکھ لگا لیا کرتے ہیں۔

یہ کیمپ جہاں کبھی قدرت بھی صبر کو آزماتی ہے اور کبھی مخالفین کی بدخواہیاں بھی رنگ لاتی ہیں، آندھیوں اور طوفانوں کی آماجگاہ ہے۔ سخت سردی کا موسم، مخالفوں کی طرف سے مختلف طرح کی ریشہ دوانیاں پولیس اور پی اے سی کی دھمکیاں اور ہر طرح کی بے سروسامانی۔ یہ مسائل و مصائب چاہتے ہیں کہ کیمپ کی طنابوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں اور طلبہ کو شکستہ دل، مایوس و منتشر کر دیں لیکن جب یہ مصائب عزم و استقلال کے پہاڑ مولانا وحید الزماں کیرانوی کے سینے سے ٹکراتے ہیں تو خود ہی پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ کیمپ میں مولانا کی سحر انگیز شخصیت اہالیان کیمپ کے لیے مرکز و مرجع ہے جو ان کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے اور مخالف قوتوں کے مقابلے میں ان کیلئے ڈھال واقع ہوتی ہے۔ کیمپ میں اگرچہ کچھ اور بھی ذمہ دار اساتذہ ہیں جن کی موجودگی خود مولانا اور طلبہ کے لئے

بقیہ حاشیہ: حکیم عبد الحمید صاحب قبلہ نے خلاف عادت ایک اخباری بیان جاری کر کے اپنے افسوس اور احتجاج کا اظہار فرمایا تھا اور پیش کش فرمائی تھی کہ اگر دار العلوم کی انتظامیہ اپنے اس فیصلے سے رجوع کرے تو وہ موصوف قانونی اڑچنوں کو دور کرانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

تقویت اور حوصلے کا باعث ہے لیکن ان حضرات کی عملی سرگرمیاں عموماً تدریسی ذمہ داریوں، جلسے جلوسوں میں تقریروں اور مشوروں کی حد تک محدود ہیں جب کہ مولانا نے اپنا گھر بار چھوڑ کر شب و روز کیمپ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے وہ رات دن کیمپ ہی میں قیام کرتے اور اپنے بیش قیمت وقت کا ہر ہر لمحہ کیمپ ہی کی بہبود پر صرف کرتے ہیں

مولانا نے کیمپ کا تعلیمی و انتظامی نظم و نسق اس طرح قائم کیا تھا کہ اساتذہ کے علاوہ تکمیل ادب عربی کے کچھ ممتاز طلبہ کو بھی تدریسی، ذمہ داریاں سپرد کی تھیں جنھوں نے نہایت عمدگی کے ساتھ یہ ذمہ داریاں نبھائیں۔ علاوہ ازیں تدریس کیلئے دیگر مدارس سے بھی کچھ اہل علم کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ تقسیم وظائف اور خورد و نوش اور طلبہ کے اندرونی نظم و نسق کی ذمہ داریاں جمعیۃ الطلباء کے ذمہ داران اور کارکنوں کو تفویض کی گئی تھیں۔ جب کہ دفتر کے جملہ امور مع حساب کتاب ایک انتہائی امانت دار، بے لوث اور جرأت مند شخصیت جناب ارشد عثمانی دیوبندی کے سپرد تھے۔ ارشد عثمانی صاحب مولانا کی موجودگی میں ان کے مشیر خاص اور پیش کار اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے نائب اور معتمد سمجھے جاتے تھے۔ کیمپ کا ہر فرد موصوف کی خوش اخلاقی، سنجیدگی، محنت اور بے لوثی اور مولانا کے اس انتخاب کا مداح تھا۔ طلبہ ان سے بے پناہ انس اور لگاؤ رکھتے اور محبت سے "ارشد بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ دارالعلوم کھلنے کے بعد ان کی شاندار کارکردگی کے اعتراف کے طور پر جب ان کو "ناظم محاسبی" بنانے کی پیشکش کی گئی تو انھوں نے شکریے کے ساتھ انکار فرمادیا۔

تیہاڑ جیل سے واپسی کے بعد مولانا نے حکم فرمایا کہ میں ارشد صاحب کی معاونت کروں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور حقیقت یہ ہے کہ دفتری نظم و نسق کے سلسلے میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔

کیمپ کے قیام کے وقت مولانا کے ایک نائب بھی مقرر کیے گئے تھے لیکن مولانا کو ان کا کوئی تعاون حاصل نہ تھا۔ مجھے جب بھی ان کی زیارت نصیب ہوئی انھیں تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں پایا۔ پان لگاتے ہوئے، پان کھاتے ہوئے یا پان تھوکتے ہوئے۔ کیمپ کے انتظامی امور میں موصوف کے دلچسپی نہ لینے کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی چند ماہ بیشتر عالمی مؤتمر کے ساتھ ساتھ دیوبند میں ان کا بھی ورود مسعود ہوا تھا نہ طلبہ ان سے آشنا تھے نہ وہ طلبہ سے مانوس۔

کیمپ میں ہر طرح کی بے سروسامانی کے باوجود مولانا کی حکمت و دانائی اور قربانیوں

کے باعث دارالعلوم کے مقابلے میں جہاں منتظین کو ہر طرح کے وسائل حاصل تھے کافی بہتر نظام قائم ہوگیا تھا ، یہاں کے اساتذہ دارالعلوم کے اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ تندہی، محنت اور پابندی کے ساتھ پڑھاتے، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان دارالعلوم کے مقابلے میں زیادہ میل محبت اور ملاپ تھا۔ طلبہ کے خورد و نوش، روشنی اور دوا وغیرہ کا نظم دارالعلوم کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھا۔ طلبہ کے باہمی مسائل کو مولانا منٹوں اور سکنڈوں میں حل کر دیا کرتے تھے۔ جو دارالعلوم کے ان منتظمین کے لئے ایک چیلنج تھا جو طلبہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بات کا بتنگڑ بنا کر ہفتوں اور مہینوں لٹکائے رکھا کرتے تھے۔

جب کیمپ کو عوامی عطیات موصول ہونا شروع ہوئے تو طے پایا کہ طلبہ کو دارالعلوم میں جو وظیفہ نقد ملا کرتا تھا اسے کیمپ میں بھی جاری کیا جائے۔ اسی طرح کیمپ کے اساتذہ کو بھی دارالعلوم کی تنخواہ کا نصف حصہ دیا جایا کرے۔ چنانچہ طلبہ کو وظائف کی تقسیم شروع ہوئی اور اساتذہ کو تنخواہ بھی پوری پابندی کے ساتھ دی جانے لگی جسے ہر ماہ کی آخری تاریخ کو مولانا کے حکم پر ایک لفافے میں رکھ کر میں خود اساتذہ کے گھر پہنچایا کرتا۔

کیمپ میں مولانا کے سامنے مختلف طرح کے مسائل اور مشاکل تھے مثلاً کیمپ اور طلبہ کے بیچ در پیچ اندرونی و بیرونی مسائل، مقدمات اور پولیس والوں سے نمٹنا، پولیس والوں کو مطمئن کرنا، بڑی تعداد میں باہر سے آنے والے مہمانوں کا استقبال اور ان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا، شہر والوں سے رابطہ اور ان کو کیمپ کے تعاون پر آمادہ رکھنا، کیمپ کی تعلیمی اور انتظامی نگرانی اور تعلیم و انتظام سے متعلق بروقت فیصلے، کیمپ کے لئے شہر اور شہر کے باہر سے مالیات و اشیاء ضروریہ کی فراہمی، نکتہ چینوں اور بدخواہوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی افواہوں کے جوابات وغیرہ۔

گوناگوں مسائل اور مصائب کے اس ہجوم اور کیمپ کے اندرونی حاسدوں اور بیرونی دشمنوں کی کڑی نگاہ اور تجسس کے باوجود کیمپ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں گزرا جس سے لوگوں کو کسی بدنظمی یا بدمزگی کا احساس ہوا ہو۔ کیمپ کے ہزاروں طلبا، اساتذہ، کارکنان اور معاونین سب مل کر ایک ایسا خاندان نظر آتے تھے جو پورے اتحاد اور ذہنی یگانگت کے ساتھ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہو، جبکہ ایسے مواقع پر جب مصائب اور دشواریوں کا سامنا ہو تو چند آدمیوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے معاشرے میں بھی اختلافات اور تنازعوں کا رونما ہونا

ایک عام سی بات ہوا کرتی ہے۔

کیمپ کا یہ متحد اور منفرد معاشرہ یوں ہی نہیں تشکیل پا گیا تھا بلکہ اس کے پیچھے مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی وہ بے پناہ صلاحیتیں کارفرما تھیں جو اللہ رب العزت نے اس بے مثال انسان کے اندر ودیعت کی تھیں، وہ کیمپ کی تمام جزئیات اور تفصیلات سے آگاہ رہتے، ہر روز دفتر کے کارندوں کی رپورٹیں ساعت فرماتے اور آئندہ کے لئے انھیں ہدایات دیتے، خاص طور سے حساب وکتاب پر گہری نظر رکھتے، ہر روز شام کو دفتر کے تفصیلی روزناموں سے نقل کر کے آمد وصرف کا اجمالی خاکہ خود اپنے پاس بھی محفوظ رکھتے، ہر ہفتہ اور ہر ماہ آمد وصرف کے نہایت واضح گوشوارے مرتب کراتے اور ایک کاپی اپنے فائل میں بھی محفوظ رکھتے، دفتر کے لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے کہ کسی افسر کی اعلیٰ کارکردگی اور فعالیت کا معیار یہ ہے کہ جب وہ شام کو کام سے فارغ ہو تو اس کے ڈیسک پر کوئی ایک بھی ایسا کاغذ باقی نہ رہے جس پر آج کارروائی ممکن تھی۔ وہ خود اس پر سختی سے عامل تھے۔ چنانچہ وہ جب فائلوں پر کارروائی کے لئے بیٹھتے تو اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک ایک ایک فائل اور ایک ایک کاغذ پر احکامات اور ہدایات صادر نہ فرمادیتے۔ دفتر کے اہم فائلوں پر کارروائی کا وقت عموماً روزانہ رات کو بارہ بجے کے بعد سے دو ڈھائی بجے تک ہوا کرتا تھا۔ طلبار کی معمولی درخواستوں پر دن ہی میں فیصلے فرمادیتے تھے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد رات میں دو ڈھائی بجے کا یہ وقت ہم دفتر کے خدام کو کبھی گراں گزرتا مگر وہ پوری بشاشت کے ساتھ ایک ایک تحریر ملاحظہ فرماتے اور اس پر اپنے قلم سے احکامات تحریر فرماتے۔ ایک بار اس صورتِ حال سے اکتاکر میں نے کچھ فائل پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت! ان فائلوں میں، میں نے ہر نوع کے کاغذات الگ الگ منسلک کر دیئے ہیں۔ آپ ہر کاغذ پر حکم لکھنے کے بجائے ہر نوع پر ایک مجموعی حکم تحریر فرمادیں ہم اس نوع کے جملہ معاملات سے متعلق وہی حکم نافذ کر دیں گے۔ اس پر مولانا نے مسکراتے ہوئے کسی مفکر کا یہ قول دہرایا کہ "جو کام کرنے کے قابل ہے وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے سلیقے سے کیا جائے"۔ پھر جب انھوں نے ہر ہر کاغذ کو ملاحظہ فرما کر احکامات لکھنے شروع کئے تو واقعی ان میں کچھ ایسے معاملات بھی سامنے آئے جن پر اگر ایک ہی عبارت کا حکم نافذ کیا جاتا تو دفتر کے بارے میں بدگمانیوں کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد مولانا نے ہماری اکتاہٹ اور بوریت کے علاج کے لئے ایک تدبیر بھی پیش فرمائی مگر ہم نے اسے منظور نہ کیا اور آئندہ بغیر کسی اکتاہٹ کے حسب معمول رات کو بارہ بجے کے بعد ہی فائل

لے کر خدمت میں حاضر ہوتے رہے، مولانا کی عادت تھی کہ فائلوں کے ان خشک موضوعات میں سے بھی ظرافت اور مزاح کے ایسے پہلو نکال لیتے جن سے مجلس قہقہہ زار رہتی۔ ایک مرتبہ ایک بنگالی طالب علم نے اپنی ایک درخواست میں اپنے لئے دو گدّوں کی ضرورت کا اظہار کیا، لیکن اردو کم جاننے کے سبب لفظ "گدوں" کا املا "گدھوں" تحریر کیا اور لکھا کہ "مجھے فلاں وجہ سے دو گدھوں کی ضرورت ہے" اتفاق سے اس وقت مولانا کے پاس چار آدمی موجود تھے اور قریب ہی چار گدّے بھی رکھے ہوئے تھے، مولانا نے درخواست پڑھ کر مذکورہ طالب علم سے فرمایا کہ بھئی یہاں چار گدھے موجود ہیں آپ اپنے لئے دو کا انتخاب کر لیجئے۔ اس پر مجلس میں دیر تک شگفتگی اور تبسم کی فضا طاری رہی۔ مولانا طلبہ کی عزتِ نفس کا غیر معمولی خیال رکھتے اور ان پر بھرپور اعتماد فرماتے تھے۔ چنانچہ کیمپ میں طلبہ کے لئے عام اجازت تھی کہ وہ مولانا کو جہاں اور جس وقت پائیں اپنی درخواست پیش کر دیں یا زبانی طور پر اپنی ضرورت کا اظہار کر دیں۔ یعنی طلبہ کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ مولانا کے دفتر میں بیٹھنے کا انتظار کریں۔ ایسے مواقع پر مولانا طلبہ کی معمولی درخواستوں پر جہاں بھی اور جس حال میں بھی ہوتے دستخط فرما دیتے اور متعلقہ طالب علم ہی کو حکم فرماتے کہ وہ دفتر جا کر اس درخواست پر مہر لگوا لے۔ لیکن اگر کسی طالب علم نے درخواست میں اپنی کسی ایسی ضرورت کا اظہار کیا ہوتا جس کے بارے میں مولانا کو محسوس ہوتا کہ دفتر والوں کو اس ضرورت کا علم متعلقہ طالب علم کی سبکی یا شرمندگی کا باعث ہوگا تو مولانا دفتر سے مہر طلب فرما کر خود ہی مہر ثبت فرماتے ——— اور رازدارانہ طور پر ہی اس کا اندراج کراتے۔

کیمپ میں مولانا بڑی بڑی خریداریاں طلبہ کے ذریعے کراتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک بار مطبخ کی لکڑیاں اور لحافوں کے استر یا شاید لحاف جن کی خریداری پر کافی بڑی رقم صرف ہوئی تھی طلبہ ہی کے ذریعے خریدے گئے تھے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس سے طلبہ میں خود داری، خود اعتمادی اور ذمہ داری اور اپنے ادارے سے ہمدردی اور اپنائیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور چونکہ طلبہ کو عموماً زیادہ گھومنے اور زیادہ بولنے کی عادت ہوتی ہے اس لئے وہ ایک معمولی سی چیز کے لئے بھی پورے بازار میں گھوم کر ریٹ معلوم کرتے ہیں اور دوکاندار سے جھک جھک کر کے کم سے کم داموں پر اشیاء کی خریداری کر لاتے ہیں جب کہ ملازم عموماً ایک دو دوکان سے زیادہ معلومات نہیں کرتے اور اشیاء کا سودا کرتے وقت زیادہ مول تول کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

کیمپ کے علاوہ دارالعلوم میں بھی مولانا کے طلبہ پر اعتماد کا یہی عالم تھا جب شوال سنہ ۱۳۹۱ھ

میں تکمیل ادب عربی" میں داخلے کے لئے ہمارا ٹیسٹ ہوا تو مولانا سوالات لکھوانے کے بعد امتحان ہال سے اٹھ کر چلے گئے اور جانے سے پہلے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

دیکھیئے آپ سب فضلائے دار العلوم ہیں اور فاضل دار العلوم ہونا میرے نزدیک امانت، دیانت، صداقت اور اعتماد کی سب سے بڑی ڈگری ہے، اس لئے میں آپ کی نگرانی ضروری نہیں سمجھتا، اور یوں بھی اگر آپ چیٹنگ کرنا چاہیں تو آپ کی اس بڑی تعداد کے مقابلے میں میری تن تنہا نگرانی کافی نہ ہوگی اس لئے میں آپ کے ضمیر اور اعتماد پر امتحان ہال سے اٹھ کر جا رہا ہوں، گویا یہ امتحان آپ کی دو صلاحیتوں کا امتحان ہے یعنی علمی صلاحیت اور تربیتی اور اخلاقی صلاحیت۔ اگر ان دونوں صلاحیتوں میں سے آپ کسی ایک میں بھی ناکام رہے تو میری جماعت (تکمیل ادب عربی) میں آپ کا داخلہ بے سود رہے گا۔ چنانچہ مولانا اٹھ کر چلے گئے اور طلبہ نے ان کی بات کا اثر لیتے ہوئے امتحان میں کسی طرح کی چیٹنگ نہ کی۔ مولانا بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اگر آپ طلبہ پر اعتماد کریں تو طلبہ آپ پر اعتماد کریں گے۔

طلبہ کا مظاہرہ

کیمپ میں دار العلوم کے بعض ان طلبہ کے علاوہ جو کسی وجہ سے گھر چلے گئے تھے تقریباً سبھی طلبہ مقیم تھے، کیمپ کے رجسٹر اندراجات کے مطابق ان طلبہ کی کل تعداد اٹھارہ سو اٹھاون (۱۸۵۸) تھی۔ رجسٹر اندراجات اگرچہ کیمپ کے قیام کے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد تیار کیا گیا تھا اور ابتدا میں طلبہ کے ناموں کے اندراج میں غالباً کوئی ضابطہ بھی متعین نہیں کیا جاسکا تھا مگر ذمہ داران کیمپ کے علم کی حد تک یہ یقینی تھا کہ جو طلبہ کیمپ میں مقیم ہیں وہ دار العلوم ہی کے طلبہ ہیں ممکن ہے کہ بعض باہر کے طلبہ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا نام مندرج کرا لیا ہو، مگر ایسے طلبہ کی تعداد دو چار یا دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔ رجسٹر اندراجات تیار ہو جانے کے بعد مولانا نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ کیمپ میں کسی طالب علم کا نام مندرج ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کیمپ کا کوئی استاذ یا کم از کم دو طالب علم گواہی دیں کہ اندراج کا خواہشمند طالب علم کیمپ سے پہلے دار العلوم میں باضابطہ داخل تھا نیز یہ کہ دار العلوم کھلنے کے بعد اگر وہ باضابطہ داخل نہ پایا گیا تو اسے کسی بھی وقت خارج کر دیا جائے گا۔ اس ضابطے کے بعد چند طلبہ نے حسب ضابطہ اندراج کرایا تھا، میری یادداشت کے مطابق ان کی تعداد دس پندرہ سے بھی کم تھی مگر اس کے بعد

جب دارالعلوم پر قبضے کی بات زبانوں پر آنے لگی تو یہ اندراج قطعاً بند کر دیا گیا تھا۔ ایسا اس لیے بھی کیا گیا تھا کہ مخالفین کیمپ نے حکام کو باور کرا رکھا تھا کہ کیمپ میں دارالعلوم کے باضابطہ طلبہ صرف سترہ (۱۷) ہیں باقی سب طلبہ قرب وجوار کے مدارس سے بلائے گئے ہیں نیز مخالفین نے یہ بھی افواہ گرم کر رکھی تھی کہ کیمپ میں خاصی تعداد غنڈوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی ہے جنھیں دارالعلوم پر قبضہ کرنے کی غرض سے طلبہ یا کارکنوں کے نام پر ٹھہرایا گیا ہے اور جن سے کسی بھی وقت شہر کا امن وامان تباہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر حکام بار بار مولانا سے ملاقات کرتے اور اس بات کا ثبوت مانگتے کہ کیمپ میں جو لوگ موجود ہیں وہ دارالعلوم ہی کے طلبہ و کارکنان ہیں۔
مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب ایس پی (سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) نے دفتر کیمپ میں آکر مولانا سے اس بارے میں سوال کیا اور مولانا نے یقین دہانی کرائی کہ چند ایسے لوگوں کو چھوڑ کر جن کا حسب ضرورت تقرر کر لیا گیا ہے یہاں سبھی لوگ دارالعلوم کے باضابطہ طلبہ یا باضابطہ کارکنان ہیں تو ایس پی نے پلٹ کر کہا کہ آپ کا یہ کہنا درست نہیں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (حال استاذ دارالعلوم و مدیر ماہنامہ دارالعلوم) دارالعلوم کے استاذ یا کوئی ملازم نہیں ہیں اور وہ کیمپ میں مدرس ہیں۔ اس پر مولانا نے جواب دیا کہ آپ کا کہنا صحیح ہے نگران کو اس لیے رکھا گیا ہے کہ جس بلڈنگ میں کیمپ قائم ہے وہ عالمی مؤتمر کی بلڈنگ ہے اور مولانا حبیب الرحمان اعظمی عالمی مؤتمر کے سکریٹری ہیں، اس لئے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے ان کا یہاں قیام ضروری ہے اور چونکہ کیمپ میں اساتذہ کی کمی ہے اس لئے طلبہ کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ہم نے ان کی تدریسی خدمات حاصل کی ہیں، اس پر بھی اگر آپ کے ان پر شبہ ہے تو میں ان کی ذمہ داری اور ضمانت لیتا ہوں۔ اس پر ایس پی نے ہنستے ہوئے کہا کہ ہمیں آپ کے اوپر مکمل اعتماد ہے۔ اس موقع پر مولانا نے ایس پی کو کیمپ کے بعض ان اساتذہ اور ملازمین کی فہرست بھی دی تھی جن کا حسب ضرورت کیمپ میں تقرر کر لیا گیا تھا۔
اسی طرح ایک بار پولیس کی ایک جماعت نے کیمپ میں آکر مولانا سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کیمپ میں آپ نے دارالعلوم کے طلبہ کے نام پر علاقے کے غنڈوں اور قرب وجوار کے مدارس کے طلبہ کو ٹھہرا رکھا ہے اس لئے آپ ہمیں طلبہ کے شناختی کارڈ چیک کرا دیجیے۔ مولانا نے جواب دیا کہ دارالعلوم میں طلبہ کے لئے شناختی کارڈ رکھنا لازم نہیں تھا اس لئے ضروری نہیں کہ سب طلبہ کے پاس شناختی کارڈ موجود ہوں، البتہ آپ اس طرح اپنا شک دور کر سکتے ہیں کہ دارالعلوم سے رجسٹر داخلہ نکلوائیں اور ہر طالب علم کا نام پکاریں اور ولدیت خود طالب علم سے

معلوم کریں جو طلبہ صحیح ولدیت بتا سکیں انہیں دارالعلوم کا طالب علم تسلیم کریں اور اگر کوئی نہ بتا سکے یا غلط بتائے تو اسے میں آپ کے سامنے ہی کیمپ سے خارج کر دوں گا، مولانا نے پولیس والوں سے الزاماً کہا کہ اگر کیمپ میں علاقے کے جرائم پیشہ لوگ مقیم ہیں تو ان کے نام اور پتے پولیس کے ریکارڈ میں موجود ہوں گے میں ابھی سب طلبہ اور ملازمین کو بلائے دیتا ہوں آپ ان کی شناخت کریں اور جسے بھی ان میں سے پائیں اسے یہیں سے گرفتار کر لیں۔

لیکن حکام پر مخالفین کے دباؤ کے پیش نظر مولانا کی یہ دلیلیں اثر انداز نہ ہوئیں۔ توقع تھی کہ اس موقع پر مولانا اسعد صاحب ایم پی کی حیثیت اور اثر و رسوخ کچھ رنگ لائیں گے مگر کیمپ میں کبھی ان کا مظاہرہ نہ ہوا۔ بالآخر کیمپ سے تحصیل تک طلبہ کے ایک مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی قیادت مولانا کے علاوہ کیمپ کے سینئر اساتذہ نے کی تحصیل پر پہنچ کر مولانا نے طلبہ اور حکام کی موجودگی میں ایک نہایت پرجوش تقریر کی۔ تقریر کے دوران حکام کے خلاف مولانا کی زور بیانی کا یہ عالم تھا کہ مولانا کے استاذ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ از راہِ محبت و شفقت ان کے برابر میں کھڑے ہو کر ان کے شانے کو پکڑے ہوئے تھے اور گاہ بگاہ پانی پیش فرما رہے تھے۔

اس تقریر میں مولانا نے حکام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ——— "ہمیں امن کے لئے خطرہ بتایا جاتا ہے، ہمارا مظاہرہ وہاں سے یہاں تک آیا ہے، حکام بتائیں کہ نقصِ امن تو درکنار کہیں ہماری صف بھی ٹیڑھی ہوئی ہو اور اسی طرح ان شاء اللہ یہاں سے وہاں تک جائے گا۔ ہم امن کے لئے خطرہ نہیں ہم امن کے پیغامبر ہیں، ہم شہریوں کے دشمن نہیں ہم شہریوں کے دوست اور وہ ہمارے سرپرست ہیں۔ امن کے لئے خطرہ وہ لوگ ہیں جو ہر روز نئی افواہیں پھیلا رہے ہیں آپ کو ہندوستان میں کوئی ایسی مثال نہ ملی ہوگی کہ دو ہزار طلباء کو سخت سردی میں سڑک پر لا کر پھینک دیا گیا ہو اور وہ ہماری طرح پر امن رہے ہوں لیکن ہماری اس شرافت کو ہماری کمزوری نہ سمجھا جائے۔ ہم حکام کو ایک ہفتہ کا وقت دیتے ہیں یا تو وہ اس مدت میں طلبہ کے لئے دارالعلوم کو کھلوا دیں یا پھر ہم اس کے در و دیوار سے ٹکرا جائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں دارالعلوم میں داخل ہونے سے روک نہ سکے گی۔"

ایک طالب علم کی موت

مصائب اور پریشانیوں کے اس عالم میں جبکہ مولانا کیمپ کے انتظامات، حکام کی

دھاچوکڑیوں اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تن تنہا لوہا لے رہے تھے اور ان تمام مصروفیتوں کی وجہ سے تکان سے چور چور ہو جاتے تھے، بہار کے ایک طالب علم کی طبیعت خراب ہوئی اور طبیعت کی خرابی دیوبند کے نامور ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرلینے کے باوجود بڑھتی گئی یہاں تک کہ یہ طالب علم رات کو تقریباً عشاء کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔ مولانا کو جو اس کی پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھے جب کسی طالب علم نے یہ خبر دی اور پھر ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کی تو مولانا غش کھاکر گر پڑے اور غشی کے عالم میں بس یہی کہتے کہ جاؤ اب مجھے سونے دو یا کبھی اس طالب علم کا نام لے کر اس کی طبیعت پوچھتے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے مولانا نے ارشد عثمانی صاحب کی مدد کے لئے دفتر میں متعین فرمایا تھا اور ادب عربی کے کچھ اسباق بھی مجھ سے متعلق کردیئے تھے، جب کبھی مولانا فراہمی مالیات کے لئے کیمپ سے باہر جاتے اور ارشد عثمانی مرحوم بھی اپنے ایک دائمی مرض کی وجہ سے اتفاقاً دورہ پڑنے پر دفتر نہ آتے تو دفتر کی تمام تر ذمہ داریاں مجھ ہی پر آن پڑتیں، کیوں کہ کوئی اور استاذ یا ذمہ دار دفتر کی الجھنوں سے دل چسپی نہ لیتا تھا۔ یہ لمحات میرے لئے نہایت پریشان کن اور حوصلہ شکن ہوتے اور اندازہ ہوتا کہ مولانا کو اللہ نے کتنی قوت و طاقت، کتنا صبر و حوصلہ، اور کتنی دانائی و حکمت اور کتنا ثبات و استقلال عطا فرمایا ہے۔

اس موقع پر بھی وہی ہوا کہ ادھر طالب علم کی موت اور ادھر مولانا کی غشی اور پھر اسی موقع پر جناب ارشد عثمانی صاحب کو بھی ان کی دائمی بیماری کے سبب دورے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ وہ مجھے یہ ہدایت فرماکر گھر چلے گئے کہ میں اس طالب علم کی میت کے پاس رہوں اور مولانا کے دیگر قریبی طلبہ کو بھی سختی سے پابند کردوں کہ وہ طالب علم کی موت کی خبر کم از کم کیمپ سے باہر نہ جانے دیں جب تک کہ مولانا اس سلسلے میں کوئی پالیسی طے نہ فرمادیں، کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اس سے طلبہ میں سراسیمگی پھیلے گی یا مخالفین اس کو غلط رنگ دینے کی کوشش کریں گے۔

یہ طالب علم عمارت کی تیسری منزل پر رہتا تھا جس کی چھت پر شامیانہ لگا ہوا تھا وہیں اس کا انتقال ہوا، میں اور میت کا ایک ساتھی طالب علم میت کے پاس موجود تھے۔ اس کمرے کے باقی طلبہ مذکورہ طالب علم کی بیماری اور بارش کے متوقع خطرے کے پیش نظر نیچے کے کمروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ تقریباً پونے دو بجے زور کی آندھی اور بارش آئی قریب تھا کہ شامیانے کو اڑلے جائے اور ہم بے دست و پا کھڑے رہ جائیں۔

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

اسی دوران میں نے دیکھا کہ مولانا تشریف لا رہے ہیں انھیں دیکھ کر اطمینان سا ہوا، مولانا نے کہا کہ ہوا کا زور ہے شامیانے کی طناب کو طاقت کے ساتھ پکڑ لو، چناں چہ ہم تینوں نے شامیانے کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ ہم لوگ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر مولانا سے یہ بھی عرض نہ کر سکے کہ شامیانہ پکڑنے کے لئے ہم ہی کافی ہیں، وہ خود زحمت نہ فرمائیں۔ اگر چہ اس کمرے سے کچھ ہی دور کے فاصلے پر طلباء سو رہے تھے مگر کچھ وجوہات کی بنا پر ان کو جگانا اور ان سے مدد لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہوا اور پانی کے دباؤ سے شامیانہ پھٹا اور اس کے اوپر جو پانی تھا وہ تمام میت کے اوپر آ گرا۔ یہ دیکھ کر ہم تینوں نے میت کو سہارا دے کر اسی کمرے میں ایک دوسری جگہ منتقل کیا وہاں بھی جب یہی واقعہ پیش آیا تو پھر ہم نے میت کو گود میں اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں منتقل کیا اور منتقل کرنے میں مولانا نے بھی سہارا دیا۔ میت کو منتقل کرنے کے بعد مولانا کی طبیعت پھر بگڑنا شروع ہوگئی اور کمرے میں جاکر سابقہ غشی کی کیفیت پھر عود کر آئی یہاں تک کہ غالباً وہ صبح کو اس طالب علم کے جنازے میں بھی شرکت نہ کرسکے۔ یہی تھا طلبہ میں مولانا کی مقبولیت اور مولانا پر طلبہ کی جاں نثاری کا راز اور یہی وجہ تھی کہ طلبہ ہر طرح کے خطرات مول لے کر تقریباً چار ماہ تک مولانا کے ایک اشارے پر کڑاکے کی سردی اور شدید پریشانی کے عالم میں سینہ سپر رہے۔ دارالعلوم کی فتح کے دعوے دار سوچیں کہ کیمپ کے دوران انھوں نے کوئی ایک شب بھی ایسی گذاری ہے جس میں ان کا دل کسی طالب علم کے لئے اس قدر تڑپا ہو کہ وہ اپنا دکھ درد بھول کر اس کی محبت اور خیر خواہی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہوں؟

پی اے سی کے سامنے سینہ سپر

حکام پر دارالعلوم کی انتظامیہ کا دباؤ تھا کہ طلبہ جامعہ طبیہ کے جن کمروں پر قابض ہیں۔ وہ ان کمروں کو خالی کردیں اور مزید کسی کمرے پر قبضہ نہ کریں۔ دوسری طرف طلبہ انتظامیہ سے چرطے حکام کی بار بار کی دھمکیوں اور رہائشی ضرورت کے پیش نظر جامعہ طبیہ کے تمام کمروں پر اپنا کنٹرول چاہتے تھے۔

مولانا نے تو مذکورہ کمرے ہی میں جس میں کیمپ کا دفتر قائم تھا اور دن رات طلبہ کی آمد و رفت

جاری رہا کرتی تھی اپنے بیٹھنے کے لئے دو ڈھائی فٹ جگہ بنالی تھی۔ لیکن باہر سے جو موقر مہمان آتے ان کے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہاں تک کہ بڑی بڑی موقر شخصیتیں جن میں علماء، وزراء اور صحافی سبھی شامل ہوتے جب کیمپ میں آتے تو ان سے بات کرنے تک کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ نائب مہتمم حضرت مولانا محمد عثمان صاحب، صدر المدرسین حضرت مولانا معراج الحق صاحب جب کیمپ تشریف لاتے تو ان کے لئے کوئی بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ان حضرات کو بھی بعض مرتبہ کھڑے کھڑے ہی بات کرکے واپس ہو جانا پڑتا تھا یا پھر کسی ضروری گفتگو کے لئے کیمپ سے کہیں باہر جانا پڑتا تھا۔

ایک دن جب کہ مولانا کسی مقدمہ کی تاریخ پر سہارن پور گئے ہوئے تھے طلبہ نے جامعہ طبیہ کے صدر دروازے سے کچھ فاصلے پر واقع کمرے کا قفل توڑ کر اس پر قبضہ کرلیا اور اس پر کوئلے سے بڑے بڑے حروف میں "دفتر اہتمام کیمپ دارالعلوم دیوبند" لکھ دیا۔ یہ دیکھ کر پولیس حرکت میں آئی اور پولیس کی ایک جمعیت نے کیمپ میں داخل ہو کر طلبہ سے زبردستی یہ کمرہ خالی کرالیا۔ اور اس میں اپنا تالا اور غالباً سیل لگادی۔ مولوی محمد عثمان انبہٹوی جو اس وقت جمعیۃ الطلباء کے صدر تھے انھوں نے پولیس افسران کے سامنے ہی وہ تالا اور سیل توڑ کر اس کمرے پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ پولیس والوں نے جب یہ دیکھا تو دھمکی دی کہ یہ کمرہ ہمیں بہر حال خالی کرانا ہے خواہ اس کے نتیجے میں ہمیں پورے کیمپ ہی کو کیوں نہ اُجاڑنا پڑے۔ اس کے جواب میں مولوی محمد عثمان نے افسران سے کہہ دیا کہ ہم نہ کسی قیمت پر اس کمرے کو خالی کریں گے اور نہ بقیہ عمارتیں خالی کریں گے اور جامعہ طبیہ میں مزید جتنے کمرے ہیں ان سب پر بھی قبضہ کریں گے۔ پولیس کے افسران اس وقت تو دھمکی دے کر چلے گئے مگر اس سے اگلے یا دوسرے روز جب کہ مولانا پھر دیوبند سے باہر اغلباً سہارنپور گئے ہوئے تھے تو عصر کے بعد پی اے سی کے خیموں میں جو حضرت مہتمم صاحب کی انتظامیہ کی درخواست پر مدنی گیٹ کے باہر لگے ہوئے تھے طلبہ نے کچھ غیر معمولی حرکت محسوس کی۔ ایسا محسوس ہوا کہ پی اے سی کے افسران اور سپاہی کسی مہم کو سر کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ سہارن پور روڈ پر عصر کے بعد جو طلبہ تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے انھوں نے فوراً واپس آکر بتایا کہ پی اے سی کی کچھ گاڑیاں شہر کے باہر سہارن پور روڈ پر کھڑی ہیں اور سپاہی سب مسلح ہیں یہ اطلاع پاکر جمعیۃ الطلبہ کے کچھ ذمہ داران پی اے سی کے خیموں میں گئے اور کئی ماہ تک قریب رہنے کے باعث جن سپاہیوں سے کچھ جان پہچان ہو گئی تھی ان سے اس غیر معمولی نقل وحرکت کا سبب معلوم کیا، انھوں نے بتایا کہ

آج ہمارے افسر بالا آنے والے ہیں، ان کے استقبال کی تیاریاں ہیں، لیکن جب طلبہ نے کہا کہ آپ کے افسران بالا تو روزانہ ہی آتے رہتے ہیں کبھی بھی آپ لوگ اس شان سے تیار نہیں ہوتے تو انھوں نے ان طلبہ کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سپاہیوں نے مسلح اور منظم ہونا شروع کیا انھوں نے خود کو کئی ٹکڑیوں میں تقسیم کیا اور مسلح سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہوکر پوزیشن سنبھال لی۔ محسوس ہوتا تھا کہ کسی حکم کے انتظار میں ہے پی اے سی نے ایک گاڑی پر لاؤڈ اسپیکر بھی سیٹ کر لیا۔ ہم لوگوں کا خیال تھا کہ افسران پہلے لاؤڈ اسپیکر سے کیمپ کے انخلاء کی وارننگ دیں گے اور پھر عدم تعمیل کی صورت میں سپاہیوں کو پیش قدمی کا حکم دیں گے۔

ادھر طلبہ نے جب پی اے سی کے تیور بدلے ہوئے دیکھے تو انھوں نے بھی ایک سرفروشانہ یا طفلانہ پروگرام مرتب کیا اور پی اے سی کے مقابلے کی ٹھان لی۔ انھوں نے طے کیا کہ طلبہ درجنوں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہوکر مختلف کمروں اور کمین گاہوں میں خاموشی کے ساتھ روپوش ہو جائیں اور طلبہ کی ایک بڑی جماعت اپنی حرکت وعمل سے پی اے سی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرے کہ طلبہ پی اے سی سے مزاحم تو نہیں ہیں لیکن اس کے حکم کی تعمیل کرنا نہیں چاہتے۔ پھر پی اے سی اگر فائرنگ کرتی ہے تو یہ جماعت جامعہ طبیہ کے آخری کونے پر واقع افریقی منزل کے کمروں میں گھس جائیں اور اگر انخلاء یا گرفتار کرنے کی پیش قدمی کرتی ہے تو اسے بغیر مزاحمت کے پیش قدمی کرنے دیں اور جب پی اے سی کی یہ جماعت جامعہ طبیہ کے کیمپس میں اندر تک داخل ہو جائے تو صدر جمعیۃ الطلبہ مولوی محمد عثمان صاحب کیمپ کا گھنٹہ بجائیں جسے چھت پر چاروں طرف اینٹیں چن کر محفوظ کر لیا گیا تھا یہ گھنٹہ صدر جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے اس بات کا حکم ہوگا کہ طلبہ اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلیں اور عقابوں کی طرح دوڑ کر سرفروشانہ انداز میں پی اے سی کے سپاہیوں کی ٹانگوں میں گھس جائیں تاکہ وہ ہتھیار نہ چلا سکیں اور اس طرح پی اے سی کے جو بھی سپاہی ہاتھ لگیں انھیں یرغمال بنالیں یہاں تک کہ پی اے سی کسی مصالحت پر آمادہ ہو جائے۔

طلبہ کا یہ پروگرام اگرچہ اس وقت طفلانہ اور ناقابل عمل سا معلوم ہوتا ہے مگر اس وقت مولانا کی تربیت کے نتیجے میں طلبہ کے اندر جو جوش اور فداکارانہ اور جانبازانہ کیفیت اور ڈسپلن پیدا ہو گیا تھا اس کے پیش نظر بعید نہ تھا کہ یہ پروگرام کامیاب ہو جاتا۔ مولانا اپنی مختلف تقریروں اور مجلسوں میں کہا کرتے تھے کہ بہادری اس کا نام نہیں ہے کہ ضرورت کے وقت آپ

اسلحہ تلاش کرتے پھریں بلکہ کمال بہادری یہ ہے کہ آپ دشمن کا ہتھیار چھین کر اسی سے اس پر وار کریں۔

دونوں طرف تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں اور کیمپ کا کوئی ذمہ دار یا استاذ کیمپ میں موجود نہ تھا، اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ اس صورتِ حال کی اطلاع کم از کم جناب حسیب صدیقی صاحب منیجر مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کو کر دی جائے ممکن ہے کہ وہ حکام سے گفت و شنید کریں۔ میں مسلم فنڈ جانے کے لئے سڑک پر نکلا تو وہاں پر تعینات پولیس کی ایک جماعت نے مجھے ڈانٹ کر واپس کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند کی سرزمین جو مجاہدوں اور سرفروشوں کی سرزمین تھی عرصہ ہوا کہ اس کے بہادر اور جیالے فرزند جابروں اور ظالموں کے خلاف نعرہ ہائے حق و صداقت بلند کر کے اور ہندوستان میں اپنی حق پرستی اور بہادری کے جھنڈے گاڑ کر قبرستان قاسمی میں سو چکے تھے اور اب اس کے فرزندوں میں بہادری کی جگہ بزدلی، صداقت کی جگہ نفاق اور ہمت کی جگہ کم ہمتی اور پست ہمتی نے جڑیں پکڑ لی تھیں، ایسے میں شاید قدرت کو منظور ہوا ہوگا کہ جیالوں کی اس سرزمین سے پھر کوئی صدائے سرفروشی سامعہ نواز ہو اور اس کا کوئی بہادر فرزند پھر بازوئے قاتل کو آزمانے کا نعرۂ مستانہ بلند کرے۔

قرمزی شام سرمئی ہو کر اب سیاہی کی طرف مائل تھی، میں سڑک سے واپس ہوتے ہوئے مڑا تو دیکھا کہ مولانا اسعد صاحب کے مکان کے قریب آٹھ دس لوگوں کے جھرمٹ میں مولانا تیز گامی کے ساتھ کیمپ کی جانب گامزن ہیں۔ جامعہ طبیہ (جہاں کیمپ قائم تھا) کے صدر دروازے میں داخل ہونے تک یہ آٹھ دس آدمی تو جانیں کہاں کھسک گئے، دروازے میں داخل ہوئے تو مولانا تن تنہا تھے۔ طلبہ نے مولانا کو جیسے ہی آتے ہوئے دیکھا سب سے سب اپنی کمین گاہوں سے نکل کر مولانا کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مولانا نے جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ داروں سے مختصر سی گفتگو کی۔ اور پھر عربی میں طلبہ کو کچھ ہدایتیں دے کر انھیں صف بستہ کیا اور جامعہ طبیہ کی بیرونی چہار دیواری پر کھڑے ہوئے اور پی اے سی کی بڑی جماعت کے روبرو سینہ سپر ہو کر یوں نوا سنج ہوئے۔

"یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ دارالعلوم کے طلبہ تو اس کڑاکے کی سردی میں اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور یہاں بھی ان کو چین نصیب نہیں، دوسری طرف دارالعلوم کی مقدس عمارتیں غنڈوں اور شرابیوں کے جوتوں سے پامال ہیں ہم حکام سے ڈنکے کی چوٹ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ کیمپ

سے نکلنا تو درکنار ہم مادر علمی کے چپہ چپہ کو آزاد کرائیں گے۔
آپ لوگوں نے بزدلوں کو دیکھا ہوگا جو سنگینوں سے ڈر کر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ ہم قاسم و محمود کے فرزند ہیں ہم کیمپ کی سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنادیں گے مگر ایک انچ بھی یہاں سے ہٹنا گوارا نہیں کریں گے۔ میں آپ سے رحم کی اپیل کرنے کے لئے کھڑا نہیں ہوا ہوں بلکہ یہ کہنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں کہ اگر آپ کے نزدیک یہی انصاف ہے کہ چند خود غرضوں کے کہنے پر نہتے پردیسی اور مظلوم طلبہ کے خون سے اپنا دامن داغدار کرو تو ضرور کرو لیکن اس سے پہلے کہ آپ کی گولی طلبہ کے کسی ناخن پر خراش لائے وہ میرے سینے ہوکر گذرنی چاہئے تاکہ حق و صداقت اور مظلوموں کا خون دیکھنے کے لئے میں اس دنیا میں موجود نہ رہوں۔" (اقتباس کیمپ ڈائری)

ہوگی تعمیر آشیاں ہوگی
برق و باراں کو مسکرانے دو

مولانا کی اس پرجوش تقریر کے ختم ہوتے ہوتے ہم نے دیکھا کہ پی اے سی کی صفیں منتشر ہونا شروع ہوگئیں اور پولیس اور پی اے سی کے افسران نے مولانا کو اطلاع کرائی کہ وہ ان سے علیحدہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں، اس موقع پر حضرت مولانا معراج الحق صاحب بھی وہاں پہنچ گئے تھے انھوں نے مولانا سے فرمایا کہ وہ کیمپ میں تشریف رکھیں افسران سے گفتگو میں کرکے آتا ہوں، بالآخر غالباً اس پر مصالحت ہوگئی کہ طلبہ مزید کسی کمرے پر قبضہ نہ کریں اور پی اے سی کیمپ کے معاملات میں دخل انداز نہ ہو۔

دارالعلوم میں داخل ہونے کی کوشش اور کامیابی

مولانا کی وارننگ کے بعد غالباً مارچ کے وسط میں طلبہ نے ایک شب سیڑھیاں لگا کر دارالعلوم میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر پی اے سی کے باخبر ہوجانے کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہوگیا تھا۔ اسی دوران مارچ ۱۹۸۲ء میں ۱۰ تاریخ کے بعد ہی کسی تاریخ کو مولانا نے مجھے طلب فرمایا اور کہا کہ میں شکر کی زیادتی کی وجہ سے دہلی اسپتال میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ دفتر کے کام حسب معمول ارشد عثمانی صاحب کی نگرانی میں ہوتے رہیں گے البتہ مولانا عبد الخالق مدراسی صاحب (جو مولانا کے شاگرد خاص ہیں اور اس وقت مولانا کے معتمد بھی تھے) اگر کوئی ہدایت دیں تو اس پر عمل کرنا۔ میرے اٹھ کر چلے جانے کے بعد مولانا نے جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ داران کو بلا کر بھی کچھ گفتگو

کی جس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۸۲ء کی شب کو بعد نماز عشاء مولانا عبدالخالق مدراسی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آج پروگرام یہ ہے کہ شب میں صحیح ڈھائی بجے دارالعلوم میں داخل ہونا ہے اور طریقہ یہ اپنایا جائے گا کہ باب الظاہر کی جانب سے عقبی دیوار میں نقب لگایا جائے گا اور طلبہ کی بڑی جماعت وہاں سے اندر داخل ہوگی، علاوہ ازیں اسی طرح مدنی گیٹ اور معراج گیٹ کی جانب سے طلبہ سیڑھیاں لگا کر چھتوں پر چڑھ جائیں گے تاکہ ایک محاذ پر اگر ناکامی ہو تو دوسرے محاذ پر کامیابی ہو اور طلبہ اوپر سے خشت باری وغیرہ کے ذریعہ مزاحمت کو فرو کریں۔ میں نے جامعہ طبیہ کے کچھ طلبہ کے مشورے سے ایک غیر مسلم ڈاکٹر کے یہاں سے فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان اور دوائیں اسی وقت خرید کر رکھ لی تھیں تاکہ اگر کچھ طلبہ زخمی ہوں تو ان کی مرہم پٹی کی جاسکے اور جامعہ طبیہ ہی کے طلبہ کو اس پر مامور کر دیا۔ پھر گدی واڑے میں واقع مولانا کے مکان کے قریب بھائی مرغوب کے مکان کی بالائی منزل پر مظفر نگر کے کچھ طلبہ رہتے تھے ان میں سے ذمہ دار طلبہ کو انتہائی رازدارانہ طریقے پر باخبر کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ خود نہ سوئیں باقی سب طلبہ کو سو جانے دیں۔ اور جب طلبہ کے دارالعلوم میں داخل ہونے کی خبر ملے تو مولانا کے مکان کی خبر رکھیں۔ میں خود بھی مذکورہ مکان ہی میں رہائش پذیر تھا۔ پھر کیمپ جا کر جمعیۃ الطلبہ کے علاوہ جو سینئر اور قابل اعتماد طلبہ تھے ان کو بھی اس منصوبہ کی اطلاع دے دی۔ جمعیۃ الطلبہ کے طلبہ پہلے ہی اس منصوبہ میں شریک اور اس سے باخبر تھے۔

صحیح دو بجکر بیس منٹ پر باب الظاہر کی عقبی دیوار سے نقب لگایا گیا اور محمد عثمان انبھٹوی کی قیادت میں طلبہ کی ایک جماعت غالباً سیڑھیاں لگا کر چھتوں پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد تمام طلبہ نقب کے ذریعہ دارالعلوم میں داخل ہوگئے۔ عمارت کے تحفظ کے لئے جو دربان اندر موجود تھے وہ تقریباً بغیر کسی مزاحمت کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بس سترہ طلبہ کو معمولی چوٹیں آئیں۔ طلبہ نے اندر داخل ہو کر صرف آدھے گھنٹے میں دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر پر قبضہ کر لیا اور لاؤڈ اسپیکر سے مولانا وحید الزماں زندہ باد، مجلس شوریٰ کل مختار اور جمعیۃ الطلبہ زندہ باد کے نعرے لگائے اور دارالعلوم پر اپنے مکمل قبضے کا اعلان کر دیا۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری بھی وہاں پہنچ گئے اور لاؤڈ اسپیکر پر کئی بار سورہ النصر کی تلاوت کی۔ اور طلبہ کو تلقین کی کہ وہ دارالعلوم کی املاک کی حفاظت کریں اور کسی بھی طرح کی مزاحمت سے پرہیز کریں اور جو دربان ان کے قبضے میں آگئے ہوں انھیں معاف کر دیں۔ صبح ہوئی تو طلبہ نے دارالعلوم کی کنجیاں مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے حوالے کر دیں۔

دوسری طرف اگلی صبح مہتمم صاحب کے گروپ کے لوگوں نے جامع مسجد کو اپنا مستقر بنایا اور کافی شعلہ بار تقریریں کیں اور کئی اقدامات سطے گئے۔ مثلاً وہ تحصیل پر دھرنا دیں گے، جیل بھرو تحریک چلائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ مگر عملی طور پر کوئی اقدام کامیاب نہ ہوسکا۔ جیل بھرو تحریک کا جو آخری جتھا گیا اس میں چند آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دمِ عیسیٰ نہ ہوا

بالآخر انھوں نے وقف دارالعلوم دیوبند کے نام سے ایک الگ مدرسہ قائم کرنے کا اعلان کردیا جس سے ہم لوگوں کو کافی اطمینان ہوا کہ مخالفین اپنے کام سے لگے۔

دہلی سے مولانا کی واپسی

دارالعلوم پر قبضہ تو ہوگیا مگر ہر طالب علم کی آنکھیں مولانا وحید الزماں صاحب کو تلاش کرتی رہیں جو تقریباً چار ماہ تک شدید سردی اور کسمپرسی کے عالم میں انھیں اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے یہ قبضہ ممکن ہوسکا تھا۔ ہر طالب علم کی زبان پر یہی سوال تھا کہ مولانا کب واپس ہوں گے مولانا ارشد صاحب نے اپنی تقریریں دارالعلوم میں طلبہ کے داخلے کو ان دو لہے کی بارات قرار دیا تھا مولانا دہلی سے واپس ہوئے تو طلبہ نے ان کا وہ زوردار استقبال کیا کہ حضرت شیخ الہند کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں کسی کا ایسا استقبال نہ ہوا ہوگا۔ مولانا باب الظاہر کی جانب سے دارالعلوم میں داخل ہوئے اور طلبہ نے اپنے اس محبوب قائد، استاذ اور مربی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں مولانا نے اس موقع پر بہت ہی مختصر تقریر کی جو کسی کی تشفی کا باعث نہ ہوئی۔ میں نے مولانا کی تقریر کے دوران کچھ طلبہ کے چہروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ مولانا کو آنکھیں پھاڑ کر اس طرح تک رہے تھے کہ جیسے کوئی بھوکا روٹی کو یا کوئی پردیسی عید کے چاند کو تکا کرتا ہے۔ مولانا کے آنے کے بعد دارالعلوم میں پھر وہی رونق و رعنائی لوٹ آئی جو ان کی موجودگی کی وجہ سے کیمپ میں یا اس سے پہلے دارالعلوم میں محسوس کی جاتی تھی۔ مولانا کے آنے کے بعد کیمپ کا دفتر دارالعلوم میں ان کے کمرے کے برابر والی درس گاہ میں منتقل ہوگیا اور مولانا نے دارالعلوم کے ایک ایک شعبے کو فعال کرکے اسے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کے حوالے کردیا۔

مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی •

کیمپ کی ڈائری کے چند اوراق

۱۵ر اپریل ۱۹۹۵ء کو عشاء کی نماز کے بعد میں جمعیت شباب اسلام بہار کے پٹنہ دفتر میں بیٹھا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے خبر دی گئی کہ مولوی اظہار الحق ویشالوی کا فون ہے۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے کہ ابھی خبر آئی ہے کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا دہلی میں انتقال ہوگیا۔ جسدِ خاکی دیوبند لایا جارہا ہے۔ آگے وہ کیا کچھ کہتے رہے میں سن نہیں سکا۔ سننے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ فون رکھا تو سارا بدن پسینے سے تر تھا۔ دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں اور آنکھوں کے خشک سوتے جو بڑی بڑی مصیبت میں کبھی تر نہیں ہوتے تھے، رواں ہوگئے اور ذہن تیزی سے ماضی کے اوراق اُلٹنے لگا۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات امتحانِ داخلہ کے موقع سے ہوئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ میرا امتحانِ داخلہ انھیں کے پاس گیا تھا، میں عربی پنجم میں داخلہ چاہ رہا تھا۔ کتابیں سب پڑھی ہوئی تھیں، مگر ایک خوف سا دل و دماغ پر مسلط تھا۔ مولانا کا نام احباب کو بتایا، تو انھوں نے یقین دلایا کہ پریشانی کی بات نہیں، مولانا آسان امتحان لیتے ہیں اور نمبر دینے میں بھی بخیل نہیں۔ تو میں قدرے مطمئن ہوکر امتحان ہال میں آیا۔ نام پکارا گیا، حاضر ہوا۔ مولانا نے دو تین سوالات کیے اور میں نے چھٹکارا پالیا۔ اوسط آنا آیا، جو دارالعلوم میں بنیادی سہولیات کے حصول کے لیے شاہ کلید سمجھا جاتا تھا۔ یہ پہلی ملاقات بڑی خوشگوار تھی اور ذہن میں ان کی شفقت و محبت کا بڑا اچھا رنگ جما تھا۔

پھر صف عربی میں داخلہ لینے کے بعد مسلسل درجہ میں مولانا سے ملاقات ہوتی رہی۔ نیز مولانا کے درس کے طریقے، درجہ میں بیٹھنے اور سبق میں شرکت کے آداب وغیرہ کو قریب سے دیکھنے، سیکھنے اور برتنے کا موقع ملا۔

• مدرسہ احمدیہ، ابابکر پور۔ ویشالی

اجلاس صد سالہ کے بعد حالات بدلتے گئے۔ مستقل طلبار کی حمایت اور ان کے مفاد کے لیے آواز اُٹھانے کی وجہ سے مولانا انتظامیہ کے معتوب ہو گئے۔ حالات نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ مولانا معراج الحقؒ، مفتی سعید احمد پالنپوری، مولانا ریاست علی بجنوری اور مولانا عبدالخالق مدراسی صاحبان بھی مولانا کی صف میں شامل ہو گئے۔ مولانا کے مخالفین کی نظر میں بھی یہ ایک ساجھے کی ہانڈی تھی، جس میں چاول پالنپور کے، گھی کیرانہ کا، ادرک پیاز بجنور کی اور نمک مرچ مدراس کا تھا۔ (قومی منشور یکم تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء)

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور ایک زمانہ وہ بھی آیا، جب مجلسِ شوریٰ کے اختیارات اور دائرۂ کار اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث ہونے لگی۔ دارالعلوم کے ذمہ داروں نے شوریٰ کو کالعدم قرار دے دیا اور ایڈہاک کمیٹی وجود میں آئی۔ تو دارالعلوم میں عجیب افراتفری کا عالم ہو گیا۔ طلبار کے دو گروہوں میں بٹ جانے اور ان کے باہمی تصادم کی وجہ سے دارالعلوم کا وقار اور اس کی برسوں کی ساکھ داؤ پر لگ گئی۔ اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت مہتمم صاحب نے یکم نومبر ۱۹۸۱ء کی صبح دارالعلوم کو پی۔ اے۔ سی کے حوالہ کر دیا۔ طلبار مختصر نوٹس پر دارالعلوم خالی کرنے پر مجبور ہوئے اور شہریوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ اس موقع سے اہالیانِ دیوبند نے طلبار کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کی مثال پھر دیکھنے میں نہیں آئی۔ سڑکوں پر دیگیں چڑھ گئیں اور وہ آرام پہنچایا کہ طلبار اپنا گھر بھول گئے۔ طلبار کے شہر میں جم جانے کی وجہ سے حضرت مولانا وحید الزماں صاحب اور دیگر مخلصین کو کیمپ کے قیام کا خیال آیا۔ چنانچہ مولانا کی تحریک پر جوق در جوق طلبار کیمپ کا رُخ کرنے لگے اور دارالعلوم جو گھر گھر میں بنٹ گیا تھا، پھر محمود ہال اور جامعہ طبیہ کی عمارت میں آبسا۔ مولانا اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر طلبار کی راحت رسانی میں جٹ گئے۔ مولانا کے مخصوص شاگردوں نے دفتری نظام کو سنبھال لیا اور درس و تدریس کی اکثر و بیشتر ذمہ داری مفتی سعید احمد پالنپوری نے اپنے ذمہ لے لی۔ مفتی صاحب کو درس کا جو ملکہ ہے اور طلبار میں وہ جس انداز میں مقبول ہیں، اس سے کیمپ کو جمانے میں بڑی مدد ملی۔

ابتدار کے دس دنوں میں جب کیمپ کی ہیئت کذائی طے ہو رہی تھی، میں کیمپ میں مقیم رہا۔ کئی جلسے اور تقریروں میں شرکت کی۔ پھر مولانا کا حکم ہوا کہ کچھ وفود مختلف جگہوں کو بھیجے جائیں۔ تاکہ کیمپ کو انتظامیہ کی طرف سے بدنام کرنے کی جو مہم چل رہی ہے، اس کے خلاف صحیح صورتِ حال عوام کے سامنے لائی جائے اور فراہمی مالیات کا کام بھی کیا جائے۔ اس موقع سے ایک یادگار ٹکٹ بھی نکالا گیا تھا، جو غالباً پچاس پیسے کا تھا۔ چنانچہ میں وسطی بہار کے دورے پر روانہ ہو گیا اور تقریباً دو ماہ سفر پر رہا، اسی وجہ سے کیمپ کے ابتدائی ایام کی تفصیلات میری ڈائری میں رقم ہونے سے رہ گئیں۔ اس کے بعد میں نے تفصیلی طور پر ڈائری

لکھنے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ آپ اس مضمون میں مولانا سے متعلق ڈائری کے اقتباسات پڑھیں گے۔ جس سے مولانا کی ہمہ جہت خدمات آپ کے سامنے آئیں گی۔ عام طور سے میں نے واقعہ کو واقعہ کے طور پر لکھا ہے اور تبصرہ کرنے سے گریز کیا ہے تاکہ قاری خود کسی نتیجہ پر پہنچے۔ ڈائری کے یہ اقتباسات ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ آخری اقتباس سے مولانا کے نئے تجربات اور دارالعلوم کی نئی سمتِ سفر کے تعین کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ درمیان میں جہاں طویل خلاء معلوم ہوتا ہے، وہ یا تو مولانا کی بیماری یا سفر کی وجہ سے ہے یا خود میرے سفر پر ہونے کی وجہ سے۔ اس تمہید کے بعد آپ اس طوفان بلاخیز میں مولانا کی خدمات کی روداد پڑھئے اور ان کی عبقری شخصیت کو سمجھئے۔

کیمپ کی ڈائری سے

۱۸ر جنوری ۱۹۸۲ء : کیمپ کو بند کرانے کی متواتر کوششیں ہو رہی ہیں۔ رات عجیب ہنگامہ کھڑا ہوا۔ پی اے سی نے اپنا ڈیرہ دارالعلوم کے اِرد گرد سے ہٹا لیا تھا تو ارباب اہتمام کو تشویش ہوئی اور ۹ بجے دارالعلوم کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا اور دارالعلوم کے مائیک سے اعلان ہونے لگا کہ شہریو! دوڑو! دارالعلوم کو بچاؤ۔ اسعد گروپ کے لوگ دارالعلوم پر قبضہ کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیمپ کے طلبار بھی گھبرا گئے اور انھوں نے بھی کیمپ کا گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں کیمپ میں شہریوں اور طلبار کا ہجوم اُمنڈ آیا۔ مولانا وحید الزماں صاحب دفتر کیمپ میں تھے۔ لڑکوں کو جوابی گھنٹہ بجانے پر سخت و سست کہا اور فرمایا :

"حالات کو سمجھو۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے تاکہ کسی طرح کیمپ کو ختم کر دیا جائے اور تم لوگ نادانستہ اس میں شریک ہو جاتے ہو۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ حملہ کو سچا ثابت کرنے کے لیے جنوبی طرف سے بیت الخلار کی جالی توڑوا دی گئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ حالات کو تشویشناک قرار دے کر پی۔ اے۔ سی کو پاس بلا لیا جائے۔

۲ر فروری ۱۹۸۲ء : مادرِ علمی کی حالت حسبِ سابق ہے۔ آج کیمپ میں اساتذۂ کرام کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نے کیمپ کی صورتِ حال طلبار کے سامنے رکھی۔ فرمایا کہ دہلی میں دو پوسٹر دیواروں پر نظر آتے ہیں۔ ایک میں حضرت مہتمم صاحب کے اقدام کو سراہا گیا ہے اور دوسرا پوسٹر پانچ ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مولانا اسعد صاحب کو بند کروا دیں۔ پھر مولانا نے فرمایا کہ ہم کسی کے دباؤ سے کیمپ نہیں توڑیں گے۔ البتہ اگر تم لوگ کہو تو توڑ دیں۔ اس پر لڑکوں نے پُر زور الفاظ میں کہا کہ "جاری رکھئے، جاری رکھئے۔" پھر مولانا نے فرمایا کہ امتحان ہوگا وظیفے دیئے جائیں گے۔ پُر جوش لہجے میں استقامت اور صبر کی تلقین کی۔ جلسے سے مولانا سعید احمد

صاحب پالنپوری نے بھی خطاب کیا۔ اس اجتماع میں ایک نظم پڑھی گئی جس کی ٹیپ کا بند تھا۔

ع آخر جیت ہماری ہے

۵رفروری ۱۹۸۲ء : گزشتہ ۲رفروری کی شام کو مولانا وحیدالزماں صاحب دہلی میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ یہ میٹنگ کچھ ممبرانِ پارلیمنٹ نے بلائی ہے تاکہ دارالعلوم کے معاملہ میں صلح وصفائی کرلی جائے سننے میں آیا ہے کہ پہلے دن مولانا وحیدالزماں صاحب بروقت نہیں پہنچ سکے اور بعد میں اُدھر کے لوگ نہیں آئے۔ اس طرح یہ میٹنگ تعطل کا شکار ہوگئی۔ خبر یہ بھی ہے کہ سید شہاب الدین ایم۔پی مہتمم صاحب کو بلانے بمبئی گئے تھے لیکن انھوں نے آنے سے انکار کردیا۔

۶رفروری ۱۹۸۲ء : مولانا وحیدالزماں صاحب دیوبند تشریف لے آئے ہیں پچھلے دو مہینوں سے لڑکوں کو وظیفہ تیل نہیں ملا تھا، مولانا نے اعلان کیا کہ اگلے ماہ میں ملے گا۔ شاید کیمپ مالی بحران سے گزر رہا ہے۔

۸رفروری ۱۹۸۲ء : حضرت مہتمم صاحب کے حامی لڑکوں نے ایک جلوس نکالا، جس میں مولانا وحیدالزماں صاحب اور کیمپ کے خلاف نعرے لگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو نہیں مگر سُنا کہ اس جلوس کی قیادت قمر کاظمی کر رہے تھے۔ شاید یہ بتانے کے لیے کہ دانشوروں کی یہ جماعت بھی ہمارے ساتھ ہے پھر ہمارے کیمپ کے حامی لوگ کیوں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی بچوں کو بلایا۔ بلّے تقسیم کیے اور دفتی پر نعرے لکھ کر انھیں جلوس کی شکل میں شہر میں گشت کرنے کے لیے بھیج دیا۔ یہ نعرے لگا رہے تھے: ظلم وستم کے تین شیطان ..... مجلسِ شوریٰ کیا ہے ..... وغیرہ وغیرہ۔ مولانا کو خبر ہوئی تو بہت خفا ہوئے۔

۱۰رفروری ۱۹۸۲ء : ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ رات بارش بھی ہوئی۔ کیمپ میں سہولتوں کی فراہمی کی ممکنہ کوششوں کے باوجود موسم کے یہ تھپیڑے مہمانانِ رسولؐ کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہے ہیں۔ مولانا اسعد صاحب ان دنوں دیوبند میں ہیں اور اساتذہ میٹنگ میں مصروف۔ اس لیے اسباق پابندی سے نہیں ہو رہے ہیں۔

۱۱رفروری ۱۹۸۲ء : آج بڑی خاموشی سے خفیہ طور پر جمعیۃ الطلباء کے ذمّہ داروں کا انتخاب حضرت مولانا وحیدالزماں نے کردیا لیکن لڑکے اس نامزدگی سے خوش نظر نہیں آتے۔ انھوں نے اُسے رضاکاروں کی انجمن اور رضاکاروں کے عہدیداروں کا نام دیا ہے اور تجویز پیش کی ہے کہ جمعیۃ کا لفظ ہٹا دیا جائے۔

۱۲رفروری ۱۹۸۲ء : کیمپ مالی طور پر شدید بحران کا شکار ہے۔ اسی لیے علاج، پارچہ وغیرہ کی رقم کی تقسیم جو شروع کیمپ میں دی گئی تھی، دو تین روز سے بند ہے۔ معاملہ عجیب سے عجیب تر ہوتا جارہا ہے کیمپ کے منتظمین لڑکوں کی تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں تاکہ رائے عامہ کا اثر عدالت پر پڑے مولانا اسعد صاحب اسے مفر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا منفی اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کے سامنے مظاہرہ کی بات بھی چل رہی ہے۔ عام طلبار کی رائے کیمپ کے رضا کاروں کے متعلق بدلتی جارہی ہے اور عام خیال یہ ہے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور مطلق العنان بن گئے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو کیمپ کا خدا حافظ۔

۱۳رفروری ۱۹۸۲ء : جمعیۃ الطلبہ کے عہدیداران کی نامزدگی سے جو بدظنی پھیلی ہے اس کو دور کرنے کے لیے آج بعد نماز مغرب مولانا نے طلبار کا جلسہ بلایا۔ جس میں انھوں نے سابقہ انتخاب کو کالعدم قرار دیا اور فرمایا کہ یہ تمھاری دلجوئی کے لیے ہے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ پہلا انتخاب برقرار رہے۔ مگر لڑکے کسی طور پر راضی نہیں ہوئے۔ خبر ہے کہ غلہ اسکیم کا جلسہ جلد ہی ہونے والا ہے۔

۱۴رفروری ۱۹۸۲ء : آج بعد نماز مغرب جمعیۃ الطلبہ کا اجلاس ہوا، مولانا نے اتحاد و اتفاق اور فعال افراد کے انتخاب پر تقریر فرمائی۔ صدر تو مولانا ہی کے نامزد ابراہیم افریقی اور نائب صدر افضل افریقی بنائے گئے۔ جنرل سکریٹری کے لیے میرے نام کے ساتھ عثمان، رحمت اللہ، فیاض، عبدالواحد، جمال الدین، سعید مرادآبادی وغیرہ کا نام آیا، میں نے اپنا نام واپس لے لیا۔ ہاتھ اٹھا کر انتخاب کی بات ہوئی۔ اقبال (پلامون) نے مخالفت کی، طے پایا کہ کل عشار بعد باضابطہ ووٹنگ ہوگی۔ ایک صاحب کے نام پر وضع قطع کا سوال اٹھایا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ وضع قطع جیسی بھی ہو، دارالعلوم نے اس کو طالب علم مانا ہے تو اس کے انتخاب کی گنجائش ہے۔

۱۵رفروری ۱۹۸۲ء : جمعیۃ الطلبہ کے انتخاب کی ہماہمی شباب پر ہے۔ آج دس بجے کے آس پاس ایک اعلان بورڈ پر آویزاں ہوا جس میں لکھا تھا کہ فیاض، رحمت اللہ، سعید وغیرہ عثمان کے حق میں دستبردار ہو چکے ہیں۔ مولانا کا گزر ہوا تو اس کو ہٹا دیا اور ظہر بعد لڑکوں کے جمع ہونے کا اعلان لکھوایا۔ میں بھی قریب ہی کھڑا تھا، فرمایا کہ ووٹنگ منسوخ کر دی گئی ہے۔ ظہر بعد آپ لوگ جمع ہوجائیے۔ چنانچہ ظہر بعد پروگرام ہوا۔ مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا نصیر احمد خاں صاحب، مولانا سعید صاحب کی تقاریر ہوئیں۔ مولانا نے فرمایا کہ انتخاب کا طریقہ یہ سوچا ہے کہ صدور و نظما رسمیت آٹھ یا گیارہ افراد کی مجلس عاملہ ہو جس میں سب کا درجہ مساوی ہو، لڑکوں نے اس تجویز کو سراہا۔ چنانچہ رات کے

۹ بجے دارالاہتمام کیمپ میں انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں اقبال، معین، عثمان، زماں، نعمان، عتیق انظر وغیرہ کامیاب قرار پائے جبکہ واحد، فیاض اور دوسرے لوگ شکست کھا گئے۔ مولانا نے انتخابی نتائج کے بعد ایک شاندار تقریر کی، اتحاد پر زور دیا اور فرمایا کہ دارالعلوم کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لیے مل جل کر کام کرو۔

۱۶ فروری: ایک لڑکے کی کیمپ میں بہت سخت طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے درس نہیں ہوا۔ مولانا وحید الزماں صاحب بیمار طالب علم کو دیکھنے اوپر تشریف لے گئے ہیں اور کافی دیر سے وہیں ہیں۔ کئی ڈاکٹر بلائے گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔

۱۷ فروری: بیمار طالب علم رات سوا بجے چل بسا، بہار کا رہنے والا تھا۔ عرفان ڈمکوی سے پہچانا جاتا تھا۔ درجہ ہشتم کا طالب علم تھا، ابھی ایک ماہ پہلے گھر سے آیا تھا قبض اور پیٹ کے درد کا عارضہ تھا، گیس دماغ پر چڑھ گئی اور بے چارہ اس کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم موجود تھی۔ خود مولانا وحید الزماں صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ جب اسے پکارا اور نہ بولا تو مولانا کھڑے کھڑے اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑے، صبح میں جب بھی ہوش ہوتا پوچھتے کہ وہ لڑکا ٹھیک ہو گیا؟ لوگ کہتے کہ ہاں ٹھیک ہو گیا تو فرماتے کہ اچھا اب ہمیں سونے دو۔ بالآخر انھیں نیند کی گولی کھلا کر سلایا گیا۔ گیارہ بجے جنازہ کی نماز میں بھی سخت علالت اور نیند کی وجہ سے مولانا شریک نہ ہو سکے۔

۱۹ فروری: آج حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نے طلباء کا وفد سہارنپور، وزیر مملکت ظفر نقوی صاحب سے ملنے کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ تین بسوں میں ہم لوگ سہارنپور گئے۔ کلکٹریٹ سے کچھ پہلے اتر کر ہم لوگوں نے تین لائنیں بنائیں اور نعرے لگاتے ہوئے کلکٹریٹ پہنچے۔ پہلے تو ہمیں اطلاع دی گئی کہ ساڑھے بارہ بجے نقوی صاحب ملیں گے، لیکن جب انھیں یہ پتہ چلا کہ ہم طلباء دارالعلوم ہیں، تو میٹنگ چھوڑ کر نکل آئے۔ عبدالوحید اور افضل صاحبان نے ترجمان کے فرائض انجام دیئے۔ انھوں نے حالات کو بغور سنا اور کہا کہ تیل، چینی دینے کا آرڈر تو ہم آج ہی دے رہے ہیں، حالات درست کرنے کے لیے بھی کوشش کروں گا۔ نماز ظہر کے بعد ہم لوگوں نے سہارنپور میں ہی ایک جلسہ کیا۔ جس میں راقم الحروف، عثمان، اقبال اور افضل افریقی کی تقریریں ہوئیں۔ ایک اخبار نویس نے مجھ سے دریافت کیا کہ دارالعلوم پر ناجائز قبضہ کس کا ہے، میں نے کہا، پی۔ اے۔ سی کا بعد میں یہ تفصیلات مولانا محترم سے عرض کی گئیں، خوش ہو گئے۔ فرمایا کہ آج سہارنپور کے لوگوں کو بھی یقین ہو گیا کہ کیمپ میں صرف تیرہ طلباء کی تعداد بتانے والے جھوٹے ہیں

۲۳ فروری: مولانا نے حکم دیا ہے کہ شناخت نامہ دارالعلوم کا جن کے پاس ہو، وہ نام لکھوا دیں اور وہ بھی جو تقریر و تحریر کے ماہر ہوں، شناختی کارڈ کی ضرورت شاید تیل چینی کے لیے ہو گی اور اس سے اس

جھوٹ کا پردہ بھی فاش کیا جاسکے گا کہ کیمپ میں باہر کے طلبا رہیں، دارالعلوم کے نہیں۔ خبر یہ بھی ہے کہ جمعیۃ الطلبہ کے انتخاب سے غیر مطمئن افراد کے لیے مولانا نے ایک مجلس عمل بنائی ہے۔

۲۵ رفروری : آج جمعیۃ الطلبہ کا جلسہ ہوا۔ جن لوگوں کے نام مقرر کی حیثیت سے لکھے گئے تھے، ان کی تقریر ہوئی۔ میرا نام بھی کسی نے لکھوا دیا تھا، سو پکارا گیا، لیکن میں پہلے سے تیار نہیں تھا۔ اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔ اس موقع سے مولانا وحید الزماں صاحب نے طلبا کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا" ایسے ہی آپ لوگ ان لوگوں کو سامنے لائیے جو اچھی تقریر کرتے ہیں۔ ہم جلد ہی شہر میں جلسہ کرانا چاہتے ہیں۔ جس میں اساتذہ کے بجائے آپ حضرات کی تقریر ہو گی" ایک لڑکے کے دریافت کرنے پر کہ اِن دنوں کیا کچھ ہو رہا ہے، فرمایا کہ اگر سب باتیں آپ لوگوں کو بتا دی جائیں تو آگے کا نمبر ہی نہیں آئے گا۔ اس لیے ابھی انتظار کیجیے۔ فرمایا" مصالحتی کمیٹی نے یہ درخواست کی ہے کہ آپ لوگ ۵ رمارچ تک کچھ نہ کریں، ہمیں کوشش کرنے دیں، اگر ہم لوگ کچھ نہ کر سکے تو پھر آپ لوگ مختار ہوں گے۔ ہم تحریک چلائیں گے۔ وقت کا انتظار کیجیے۔ کوئی ۱۲ بجے رات میں دعا پر مجلس کا اختتام ہوا۔

۴ رمارچ : مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں دستور جمعیۃ الطلبہ پر غور کیا گیا اور کئی دفعات میں ترمیم کی گئی۔ انتخاب کا طریقہ بھی زیر بحث آیا۔ آخر طے ہوا کہ یہ فیصلہ مولانا وحید الزماں صاحب پر چھوڑا جائے۔ وہ اگر مطمئن ہو جاتے ہیں تو اتحاد الطلبہ کی مجلس منتظمہ بھی منتخب سمجھی جائے گی۔ مولانا کے والد محترم کی طبیعت سخت خراب ہے اور اب بس آخری سانسیں ہی رہ گئی ہیں۔ مجلس میں ان کی صحت کے لیے دعا کی گئی۔

۵ رمارچ : اور آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، مولانا کے والدِ محترم حضرت مولانا مسیح الزماں صاحب، دنیا سے چل بسے۔ عصر سے قبل نمازِ جنازہ ہوئی اور مزارِ قاسمی میں دفن کیے گئے۔ تعزیت کے لیے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ خود تشریف لے گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت! آپ نے کیوں تکلیف کی؟ فرمایا کہ میرے آپ کے اختلافات دارالعلوم کی حد تک ہیں، اس حد تک نہیں کہ میں تعزیت کے لیے بھی نہ آؤں۔

۸ رمارچ : آج شہریوں اور طلبہ کی مشترکہ نشست محمود ہال میں ہوئی۔ جس سے مولانا وحید الزماں صاحب، اظہر صابری صاحب، مولانا ریاست علی اور مفتی سعید صاحب پالنپوری نے خطاب کیا۔ مولانا وحید الزماں صاحب کا لب و لہجہ آج خالص انقلابی تھا۔ لگتا تھا کہ اب انقلاب آہی جائے گا۔ مولانا نے فرمایا: اب ہمارا کیمپ چلتا پھرتا مدرسہ ہو گا۔ ہم لوگوں کو یہ بتا دیں گے کہ کیمپ میں کتنے لڑکے رہتے ہیں۔ حکومت کو بھی اب ہماری آواز پر کان دھرنا ہو گا، ہم انھیں بتائیں گے کہ پُرامن رہ کر بھی حق لیا جاسکتا

ہے۔ غاصبوں کو ہمارا حق دینا ہوگا۔" آپ نے فرمایا: "ہماری مثال ایسی ہے، جیسے قلب کو آپریشن کے لیے باہر نکال کر رکھ دیا گیا ہو، جب تک اسے اندر نہیں رکھا جائے گا، دارالعلوم بے جان ہوگا۔ اگر اس میں جان پیدا کرنا ہے، تو ہمیں اندر رہنا ہی پڑے گا۔" مولانا نے تحریک کی تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا کہ کل ساڑھے نو بجے طلبا کا جلوس نکلے گا، جو مختلف شاہراہوں سے گزرتا ہوا، تحصیل پہنچے گا۔ پھر وہاں سے چھتہ مسجد اور دارالعلوم کے صدر گیٹ سے گزرتا ہوا کیمپ لوٹے گا۔ اگلے مرحلہ کی بات بعد میں طے ہوگی۔ ضرورت پڑی تو ہم دھرنا بھی دیں گے۔ بس وقت کا تھوڑا اور انتظار کر لو — رات کے گیارہ بجے تحصیلدار اور انسپکٹر صاحبان کیمپ پہنچے کہ پرسوں ہولی کا دن ہے، اس لیے مظاہرہ مؤخر کریں، اس موقع سے تشدد کا بھی اندیشہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ جلوس غیر مسلم محلوں میں نہیں جائے گا۔ اور اگر تشدد کیا گیا تو ہم صبر کا امتحان دیں گے۔ لیکن جلوس ضرور نکلے گا۔

۹ر مارچ : صبح کا سماں ہے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل اور ان کی اوٹ سے جھانکتا سورج، بڑا خوشنما منظر پیش کر رہا ہے۔ طلبا میں جوش و خروش، امنگ و ترنگ ہے۔ ساڑھے نو بجنے والے ہیں۔ جلوس ترتیب دیا جا رہا ہے۔ دو دو لڑکوں کی لائن لگا دی گئی ہے۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے اعلان کر دیا ہے کہ لڑکے استاذ کی معیت میں جائیں گے۔ نعرے مخصوص ہوں گے، ضلعی اور صوبائی انجمنوں کے بینر ساتھ لے جانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ٹھیک دس بجے مولانا نے جلوس کو چلنے کا حکم دیا۔ جلوس ایک چکر لگا کر محمود ہال کے پاس پہنچ گیا ہے۔ مگر اس کا آخری سرا جامعہ طبیہ کے میدان ہی میں ہے۔ اور اب شہر کی طرف کوچ ہو رہا ہے۔ آگے آگے اساتذہ ہیں۔ تین مائک سے نعرے لگائے جا رہے ہیں اور جواب سے فضا گونج رہی ہے۔ مدنی گیٹ سے ذرا پرے کچھ طلبا جو مہتمم صاحب کے گروپ کے ہیں، جلوس کو بحسرت و یاس دیکھ رہے ہیں۔ جلوس مختلف شاہراہوں سے گزر رہا ہے۔ لوگ جوق در جوق شامل ہو رہے ہیں۔ مظاہرین کا سیلاب ہے، جو امڈا آ رہا ہے۔ بچے بوڑھے، عورت مرد بھی جلوس کے استقبال کے لیے سڑک کے دو کنارے کھڑے ہیں۔ کچھ نے چھتوں پر جگہ لے رکھی ہے۔ کہیں کہیں جلوس پر پھولوں کی بارش بھی ہو رہی ہے۔ جلوس تحصیل پر پہنچ گیا ہے اور اب مولانا وحید الزماں صاحب تقریر فرما رہے ہیں — "یاد رکھو پولیس والو! تم نے ہمیں صدر گیٹ سے نہیں گزرنے دیا۔ ہم نے آج مان لیا ہے۔ لیکن اب ہم تم سے درخواست نہیں کریں گے۔ حکم دیں گے۔ یاد رکھو اگر دارالعلوم ایک ہفتہ میں نہیں کھولا گیا، تو ہم دیوانہ وار دارالعلوم کی دیواروں سے ٹکرا جائیں گے۔ ہماری یہ فوج سرنگیں کھود کر دارالعلوم میں داخل ہو جائے گی اور ان کے آگے کنکر پلائی ہوئی دیوار بھی خس و خاشاک ثابت ہوگی۔

اس وقت تمہارے قانون ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اس وقت نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ہم تمہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ اب جنگل کا شیر جاگ چکا ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر ہماری اب بھی نہیں سنی گئی، تو ہم لکھنؤ اور دہلی تک پہنچیں گے۔ ہم نے امن کی مثال قائم کی ہے۔ لیکن ہمیں حالات کا رُخ موڑنا بھی آتا ہے۔" کوئی ایک گھنٹہ تک مولانا مسلسل بولتے رہے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی آدمی پکڑے ہوئے تھے کہ کہیں گر نہ جائیں۔ مولانا کی تقریر کے بعد لڑکے دو قطار ہو کر مختلف شاہراہوں سے گزر کر جامعہ طبیہ واپس آگئے ہیں۔ اور مولانا پھر اُن سے خطاب کر رہے ہیں۔" اب وہ زمانہ لد گیا، جب ہم گالیاں سُن کر چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ اب ہم اکابر کو گالیاں دینے والوں کو سزا دیں گے۔ جو گالیاں دے گا اس کی زبان نکال لیں گے۔" وغیرہ مولانا کی تقریر کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔

۱۰ر مارچ : کل کی مولانا کی تقریر اور احتجاج سے حکومت گھبرا گئی ہے اور دو ماہ کیلئے دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے۔" دعوت" میں کل کے مظاہرے کے بارے میں لکھا ہے کہ صرف ڈیڑھ سو طالب علم تھے اور وہ بھی باہر سے بلوائے گئے تھے اور دارالعلوم کی حفاظت کے لیے چھ ہزار شہری موجود تھے۔ کذب بیانی کی حد ہو گئی ہے۔ ان کم بختوں سے خدا سمجھے اور اگر ڈیڑھ سو ہی تھے تو اس کے لیے چھ ہزار شہریوں کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ جانتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک دس پر بھاری ہو گا۔ مولانا کی تقریر کے بعد، اب اجازت مل گئی ہے۔ ہم دیکھیں گے ان جیالوں کو، جو ہمیں روکنے آئیں گے۔ اب ہمارے عزم جواں ہے بلکہ اب ہم طوفان ہیں، ہواؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان۔

۱۳ر مارچ : آج نکلنے والا جلوس ڈی۔ ایم کی یقین دہانی پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۴ر مارچ : دیوبند میں دفعہ ۴۴ نافذ ہے۔ ڈی ایم نے مولانا کو لکھا ہے کہ کوئی جلوس نکلا تو ہم گرفتاری کریں گے۔ مولانا نے فرمایا: دیکھا جائے گا۔ سُنا ہے کہ بدھ کو عام جلسہ ہو گا اور جمعرات کو جلوس نکلے گا۔ خبر یہ بھی ہے کہ مہتمم صاحب کو ڈی ایم نے اڑتالیس گھنٹہ کا وقت دیا ہے کہ وہ دارالعلوم کا بحران حل کریں۔

۱۵ر مارچ : آج وزیر مملکت مسٹر ظفر نقوی صاحب، ایس۔ ڈی۔ او، ڈی۔ ای۔ او، ڈی۔ ایم وغیرہ آئے تھے مہتمم صاحب اور مولانا وحید الزماں صاحب سے دیر تک گفتگو رہی۔ مہتمم صاحب اپنی ضد پر ہیں، البتہ انھوں نے مولانا وحید الزماں صاحب سے تین دن کی مہلت مانگی ہے۔ بدھ کو شاید شہریوں کا 'جلسہ ہو گا' جمعرات کو جلوس' بات قبضے تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ لیکن پریشانی یہ ہے غلہ اسکیم کا جلسہ بھی 'اس' سے متاثر ہو گا۔

۱۶ر مارچ : عشاء سے کچھ قبل انظر بنارسی آئے تھے، انھوں نے کل شہریوں کے جلسہ میں تقریر کرنے کو کہا ہے، میں نے پہلے تو انکار کیا، لیکن جب انھوں نے کہا کہ مولانا کا ایماء شامل ہے تو حامی بھرلی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

۱۷ر مارچ : آج شہریوں کے جلسہ کے پروگرام کی ترتیب کو لے کر جمعیۃ الطلبہ کی مجلس عاملہ اور مجلس عمل میں ٹھن گئی۔ دونوں میں سے ہر ایک دعویدار تھا کہ مولانا نے ہم سے کہا تھا۔ اس اختلاف کے پیش نظر میں نے تقریر سے انکار کردیا۔ مولانا بھانپ گئے، چنانچہ خود تقریر کے لیے کھڑے ہوگئے۔ کافی دیر تک شہریوں کے اس جلسہ میں تقریر فرمائی اور کہا: "کیمپ حکومت کے دباؤ سے ختم نہیں ہوگا، رمضان میں بھی تعلیم جاری رہے گی۔ ہم پورے ہندوستان کے مشاہیر پر مشتمل ایک ایکشن کمیٹی بنائیں گے۔ مناسب وقت پر جلوس اور تحریک کو تیز کیا جائے گا' ابھی کچھ دیر اور صبر کیجیے۔ آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ نقوی صاحب کی مصالحت کی کوشش ناکام ہوگئی ہے۔ ایک وقت آئے گا' جب ہم انھیں اپنی شرائط پر صلح کرنے کو مجبور کریں گے۔ ایک اور کوشش ہو رہی ہے' اس کا حشر بھی دیکھ لیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنی لڑائی جیت چکے ہیں۔ ہر طرف کیمپ کو سراہا جارہا ہے۔ ہمارے پاس الحمدللہ روپے کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ سے رابطہ قائم رہے' اس لیے چندہ کی درخواست کرتے ہیں۔" اس پر ایک صاحب نے سو روپے نکال کر دیے۔ مولانا نے فرمایا: ابھی نہیں' وقتاً فوقتاً آپ دیتے رہیے۔ پھر فرمایا۔ ہم خونریزی نہیں چاہتے، ورنہ کب کے ہم دارالعلوم میں چلے گئے ہوتے۔ مولانا معراج صاحب کی دعا پر مجلس ختم ہوئی۔ اس سے قبل عبدالرؤف بلندشہری نے ایک نظم سنائی جس کے ٹیپ کا بند تھا:

انصار ہی ملے یا مجاہد لقب ملے
اے اہلِ دیوبند تمہیں کیا لقب ملے

۱۹ر مارچ : کیمپ میں ہر طرف آج خوشی و مسرت چھائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شوریٰ کے خلاف کچھ لوگوں کی جانب سے دائر رٹ خارج ہوگئی ہے۔ جس میں شوریٰ کے فیصلے اور رجسٹریشن کو چیلنج کیا گیا تھا اور مہتمم صاحب کے فیصلے پر غالباً اسٹے آرڈر مانگا گیا ہے۔ رٹ خارج ہو جانے سے شوریٰ کی پوزیشن کافی مضبوط ہوگئی ہے۔ دیکھئے دارالعلوم کب تک کھلتا ہے۔

۲۰ر مارچ : کل کی جیت کی خوشی میں آج دورۂ حدیث کے طلباء نے مٹھائی کا نظم کیا تھا۔ مولانا نصیر خاں صاحب نے سو روپے اور مولانا معراج صاحب نے بیس روپے دیئے، مگر اس خوشی میں غم کی پرچھائیں بھی شامل ہوگئی۔ اس لیے کہ دارالعلوم کا مردِ آہن جو مستقل طلباء کو جگاتا رہتا تھا، خود اسپتال کے بستر پر سونے

چلا گیا' یعنی مولانا وحید الزماں صاحب دہلی کے جیون نرسنگ ہوم میں بھرتی کرا دیئے گئے۔ ذیابیطس کا مرض کافی بڑھ گیا تھا۔ دیوبند کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر اب بھی آپ مستقل محنت اور تقریر سے باز نہیں آئیں گے تو یہ مرض جان لے کر رہے گا۔ جاتے وقت مولانا نے فرمایا کہ کوئی مجھ سے ملنے نہ آئے، سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں، میری فکر نہ کریں۔

۲۴ مارچ : ہلکی بارش، گھنگھور گھٹا، یخ بستہ ہوا، بجلی غائب، فون کا نظام درہم برہم۔ ایسے میں رات کے دو بجکر ۴۵ منٹ پر طلبا نے دارالعلوم کے قلعہ پر کمندیں ڈال دیں۔ تین بزرگوں کی زیر نگرانی ڈیڑھ سو طلبا کے جتھے نے اس عظیم قلعہ کو صرف پندرہ منٹ میں فتح کر لیا۔ سارے حفاظتی انتظامات اور محافظوں کی بڑی فوج بھی، طلبا کے جوش و خروش کے سامنے بند نہیں باندھ سکی۔ ہر طرف خوشیاں ہیں، مسرت ہے، شادمانی ہے۔ مسجد کے مائک سے اذا جاء نصر اللہ والفتح کی مسلسل تلاوت ہو رہی ہے۔ دونوں طرف کے چند لوگ گھائل ہوئے ہیں، مگر اس خوں خرابے کی نوبت نہیں آئی جس کی عام طور سے توقع کی جاتی تھی۔ فللہ الحمد والشکر۔ ایسے میں ہماری نگاہیں مولانا وحید الزماں صاحب کو تلاش رہی ہیں۔ کاش! وہ آج ہمارے درمیاں ہوتے اور دیکھتے کہ ان کے جیالوں نے کس طرح کمندیں ڈال کر دارالعلوم فتح کیا ہے۔

۲۵ مارچ : ہم لوگوں نے یک طرفہ امن قائم کر رکھا ہے۔ مشتعل کرنے کی مخالفوں کی ساری کوششیں بیکار ہوتی جا رہی ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئے ہیں تاکہ قانونی چارہ جوئی کر کے پھر سے خالی کرایا جائے۔ جبکہ کلکٹر صاحب نے حضرت قاری صاحب کے کسی بھی حکم کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ اب آپ دارالعلوم کے مہتمم نہیں رہے۔ طلباء سے مولانا ریاست علی صاحب اور مفتی سعید احمد پالنپوری نے خطاب کیا اور پرامن رہنے کی تلقین کی۔ ڈی ایم نے غلہ اسکیم کے جلسہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

۲۶ مارچ : مولانا نصیر خاں صاحب سفر سے واپس ہوئے تو طلبا نے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ غلہ اسکیم کے لیے جو اسٹیج بنا تھا، اس کو ڈی۔ ایم نے اپنی نگرانی میں تڑوا دیا۔ مولانا معراج الحق صاحب نے فرمایا، صاحب! اگر ہم جلسہ کرنا چاہیں گے تو ہماری فوج کو اسٹیج تیار کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ لیکن آپ مطمئن رہیں، ہم آپ کی بات مانیں گے۔ حضرت قاری طیب صاحب نے جامع مسجد میں تقریر فرمائی اور فرمایا کہ دارالعلوم کے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔

۲۷ مارچ : تعلیمات کا عملہ بحال ہو گیا ہے۔ اسباق شروع ہو گئے ہیں۔ مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں مولانا ریاست صاحب

اور مفتی سعید صاحب نے خطاب فرمایا۔ مولانا معراج الحق صاحب نے دعا سے پہلے فرمایا: مولانا وحید الزماں صاحب جو ہماری تحریک کے روحِ رواں ہیں، عجیب مخلص آدمی ہیں۔ بیمار ہیں۔ ہم ان کی عدم موجودگی میں ایسا محسوس کرتے ہیں، جیسے بغیر روح کا جسم۔ جگہ جگہ ان کے مشورے کی ضرورت ہے۔ دعا فرمائیے کہ خدا انھیں جلد صحت دے۔ لڑکے یہ سُن کر زار و قطار رونے لگے۔ اور پھر ختم کر دعا ہوئی۔

یکم اپریل ۱۹۸۲ء: قبضہ کے بعد پہلی مرتبہ مولانا وحید الزماں صاحب آج باب الظاہر سے داخل ہوئے۔ لڑکوں کا بے پناہ ہجوم استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا۔ سبھی کو یہاں خبر ملی، بھاگا چلا آیا۔ پھولوں کی بارش کی گئی۔ گلے میں ہار ڈالا گیا۔ "مولانا وحید الزماں زندہ باد" کے نعرے سے فضا گونج اٹھی۔ قطار در قطار لڑکوں کے جلو سے گزرتے ہوئے مولانا نودارے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن جذبات تشکر سے آواز گلو گیر ہو گئی ہے۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ چند جملے کہنے کے بعد اجازت لیتے ہیں۔ میری آنکھوں نے ایسا استقبال آج تک نہیں دیکھا۔ والہانہ اور جذباتی استقبال۔ اس کے سامنے بادشاہوں کی بادشاہت اور حکمرانوں کی حکومت کو بھی رشک آجائے۔ شام میں بعد نماز مغرب استقبالیہ جلسہ ہوا، جس میں مولانا نے تقریر فرماتے ہوئے کہا:

"طلبائے عزیز! جب آپ حضرات دارالعلوم سے نکالے گئے تھے تو آپ نے کہا تھا ربنا اللہ۔ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور پھر اللہ نے آپ کو آزمائش میں ڈالا کہ آپ اپنے اس دعوے میں کتنے سچے ہیں۔ سخت طوفان اور بارش کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، موسم کے سرد و گرم چکھنے پڑے۔ آپ اللہ کے فضل سے ثابت قدم رہے اور "ثم استقاموا" کی زندہ تصویر بن گئے۔ تو اللہ نے آپ پر رحمت نازل فرمائی۔ غیب سے آپ کی امداد و اعانت کی۔ چنانچہ مہینوں کے بعد آپ پھر دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ اب آپ الحمدللہ بے خوف ہیں، حزن و رنج کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ خوشی کا موقع ہے۔ اس وقت آپ کو بے قابو نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ الٹ پھیر ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے۔ اس لیے جو ملازمین و مدرسین آئیں، ان کو بسر و چشم قبول کیجئے کیونکہ دارالعلوم کا مفاد اور بھلائی اسی میں ہے اور ہم سب کو اسی کا مفاد عزیز ہے۔"

۲ را پریل: حضرت قاری طیب صاحب کے حامیوں نے آج دارالعلوم پر قبضہ کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے گرفتاریاں دیں۔ کل اکیاون آدمی گرفتار ہوئے۔ قمر کاظمی، مولانا محمد سالم قاسمی، حسن احمد صدیقی اور کشمیری طلبا۔ کے گرفتار ہونے کی خبر ہے۔ عورتوں کا جلوس اتوار کو نکلے گا، جس کے لیے خاتون پولیس بلائی گئی ہے۔

۳؍ اپریل : دارالعلوم کھل جانے کے بعد، پانچ نفری کمیٹی نے، جس میں ابراہیم سلیمان سیٹھ، ضیاء الرحمٰن انصاری، سید شہاب الدین، شفیع قریشی اور یونس سلیم تھے ۔ اور جو ۵؍ فروری ۱۹۸۲ء کو ویسٹرن کورٹ دہلی میں بنی تھی، آج ایک پریس میں مصالحت کا ایک فارمولہ پیش کیا۔ جس کے مطابق شوریٰ کی برتری کو تسلیم کرنے اور دستور کو شخصیت سے اونچا سمجھنے کی شرط پر حضرت قاری صاحب کو شیخ الجامعہ کا اعزازی عہدہ دے کر دارالعلوم سے ان کے تعلق کو باقی رکھا جائے۔ پریس کانفرنس نے سید شہاب الدین اور یونس سلیم غائب تھے۔ دارالعلوم کے بدلے ہوئے حالات میں شاید یہ فارمولہ بعد از وقت سمجھا جائے۔

۹؍ اپریل : آج مولانا وحید الزماں صاحب دارالعلوم کے حالات پر قابو پانے کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔

۱۲؍ اپریل : آج شوریٰ کی نشست ہوئی، مولانا منظور نعمانی، مولانا عبدالحلیم جونپوری، شیروانی صاحب اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحبان تشریف لائے ہیں۔ دارالحدیث تحتانی میں مولانا منظور نعمانی صاحب نے احتسابِ نفس اور تقویٰ پر زور دیا۔ بعد نماز مغرب مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب کی تقریر ہوئی خوب خوب ہنسایا۔

۱۶؍ ستمبر ۱۹۸۲ء : مولانا جو رمضان ہی میں ماریشس، ری یونین، انگلینڈ وغیرہ کے سفر پر گئے تھے، آج واپس آرہے ہیں۔ جمعیۃ الطلبہ نے ان کے شایانِ شان استقبال کی پوری تیاری کرلی ہے۔ مولانا کے پہلے ریل سے آنے کی خبر تھی، لیکن میرٹھ میں فساد کی وجہ سے انھوں نے ارادہ بدل دیا اور اب روڈ سے ان کا سفر ہو رہا ہے۔ ۹ بجے جلوس کی شکل میں طلبا اپنی اپنی انجمن کے بلّے لگا کر تلہڑی چنگی پر پہنچ گئے ہیں۔ ۱۰ بجے مولانا کی ٹیکسی چنگی پر پہنچی۔ طلبا دو طرفہ قطاریں کھڑے ہیں۔ جوش و جذبہ سے صفیں ٹوٹتی جارہی ہیں۔ لوگ قائد ملت، شیخ الادب، امیر شریعت وغیرہ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ازدحام اتنا ہے کہ شانہ سے شانہ چھل رہا ہے۔ کئی لوگ مولانا کے گرد دائرہ بنا کر چل رہے ہیں تاکہ بھیڑ کی وجہ سے مولانا کو تکلیف نہ پہنچے۔ میں تمام مناظر کو اپنی آنکھوں میں قید کرنا چاہتا ہوں، اس لیے تیزی سے آکر دفتر محاسبی کے اوپر چڑھ گیا۔ مولانا جلوس کے ساتھ دارالحدیث میں داخل ہوئے۔ طلبا اور سارے لوگ مؤدب بیٹھ گئے۔ قاری عبدالجلیل منی پوری نے تلاوت کی۔ طلحہ فتحپوری نے مولانا کی تعریف میں چند جملے کہے ہی تھے کہ مولانا نے سختی سے منع کردیا۔ مائک پر تشریف لائے، شکریہ ادا کیا اور فرمایا:

"حضرات میں زمین میں دفن ہونا زیادہ پسند کروں گا، اس بات سے کہ اساتذہ کے سامنے میری تعریف کی جائے۔ یہ نعرے مسائل کا حل نہیں ہیں، دارالعلوم میں روح پھونکنے کے لیے آپ کو اپنا طرزِ عمل

بدلنا ہوگا۔ میں آپ لوگوں کے لیے کوئی ہدیہ نہیں لا سکا، لیکن ایک پیغام ضرور لایا ہوں، جو میرے سفر کا نچوڑ ہے۔ آج یورپ اور افریقہ کی روح پیاسی ہے۔ نوجوان طبقہ اسلام قبول کے لیے بے چین ہے۔ لیکن آج ان کے اعتراضات کا جواب دے کر انھیں مطمئن کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ کی کھیپ کی کھیپ اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ خدارا اب خلوص کے ساتھ میدان میں آئیے اور تبلیغ کے فرائض انجام دے کر دنیا کو ضلالت و گمراہی کے غار سے نکالیے۔" مولانا معراج صاحب کی دعا پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔

۱۰ رفروری ۱۹۸۲ء : آج جمعیۃ الطلبہ کا باضابطہ انتخاب ہوا۔ مولوی عثمان صدر، راقم الحروف جنرل سکریٹری اور حزب اللہ کے سبھی ممبران بھاری ووٹوں سے چن لیے گئے۔ رات کے گیارہ بجے مولانا ریاست علی صاحب نے الکشن آفیسر کی حیثیت سے ہم لوگوں کی جیت کا اعلان کیا۔ اسی مقصد کے لیے بلائے گئے۔ جلسہ سے مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے خطاب کیا اور فرمایا: "ہمیں امید ہے کہ جمعیۃ الطلبہ اور انتظامیہ کا باہمی ربط دارالعلوم کی عظمت رفتہ کو واپس لانے میں معاون ہوگا۔" جلسہ کے اختتام کے بعد ہم لوگ اپنے قائد مولانا وحید الزماں صاحب سے دعا لینے ان کے گھر گئے۔ مولانا نے مبارکبادیاں دیں اور دعائیں بھی۔

۱۱ رفروری : مختلف استقبالیہ جلسوں میں شرکت اور وفود کی مبارکبادیاں قبول کرنے کے بعد ہم لوگ مولانا وحید الزماں صاحب کے یہاں بعد نماز عشاء گئے۔ کافی دیر تک گفتگو ہوئی۔ دارالعلوم کی انتظامیہ سے اپنے اختلافات کا ذکر کرتے رہے۔ ہم لوگوں کی درخواست پر طلبار کی جانب سے بلائے گئے استقبالیہ جلسہ میں شرکت کی منظوری دے دی۔

۱۲ رفروری: دارالحدیث تحتانی میں جمعیۃ الطلبہ کا اجلاس ہوا۔ صدر جمعیۃ کی تحریک پر طلبار نے دارالحدیث سے مولانا کے گھر تک بڑی لمبی لائن استقبال کے لیے لگائی تھی۔ میں مولانا کے ساتھ ساتھ تھا۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد راقم الحروف کے ساتھ صدر جمعیۃ اور طلحہ فتحپوری نے مولانا کی کیمپ سے لے کر آج تک کی خدمات کا شرح و بسط سے ذکر کیا۔ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو مولانا نے فرمایا: "بھائی بہت ہو گیا۔ بس کرو۔ اب سننے کی تاب نہیں۔" پھر خود تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیمپ میں آپ سے جتنے وعدے کیے تھے، وہ پورے نہیں کر سکا اور نہ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ پورے ہو جائیں گے۔" پھر فرمایا: "آخر میرا کیا قصور ہے جو مجھے اس طرح

مطعون کیا جارہا ہے۔ سابق انتظامیہ سے میرا ایک طویل عرصہ تک اختلاف رہا۔ انھوں نے مجھ پر کبھی عہدہ طلبی کا الزام نہیں لگایا، اور یہ لوگ جن کے لیے میں نے سب کچھ برداشت کیا۔ میرے اہلِ خانہ پریشان ہوئے گھر پر حملے کیے گئے، مفسدین میرے دروازہ پر کھڑے ہو کر نعرے لگاتے تھے کہ وحید الزماں کو نکالو، ہم اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔ اتنی تکلیفیں ہم نے جھیلی ہیں۔ کیمپ کا زمانہ تھا، تو سی آئی ڈی والوں سے بات کرنا ہو تو، وحید الزماں کرے، پولیس ملنے آئے تو وحید الزماں ملے، نامہ نگاروں کو انٹرویو دینا ہو تو وحید الزماں دے، مالی پریشانی کا حل نکالنا ہو تو وحید الزماں نکالے اور آج وحید الزماں عہدہ کا خواہاں ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اہتمام چاہتا ہے۔ یاد رکھو! اگر اہتمام کی خواہش ہو گی اور جس دن ہو گی، تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے روک نہ سکے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ میں مجلس تعلیمی کا محرر بن کر نہیں رہنا چاہتا۔"

اس تقریر کے بعد مولانا دارالعلوم سے برسوں منسلک رہے، مددگار مہتمم جیسے عہدہ پر فائز ہوئے لیکن اس تقریر میں مولانا کے تئیں انتظامیہ کی جس بدلی ہوئی روش کا اشارہ ملتا تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تا آں کہ پہلے مولانا نے منصبِ اہتمام سے استعفا دے دیا اور بالآخر ان کو دارالعلوم سے جبری طور پر سبکدوش کر دیا گیا۔

اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر مولانا نے ان کے ہاتھوں شکست کھائی، جن کو کاندھے پر چڑھا کر مسندِ اقتدار تک پہنچایا تھا۔ اور وہ لوگ جیت گئے جو برسوں ساحل سے صرف طوفاں کا نظارہ کرتے رہے تھے اور ساحلِ مراد پر پہنچنے سے تھوڑا پہلے کشتی میں آبیٹھے تھے۔ ظاہری صورت حال تو یہی ہے۔ لیکن کون جانے آنے والا مؤرخ جب دارالعلوم کے انقلاب کی تاریخ لکھے تو اس کا فیصلہ اس سے مختلف ہو جو ہماری ظاہر بیں آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے۔ جب فاتح جیت کر بھی ہار گیا ہے اور ہارنے والا ہار کر بھی قابلِ رشک و تقلید رہا ہے۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ*

صدائے دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند میں جشن صد سالہ کے بعد رونما ہونے والے ہنگاموں کے دوران ایک مخصوص حلقہ کی طرف سے مولانا وحید الزماں صاحب جیسے عبقری اور مقبول عام استاذ کو دارالعلوم سے علاحدہ کرنے کا پرزور مطالبہ اور اس پر بے جا اصرار کیا جا رہا تھا۔ اس نامعقول مطالبہ سے متاثر ہو کر پروفیسر بدرالدین الحافظ نے "صدائے دارالعلوم دیوبند" کے عنوان سے یہ تحریر لکھی تھی۔ مضمون کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

اے میرے عزیز فرزندو! ابھی کے دن کی بات ہے تم نے کس شان سے میری اس چہار دیواری اور اس مبارک شہر دیوبند میں میرا صد سالہ اجلاس منایا تھا جسے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

مگر آج میں یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوں کہ تم باہمی رسہ کشی کا شکار ہو۔ تم میں ایک وحشت ناک سرد جنگ جاری ہے جس کے پیچھے نہ کوئی اہم مقصد ہے نہ سامنے تابناک منزل مقصود۔ تم میں ایک دوسرے کے لئے مخالفانہ غضبناک جذبات پائے جاتے ہیں آخر کیوں؟

کیا تم سب نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے۔ کیا تم سب نے ایک ہی مادرِ علمی کی گود میں نہیں پلے بڑھے ہو۔ کیا تم سب کو میرا مسلک اور میرا مفاد یکساں عزیز نہیں ہے۔ پھر آخر تم کیوں میری جگ ہنسائی کے لیے صف آرا اور کمربستہ ہو؟ آخر تمہاری بنائے مخاصمت کیا ہے؟

اگرچہ بحیثیت فرزند میرے نزدیک تم سب برابر ہو مگر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرا ایک فرزند جلیل آج

- * سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

خدمات اور کام کی وجہ سے دوسروں کی نگاہ میں خار بن کر کھٹکنے لگا ہے اور لوگ اس کے درپے ہیں کہ اس کا نشہ کی زندگی ختم کر کے دم لیں تو میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں بغیر پاسداری اور حمایت کے الزام کا لحاظ کیے حقائق سے ذرا پردہ اٹھاؤں۔

اب آؤ! ذرا غور سے سنو! میرا وہ پاسبان ادب وحید الزماں کیرانوی جو اپنی حق گوئی و بیباکی، جانفشانی اور علمی خدمات، ٹھوس کردار اور طلباء میں مقبولیت کی وجہ سے آج تمہاری سب و شتم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس نے دارالعلوم کو کیا دیا ہے۔

ذرا دارالعلوم کی تاریخ میں اٹھائیس سال پہلے ۱۹۵۲ء کا ورق پلٹو یہ وحید الزماں کے دورۂ حدیث کا سال تھا، یہ وہ دور تھا جب دارالعلوم میں حدیث، تفسیر، قدیم عربی ادب، منطق و فلسفہ، فقہ و قواعد کے عالمی شہرت رکھنے والے اساتذہ کرام موجود تھے اور ان سے فیض صحبت اٹھائے ہوئے طلباء، ان علوم میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے مگر مجھے اس حقیقت کے بیان کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس دور میں روایتی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود طلباء جدید عربی ادب اور عربی تقریر و تحریر کے ملکہ سے یکسر خالی ہوتے تھے سوائے اس کے کہ کسی کو ذاتی ذوق و شوق سے کوئی خوبی حاصل ہو گئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں جو لوگ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم کے طلباء کی صلاحیتوں کا موازنہ کرتے تھے وہ کھل کر کہتے تھے کہ دیوبند کے لڑکوں کو عربی نہیں آتی۔

اس کے علاوہ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس زمانہ میں دارالعلوم اپنے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت کو چھوڑ کر کسی ایک عربی کے قادر الکلام خطیب و متکلم سے آشنا نہ تھا۔

اس دور میں وحید الزماں کی پوزیشن یہ تھی کہ جب کبھی دارالعلوم کے مہمان خانہ میں کوئی عرب مہمان آ جاتا تو پہلے چپراسی دوڑتا ہوا وحید الزماں کو بلانے جاتا، جب وہ برج جنوبی فوقانی کے اپنے کمرہ سے مہمان خانہ پہونچ جاتے تو ان کی ترجمانی کے واسطے سے دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات مہمان سے گفتگو کر پاتے تھے۔ اگر کسی وقت یہ کمرہ میں موجود نہ ہوتے تو مہمان خاموشی و تنہائی کی گھڑیاں گنا کرتا۔ ان حالات میں انھوں نے فراغت حاصل کی اور فکر معاش میں سرگرداں ہو گئے۔

اسے حسن اتفاق کہیے کہ چند سال بعد وحید الزماں کو صف عربی کے مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم نے قبول کر لیا اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق انتھک محنت اور شوق و ذوق سے طلباء کو عربی ادب کی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ طلباء میں شوق پیدا کرنے اور صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے انھوں نے جو طریقے اختیار کیے وہ بھی دارالعلوم کی تدریسی تاریخ میں قطعی منفرد حیثیت رکھتے تھے مثلاً النادی الادبی کا قیام اس

عربی کلب کے ذریعہ کئی تعلیمی پروگرام چلائے گئے جن میں عربی کی جدید کتب و رسائل و اخبارات کی لائبریری کا قیام، اور ہفتہ واری، ماہانہ اور سالانہ جلسوں کا پروگرام شامل ہے جن کی ساری کارروائی از اول تا آخر عربی زبان میں ہوتی تھی۔

تحریری صلاحیت پیدا کرنے کے لیے دیواری اخباروں کا اجراء کیا گیا جن کا ریکارڈ آج بھی النادی کے دفتر میں موجود ہے۔

طلباء کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ کلاس میں اور کمرہ میں ہر وقت عربی میں گفتگو کریں۔ حد یہ کہ شام کو طلباء فٹ بال اور والی بال کھیلتے تو اس کی اصطلاحات بھی عربی میں بولتے تھے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ عربی بولنے اور لکھنے والے نظر آنے لگے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ ابتداء میں طلباء کے اس منجمد ماحول کو متحرک کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ایک اکیلے استاد کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اس کو تعلیم و تربیت کا تجربہ رکھنے والا شخص ہی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال اس مسلسل کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دارالعلوم کی چہار دیواری میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے طلباء مل سکتے ہیں جو عربی تقریر و تحریر میں نہ صرف عربوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں

ان کے علاوہ جو علماء فراغت کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں متعدد اعلیٰ مناصب پر اپنی عربی صلاحیت سے طلباء اور عوام کو فیضیاب کر رہے ہیں ان کا شمار مشکل ہے۔ ان تمام ناموران علم و ادب کو وحید الزماں ہی کے فیض صحبت و شرف تلمذ نے جلا بخشی ہے۔

اب اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ تدریس کے علاوہ وحید الزماں کے قلم جولاں نگاہ نے گذشتہ ۲۵ سال میں عربی ادب میں کیا اضافہ کیا ہے تو "دعوۃ الحق"، دیوبند کے فائل اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں جو علمی مجلہ تقریباً دس سال تک ان کی ادارت میں عرب دنیا میں دین و ادب کا جادو جگاتا رہا ہے۔

درسی کتابوں میں القراءۃ الواضحۃ کا جدید سہل نصاب ان کا مرتب کردہ اس قدر مقبول ہوا ہے کہ آج بہت سے دینی مدارس کے علاوہ گورنمنٹ کے اداروں میں داخل نصاب ہے، دہلی کے اسکول آف فارن لنگویجز اور جامعہ ملیہ کے سرٹیفکیٹ کورس میں داخل درس ہے۔ بہت سے غیر مسلم اسی کے ذریعہ عربی سیکھ رہے ہیں۔ آپ کی اردو عربی اور عربی اردو القاموس الجدید نامی لغت ہندوستان میں شائع ہونے والی اپنی قسم کی وہ پہلی کتاب ہے جس نے جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کے شائقین کی تشنگی کو دور کیا ہے

اور اب صد سالہ اجلاس کے موقعہ پر دارالعلوم کی عمارات کی تزئین و تجدید بھی اسی رنگارنگ صلاحیت

کے حامل وحیدالزماں کی مرہونِ منت ہے جسے دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے بیشہ ور انجنیر بھی ششدر رہ جاتے ہیں
اب اے ارباب اقتدار اور ان کے ہم نشینو! ذرا سوچو! اگر مذکورہ حقائق اور دلائل میں کسی طرح کا جھول یا غلط بیانی ہے تو اس تحریر کے قلمکار میرے ترجمان کی زبان کو ناک سے کھینچ دو، اس کے ہاتھوں کو پہنچوں سے اتار دو تاکہ ہمیشہ کے لیے یہ زبان درازی موقوف اور قلم کی حرکت یکلخت نیست و نابود ہو جائے لیکن اگر ان حقائق کا تعلق وحیدالزماں کی زندگی سے ہے تو پھر بتاؤ اس کا نہ گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں تم اسے میری چہار دیواری سے ہمیشہ کے لیے دور کر دینا چاہتے ہو۔

کیا وحیدالزماں نے دارالعلوم کی مالیات میں خُرد بُرد کیا ہے، کیا اس پر کسی غبن کا الزام ہے، کیا اس نے اپنے کسی نااہل عزیز و قریب کو دارالعلوم کی ملازمت سے چپکایا ہے، کیا اس نے دارالعلوم کی کسی عمارت پر ناجائز قبضہ یا عمارت کو اس کی حیثیت سے کم کرایہ پر حاصل کیا ہے، کیا وہ طلباء سے فرمائشیں کرنے کا مجرم ہے؟ یا اس کے علاوہ اور کوئی الزام اس پر عائد ہوتا ہو تو کھلے عام اس کی اشاعت کر کے عوام کی عدالت میں اسے برہنہ کر دو تاکہ از خود اسے قرار واقعی سزا مل جائے اور تم کتمانِ حق کے مجرم نہ بنو۔

ہاں اگر وحیدالزماں پر یہ الزام ہے کہ اس نے گونگے طلباء کو بولنا سکھا دیا، بے زبانوں کو زبان دیدی، اپنے جائز مطالبات کو پیش کرنے کی جرأت پیدا کر دی تو ان اسلامی وجمہوری صفات کو گناہ و جرم ثابت کرنے سے پہلے حضرت عمر فاروق کے اس واقعہ کو جس میں ایک صحابی نے دورانِ خطبہ آپ کے کرتے پر اعتراض کیا تھا اور آپ نے منبر سے اتر کر پہلے معترض کا معقول جواب دیا پھر خطبہ کی تکمیل کی تھی۔ تاریخِ اسلام کے صفحات سے نکال دو، اگر اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے طلباء کی زندگی میں سلیقہ مندی پیدا کر دی تو چاہے چند خمیدہ ذہن قدامت پرست لوگ اسے گناہ سمجھیں مگر ترقی پسند صالح دل و دماغ کے عوام و خواص کبھی اس پر مہر تائید ثبت نہ کریں گے۔

اگر وحیدالزماں پر یہ الزام ہے کہ اس نے طلباء کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، طلباء کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس کے اشارے پر ناچتے ہیں تو خدارا یہ بتاؤ کہ دوسرے اساتذہ یہ فرض کیوں نہ انجام دے سکے، دوسروں کو طلباء کا ہمدرد بننے میں کیا رکاوٹ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ معلم و متعلم کے باہمی تعلق کا اصول مسلمہ یہ ہے کہ اگر استاذ میں تدریس کی اعلیٰ صلاحیت اور طالب علم سے سچی محبت ہو تو طالب علم ہمیشہ استاذ کا گرویدہ رہتا ہے، اسی اصول نے وحیدالزماں کو ہمیشہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کیا اور اس گُر کو دوسرے بھی اختیار کر سکتے تھے۔ اب خدا کے لیے اس معاندانہ روش سے باز آؤ اور اس پاسبانِ علم و ادب کو یکسو ہو کر علم و ادب کی خدمت کرنے دو۔

ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد بھی اگر کوئی ناعاقبت اندیش یہ سوچے کہ وہ چند نامانوس لوگوں کی مدد اور نادان عوام کی مٹھی بھر جماعت کے تعاون سے ادب کی اس شمع فروزاں کو بجھانے میں کامیاب ہو جائے گا تو یاد رکھو اب "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا" کیوں کہ اس چراغ نے اب ہند اور بیرونِ ہند اتنے چراغ روشن کر دیے ہیں جن کا گل ہونا مشکل ہے، تم کہاں کہاں پانی کے خشک فوارے لیے انھیں بجھاتے پھروگے۔ تھک جاؤگے، درماندگی بٹھا دے گی، ناکامی پچھاڑ دے گی، یہ چراغ تو اب اپنے مرکز کے سہارے روزافزوں ترقی ہی کرتے جائیں گے۔ ●●●

قائدِ مظلوم

- روز افزوں مقبولیت سے مفاد پرستوں کے اندیشے
- کردار کشی کی مہم
- جبری سبکدوشی
- علمی و دینی حلقوں کا ردِّ عمل

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن رازؔ

مولانا وحید الزماں کی سبکدوشی

محض اتفاقی حادثہ یا سوچا سمجھا منصوبہ؟

(زیر نظر مضمون مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کی دارالعلوم دیوبند سے جبری سبکدوشی کے بعد دفتر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو دوحہ (قطر) سے موصول ہوا تھا۔)

دارالعلوم دیوبند کم و بیش ایک دہائی سے سخت انتشار و مشکلات سے دوچار ہے۔ ایشیا اور برصغیر ہند و پاک کا یہ عظیم اسلامی ادارہ ایک روشن تاریخ کا حامل رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد قائم ہونے والے اس اسلاف کے وارث دینی مرکز نے تقریباً ایک صدی تک اسلام اور علوم اسلامیہ کی بے لاگ اور پر خلوص خدمت کی۔ لیکن گذشتہ چند دہائیوں سے اس کا حقیقی کردار کچھ کمزوریاں اور سازشوں کا شکار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے جشن صد سالہ کے بعد سے مسلسل افراتفری اور انتشار اس کی قسمت بن کر رہ گیا۔ یہ درست ہے کہ مرحوم و مغفور قبلہ مہتمم صاحب (قاری محمد طیب) طیب اللہ ثراہ کے انتظام میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنا دائرۂ اثر پھیلاتی چلی گئیں، جن میں سب سے بڑی خامی وہ تھی جسے صاحبزادہ پرستی کہا جاسکتا ہے یعنی کسی بڑے استاد یا بزرگ کی اولاد کو محض اولاد ہونے کی بنیاد پر استاد یا کوئی دوسرا عہدیدار بنا دینا، کم از کم علمی ذمہ داری تو محض علمی صلاحیت کی بنیاد پر ہی سپرد کی جانی چاہئے کسی دوسری بنیاد پر نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب صاحبزادگان نااہل ہیں بلکہ ان میں کئی قابل و فاضل حضرات بھی ہیں جن سے راقم السطور نے بھی علمی اکتساب کیا ہے۔

بہرحال رفتہ رفتہ یہ خامی رنگ لائی اور کئی اچھے اساتذہ کو انتظامیہ سے شکایت بڑھنے لگی، مگر یہ دارالعلوم کا اندرونی مسئلہ تھا اور دیر سویر کسی بھی انداز سے اندرونی طور پر ہی حل ہوسکتا

تھا، مگر تقریب جشن صد سالہ نے جہاں ایک طرف ہندوستان و پاکستان بلکہ تمام عالم اسلامی میں اس ادارہ کی مقبولیت و اہمیت کو رونما کیا وہاں دوسری طرف کچھ حاسدوں اور موقع پرستوں کو اس کی بیخ کنی کرنے پر آمادہ بھی کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کی جلا وطنی و اسیری کے بعد سے دار العلوم کے کئی ذمہ داران انگریز دشمنی میں کانگریس پارٹی کے ساتھ تعاون کرنے لگے جبکہ دیگر متعدد مؤقر اساتذہ اس رجحان کے علانیہ اور سخت مخالف رہے، یعنی دار العلوم دیوبند کسی بھی لمحہ مکمل طور پر کانگریس کا وکیل نہیں رہا، بلکہ اکثریت ہمیشہ غیر جانبدار اور علمی مشاغل میں مصروف رہی لیکن گذشتہ چند دہائیوں سے داخلی طور پر کم اور خارجی سطح پر زیادہ سیاسی عمل دخل بڑھنے لگا۔ اس میں ایک طرف مرحوم قاری محمد طیب صاحب کی مرنجاں مرنج پالیسی اور نرمی و میانہ روی کو دخل تھا اور دوسری جانب چونکہ دیوبند کچھ مشہور اور سرگرم سیاسی کھلاڑیوں کا مرکز بھی تھا اس نے بھی بالواسطہ سیاسی اثرات کو بڑھاوا دیا، یہاں تک کہ جب جشن صد سالہ میں دار العلوم کی عالمی مقبولیت کا مظاہرہ ہوا تو یہ سیاسی ابن الوقت بوکھلا اٹھے اور دہلی کی کرسیوں کو بے وقعت سمجھ کر دار العلوم دیوبند کو ہڑپ کرنے پر تل گئے۔

مرحوم قاری محمد طیب صاحب ایک معروف علمی اور دینی شخصیت کے حامل تھے، ان کی دینی علمی اور ادبی تصانیف بڑی تعداد میں موجود ہیں، ہندوستان کے گوشے گوشے میں انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اسلامی افکار و تعلیمات کو روشناس کرایا ہے۔ انھوں نے اور ان کے خاندان نے ہندوستان کی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا، ان کی تمام تر کوشش و کاوش دار العلوم دیوبند کے لئے تھی۔ کم از کم انفرادی حیثیت سے ان کی شخصیت کو تسلیم کرنے میں کسی کو کلام نہ تھا اگرچہ ان کی ذات سے کچھ شکایات کچھ حضرات کو ضرور رہیں لیکن جس شخص اور خاندان نے قاسمی خاندان کو بے دخل کرنے کا بیڑا اٹھایا اس کی علمی اور اخلاقی حیثیت کیا ہے؟ کیا موجودہ افراد کی کچھ علمی تصانیف اور کارنامے ہیں؟ کیا انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ کر کے دکھایا ہے؟ مرحوم مولانا حفظ الرحمٰن جمعیت علمائے ہند کو جہاں چھوڑ گئے تھے۔ کیا موجودہ کرتا دھرتا عناصر نے اس جمعیت اور اس کے اخبار کو دفن نہیں کر دیا ہے؟ جو لوگ قوم سے انگریزی اخبار کے لئے لاکھوں روپے چندہ وصول کر چکے ہوں، وہ ایک اردو روزنامہ بھی نہیں چلا سکے۔ کیا ان حضرات سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ یہ دار العلوم جیسے عظیم ادارہ کی ترقی و بہبود کے ضامن ہو جائیں گے۔ دہلی اور دیوبند میں لگے بے شمار پوسٹر اس بات کے گواہ ہیں کہ مسلم عوام کو بالعموم اور خواص اور دانشوروں کو بالخصوص ان حضرات

سے کتنی شکایات اور خیانت کا کتنا خوف ہے۔ رہا دارالعلوم دیوبند تو موجودہ حالات میں اس کی علمی مرکزیت کی بحالی یا ترقی کی توقع کرنا بے سود ہے کیونکہ جن لوگوں کا خود کوئی علمی اور علمی مقام نہیں وہ کسی ادارے یا کرسی کی مدد سے اپنا مقام اور قد تو بلند کرسکتے ہیں اس ادارے کا نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے موجودہ انتظامیہ اور عملے میں پرانے عظیم بزرگوں اور اساتذہ کے کردار و علم کو تلاش کرنا بے سود ہے، ہاں کچھ مخلص اور غنیمت قسم کے نفوس ضرور باقی ہیں جن میں سرفہرست حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی دامت برکاتہم کا وجود گرامی ہے۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ موجودہ ذمہ داران دارالعلوم نے حضرت مولانا موصوف کی طویل علمی خدمات اور تجربہ کے ساتھ حسن معاملہ کا اپنی تحریک کے آغاز میں پوری طرح استحصال کیا تھا اور اندرونی سطح پر وہ ہرگز کامیاب نہ ہوتے اگر مولانا موصوف کا تعاون انھیں حاصل نہ ہوتا، مگر چونکہ یہ لوگ نیک نیت نہیں تھے وہ دارالعلوم کی خدمت کرنے نہیں بلکہ اسے ناکام و مفلوج کرنے کے لئے اس میں داخل ہوئے تھے: اس لئے انھوں نے رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کا عمل شروع کردیا۔ دارالعلوم سے پوری ملت کی متفقہ آواز اور اس کے مفاد کے خلاف فتوے صادر ہونے لگے، صرف ایک دو صوبوں کے لوگوں کی بھرمار اور اقرباپروری کا دور دورہ ہونے لگا، ذی استعداد اساتذہ کو برطرف کرکے علم وعرفان کا گلا گھونٹا جانے لگا، جس پر اب بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور کئی حضرات جنھوں نے قاری صاحب مرحوم کے خلاف آواز اٹھائی تھی انھیں اندازہ ہوا کہ نیا انتظامیہ تو نہ صرف جاہل اور نکما بلکہ بدنیت بھی ہے، یہ تو بجائے علم کی شمع روشن کرنے کے جہالت کی تاریکیوں کا بول بالا کرنا چاہتا ہے ان حضرات نے ازسرنو ایک بار پھر نعرۂ حق بلند کیا مگر اس مرتبہ ان کا واسطہ چند خدا پرست بوڑھوں اور کمزور ملت کے سادہ لوح نوجوانوں سے نہیں تھا بلکہ جابر و مستبد اہل ہوس اور متمول موقع پرستوں سے تھا جن کی رسائی زنجیروں اور سنگینوں کی بارگاہوں تک تھی لیکن کیا آج تک طوق و سلاسل حق کی آواز دبانے میں کامیاب ہوسکے ہیں؟ کبھی نہیں! حق کو کچھ دیر کے لئے محبوس کیا جاسکتا ہے مگر ایک دن اس کا بول بالا ہوکر رہتا ہے، حق آتا ہے باطل مٹ جاتا ہے کیونکہ باطل کی قسمت میں مٹنا ہی لکھا ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے مولانا وحید الزماں صاحب کی سبکدوشی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ ایک ایسا سانحہ والمیہ ہے جس کے پس پشت فتنہ پردازی، علم دشمنی، ملت فروشی اور ضمیر باختگی کی طویل داستان ہے جسے ہندوستان کا ہر دانش مند، مہذب اور غیرت مند مسلمان جانتا ہے اور ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب موجودہ سیاہیوں کا پردہ چاک ہوکر ایک نئی صبح امید روشن ہوگی۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا آس محمد گلزار قاسمی
جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ

مولانا وحید الزماںؒ نے دارالعلوم کو کیا دیا اور کیا پایا

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے جن اوصافِ حمیدہ سے متصف کیا تھا، وہ عموماً کم ہی پائے جاتے ہیں، حضرت مولانا نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے اندر وہ صلاحیتیں جمع کرلی تھیں کہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور ہی نہیں بلکہ برصغیر کے تمام علمی و ادبی حلقوں میں ان کی صلاحیتوں کو بنظر تحسین دیکھا جاتا تھا، یہاں تک کہ آپ کو ملک سے باہر کئی معروف یونیورسٹیوں کی طرف سے پیش کش ہوئی، مگر مولانا مرحوم نے اپنی تمام صلاحیتوں اور کمالات کا فائدہ اپنی مادر علمی (دارالعلوم) اور وہاں کے طلبہ عزیز کو ہی پہنچانا بہتر و افضل سمجھا۔

آپ نے دارالعلوم میں ملازمت کے دوران تدریسی، تنظیمی اور خاص طور پر تربیتی میدانوں میں جو مثالی کردار ادا کیا ــــ اس کی نظیر نہیں پائی جاتی، اوقات کی پابندی، وقت کی قدر و قیمت، خود کو فعال اور منظم رکھنا، اور نظم و نسق کے ساتھ طلبہ کی زندگیوں میں شعور و سلیقہ مندی کا رنگ بھرنا اور وقتاً فوقتاً طلبہ عزیز کی خبرگیری اور ان کے دکھ درد میں شامل رہنا، مولانا مرحوم کے اس مخلصانہ کردار اور جذبۂ ایثار کو دیکھ کر طلبہ عزیز نے ان کو اپنا مسیحا، مربی اور محسن بنالیا تھا۔

دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ میں مولانا نے اپنی جن صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہ اَظْہَرُ مِنَ الشَّمْس ہیں، آپ نے عمارتوں کے فاصلوں کو ہی کم نہیں کیا، بلکہ ان میں رہائشی گنجائشوں اور وسعتوں کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ حضرت مہتمم صاحب (مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) نے شاباش کہا۔ اور فرمایا کہ جو وحید الزماں کر رہے ہیں وہ سب ٹھیک ہے۔

مولانا مرحوم کی یہ خوبی تھی کہ جس کام پر لگتے تھے، تو پھر دوسری کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ آرام کا خانہ نہ ہونے کے درجہ میں تھا۔ کام کی تکمیل مقصد اصلی ہوتا تھا، درحقیقت آپ رات و دن آندھی و طوفان کی طرح کام کرنے کے عادی تھے، لیکن اس رفتار میں نہایت ہوشمندی اور سلیقہ مندی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ دارالعلوم میں آپ جس خلوص و جذبہ ایثار و للّٰہیت سے کام کر رہے تھے، اس کی قدر و منزلت حکیم الاسلام حضرت قاری محمد

طیب صاحبؒ کے دور اہتمام میں بڑی حد تک تھی، حالانکہ مولانا مرحوم بہت واضح طور پر جمعیتی تھے اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے گہری عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ ان اسباب و علل کی بنیاد پر آپ کو مولانا اسعد مدنی کا حمایتی تصور کیا جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے دور اہتمام میں کئی بار اس طرح کی اٹھنے والی آواز اور شورش کو بعض لوگوں نے مولانا مرحوم کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی، حالانکہ مولانا کیرانویؒ کی طرف سے اس طرح کا کوئی عملی ثبوت نہیں پایا گیا۔ بس اتنا ضرور تھا کہ اگر مولانا کو کسی طرح یہ معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کے ساتھ ظلم و زیادتی ہورہی ہے، خواہ انتظامیہ کی طرف سے ہو یا انفرادی تو وہ زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے میں پروا نہیں کرتے تھے۔ مرحوم کی یہ بھی خواہش رہی کہ دارالعلوم دیوبند سب کا ہے — اور اس میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی بھی قربانیاں شامل ہیں لیکن ان کی نسل اور اولاد میں سے کسی ایک فرد کی بھی اس میں گنجائش نہ ہو یہ مناسب نہیں ہے۔ اس تعلق سے کبھی کبھی آپ جذباتی لب و لہجہ میں اظہار فرمایا کرتے تھے۔ یہ حضرت مولانا مرحوم کی دلی عقیدت اور اپنے استاذ حضرت مدنیؒ سے والہانہ تعلق کی بات تھی۔ بہرحال وہ وقت آ پہنچا کہ دارالعلوم میں معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ دو محاذ کھل گئے — مولانا کیرانویؒ نے اپنے استاذ زادے کا کھل کر ساتھ دیا، اور اس جنگ میں کھل کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ اس مشن کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی۔ لیکن اس فتح و کامرانی کے بعد مولانا کو نظر انداز اور پریشان کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اور بالآخر ان کی برطرفی پر منتج ہوا وہ دارالعلوم کی تاریخ کا نہایت افسوسناک باب ہے۔

حضرت مولانا مرحوم چاہتے تھے کہ دارالعلوم کے انقلاب میں جن حضرات کا تعاون شامل رہا ہے۔ ان کو کسی نہ کسی طرح یاد رکھا جائے، ان کی ستائش ہو، اور خیال خاطر احباب کا کوئی طریقہ و ذریعہ اپنایا جائے تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ ایک دائرہ تھا شہری سطح پر، دوسرا دائرہ تھا اساتذۂ کرام اور طلبۂ عزیز کا، تیسرا دائرہ مغربی اترپردیش و اطراف کے مدارس اور ان کے ذمہ داران اور دوسرے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے معاونین و متعلقین کا جنہوں نے اس قضیہ کو حل کرنے اور اس معرکہ کو فتح کرنے میں ہر طرح سے مدد پہنچائی تھی، مثلاً کیمپ کے قیام وغیرہ میں تعاون پر اظہار تشکر کے لیے حضرت مولانا نے ایک محدود و مخصوص حلقہ کو دعوت دی، اس دعوت پر علاقائی مدارس کے ذمہ داران بڑی تعداد میں حاضر ہوئے مگر یہ افسوسناک حقیقت بھی کہ اس موقع پر ذمہ داران دارالعلوم اور بڑے اساتذہ کرام میں سے ایک فرد بھی شامل و حاضر نہ ہو سکا۔ بظاہر یہ لگا کہ یہ مہذب بائیکاٹ ہے۔ باہر سے آنے والوں کو سخت حیرت بھی کہ ہم باہر سے آئے ہیں، لیکن جن لوگوں کے لیے ہم نے پوری جنگ لڑی ہے۔ اور ہر طرح کا تعاون پہنچایا ہے، ان میں سے یہاں ایک بھی حاضر نہیں ہے۔ بلکہ اچھا خاصا بائیکاٹ و احتجاج ہی نظر آرہا ہے۔

بہرحال، بلائے ہوئے حضرات ایک دو گھنٹے کے بعد ایک احساس کو دلوں میں لے کر واپس ہو گئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے تئیں دلوں میں نفرت و اختلاف اور اُن کو مٹانے کے جذبات اُبھرنے شروع ہو گئے، اور بڑھ کر ایک دن بڑے دائرے بن گئے۔ یہاں تک کہ اپنے ہی محسنوں کے لیے ماسٹر پلان تیار ہو گیا۔ دھیرے دھیرے حضرت مولانا مرحوم پر اعلانیہ تنقید، تبصروں اور برائیوں کا دروازہ کھل گیا، ماحول میں یہ تاثر پیدا کیا جانے لگا کہ مولانا جذباتی ہیں، بیمار ہیں، بیکار ہیں، اور ان کے بس کا اب کوئی کام ہی نہیں ہے۔ حضرت مولانا مرحوم کی شہرت کو ختم کرنے، دلوں سے ان کی عظمت نکالنے اور ان میں مفروضہ خرابیوں کو ثابت کرنے کی مہم نے تیزی پکڑی۔ مولانا مرحوم سیاسی لوگوں میں سے نہیں تھے۔ اور نہ ہی اپنی ذات کے اردگرد انھوں نے کوئی حلقۂ خاصان جمع کیا تھا۔ کچھ لوگوں کے دل و دماغ میں بس یہ بات تھی کہ اگر یہ شخص رہے گا تو اسی کی عزت ہوگی اور باقی سب لوگ بیکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ میں مولانا کی شخصیت پر بحث ہوئی اور بعض لوگوں نے ایک مخصوص ممبر شوریٰ کے زیر اثر مولانا کی مخالفت میں وکالت کی۔ بعض اساتذہ نے اسباق میں برائیاں کیں۔ مختلف طریقوں اور ذریعوں سے مولانا مرحوم کو زخمی کیا گیا اور اذیت پہنچائی گئی اور اس طرح کے واقعات روز بروز رونما ہونے شروع ہو گئے۔ سیاسی لوگوں کا مقولہ ہے کہ پہلے مسئلہ تو بنے تب ہی کوئی آواز اٹھ سکتی ہے۔ حضرت مولانا مرحوم میں نہایت جذب و برداشت، بڑی ثابت قدمی، اور صبر و استقامت کے ساتھ کام کر رہے تھے اور وقت گذار رہے تھے، کار مفوضہ سے منھ موڑنا یا اس کو نہ کرنا، ان کے مذہب میں شامل نہیں تھا۔ الغرض مولانا مرحوم کی شخصیت کو داغدار اور مفلوج و بے اثر بنانے کی تدابیر جاری تھیں۔ دریں اثنا اہتمام کا ایک چپراسی موت کا پیغام لے کر سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ یہ مولانا مرحوم پر حملہ کا سب سے بڑا و آخری دن تھا۔ ایک لفافہ میں بغیر کسی تمہید کے دار العلوم کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دینے کا فیصلہ تھا۔ یہ فیصلہ درحقیقت مولانا مرحوم کے لیے پیغام اجل سے کم نہیں تھا۔ جس ادارہ سے ان کی محبت ضرب المثل تھی اور جس کی تعمیر و ترقی کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کیا تھا اس سے بیک بینی و دو گوش بے دخل کر دیا جانا کس قدر اذیت ناک ہوگا اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ بقیہ زندگی کا حصہ مولانا کیرانوی مرحوم نے بڑے کرب و اضطراب میں گذارا ہے۔ اور کیا کیا مولانا مرحوم پر گذری ہے اس سے دار العلوم دیوبند کا مخصوص حلقہ اچھی طرح واقف ہے، اے کاش ــ! مولانا مرحوم کسی ایسے ادارے میں ہوتے کہ جہاں مولانا کی صلاحیتوں، کارناموں اور خاص طور پر تصنیفات کو اجاگر کیا جاتا، ان پہلوؤں پر الگ الگ سیمینار اور تقابلی مطالعہ کے پروگرام کیے جاتے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی باوجاہت شخصیت کا اعتراف بصورت اعزاز ہوتا۔ آپ کی تصنیفات کے لیے اشاعتی منصوبہ ہوتا اور ان کو ایک خاص

مقام دیا جاتا ___ ؟

مولانا مرحوم کو مختلف اداروں، جماعتوں اور تنظیموں کی طرف سے پیش کش ہوتی، انھوں نے آپ کی سرپرستی اور مفید مشوروں کے لیے برابر رابطہ بھی رکھا۔ بعض تحریکوں اور محاذوں میں شامل ہونے سے آپ نے انکار بھی نہیں کیا ــ وہ چاہے جمعیۃ علماء ہند کے کردار کی بحالی کی مہم ہو یا ملی جمعیۃ علماء ہند اور پھر مرکزی جمعیۃ علماء کی صدارت، یہ سب تحریکات و سلسلے مولانا مرحوم کے لیے نشانِ منزل نہیں تھے۔ بلکہ صرف اتفاق و نباہ کی حد تک ہی اُن سے وابستگیاں تھیں۔ بس! اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے صرف اور صرف دارالعلوم کا ہی ذکر، اُس سے اُلفت کا اظہار، اور اس کی خدمت کے لیے متوجہ کرنا ـــ اور مرتے مرتے اس کے نام پر تڑپنا، اور کروٹ کروٹ اُس کو یاد کرکے آبدیدہ ہونا ـــ یہ تھی آخری معراج اس کے ایک سچے محسن و خادم کو ملی ــ

آسمانِ علم کا تھا وہ درخشاں آفتاب
بس مطالعہ سے پڑھتی مصلحت کی ہر کتاب
وہ مجاہد، وہ مفکر وہ سپہ سالارِ قوم
اُس کے دل میں قاسمیت تھی یقیناً بے حساب

اللہ تبارک و تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ــ آمین،

بقیہ : علم و دانش کا پیکر

باتفاق آرا اس کے صدر منتخب ہوئے۔

مولانا وحید الزماں الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس والی صفت رکھتے تھے آپ نے اپنی ذات کے لئے کئی مدوجزر کے باوجود کبھی انتقامی کاروائی کے بارے میں نہ سوچا اور نہ کسی کو اپنی طرف سے اجازت دی بلکہ انتقال سے پہلے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ تم کسی سے اختلاف نہ رکھنا میرا اختلاف اصولی تھا تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ مولانا نے یہاں تک کہہ دیا میں نے یک طرفہ طور پر سب کو معاف کردیا ہے واذا مروا باللغو مروا کراما، آپ فطرتاً بطئ الغضب اور سریع الفئ تھے جو اخلاق کا اونچا معیار ہے عفو و درگذر آپ کی عادت تھی۔

فیصلۂ سبکدوشی پر
مولانا وحید الزماںؒ کا ردِّ عمل

دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات سے سبکدوشی کا فیصلہ موصول ہونے کے بعد مولانا وحید الزماںؒ صاحب نے مہتمم دارالعلوم کے نام متعدد تحریریں ارسال کیں جن میں اس فیصلے کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کر کے اس پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ مولانا نے پر زور دلائل سے ثابت کیا کہ سبکدوشی کا فیصلہ ضابطہ و تعامل کے خلاف اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ ایک تحریر میں جو ۱۳ محرم ۱۴۱۱ھ کو ارسال کی گئی، مولانا نے متعدد بے ضابطگیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتہ پر خصوصیت سے زور دیا کہ دارالعلوم کے ایک اہم استاذ کی سبکدوشی کا یہ فیصلہ مجلس شوریٰ کے ایجنڈے میں لائے بغیر اور شوریٰ کے سینئر اور مقتدر ارکان کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہے۔ جب کہ معمولی درجے کے ملازمین کو بھی اس طرح سبکدوش نہیں کیا جاتا۔ مولانا مرحوم کے الفاظ میں :

" دراصل یہ ساری بے ضابطگی اس لئے ہو رہی ہے کہ اصل معاملہ یعنی فیصلۂ سبکدوشی ہی غلط بنیاد پر کیا گیا ہے، اب اسے نبھانے کے لئے ایک غلطی کی جگہ مسلسل غلطیاں ہو رہی ہیں۔ فیصلہ اس لئے غلط بنیاد پر ہے کہ درجۂ علیا کے ایک ایسے مدرس کی علیحدگی کا فیصلہ جس کی دارالعلوم میں خاص اہمیت رہی ہو اور انقلاب دارالعلوم میں اس کا نمایاں کردار رہا ہو۔ خود مجلس شوریٰ نے اور آنجناب نے ایک درجن سے زائد تحریروں میں اس کی بیماری کے باوجود دارالعلوم کے لئے اس کی ضرورت و

اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور اس کی قوتِ کارکردگی اور انتظامی صلاحیت کو کھلے لفظوں میں سراہا ہو۔ جو اہم عہدوں پر فائز رہا ہو اور جو اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر حالت میں ہو اور سالِ گزشتہ جس نے پابندی کے ساتھ مفوضہ تدریسی خدمت انجام دی ہو اور اس کا ہند و بیرونِ ہند میں ایک وسیع حلقۂ تلامذہ بھی ہو۔ اس کی علیحدگی کا مسئلہ ایجنڈے میں لائے بغیر جب کہ مجلسِ تعلیمی کی رپورٹ بھی اس کے خلاف نہ ہو، محض ناظم مجلسِ تعلیمی کی سرسری غیر قانونی رپورٹ پر یا کسی دوسرے شخص کی ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر سبکدوشی کا فیصلہ کرنا کسی بھی طرح منصفانہ فیصلہ نہیں کہا جاسکتا۔ جب کہ معمولی درجے کے ملازمین کو بھی اس طرح سبکدوش نہیں کیا جاتا، اسے بھی ایجنڈے میں لایا جاتا ہے۔"

ایک اور مفصل و مدلل تحریر جو مولاناؒ نے دفتر اہتمام اور اس کے واسطے سے مجلس شوریٰ کو ارسال فرمائی۔ اس کا متن سطور ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس تحریر میں مولانا مرحوم کی طرف سے اٹھائے گئے نکات کتنے اہم ہیں، اس کا اندازہ قارئین بآسانی کرسکتے ہیں۔ (ادارہ)

محترم و مکرم حضرت مہتمم صاحب (دارالعلوم دیوبند) دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کے دستخط سے مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ شعبان ۱۴۱۰ھ کی ایک تجویز مجھے ۴ رمضان ۱۴۱۰ھ کو موصول ہوئی تھی جس میں دارالعلوم کی تدریسی ذمہ داریوں سے مجھے سبکدوش کیے جانے کا ذکر تھا۔ اس میں چونکہ اس فیصلے کی تاریخِ نفاذ کا ذکر نہیں تھا، اس لئے میں بروقت خاموش رہا کہ شاید اس کا تعین ہی بعد میں ہو یا شاید کوئی اور فیصلہ کیا جائے۔

مجھے آپ کے دستخط سے جو تجویز موصول ہوئی تھی اس میں میری سبکدوشی کی وجہ میری "بیماری اور اس کے نتیجے میں اشتعال" میں آجانا تحریر کی گئی ہے۔ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کی مؤقر اور بااختیار کمیٹی ہے جس کے اراکین کا میں ہمیشہ ہی سے احترام کرتا آیا ہوں اور ان کے فیصلوں کو بھی قابلِ احترام و تسلیم

سمجھتا آیا ہوں جن کا انہیں حق اور اختیار ہے اور اب بھی اگر مجلس مجھے کسی سبب اور علت کے بغیر سبکدوش کردیتی تو شاید میں کچھ نہ کہتا۔ لیکن اس کے برعکس مجلس نے چونکہ مجھے سبکدوش کرنے کا فیصلہ ایک خاص سبب کے تحت کیا ہے۔ اس لئے اب یہ سوال قدرتی اور ناگزیر ہے کہ یہ سبب واقعۃً ہے یا نہیں اور یہ کہ اتنے اہم فیصلے کے لئے اس کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

تجویز کے مطابق مجھے سبکدوش کرنے کا فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ میں بیمار رہتا ہوں اور اس کی وجہ سے "مشتعل" ہو جاتا ہوں۔ اولاً تو میں اس کو محض ایک الزام سمجھتا ہوں کیوں کہ اشتعال میں آنا اور مشتعل ہونا ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے جس کا کسی بھی باضمیر اور حساس انسان پر مخصوص حالات میں طاری ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی ایسے وقت میں جب موقع اظہارِ حق کا ہو اور دوسری جانب سے اپنی مصلحت کی بنیاد پر حق کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہو تو یہ کیفیت تمام حق پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ میرا یہ "مشتعل" ہونا مزاجاً وطبعاً ہے یا بیماری کے باعث؟ اگر یہ مزاجاً وطبعاً ہے تب تو آج اس کے قابلِ مواخذہ ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب کہ میں اپنی اسی طبیعت اور مزاج کے ساتھ گزشتہ ۲۸ سال سے دارالعلوم میں ہمہ جہتی خدمات انجام دیتا آرہا ہوں اور اس طویل مدت میں کبھی بھی میرے اس مزاج وطبیعت اور ان کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو قابلِ مواخذہ نہ سمجھا گیا اور نہ ہی عملی طور پر کوئی مواخذہ کیا گیا۔ بالخصوص حالیہ انقلاب میں اس مزاج نے جو نمایاں کردار ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں اور اگر یہ اشتعال طبعاً اور مزاجاً نہیں بلکہ مرض اور بیماری کی وجہ سے ہے اور یہی آپ حضرات کا خیال بھی ہے۔ جیسا کہ تجویز میں اس کی صراحت ہے تو حیرت ہے کہ اسے کیونکر اتنے بڑے فیصلے کی بنیاد بنایا گیا؟ کیوں کہ اس صورت میں یہ ایک عذر ہوگا اور عذر درگزر کے قابل ہوتا ہے۔ قابلِ سزا نہیں۔ آخر عذر اور جرم کو یکساں کیوں کر رکھا جاسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ بیماری کی وجہ سے اشتعال میں آجانے کو تدریس سے کیا تعلق ہے؟ اگر اس سے تدریس میں کوئی کمی یا کوتاہی آئے تو اسے قابلِ گرفت سمجھا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس پہلو کو بالکل ہی نظر انداز کردیا گیا ہے اور تدریس کا نہ ذکر ہے اور نہ اس سلسلے میں کسی شکایت کا حوالہ!

آپ کی جانب سے ۱۸ر جون ۱۹۹۰ء کو نمائندہ اجتماع کے عنوان سے ایک جلسہ بلایا گیا تھا جس کا مقصد بہی خواہانِ دارالعلوم کو دارالعلوم کی ترقیات سے آگاہ کرنا بتایا گیا تھا جیسا کہ دعوت نامہ سے ظاہر ہے لیکن عملی طور پر اس جلسہ کا موضوع اور محور صرف میری ذات کو بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ جیسا کہ

جلسہ کی کارروائی پر مشتمل کیسٹ سننے سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس جلسے کے دعوت نامے پر بہ حیثیت مہتمم دارالعلوم آپ کے دستخط تھے۔ جو بالکل درست اور صحیح ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ایک ایسے رکن شوریٰ کے دستخط کا پایا جانا نہایت قابلِ تعجب ہے۔ جن کے بارے میں میرا یقین ہے کہ مجلسِ شوریٰ سے میرے خلاف کارروائی کرانے میں ان کی سازش اور ان کے منتقمانہ مزاج و جذبے نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے دستخط کے پہلو بہ پہلو صرف ایک اور وہ بھی اس خاص رکن شوریٰ کے دستخط کا پایا جانا یقیناً حیرت انگیز ہے اور ساتھ ہی احقر کے معاملے سے اس شخص کی غیر معمولی دلچسپی کی دلیل بھی، جس سے میرے مذکورہ یقین کو اور تقویت ملتی ہے۔

اس جلسہ میں مولانا ریاست علی صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند اور مولانا اسعد صاحب مدنی نے مجھ پر انتہائی غیر ضروری اور غیر واقعی طور پر نہایت بے تکے اور رکیک ذاتی حملے کرنے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے وقار اور اس کی تاریخی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت مغالطہ آمیز تقریریں کیں اور غیظ و غضب کے عالم میں مجھ پر انتہائی غلط الزامات لگائے۔ یہ الزامات جو مختلف النوع ہیں اور ان میں سے اکثر کا تعلق دارالعلوم کے انتظامی معاملات سے ہے۔ مجھ پر اس زمانے کے حوالے سے لگائے گئے، جب میں دارالعلوم میں ناظم تعلیمات اور معاون مہتمم جیسے عہدوں پر کام کر رہا تھا، ذاتی دشمنی کی وجہ سے کسی کا کسی پر کیچڑ اچھالنا اور بے تکے اور غلط الزامات لگانا اتنا حیرت انگیز نہیں جتنا کسی ادارے سے متعلق اس کے سربراہ کی موجودگی میں عام مجمع کے سامنے اس کے کسی سابق ذمہ دار اور کارکن پر ایک طویل عرصے کے بعد ایسے الزامات عائد کرنا حیرت انگیز ہے۔ جن کے بارے میں خود سربراہِ ادارہ نے نہ کبھی کچھ کہا ہو اور نہ ہی اُن میں سے کسی کی وجہ سے کبھی کوئی کارروائی کی ہو۔

ظاہر ہے کہ میں ناظم تعلیمات تھا یا معاون مہتمم۔ دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی بالا دست کی ماتحتی ہی میں کام کرتا رہا۔ لہٰذا ان دونوں عہدوں پر رہتے ہوئے اگر میں نے کوئی غیر قانونی قدم اٹھایا تھا یا کوئی ایسا کام کیا تھا جو مفادِ دارالعلوم کے خلاف تھا تو میرے بالادست سربراہ کا فرض تھا کہ کسی رُو رعایت کے بغیر بر وقت مجھے تنبیہ کرتا یا میرے خلاف وہ جو مناسب سمجھتا کارروائی کرتا۔ ایسا نہ کرتا تو یہ دارالعلوم کے مفاد اور ذمہ دارانہ امانت داری کے خلاف تھا۔ یوں بھی دارالعلوم کی انتظامیہ کسی معاملے میں رو رعایت سے کام نہیں لیتی جیسا کہ آپ حضرات کا دعویٰ بھی ہے۔ چنانچہ جب میں ناظمِ تعلیمات تھا تو موجودہ ناظمِ تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب کے بقول جو اُس زمانے میں میرے نائب تھے میں نے کچھ خلافِ قانون اقدامات کئے تھے اور مولانا اسعد صاحب کے بقول میں نے اس کا

حال بالکل خراب کر رکھا تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ ان تمام تر خرابیوں اور غیر قانونی اقدامات کے باوجود مجلسِ تعلیمی یا اہتمام نے بروقت مجھے تنبیہ کیوں نہیں کی، میرے خلاف کوئی رپورٹ کیوں نہیں کی گئی؟ مجھ سے مواخذہ کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا ان غیر قانونی اقدامات اور تعلیمات کے نظام کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھنے کے باوجود مجلسِ تعلیمی اور سربراہ ادارہ کا خاموشی اختیار کر لینا مفادِ دارالعلوم اور ذمہ دارانہ احساس و امانت داری کے خلاف نہیں؟

نیز دونوں عہدوں سے الگ ہوتے کے بعد میں جب تدریس پر واپس آیا تو اگر میں نے تدریس میں کسی طرح کی کوتاہی کی جیسا کہ کہا جا رہا ہے تو ناظمِ تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب نے میرے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی۔ کیا یہ غیر ذمہ داری نہیں؟ اسی طرح جب میں معاون مہتمم تھا اور اس زمانے میں مولانا اسعد صاحب کے بقول میری وجہ سے دارالعلوم کا نظام ہر لحاظ سے درہم برہم ہو گیا تھا اور معاملات الجھ گئے تھے تو آپ کو مہتمم کی حیثیت سے اپنے معاون کی تنبیہ اور اس کے خلاف ضابطے کی کارروائی کرنے کا نہ صرف پورا حق اور اختیار تھا بلکہ اگر واقعی مذکورہ صورتِ حال پیش آ گئی تھی تو بروقت کارروائی ضروری بھی تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں میرے اور آپ کے درمیان کبھی بھی ناگواری اور ناخوشگواری کی صورت پیش نہیں آئی۔ میں تمام ضروری معاملات میں آپ سے مشورے لیتا رہا اور آپ میرے کاموں پر برابر اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ بلکہ آج بھی جب کہ میرے خلاف کردارکشی کی شدید مہم جاری ہے اور میں نے حتی المقدور دارالعلوم کی جو خدمات انجام دی ہیں اور جنہیں اب سے پہلے بلا استثنا سب ہی حضرات سراہتے تھے۔ ان کو بھی میرا جرم قرار دے کر مجھے ہر لحاظ سے مجرم باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آپ نے ۱۸ر جون کو نمائندہ اجتماع کے عنوان سے بلائے گئے جلسے تک تقریری یا تحریری طور پر مجھ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیت منتظمِ اعلیٰ آپ کو اس خادم سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ ان تمام چیزوں کے پیشِ نظر مولانا اسعد صاحب کو جو دارالعلوم کے معاملات میں بے جا دخل اندازیوں کے باوجود خود کو صرف رکنِ شوریٰ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، کیا حق ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد عوامی مجمع میں دارالعلوم کے انتظامی معاملات سے متعلق آپ کی موجودگی میں مجھ پر ایسے غلط اور بے بنیاد الزامات لگائیں اور کیا یہ ایک مذموم حرکت ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز نہیں ہے؟ انہوں نے شوریٰ جیسی باوقار مجلس کا رکن ہوتے ہوئے میری دارالعلوم میں ۲۸ سالہ قربانیوں کو پسِ پشت ڈال کر ایک عوامی جلسے میں جس بھونڈے انداز سے

میری کردار کشی کی کوشش کی اور مجھ پر الزامات لگائے وہ بہر حال ایک رکنِ شوریٰ کو قطعاً زیب نہیں دیتا اور نہ ہی دارالعلوم کی طویل تاریخ میں کسی رکنِ شوریٰ نے آج تک کوئی ایسا نازیبا رویہ اختیار کیا۔

میری حیثیت دارالعلوم میں صرف ایک مدرس کی نہیں رہی ہے بلکہ بطور تحدیثِ نعمت اور بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ دو تین افراد کے بقدر کام کیا ہے اس کی شہادت دارالعلوم کی ایک پوری نسل دے گی جو برصغیر اور ایشیا کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ اور عالمِ عرب میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کے کچھ افراد نہایت نمایاں حیثیت کے مالک اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں پروفیسر تک ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پر عربی زبان و ادب کے سلسلے میں جو دامنی کا جو دھبہ لگا ہوا تھا خدا نے مجھے یہ سعادت اور توفیق بخشی کہ اس دھبے کو مٹانے کی حتی المقدور کوشش کروں اور یہ کہنے میں بھی مجھے فخر ہے کہ قدرت نے اس سلسلے میں بہت حد تک مجھے کامیابی عطا کی۔ میں اس کو پوری طرح دارالعلوم اور اپنے اکابر و اساتذہ کے فیض اور ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ سمجھتا ہوں۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے ہمیشہ دارالعلوم میں صرف تدریس، افراد سازی اور مختلف النوع علمی و انتظامی کاموں کو ہی اہمیت و اولیت دی ہے اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ملک و بیرونِ ملک کی یونیورسٹیوں، ان کے جلسوں، علمی سیمیناروں اور کانفرنسوں سے شرکت کے لئے بے شمار دعوت نامے آتے رہنے کے باوجود میں نے دارالعلوم کی خدمت اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان میں شرکت کو کبھی اہم نہیں سمجھا۔ اگر میں شریک ہوتا رہتا اور اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کچھ بھی کوشش کرتا تو شاید کم از کم مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر میں آج میری حیثیت کچھ اور ہوتی۔ لیکن مجھے نہ کل اس کی فکر رہی ہے اور نہ ہی آج اس پر کچھ افسوس اور ندامت ہے بلکہ مجھے اس پر خوشی اور فخر ہے کہ میں نے اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے جو کچھ سیکھا طلبہ دارالعلوم تک اسے پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی اور بحمد اللہ اس میں بہت کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ کیا اس کے باوجود یہ افسوس ناک بات نہیں ہے کہ میری ان تمام قربانیوں اور خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے آج یہ کہا جا رہا ہے کہ میں نے دارالعلوم میں کوئی کام نہیں کیا اور اس کو اور اس کے نظام کو بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے بلکہ علمی، خاندانی، سیاسی اور ملکی و ملی سطح پر جو مجھے حیثیتِ عرفی حاصل ہے۔ ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے میری انتہائی رکیک اور مکروہ انداز میں کردار کشی بھی کی جا رہی ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک عوامی جلسے میں اور آپ کی موجودگی میں کہا گیا۔

(بقیہ ص ۲۱۳ پر)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا وحید الزمـــان کیـرانوی

دارالعلوم سے میری سبکدوشی
پس منظر — الزامات — حقائق

۱۹۹۰ء میں حضرت مولانا وحید الزماںؒ صاحب کو لنگڑے لولے اسباب کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند سے جبراً سبکدوش کردیئے جانے کے بعد جب اس نامعقول اور تعجب خیز فیصلہ پر ملک و بیرون ملک میں سخت ہلچل اور ناراضگی پیدا ہوئی اور ہر طرف سے دارالعلوم کے ارباب حل وعقد کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا جانے لگا تو مہتمم دارالعلوم نے مولانا اسعد مدنی کی شہ پر (جو کہ فضلائے دارالعلوم کے غم وغصہ کا اصل نشانہ تھے) پہلے ۱۸؍جون ۱۹۹۰ء کو دیوبند میں ایک "نمائندہ" اجتماع بلایا جس میں اس ناعاقبت اندیشانہ فیصلے کو رنگ جواز دینے کے لئے مولانا وحید الزماں صاحب پر متعدد الزامات عائد کئے گئے اور پھر ۲۱؍جون ۹۰ء کو مولانا اسعد اور مہتمم دارالعلوم نے دہلی میں ایک پریس کانفرنس کرکے اس میں بھی اُن الزامات کا اعادہ کیا۔

اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ان الزامات کی تفصیل معلوم ہونے پر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو قدرتی طور پر تشویش ہوئی اور اس کے ناظم اعلیٰ نے مولانا وحید الزماں صاحب کو خط لکھ کر ان سے مذکورہ الزامات کے بارے میں وضاحت کرنے کی درخواست کی تاکہ فضلاء و ہمدردانِ دارالعلوم کی تشویش کا ازالہ اور عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہی ہو۔ اس خط کے جواب میں مولانا مرحوم نے مندرجہ ذیل مفصل وضاحتی بیان املا کراکے ارسال فرمایا، جس میں مذکورہ الزامات کی وضاحت کے علاوہ ضمناً بہت سے ایسے پس پردہ واقعات وحقائق کا ذکر خود مولانا مرحوم کے قلم سے آگیا ہے جو کسی اور ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ مدلل و مؤثر اور انکشافاتی تحریر ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے انقلاب دارالعلوم کے بعد کی صورتِ حال بالخصوص مولانا وحید الزماں صاحب کو طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ مسلسل اور منظم و منصوبہ بند طریقہ پر پریشان کئے جانے سے متعلق حالات وواقعات کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ
والسلام علی سید الأنبیاء
والمرسلین محمد وعلی آلہ
وصحبہ أجمعین.

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کے دورِ اہتمام کو ختم ہوئے تقریباً نو سال گزر چکے ہیں۔ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی مکمل تفصیلات تو ان شاء اللہ ایک کتاب کی شکل میں پیش کی جائیں گی۔ اس وقت دارالعلوم سے اپنی سبکدوشی (رمضان ۱۴۱۲ھ) اور اس کی بیان کردہ وجوہات نیز اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات اور کچھ سوالات و اعتراضات کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مختصراً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ۱۹۸۱ء میں جب دارالعلوم پر پولیس ایکشن ہوا اور طلباء نکال دیئے گئے تو ہم چند لوگوں نے کیمپ دارالعلوم قائم کر لیا۔ اس وقت مولانا اسعد صاحب ہندوستان سے کہیں باہر تھے۔ مگر جب واپس آئے تو کچھ ہی دنوں کے بعد محسوس ہونے لگا تھا کہ مولانا اسعد صاحب سے میرا نباہ مشکل ہوگا۔ کیونکہ وہ ضروری ہدایات دے کر باہر روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تقسیم کار کے طور پر مختلف افراد مختلف کام انجام دیتے تھے، میرے سپرد کیمپ کی نظامت تھی، جس میں طلباء کے تمام معاملات، نیز اہلِ شہر سے روابط، باہر سے آنے والے مہمانوں، اخبار نویسوں اور پولیس افسران سے ملاقات اور گفتگو کرنا شامل تھا۔ طلباء پر چونکہ مکمل طور پر میرا ہی کنٹرول تھا اور ہمہ وقت مشغولِ کار رہنے کی وجہ سے اہلِ شہر بھی مجھی سے زیادہ وابستہ تھے، اس لیے میں مولانا اسعد صاحب کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ وہ کھل کر سامنے آنا بھی نہیں چاہتے تھے اور درپردہ اتنا کنٹرول چاہتے تھے کہ ایک پتہ بھی ان کی مرضی کے بغیر حرکت نہ کرے۔ میرے اور ان کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ بھی تھا کہ میں ہر بات کھل کر کہتا تھا جبکہ وہ ہر بات گول مول انداز میں بیان کرتے تھے۔ پھر جب دارالعلوم کھل گیا تو میں نے معاملات میں دیکھا کہ مولانا اسعد صاحب کی پالیسی مفاد پرست سیاسی لوگوں کی طرح تبدیل ہو گئی ہے اور ان کی منشاء ہے کہ اب اہلِ شہر سے وابستگی ختم کی جائے اور انھیں اپنے اوپر زیادہ مؤثر نہ ہونے دیا جائے۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ "اس بلا کو اتار پھینکئے"۔ اسی طرح ان طلباء کے بارے میں جو کیمپ کے دوران تقریباً ایک سال کی اپنی تعلیم قربان کر چکے تھے اور جنھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی تھیں، مولانا کا یہ خیال تھا کہ "ان کو سر پر نہ چڑھایا جائے"۔ بے مروتی کی یہ دونوں باتیں میرے لئے ناقابلِ قبول تھیں، کیونکہ ایک سیاسی آدمی تو "کام نکال دھکا دے" کے اصول پر عمل کر سکتا ہے اور ان طلباء اور اہلِ شہر سے منہ موڑ سکتا ہے جنھوں نے مصیبت کی گھڑی میں جان پر کھیل کر ہمارا ساتھ دیا تھا، لیکن میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ میری ہمیشہ ہی منتظمین سے یہ مانگ رہی کہ انھیں طلباء کو ایک حیثیت اور اہمیت دینی چاہئے، لہٰذا اب اس انقلاب کے بعد بھی (جس کی کامیابی میں طلباء کا بہت کچھ دخل تھا) طلباء کے ساتھ وہی سابقہ انتظامیہ کا سا معاملہ کرنا اور ان کو دبا کر رکھنا میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

بہر حال اس قسم کے بہت سے معاملات کو دیکھتے ہوئے مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ اب دارالعلوم کے نئے حالات میں کچھ بنیادی اختلافات پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ خوشگواری کے ساتھ دارالعلوم سے رسمی ملازمت کا تعلق ختم کر لیا جائے اور دیگر بیت سے فرزندانِ دارالعلوم کی طرح میں بھی آزاد رہ کر ملی و علمی کی خدمت انجام دیتا رہوں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت میں نے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اپنا استعفیٰ پیش کیا اور یہاں سے بہت دور مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج ضلع جونپور میں جا کر مقیم ہو گیا۔ اس دوران طلبۂ دارالعلوم پر کنٹرول کرنے میں سبھی موجود حضرات ناکام رہے اور میرے پاس زبانی اور تحریری پیغامات پہنچے کہ دارالعلوم آکر اس کو تباہی سے بچاؤ (اس کی تفصیل بھی ان شاء اللہ ایک مستقل کتاب میں آئے گی۔) اسی زمانے میں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا اور اس میں مجھے ناظم مجلس تعلیمی بنا دیا گیا، جس کے بعد حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے بذریعۂ تحریر اور مولانا اسعد صاحب نے زبانی پیغامات کے ذریعہ میرے دارالعلوم پہنچنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ مدرسہ بدر الاسلام کے اپنے کچھ کرم فرماؤں کے سمجھانے پر اور دارالعلوم کے مفاد اور ان حضرات کے اصرار کو سامنے رکھ کر میں دارالعلوم واپس آگیا اور تعلیمات کا چارج بھی لے لیا۔ تعلیمات کی نظامت کے دور میں، میں نے جو تعلیمی اصلاحات کیں اور ہر طرح کی خامیوں کو دور کر کے نظام کو مستحکم اور چاق و چوبند کیا، اور جس طرح اساتذۂ کرام نے ذوق و شوق کے ساتھ اسباق کی پابندی کی اور مقدارِ خواندگی کی تکمیل کرائی، اس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اسی دوران دفتر اہتمام میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو نظامِ کار میں زبردست مشکلات پیش آ رہی تھیں، ان کو اپنے دو نائبوں سے کام نہ کرنے کی سخت شکایت تھی اور وہ خود پر بڑا بوجھ محسوس کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے اجلاس شوریٰ منعقدہ لکھنؤ میں اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا اظہار کرتے ہوئے ایک مضبوط معاون مہتمم مقرر کیے جانے کی درخواست کی۔ مجلس شوریٰ نے ان کی تجویز پر مجھے اس پس منظر میں معاون مہتمم کا درجہ دیا کہ مجھے خود دارالعلوم کے تمام کاموں کو مکمل طور پر انجام دینا ہے اور جہاں تک ہو سکے مہتمم صاحب کے سر سے کاموں کا بوجھ کم کرنا ہے۔ میں اس زمانے میں بیمار تھا اور میں، میرے اہلِ خانہ اور محبین اس منصب کو قبول کرنے کے خلاف تھے۔ لیکن حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے مجلس شوریٰ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا، میں نے معذرت کرنی چاہی تو حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے ایک انتہائی تڑپا دینے والا جملہ فرمایا کہ "دارالعلوم کا کیا انجام ہو گیا ہے، آپ اللہ کا نام لے کر اٹھیے اور دارالعلوم کی خدمت کیجئے، ان شاء اللہ شفا ہو گی"۔ میں لحاف اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا، یہ جملہ سن کر میں نے لحاف کو اتار پھینکا اور عرض کیا کہ حضرت! اگر یہ بات ہے تو جس حال میں بھی ہوں دارالعلوم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

اگلے ہی روز سے دارالعلوم جانا شروع کیا۔ اب میرے ذمہ نظامت مجلس تعلیمی بھی تھی اور میں معاون مہتمم بھی تھا۔ میں اپنی بیماریوں اور تکلیفوں کو بھول گیا اور اللہ نے مجھے اتنی طاقت دی کہ روزانہ دس بارہ گھنٹے کام کرنے لگا۔ اس دور میں جو دفتری نظام کی اصلاحات ہوئیں

اس کی تفصیلات بھی کسی دوسرے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ تعلیمات اور اہتمام سے متعلق تمام کارروائیوں میں جو تیزی اور استحکام پیدا ہوا تھا اس کی گواہی ہر طالب علم، ہر مدرس، ہر ملازم اور ہر آنے جانے والا دینے لگا تھا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میرے تمام اقدامات سے مطمئن اور خوش تھے جیسا کہ میرے بار بار دریافت کرنے پر وہ اظہار کرتے تھے، انھوں نے ایک بار بھی میرے کسی انتظامی اقدام پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا (البتہ مولانا اسعد صاحب اور ان کے برادر مولانا ارشد صاحب اور ان کے چند احباب نے اس دور میں میرے خلاف جو ریشہ دوانیاں کیں اور جس طرح مجھے ستایا، پریشان کیا اور طرح طرح کی مشکلات اور الجھنیں پیدا کیں اس کی تفصیل بھی انشاء اللہ کتاب میں آئے گی) اس زمانے کی میری خدمات اور میرے جوش و ولولہ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری شب و روز کی محنت کو دیکھ کر ایک دفعہ حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے غایت شفقت سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ "اتنی محنت نہ کیجئے، دارالعلوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔" اسی طرح ممبرانِ شوریٰ نے بھی تحریری اور زبانی طور پر اس منصبِ جدید کو سنبھالنے کے بعد میری کارکردگی کو مختلف طریقوں سے سراہا۔ جامعہ طبیہ کا معائنہ کرتے ہوئے جناب حکیم انعام اللہ صاحب نے فرمایا، "کاش یہ انتظامی خدمت آپ کے سپرد پہلے ہی کر دی جاتی۔" حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ "ماشاء اللہ حقیقت یہ ہے کہ اتنا بہتر کام ہو جائے گا، اس کی توقع نہیں تھی۔" حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری مدظلہ اور جناب حاجی علاؤالدین صاحب (مرحوم) نے بھی زبانی اور تحریری طور پر میری خدمات کو سراہا۔ حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب کے تو بہت سے گرامی نامے بھی میرے پاس موجود ہیں جن میں انھوں نے ایسے الفاظ میں میری حوصلہ افزائی کی ہے کہ اپنی ذات کی تعریف ہونے کی بنا پر ان کو نقل کرتے ہوئے شرم اور جھجک محسوس ہوتی ہے۔ تاہم اس سلسلہ کی کچھ تفصیلات انشاء اللہ کتاب میں بیان کروں گا۔

یہ تمام باتیں انتہائی خوشگوار ماحول میں ہو رہی تھیں اور دارالعلوم کے تمام انتظامی امور بڑی عمدگی کے ساتھ انجام پا رہے تھے، لیکن یہ صورت حال مولانا اسعد صاحب کے مجلس شوریٰ کے ممبر ہونے تک ہی قائم رہ سکی۔ انھوں نے ممبر بننے کے بعد شوریٰ کے پہلے ہی اجلاس میں مختلف طریقوں پر میری مخالفت اور طرح طرح سے میری راہ میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں مثلاً ممبرانِ شوریٰ کو مختلف طریقوں اور تدبیروں سے ہموار کر کے دارالعلوم کے شعبہ جات مختلف لوگوں میں تقسیم کرا دیئے جس کے نتیجہ میں وہ حساس اور اہم ترین شعبے جن کا تعلق طلباء سے تھا، میرے دائرۂ اختیار سے نکال کر حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کو دیدیئے گئے۔ جبکہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ان کے بارے میں ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے اور ہر کام اور ہر کاغذ کو مجھ پر ہی ٹال دیتے ہیں۔ یا تو وہ اس قدر بے صلاحیت تھے، یا یکایک مولانا اسعد صاحب کے ممبر بننے کے بعد ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تعلیمات، دارالاقامہ اور مطبخ وغیرہ جیسے حساس شعبے جن کا تعلق براہِ راست طلباء سے ہوتا ہے، ان کے حوالے کر دیئے گئے۔ اور وہی مہتمم صاحب جو کل تک ان کے بے انتہا شاکی تھے خاموشی کے ساتھ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ یوں تو حضرت مہتمم صاحب پورے دارالعلوم اور تمام شعبوں کے ذمہ دار ہیں لیکن اس تقسیم کے بعد شعبۂ محاسبی، شعبۂ اہتمام اور شعبۂ اوقاف خاص طور پر ان کی نگرانی میں دیئے گئے اور باقی کچھ غیر اہم شعبے جیسے شعبۂ تبلیغ، مہمان خانہ اور شعبۂ نشر و اشاعت وغیرہ میرے سپرد کئے گئے۔ مجھے اس سے بڑا قلق ہوا اور میں حیران رہ گیا کہ یا تو چند ماہ پیشتر ممبرانِ شوریٰ اس بات کو سراہ رہے تھے کہ دارالعلوم کے انتظامی امور بڑی عمدگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بھی ہر طرح مطمئن تھے، یا اب اچانک یہ صورت حال پیش آگئی۔ جس کا نتیجہ میرے نزدیک یقینی طور پر یہ نکلنا تھا کہ نظام کی وہ پھرتی اور تیزی جو بڑی محنتوں کے بعد لائی گئی تھی اب پھر ختم ہو جائے گی۔ میں نے یہ صورت حال دیکھ کر ایک قلبی اذیت محسوس کی اور یہ یقین کر لیا کہ اب اہتمام میں کام کرنے کے لئے میرا کوئی میدان باقی نہیں رہا۔ مولانا اسعد صاحب کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا کہ اب وہ یہ چاہیں گے کہ دارالعلوم کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی ان کی اجازت اور مرضی کے بغیر انجام نہ پائے، اور ظاہر یہ کریں گے کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں تو بس ایک رکنِ شوریٰ ہوں۔ چونکہ میں مولانا کا رفیقِ قدیم رہا ہوں اور انھوں نے ذاتی طور پر جو خدمت بھی میرے سپرد کی اسے میں نے ہمیشہ انجام دیا لیکن اس وقت بھی میں نے ان کی بے جا تائید کبھی نہیں کی نہ ذاتی فائدے ان سے حاصل کیے۔ کیونکہ یہ میرا مزاج ہی نہیں ہے۔ البتہ میں نے خود ان کی ترقیات اور جمعیۃ علمائے ہند کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں، جن کی فہرست طویل ہے جو انشاء اللہ کتاب میں آئے گی۔

میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مولانا اسعد صاحب کو میرا معاونِ مہتمم کا منصب، طلباء کا مجھ ناچیز سے والہانہ تعلق اور میرا اثر و نفوذ اور قوتِ تنفیذ قطعاً گوارا نہیں ہے۔ چونکہ میں اس اصول پر انتظامی امور انجام دیتا تھا کہ میں صرف دارالعلوم کے نظام و دستور کا پابند ہوں اور مہتمم کے علاوہ کسی بھی دوسرے فرد سے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ہر معاملے میں اجازت لینے یا مشورہ کرنے کا پابند نہیں ہوں (یہ الگ بات ہے کہ میں حسبِ ضرورت مشورہ لیتا رہا ہوں، جیسا کہ لیتا رہا) اس لئے اب دو ہی صورتیں میرے سامنے تھیں، ایک تو یہ کہ میں بالکل بے عمل اور بے اختیار بن کر دفترِ اہتمام میں بیٹھا رہوں جیسا کہ بہت سے لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم مولانا نصیر احمد خاں بن جاؤ (واضح رہے کہ یہ الفاظ میرے اپنے نہیں ہیں) یعنی کوئی کام نہ کرو، لیکن میری طبیعت یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ میں کسی منصب پر رہتے ہوئے اس کے فرائض کی انجام دہی میں جان بوجھ کر کوئی کوتاہی کروں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کی طرح ہر ہر بات کی اجازت مولانا اسعد صاحب سے لیا کروں، یہ بھی میرے لیے ناممکن تھا اسلئے میں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی خدمت کا وہ میدان جو مجلس شوریٰ کے مخلص ارکان نے کچھ عرصے تک مجھے مرحمت فرمایا تھا، مولانا اسعد صاحب کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اب ختم کر دیا گیا ہے، اپنے لئے بہتر یہ سمجھا کہ اپنی انتظامی ذمہ داری یعنی معاون مہتمم کے منصب سے سبکدوشی لے کر پھر تدریسی خدمت پر واپس چلا جاؤں چنانچہ مجلس شوریٰ نے میری اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے مجھے تدریس پر واپس بھیج دیا۔ چونکہ میرا تقرر عربی زبان و ادب کی تدریس اور اس کی نشر و اشاعت کیلئے ہوا تھا اور اسی کام میں ہمیشہ مشغول بھی رہا، اس لئے میری کسی طلب یا فرمائش کے بغیر دفتر تعلیمات کی جانب سے مجھے عربی کے دو گھنٹے پڑھانے کیلئے دیئے گئے (میرے پاس تعلیمات کی تحریریں محفوظ ہیں) ایک تکمیل ادب کی انشاء کا اور دوسرا تکمیل ادب سال دوم کا۔ یاد رہے کہ تکمیل ادب سال دوم کے اسباق یا گھنٹے متعین نہیں ہوتے، بلکہ اس میں سالِ اوّل کے دو منتخب طالب علم ہوتے ہیں جو استاد کی نگرانی میں مطالعہ کرتے ہیں اور عربی میں کوئی طویل مقالہ لکھتے ہیں یا کسی کتاب کا ترجمہ کرتے ہیں (اصل مقصد عربی زبان میں پختگی پیدا کرنا ہوتا ہے) اس کے لئے یومیہ کسی مقدار وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں حسبِ ضرورت وقت صرف کیا جاتا ہے، زیادہ بھی اور کم بھی۔

میں نے منصب اہتمام سے اس جذبے کے تحت استعفیٰ دیا تھا کہ جب میرے پاس

کوئی عہدہ نہیں رہے گا تو ہمارے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں گے اور دارالعلوم کی فضا میں خوشگواری پیدا ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میرے اس ایثار کی قدر کرتے ہوئے مجھ ساتھ لے کر اور سب کے ساتھ ملا کر چلیں گے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ مجھے دارالعلوم کے چھوٹے بڑے تمام معاملات سے اس طرح دور رکھا گیا جیسے وحید الزماں نام کا کوئی آدمی دارالعلوم میں ہے ہی نہیں۔ یہ پالیسی غالباً باقاعدہ مشورہ کے بعد اپنائی گئی۔ حتیٰ کہ قادیانیت پر جب کانفرنس ہوئی تو اس کا ایک عمومی دعوت نامہ اگرچہ میرے پاس آیا لیکن اس کے کسی بھی معاملے اور مشورے میں مجھے شریک نہیں کیا گیا جبکہ جونیئر اساتذہ جو میرے شاگرد بھی ہیں ہر چیز میں حصہ لیتے رہے مجھے اس حد تک نظر انداز کیا گیا کہ یہ بات دوسرے لوگوں نے بھی محسوس کر لی۔ مثلاً مولانا مفتی محمد منظور صاحب کانپوری نے جو آجکل مولانا اسعد صاحب سے بہت قریب بھی ہیں۔ بعض ذمہ داران سے کہا ہے یا کہ مجھے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اختلاف ہے تو اس حد تک نہیں ہونا چاہیے کہ آپ انھیں بالکل نظر انداز کر دیں۔ مولانا منظور صاحب میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے تھے مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہو سکی، شاید انھیں مجھے دلاسا دینا تھا۔

اس طرح تقریباً ڈھائی تین سال کا عرصہ ایسا گزرا کہ جس میں مسلسل مجھے نظر انداز کیا جاتا رہا اور پالیسی یہ بنائی گئی کہ دارالعلوم کا سبق بھی مجھے ایسا دیا جائے جس میں طلباء کم سے کم تعداد مجھ سے وابستہ ہو سکے۔ میں نے اس پر قناعت کی اور اس حد تک احتیاط برتی کہ اس پورے عرصے میں دارالعلوم کے طلباء کی جانب سے منعقد کیے جانے والے ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان کے اصرار کے باوجود شرکت نہیں کی، حتیٰ کہ النادی الادبی (جس کو ایک زمانے میں میں نے ہی قائم کیا تھا اور جس سے آج بھی مجھے قلبی لگاؤ ہے) کے جلسوں میں بھی اس کے موجودہ نگراں مولانا قاری محمد عثمان صاحب کے اصرار کے باوجود شریک نہیں ہوا۔ چونکہ دارالعلوم کے اندر ہونے والی بہت سی انتظامی خرابیوں اور بے جا تشدد اور سختیوں کی اطلاعات مجھے مل رہی تھیں اور جتنی خامیاں میں نے دور کی تھیں وہ سب عود کر آنے لگی تھیں اس لیے مجھے ڈر تھا کہ میں موجودہ انتظامیہ کی کسی خامی پر تنقید نہ کر بیٹھوں، کیونکہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے عہد اہتمام میں آزادانہ تنقید کرنے کا عادی رہ چکا تھا اور ان تنقیدوں پر مولانا اسعد صاحب اور ان کے حلقہ کی جانب سے مجھے ہمیشہ داد شجاعت دی جاتی تھی۔ میں یہ بھی جان چکا تھا کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ جتنے فراخدل اور وسیع الظرف تھے کہ ہر تنقید کو گوارا کر لیتے تھے، لیکن مولانا اسعد صاحب جو اب دارالعلوم پر بڑی حد تک حاوی اور مسلط ہو چکے ہیں، ہرگز کوئی بات گوارا نہیں کریں گے۔ مجھے چونکہ طلباء کو ساتھ لے کر کوئی اقدام نہیں کرنا تھا اس لئے میں ان کے جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا اور میں نے خاموشی کے ساتھ اپنے لئے کام کا ایک تصنیفی میدان الگ بنا لیا اور ادارہ دارالمؤلفین قائم کر کے اپنے چند نوجوان فضلاء کو ساتھ لے کر علوم اکابر دیوبند کی اشاعت میں مشغول ہو گیا۔

گزشتہ سال غالباً ماہ ربیع الاول میں دارالعلوم کی تبلیغی جماعت سے وابستہ چند طلباء میرے پاس آئے اور انھوں نے چھتہ کی مسجد میں منعقد ہونے والے اپنے ہفتہ واری تبلیغی جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ میں اس سے بہت پہلے ان کے دو جلسوں میں شریک ہو چکا تھا۔ ان کے جلسے بہت سادہ اور مخصوص افراد پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں لاؤڈ اسپیکر کا نظم نہیں ہوتا۔ دو دفعہ انکار کر دینے کے بعد جب تیسری بار آ کر انھوں نے اصرار کیا تو میں نے یہ سمجھ کر کہ ان کا یہ جلسہ بھی معمول کے مطابق ہوگا، شرکت کے لیے حامی بھر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جلسہ کا مدار مجھ پر نہیں ہوگا بلکہ میں آپ طلباء کی تبلیغی تقریریں سنوں گا اور بعد میں چند منٹ خود بھی کچھ کہہ دوں گا۔ میں بالکل خالی الذہن بعد نماز عشاء چھتہ کی مسجد میں پہنچا تو خلاف توقع مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، طلباء کی ایک بڑی تعداد سڑک پر اور مسجد کی چھتوں پر بھی تھی۔ یہ مجمع دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور مجھے پس و پیش ہوا کہ میں کیا کروں؟ جو طلباء میرے ساتھ تھے ان سے میں نے ناگواری کے ساتھ یہ بات کہی کہ یہ کیسا مجمع ہے؟ یہ بات تو طے نہیں ہوئی تھی؟

میں مسجد کے اندر پہنچا تو منتظم طالب علم نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر شروع کر دی، لیکن چہار طرف سے طلباء نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہم مولانا کی تقریر سنیں گے۔ اس طالب علم نے مجبور ہو کر اپنی تقریر بند کی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں تقریر شروع کر دوں۔ میری عادت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں وقتی تاثر کے تحت بولتا ہوں۔ چونکہ یہ بات خلاف معاہدہ اور ذہنی نقشے کے برعکس تھی، اس لئے مجھے ناگواری ہوئی اور میں نے اسی بات کو لے کر اپنی تقریر کا آغاز کر دیا کہ آپ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ قول و فعل کا تضاد ہمارے علماء کے معاشرے میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ بزدلی بھی پھیلتی جا رہی ہے، نفاق کے ہم لوگ عادی بنتے جا رہے ہیں۔ آج ہمارا محبوب مشغلہ کمروں میں بیٹھ کر اساتذہ اور منتظمین پر تنقید کرنا ہے۔ لیکن ہمارے اندر وہ جرأت باقی نہیں رہی جو ایک مسلمان اور بالخصوص عالم دین کے اندر ہونی چاہیے۔ کہ ہم غیبت کرنے کے بجائے اپنے استاد یا منتظم کے سامنے ادب کے ساتھ اپنی بات پیش کر دیں۔ اس میں ہم ڈر اور جھجک محسوس کرتے ہیں اور پس پشت تبصروں میں خوب دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اللہ نے ایک ہی چیز کو باعث اجر و ثواب بھی قرار دیا ہے اور اسی کو باعث عتاب بھی۔ اگر ہم بہ نیت ہمدردی اپنے دل کی بات اپنے منتظم یا استاد کے سامنے کہہ دیں، چاہے ان کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو، تو وہ باعث اجر ہوگی اور اگر وہی بات پس پشت کہی جائے تو غیبت ہوگی جو حرام ہے۔ حقیقی نماز وہ ہے جس کے اثرات نمازی کے اعمال میں ظاہر ہوں۔ بزدلی کا سرچشمہ نفاق ہے اور شجاعت کا سرچشمہ ایمان ہے۔ نماز ایمان کو تازہ کرتی ہے اور جس کے دل میں ایمان تازہ ہو جاتا ہے اس کے اندر جرأت اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے مدارس بہادر اور مخلص و جاں نثار علماء پیدا کرنے کے لئے قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے اکابر و اسلاف ایسی کی زندہ مثالیں ہیں۔ میں نے متعدد بزرگوں جیسے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعض واقعات اور ان سے متعلق اپنے کچھ خواب بیان کیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جو حضرات بزرگ اور پیر ہیں اگر ان کی زندگی میں سادگی اور خدا ترسی نہیں ہے تو وہ حقیقی بزرگ نہیں ہیں۔ ہمارے اکابر جو اسی صدی میں گزرے ہیں، ان کی زندگیوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسوہ کے مطابق گزاری ہے۔

میں نے کہا کہ آج کے دور میں ہر جگہ سیاست آتی جا رہی ہے، دارالعلوم میں بھی سیاسی اثرات رونما ہونے لگے ہیں۔ مثلاً دکھانے کے لئے منصب پر کسی کو رکھا جاتا ہے اور کام کرنے کے لئے کوئی اور صاحب ہوتے ہیں۔ مولانا ریاست علی صاحب ناظم تعلیمات ہیں اور مولانا ارشد صاحب ان کے نائب ہیں۔ لیکن مولانا ارشد صاحب مختار کل بنے ہوئے ہیں وہ سزائیں دینے میں بالکل آزاد ہیں، نہ مجلس تعلیمی کے پابند ہیں اور نہ ناظم تعلیمات کے۔ اور جب کسی کام کو ٹالنا ہوتا ہے تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں تو نائب ہوں اصل ذمہ دار مولانا ریاست صاحب ہیں اور مجلس تعلیمی ہے۔ متعلقہ شخص پریشان ہو کر مولانا ریاست صاحب

کے پاس جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ میں ناظم تو ضرور ہوں لیکن عملاً مولانا ارشد صاحب ہی کام کر رہے ہیں، اس لئے انھی سے جاکر کہو۔ اس سیاسی صورت حال کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اپنا کام کرانے میں سخت پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ صرف سیاسی تکلف ہے۔

میں نے کہا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم کے زمانے میں بھی میرا یہ ذہن رہا کہ طلباء کی شخصیت کی نشو و نما میں ایک حد تک آزادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے انھیں دبا کر نہیں رکھنا چاہئے بلکہ آزادی دینی چاہئے اور پھر کنٹرول کرنا چاہئے۔ یہ تربیت کا اہم جزو ہے۔ دبا کر، جذبات کو کچل کر اور زبان بندی کر کے یہ سمجھنا کہ کنٹرول ہو رہا ہے محض خام خیالی ہے۔ حضرت مولانا محمد طیبؒ صاحب کے زمانے میں جمعیۃ الطلبہ مجلس شوریٰ کے قانون کی رو سے ممنوع تھی، لیکن اس وقت مولانا اسعد صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ ممنوع ہے، زور دے کر جمعیۃ الطلبہ بنوائی، اور اس کو حضرت قاری صاحب مرحوم اور مجلس شوریٰ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا حالانکہ یہ کھلی بغاوت تھی۔ میں فکری طور پر جمعیۃ الطلبہ کے قیام کا مؤید تھا، اس لیے میں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور وہ سرگرم عمل ہو گئی۔ اس وقت میں نے حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب قدس سرہ کے نظام کے خلاف جو تقریریں کیں اس پر مولانا اسعد صاحب اور ان کی پارٹی نے مجھے سب سے بڑا مجاہد قرار دیا۔ اس وقت بھی دارالعلوم میں امن و سکون تھا لیکن چونکہ مولانا اسعد صاحب حضرت قاری صاحب کے نظام کو ختم کرنا چاہتے تھے اسلئے انھوں نے دوہری فوج تیار کی۔ باہر عالمی مؤتمر کے نام سے فضلائے دارالعلوم کی تنظیم اور اندرون دارالعلوم جمعیۃ الطلبہ کا قیام۔ میری اس بغاوت کے باوجود حضرت قاری صاحب مرحوم اور اس وقت کی مجلس شوریٰ کے عالی ظرف ارکان نے میرے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔ اُس وقت لڑائی کا سب سے بڑا عنوان جمعیۃ الطلبہ کا مطالبہ تھا۔ آج جب کہ مجلس شوریٰ کے قانون کی رُو سے جمعیۃ الطلبہ منظور شدہ ہے اور اس کا دستور اساسی بھی منظور شدہ ہے، اگر کوئی شخص اس کے قیام کا مطالبہ تو کجا، اس کا نام بھی لے گا تو مولانا اسعد صاحب کی نظر میں اس سے بڑا کوئی مفسد نہ ہوگا، اسی کو سیاست کہتے ہیں۔

میں نے دارالعلوم میں اپنے کچھ کاموں کی بھی تفصیل بیان کی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے اسلاف اس قسم کی سیاستوں سے پاک تھے۔ پھر کچھ طلباء نے ملی جمعیۃ علماء کے تعلق سے سوالات کیے کہ آپ کو جمعیۃ علمائے ہند سے کیوں الگ کیا گیا۔ میں نے کہا کہ ہم متعدد افراد کو مولانا اسعد صاحب کی غیر واضح اور مبہم پالیسی سے اختلاف تھا، جو ہمارے اکابر و اسلاف کی روایات کے خلاف تھی۔ ان کی غلط پالیسی سے تنگ آکر بہت سے پُرانے ممبر بھی علیحدگی اختیار کر چکے تھے جیسے حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحب اور پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی وغیرہ۔ چند سوالوں کے جوابوں کے بعد میری تقریر ختم ہو گئی۔

یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ تقریر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک طلباء مصافحہ کرتے رہے۔ جس کے بعد بمشکل تمام میں باہر نکلا تو دارالعلوم کے صدر دروازے تک مصافحوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں اپنے گھر پہنچا تو وہاں بھی طلباء کی ایک جماعت پہنچی جس کو بمشکل تمام واپس کیا۔ صبح کو دارالعلوم کی تمام درسگاہوں میں حسب معمول حاضری ہوئی اور اسباق کا نظام قطعاً متاثر نہیں ہوا، جبکہ نئے دن بیرون دیوبند منعقد ہونے والے مشاعروں میں طلباء کی بڑی تعداد میں شرکت سے اسباق متاثر ہو جاتے ہیں اور موجودہ انتظامیہ ان پر کنٹرول کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

مجھے اپنی تقریر کی یہ ساری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مولانا اسعد صاحب نے دیوبند کے نام نہاد نمائندہ اجتماع میں اسی تقریر کے حوالے سے مجھ پر بالکل بے بنیاد اور بے تکے متعدد الزامات لگائے ہیں۔ جن میں سے ایک الزام یہ ہے کہ میں نے اس تقریر میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں علانیہ طور پر طلباء سے کہا کہ "مدرسین ملازمین اور منتظمین کو مارو"۔ تنہا یہ الزام اس قدر غیر معقول ہے کہ اس سے نہ صرف مولانا اسعد صاحب کی کذب بیانی کی قلعی کھل جاتی ہے بلکہ یہ بھی محسوس ہو جاتا ہے کہ مولانا موصوف جو اپنی تقریر کے دوران مجھ کو سریع الاشتعال ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، خود کس قدر از خود رفتہ اور حواس باختگی کا شکار تھے کہ انھیں یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں، کیا اس پر کسی کو بھی یقین آئے گا؟ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ ایک استاد باہوش و حواس طلباء سے یہ کہے گا کہ اپنے استادوں کو مارو؟ اور کیا طلباء خاموش سنتے رہیں گے اور کچھ نہ کہیں گے۔ بلکہ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ایسا کہنے والے سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحے کریں گے؟ اگر طلباء نے واقعی ایسا کیا تو یہ ان کے مہتمم اور انتظامیہ کے لیے زیادہ رسوائی کی بات ہے کہ اس کی ناقص تعلیم و تربیت نے طلباء کو اس حد تک بے حس اور بزدل بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ میں بھلا اساتذہ اور ملازمین کو مارنے پر طلباء کو کیوں اکسانے لگا، کیا ان سے میرا کوئی اختلاف یا جھگڑا ہے؟ ہاں اگر میں مولانا اسعد صاحب کو مارنے کی بات کہتا تو کسی قدر عقل میں بھی آسکتی تھی، اگرچہ یہ چھچھوری حرکتیں ان کے جیسے سیاسی لوگوں کو زیب دیتی ہیں جن کا مشغلہ ہی رات و دن صرف یہ ہوتا ہے کہ فلاں کو مارو، فلاں کے پر کتر دو اور فلاں کے اقتدار کا چراغ گل کر دو۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے یہ سفید جھوٹ میری طرف منسوب کر کے اپنے ذہنی افلاس اور اخلاقی پستی کا ثبوت دیا ہے اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے بدنام کرنے کے لیے صریح دروغ گوئی سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ میں نے سیکڑوں آدمیوں کے سامنے طلباء سے یہ بات کہی تھی۔ اور میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی معتبر شخص جو اس جلسہ میں شریک رہا ہو یہ گواہی نہیں دے سکتا کہ میں نے یہ بات کہی ہے۔ اگر مولانا اسعد صاحب صرف دو ثقہ آدمیوں سے بھی حلف اٹھوا کر گواہی دلوا دیں تو میں اس کی ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔

خیر، مولانا اسعد صاحب کے الزامات کا جواب تو میں بعد میں دوں گا، اسوقت مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ چھتہ کی مسجد میں میری تقریر کا پروگرام ایک ایسا واقعہ تھا جسے مولانا اسعد صاحب اور ان کے گروپ نے خطرہ کا الارم سمجھا (حالانکہ ایک استاد کا طلباء کے علمی و دینی پروگراموں میں شریک ہونا نہ صرف یہ کہ کوئی بری یا عجیب بات نہیں ہے بلکہ ایک اچھی بات ہے جس کو سراہا جانا چاہیئے) وہ اپنی دانست میں مجھے دارالعلوم کے منظر سے غائب اور طلباء سے بے تعلق کر چکے تھے۔ یہ ان کے لئے اچنبھے کی بات تھی کہ طلباء اب بھی مجھ سے وابستہ اور میرے اس قدر گرویدہ ہیں۔ انھوں نے جوابی عمل کے طور پر مدراس سے تعلق رکھنے والے ایک مدرس کو (جو میرے شاگرد بھی ہیں اور میں نے ہی ان کو دارالعلوم میں بڑی کوشش کے بعد ملازمت دلوائی تھی، لیکن اب مولانا اسعد صاحب سے بہت قریب ہیں) تیار کیا یا وہ خود تیار ہوئے اور انھوں نے تیسرے دن اپنے دو اسباق میں یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ میں ان کا استاد اور محسن ہوں، میرے خلاف انتہائی سوقیانہ، زہریلے اور اشتعال انگیز الفاظ میں تقریر کی۔ مجھے فاسق، فاجر، یہاں تک کہ بے نمازی غرض کہ جو منھ میں آیا کہتے چلے گئے۔ اس کی گواہی طلباء کی ایک بڑی تعداد آج بھی دے سکتی ہے۔ انھوں نے یہ تقریر مجھے طلباء کی نظر سے گرانے کی غرض سے کی تھی لیکن اس کا الٹا اثر ہوا اور طلباء میں اس تقریر سے زبردست بے چینی اور غم و غصہ پیدا ہوا۔ طلباء کے ذہن میں یہ سوال

مولانا وحید الزماں کیرانوی

ابھر کر سامنے آیا کہ جب ایک استادِ حدیث اپنے محسن استاد کی شان میں اس طرح گستاخی ہی نہیں الزام تراشی کر سکتا ہے تو ہم شاگردوں کا کیا حال ہوگا اور ہماری سیرت کس سانچے میں ڈھلے گی۔ طلباء کی ایک تعداد نے تو اس کے بعد ان کے سبق میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ اس تقریر کا چرچا دارالعلوم اور بیرون دارالعلوم ہر جگہ ہوا اور سب نے اس کی مذمت کی اور کہا کہ دارالعلوم کی پوری تاریخ میں اب سے پہلے کسی استاد نے کسی درس گاہ میں اپنے استاد کو اس طرح مغلظات سنائی ہوں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ دارالعلوم کی تمام روایات کو بے دردی کے ساتھ پامال کیے جانے کے باوجود مولانا ریاست علی صاحب ناظم مجلس تعلیمی اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ گویا ان کے نزدیک یہ ایک پسندیدہ بات تھی۔ قاعدے کے مطابق چھتہ کی مسجد میں ہونے والی میری تقریر اگر قابل مؤاخذہ تھی تو ناظم مجلس تعلیمی کو مجھ سے فوراً جواب طلب کرنا چاہئے تھا۔ اسی طرح مذکورہ مدرس سے بھی باز پرس کرنی چاہئے تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ منتظم حضرات جو خود کو دارالعلوم کا سب سے بڑا محافظ امن سمجھتے ہیں۔ اس جوابی کارروائی کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ میرا لڑکا جو مذکورہ مدرس کے ایک سبق میں شریک تھا گھر آکر رونے لگا اور دریافت کرنے پر بتایا کہ آج میرے باپ کو میرے ایک استاد نے جتنا سخت و سست کہا میں اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا تھا، یا تو میرے کان بہرے ہو جاتے یا زمین مجھے نگل جاتی، مگر میں اس لئے ضبط کرکے بیٹھا رہا کہ میرے والد کی مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں ہر استاد کا احترام کروں اور ان کا کسی سے کتنا ہی اختلاف ہو، میں اس میں شریک نہ ہوں۔ اس تقریر کی گونج باہر تک پہنچی اور لوگوں نے ملاقاتوں میں اور تحریری طور پر اس کی مذمت کی۔ اگر کسی نے مذمت نہیں کی تو وہ دارالعلوم کی انتظامیہ تھی جو چپ سادھے تماشائی بن کر یہ سب کچھ دیکھتی رہی مگر دارالعلوم کے سبھی مدرسین حضرات نے اس تقریر کو ناپسند کیا۔

مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس کے فوراً بعد مولانا اسعد صاحب دیوبند پہنچے اور مخصوص حضرات کی میٹنگ ہوئی۔ مولانا اسعد صاحب نے مذکورہ مدرس سے کہا کہ آپ کو ایسی تقریر نہیں کرنی چاہئے تھی، اس سے آپ گرفت میں آجائیں گے۔ آپ تو وحید الزماں کو تقریر کرنے کے مواقع دیجئے اور ٹیپ کیجئے تاکہ ان کو ... مجلس شوریٰ میں رکھا جا سکے۔ یہ رپورٹ مجھے میرے ایک مخصوص آدمی نے پہنچائی جو ان سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس گفتگو کے وقت باہر کھڑے سب کچھ سن رہے تھے۔

اس کے تیسرے دن اچانک مغرب کے بعد دارالعلوم میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ آج آٹھ بجے وحید الزماں کی تقریر ہوگی۔ یہ بات ایک سازش کے تحت پھیلائی گئی۔ طلباء کی مختلف ٹولیاں جن میں سے کچھ کو میں پہچان سکا اور بہت سوں کو میں نے نہیں پہچانا، عشاء کی نماز تک میرے پاس آتی رہیں۔ میں نے ان سب سے اس خبر کی تردید کی اور کہا کہ میری تقریر کا کوئی پروگرام نہیں ہے، نہ میں نے کسی سے کہا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے کہا ہے، یہ صرف ایک شرارت ہے۔ میرے پاس میرے محلہ کے قاضی مرغوب احمد اور قاضی منصور احمد صاحبان بیٹھے ہوئے تھے، جو دارالعلوم جامع مسجد سے متعلق ہیں لیکن میرے قدیم ہمدرد اور مخلص ہیں، دونوں بھائی میرے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں، میں جانے کے لئے کچھ آمادہ ہوا تو ان دونوں حضرات نے منع کیا اور کہا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی سازش ہو۔ اب میں اس کش مکش میں پڑ گیا کہ نہ جانا بہتر ہے یا جا کر طلباء سے یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ آپ لوگ اپنے کمروں میں جائیے۔ اسی دوران تقریباً پچیس تیس طلباء کی ایک جماعت آئی اور انھوں نے کہا کہ طلباء میں کافی خلفشار ہے، وہ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں، آپ چل کر کم از کم یہی کہہ دیجئے کہ میری تقریر نہیں ہوگی۔ میں ان کے ساتھ تنہا نکلا، جب صدر دروازے پر پہنچا تو کوئی سو کی تعداد میں طلباء وہاں اکٹھا ہو گئے۔ میں پھر ٹھٹھکا اور یہ خیال آیا کہ اگر اندر جاؤں گا تو مزید طلباء وہاں جمع ہوں گے اس لیے بہتر یہ ہے کہ یہیں کچھ کہہ دیا جائے۔ چنانچہ میں گیٹ کے پاس کے کمرے کی سیڑھی پر کھڑا ہو گیا۔ طلباء ادھر ادھر سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میرے عزیزو! میری تقریر کا کوئی پروگرام نہیں ہے، نہ میں نے کسی سے کہا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے کہا ہے۔ یہ ایک سازش ہے جو اس لئے کی جا رہی ہے تاکہ یہ کہہ کر مجھے بدنام کیا جا سکے کہ میں دارالعلوم میں انتشار پھیلا رہا ہوں۔ امتحان کا زمانہ قریب ہے، آپ لوگ جائیے اپنی پڑھائی میں مشغول رہئے اور ادھر ادھر کی باتوں پر قطعاً توجہ نہ دیجئے۔ ان چند منٹوں میں طلباء بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے کیونکہ پہلے سے افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ میں رُکا تو دو طالب علموں نے یہ کہا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرما دیجئے۔ میں نے کہا کہ آج کی نصیحت صرف یہ ہے کہ ہمارے دارالعلوم کی جہاں بہت سی خصوصیات ہیں، وہیں ایک بڑی خصوصیت اور اعلیٰ روایت احترام اساتذہ بھی ہے۔ یہ ہماری تعلیم کا جوہر ہے۔ اگر یہ جوہر پیدا نہ ہو تو ہماری تعلیم ناقص ہے۔ میں عاصی و گنہگار، بے عمل اور تہی دامن ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنے اساتذہ کی دعائیں ملی ہیں۔ میرے کوئی استاد مجھ سے ناراض نہیں ہوئے اور اگر ہوئے تو میں نے ان کو راضی کرکے اپنی دنیا و آخرت درست کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بطور مثال کہا کہ ایک دفعہ اسٹرائک کے زمانے میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب کو میرے بارے میں بدگمانی تھی اور وہ مجھ سے ناراض تھے، لیکن میں ہمیشہ ان کو سلام کرتا تھا اور کوئی لفظ ان کی شان کے خلاف زبان سے نہیں نکالا۔ ایک ملازم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا ان کا اختلاف ہے۔ ایک روز مجھ سے یہ کہا کہ "آج اہتمام میں معراج الحق کی بڑی درگت بنی" میں نے اس پر اس کی سخت سرزنش کی اور کہا کہ میرے سامنے میرے محترم استاد کی شان میں کوئی گستاخی کرے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔

اسی اسٹرائک کے زمانے میں حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاری بھی ایک دفعہ دارالعلوم کی مسجد میں مجھ سے ناراض ہو کر مخاطب ہوئے۔ میں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا اور عرض کیا کہ "حضرت! آپ نے میرے متعلق فلاں بات کہی جو آپ کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہو، میرے سامنے فرمائیں اور اس طرح کہ آپ کا جوتا ہو، میرا سر ہو اور مجمع عام ہو۔ یہ آپ کا حق ہے، وہ آپ کا منصب نہیں۔" وہ بہت رحم دل اور رقیق القلب ہیں۔ اتنی بات سنتے ہی انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، وہ مجھے ہمیشہ بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، ڈانٹتے بھی ہیں اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔ نیز میں نے کہا کہ دارالعلوم کے بعض مدرس جو میرے شاگرد بھی ہیں، کہتے ہیں کہ وحید الزماں سے کوئی شخص ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ یہ ہزاروں کا مجمع جو اس وقت اپنی محبت کی بنا پر میرے گرد جمع ہے آخر کیوں جمع ہے؟ صرف اس لیے کہ میں نے اپنے اساتذہ سے دعائیں لی ہیں، اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر طلباء نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

اسی دوران کچھ طلباء جن میں سے بعض میرے مکان پر بھی مجھے بلانے کے لیے پہنچے تھے، اوپر چڑھ گئے اور وہاں سے مجمع کو منتشر کرنے کے لئے چند اینٹیں پھینکیں اور ان میں سے کچھ نے مجمع کے قریب آکر اس طرح شور مچایا کہ مجمع میں انتشار پیدا ہو۔ اسی دوران مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب

مولانا عبدالرؤف [illegible]

صدر دروازے پر پہنچے اور طلباء سے اندر جانے کو کہا۔ میں نے تقریر بند کر دی بعد سیڑھیوں سے نیچے اتر کر طلباء کو اندر بھیجنے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں طالب علموں سے اندر جانے کو کہتا رہا۔ شہر کے کچھ لوگ مہمان خانے کے گوشہ پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے اور مرغوب و منصور صاحبان جن کا ذکر اوپر گزرا، میرے پاس کھڑے ہوئے تھے، میں نے ان کو روانہ کر دیا (اسی بات کو مولانا اسعد صاحب اور ان کے حواریوں نے اس طرح پھیلایا کہ میں جامع مسجد (وقف دارالعلوم) کے لوگوں کو ساتھ لے کر دارالعلوم پر قبضہ کرنے آیا تھا) حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے اس کی ضرورت نہیں محسوس فرمائی کہ وہ مجھ سے معلوم کرتے کہ کیا معاملہ ہے۔ دارالعلوم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں اپنے مکان واپس آ گیا۔ میرے پیچھے کچھ طلباء اور کچھ دوسرے افراد تھے جن کو میں نہیں پہچانتا، ان کو میں نے واپس کر دیا۔ مولانا اسعد صاحب بھی اس روز اپنے مکان پر موجود تھے۔ نعروں کی آواز سن کر وہ بھی شمالی گیٹ سے اندر آ گئے۔ تحتانی ہال میں طلباء کو جمع کیا جانے لگا، لیکن طلباء منتشر تھے۔ مولانا ریاست علی صاحب اور مولانا سعید احمد پالنپوری صاحب کو بھی ان کے گھروں سے بلا لیا گیا، یہ لوگ جنوبی دروازے سے داخل ہوئے۔ اب جس قدر حضرات وہاں پر موجود تھے، ان میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ صدر دروازے پر کیسا اجتماع ہوا! میں کیا تقریر کر رہا تھا اور کیوں کر رہا تھا؟ اور کسی نے بھی مجھ سے یا طلباء سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ تحتانی ہال میں مولانا ریاست علی صاحب اور مولانا سعید احمد پالنپوری نے تقریریں کیں۔ آخر الذکر نے تو ناصحانہ تقریر کی کہ فتنہ وفساد نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن مولانا ریاست صاحب نے جو دارالعلوم کے ناظم تعلیمات تھے، تحقیقِ حال کیے بغیر میرے خلاف ایک تقریر کر ڈالی جس میں میری مذمت کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ مولانا کی دارالعلوم میں کوئی خدمت نہیں ہے۔ وہ صرف ہر کام کا انتساب اپنی طرف چاہتے ہیں۔ لیکن طلباء اور سامعین میں بے چینی اور اضطراب تھا اور طلباء پر ان کی تقریر کا اچھا اثر نہیں تھا۔ طلباء کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مولانا اسعد صاحب نے تقریر کرنے کی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ جوں ہی وہ دارالعلوم میں داخل ہوئے تھے، مختلف سمتوں سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ ہوا کا رخ سمجھ گئے تھے۔

رات ہی کو مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے جو بجنور میں تھے، رابطہ قائم کیا گیا اور وہ علی الصباح دارالعلوم پہنچ گئے۔ تمام دن اساتذہ کے ساتھ میٹنگیں ہوتی رہیں۔ بعض میں مولانا اسعد صاحب بھی شریک رہے۔ شام کو ایک ذریعہ سے مجھے اطلاع ملی کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب اور مولانا نصیر احمد خاں صاحب مجھے بلا کر بات کریں گے۔ غالباً یہ انتخاب اس لئے کیا گیا کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب تو بڑے ہیں ہی، باقی دونوں حضرات بھی میرے استاد ہیں۔ اگلے دن میں حسبِ معمول سبق پڑھانے گیا۔ پڑھا کر درس گاہ سے نکلا تو مہتمم صاحب کا مکتوب ملا کہ تھوڑی دیر کے لئے اہتمام میں آ جائیں، کچھ بات کرنی ہے۔ چنانچہ میں فوراً ہی دفتر اہتمام میں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی تینوں بزرگ کھڑے ہو گئے حضرت مولانا معراج الحق صاحب اور حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کے چہروں پر اس قدر بشاشت اور آثارِ شفقت تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب حسبِ معمول تھے۔ مصافحہ ہوا۔ سب سے آخر میں مولانا معراج الحق صاحب سے مصافحہ ہوا تو انھوں نے انتہائی شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے رکھا اور اسی حالت میں دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں گفتگو کرنی تھی۔ مہتمم صاحب نے گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ ابھی چھتہ کی مسجد میں اور اس کے بعد صدر دروازے پر آپ کی جو تقریر ہوئی تھی، اس کے بارے میں علوم کرنا تھا کہ وہ کیا تھی اور آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات اگر آپ پہلے ہی دریافت فرما لیتے تو آپ کو اس قدر طویل مشوروں کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں نے کہا کہ میرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں خالی الذہن ہو کر تبلیغی جماعت کے طلباء کے اصرار پر چھتہ کی مسجد میں یہ سمجھ کر آیا تھا کہ وہاں حسبِ معمول مختصر سی جماعت ہو گی لیکن وہاں خلاف توقع مجمع کثیر تھا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق آزادانہ تقریر کی۔ میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے دارالعلوم میں خلفشار ہو یا جس کا مقصد کوئی انقلاب برپا کرنا ہو۔ میں نے اپنی تقریر کا ماحصل بھی بتایا اور پھر مدراس سے تعلق رکھنے والے مذکورہ مدرس کی اشتعال انگیز اور زہریلی تقریر کا حوالہ دیا جس سے طلباء میں بے انتہا غم و غصہ پیدا ہوا اور دارالعلوم کی اخلاقی روایات پامال ہوئیں۔ نیز اس کے بعد صدر دروازے پر اپنی آمد، اس کا سبب اور اپنی تقریر کا مضمون بھی وضاحت کے ساتھ بتایا اور عرض کیا کہ میرا کسی اقدام کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں تو احتیاطاً طلباء کے ہر اجتماع میں شرکت سے گریز کرتا ہوں اور یہ جو کچھ پیش آیا، محض ایک اتفاقی بات تھی۔ ہاں ایک بات ضرور عرض کرنی ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے زمانے میں طلباء کے ساتھ اگر کچھ سختی ہوتی تھی یا انقلاب سے قبل طلباء کا اجتماعی اخراج کر دیا گیا تھا تو ہم سب نے اسے ظالمانہ اقدام قرار دیا تھا۔ میں آج طلباء کے ساتھ مولانا ارشد مدنی صاحب کے پُرتشدد طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مدنیؒ کی طرح ان کے صاحبزادگان میں طلباء کے ساتھ بے انتہا ہمدردی اور شفقت ومحبت ہو گی۔ لیکن مولانا ارشد صاحب کے یہاں سختی ہی سختی ہے، محبت وہمدردی نہیں۔ اساتذہ بھی ان کے طرزِ عمل سے خوش نہیں ہیں، بلکہ بے انتہا منقبض ہیں۔ آپ کو میں دعوت دیتا ہوں کہ اپنے طور پر آپ میری بات کی تحقیق کرائیں۔ اگر صحیح ہو تو ان کو توجہ دلائیں اور غلط ہو تو میری سرزنش فرمائیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون ناظم ہو اور کون نائب ناظم۔ آپ جن صاحب کو بھی طلباء کا اور ہمارا افسر مقرر کریں گے ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ لیکن اگر وہ ظلم کرے گا تو اس کو ظلم ہی کہیں گے۔ اس پر خاموش نہیں رہیں گے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب میری تفصیلی گفتگو سن کر مطمئن ہو گئے۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے فرمایا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا اور مولانا اسعد صاحب کا اختلاف دارالعلوم پر اثر انداز نہ ہو۔ میں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ دونوں ہی کا [illegible] دارالعلوم سے ہے۔ اگر وہ بلاوجہ میری مخالفت بند کر دیں جیسا کہ وہ شوریٰ کے ہر اجلاس میں کچھ نہ کچھ میرا مسئلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تو میں بھی ان کے خلاف بولنا بند کر دوں گا۔ اس پر مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہم آپ دونوں کی گفتگو کرائیں گے اور ایسا ہی ہو گا۔ مہتمم صاحب دو روز کے بعد بجنور تشریف لے گئے تو وہاں حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب کے صاحبزادے مولانا زین الساجدین صاحب قاسمی سے ایک ملاقات میں حالات کی تفصیل بتا کر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

یہ واقعہ گزشتہ تعلیمی سال (۱۴۲۱ھ) کے دوران ششماہی امتحان سے کچھ پہلے کا ہے امتحان بخیریت گزرا اور دارالعلوم کی فضا میں کوئی ادنیٰ ہلچل نہ تھی۔ حتیٰ کہ ماہ شعبان آیا اور ۲۱-۲۲ر شعبان ۱۴۲۱ھ کو مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں چند فیصلے ہوئے جنکی شہرت اجلاس کے فوراً بعد ہو گئی۔ مولانا ارشد صاحب کے استعفے اور اس کی منظوری کی خبر بھی

عام ہوگئی لیکن میری سبکدوشی کا فیصلہ صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ ۱۴ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ء کی دوپہر کو دفتر اہتمام کی جانب سے مجھے ایک بند لفافہ موصول ہوا جسے کھول کر دیکھا تو حسبِ ذیل مضمون کی تحریر ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی:

"مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۱، ۲۲ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ نے آپ کے بارے میں جو تجویز منظور کی ہے، وہ ارسالِ خدمت ہے۔

تجویز ۳۴ ضمن (ح)

حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کی جانب سے بار بار پیش آنے والی صورتِ حال زیرِ بحث آئی۔ مجلس شوریٰ ان کی بیماری اور اس کی بنا پر مشتعل اور بے قابو ہو جانے کی معذوری کے پیشِ نظر ان کو تدریسی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے مبلغ سات سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جانا منظور کرتی ہے۔"

یہ فیصلہ میری توقع کے خلاف نہ تھا، چونکہ مولانا اسعد صاحب مسلسل اس کوشش میں تھے کہ کوئی بھی بہانہ ہاتھ آئے تو وہ اپنی آتشِ انتقام کو جو جمعیۃ علماء کے قیام اور اس کی صدارت قبول کر لینے کے بعد ان کے سینے میں بھڑک ہوئی تھی، فرو کریں۔ چنانچہ وہ اس دفعہ بڑی کدوکاوش کر کے اور کچھ ممبران شوریٰ سے کنویسنگ کر کے اور غلط اطلاعات پہنچا کر ان کی ذہن سازی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا موصوف اس سے قبل بھی مولانا ریاست علی صاحب پر مختلف باتوں کی رپورٹ پیش کرنے پر زور دیتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ کوئی بنیاد نہ تھی اس لیے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس دفعہ بھی میری سبکدوشی کا فیصلہ تعلیمات کی نہیں بلکہ مولانا ریاست صاحب کی تحریر پر ہوا، کیونکہ تعلیمات کی رپورٹ وہ کہلاتی ہے جو مجلس تعلیمی میں پیش ہو کر منظور ہوتی ہے۔ مجلس تعلیمی کے کئی ممبران نے میرے خلاف ایسی رپورٹ پیش کرنے سے اختلاف کیا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک معاملہ دب گیا تھا اور ماحول پُرامن تھا، اس لیے ایک نیا مسئلہ اٹھانے کو وہ دارالعلوم کے امن کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے۔

مجلس شوریٰ کا یہ فیصلہ چونکہ میری ذات سے متعلق تھا، اس لیے میں نے اسے غیر منصفانہ اور محض انتقامی کارروائی سمجھنے کے باوجود گوارا کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے دیوبند میں کسی کو یا باہر اس کی اطلاع بھی نہیں کی، بجز اپنے بھائیوں اور بعض مخصوص احباب کے۔ کچھ وقت گزر گیا اور رفتہ رفتہ یہ خبر پھیلنے لگی۔ میری اس خواہش اور کوشش کے باوجود کہ یہ معاملہ آگے نہ بڑھے، اس پر ردِ عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ دارالعلوم میں اللہ کے فضل سے اٹھائیس سال تک میں نے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ہر جگہ میرے شاگرد اور محبین موجود ہیں۔ اس لیے یہ ناممکن تھا کہ میرے متعلق دارالعلوم کے ایسے جابرانہ فیصلے پر کوئی ردِ عمل نہ ہو۔ چنانچہ دہلی میں میرے ہمدردوں نے از خود جمع ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد دیوبند جا کر مہتمم صاحب سے ملے۔ ۲۴ مئی ۱۹۹۰ء کو بارہ مؤقر افراد پر مشتمل ایک وفد جس میں اکثر مدارس کے ذمہ دار تھے، دیوبند آیا اور اس نے مہتمم صاحب سے زبانی گفتگو کے ذریعہ اس فیصلہ پر اپنے غم و رد کا اظہار کیا۔ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مجھے بھی اس فیصلے کا رنج ہے، مگر شوریٰ نے ایسا کر دیا ہے۔ انھوں نے وفد سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے جذبات اور اس کا پیش کردہ میمورنڈم مجلس شوریٰ کے آئندہ اجلاس میں پیش کریں گے۔

اس کے بعد ۴ جون کو دہلی اور قرب و جوار کے تقریباً ساڑھے تین سو فضلائے دارالعلوم کا ایک خصوصی اجتماع جیون بخش ہال فتحپوری، دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں جیسا کہ مجھے اطلاعات ملیں، ان فضلاء کے علاوہ کوئی غیر شخص شریک نہیں تھا۔ اس اجلاس نے ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی ایک تنظیم کے قیام کو ضروری سمجھا تاکہ اس کے ذریعہ مادرِ علمی کو آئندہ لاحق ہونے والے خطرات اور جابرانہ، منتقمانہ اور شخصی مداخلت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور ابنائے قدیم میں اجتماعیت پیدا کر کے انھیں اپنے ماحول میں مؤثر بنایا جائے۔

مثل مشہور ہے "چاہ کن را چاہ در پیش"۔ دس سال کے بعد تاریخ نے خود کو دہرانا شروع کر دیا۔ مولانا اسعد صاحب نے اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم کے پُرامن ماحول میں ہلچل پیدا کرنے، اجلاس صد سالہ کی کامیابی کے اثرات کو فنا کرنے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ کو متاثر و مجروح کرنے کے لیے عالمی مؤتمر کے نام سے تنظیم قائم کی تھی۔ جس کے بڑے بڑے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ لیکن اصل مقصد صرف دارالعلوم پر قبضہ کرنا ثابت ہوا چنانچہ قبضہ کے بعد وہ ختم کر دی گئی۔ اب قدرت نے مولانا اسعد صاحب کی من مانی کارروائیوں پر قدغن لگانے اور مادرِ علمی کو شخصی اور خاندانی تسلط سے بچانے کے لیے فضلائے دارالعلوم کے دلوں میں اس تنظیم کے قیام کا جذبہ پیدا کر دیا۔ تنظیم کا صدر حضرت مولانا انضال الحق قاسمی کو منتخب کیا گیا جو مختلف مدارس میں درسِ حدیث کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، اور اس کے جنرل سکریٹری مولانا ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، ریڈر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنائے گئے۔ اس تنظیم نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر اس کو مستحکم اور منظم کرنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ تنظیم کا پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد ۵ جون ۱۹۹۰ء کو دیوبند آیا۔ مہتمم صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے نائب مہتمم مولانا نصیر احمد خاں صاحب ہی سے ملاقات کی۔ اور دو چار تجاویز پیش کیں، جن میں ایک کا تعلق تنظیم ابنائے قدیم کے قیام سے تھا اور ایک کا تعلق میری برطرفی اور اس پر نظرِ ثانی سے تھا۔ اور اس کے ساتھ مہتمم صاحب کے نام وفد کا ایک خط تھا۔

اس کے چند روز بعد مولانا اسعد صاحب جیسے ہی دیوبند پہنچے اور انھیں ان دو وفدوں کی آمد کی اطلاع ملی تو بالکل حواس باختہ ہو گئے اور انھوں نے فوراً ہی حسبِ عادت اس کے توڑ کی تدابیر شروع کر دیں۔ میرے ہمدردوں نے پُرامن اور مہذب طور پر دیوبند سے دور دہلی میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور قاعدے اور تہذیب کے ساتھ میمورنڈم اور تجاویز پیش کیں۔ جس کی کوئی اطلاع طلباء تک نہیں پہنچائی گئی تاکہ وہ کسی الجھن میں مبتلا نہ ہوں۔ مولانا اسعد صاحب کی توڑ والی تدبیر کے نتیجہ میں دارالعلوم اور اس کے باہر ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ نمائندہ اجتماع کے نام سے ایک دعوت نامہ تیار کیا گیا جس پر مہتمم صاحب، نائب مہتمم اور صدر مدرس کے دستخطوں کے علاوہ ایک رکنِ شوریٰ مولانا اسعد صاحب کے بھی دستخط تھے۔ یہ دعوت نامے ڈاک سے بھیجنے کے بجائے مدرسین کے ذریعہ دستی بھیجے گئے۔ دس روز تک تین کرائے کی گاڑیاں دہلی سے لے کر مظفرنگر، سہارنپور، مرادآباد اور بریلی تک دوڑتی رہیں۔ چونکہ مولانا اسعد صاحب کو اپنی پوزیشن کا خیال تھا اور یہ یقین تھا کہ دعوت نامے پر لوگ زیادہ تعداد میں نہ آسکیں گے اس لیے مخصوص مقامات پر اپنے خاص افراد کو جو ان کے ساتھ محض اپنے مصالح و مفادات کی بنا پر وابستہ ہیں، اس بات کے لیے تیار کیا گیا کہ وہ اپنے یہاں سے زیادہ سے زیادہ افراد بھیجیں۔ چنانچہ اس اجتماع میں جو لوگ جمع ہوئے ان میں فضلائے دارالعلوم کم تھے اور اکثریت طلبۂ مدارس اور کچھ غیر متعلق لوگوں کی تھی۔ مثلاً ہاپوڑ کے مدرسہ سے ۱۸ آدمی آئے تھے جن میں دس طالب علم اور آٹھ مدرس تھے۔ اسی طرح شاہی مدرسہ مرادآباد کے اساتذہ اور دورہ کے طلباء لائے گئے تھے۔ دوسرے مدارس سے آنے والوں کا بھی یہی حال تھا مگر انھی کو نمائندوں کا نام دے دیا گیا۔ اجتماع

سے پہلے اور بعد میں بہت سے افراد سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں اکثریت مولانا اسعد صاحب کے مخالفین کی تھی لیکن وہ اپنے مدارس کی ملازمت یا طالبعلمانہ نسبت یا بعض دوسری وجوہات کی بنا پر خاموش بیٹھے اور کارروائی سنتے رہنے پر مجبور تھے۔

اس اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں متعدد مدرسین کے اسباق کا نقصان ہوا۔ عام طلباء کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسئلہ کیا ہے اور یہ تیاریاں کس اجلاس کے لیے ہو رہی ہیں۔ میری سبکدوشی کی وجہ جس تقریر اور جس پیش آمدہ صورت کو بتایا گیا ہے، اس سے دارالعلوم میں ایک دن کی تعلیم کا بھی نقصان نہیں ہوا تھا، لیکن اس اجتماع کے نتیجہ میں طلباء کی تعلیم کا غیر معمولی نقصان ہوا، اور میں نے جس مسئلہ کو چھپانے کی کوشش کی تھی اسے عام طلباء کے ذہنوں تک پہنچا دیا گیا۔

۱۸ جون کو یہ نام نہاد نمائندہ اجتماع محمود ہال دیوبند میں منعقد کیا گیا۔ مہتمم صاحب کے بجائے مولانا اسعد صاحب اس اجلاس کے روح رواں رہے۔ ان کو کوالالمپور کی ایک کانفرنس میں شریک ہوکر حج کے لیے جانا تھا مگر وہ اپنا پروگرام تبدیل کرکے محض اس اجتماع میں شرکت کے لیے دیوبند پہنچے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر میرے خلاف کارروائی مجلس شوریٰ نے کی تھی اور مولانا اسعد صاحب کے جذبۂ انتقام کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا اور نہ ان کی کوشش تھی (جیسا کہ انھوں نے بعض لوگوں سے کہا کہ خود انھیں بھی اس فیصلہ پر ملال ہوا) تو وہ اس اجتماع کے روح رواں کیوں بنے رہے؟ دعوت نامے پر ان کے دستخط کا کیا مطلب ہے؟ یا تو شوریٰ کے تمام ارکان کے دستخط ہوتے یا کسی بھی رکن کا نام نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں اگر یہ دارالعلوم کا بلایا ہوا نمائندہ اجتماع تھا تو اس کا انعقاد محمود ہال میں چہ معنی دارد؟ اسے تو دارالعلوم ہی کے کسی ہال میں منعقد ہونا چاہیے تھا لیکن مولانا اسعد صاحب ہمیشہ اسی پالیسی پر عمل کرتے ہیں اور ہر اجلاس کو شتر مرغ بنا دیتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ ہوا وہ ان کی وجہ سے ہوا، اس میں مہتمم صاحب وغیرہ کا نام برائے نام شامل کیا گیا۔

مزید یہ کہ دعوت نامے کے بموجب یہ اجتماع دارالعلوم کی ترقیات کی تفصیلات پیش کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، اس لیے قاعدے کے مطابق انتظامیہ کے ارکان کو دارالعلوم کی ترقیات پر بولنا چاہیے تھا، لیکن اس کے بجائے مولانا اسعد صاحب نے رکن شوریٰ ہوتے ہوئے اپنے دیگر تمام مناصب کو بالائے طاق رکھ کر اور انتہائی نچلی سطح پر اتر کر جو غیر ذمہ دارانہ، بے بنیاد، نامعقول، چھچھوری اور گھناؤنی باتیں کہیں، وہ رکن شوریٰ تو کیا، دارالعلوم کا ادنیٰ استاذ بھی اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ الزام تو مشتعل اور بے قابو ہونے کا مجھ پر لگایا جا رہا تھا لیکن بزعم خود حضرت امیر الہند، جانشین صدر جمعیۃ علمائے ہند، پیر و مرشد اور ممبر راجیہ سبھا و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم اس وقت بے قابو اور مشتعل ہو رہے تھے کہ نہ الفاظ پر قابو تھا، نہ مضمون میں کوئی تسلسل، نہ کوئی دعویٰ، نہ کوئی دلیل۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ اور بے تکی باتیں کہ ان کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ جھوٹ بھی اگر ایسا ہو جس کی کوئی تاویل ممکن ہو تو ایک بات ہے، لیکن ایسا جھوٹ جس کی تاویل تو کجا، کسی ذی عقل کی عقل اس کو قبول کرنے ہی کو تیار نہ ہو، اور ایسی مغالطہ آمیز اور پُرفریب باتیں جن سے سیاق و سباق کو حذف کرکے دیدہ و دانستہ سامعین کو گمراہ کیا جا رہا تھا، اگر ایک ایسے شخص کی جانب سے ظہور میں آتی ہیں جو مذکورہ مناصب پر بالجبر قابض ہے تو یقیناً یہ علماء کے لیے ماتم اور دارالعلوم کے لیے شرم کا مقام ہے۔ پھر دارالعلوم کی ترقیات سامعین نے سُنی ہوں یا نہ سُنی ہوں، لیکن اس بات کو سب نے دیکھ لیا کہ دارالعلوم نے مولانا اسعد صاحب کے زیر قیادت دروغ گوئی، الزام تراشی، افترا پردازی، غیبت اور مغالطہ بازی، گندہ ذہنی اور

[illegible]

بداخلاقی میں کس قدر ترقی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علماء یا ہمدردوں کے اس اجتماع میں ایک عالم دین، "پیر و مرشد" اور رکن مجلس شوریٰ نے میرے خلاف جو الزام تراشیاں کی ہیں، اگر ان کو مجلس شوریٰ کے ممبران اپنے کانوں سے سُن لیں تو شاید وہ اسے مجلس کی زبردست توہین سمجھیں گے۔ کیونکہ دارالعلوم کی شوریٰ کے ارکان مولانا اسعد کے علاوہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمیشہ بردبار، متحمل مزاج، معاملہ فہم اور عالی ظرف رہے ہیں۔ مولانا ہی ایک ایسے بے جوڑ ممبر ہیں جنھوں نے صرف اپنی ممبری کے شوق میں دارالعلوم کی تمام روایات کو پس پشت ڈال کر اس کے پورے نظام کو تہ و بالا کر ڈالا اور محض اقتدار کے حصول کے لیے علماء کی کسی رسوائی کی پروا نہیں کی۔ اگر مولانا اسعد صاحب اپنی ممبری کے لیے اس قدر خواہش مند اور کوشاں نہ ہوتے تو دارالعلوم کی رسواکن لڑائی نہ لڑی جاتی اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

اس اجتماع میں دہلی میں قائم ہونے والی تنظیم ابنائے قدیم پر بڑا کیچڑ اچھالا گیا یہاں تک کہا گیا کہ دہلی کے اجتماع میں شریک ہونے والوں کی تعداد دس بیس افراد سے زیادہ نہیں تھی اور بقول مولانا ریاست علی وہ بھی آبرو باختہ قسم کے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اگر صرف پانچ ہی تھے تو سوال یہ ہے کہ آپ نے اس کا اس قدر اثر کیوں لیا اور آپ پر اس قدر بوکھلاہٹ کیوں طاری ہوگئی کہ آپ نے زمین و آسمان ایک کر دیئے اور اس کے توڑ کے لیے بقول آپ کے دو ہزار، بقول مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے پندرہ سو، اور بقول شخصے ۸۰۰ آدمیوں کو بلانے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اگر خدانخواستہ دہلی میں ایک ہزار آدمی جمع ہو جاتے تو شاید آپ کو پورا ہندوستان جمع کرنا پڑتا اور ایک سال کے لیے دارالعلوم میں چھٹی ہو جاتی۔

اس اجتماع میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں دارالعلوم کی گزشتہ آٹھ سالہ خدمات و ترقیات کو شمار کرایا۔ لیکن دیانت و امانت کے تقاضے کے باوجود کسی جگہ پر بھی یہ اخلاقی ذمہ داری محسوس نہیں کی کہ احقر نے جو اہم ترین کام انجام دیئے تھے اور جن کا سب لوگوں نے اعتراف بھی کیا تھا، ان کا حوالہ دیدیتے۔ اس کے برخلاف ایک جگہ مجھے دیے جانے والے مناصب کا ایسے انداز میں ذکر کیا گویا مجھے جو ذمہ داریاں سونپی گئیں نہ میں ان کا اہل تھا اور نہ ہی دارالعلوم کی ضرورت اور مفاد کے پیش نظر مجھے منصب پر لایا گیا تھا، بلکہ وہ میرے لیے ایک انعام تھا۔ اگر یہ انعام ہی تھا تو کس کارنامے کا تھا۔ آخر یہ کہنے میں کیوں خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے ہر منصب اور ہر ذمہ داری ایسے مخصوص حالات میں دی گئی جب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب جیسے افراد خود کو بے بس پانے لگے تھے۔

نیز اس خطبۂ استقبالیہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ میں ان مناصب کو اپنے امراض اور اپنے مزاج کی بنا پر نباہ نہ سکا۔ یہ بالکل غلط اور سراسر مغالطہ آمیزی ہے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور دوسرے حضرات کا دل یقیناً گواہی دے رہا ہوگا کہ یہ بات اتنی خلاف واقعہ ہے، جیسے دن کو کوئی رات کہنے لگے۔ اس بیمار نے دارالعلوم میں سب کی آنکھوں کے سامنے صحت مندوں اور تندرستوں سے کہیں زیادہ کام کیا ہے۔ جہاں تک مزاج کی بات ہے تو الحمد للہ میری انتظامی سخت گیری کے باوجود تمام طلباء اور مدرسین و ملازمین میرے اس دور کو یاد کرتے ہیں۔ شک ہو تو تحقیق کر لی جائے۔ میں نے اپنے منصب سے سبکدوشی صرف اس لئے حاصل کی تھی کہ مولانا اسعد صاحب کی پریشان کن سازشیں میرے خلاف سخت ہو چکی تھیں۔ وہ مجھے ایک پل بھی کسی منصب پر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ ان کا مشہور مزاج ہے جسے سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ کسی بھی شخص کو اپنے برابر کھڑا دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ جہاں تک میری انتظامی کارکردگی اور اصلاحات کا تعلق ہے تو ان کا یہ موقع نہیں۔ اپنی کتاب میں انشاء اللہ ذکر کروں گا۔ اور پورا ملک ان سے واقف

ہے۔ معاون مہتمم کے منصب پر تقرر کے بارے میں ماہنامہ دارالعلوم میں (۵ ۱۴۰ھ کے کسی شمارے میں) اس کے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کا اداریہ پڑھا جائے۔ جنھوں نے لکھا ہے کہ اس منصب کے لئے اس سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا تھا کیمپ کے زمانہ کی کامیاب انتظامی خدمات اس کی شاہد ہیں۔

اس اجلاس میں مہتمم صاحب نے فرمایا کہ "اساتذہ نے ایک تحریر بھی پیش کی ہے: مجھے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے کم از کم یہ توقع اب بھی نہیں تھی کہ وہ مولانا اسعد صاحب سے اتقدہ مرعوب ہوجائیں گے کہ اپنے بیان میں بھی محتاط نہ رہیں گے۔ یہ بالکل مغالطہ ہے کہ اساتذہ نے از خود کوئی تحریر پیش کی۔ یہ ایک جبری تحریر تھی جو اساتذہ سے دستخط کراکر پیش کرائی گئی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اجتماع سے چند روز پیشتر دفتر اہتمام میں تمام اساتذہ کو جمع کیا گیا مولانا ریاست علی صاحب نے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ایک تحریر پڑھ کر سنائی جس میں مندرجہ ذیل چار نکات تھے۔

(۱) دارالعلوم کے امتحان داخلہ وغیرہ میں کوئی بے ضابطگی نہیں ہوئی۔
(۲) دارالعلوم کا ماحول پرسکون ہے اور طلباء کی تعلیم و ترقی جاری ہے۔
(۳) مولانا وحید الزماں کے بارے میں مجلس شوریٰ نے سبکدوشی کا جو فیصلہ کیا ہے، وہ حق بجانب ہے۔
(۴) دہلی میں ابنائے قدیم کی جو نام نہاد تنظیم قائم ہوئی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں اور ہم اس سے لاتعلق ہیں (الفاظ میں کچھ معمولی فرق ہوسکتا ہے)

یہ تحریر سُنا کر مولانا ریاست علی صاحب نے اساتذہ سے دستخط کرنے کی درخواست کی۔ اساتذہ نے اس تحریر پر من وعن دستخط کرنے سے انکار کیا۔ خاص طور سے میری سبکدوشی کے فیصلہ اور تنظیم ابنائے قدیم سے متعلق دونکات کے بارے میں کہا کہ ان کا تعلق ہم مدرسین سے نہیں ہے۔ مولانا ریاست علی صاحب چونکہ آج کل میری مخالفت اور مولانا اسعد صاحب کی وفاداری میں کچھ زیادہ پیش پیش رہنے میں مصلحت سمجھتے ہیں، اس لئے انھوں نے ایک دباؤ کے انداز میں بڑے اساتذہ سے فرداً فرداً رائے لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اگرچہ ایک رکن شوریٰ اور مہتمم دارالعلوم نے امانت و دیانت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اساتذہ کے ضمیر ابھی بالکل مُردہ نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور بعض اساتذہ نے جو مجلس تعلیمی کے رکن بھی ہیں، مولانا ریاست صاحب سے یہاں تک کہہ دیا کہ "مجلس تعلیمی میں مولانا وحید الزماں کے بارے میں یہ بات سامنے آگئی تھی کہ ان کے متعلق کوئی رپورٹ پیش نہیں کی جائے گی، بس سرسری ذکر کر دیا جائے گا کیونکہ ایک دبے ہوئے معاملہ کو ہوا دینا اور ابھارنا مناسب نہیں ہے۔"

اس غیر متوقع اور ناگہانی صورت حال نے مولانا ریاست علی صاحب کو تحریر بدلنے پر مجبور کر دیا اور دوسری تحریر مرتب کی گئی جس میں میرا نام حذف کرکے اجمالاً یہ کہا گیا کہ ہم مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی تائید کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اساتذہ سے دستخط لیے گئے۔ دراصل چند کے علاوہ تمام ہی مدرسین اور ملازمین میں مولانا اسعد صاحب کے جابرانہ اور ڈکٹیٹرانہ مزاج کی بنا پر ایک غیر یقینی فضا پائی جاتی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مولانا موصوف حسب عادت اب کسی بھی شخص کو اپنی چھری سے ذبح کر سکتے ہیں۔ اساتذہ نے دوسری مبہم تحریر پر جو دستخط کیے وہ بھی انقباض اور بے دلی کے ساتھ کیے ہیں۔ اساتذہ کی پیش کردہ تحریر تو وہ ہوتی جو ان کے دل میں پیدا ہونے والے داعیہ کے تحت لکھی جاتی، کہ وہ خود جمع ہوتے اور اپنے دستخطوں کے ساتھ کوئی ایسی تحریر مرتب کرکے ناظم تعلیمات یا "اہتمام" کو پیش کرتے۔ کسی افسر کا اپنے ماتحتوں کے سامنے مضمون لکھ کر پیش کرنا اور دستخط کرانا جبر و اکراہ کی ایک قسم نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اس تحریر کی نامعقولیت کی یہی دلیل ہے۔

۱۸ جون ۱۹۹۰ء کے اس اجتماع میں مولانا ریاست صاحب نے بھی ایک تقریر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچ بچ کر بول رہے تھے۔ میرے خلاف چند باتیں انھوں نے کہیں۔ سننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔ مثلاً انھوں نے ایک واقعہ ذکر کیا کہ میں نے (وحید الزماں نے) چند اساتذہ کو ڈانٹ دیا۔ اوّل تو یہ غلط ہے، لیکن اگر ذرا سخت لہجہ میں کوئی ذمہ دار نظام کی رو سے اپنے ماتحت رفقاء کار کو فرائض کی انجام دہی پر کوتاہی پر متنبہ کر دے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے بلکہ احساس ذمہ داری کا ثبوت اور انتظامی جرأت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جن اساتذہ کرام کے بارے میں مولانا موصوف یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، ان سے میرے خوشگوار تعلقات ہیں۔ ان میں ایک میرے شاگرد اور ایک میرے رفیق مخلص ہیں اور دونوں ہی کو مجھ سے اپنی اپنی جگہ بے انتہا تعلق اور ہمدردی ہے۔ ایسی باتوں سے مولانا ریاست علی صاحب دراصل اپنے اس حاسدانہ جذبہ کا مظاہرہ کرتے ہیں جس میں وہ احقر کی انتظامی صلاحیت، قوت ارادی اور قوت تنفیذ (جو اس ناچیز کو خدا کے فضل سے اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل میں حاصل ہیں) کو دیکھ کر مبتلا رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کا پیٹھ پیچھے رونا روتے ہیں اور شکوہ کرتے ہیں۔ جیساکہ وہ میرے متعلق کر رہے ہیں۔ حالانکہ اپنے ماتحتوں کا شکوہ کرنا اور بروقت ان کی کوتاہی پر نوٹس نہ لینا یہ منتظم کی کمزوری اور نااہلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے دونوں عہدوں پر رہتے ہوئے نہ اس وقت اور نہ بعد میں کسی ماتحت کی نہ مذمت کی اور نہ شکایت کی۔ البتہ کام میں کوتاہی یا غفلت پر بروقت تنبیہ کرنے اور ضابطہ کی کارروائی کرنے میں ادنیٰ جھجک محسوس نہیں کی۔

مولانا ریاست صاحب نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ میں نے کم نمبرات والے طلبہ کو ناجائز طور پر داخلہ دیا۔ یہ بھی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بات کو سیاق و سباق سے کاٹ کر سامعین کو مغالطہ دینا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت معاون مہتمم اور ناظم مجلس تعلیمی دونوں عہدوں کی ذمہ داریاں میرے سپرد تھیں اور مولانا ریاست صاحب ان دنوں نائب ناظم تھے۔ انقلاب دارالعلوم کے فوراً بعد کا زمانہ تھا اور تالیف قلوب کا دور تھا۔ ہمدردان دارالعلوم کی طرف سے آنے والی سفارشات بے انتہا تھیں اور ان کو ماننا بھی ناگزیر تھا۔ مزید براں دارالعلوم کی ایک پالیسی یہ تھی کہ کم سے کم طلباء کو متوازی دارالعلوم وقف جامع مسجد میں داخلہ کا موقع دیا جائے۔ اسی لیے مجلس تعلیمی نے جیساکہ اس کے رجسٹر میں لکھا ہوا ہے، داخلوں کی مقررہ تعداد پوری ہوجانے کے بعد سو طالب علموں کے رعایتی داخلہ کا ایک کوٹہ مقرر کیا تھا۔ اسی زمانے میں مولانا رشید الدین صاحب (داماد حضرت مدنیؒ) کے صاحبزادے مولوی اخلد سلمہٗ داخلہ کے لیے آئے۔ ان کے داخلہ کے لیے مولانا رشید الدین صاحب نے سفارشی خط لکھا اور حضرت مدنیؒ کے دوسرے داماد مولانا قاری محمد عثمان صاحب (حال مدرس دارالعلوم) نے بھی اپنی سفارش تحریر کی اور وہی اخلد میاں کو لے کر میرے پاس آئے۔ میں نے اس زمانے میں یہ طے کیا تھا کہ کسی ایک طالب علم کو سفارش کی بنیاد پر داخلہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ ایک ضابطہ بناکر اس کے تحت استحقاق رکھنے والے تمام طلباء کو داخلہ دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی ضابطے کے تحت تیس ناکام طلباء کی ایک فہرست میں نے تیار کی اور ان کا میں نے ہی امتحان لیا۔ ان طلباء میں سے ایک بھی نہ کوئی میرا عزیز تھا اور نہ میرے کسی دوست یا خویش کا لڑکا تھا، بلکہ ایسے ہمدردان و فضلائے دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے تھے جنھوں نے زمانۂ کیمپ میں ہر طرح

مدد کی تھی، اس لیے ہم ان سے طوطا چشمی نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ عام طلبا، اہل دیوبند اور باہر کے ہمدردوں سے براہ راست میرا واسطہ رہتا تھا، اس لیے اس مصیبت سے مجھے ہی سابقہ پڑتا تھا۔ مولانا ریاست صاحب ان مشکلات سے دوچار نہیں ہوتے تھے۔ ان کو میرے ساتھ ایک ضد تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے باوجود کہ وہ میرے نائب تھے، اور میں ناظم ہونے کے ساتھ ساتھ معاون مہتمم بھی تھا اور اسی زمانے میں قائم مقام مہتمم بھی ہو گیا تھا، مرسلہ فہرست کو خلاف ضابطہ مسترد کر دیا۔ میں بھوپال میں منعقد ہونے والی جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ میری مرسلہ فہرست پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا ہے اور مولانا ریاست صاحب ناراض ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ بڑے ہیں اور آپ کا منصب بھی بڑا ہے۔ اس لیے آپ جا کر ان کو دارالعلوم لے آیئے۔ میں فوراً ہی ان کے مکان پر گیا اور ان کو منا کر اپنے ساتھ لے آیا اور مہتمم صاحب کے سمجھانے پر طلباء کا داخلہ ہوا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف مولانا ریاست صاحب ضابطے اور اصول کی پابندی میں اتنی سختی کا مظاہرہ فرما رہے تھے کہ میری تحریر کو بھی مسترد کر دیا، لیکن خود ہی دو روز پیشتر یا بعد بحیثیت قائم مقام مہتمم (وہ ایک دن کے لیے قائم مقام مہتمم بنائے گئے تھے) انھوں نے سفارش کی بنیاد پر دو ایسے طالب علموں کا بلند ترقی کے ساتھ منظور کر لیا تھا جو ناکام تھے۔ ایک کے لیے مولانا اسعد صاحب نے سفارش کی تھی اور دوسرے کے لیے ان کے دو دوستوں نے۔ وہ بحیثیت قائم مقام مہتمم خود تو اس کے مجاز ہو گئے لیکن میں نے اگر مجلس تعلیمی کے دیئے ہوئے اختیار کے تحت ناظم مجلس تعلیمی اور معاون مہتمم ہونے کی حیثیت سے کسی شخصی سفارش پر نہیں بلکہ مفاد دارالعلوم کے لیے بنائے گئے ایک ضابطے کے تحت ہمدردان دارالعلوم کی سفارش پر ان کے متعلقین کو ترقی دیدی تو بہت بڑا جرم ہو گیا (مولانا ریاست صاحب نے جن دو طالب علموں کو خلاف ضابطہ ترقی دی۔ ان کے فارم داشتہ بکار آید کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں، جو صاحب دیکھنا چاہیں دیکھ سکتے ہیں) نام نہاد نمائندہ اجتماع میں اس ڈھٹائی کے ساتھ اعلان کرنے کے باوجود کہ ہمارے یہاں کوئی رعایت بیجا اور بے ضابطہ نہیں ہوتی۔ اس اجتماع کے فوراً بعد ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۹۶ھ میں کئی ایسے طالب علموں کو جو امتحان داخلہ میں ابتداءً ناکام ہو گئے تھے سفارش پر داخلہ دیا گیا ہے۔

مولانا اسعد صاحب نے مذکورہ بالا اجتماع میں جو کچھ فرمایا اس میں اظہار غیظ و غضب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انھوں نے مجھ پر متعدد الزامات لگائے ہیں مگر وہ میری عدم موجودگی میں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ بات تو جب تھی کہ وہ مجھے بھی بلا لیتے یا آئندہ کسی موقع پر کسی واقعی نمائندہ اجتماع میں ہم دونوں بیٹھ جائیں اور وہ اپنے الزامات کو دہرائیں۔ انشاء اللہ بروقت ان کے ہر الزام کا ایسا مدلل اور شافی جواب دوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو ضمیر کی آواز پر مجرم سمجھیں گے۔ اتفاق سے وہ مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، مجلس شوریٰ کے کسی ممبر کو کسی ملازم پر ادھر ادھر کے الزام لگانے کا حق نہیں ہے۔ اگر واقعی کوئی ملازم مجرم و خطاکار ہے اور کسی رکن شوریٰ کے علم میں اس کا جرم و قصور آتا ہے تو اس کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ وہ مہتمم کو توجہ دلائے اور مہتمم پہلے اس کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کرے، جواب طلب کرے، اور پھر ضرورت ہو تو مجلس شوریٰ میں اس کی رپورٹ پیش کرے۔ مجلس شوریٰ کا بھی قانون و انصاف کی رو سے یہ فریضہ ہے کہ وہ صرف پیش کردہ رپورٹ کو منظور نہ کرے بلکہ معاملہ کی نوعیت کے پیش نظر اس کی قانونی تحقیقات کرائے اور اس کے بعد کوئی فیصلہ صادر کرے۔ یہ تو اسلام کا ایک معروف طریقۂ عدالت ہے مگر مولانا نے کوئی پروا نہیں کی۔

میرے بارے میں مولانا اسعد صاحب یا ان کے بعض ہمنوا جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس کا تعلق یا تو میری ذات اور میرے مزاج و اخلاق سے ہے یا میری منصبی ذمہ داریوں سے۔ جہاں تک کسی شخص کے مزاج و اخلاق کا تعلق ہے تو عام حالات میں وہ اس کا ایک ذاتی معاملہ ہے، اور اگر منصبی ذمہ داریوں پر اس کا کوئی برا اثر نہ پڑتا ہو تو اس پر کسی کو داروگیر کا حق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بدمزاج، بداخلاق اور مشتعل مزاج ہے تو اس سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے اور اس کو اپنے سے قریب نہ کیا جائے۔ جہاں تک انتظامی خامیوں اور کوتاہیوں کا تعلق ہے تو ان کو چوراہوں پر اور جلسوں میں غیر ذمہ دارانہ طریقے سے بیان نہیں کیا جاتا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق جب ہر منصبدار کے اوپر ایک اعلیٰ منصبدار ہے تو اعلیٰ منصبدار کو ہر وقت اپنے ماتحت کی کوتاہیوں پر نگاہ رکھنی چاہیئے اور بروقت کارروائی کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی ملازم انتظامی امور کی انجام دہی میں جرم، غفلت یا غلط کاری کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا ذمہ دار اعلیٰ نہ اس کو متنبہ کرتا ہے نہ اس سے باز پرس کرتا ہے تو وہ بجائے خود ایک نااہل منتظم اور غلط کار افسر ہے۔ کسی بھی منتظم کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اپنے ماتحت سے بروقت داروگیر کرنے کے بجائے عرصہ کے بعد اس کی کوتاہیوں اور غلط کاریوں کو عوام کے سامنے اس طرح پیش کرے۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب جو میرے ذمہ دار اعلیٰ تھے، اس اجلاس میں موجود تھے اور میرے اوپر لگائے جانے والے الزامات سن رہے تھے، لیکن انھوں نے کسی الزام کی کوئی تردید نہیں کی۔ ان سے میرا سوال ہے کہ اگر یہ الزامات درست ہیں اور واقعی میں نے اپنے تعلیمات کا ناظم اور معاون مہتمم ہونے کے دور میں بہت سی غلطیاں یا بدانتظامیاں کی تھیں تو انھوں نے بروقت میرے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی تھی۔ لیکن اگر یہ الزامات غلط لگائے جا رہے تھے تو کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ وہ ان کی تردید کرتے، خاموش نہ رہتے۔

مولانا اسعد صاحب کے الزامات کا جواب دینے سے پہلے میرا ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ جب میں بقول مولانا اسعد صاحب بدمزاج، سریع الاشتعال، آگ کا کنڈ اور غلط کار تھا اور میں نے جس کام پر بھی ہاتھ لگایا اسے چوپٹ کر کے رکھ دیا، تو پھر اس بدترین کوہ آتش فشاں کو مولانا موصوف جمعیۃ علماء اور دارالعلوم کی خدمت کے لیے کیوں اٹھائے اٹھائے پھرے۔ ایسے شخص کو جمعیۃ علماء کے قریب بھی نہیں آنے دینا چاہیئے تھا چہ جائے کہ اس کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا جائے۔ ایسے بداخلاق و بدمزاج انسان کو عرب ممالک جانے والے جمعیۃ علماء کے وفد کا ادنیٰ رکن بھی نہیں بنانا چاہیئے تھا چہ جائیکہ اسے سربراہ وفد بنایا جائے۔ ایسے بدانتظام شخص کو عربی اخبار کی ادارت کیلئے مجبور کرنا اور چودہ سال تک اس ذمہ داری پر قائم رہنے کے لیے اصرار کرنا۔ پھر اس آگ کے کنڈ کو مرکز دعوت اسلام کا ڈائریکٹر بنا دینا کہاں کی عقلمندی تھی۔ اس "آگ" نے مرکز دعوت اسلام کو جلانے کے بجائے اس سے ستائیس کتابوں کے چراغ روشن کیے ہیں لیکن مولانا اسعد صاحب کی سرد مہری نے ان روشن چراغوں کو گل کر دیا۔ یہ "بدانتظام اور بدمزاج" شخص مولانا اسعد صاحب کی ہر علمی اور عربی ضرورت کے وقت ان کے کام آتا رہا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے تعارف کے کتابچے اور کتابیں بھی لکھتا رہا۔ عرب ممالک کی کانفرنسوں میں پڑھنے کے لیے مقالے لکھ لکھ کر مولانا موصوف کو دیتا رہا اور اپنے ذہین اور باصلاحیت شاگردوں کی خدمات کو معمولی معاوضوں پر ان کے لیے پیش کرتا رہا، اس وقت مولانا اسعد صاحب نے اس "آگ" کی تپش کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر دس سال

پہلے دارالعلوم میں انقلاب برپا کرنے کے لیے مولانا کو اس آگ کی ضرورت پیش آئی تھی تو اسے ہر محاذ پر کیوں آگے کر دیا گیا تھا اور خود کو انتہائی بزدلی کے ساتھ چھپانے کی کوششیں کیوں کرتے رہے تھے پھر اسی بدانتظام اور بدمزاج آدمی کے حوالہ کیمپ کا سارا انتظام کر دیا گیا۔ پھر کیمپ سے دارالعلوم میں منتقل ہونے اور اس پر قبضہ جما لینے کے بعد اس قبضہ کو باقی رکھنے اور دارالعلوم اور طلبا و پر اس رو میں کنٹرول کرنے کے لیے مولانا موصوف اس بدمزاج انسان یا آگ کے کنڈ سے بے نیاز نہ رہ سکے۔

میں نے مولانا کی سیاست اور ذہنیت کو بھانپ کر ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم سے استعفیٰ دیدیا تھا اور دیوبند سے بہت دور چلا گیا تھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جب میں بداخلاق، مشتعل مزاج اور آگ کا کنڈ تھا تو مولانا میرے از خود دفع ہو جانے کو غنیمت جانتے اور بھول کر بھی مجھے بلانے کا نام نہ لیتے۔ لیکن نہ معلوم میری کس خصوصیت یا اپنی کس ضرورت کی بنا پر مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے اصرار کے ساتھ مجھے دارالعلوم بلایا۔ ان کی تحریروں کے عکس انشاءاللہ ایک مستقل کتاب میں شائع کیے جائیں گے۔

بقول مولانا اسعد صاحب میں نے تعلیمات میں، تعمیرات میں، مالیات میں اور ہر چیز میں خرابی اور گڑبڑ پیدا کی، انتظام کا مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، بدمزاجی اور اشتعال انگیزی میری فطرت تھی، تو کیا میری یہ ساری خرابیاں کیمپ کے زمانے میں مولانا پر ظاہر نہیں ہوئی تھیں، جبکہ میں اس کا ناظم اعلیٰ بنایا گیا تھا۔ اگر ہو گئی تھیں تو کیمپ کے بعد مولانا نے اور مجلس شوریٰ نے تعلیمات جیسے اہم شعبہ کی نظامت کی ذمہ داری کیوں میرے سپرد کی، اور بقول مولانا اسعد صاحب جبکہ میں نے تعلیمات کا سارا کام خراب کر دیا تو سزا دینے اور برطرف کرنے کے بجائے مجھے ترقی دے کر معاون مہتمم کے منصب پر کیوں لا کر بٹھایا گیا۔ اور جبکہ میں نے معاون مہتمم بن کر تعمیرات میں، مالیات میں اور ہر چیز میں خرابی ہی خرابی پیدا کی تو مجھے مجلس شوریٰ میں مستقل شرکت کے لیے خصوصی مدعو کا اعزاز کیوں دیا گیا۔ اور ان تمام خرابیوں کے باوجود میرے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا گیا؟ کیا میں اتنے جرائم کے بعد اس قابل تھا کہ مجھے دوبارہ مدرس بنایا جائے؟ سچ تو یہ ہے کہ میرا جرم کم ہے، مہتمم صاحب اور دوسرے اعلیٰ ذمہ داران کا جرم بڑا ہے کہ انھوں نے مفاد دارالعلوم کا کوئی خیال نہیں کیا اور میرے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتی اور میری ناجائز رعایت کی۔ ایسے حضرات بلاشبہ دارالعلوم کے منتظم رہنے کے اہل نہیں ہیں۔ (یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک مدرس معین کی جس کی تدریس میں کوئی کوتاہی نہیں نکالی گئی، تین چار سال اور آٹھ سال پہلے کی مفروضہ مزاجی و انتظامی خرابیوں کو بہانہ بنا کر اسے تدریس سے سبکدوش کیا جائے۔ اس کی تفصیل ابھی آنے والی ہے)۔

مولانا اسعد صاحب کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ میں ہر کام اپنی مرضی سے اور مشورہ کے بغیر کرتا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے ناظم مجلس تعلیمی کی حیثیت سے اور معاون مہتمم کی حیثیت سے جس قدر خدمات انجام دیں وہ شوریٰ کے فیصلوں کے مطابق قانون کے دائرے میں رہ کر انجام دیں۔ مہتمم صاحب جو ذمہ دار اعلیٰ تھے، ان کے اور میرے درمیان مکمل ربط و ضبط تھا، میں نے ہمیشہ ان کی رہنمائی اور مشورے سے کام کیا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے جزوی امور میں میں نے ان سے مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھا اور دارالعلوم کی ضرورت کے تحت بحیثیت قائم مقام مہتمم بروقت فیصلہ کیا۔ اگر میں ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں مہتمم صاحب سے رجوع کرتا تو پھر ان پر کاموں کا وہی بار ہوتا جس سے وہ گھبراتے تھے اور جس کو کم کرنے کے لیے مجھے معاون مہتمم بنایا گیا تھا اور جس کی شکایت انکو اپنے دونوں نائبوں سے تھی۔ اگر ہر جزوی معاملہ میں ان کی اجازت لینی ضروری تھی تو پھر دو نائبوں کے ہوتے ہوئے معاون مہتمم کے منصب پر میرا تقرر فضول تھا۔ میرا تقرر جس پس منظر میں ہوا تھا (حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہ اس کے گواہ ہیں) وہ یہ تھا کہ میں دارالعلوم کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس کے لیے مجھے مہتمم صاحب کی طرف سے اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس زمانے میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے (جو بعد میں انتقال فرما گئے) سخت علیل اور صاحب فراش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے والد ان کے پاس مقیم رہیں۔ انھوں نے چھوٹے بھائی کے ذریعہ میرے پاس پیغام بھی بھجوایا۔ اس لیے مہتمم صاحب کی پریشانی کے پیش نظر میں نے عرض کیا کہ آپ اپنے صاحبزادے کے پاس قیام فرمائیں اور یہاں کے کاموں سے بے فکر رہیں۔ میں اہم امور میں مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے چوتھے پانچویں دن دہلی حاضر ہو جایا کروں گا یا ٹیلی فون پر وقت ضرورت رابطہ قائم کروں گا۔ اس منصوبے کے تحت میں نے تمام کاموں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ جب مہتمم صاحب تشریف لاتے تو ان کو تمام کاغذات تکمیل شدہ ملتے۔ اس طرح ان کی سابقہ شکایت ختم ہو گئی تھی کہ میں آتا ہوں تو فائل ہوں کے ڈھیر میرے سامنے آجاتے ہیں

لیکن انھی دنوں مولانا اسعد صاحب کی جانب سے مہتمم صاحب کو یہ باور کرایا جانے لگا کہ وحیدالزماں آپ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مختار کل بن جائے گا اور آپ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہ رمضان میں مہتمم صاحب نے باوجود اس کے کہ ان کے صاحبزادے بیمار تھے، ۱۷ روز دارالعلوم میں قیام فرمایا اور بقیہ ایام صاحبزادے کے پاس۔ جبکہ اس سے پہلے کے رمضان میں جب میں معاون مہتمم نہیں تھا، اور بقول مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ان کے دو نائب کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے اور ان کے صاحبزادے بھی بیمار نہیں تھے تو وہ تقریباً ۱۸ روز اپنے گھر مقیم رہے اور صرف ایک ہفتہ دارالعلوم میں گزارا تھا۔

ٹیپ ریکارڈ

مولانا اسعد صاحب کی مکمل تقریر ٹیپ شدہ میرے پاس موجود ہے وہ انتہائی جوش اور غیظ و غضب میں بول رہے تھے۔ بات اگرچہ پورے طور پر صاف سمجھ میں نہیں آتی۔ تاہم کوشش کر کے ان کے جملہ الزامات کو قلمبند کیا گیا ہے جن کے جوابات ذیل میں تحریر ہیں۔ اگر وہ حسب عادت اپنی تقریر کے کسی جز سے انکار کریں تو میرے پاس ان کی تقریر کا کیسٹ موجود ہے، اس کو سنا جا سکتا ہے۔

بے حیا الزام تراشی

ان کے کچھ الزامات تو مشخص ہیں جن کا جواب بہ آسانی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ الزامات ایسے مبہم و مضحکہ خیز ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اصل میں تو مولانا اسعد صاحب کے جتنے بھی الزامات ہیں وہ انتظامی امور سے متعلق ہیں۔ اگر یہ الزامات صحیح ہیں تو سوال یہ ہے کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے ایک ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ان کا اظہار کسی بھی موقع پر کیوں نہیں کیا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ بروقت مجھ سے باز پرس کرتے اور میرے خلاف کارروائی کرتے۔ اور اگر غلط ہیں اور یقیناً غلط ہیں تو کیا مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب (جو اس جلسہ میں موجود تھے) کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ ان کی تردید کرتے، اور کیا وہ عنداللہ بری الذمہ ہو سکتے ہیں! دوسرے یہ کہ مولانا اسعد صاحب کو مجھ پر انتظامی معاملات کے تعلق سے کوئی الزام لگانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اور اس لحاظ سے میں ان کے الزامات کا جواب

دینے کا مکلف نہیں ہوں۔ تاہم ازالۂ غلط فہمی کے لیے چند باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

متوازی نظام

مولانا اسعد صاحب کا ایک بڑا الزام یہ ہے کہ میں نے دارالعلوم میں ایک متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور کسی سے مشورہ کیے بغیر اپنی رائے سے جو چاہا تصرف کیا۔ یہ ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ میں نے ضرورت کے مطابق ہر کام مہتمم صاحب کے مشورے اور اجازت سے کیا اور جہاں ان کی اجازت اور مشورے کی ضرورت نہیں ہوئی اور کوئی کام میرے دائرۂ اختیار میں ہوا تو اس کو میں نے از خود انجام دیا۔ مولانا اسعد صاحب کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ مولانا مرغوب الرحمن صاحب کو جو ذمہ دار مہتمم ہیں، مجھ سے متوازی نظام بنانے یا خود رائے ہونے اور غلط تصرفات کرنے کی کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ انھوں نے ہر موقع پر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ البتہ مولانا اسعد صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں اور کھل کر نہیں کہہ سکتے وہ یہ ہے کہ میں ہر کام موصوف سے اجازت لے کر نہیں کرتا تھا۔ ان کا یہ خاص مزاج ہے کہ بظاہر یہ مظاہرہ کریں گے کہ وہ کچھ نہیں ہیں، لیکن درپردہ یہ چاہیں گے کہ ہر کام ان کی رائے اور مرضی کے مطابق ہو۔ مجھ سے اصل شکایت ان کو یہی ہے کہ میں نے نظام دارالعلوم کا پابند ہو کر انصاف کے ساتھ کیوں کام کیا۔ ان کی خواہش کے مطابق کیوں نہیں کیا۔

ایک خلش

ان کے دل کی ایک زبردست خلش جس کا وہ کھل کر اظہار نہیں کر سکتے یہ ہے کہ میں نے ان کے مقرب خاص اور پرائیویٹ سکریٹری مولوی محمود (مرحوم) کو جبکہ وہ دارالافتاء میں محرر تھے، ان کی ایک دفتری خیانت پر بازپرس کر کے حسب ضابطہ معطل کر دیا تھا۔ مولانا کو یہ بات انتہائی ناگوار گزری مگر وہ کھل کر اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ معطلی دستورِ دارالعلوم کے عین مطابق ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ اقدام اس لیے ضروری تھا تاکہ تمام ملازمین پر یہ اثر قائم ہو کہ قانون کی نظر میں مولانا اسعد صاحب کا خاص آدمی بھی دوسرے ملازمین کے برابر ہے۔ میرے اس اقدام کی توثیق مجلس شوریٰ نے بھی کی تھی اور مجھے ہی مرحوم کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کلی اختیار دے دیا تھا۔ میں نے اپنے دور میں اللہ کے فضل سے ایسے تمام ملازمین کو جائز حقوق دلانے کی کوشش کی جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا، نیز باصلاحیت افراد کی حوصلہ افزائی کی اور غلط کار لوگوں کی سرزنش کی۔ الحمدللہ میں نے کسی سے اپنا کوئی ذاتی کام لیا نہ اپنے کسی رشتہ دار یا دوست یا خویش کو دارالعلوم کا ملازم بنایا۔ اس کے علاوہ شعبہ جات کی عمدہ کارکردگی، اوقات کی پابندی، ملازمین کی بروقت حاضری، احکام کی فوری بجا آوری، کاغذات پر کارروائیوں کی فوری تکمیل، الجھے ہوئے معاملات کا حل، نظم الحساب، رقوم کے حسابات کی بروقت وصولی وغیرہ نمایاں انتظامی امور ہیں جو میرے دور میں انجام پائے اور جن کی گواہی دارالعلوم کا ریکارڈ اور ہر خورد وکلاں دے سکتا ہے۔ پھر نہ معلوم مولانا اسعد صاحب کو نظام کی کون سی خرابی نظر آئی جس کو وہ اب تک بیان کر رہے ہیں۔ وہ کسی خرابی کو متعین کیوں نہیں کرتے۔

مبہم الزام

مالیات کے سلسلے میں مولانا اسعد صاحب نے بہت گول مول بات کی ہے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ ان پر مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ میں نے مالیات میں کیا گڑبڑ کی اور کون سی رقم داخلِ خزانہ نہیں ہوئی، اس کی کوئی وضاحت انھوں نے نہیں کی۔ یہ انتہائی لغو اور پُر فریب الزام ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ مولانا مرغوب الرحمن صاحب جو دارالعلوم کے ذمہ دار مہتمم ہیں اس پر سکوت اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اگر مولانا اسعد صاحب کی بات صحیح ہے تو مہتمم صاحب بھی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے مجھ سے دارو گیر کیوں نہیں کی۔ اور اگر غلط ہے، جیسا کہ انھوں نے بعض نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہا ہے تو انھوں نے اس وقت اس کی تردید کیوں نہیں کی۔

تعمیرات

میں نے تعمیرات کے سلسلے میں ہندوستان کے چند علاقوں سے چھ ماہ کے اندر تیرہ لاکھ روپے جمع کیے۔ قاعدے کے مطابق ان کی رسیدیں کاٹی گئیں اور یہ رقم منشی طالب حسین صاحب نائب پیش کار اور قاری فخرالدین صاحب ناظم دفتر تنظیم و ترقی جو وصولیابی میں میرے ساتھ تھے، ان کی تحویل میں رہی۔ پھر دارالعلوم پہنچتے ہی دفتر اہتمام میں محاسبی کے ذمہ دار کے حوالہ کر دی گئی اور داخل خزانہ ہو گئی۔ رسیدوں سے ملان بھی کر دیا گیا اور تمام حسابات بالکل درست رہے۔ تعمیرات پر جو رقم خرچ ہوئی وہ حسب ضابطہ خرچ ہوئی اور اس کے تمام جزوی و کلی حسابات محفوظ ہیں، ان کی ڈپلی کیٹ کاپی آج تک میرے پاس بھی محفوظ ہے۔

اس کے برعکس مولانا اسعد صاحب کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے میرے معاون مہتمم بننے کے بعد دارالعلوم کے خزانے میں یا اس کی تحویل میں باہر سے لائی جانے والی کوئی رقم جمع نہیں کی۔ جبکہ افریقہ سے آنے والے دو مہمانوں نے خود مجھ سے یہ بیان کیا کہ گزشتہ سال ہم نے مولانا اسعد صاحب کو سات لاکھ روپیہ چندہ کرایا تھا اور امسال بھی جوہانسبرگ میں فضلاء و ہمدردانِ دارالعلوم کی میٹنگ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ دارالعلوم کے لیے مالی فراہمی کی جائے، اور ہم سے دارالعلوم کی ضروریات کا جائزہ لینے کیلئے کہا گیا ہے۔

میں نے ان کو دارالعلوم کی ضروریات اور اس کے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم افریقہ میں چندہ کے لیے مولانا اسعد صاحب کو سامنے نہیں رکھنا چاہتے، اس کے لیے دارالعلوم کے کوئی دوسرے دو ذمہ دار وہاں جائیں تو بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ان دو ذمہ داروں کا انتخاب کون کرے گا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم مولانا اسعد صاحب سے اس سلسلہ میں مشورہ کریں گے۔ مولانا اسعد صاحب اس وقت دیوبند میں موجود نہیں تھے البتہ ان کے بھائی مولانا ارشد صاحب موجود تھے۔ اس گفتگو کے بعد مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں سے کوئی رقم آئی یا نہیں۔ لیکن میری موجودگی میں باوجود قلت سرمایہ کوئی رقم وہاں کی نہیں آئی۔

بہرحال مولانا اسعد صاحب نے مجھے پریشان رکھنے کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی مالی تعاون نہیں کیا بلکہ آنے والی رقموں کو بھی باہر سے باہر روک دیا۔ کیونکہ باہر سے آنے والی رقمیں سب انھی کی معرفت آتی ہیں۔ میں مالیات کے باب کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا، لیکن انھوں نے چونکہ مجھ پر مبہم اور بے بنیاد الزام لگایا ہے اس لیے مجھ کو کچھ معمولی سا ذکر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ مالیات کا باب بہت وسیع ہے اور اگر خدانخواستہ اس کی تفصیلات بیان کرنے کی نوبت آئی تو پھر مولانا اسعد صاحب کو شکایت ہوگی کہ یہ مسئلہ کیوں اٹھایا گیا۔

چندہ کرنا

مولانا اسعد صاحب نے ہندوستان سے میرے چندہ کرنے کے پروگرام کو بھی بڑی نگاہ سے دیکھا اور بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس میں بھی اڑچنیں پیدا کیں۔ مثال کے طور پر مولانا بدرالدین صاحب آسامی فاضل دارالعلوم تاجر عطریات بمبئی نے دارالعلوم کی ہمہ جہت ترقیات اور میری انتھک محنت کو دیکھ کر اس بات کی خواہش ظاہر کی اور دعوت دی کہ میں بمبئی آؤں اور وہاں مالیات کی فراہمی کی جائے۔ میں بمبئی گیا تو وہاں تاجروں کی میٹنگ میں یہ بات طے پائی کہ دارالعلوم کی تعمیرات کے لیے کم از کم ۲۰ لاکھ چندہ فراہم کیا جانا چاہیے۔ اسی مجلس میں ایک مفتی منزل (اعظم گڑھ کے لوگوں کی جانب سے) اور ایک آسامی منزل (آسامی تاجروں کی جانب سے) بنانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں مجھ سے کہا گیا کہ اس فراہمی کیلئے آپ کو دس پندرہ دن بمبئی میں رہنا ہوگا۔ مجھے چونکہ پروگرام کے مطابق فوراً ہی راجستھان کا دورہ کرنا تھا اس لیے طے پایا کہ وہاں سے فارغ ہو کر بمبئی آؤں۔ اسی دوران مولانا اسعد صاحب باہر سے بمبئی پہنچے۔ ان کو میری آمد اور چندہ فراہمی کے پروگرام کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گئے اور انہوں نے فوراً ہی ایک خوبصورت چال یہ چلی کہ لوگوں سے کہا کہ تعمیرات کے لیے چندہ تو اور جگہوں سے بھی ہو جائے گا، بمبئی سے صرف مسجد کے لیے چندہ ہونا چاہیے اور اس کے لیے ارکان شوریٰ کا ایک مؤقر وفد آنا چاہیے۔ مولانا اسعد صاحب کی سیاست کو لوگ نہیں سمجھ سکے اور ان کی یہ تجویز مان لی گئی۔ مولانا اسعد صاحب نے وفد کی تشکیل اس طرح کی کہ اس میں اپنے ساتھ مولانا مرغوب الرحمن صاحب کو زور دے کر شامل کیا (حالانکہ ان دنوں ان کے صاحبزادے سخت بیمار اور موت و حیات کی کش مکش میں تھے) تیسرے ممبر مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری رکن شوریٰ کو خاص طور پر اس لیے لیا گیا کہ بمبئی میں ان کا حلقۂ اثر وسیع ہے۔ اور چوتھا ممبر حاجی علاؤالدین صاحب (مرحوم) (رکن شوریٰ) کو بنایا گیا جن کے اثرات اپنی مخصوص تاجرانہ (چلکا) برادری میں تھے۔ مجھے وفد سے کاٹ دیا گیا۔ جب یہ وفد بمبئی پہنچا اور لوگوں نے میرے بارے میں سوال کیا تو مولانا اسعد صاحب نے برجستہ یہ کہہ دیا کہ وہ بیمار ہیں۔ اس طرح دو مرحلوں میں بمبئی سے مسجد کے لیے چندہ کیا گیا جو مجموعی طور پر ۱۸ لاکھ ہوا۔

مجھے دارالعلوم میں تعمیراتی کاموں کی تکمیل میں پریشانیاں پیش آئیں کیونکہ میں مولانا بدرالدین صاحب کی یقین دہانی پر کئی لاکھ کا ادھار سامان لے کر تعمیر شروع کرا چکا تھا۔ مسجد کے نام پر حاصل ہونے والی رقم دارالعلوم کی دیگر ضروریات پر خرچ نہیں ہو رہی کیونکہ دارالعلوم کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ مجھے تعمیرات کے سلسلے میں پھر اسفار کرنے پڑے۔ میں دوبارہ بمبئی گیا اور ذاتی تعلقات کی بنیاد پر معمولی مشقت سے ہی ڈیڑھ لاکھ روپیہ جمع کیا۔

میں بمبئی سے مالیگاؤں گیا۔ وہاں فضلائے دارالعلوم نے فراہمی مالیات کے لیے ماحول سازگار کیا اور امید تھی کہ دو تین روز میں ڈھائی تین لاکھ روپیہ وصول ہو جائے گا۔ لیکن وہاں مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمن صاحب کی مدراس سے خط پہنچا کہ ارکان شوریٰ کا وفد فراہمی مالیات کے لیے مالیگاؤں آرہا ہے۔ میں نے یہ سن کر خود چندہ کرنا ملتوی کر دیا۔ اس خیال سے کہ اگر میں نے تین لاکھ رقم بھی وصول کر لی تو مولانا اسعد صاحب مجھ پر الزام لگائیں گے کہ ہم لوگ تو مالیگاؤں سے دس لاکھ جمع کرتے، وحیدالزماں نے صرف تین لاکھ وصول کیے۔ مولانا عبدالقادر صاحب رکن شوریٰ اور حاجی مصطفےٰ صاحب نے میری اس رائے کو پسند کیا، لیکن فضلائے دارالعلوم کو اس پر کافی رنج و ملال ہوا اور ان کا اصرار تھا کہ میں رکوں اور چندہ جمع کیا جائے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی اور بمبئی واپس آ گیا۔ ارکان شوریٰ کا وفد مالیگاؤں نہیں پہنچ سکا۔ اور نہ کوئی دوسرا شخص وہاں پہنچا، نتیجہ یہ ہوا کہ سخت ضرورت کے باوجود دارالعلوم مالیگاؤں کے اصحاب خیر کی رقم سے محروم رہا۔ مولانا اسعد صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ چندہ کرنے کا کریڈٹ کسی طرح مجھ کو (وحیدالزماں کو) حاصل نہ ہو تاکہ ان کی شخصیت چندہ کے سلسلے میں محتاج الیہ بنی رہے۔ حالانکہ میرا مقصد کریڈٹ حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ میں صرف دارالعلوم کا تعمیراتی کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اگر مولانا اسعد صاحب نیک نیت ہوتے تو وہ میرے ساتھ اس طرح تعاون کر سکتے تھے کہ مجھے پریشان کرنے کے بجائے مالیات کی فراہمی کا ذمہ لیتے اور مجھے یکسو ہو کر دارالعلوم میں کام کرنے کا موقع دیتے۔ اس واقعہ کے بعد میرا دل ٹوٹ گیا اور میں نے چندہ کے لیے سفر کرنا بند کر دیا۔

خام تعمیرات

تعمیرات کے سلسلہ میں مولانا اسعد صاحب نے میرے خلاف ہند و بیرون ہند میں بے انتہا پروپیگنڈہ کیا ہے۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ میں نے کچی عمارتیں بنائیں اور یہ کہ وہ سب کسی نقشے اور منصوبے کے بغیر تعمیر ہوئیں، جبکہ یہ دونوں الزام بھی سراسر غلط ہیں۔

میرے معاون مہتمم بننے کے فوراً بعد مولانا مرغوب الرحمن صاحب نے مجھ سے احاطۂ دفتر میں زینے بنانے کے لیے کہا۔ میں نے اس کام کا آغاز کیا۔ دو زینے اور گیلری توڑ کر ایک بڑا ہال تیار کیا گیا۔ اس کے بعد برقیات کے دفتر سے احاطۂ کتب خانہ میں جانے کا راستہ بنایا گیا اور پھر دار جدید میں پہنچنے کے لیے دار جدید کے کمرے میں سے راستہ نکالا گیا۔ یہ سب تعمیرات مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے مشورے اور اجازت سے ہوئیں۔ اس کے بعد رواق خالد کی بالائی منزل، جامعہ طبیہ کے میدان پر قبضہ کرنے کے لیے چہار دیواری بنانے کا کام اور دوسرے چھوٹے اور بڑے تعمیراتی کام مولانا موصوف ہی کے مشورے سے ہوئے۔ جامعہ طبیہ سے ملحق میدان کی نوعیت غیر واضح سی تھی، میں نے مولانا مرغوب الرحمن صاحب کی اجازت اور مشورے سے وہاں چہار دیواری بنوائی تاکہ اس میدان پر دارالعلوم کا قبضہ مکمل ہو جائے۔ چونکہ دارالعلوم کے پاس روپیہ نہیں تھا اس لیے میں نے عارضی احاطہ کے طور پر پرانے ملبے سے جو ادھر ادھر سے اکٹھا کیا گیا تھا کم پیسوں میں یہ کام کرا دیا۔ کیونکہ اصل مقصد اس میدان پر دارالعلوم کا قبضہ مکمل کرنا تھا۔ اس چہار دیواری اور دروازے کی تعمیر کے دوران ملحقہ زمینوں کے مالکان سے کچھ جھگڑا بھی ہوا، کچھ لوگ میرے مکان پر بھی چڑھ آئے، لیکن کسی طور سے معاملہ کو سلجھا کر دارالعلوم کا قبضہ نمایاں کر دیا گیا۔ سہارنپور روڈ سے متصل جو دروازہ بنایا گیا وہ بھی چونکہ تالاب کی جگہ تھی اور وہاں ہمیشہ پانی بھرا رہتا تھا اس لیے اس کی بنیاد کے قریب جو بھراؤ کیا گیا تھا وہ مٹی کے بجائے بڑلودکی راکھ سے کر دیا گیا جس کی وجہ سے پانی جذب نہیں ہو سکا ۔۔۔ اس کی روک تھام کے لیے ۔۔۔ کوٹھریاں بنا دی گئیں۔ یہ کوئی جرم یا کوئی سنگین غلطی نہیں جس پر پروپیگنڈہ کیا جائے۔ بڑے بڑے انجینئروں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ جمنا پر بنے ہوئے ایک نئے پل کے دائیں اور بائیں کنارے ۔۔۔ گر گئے ہیں اس پر کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی۔ دارالعلوم کی مالیہ زیر تعمیر مسجد، جس کی تعمیر میں میرا کوئی دخل نہیں رہا ہے اور جو فولاد کی طرح مضبوط بنائی جا رہی ہے) کی جس جگہ محراب ہے وہاں بھی باوجود تمام تر چوکسی کے ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا جس کو مستری ریاض الدین نے عجلت تمام یا پیہم ۔۔۔ کر کے پُر کیا، اس پر بھی کوئی ہنگامہ نہیں مچایا گیا، نیز سطور زیر قلم بند کرتے وقت ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک دیوار میں ایسی کمزوری پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کافی نقصان ہوا ہے۔ الحمد للہ میری کمزور عمارتیں اب تک محفوظ ہے۔

گاڑے کی عمارت

یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ دارالعلوم کی تمام عمارتیں گارے ہی کی بنی ہوئی ہیں۔ اندر گارا ہے اور باہر لال چونا لگا ہوا ہے۔ اس کو پتی کی چنائی کہتے ہیں۔ جس عمارت کو چاہیں کھود کر دیکھ لیں۔ اس کے اندر گارا ہی ہے۔ قصبات میں عام طور پر تین تین چار چار منزلہ عمارتیں گارے ہی سے بنتی ہیں اور ان کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میں نے گارے کی چنائی کے بعد دونوں طرف پلاسٹر بھی کرا دیا تھا۔ پھر یہ گارے کی چنائی میں نے چھپ کر نہیں بلکہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے علم میں نا کر کرائی اور انھی سے ہر عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھوایا۔ جامعہ طبیہ سے ملحق میدان میں مدرسین کے مکانات کا سنگ بنیاد مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور مولانا اسعد صاحب سے رکھوایا گیا تھا اور ان کے سامنے بھی گارے کی چنائی ہو رہی تھی۔ اگر ان کے گارے کی چنائی ناپسند تھی یا کمزور تھی تو سیمنٹ کی کرا دی جاتی یا اس سے بھی زیادہ پختہ کرا دی جاتی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے اگر گارے کی چنائی کرائی تو اس کی سب سے بڑی وجہ روپئے کی کمی تھی۔ میں کم خرچ پر فوری ضروریات کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔

بے نقشہ کی تعمیر

یہ بھی غلط ہے کہ ان عمارتوں کا کوئی نقشہ نہیں بنوایا گیا۔ ان سب عمارتوں کے نقشے باضابطہ طور پر سہارنپور کے ایک آرکیٹکٹ نفیس صاحب سے بنوائے گئے جو دفتر اہتمام کی الماری میں محفوظ تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی غلط ہے کہ تعمیرات کے لیے کوئی کمیٹی بنائی گئی تھی اور میں نے اس کو توڑ دیا۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے مجلس شوریٰ میں تعمیرات کے لیے ایک کمیٹی بنائے جانے کی تجویز پیش کی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ تعمیروں کے لیے کمیٹیاں بنتی ہیں عام طور پر ان کی تکمیل میں دیر ہوتی ہے۔ مجلس شوریٰ نے اس وقت کمیٹی نہیں بنائی تھی۔

پہلا حملہ

یہ پہلی مجلس شوریٰ تھی جس میں مولانا اسعد صاحب بحیثیت ممبر شریک ہوئے تھے اور پہلے ہی اجلاس میں انھوں نے مجھ پر دو حملے کیے تھے۔ ایک میرے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کرنا اور دوسرے مجلس کے اخیر میں اس عنوان سے کہ مولانا بیمار رہتے ہیں، مجھ سے نظامت تعلیمات لے کر مولانا ریاست علی صاحب کو اس کا ذمہ دار بنانا؛ جس پر میں نے کہا تھا کہ آپ میری بیماری کا عنوان نہ لگائیے۔ میں اہتمام کی ذمہ داریوں کے ساتھ تعلیمات کی ذمہ داریوں کو مولانا ریاست صاحب کے تعاون سے بسہولت انجام دے رہا ہوں۔ میں نے اسباق اور تعلیم کے نظام پر بحمداللہ پوری طرح قابو پا لیا ہے اور جملہ تعلیمی امور بحسن وخوبی انجام پا رہے ہیں۔ تعلیمات میں جو کوتاہیاں ہوتی تھیں الحمدللہ وہ سب دور کر دی گئی ہیں۔ میری علاحدگی کے بعد مولانا ریاست علی صاحب اس نظام پر پوری طرح قابو نہ پا سکیں گے اور پھر وہی سابقہ اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔ لیکن مجلس نے مولانا ریاست صاحب کو ناظم بنا دیا۔

اسی روز شب میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مولانا اسعد صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے اور انھوں نے مولانا اسعد صاحب سے کہا کہ وحید الزماں آپ کا حامی اور آپ کی ممبرشپ کے لیے کوشاں رہا ہے، مگر آج آپ نے بیٹھتے ہی دو باتیں ایسی کیں جو آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ اس پر مولانا اسعد صاحب نے اقرار کیا کہ ہاں مجھے بھی بعد میں اس کا احساس ہوا۔ اور اپنی اس غلطی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں جب شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند پہنچا تو لوگوں نے (جو مولانا اسعد صاحب کے چند حاشیہ نشین سمجھے جاتے ہیں) ایسی غلط اطلاعات مجھ تک پہنچائیں جن سے میں متاثر ہو گیا۔ یہ واقعہ خود مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ غالباً انھیں ابتک یاد ہوگا۔

غبن

مولانا اسعد صاحب نے انتہائی جسارت سے کام لیتے ہوئے خلاف حقیقت مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میرے زمانے میں ایک لاکھ پینتیس ہزار کا غبن ہوا اور متعلقہ محرر نے اسکے نتیجہ میں خودکشی کر لی۔ گویا غبن کا بھی میں ذمہ دار ہوں اور خودکشی کا بھی میں ہی ذمہ دار ہوں۔ مولانا اسعد صاحب کو پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ مہتمم کی موجودگی میں انتظامی اچھائیوں یا خرابیوں کی نسبت صرف انھی کی طرف ہوگی یا ان کے ماتحت کی طرف بھی۔ اگر جملہ ترقیات کی نسبت بحیثیت ذمہ دار اعلیٰ مہتمم کی طرف ہوگی، تو انتظامی خرابیاں بھی ذمہ دار اعلیٰ ہی کی طرف اور اسی کے دور سے منسوب ہوں گی۔ ماتحت کا دور، دور نہیں کہلاتا۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ غبن کا یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جبکہ شعبۂ محاسبی سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا اسعد صاحب نے ممبر شوریٰ بننے کے بعد میرے اثرات کو کم کرنے اور میرے دائرۂ اختیار کو محدود کرنے کے لیے اپنی عادت کے مطابق بڑی ہوشیاری اور بڑے خوبصورت عنوان سے دارالعلوم کے انتظامی شعبہ جات تقسیم کرا دیئے تھے۔ جس کے بعد طلباء سے متعلق اہم اور حساس شعبے مولانا نصیر احمد خاں صاحب کو دیئے گئے۔ چند غیر اہم شعبے میرے حوالے کیے گئے اور شعبۂ محاسبی (اکاؤنٹ سیکشن)، شعبۂ اوقاف اور اہتمام خصوصیت کے ساتھ مہتمم صاحب کی نگرانی میں دیئے گئے۔ حالانکہ سارے ہی شعبے مہتمم صاحب کے ماتحت تھے لیکن اصل مقصد مجھ کو بے دخل کرنا تھا۔ اس تقسیم شعبہ جات کے چند ماہ کے بعد مذکورہ غبن کا واقعہ پیش آیا جبکہ شعبۂ محاسبی میں میرا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ وہ براہ راست مہتمم صاحب کی نگرانی میں تھا۔ اور انھوں نے مجلس شوریٰ میں اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ بھی پیش کرنے کو کہا تھا۔ یہ کس قدر دیانت کے خلاف بات ہے کہ اس غبن کو میری طرف منسوب کر دیا جائے۔ یہ زبردست اور شرمناک مغالطہ آمیزی اور افترا پردازی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور افسوس اس کا ہے کہ مہتمم صاحب نے بھی دانستہ اس سے خاموشی برت کر اس میں شرکت کر لی ہے۔

پھر اس کے بعد ۱۲ر جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں کی گئی پریس کانفرنس کے دوران مولانا اسعد صاحب اور مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے انتہائی مغالطہ آمیزی کے ساتھ میرے دور کے بجائے براہ راست مجھ پر ہی اس غبن کا الزام لگا دیا جس کو ہندوستان کے کئی اہم اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور آج تک اس کی کوئی تردید نہیں کی گئی۔ کیا یہ صریح کذب بیانی اور مجھ کو بدنام کرنے کی منصوبہ بند سازش نہیں ہے؟ جبکہ ایک ایجنسی کے نمائندے کے سوال پر (جو دارالعلوم آیا تھا) مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے صاف انکار کیا کہ ہم نے مولانا پر غبن کا کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔

تخمینہ

مولانا نے ایک بات یہ کہی ہے کہ میں نے دارالعلوم کی مسجد کے مصارف کا تخمینہ پہلے دس لاکھ بتایا اور دوبارہ بیس لاکھ بتایا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح بھی مان لی جائے تو اس سے کونسا جرم ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی مسجد کے سلسلہ میں ہر دفعہ شوریٰ میں بحث ہوتی تھی لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا، نہ جگہ کا تعین ہوتا تھا نہ اس بات کا کہ کتنی بڑی مسجد بنائی جائے۔ میں نے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے مشورے سے اس جگہ پر بورڈ لگوا دیا جہاں اب مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں رد و قدح ختم ہو گئی اور جگہ متعین ہو گئی۔ یہ اب سے پانچ سال

پہلے کی بات ہے۔ اس وقت دو ہزار نمازیوں کے بقدر مسجد بنانے کا پروگرام تھا اور اس کی لاگت کا تخمینہ چالیس لاکھ روپے تک تھا۔ میں نے دس لاکھ پہلے مرحلے کے لیے اور بیس لاکھ دوسرے مرحلے کیلئے متعین کیے تھے۔ اور یہ ساری بات باہمی مشورے سے طے ہوئی تھی کہ ایک دم بڑی رقم مانگنے سے لوگوں کو وحشت ہوگی اس لیے مرحلہ وار رقم فراہم کی جائے۔ چنانچہ اس سے قبل باہر کے ایک عرب دارالعلوم آئے ان کے سامنے مسجد کا نقشہ پیش کیا گیا اور ایک بڑا تخمینہ سامنے رکھا گیا جو ایک کروڑ کے قریب تھا تو انھوں نے کہا کہ اتنی بڑی رقم تو کوئی سربراہ مملکت ہی دے سکتا ہے۔ یہ میرے امکان سے باہر ہے۔ اگر اس وقت ایک کروڑ کے بجائے ان سے دس لاکھ کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ شاید اسی وقت دیدیتے۔ اس تجربہ کی بنا پہ مرحلہ وار چندے کی اپیل کی گئی تھی۔ اُس موقع پر جو پمفلٹ شائع کیا گیا تھا اس میں "پہلے مرحلے" کی صراحت کی گئی تھی اور وہ شاید دارالعلوم کے ریکارڈ میں اب بھی موجود ہوگا۔ یہ بات میں مولانا اسعد صاحب کو مجلسِ شوریٰ میں زبانی بھی بتا چکا ہوں۔ مگر وہ برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔

مشتعل مزاجی

مولانا اسعد صاحب اپنی تقریر کے دوران کبھو انتظامی امور کے تعلق سے الزامات لگاتے ہیں اور کبھی ایک دم ذاتیات اور "مزاجیات" پر پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں میری مشتعل مزاجی کے ثبوت کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جو کہ مکہ مکرمہ میں ایک دعوت کے دوران میرے رفیق سفر مولانا فصیح الدین دہلوی کے ساتھ پیش آیا تھا جس میں مولانا اسعد صاحب کے بقول میں ایک ذرا سی بات پر مولانا فصیح الدین صاحب پر برس پڑا تھا اور یہ کہا تھا کہ "تم نہیں جانتے، میں آگ ہوں آگ"۔ مولانا اسعد صاحب نے اس واقعہ کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اس کی حکایت میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اس کو بڑے بھیانک اور بھونڈے انداز میں پیش کیا ہے۔ میرے رفیق سفر مولانا فصیح الدین صاحب سے اس کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر میں اپنی بدمزاجی کا اظہار میزبان کے سامنے کرتا تو وہ یقیناً قابل مذمت بات تھی، لیکن اگر میں اپنے رفیق سفر سے کسی بات پر اظہار ناگواری کردوں تو یہ میرا ان کا ذاتی معاملہ ہے اور کوئی قابل مذمت بات نہیں ہے۔ اس طرح کے فضول واقعات اور بے بنیاد باتوں کا ذکر کرنا جن سے نہ کوئی جرم ثابت ہوتا ہو اور نہ کوئی حقیقت سامنے آتی ہو، میں قطعاً مناسب نہیں سمجھتا، لیکن جبکہ مولانا اسعد صاحب اس نچلی سطح پر اتر آئے ہیں تو جواباً میں بھی ان کا صرف ایک واقعہ ذکر کر دیتا ہوں جو یقیناً ان کی "خوش اخلاقی" کا بھرم کھول دے گا۔ یوں تو میزبانوں کے ساتھ ان کی بداخلاقی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔

غالباً ۱۹۸۸ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں اور مولانا اسعد صاحب راجستھان کے سردار شہر پہنچے۔ لوگوں نے شہر کے باہر سے مدرسہ تک لے جانے کیلئے استقبالیہ گرائیں سجائی تھیں اور وہ ہمیں اعزاز کے ساتھ ان گرایوں سے گزار کرلے جانے کے خواہشمند تھے۔ مولانا اسعد صاحب جو پیر اور دیوبندی عالم ہونے کے باوجود بڑے شوق اور ترکیبوں سے اخبارات میں اپنی تصویریں چھپواتے اور اپنا پروپیگنڈہ کراتے ہیں، کبھی کبھی دکھانے کے لیے بڑی سادگی اور تصوف کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس روز بھی انھوں نے میزبانوں کو بری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ سب کے سب دل مسوس کر رہ گئے اور مولانا موصوف چہرہ بگاڑتے ہوئے انتہائی انقباض کے عالم میں دوسرے راستے سے مدرسہ پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی کہا: "پروگرام بتائیے کیا ہے؟" لوگوں نے پروگرام بتایا۔ پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور ناشتہ کا سامان آنے لگا۔ بڑے غصہ سے کہنے لگے: "یہ ناشتہ کیسا! ناشتہ تو آپ نے پروگرام میں بتایا نہیں!" اٹھ کر جانے لگے کہ میں ناشتہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ پروگرام میں شامل نہیں۔ ہر چند لوگوں نے خوشامد کی لیکن وہ نہ مانے اور انتہائی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ بالآخر میں نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ان کو ناشتہ کیلئے آمادہ کیا۔ بتائیے کیا یہ بدمزاجی اور بدخلقی نہیں ہے؟ یہ واقعہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اسباق

مولانا اسعد صاحب نے مجھ پر ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ میں دارالعلوم میں صرف ایک دو سبق پڑھاتا تھا۔ اس کے بارے میں میں پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں کہ تعلیمات کی جانب سے مجھے صرف دو سبق دیئے گئے تھے اور میں اس کے مطابق پڑھاتا تھا۔ ان دو اسباق میں ایک تکمیل ادب سال دوم کا تھا جس کا کوئی مستقل گھنٹہ نہیں ہوتا۔ اور میں اس میں حسب ضرورت زیادہ وقت بھی لگاتا اور مشق کراتا تھا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ سال کی بات ہے کہ میں نے خود یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میرے پاس صرف دو گھنٹے ہیں اور طلباء مجھ سے انفرادی طور پر عربی پڑھنے کے لیے کہتے رہتے ہیں، اپنے ایک قدیم تعامل کے مطابق بعد نماز مغرب ایک جماعت کو پڑھانے کا اعلان کیا۔ اس کے لیے ساڑھے تین سو درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان طلباء کی صف بندی کے لیے میں نے مولانا قاری محمد عثمان صاحب کو (جو اس وقت نائب ناظم تعلیمات تھے) متعین کیا۔ انھوں نے ایک "صف ثالث" بنا کر میرے حوالے کی۔ میں نے تعلیمات کے زیر انتظام سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ میری جماعت میں اتنی طالب علم موقوف علیہ (دورۂ حدیث سے پہلے کا سال) کے تھے۔ میں نے دارالحدیث میں سبق کا آغاز کیا تو تمام دارالحدیث بھر گئی۔ اور ایک ہفتہ تک ... طلباء شریک درس ہوتے رہے۔ میں نے ان طلباء کو عربی کے ایسے بنیادی اصول بتا دیئے کہ اگر وہ ان پر عمل پیرا ہو کر صرف مطالعہ کرتے رہیں تو ان کو عربی زبان سے ایک حد تک واقفیت ہو جائے۔ میرے اس سبق کی مقبولیت کو دیکھ کر منتظمین دارالعلوم خوش ہونے کے بجائے پریشان ہو گئے اور اگلے ہی ہفتہ "سراجی" کے سبق کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ میری جماعت میں اکثر طلباء "سراجی" میں شریک ہونے والے تھے، اس لیے قصداً ایسا کیا گیا، ورنہ یہ سبق ہمیشہ سال کی دوسری سہ ماہی میں ہوا کرتا تھا۔ میں نے طلباء کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ سراجی کے سبق میں شریک ہوں اور میرا سبق چھوڑ دیں۔ حالانکہ ناظم تعلیمات کا یہ فرض تھا کہ جب میرا سبق ضابطہ میں آچکا تھا تو وہ اس ٹکراؤ کو ختم کرتے اور اس کا حل نکالتے۔ لیکن انھوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ اسی سال شعبان میں منعقد ہونے والی شوریٰ کے اجلاس میں مولانا اسعد صاحب نے مجھ پر ڈسپلن شکنی کا الزام لگاتے ہوئے میرے اس سبق کو بھی جرم قرار دینے کی کوشش کی۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ یہ مجھے بے طرف سے پریشان کرنے اور بدنام کرنے کی سوچی سمجھی اسکیم نہیں تو اور کیا ہے! میں پڑھانا چاہتا ہوں تو پڑھانے نہیں دیا جاتا، اور خود ہی گھنٹے کم دیتے ہیں تو اس کی بنیاد پر میرے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔

"اگر دیانت و امانت نام کی کوئی چیز منتظمین کے یہاں باقی ہے تو وہ میرا سال گزشتہ کا تعلیمی ریکارڈ دیکھیں۔ رجسٹر حاضری اٹھا کر دیکھیں کہ میں نے کتنی پابندی کے ساتھ اپنا کام انجام دیا ہے۔ طلبۂ تکمیل ادب سے میرے مضمون کے متعلق معلوم کریں کہ ایک گھنٹے میں میں نے ان کو کیا دیا ہے اور دوسروں نے کیا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ تکمیل ادب کے بعض دوسرے اساتذہ کے رجسٹر بھی ملاحظہ کیے جائیں اور طلباء سے بھی تحقیق کی جائے کہ انھوں نے سال بھر میں کتنے مہینے تعلیم دی۔

اگر بفرض محال میری حاضری پوری نہیں تھی تو میرے مضمون کیسے داخل امتحان کر لیا گیا اور

مولانا وحید الزماں کیرانوی

مجھے کس قانون اور کس رعایت کے تحت تنخواہ دی جاتی رہی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دارالعلوم کا موجودہ انتظامی ڈھانچہ بالکل بیکار اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ جب میرے ساتھ یہ غیر ذمہ دارانہ معاملہ ہے اور دارالعلوم کے معاملہ میں کھلی مداہنت سے کام لیا جا رہا ہے تو نہ معلوم اور کتنے مدرسین کے ساتھ یہ ڈھیل برتی جاتی ہوگی۔ مجلس شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ ایسے متعلقین کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرے جو اپنے ماتحتوں سے فرائض منصبی میں ان کی کوتاہیوں پر دارو گیر کرنے کے بجائے چوراہوں پر اور جلسوں میں اُن کی بُرائی اور مذمت کرتے ہیں۔

نازیبا سلوک

مولانا اسعد صاحب نے انتہائی بھیانک اور وحشت ناک انداز میں بعض ممبرانِ شوریٰ کے ساتھ میرے نازیبا سلوک کا ذکر کیا ہے؛ حالانکہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جس طرح مشورہ کی مجلسوں میں عام طور پر کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے دوران اختلاف رائے کے واقعات پیش آتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں کچھ تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میں نے بھی شوریٰ کے بعض جلسہ میں کسی مسئلہ پر بعض ممبران سے اختلاف کیا۔ یہ نہ تو کوئی انوکھی بات ہے اور نہ ہی کوئی سنگین جرم۔ مجلس شوریٰ میں اختلاف رائے کا پیدا ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی روایت رہی ہے کہ اس میں اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ہوتی ہے اور ہر شخص اپنی رائے کھل کر پیش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا اسعد صاحب کے ممبر شوریٰ بننے کے بعد سے یہ روایت دم توڑتی نظر آ رہی ہے اور اب شوریٰ میں مولانا اسعد صاحب کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اپنی ہی رائے پر اصرار کرتے ہیں اور اسی کو دوسروں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم ممبران گرامی قدر جنھوں نے آزادیٔ خیال کا دور دیکھا ہے، شوریٰ کے جلسوں میں شرکت کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر شرکت کرتے بھی تو مولانا اسعد صاحب کی انانیت، خود سری اور ہٹ دھرمی سے ملول اور رنجیدہ ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ اگر مولانا اسعد صاحب کو اختلاف رائے اس قدر ناپسند ہے تو انھیں مجلس شوریٰ کا نام "تائیدی مجلس" رکھ لینا چاہئے اور یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ اس مجلس کا کام دارالعلوم کے مسائل پر بحث و مباحثہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی مرضی اور ان کی پیش کردہ رائے کی تصدیق و توثیق کرنا ہے۔

حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی مدظلہ کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ احقر سے ایک مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا جس کے نتیجہ میں دونوں طرف سے کچھ نرم و گرم باتیں ہوئی تھیں؛ لیکن چونکہ قاضی صاحب موصوف ایک عالی ظرف اور کشادہ قلب انسان ہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اس طرح کے جلسوں میں اختلاف رائے ایک ناگزیر امر ہے اور یہ کہ آزادیٔ فکر و خیال مجلس شوریٰ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کو کسی قیمت پر ضائع نہیں ہونے دینا چاہئے۔ اس لیے حضرت قاضی صاحب نے میری تیز گفتگو کا کوئی اثر نہیں لیا اور اسی مجلس میں مجھ سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "بھئی! ہم دونوں ہی ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں"۔ اس کے بعد حضرت قاضی صاحب کے دل میں کوئی بات نہیں رہی اور ان کا مشفقانہ برتاؤ بدستور میرے ساتھ قائم ہے۔

اسی طرح ایک بار مخدومی جناب نواب عبید الرحمٰن خاں شیروانی مدظلہ نے بھی احقر سے کسی بات پر اختلاف فرمایا اور اس سلسلہ میں کچھ گرما گرم بحث ہوئی، لیکن نواب صاحب موصوف اس قدر شریف النفس اور متحمل مزاج انسان ہیں کہ اسی دن شام کو مولانا اسعد صاحب کے مکان پر ممبرانِ شوریٰ کی ایک دعوت کے دوران جب انھوں نے مجھے دیکھا تو والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس پڑھتے ہوئے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اگلے دن صبح کو فجر کی نماز کے بعد وہ تنہا مجھ ناچیز کے غریب خانے پر تشریف لائے، چائے نوش فرمائی اور کہا کہ "آپ اپنا دل صاف کرلیں میرے دل میں آپ کی بہت قدر ہے"۔ میں نے ان کی اس نوازش اور عالی ظرفی سے زیر بار ہوتے ہوئے عرض کیا کہ "آپ میرے بڑے ہیں، مجھ سے جو تکلیف پہنچی ہو اس کو معاف فرمائیں"۔ الحمدللہ اس کے بعد ان سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کا دل صاف نظر آیا۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جن حضرات کے ساتھ یہ واقعات پیش آئے تھے انھوں نے تو اپنی فراخدلی اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے فوری طور پر سب کچھ بھلا دیا اور کبھی بھولے سے بھی ان واقعات کو زبان پر لانا گوارا نہیں کیا۔ لیکن مولانا اسعد صاحب جو دوسروں کو بھی کینہ پروری، تنگ نظری اور منتقم مزاجی میں اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں آج تک ان باتوں کا عوامی محفلوں میں انتہائی مکروہ انداز میں پروپیگنڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی کہ مولانا اسعد صاحب کو جب میری گردن زدنی کے لیے کوئی واقعی جرم نظر نہیں آیا تو وہ اس طرح کی پرانی باتوں کو بھونڈے اور مغالطہ آمیز شکل میں پیش کر کے مجھ کو بدنام اور شوریٰ کے موقر ممبران کو مجھ سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں! کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ امیر الہند جیسے مقدس منصب کے دعویدار محض اپنی انتقامی ہوس کو غذا دینے کیلئے ایسے اوچھے اور گھناؤنے ہتھکنڈے بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

تیسرا واقعہ خود مولانا اسعد صاحب کے ساتھ پیش آیا، اور دراصل یہی وہ واقعہ ہے جس کی وجہ سے وہ ممبران شوریٰ کے ساتھ میری بدسلوکی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں؛ لیکن خود اپنا حوالہ دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے دیوبند کے رہنے والے ایک فاضل دارالعلوم کا جو جامعہ طبیہ دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں۔ جامعہ طبیہ کے شعبۂ معالجہ میں عارضی تقرر کر دیا تھا۔ ان صاحب نے کیمپ دارالعلوم کے دوران بہت کچھ تعاون کیا تھا۔ ان کا تعلق طالب علمی کے زمانے میں مجھ سے رہا تھا، اور وہ دیوبند کی ایک بڑی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادھر مولانا اسعد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمود صاحب سے بھی ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ مولانا اسعد صاحب کے گھر میں بھی ان کی آمد و رفت تھی اور روپے کا بھی لین دین تھا۔ ان کی برادری کے لوگوں نے جامعہ طبیہ میں ان کو ملازم رکھنے کیلئے زور دیا۔ ابتداً میں نے انکار کیا، پھر کچھ لوگوں کے اصرار کرنے پر مولانا مرغوب الرحمٰن کی اجازت سے ۵۰۰ روپے ماہانہ پر معالجہ کے شعبہ میں انکا تقرر کر دیا۔ اوسطاً شہر کے ڈیڑھ سو مریض روزانہ آنے لگے۔ فی مریض دو دن میں ایک روپیہ لیا جاتا تھا اور دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔ اس طرح ان صاحب کے ذریعہ ان کی تنخواہ نکال کر آٹھ سو یا ہزار روپیہ ماہانہ شعبۂ معالجہ کے لیے بچت ہو جاتی تھی، دارالعلوم پر کوئی بار نہ تھا۔

مولانا اسعد صاحب کے کچھ مقربین کو ان سے پرخاش تھی، انھوں نے مولانا کا ذہن ان صاحب کے خلاف تیار کیا۔ اجلاس شوریٰ کے موقع پر بالکل ابتداء ہی میں کوئی بات اٹھی جو تقرر سے متعلق تھی۔ مولانا اسعد صاحب نے کہا کہ تقررات کے لیے ایک کمیٹی بنائی جانی چاہئے۔ حضرت مولانا حکیم زماں صاحب حسینی نے فرمایا کہ "تقرر کمیٹی تو پہلے سے ہی ہوئی تھی۔ اور حال ہی میں اسے اہتمام کی فرمائش پر تحلیل کیا گیا ہے۔ اب دوبارہ کیا ضرورت پیش آئی؟ کیا کوئی غلط تقرر ہوا ہے؟"؛ مولانا اسعد صاحب نے انتہائی چراغ پا، بے قابو اور مشتعل ہوتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر فرمایا کہ جی ہاں! فلاں کا تقرر کر دیا گیا ہے اور وہ زانی ہے۔" سوال آیا کہ یہ تقرر کس نے کیا ہے تو میں نے کہا کہ یہ تقرر میں نے کیا ہے اور مہتمم صاحب کے مشورے سے کیا ہے۔ مولانا اسعد صاحب نے مہتمم صاحب پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا، کہنے

مہتمم صاحب !! مہتمم صاحب نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا شخص ہے۔ میں نے مولانا اسعد صاحب سے کہا کہ "مولانا! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں اور کیا الزام لگا رہے ہیں؟ زنا کا الزام کوئی معمولی الزام نہیں ہے۔ آپ اس پر گواہ نہیں پیش کر سکتے۔ پھر آپ ایک عالم دین اور صدر جمعیۃ علمائے ہند ہونے کے ساتھ مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، مجلس شوریٰ دارالعلوم کی عدالتِ عالیہ ہے، اس کے ممبران کا کام فریق بن کر کسی پر الزام لگانا نہیں بلکہ لگائے ہوئے الزامات کی تحقیق کرنا اور فیصلہ کرنا ہے۔ جس شخص کو آپ زناکار کہہ رہے ہیں وہ یہ بتا سکتا ہے کہ آپ کے صاحبزادے "گناہ کار" ہیں۔" میں نے ممبران کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ان کا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کا در و بست ان کے حوالہ کر دیا جائے اور یہی مالک مختار ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُٹھ گیا اور باہر نکل کر میں نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ میں سیدھا دفترِ اہتمام آیا اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔

دراصل یہی وہ کانٹا ہے جس کی خلش مولانا اسعد صاحب کبھی بھول نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کو صرف خوشامدی اور چاپلوسی کرنے والوں سے ہی واسطہ پڑا ہے، ایسا صاف جواب سننے کے وہ عادی نہیں ہیں۔ مجھے اس بات پر رنج تھا کہ اگر مولانا اسعد صاحب کو میرے رکھے ہوئے ایک آدمی سے اختلاف تھا تو بجائے یہ کہ غیر اخلاقی اور بھونڈا طریقہ اختیار کرتے وہ میرے ساتھ معقول معاملہ کر سکتے تھے اور یہ کہتے کہ فلاں شخص کا کردار مشتبہ ہے اور اسے دارالعلوم سے الگ کر دینا چاہیے۔ لیکن میں سازشوں اور حیلہ بازیوں سے بہت چڑتا ہوں اور پھر اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ ممبرانِ شوریٰ کے ساتھ بدسلوکی کا پروپیگنڈا صرف اسی واقعہ کی بنیاد پر ہے، ورنہ اور جن حضرات سے میری تلخ کلامی ہوئی تھی ان سب سے بحمداللہ میرے خوشگوار تعلقات ہیں اور خدا کے فضل سے وہ سب لوگ ہنوز بقیدِ حیات ہیں، ان سے مل کر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ مجلس شوریٰ میں اختلافِ رائے ہونا اور تلخ کلامی تک نوبت پہنچ جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر جگہ مجلس مشورہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

بدسلوکی

مولانا اسعد صاحب اس بات کو بھولے ہوئے ہیں کہ انھوں نے کیسے کیسے بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی اور بدتہذیبی کی ہے اور ان کی پگڑیاں اچھالی ہیں۔ جمعیۃ علمائے یوپی کے ایک انتخابی اجلاس میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ تشریف رکھتے تھے۔ مولانا اسعد صاحب نے انتہائی بداخلاقی کے ساتھ یہ کہہ کر ان کو اُٹھا دیا کہ آپ مرکز سے متعلق ہیں، یہاں صوبائی اجلاس میں آپ کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (مرحوم) رنجیدہ ہو کر بادلِ ناخواستہ اٹھے اور اپنی گاڑی میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اور کسی سے اشکبار آنکھوں سے فرمایا کہ "آج اس لونڈے نے میری بڑی بے عزتی کی ہے۔" (شفیق چودھری اس بات کا گواہ آج بھی دہلی میں موجود ہے)۔

ایسا ہی ایک واقعہ حال میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری مدظلہ رکن شوریٰ کے ساتھ پیش آیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب مولانا اسعد صاحب نے خود کو نائب امیر الہند قرار دے لیا۔ اپنی امارت کے شرعی جواز اور بیعت کے لیے وجہ جواز تلاش کرنے کے لیے ایک استفتا مرتب کرایا اور اساتذۂ دارالعلوم سے جواب لکھوا کر ہندوستان بھر میں تصدیق کے لیے بھیج دیا گیا تھا مگر مولانا عبدالحلیم صاحب کے نفتی مدرسہ اور اساتذہ نے ان کی امارت شرعیہ کے متعلق مختلف علماء اور فضلاء کی طرف سے نقدی تحریریں شروع کر دیں تھیں۔ مولانا جونپوری رحمۃ کے مدرسہ ریاض العلوم گورینی سے شائع ہونے والے مجلہ "ریاض الجنۃ" میں بھی امارتِ شرعیہ کے خلاف وہ فقہی بحثیں شائع ہو گئیں۔ مولانا اسعد صاحب بھلا یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ وہ ایک اجلاسِ شوریٰ کے موقع پر مجلہ ہاتھ میں لیے ہوئے نہایت برافروختگی کی حالت میں مولانا عبدالحلیم صاحب کے کمرہ میں پہنچے اور کہا کہ "مولانا! یہ آپ کے رسالہ میں کیا شائع ہو رہا ہے؟" مولانا عبدالحلیم صاحب نے فرمایا کہ "ایسے ہی، بچے کچھ لکھ دیتے ہیں۔" مولانا اسعد صاحب نے آنکھیں نکال کر فرمایا "میں بچے اور بڑے کچھ نہیں جانتا۔ آپ کے مجلہ کا ابھی رجسٹریشن بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ پر مقدمہ بھی چل سکتا ہے۔" مولانا عبدالحلیم صاحب کو ان الفاظ سے سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد وہ آج تک بڑی کوششوں کے باوجود شوریٰ کے کسی اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ مولانا اسعد صاحب کے "اخلاقِ عالیہ" یا خاندانی شریفانہ مزاج کا یہ صرف ایک نمونہ ہے جو صرف جواباً عرض ہے، ابتداءً نہیں —— جس وقت سے مولانا اسعد صاحب شوریٰ کے ممبر ہوئے ہیں بیشتر اور معتبر ممبران نے شوریٰ کے اجلاس میں شریک ہونا تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ اور بمشکل ہی کورم پورا ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ جس کے جلسے سال میں دستوری طور پر چار ہونے چاہئیں، اکثر کورم پورا نہ ہونے کی بنا پر منعقد ہی نہیں ہوتے۔ یہ صرف حضرت ہی کی برکت ہے۔

اگر مولانا اسعد صاحب واقعتاً دارالعلوم کی باتیں دارالعلوم سے باہر نہیں پہنچانا چاہتے تھے اور ان کو مفادِ دارالعلوم عزیز تھا، جیسا کہ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تو مجھ کو دارالعلوم سے علیحدہ کرنے کے بجائے باہم میں جو ل کی بھی راہ نکالی جا سکتی تھی، کسی کو قتل کر کے یہ سوچنا کہ اس قتل کی خبر کہیں نہ جائے، خام خیالی نہیں تو کیا ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (مرحوم) کے خلاف میں نے جو باغیانہ روش اختیار کی تھی کیا وہ اس وقت کے لحاظ سے مفادِ دارالعلوم کے خلاف نہ تھی؟ لیکن اس عظیم انسان نے اپنے تمام ہمنواؤں کے اصرار کے باوجود میری برخواستگی کے مقابلہ پر [illegible] تھا کہ "وہ ہمارے کتنے ہی بڑے مخالف ہوں، لیکن پڑھانے میں تو اچھے ہیں اور دارالعلوم کا کام تو اچھا کرتے ہیں، اس لیے میں ان کو برخواست نہیں کروں گا۔" موجودہ مہتمم صاحب کے لیے سابق مہتمم قدس سرہٗ کی یہ مثال ایک عبرت ہے۔

مولانا اسعد صاحب نے اپنی تمام مذمتوں، الزام تراشیوں اور کذب بیانی کے ساتھ ساتھ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھ سے اپنے تعلق کا بھی اظہار کیا ہے۔ [illegible] مرحوم کی سوانح پڑھنی چاہیے اور اس سے یہ سیکھنا چاہیے کہ تعلق کسے کہتے ہیں۔ مولانا کی یہ منافقانہ روش تمام علماء کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ مجھے نہ میرے [illegible] نے اس کی تعلیم دی ہے اور نہ میرے والدین نے۔ میں صاف اعلان کرتا ہوں کہ میرا ایسے شخص سے جس کے قول و فعل میں تضاد اور جس کی ہر نقل و حرکت میں فساد ہو، کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کا میرے ملنے کیلئے آنا اور تعزیت کے لیے آنا اور پھر اس کا پروپیگنڈا کرنا محض دکھاوا اور پبلسٹی کا ایک ذریعہ ہے۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ایسی تعزیت پر کوئی ثواب نہیں ملتا، جس کا مقصد ریاکاری اور پروپیگنڈہ ہو۔ کیا کوئی شخص میرے ساتھ مولانا اسعد صاحب کے موجودہ طرزِ عمل اور میرے [illegible] ان کی بہتان طرازیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کو مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف ایک فریب اور جھوٹ ہے [illegible] کی قطعی ضرورت نہیں۔

مولانا اسعد صاحب نے اپنی تحریر میں دھمکی کے انداز میں کہا ہے کہ [illegible] پریس اور اخباروں میں آنے ہی مقدمہ ہے تو پھر آئے گا اور بہت کچھ آئے گا [illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا وحید الزماں کی سبکدوشی پر
ابنائے قدیم کا موقف اور ردِ عمل

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس ۲۱ / ۲۲ / شعبان ۱۴۱۰ھ میں مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کو تدریسی خدمات سے سبکدوش کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، ابنائے قدیم اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے اس کو غیر قانونی اور شخص واحد کی انتقامی کارروائی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ تنظیم کے ذمہ داران نے مجلس شوریٰ کے ممبران، مہتمم دارالعلوم دیوبند اور دوسرے ذمہ داروں سے مختلف ملاقاتوں اور تحریروں کے ذریعہ اس فیصلے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور اس کو تبدیل کرنے کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں فضلاء و تنظیم ابنائے قدیم کے مختلف وفود نے جہاں متعدد اہم اور سینئر ارکان شوریٰ سے فرداً فرداً ملاقات کی، وہیں ایک اعلیٰ سطحی وفد نے دیوبند میں نائب مہتمم سے ملاقات کرکے اپنے احساسات پیش کئے۔ اور پھر ایک کثیر رکنی وفد نے براہ راست مجلس شوریٰ کے اجلاس میں حاضر ہوکر ارکان کو متوجہ کیا اور میمورنڈم پیش کیا مگر دارالعلوم کی انتظامیہ نے فضلاء و تنظیم ابنائے قدیم کی گذارشات پر ہمدردی کے ساتھ توجہ دینے کے بجائے ۱۸ / جون ۱۹۹۰ء کو دیوبند میں ایک نام نہاد نمائندہ اجتماع طلب کرلیا۔ جس میں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ اور دہلی میں ۴ / جون ۱۹۹۰ء کو منعقد ہونے والے فضلائے دیوبند کے عظیم الشان اجتماع پر جس میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تھا کیچڑ اچھالی گئی اور تنظیم کے اکابر واصاغر کی شان میں گستاخیاں روا رکھی گئیں۔ اس کے بعد رکن شوریٰ مولانا اسعد صاحب نے نہ جانے اپنے کن خصوصی اختیارات کے تحت ۲۱ / جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی شرکت کی اور دونوں حضرات نے تنظیم ابنائے قدیم اور مولانا وحید الزماں صاحب پر مختلف بے بنیاد الزامات عائد کئے، جس کے بعد تنظیم کے ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی

نے بھی ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے دارالعلوم کی انتظامیہ کے ان غیر اخلاقی اقدامات پر سخت تشویش کا اظہار کیا، جن کی وجہ سے یہ مسئلہ اخبارات اور عوامی محفلوں کا موضوع بنتا چلا گیا، حالاں کہ تنظیم کے خدام چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ عوام تک پہنچے بغیر حل ہو جائے، تاکہ علمائے دیوبند کو ایک بار پھر رسوائی اور جگ ہنسائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

دارالعلوم کی انتظامیہ کے اس افسوسناک رویے کے باوجود تنظیم نے اس سلسلے میں اپنی سنجیدہ کوششیں جاری رکھیں اور ارکانِ شوریٰ کو مختلف طریقوں سے بار بار اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور ان سے درخواست کی کہ مجلس شوریٰ کے آئندہ اجلاس میں اس فیصلے پر نظر ثانی کر کے اسے منسوخ قرار دیں ـــــ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحب رح کی سبکدوشی کے غیر منصفانہ فیصلے نے تنظیم ابنائے قدیم کے قیام میں مہمیز کا کام ضرور انجام دیا تھا مگر اس کا قیام محض کسی ایک یا ایک سے زائد مسئلے پر احتجاج کے لئے وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کا قیام وسیع تر مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا ہے جن کی تکمیل کی طرف تنظیم بحمداللہ پوری سنجیدگی، متانت اور خاموشی کے ساتھ گامزن ہے ـــــ مگر چوں کہ مولانا وحید الزماں صاحب کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں سراسر زیادتی اور ناانصافی سے کام لیا گیا تھا اور جس سے دارالعلوم کی روایات پامال اور ابنائے قدیم کے جذبات مجروح ہوئے تھے، اس لئے فطری طور پر تنظیم نے اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھا اور آئندہ بھی اگر دارالعلوم کے کسی ملازم، کارکن یا استاذ کے خلاف ناانصافی کی گئی تو تنظیم پوری قوت کے ساتھ اس کے خلاف احتجاج کرے گی۔

ہمیں یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی اس غیر قانونی سبکدوشی پر ملکی غیر ملکی عوامی اور علماء کے حلقوں کے احتجاج کے باوجود دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس میں شریک ہونے والے ارکان جس میں اس فیصلے پر نظر ثانی ہونا تھی صرف ایک شخص کے دباؤ میں آکر فیصلے کو منسوخ کرنے کی جرأت نہ کر سکے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شوریٰ کی تابناک تاریخ پر یہ داغ لگا رہ گیا کہ موجودہ شوریٰ دارالعلوم کی کوئی آزاد باڈی نہیں بلکہ شخص واحد کی خواہشات اور اشاروں پر کام کرنے والی ایک مجلس ہے۔

ہم ذیل میں فضلاء و تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ان درجنوں مراسلوں اور تحریروں میں سے جن میں اس فیصلے پر احتجاج کیا گیا تھا دارالعلوم کی انتظامیہ اور شوریٰ کے نام وفود کے ذریعہ بھیجی گئی دو تحریریں شائع کر رہے ہیں جن سے قارئین اندازہ کر سکیں گے کہ فضلاء و تنظیم نے اس فیصلے

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

کو کس نظر سے دیکھا تھا۔

فضلا کا مہتمم دارالعلوم دیوبند کو میمورنڈم

۲۸ر شوال المکرم ۱۴۱۰ھ مطابق ۲۴ر مئی ۱۹۹۰ء

حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند / زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مؤدبانہ عرض ہے کہ تقریباً چوتھائی صدی تک دارالعلوم دیوبند کی مسلسل خدمات کو نظر انداز کرکے دارالعلوم دیوبند کے ممتاز استاذ اور عربی ادب کے شعبہ کے سربراہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی / مدظلہ العالی کی سبکدوشی کا فیصلہ نہ صرف یہ کہ ہم سٹرکاروفد بلکہ ہندوستان اور بیرون ہند میں پھیلے ہوئے تمام اہل علم، دارالعلوم کی ترقی اور مفاد سے دلچسپی رکھنے والے ملک کے عوام اور خصوصاً علمی و تعلیمی حلقوں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے نہایت تکلیف دہ اور تشویش کا باعث ہوا ہے اور یہی اضطراب ہے جس نے ہمیں دہلی سے یہاں دیوبند آپ کی خدمت میں حاضری کے لئے مجبور کیا ہے۔

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی دارالعلوم دیوبند کے مخلص اور بے لوث خادم، اس کے فضلاء اور طلباء کی بڑی تعداد کے مشفق استاذ ہیں اور قاسمی برادری کے نزدیک موصوف کی مربیانہ اور مشفقانہ شخصیت پہلے بھی اور آج بھی پُرکشش، باوقار اور مثالی رہی ہے۔ انھوں نے دارالعلوم کی تعمیر و ترقی کے لئے شب و روز انتھک جد و جہد کی ہے اور دارالعلوم کے ساتھ تقریباً چوتھائی صدی کی ان کی وابستگی کے دوران کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا جس کی وجہ سے دارالعلوم کے تئیں ان کے خلوص یا ان کی طرف سے دارالعلوم کی ترقی کی کوششوں میں کوئی کمی آئی ہو، وہ چاہے طلباء کی تربیت کا معاملہ ہو، دارالعلوم کی ترقی کا مسئلہ ہو یا اجلاس صد سالہ کے لئے انتھک مساعی کا معاملہ ہر جگہ مولانا موصوف کی بیش قدمیاں قابل تحسین اور ممتاز و منفرد حیثیت کی حامل رہی ہیں۔

مولانا عمر کے لحاظ سے دارالعلوم میں موجود بزرگ اساتذہ اور کم عمر اساتذہ کے درمیان ایک کڑی ہیں اور دارالعلوم کے بعض دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں صحت کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

ہم فضلاء دارالعلوم مولانا کے ساتھ اپنی دیرینہ وابستگی اور تعلق کے پیش نظر پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو دیئے گئے نوٹس میں بیان کی گئی سبکدوشی کی وجہ غیر واقعی، غیر قانونی غیر اسلامی، غیر اخلاقی ہے اور اس طرح کا فیصلہ کسی ایک شخصیت کے ذاتی جذبات وخواہشات کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔

اس لئے ہماری گذارش ہے کہ فوری طور پر مجلس شوریٰ کا ہنگامی اجلاس منعقد کرکے اس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے اور غیر مشروط طور پر مولانا کو واپس لیا جائے، کیونکہ خدانخواستہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فضلاء و وابستگان دارالعلوم اور مسلمانوں کے درمیان یہ تشویش عام ہوگی اور وہ پھر یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ دارالعلوم اپنی روایتی علمی قدرشناسی سے منحرف ہوکر اسلاف کی قائم کی ہوئی دینی اسلامی قدروں کو بھی باقی رکھ سکے گا یا نہیں۔

ہمیں امید ہے کہ حضرت مہتمم صاحب ہماری گذارش کو اہمیت دیں گے اور طلباء کے علمی اور تربیتی مفاد اور مولانا کے منفرد اسلوب تعلیم کے پیش نظر دارالعلوم کو ان کی خدمات سے محروم نہ ہونے دیں گے اور کوئی ایسی صورتِ حال پیش نہ آنے دیں گے جس سے فضلاء اور عام مسلمانوں کو اپنے اس محبوب ادارے کے تئیں پھر تشویش لاحق ہو اور اس کا علمی اور دینی وقار مجروح ہو۔ ہماری درخواست ہے کہ ذاتی جذبات وعناد سے بالاتر ہوکر دارالعلوم کے مفاد کو ہر قیمت پر محفوظ کیا جائے۔

دستخط شرکاء وفد والسلام

(یہ وفد مختلف دینی مدارس کے ۱۴؍ ارکان پر مشتمل تھا۔)

۴؍ جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں منعقد ہونیوالے فضلاء کے اجتماع کی قرارداد

تجویز ۲

ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا یہ اجلاسِ عام: دارالعلوم دیوبند کی موجودہ انتظامیہ کے اس ناعاقبت اندیشانہ اقدام پر سخت بیزاری اور تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ شعبہ عربی ادب جدید کے بانی وسربراہ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب دامت برکاتہم کو ایک منفردانہ حیلہ جوئی سے جبری طور پر تدریسی خدمات سے سبکدوش کردیا گیا اور ملک کے علمی ودینی حلقوں کو حیرت اور اچنبھے میں ڈال دیا۔

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب دامت برکاتہم، دارالعلوم کی ان ممتاز اور منفرد شخصیتوں

ہیں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کے علمی و دینی وقار کو ملک اور بیرونِ ملک میں متعارف کرانے اور سربلند کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے علمی و دینی حلقوں میں مولانا موصوف کی شخصیت بجا طور پر قابلِ احترام سمجھی جاتی ہے، اور افراد سازی، تربیت اور تعلیمی میدان میں ان کے امتیازی اور منفرد اسلوب نے طلبہ کے حلقے میں ان سے فیضان حاصل کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ باہمی مسابقت کے جذبے کو پیدا کیا بلکہ وہ طلباء کے محبوب و ہر دل عزیز مربی کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اس فیصلے کے نتیجہ میں یہ اجلاس عام اس احساس اور تاثر کا اظہار کرنے پر مجبور ہے کہ اس طرح کے معاندانہ اور حریفانہ اقدامات سے دارالعلوم کا وہ مثالی کردار مجروح ہوا ہے جو ہمارے اسلاف کی قربانیوں کے نتیجے میں عالم اسلام میں عزت و وقار کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

مولانا موصوف کی سبکدوشی سے موجودہ طلبہ ہی کا نقصان نہیں، بلکہ اس کا اثر پوری تعلیمی نسل پر پڑے گا، اس لئے ہم دارالعلوم کو آمرانہ تسلط سے نجات دلانے کا عزم کرتے ہیں۔

ہم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، حضرات اراکین مجلس شوریٰ، حضرت صدر المدرسین اور ملک کی تمام علمی و دینی شخصیتوں اور اسلام اور مسلمانوں کے بقا و استحکام سے دلچسپی رکھنے والے قائدین اور دردمندانِ ملت سے اپیل کرتے ہیں کہ دارالعلوم آج جس سانحے کے دروازے پر کھڑا ہے، اس صورتِ حال پر غور کریں اور دارالعلوم سے اس تشویشناک صورتحال کو ختم کرنے کے لئے سامنے آئیں اور دارالعلوم کے کردار کو بچانے میں مؤثر قدم اٹھائیں۔

بقیہ : باتیں اُن کی، یادیں اُن کی

یاد رکھے گی ـــــ ان کی یادیں رہیں گی، ان کی باتیں رہیں گی ـــــ وہ دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو آنے والی نسلوں کے لئے نشانِ راہ ہوں گے۔

جامع مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ان کے سفر آخرت کا اعلان ہوا تو میں دیوبند تھا۔ بعد فجر ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ بے چین شخصیت چین کی نیند سو رہی تھی، عمر بھر کی بے قراری کو قرار آچکا تھا۔

پرانی یادیں آنسو بن کر بہتی رہیں ـــــ دل نے کہا ؎

دیکھ لو اب کہ پھر نہ دیکھو گے
غالبِ خوش خصال کی صورت

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

ترتیب: لطف اللہ قاسمی

جبری سبکدوشی سے سانحۂ ارتحال تک
فضلائے دیوبند (سعودی عرب) کا ردِ عمل اور تاثرات

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی بلاشبہ ان ہی عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جن کی نظیریں کسی بھی دور کی تاریخ میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں، مولانا نے علم وادب کی ترویج میں مؤثر خدمات انجام دیں اور اپنی زبان وقلم سے دارالعلوم دیوبند کا وقار بلند کیا۔ اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی۔ لیکن علم وادب کے اس روشن چراغ کو مجلس شوریٰ نے ایک ممبر کی منتقمانہ مہم کے زیر اثر تدریسی ذمہ داریوں سے جبراً سبکدوش کرکے دارالعلوم دیوبند کو مولانا کی علمی وادبی خدمات سے محروم کردیا۔

مولانا کی اس علیحدگی سے اندرون وبیرون ملک فضلائے دارالعلوم ومحبین کے درمیان ایک ہلچل مچ گئی اور اس کے خلاف ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ اس موقع پر فضلائے دارالعلوم (سعودی عرب) نے مجلسِ شوریٰ اور اربابِ اہتمام کے نام احتجاجی خطوط لکھے جن میں مسندِ تدریس پر ان کی فوری واپسی کا پرزور مطالبہ کیا۔ مہتمم صاحب کے نام لکھے گئے خط کا مضمون مندرجہ ذیل ہے۔

۹ رجون سنہ ۱۹۹۰ء
ریاض۔ سعودی عرب

مخدوم ومحترم حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سعودی عرب میں قیام پذیر ہم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند بحمد اللہ بخیر ہیں۔ امید کہ حضرت والا بھی مع متعلقین بعافیت ہوں گے۔ البتہ گذشتہ دنوں جناب والا کی ناسازیٔ طبع کی خبریں سنکر ہم سبھی احباب کو بہت

ملال ہوا۔ ہماری خواہش اور دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ آپ کو صحت و عافیت سے نوازے اور زیادہ سے زیادہ ملتِ اسلامیہ اور اسلامی علوم کی خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین۔

علاوہ ازیں اس عریضہ کا ایک خاص داعیہ یہ ہے کہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب مدظلہٗ کی برطرفی کی خبر ہمارے لئے بے انتہا حیرت انگیز اور باعثِ تشویش ہے۔

حضرت مولانا مدظلہٗ ربع صدی سے زیادہ عرصہ تک دارالعلوم میں صرف تدریسی ہی نہیں بلکہ مختلف النوع خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ مولانا برصغیر کی سب سے عظیم الشان دینی درسگاہ میں ایک زریں عہد کے بانی ہیں۔ یہ پورا عہد اس بات کا گواہ ہے کہ وہ ایک بلند پایہ معلم ہی نہیں بلکہ ایک عہد ساز مربی اور نہایت کامیاب منتظم بھی ہیں۔ بعض دفعہ کسی خاص مصلحت کے پیشِ نظر قدرت کا دستِ فیاض کسی فردِ واحد میں بہت سے کمالات و خوبیاں یکجا کر دیتا ہے۔

مولانا بھی اسی قسم کی منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے پوری زندگی دارالعلوم دیوبند کے کردار کو فروغ دینے کے لئے مخلصانہ جد و جہد میں صرف کر دی۔ اور جب کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے وقار کو مجروح ہونے سے بچانے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ ہماری بہ نسبت مولانا کی شخصیت اور کردار سے زیادہ واقف ہیں۔

مولانا مدظلہٗ کی برطرفی سے دارالعلوم دیوبند، فرزندانِ دارالعلوم دیوبند اور مسلک دیوبند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچے گا۔

ہمیں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے کسی فیصلہ پر اعتراض کرنے کا کوئی قانونی حق نہیں ہے تاہم ملتِ مسلمہ کے ایک فرد بلکہ ایک فاضل دارالعلوم دیوبند ہونے کے ناطے دارالعلوم کے مفاد میں کوئی مشورہ دینا حد سے تجاوز بھی نہیں۔

اس بنا پر ہماری آپ سے پُرزور گذارش ہے کہ مولانا کی برطرفی کے سلسلے میں نظرِ ثانی کے لئے آپ مجلس شوریٰ سے درخواست کریں۔ یہ آپ کا ملتِ اسلامیہ اور دارالعلوم پر عظیم احسان ہوگا۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہوں گے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

فضلائے دارالعلوم دیوبند

(سعودی عرب)

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے ارکان گرامی کے نام بھیجے گئے میمورنڈم کا متن حسب ذیل ہے:

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

۸؍اگست ۱۹۹۰ء
۱۷؍محرم ۱۴۱۱ھ
ریاض (سعودی عرب)

بنام ارکان گرامی قدر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
منجانب فضلائے دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

آپ حضرات کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں سے قطع نظر اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ارکان ہونے کی حیثیت کو ہی پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ حضرات ملت اسلامیہ ہند کا دل و دماغ ہیں۔ تقریباً ۲۰ کروڑ کلمہ گو انسانوں کا لب لباب ہیں۔ مخاطب کی بلند پایگی اور علوشان کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرومایہ لوگوں کا کچھ کہنا عام حالات میں گستاخی اور جسارت بیجا سمجھا جاتا ہے۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب بہت مشہور مقولہ ہے انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ (نظر کلام پر رکھنی چاہیے، متکلم پر نہیں۔)

برصغیر میں اگر کسی واقف کار اور باشعور مسلم بلکہ غیر مسلم سے یہ سوال کیا جائے کہ اس زبوں بخت مسلم قوم کا سب سے عظیم ملی اثاثہ کیا ہے۔ اگر اس نے دوراندیشی اور غیر جانبداری سے کام لیا تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا۔ "دارالعلوم دیوبند" "دیوبند کا عربی مدرسہ" وغیرہ۔

دارالعلوم کا قیام جن مایوس کن حالات میں ہوا تھا اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت اس اسلامی درسگاہ کا معرض وجود میں آنا خدا کی مرضی اور اکابر دیوبند کا ایک الہامی فیصلہ تھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ مسلمانوں کے لئے وہ نہایت کس مپرسی اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ انہیں حالات سے متاثر ہو کر چند خدا ترس دردمندان ملت نے ملت کی بقا و تحفظ کے لئے بظاہر ایک نہایت معمولی پودا سرزمین دیوبند میں لگایا تھا۔ مگر بعد میں دنیا نے دیکھا کہ ان بندگان خدا اور صلحاء امت کی مومنانہ فراست خلوص اور للہیت کی بدولت وہی معمولی پودا ایک گھنا اور تناور درخت بن گیا جس کے سایہ میں مسلمانوں کو پناہ ملی۔ خصوصاً برصغیر میں اس مینارۂ علم کی روشنی سے ملت مسلمہ مستنیر ہوئی۔ یہی ادارہ اس کے دینی و ملی بقا و تحفظ کا سب سے بڑا پاسبان بن گیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ادارہ یا تنظیم میں اس کے بانیوں کی ذہنیت اور نیت کار فرما رہتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اس کی ایک مثال ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام محض دینی علوم سے طلبہ کو روشناس کرانے یا انہیں

دستار فضیلت سے سرفراز کرنے کے لئے عمل میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ دارالعلوم ایک تحریک کا نام تھا، اس کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور اس کی اپنی کچھ روایات رہی ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ادارہ انھیں اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جن کا عملی نمونہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ کی زندگیاں تھیں۔ اور یہ اغراض ومقاصد اس سے حاصل بھی ہوئے۔

لیکن تاریخ امم اس بات کی گواہ ہے کہ قوموں کی طرح تحریکیں، تنظیمیں اور ادارے بھی اپنے سفر زندگی میں نشیب وفراز اور عروج وزوال سے دوچار ہوتے ہیں، نامساعد حالات اشخاص وافراد کی طرح اقوام وتحریکات کو بھی پیش آتے ہیں۔ ایسے حالات سے نبرد آزمائی کے بعد صحت مند فکر وعمل کے نتیجہ میں استقرار واستحکام پیدا ہوتا ہے یا پھر غیر صالح روش کے نتیجہ میں انحطاط وزوال خیمہ زن ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے: ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدي الناس ليذيقهم بعض الذي عملوا لعلهم يرجعون۔

بحیثیت مسلمان ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ کائنات خدا کی مخلوق ہے۔ وہی اس کا مالک اور مزاج شناس ہے۔ اپنی کائنات میں تغیر وتبدل کے لئے کچھ اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ جب تک ان اصولوں کی پیروی اور ان کے ساتھ ہم آہنگی باقی رہتی ہے بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور جب ان سے انحراف وعدول پایا جاتا ہے تو انسان اور اس کی تمام تر کاوشوں اور پیش بندیوں کے باوجود دیر سویر شکست وریخت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کو بھی ایک صدی سے زائد عرصہ پر پھیلے ہوئے اپنے سفر میں بہت سے مشکل مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ ایسے ایسے نازک لمحات اس کی راہ میں آئے کہ اس کا درد وکرب دیکھ کر اس کے دردمند دل کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس کی اب تک کی آزمائشوں میں سب سے سخت اور جانگسل آزمائش تقریباً ایک دہائی قبل اس وقت شروع ہوئی جب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے آخری دور اہتمام میں جشن صد سالہ کے موقع پر فضلاء دارالعلوم دیوبند کی تنظیم "مؤتمر ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند" وجود میں آئی۔ حالانکہ عام حالات میں کسی ادارہ یا درسگاہ کے ابناء قدیم کی یونین اسے فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے مگر اس وقت اس تنظیم کے وجود میں آنے کے بعد محاذ آرائی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور اسی جنگ سے تاریخ دارالعلوم میں ایسے شرمناک اور سیاہ ابواب کا اضافہ ہوا جن سے اس کا تابناک ماضی قطعی ناآشنا تھا۔ دارالعلوم کی اسیہ روزی دیکھ کر روتے روتے بہی خواہوں کے آنسو خشک ہوگئے اور ہنستے ہنستے بدخواہوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ام المدارس دارالعلوم دیوبند اور علماء کا

وقار بُری طرح مجروح بلکہ نیم جان ہو گیا۔ دعوت وعزیمت کی تاریخ میں علمبرداران دعوت وعزیمت کا اتنا بڑا جم غفیر اس بُری طرح رسوا اور عوام الناس کے اعتماد سے محروم ہوا ہو ایسا کوئی واقعہ کم از کم ہمارے علم میں نہیں۔

یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی صرف اس کے شعلے مضمحل ہوئے تھے، چنگاریاں ذہنوں اور عدالتوں میں پوری توانائی کے ساتھ موجود تھیں کہ تالبض گروپ میں اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی۔ اس کے نتیجہ میں مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۲۱، ۲۲ شعبان ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء میں کل ۲۱ ممبران میں سے ۱۱ کی موجودگی میں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی دار العلوم سے برطرفی کا فیصلہ ہوا۔

اس تازہ پیش رفت کا ظاہر حال تو یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی قرارداد کی روشنی میں مولانا کے نام جاری کیے گئے نوٹس میں برطرفی کا سبب ان کی مستقل مزاجی اور خرابی صحت ہے۔

مولانا کی برطرفی پر تعلیمی حلقوں بالخصوص فضلائے دار العلوم میں تشویش وبے چینی کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا چنانچہ **اپریل ۱۹۹۰ء میں تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کا ایک نمائندہ وفد صورت حال پر تبادلۂ خیال** کے لئے دار العلوم دیوبند پہنچا۔ وفد سے گفتگو کے دوران مہتمم دار العلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب زید مجدہ نے بتایا کہ شوریٰ کا یہ فیصلہ مجلس تعلیمی کی رپورٹ کی بناء پر ہوا ہے اور یہ کہ ذاتی طور پر میرے مولانا وحید الزماں صاحب سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں اور مجھے کبھی ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ بعد ازاں وفد کے ارکان نے ناظم تعلیمات مولانا ریاست علی صاحب سے گفت وشنید کی۔ تو انھوں نے کہا کہ حسب معمول ہر تعلیمی سال کے اختتام پر دفتر تعلیمات سے رپورٹ جاتی ہے۔ رپورٹ میں صرف یہ درج تھا کہ بعض کتابوں میں مقررہ نصاب پورا نہ ہونے کا سبب قادیانی کیمپ اور بعض اساتذہ کی اشتعال انگیز تقریریں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ رپورٹ میں نے کسی (نام بتائے بغیر) کے کہنے پر کی تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ رپورٹ میں مولانا وحید الزماں صاحب کا نام یا ان کی مسجد چھتہ والی تقریر کا ذکر تھا تو انھوں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ مولانا ریاست علی صاحب کے علاوہ مجلس تعلیمی کے دیگر ممبران نے بھی بتایا کہ مجلس تعلیمی کی میٹنگ میں یہ طے ہوا تھا کہ رپورٹ میں کسی کا نام قطعی طور پر ذکر نہ کیا جائے۔

ہمارے لئے باعث حیرت امر یہ ہے کہ مجلس تعلیمی کی وہ رپورٹ جس کی بنیاد پر مولانا وحید الزماں صاحب کو برطرف کیا گیا اس میں مولانا کا نام کہاں سے اور کیونکر آیا۔

ہماری رائے میں مولانا کی برطرفی کے سلسلہ میں حقیقت حال وہ ہرگز نہیں جس کا نوٹس میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مولانا وحید الزماں صاحب بحمد اللہ بقید حیات ہیں اور دیوبند میں قیام پذیر ہیں، آپ حضرات بذات خود انھیں دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحت وتندرستی کے اعتبار سے وہ فرائض تدریس انجام دینے

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

کے لائق ہیں یا نہیں۔

البتہ گزشتہ چند سالوں سے مولانا کو بعض جسمانی شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں جن کی تشخیص کے بارے میں میڈیکل سائنس اپنے جدید ترین وسائل کے باوجود درماندہ ہے۔ عملیات کے ماہرین بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ آپ پر کسی بہت گہرے سحر کا اثر ہے، لیکن یہ بھی برخاستگی کا سبب اس لئے نہیں بن سکتا کہ بدنصیبی سے ازہر دیوبند میں جو رزم گاہ وارثین انبیاء ہے قدیم زمانہ سے یہ "اسلامی" طریقۂ انتقام مروج ہے۔

رہا مسئلہ مشتعل مزاجی کا تو یہ محض حیلہ جوئی ہے جو کسی حقیقت پسند اور انصاف دوست انسان کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی شخص کی مشتعل مزاجی اس سے متعلق امور میں کسی خلل کا باعث بنی، کیا یہ حقیقت نہیں کہ مکر و فریب سے متعفن اس دور میں شعلہ مزاجی اتنی تباہ کن نہیں جتنی تباہ کن اور خطرناک شبنم مزاجی ہے۔

شاید آپ حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ دارالعلوم سے مولانا کی برخاستگی پر ہر طرف ایک ہنگامہ کیوں کھڑا ہو گیا، آپ کا یہ سوچنا بجا ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مولانا ایک انفرادی شخصیت کے مالک اور بہت سی تدریسی، تربیتی، تعمیری اور انتظامی خوبیوں کے حامل ہیں۔ اب مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی اس ذات گرامی سے محرومی ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے۔ مشہور ہے کہ محمد بن قاسم ایک سازش کے تحت اپنی معزولی کے بعد ایک شعر پڑھا کرتے تھے ؎

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریھۃ وسداد ثغر

مولانا وحید الزماں صاحب تقریباً تیس سال تک دارالعلوم دیوبند میں صرف تدریسی ہی نہیں بلکہ مختلف النوع خدمات نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ہیں۔

ایشیا کی سب سے عظیم دینی درس گاہ میں وہ ایک زریں عہد کے بانی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے بے شمار عربی مدارس میں مروج نصاب تعلیم خواہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ رہا ہو مگر اس میں ایک کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی تھی وہ یہ کہ دس سالوں تک ضخیم سے ضخیم تر بیسیوں کتابیں پڑھنے کے باوجود فضلاء میں عربی زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت قلیل الوجود بلکہ مفقود ہوتی ہے۔ مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان و ادب کو محض اپنی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی سے رواج دیا۔ اور نتیجۃً پورے ملک میں اس کا چرچا ہو چلا، چنانچہ اب کثرت سے ایسے فضلاء پائے جاتے ہیں جن میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا پندرہ روزہ جریدہ "الداعی" اور جمعیۃ علماء ہند

کا ترجمان "الکفاح" مولانا کی کامیاب کوشش کی مثالیں ہیں اگر مولانا نے فضلاء دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان کا ذوق نہ پیدا کر دیا ہوتا تو فضلاء کے حلقہ میں اس وقت اس کی بہت شدت سے کمی محسوس کی جاتی۔ وہ شدید احساس کمتری کا شکار رہتے اور بہت سے پہلوؤں سے ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔

مولانا کی انتظامی صلاحیتوں کا آئینہ دار جشن صد سالہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس موقع پر وہاں جو تعمیراتی کام ہوا اس کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ حسن اور طلبہ و اساتذہ کے لئے بڑی رہائشی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ جو اب بھی خاموشی سے اس کی گواہی دے رہی ہیں۔ آپ حضرات واقف ہوں گے کہ دارالعلوم کی یہ خدمت بھی مولانا کے ہاتھوں انجام پائی۔

تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ مولانا کی سب سے بڑی خوبی تربیت و افراد سازی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ طلبہ دارالعلوم مولانا سے جتنا تعلیمی استفادہ کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ وہ ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ ان سے زندگی کے طور طریقے، حیات انسانی میں پیش آنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے گر سیکھتے تھے۔ مولانا صرف مقررہ کتابوں کا نصاب ہی نہیں پورا کراتے بلکہ طلبہ کو تعمیر حیات کے اسباق بھی پڑھاتے تھے۔

انھیں خوبیوں اور کمالات کے باعث طلبہ کی بڑی اکثریت ہمیشہ ان سے وابستہ رہی۔ صرف وہی طلبہ نہیں جو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے بلکہ وہ طلبہ بھی ان کے گرویدہ ہوتے تھے جنھیں وہاں کے مخصوص تعلیمی اور انتظامی نظم و نسق کی وجہ سے اس کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ مولانا کے کردار کی وجہ سے یہ تاثر عام ہوتا تھا کہ وہ ایک مخلص اور ہمدرد انسان ہیں، انھیں طلبہ سے ہمدردی ہے وہ ان کی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حتی الوسع ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اساتذہ تو اور بھی بہت سے ہوا کرتے تھے لیکن طلبہ کی جتنی وابستگی ان سے ہوتی تھی اوروں سے نہیں ہوتی تھی۔ مولانا کی اسی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے باعث سابق انتظامیہ کے خلاف وہ تحریک کامیاب ہوئی جس کی قیادت مولانا کر رہے تھے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا نہ ہوتے تو انقلاب کا وہ خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ اس انقلاب کے بعد کسی کو ملازمت ملی اور کسی کو اقتدار۔ مولانا وحید الزماں صاحب کو مشتعل مزاج اور بیمار قرار دے کر خدمت تدریس سے معزول کر دیا گیا۔

مولانا کی برطرفی کے باعث علم دوست اور فضلاء، و دردمندان دارالعلوم میں گہری تشویش اور صدمہ

کے دو سبب ہیں۔
اول تو یہ کہ مادیت کے اس دور میں جب ہر جگہ مادہ پرستی کا بول بالا ہے۔ صرف غیر دینی حلقے ہی نہیں بلکہ دینی حلقے بھی اس سے بڑی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اسلام اور اسلامی علوم اقلیتی فرقہ کے محض ایک طبقہ کا جز وقتی مشغلہ بن کر رہ گئے ہیں۔ علمی اور دینی شخصیات کا بے انتہا قحط ہے ایسے حالات میں مولانا وحید الزماں صاحب جیسے ممتاز اور منفرد شخصیت کے حامل انسان سے دارالعلوم کا محروم ہونا ایک ملی خسارہ ہے جس کی تلافی کبھی نہ ہوسکے گی۔ آج کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں اس بات کے لئے کوشاں رہتی ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں کسی علم و فن کا ماہر دستیاب ہو اسے اپنے ملک کا شہری بنائیں تاکہ ملک و قوم کو اس کے علم و ہنر سے مستفید ہونے کا موقعہ ملے۔
دوسرے دارالعلوم دیوبند وسیع و عریض رقبۂ زمین پر پھیلے ہوئے در و دیوار کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اسلامی تحریک اور مکتبۂ فکر کا نام ہے۔ کتاب و سنت سے ماخوذ اس کا اپنا ایک مزاج رہا ہے، اس کی اپنی کچھ اسلامی روایات رہی ہیں۔ واقعات کی روشنی میں دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ہمارا بھی تاثر یہ ہے کہ دارالعلوم اپنی روایات سے منحرف ہو رہا ہے، اب شاید وہاں وہ اسلامی روح کام نہیں کر رہی ہے جو بانیان و اکابر دارالعلوم کی جانب سے اس کی بنیادوں میں ودیعت تھی۔
دارالعلوم کی روایات میں ایک بہت ہی نمایاں روایت اس کی اسلامی وسیع المشربی رہی ہے۔ ہم اس موقعہ پر آپ کی توجہ دو واقعات کی طرف مبذول کرانا چاہیں گے۔
اول حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ سیاسی نقطۂ نظر سے ذہنی طور پر مسلم لیگی کیمپ سے قریب تھے۔ جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کانگریسی کہلاتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد حضرت قاری صاحب پاکستان منتقل ہو گئے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اہتمام کے لئے انھیں واپس ہندوستان بلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ ابتداءً مولانا آزاد مرحوم نے غالباً قاری صاحب کی مسلم لیگ سے وابستگی کے باعث اس سلسلے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن حضرت شیخ اپنی رائے پر مصر رہے۔ بالآخر مولانا آزاد رح حضرت شیخ کا شدید اصرار دیکھ کر آمادہ ہو گئے اور قاری صاحب دوبارہ رونق بزم ہندوستان ہوئے۔
ہمارا یقین ہے کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان واپس بلانے کا فیصلہ حضرت شیخ الاسلام کی مومنانہ فراست اور دارالعلوم کے لئے خلوص پر مبنی تھا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ دارالعلوم دیوبند قاری صاحب کے زیر اہتمام عرصہ دراز تک جانب منزل رواں دواں رہا۔ اور اس عرصہ میں ہزاروں تشنگان علوم اسلامیہ

اس چشمۂ حیات سے اپنی پیاس بجھاتے رہے اور اپنی دینی خدمات سے دنیا کو روشنی بخشتے رہے۔ عالم اسباب میں یہ سب کچھ حضرت مدنی کے بظاہر ایک معمولی مگر درحقیقت مبنی بر خلوص ایک اہم فیصلہ کی بنا پر ممکن ہوا ؎

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

یہ واقعہ دارالعلوم کی روایتی وسیع المشربی کی ایک مثال ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کا تقرر دارالعلوم میں قاری صاحب کی مرضی اور مشورہ سے ہوا تھا۔ مولانا وحید الزماں صاحب تقریباً بیس سالوں تک قاری صاحب کے زیر اہتمام دارالعلوم میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ قاری صاحب سے غایت درجہ عقیدت مندی اور احترام کے باوجود مولانا انتظامیہ کی خامیوں کی بے باکانہ نشاندہی کرتے تھے۔ اس دور میں مولانا کی جمعیۃ علماء سے وابستگی سب پر عیاں تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود قاری صاحب نے مولانا کے خلاف کبھی کوئی ایکشن نہیں لیا۔ برخاستگی تو بہت دور کی بات ہے۔ ہمارے خیال میں قاری صاحب بھی دارالعلوم کی اسی روایاتی وسیع المشربی کے امین تھے جو انھیں اپنے اکابر سے وراثت میں ملی تھی۔ اس قسم کے واقعات سے دارالعلوم کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ بطور مثال یہ دو واقعات سپرد قلم کئے گئے ہیں ؎

سکوت آموز طول داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

دارالعلوم دیوبند افراد سازی کا ایک کارخانہ رہا ہے جہاں کتاب و سنت سے ماخوذ ایک مخصوص مزاج کے حامل افراد تیار کئے جاتے تھے۔ پھر وہ اپنی اپنی صلاحیتوں، رجحانات اور حالات کے مطابق اپنے لئے میدانِ عمل ڈھونڈھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اعتصام بحبل اللہ کے مقدس رشتہ میں وہ سبھی باہم دگر مربوط ہوتے تھے۔ مادر علمی کی جانب سے تمسک بالکتاب والسنہ کے علاوہ ان پر اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں سے فراغت کے بعد ایک سبق جو وہ کبھی نہیں بھولتے تھے وہ یہ ہوتا تھا کہ انھیں ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمان رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خوشہ چینوں میں اگر فقہی پلیٹ فارم سے دیکھا جائے تو مقلدین بھی ہیں اور غیر مقلدین بھی۔ مقلدین میں احناف بھی ہیں اور مالکیہ بھی، شوافع بھی ہیں حنابلہ بھی، اگر ملی پلیٹ فارم سے دیکھا جائے تو جمعیتی بھی نظر آئیں گے، مودودی بھی۔ سیاسی پلیٹ فارم سے دیکھا جائے تو کانگرسی بھی ملیں گے اور مسلم لیگی بھی۔

انحطاط تو دارالعلوم میں بھی بہت زمانہ سے ہے مگر اب جو حالات سامنے آرہے ہیں وہ اس کے

غماز ہیں کہ اب غالباً اس کے روایاتی اور مسلکی زوال کا وقت آگیا ہے۔ یہ صورتحال ہمارے اور تمام ہی فضلائے دارالعلوم کے لئے بیحد تشویشناک ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مفادات کی پاسبان مسلم لیگ نے اپنی سیاسی ساکھ مستحکم ہونے کے بعد طوطا چشمی کا ثبوت دیا۔ حصول آزادی کے بعد کانگریس میں عصبیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت اپنا رنگ دکھانے لگی۔ جمعیۃ علماء ہند اسم بے مسمی ہوکر رہ گئی اور اپنی کارکردگی اگر کلیتہً مفقود نہیں تو بے انتہا محدود کر بیٹھی۔ احیاء دین کے نام پر جماعت اسلامی نے دین کی غیر متوازن تشریح شروع کردی۔ ان تمام ہی واقعات سے مسلمان کبیدہ خاطر ہوئے مگر شکستہ خاطر نہیں ہوئے کیونکہ ان کا اصل ملی اثاثہ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں موجود تھا جو افراد سازی کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اس امید پر بڑے سے بڑا صدمہ برداشت کرلیا کہ اگر ایک پلیٹ فارم سودمند نہیں رہا تو دوسرا پلیٹ فارم بنالیں گے لیکن اگر مردم سازی کا وہ کارخانہ ہی اپنی اصلیت کھو بیٹھا تو مسلم قوم کس امید پر جیئے گی۔

اس بنا پر ہم آپ سے مطالبہ نہیں کرتے بلکہ دست بستہ گذارش کرتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند آپ حضرات کے ہاتھوں میں ملت کی امانت ہے۔ بحیثیت ارکان مجلس شوریٰ یہ امانت بہ حفاظت اگلی نسلوں تک منتقل کرنا آپ کا دینی و ملی فریضہ ہے۔ دارالعلوم سے ہماری مراد قصبۂ دیوبند میں موجود در و دیوار نہیں بلکہ وہ تحریک ہے جس کا درس یہاں دیا جاتا رہا ہے، اگر اس تحریک کے خط و خال مٹ گئے تو یہ دفن ہو جائے گی اور یہ ایک ایسا خسارہ ہوگا جس کی نہ تو تلافی ہوسکے گی اور نہ آئندہ نسلیں ان لوگوں کو کبھی معاف کریں گی جن کے ہاتھوں یہ امانت ضائع ہوگی۔

حدیث شریف میں آتا ہے من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین۔ عام طور پر اس حدیث سے مراد ایسا شخص ہوتا ہے جسے کسی اسلامی عدالت میں عہدۂ قضا سپرد کیا گیا ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ عدالتوں میں پیش ہونے والے مقدمات عام طور پر شخصی اور انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں جن کے صحیح یا غلط فیصلہ سے ایک فرد یا چند افراد مستفید یا متاثر ہوتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند پوری ملت کی جائداد ہے۔ یہاں کی عدالت میں اگر کوئی غلط فیصلہ ہوا تو اس سے آئندہ نسلیں متاثر ہوں گی۔ یہ عدالت اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے، لہٰذا ارباب حل و عقد جس وقت یہاں مقدمات کے فیصلے کریں تو انھیں زیادہ خدا ترسی، امانت، دیانت اور تحقیق و جستجو سے کام لینا چاہیے۔

بقول کسے ایک زمانہ وہ تھا جب دارالعلوم میں دربان بھی صاحب نسبت ہوا کرتے تھے۔ پہلے لوگوں میں امانت و دیانت، تقویٰ و طہارت اور خدا ترسی زیادہ ہوا کرتی تھی، ایسے ماحول میں فیصلہ کرنے کے لئے زیادہ چھان بین اور جستجو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اب جبکہ اخلاقی قدروں کا انحطاط ہے، مکر و فریب؛

دروغ گوئی اور بہتان تراشی کا دور دورہ ہے، ایسے حالات میں کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پیشتر دو باتوں کو بطور خاص ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ایک تو کسی مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے۔ اس سے متعلق موجود دستاویزات کے علاوہ صحیح صورت حال تک پہنچنے کے لئے تحقیق و تفتیش کے ممکنہ ذرائع کا استعمال کیا جائے۔ اسلامی قانون عدالت میں ظاہری تزکیہ کے علاوہ خفیہ تزکیہ بھی موجود ہے۔ یہ درحقیقت مسئلہ کی صحیح صورت حال تک رسائی کی ایک کوشش ہوتی ہے۔

دوسرے کوئی فیصلہ صادر کرتے وقت پوری دیانت، امانت اور قیامت کے دن خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس ہونا چاہیے۔

قضا کی ظاہری اور معنوی شرطوں کو پورا کرنے کے بعد بھی اگر کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو کم از کم انسان خدا کے سامنے جوابدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون ۝ ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسہم اولئک ھم الفسقون ۝ لا یستوی اصحٰب النار واصحٰب الجنۃ، اصحٰب الجنۃ ھم الفائزون ۝

آخر میں ہماری گذارش ہے کہ ہمیں اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہے لیکن دارالعلوم دیوبند ہی ہماری زندگی کی کل کائنات ہے۔ دارالعلوم سے ذہنی اور جذباتی وابستگی ہی اس جسارت کا باعث بنی اور ہم اس خامہ فرسائی پر مجبور ہوئے۔ ہمیں آپ حضرات سے توقع ہے کہ ہماری ناپختگی کے سبب اگر اس عرضداشت میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں گے اور ہماری معروضات کو اپنی توجہات سے نوازیں گے۔

اگر زحمت نہ ہو تو مختصر سہی مگر جواب سے ضرور نوازیں۔ ہمارے لئے باعث تسکین ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جمیل الرحمن
فخر الدین احمد
محمد ارشد خان
عبد السلام قاسمی
اکرام اللہ
عبد الباری
محمد رفیق
محمد راشد
محمد شاہد ظفر
شکیل احمد
عطاء اللہ
بلال احمد
محمد مسلم
نثار احمد
عزیر احمد
عبد الحمید اظہری
صبغۃ اللہ
اقبال احمد
نثار احمد
قمر الدین
ہدایت حسین
محمد طیب
احتشام الحق
[illegible]

حضرت والا کے نام خط

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) نے آپ کے نام جو خط لکھا تھا وہ مندرجہ ذیل ہے:

۹ر جون سنہ ۱۹۹۰ء

استاذ محترم حضرت مولانا زیدت معالیکم
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

بحمد اللہ ہم جملہ احباب بخیر ہیں، خدا کرے جناب والا بھی بعافیت ہوں۔

ان سطور کا سبب یہ ہوا کہ چند ہفتہ قبل دارالعلوم دیوبند سے آپ کی برطرفی کے سلسلے میں مجلس شوریٰ کے فیصلہ کی خبر سن کر ہم تمام ہی فضلاء کو سخت افسوس اور دکھ ہوا۔ یہ خبر ہمارے لئے بے حد حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے۔ اگر یہ شخصی حادثہ ہوتا تو شاید اتنا دکھ نہ ہوتا۔ ہمارے خیال میں یہ ایک ملی و قومی حادثہ ہے۔ تیس سال تک آپ نے جس کامیابی کے ساتھ تدریسی، تربیتی، تعمیری اور انتظامی خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

آپ کی مخلصانہ اور انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ ہمیشہ سے طلبۂ دارالعلوم کی بڑی اکثریت آپ کی گرویدہ اور خوشہ چیں رہی ہے۔ آپ کو برطرف تو کر دیا گیا ہے لیکن ان تیس سالوں میں دارالعلوم دیوبند کے در و دیوار پر آپ کے اخلاص اور قربانی کے جو نقوش ثبت ہیں ان کو نہ ہی محو کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی مضمحل۔ یہی نقوش آپ کی زندگی کی کامیابی کی ضمانت اور شہادت ہیں۔ آپ کا سرمایۂ حیات آپ کے علمی فرزند ہیں جو آپ کی شخصیت اور اس کے مفید اور دلکش پہلوؤں سے اپنی زندگی میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

آپ کی برطرفی ہماری رائے میں دارالعلوم دیوبند کے لئے ایسا نقصان ہے جس کی کبھی تلافی نہ ہو سکے گی، یہی احساس فرزندان دارالعلوم دیوبند اور دیگر ہمدردان ملت کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔

ہم بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ وہ دارالعلوم دیوبند اور ملت اسلامیہ پر اپنا فضل فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
فضلائے دارالعلوم دیوبند
(سعودی عرب)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

اس کے بعد فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) نے ایک اور خط آپ کے نام لکھا جس میں افراد سازی کی گذارش کی گئی تھی اس کا جواب ملاحظہ ہو:

محبین کرام وعزیزانِ مکرم اکرکم اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۰ ستمبر کو ۲۹ یوم کے بعد بنگلہ دیش سے دیوبند واپس آیا۔ وہاں دارالعلوم کھلنا میں ۱۰ یوم قیام رہا۔ وہاں اپنے محبین مزید قیام کے خواہشمند تھے۔

چند روز پیشتر آپ سب کے دستخطوں سے مودت نامہ ملا۔ خیریت وکیفیت معلوم ہوئی۔ آپ نے افراد سازی کے جذبہ سے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جو فیصلہ کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ میں اگرچہ اب نہ فعال ہوں اور نہ کسی اہم ذمہ داری کا اہل۔ تاہم جیسا کچھ ہوں حسب استعداد وقدرت خدمت کے لئے حاضر ہوں مقدور بھر کوشش کروں گا کہ آپ کے زر ایثار وتعاون کو افراد سازی کے صحیح رخ پر خرچ کروں۔ خاموشی پر اس طرح یہ ذمہ داری قبول ہے کہ میں تصرف میں ہر طرح آزاد اور مؤتمن ہوں۔

اب مسئلہ افراد کے انتخاب کا ہے۔ ایک آدھ فرد تو اپنے ساتھ لگائے ہی رکھتا ہوں۔ مزید کے لئے نگاہِ انتخاب عمل جستجو جاری رکھے گی۔ دارالعلوم سے بے تعلق کئے جانے کے بعد اس میں قدرے دشواری اور تاخیر بھی ہوسکتی ہے.....

عربی زبان وادب کی تعلیم کا ہندوستان میں کوئی ایسا ادارہ نہیں کہ جہاں بالاشتراک عربی کے شائق اپنی طلب پوری کرسکیں۔ بہت سے حضرات کا اصرار ہے اور خود کئی بار اپنا ارادہ ہوا کہ معہد اللغۃ العربیۃ دارالمؤلفین کے ایک شعبہ کے طور پر قائم کیا جائے جس میں ایک نصاب سہ ماہی ہو صرف فضلاء مدارس کے لئے اور ایک نصاب ایک سال ہو۔ اس کے لئے چندہ سسٹم نہ ہو۔ پڑھنے والے اپنے اخراجات کے متکفل ہوں۔ اب مسئلہ تعلیم اور تعلیم گاہ (درس گاہ) کا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے پڑھا سکتا ہوں۔ مزید کام کے لئے اور معاون کے طور پر ایک مزید استاد کی ضرورت ہے۔ میں تعلیم مفت دوں گا لیکن دوسرے استاد کے لئے کم از کم ایک ہزار روپے مشاہرہ کا انتظام ضروری ہے نیز کرایہ مکان وغیرہ کا بھی انتظام ضروری ہے اس کے لئے بھی خیال ہے کہ مناسب فیس رکھی جائے۔ اس ادارہ کے قیام سے بہت سے عربی کے شائقین کو مدد ملے گی اس کا فروغ ہوگا اور ایسے افراد بآسانی دستیاب ہوسکیں گے جن کو ہم اسکالرشپ دیکر عربی اور اردو انشاء وتصنیف کے لئے تیار کرسکیں۔ اپنے پاس پڑھے ہوئے طلبہ میں سے ہی اگر افراد کا انتخاب ہو تو کم محنت میں ان کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ آپ سب اس بارے میں مشورہ کرکے رائے دیں کہ یہ قدم مناسب اور مفید

ہوگا یا نہیں اور یہ کہ اس کے لئے مالی ضروریات پوری کرنے کا کونسا نظم بہتر ہے۔ سال گذشتہ معہد اللغۃ کے قیام کا اعلان کردیا تھا کہ بیس چالیس امیدوار سامنے آئے تھے پھر دارالعلوم کی طرف سے پیش آمدہ حالات کی بنا پر اس پروگرام کو مؤخر کرنے کا اعلان کردیا تھا۔ اپنی صحت کی خرابی اور ذیابیطس کے مرض کی وجہ سے کوئی میدان کا کام نہیں کرسکتا۔ ہمیشہ تعلیم وتدریس مشغلہ رہا یا کچھ تصنیف۔ احباب کے اصرار اور مصالح وقتیہ کے باعث ملی جمعیۃ علماء کی صدارت اس شرط کے ساتھ قبول کی تھی کہ وہ عارضی ہے، اب اس ذمہ داری سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ جماعت اور رفقاء جماعت کے ساتھ رہوں گا لیکن کسی عہدہ کے بغیر اس وقت بہت کام نہیں کر پا رہا ہوں۔ بینائی کمزور ہے۔ دونوں آنکھوں میں سفید موتیا اتر آیا ہے جس کا آپریشن کے سوا کوئی علاج نہیں۔ بشرط پذیرائی اکتوبر میں ایک آنکھ کا آپریشن کراؤں۔ دعاؤں کی ضرورت ہے۔

اس وقت ایک بڑی ڈکشنری زیر ترتیب وکتابت ہے جو مصباح اللغات سے انشاء اللہ دوگنی ہوگی۔ اس کا تقریباً نصف حصہ مکمل ہوگیا ہے۔ دارالمؤلفین کی آٹھ کتابیں کتابت شدہ تیار ہیں۔ جلد ہی ان کی طباعت کرانے کا ارادہ ہے۔

معہد اللغۃ العربیہ کے بارے میں آپ سب مخلصین کے مشورہ کا منتظر ہوں۔

میری جانب سے مخلصانہ ہدیہ تسلیم وتشکر قبول ہو۔ والسلام

مخلص

وحید الزماں

۲۵ ستمبر ۱۹۹۰ء

دعوت نامہ

فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) کو جہاں حضرت والا کی اس جبری علیحدگی پر شدید رنج اور قلق تھا وہیں ان کی صحت کا بھی خیال تھا۔ لہٰذا سبھی احباب نے مل کر طے کیا کہ حضرت والا کو سعودی عرب آنے کی دعوت دی جائے جس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم لوگوں کو کچھ علمی استفادہ اور ان کی خدمت کا شرف حاصل ہوجائے گا۔ نیز آب وہوا کی تبدیلی کے باعث ان کی صحت میں نمایاں فرق پڑے گا۔ چنانچہ آپ کے نام ایک دعوت نامہ ارسال کیا گیا جس کا مضمون مندرجہ ذیل ہے:

۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء

ریاض، سعودی عرب

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

استاذ محترم زیدت معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بحمداللہ ہم احباب وفضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) بعافیت ہیں۔ امید ہے کہ حضرت والا بھی بخیر ہوں گے۔ کافی عرصہ سے آپ کی خیریت معلوم نہ ہوسکی جو ہمارے لئے باعث تشنگی و فکر مندی ہے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

ہم احباب نے جناب والا کو سعودی عرب تشریف آوری کی متعدد بار زبانی و تحریری دعوت پیش کی ہے جسے آپ نے اپنے تلامذہ اور مخلصین کی دل جوئی اور ہمت افزائی کے لئے شرف قبولیت بھی بخشا۔ لیکن کچھ تو آپ کی غیر معمولی مصروفیات اور کچھ ستم ظریفی حالات کہ ہماری یہ عقیدت مندانہ خواہش تا ہنوز خواہش ہی ہے۔

لہٰذا اب ہماری آپ سے پُرزور درخواست ہے کہ اپنی مصروفیتیں اور سہولتیں ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بعجلت ممکنہ سفر سعودی عرب کا ارادہ فرمائیں اور اپنے واضح اور قطعی پروگرام سے ہمیں مطلع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں تاکہ جناب والا کے طے کردہ پروگرام کے مطابق ہمیں اس سلسلہ میں ضروری امور کی انجام دہی کی سعادت حاصل ہوسکے۔

وقت کی تحدید کے سلسلہ میں آپ کا ہر فیصلہ ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ جناب والا اپنی سہولت کے اعتبار سے تاریخ سفر کا تعین کرلیں۔

ہم سبھی احباب بصد شوق جناب کے قطعی پروگرام سے واقفیت کے لئے گوش برآواز اور بخیر خوشی آمدید کے لئے چشم براہ ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
آپ کے تلامذہ

فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب)

اس دعوت نامہ کے جواب میں حضرت والا نے جو مکتوب ارسال کیا تھا وہ پیش خدمت ہے:

۱۵؍ شعبان ۱۴۱۲ھ

احبار کرام اعزار مخلصین اسعدکم اللہ وشملکم بفضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا دعوت نامہ موصول ہوا، آپ سب کی عافیت معلوم ہوکر خوشی ہوئی۔ اس سے قبل آپ

سب نے کئی بار دعوت دی اور میں نے اسے جذبات تشکر کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کئی بار ارادہ بھی کیا لیکن کچھ نہ کچھ عوارض پیش آتے رہے اور ارادہ کی تکمیل نہ ہو سکی۔ امسال پختہ ارادہ تھا کہ ماہ فروری میں سفر کروں گا۔ اچانک کویت کا سفر ہو گیا اور اتنی عجلت میں ہوا کہ میں اس سفر کے ساتھ ریاض کا سفر نہ جوڑ سکا.... اب چونکہ ماہ رمضان المبارک کا قرب ہے اور اس ماہ میں مجھے کہیں جانے کی نہ عادت ہے اور نہ اس کے لئے طبیعت آمادہ۔ مہمان اور میزبان دونوں ہی کے لئے اس میں کلفت محسوس کرتا ہوں۔ ماہ رمضان المبارک کے بعد کوشش کروں گا کہ ویزا مل جائے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو اوائل شوال میں ورنہ پھر ماہ محرم کے شروع میں آپ سب احباب سے ملاقات کے لئے سفر کروں گا انشاء اللہ۔ اس میں آپ سب کی جانب سے کوئی ترمیم ہو تو منظور ہے۔ رمضان المبارک کے بعد کسی بھی مہینہ میں سفر کر سکتا ہوں۔

دار المؤلفین کے اشاعتی پروگرام کے تحت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تسہیل کردہ افادات "عظمت اسلام" کے نام سے ڈھائی سو صفحات کی کتاب کی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک" پانچ سو صفحات کی کتاب بھی چھپ گئی ہے ابھی بائینڈنگ کے مرحلہ میں ہے۔ مزید کتابیں بھی طباعت کے لئے کچھ تیار ہیں۔ اور کچھ آخری مرحلہ میں ہیں۔ بڑی ڈکشنری "المعجم المحیط" (ابھی تک یہی نام ذہن میں ہے اس میں ترمیم کی گنجائش ہے) جو بڑے سائز کے کم از کم پندرہ سولہ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ تین چوتھائی تیار ہو گئی ہے ایک چوتھائی کام باقی ہے۔ چھ سو صفحات کی کتابت بھی ہو چکی ہے۔ امراض و حوادث کے باوجود آپ حضرات کی دعاؤں اور تعاون سے یہ تھوڑا سا کام کیا ہے۔ بہت سے اہم کام ذہن میں ہیں۔ ڈکشنری کی تکمیل کے بعد زندگی رہی تو انشاء اللہ کوئی دوسرا کام قرآن و حدیث سے متعلق بھی کرنا ہے۔ دعاؤں کا محتاج ہوں۔ آپ سب نے حسب حالات جس اخلاص و محبت اور ہمدردی و تعاون کا معاملہ کیا ہے اس کے لئے ایک عاصی گنہگار بجز دعا کے کیا کر سکتا ہے۔ دلی دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ جملہ پرسان حال سے سلام عرض کر دیں۔

والسلام

مخلص

وحید الزماں

ریاض کا سفر

اگست ۱۹۹۲ء میں حضرت مولانا جب ریاض تشریف لائے تو اپنے تلامذہ اور محبین کا ایک غیر معمولی

ہجوم (جو استقبال کے لئے ایرپورٹ پر موجود تھا) دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ریاض میں قیام کے دوران آپ کا کوئی دن شاید ہی ایسا ہوتا جس میں آپ تنہا ہوتے، روزانہ ہی علمی مجلس ہوا کرتی، جس میں مختلف موضوعات پر علمی و دینی بحث و مباحثہ، اکابر دیوبند اور ان کی علمی خدمات پر تفصیلی گفتگو فرماتے۔ نیز فضلاء کے اصرار پر اپنے بچپن اور گھریلو زندگی کے کچھ ابتدائی حالات بیان فرماتے باوجود خرابی صحت کے آپ چار چار گھنٹے مجلس میں نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ نشست فرماتے۔

علماء دیوبند کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے اکابر نے جو علمی ورثہ اپنی تصانیف کی شکل میں چھوڑا ہے وہ بلاشبہ ہمارے لئے گراں قدر سرمایہ ہے۔ اگر ہم ان ہی کتابوں کی تسہیل کا کام کریں اور ان کو منظر عام پر لائیں تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

حضرت والا کے ابتدائی حالات سن کر فضلاء بہت متاثر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ اگر "آپ بیتی" تیار ہو جائے تو ہم سب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہوگا۔ اور ایک شاگرد رشید نے آپ بیتی کی طباعت و اشاعت کے اخراجات کی ذمہ داری خود سے اپنے اوپر لے لی۔

اس سفر سے واپسی کے بعد مولانا نے خدا کا نام لے کر اس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس کے کچھ حصے قلمبند کر چکے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی لہذا وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہونچ سکی۔

جب فضلاء نے بار بار اصرار کیا کہ حضرت والا ہر سال ریاض کا سفر فرمالیا کریں تو آپ نے تبسم فرماکر نہایت ہی مشفقانہ انداز میں فرمایا "اس بار آپ لوگوں سے کچھ علمی کام نہ لے سکا آئندہ انشاء اللہ جب بھی آیا تو آپ لوگوں کی کان کھینچائی کروں گا اور کچھ علمی کام لوں گا" اور استاد و شاگرد کے درمیان باہمی روابط پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ سبھی حضرات نے جس جذبہ اور خلوص کے ساتھ میری عزت افزائی کی ہے اس قحط الرجال میں یہ چیز بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ خدا ہر شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ اسی طرح کی وابستگی کی توفیق دے۔ (آمین)

سفر کے اختتام پر فضلاء نے مولانا کا شکریہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

۷ر ستمبر سنہ ۱۹۹۲ء

بخدمت گرامی قدر استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب زید مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ہم فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) جناب والا کے نہایت ممنون اور شکر گذار ہیں کہ آپ نے سعودی عرب تشریف لانے کے سلسلہ میں ہماری دیرینہ دعوت کو شرف قبولیت بخشا، آپ کی

یہ خورد نوازی ہمارے لئے باعث سرخروئی و ہمت افزائی ہے۔ خاص طور سے جب ہم اس پس منظر میں سوچتے ہیں کہ آپ کے اس طویل سفر کی غرض وغایت زیارت حرمین شریفین کے علاوہ محض اپنے تلامذہ کی حوصلہ افزائی ہے تو ہمارے قلوب جذبات تشکر و امتنان سے مزید لبریز اور زبانیں اظہار شکر و سپاس سے درماندہ محسوس ہوتی ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ سفر بجائے خود اپنے دامن میں بہت سی صعوبتیں اور اذیتیں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اگر کبر سنی اور عوارض جسمانی اس پر مستزاد ہوں تو دشواریاں بسا اوقات دو چند ہو جاتی ہیں۔

آپ کی تشریف آوری ہمارے لئے سرمایہ عزت و افتخار ہے۔ آغوش مادر علمی چھوٹنے کے بعد ایک بار پھر عہد طالب علمی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ گفت و شنید اور نشست و برخاست میں ایسا لگا جیسے ہم لوگ سرزمین سعودی عرب میں نہیں بلکہ دیوبند کی فضاؤں اور دارالعلوم دیوبند کی نشاط انگیز درس گاہوں میں سانس لے رہے ہوں۔ کم و بیش ایک ماہ قیام کے دوران ہم فضلاء ایسے ہی مستفیض ہوتے رہے جیسے زمانہ طالب علمی میں کسب فیض کیا کرتے تھے۔ موجودہ نظام تعلیم میں ہر شخص کے درجنوں اساتذ ہوتے ہیں لیکن تلامذہ کی آپ سے وابستگی کی نوعیت عموماً دوسری وابستگیوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر آج وہ کچھ ہے تو اس میں زیادہ کارفرمائی آپ کی کاوشوں اور شفقتوں کی ہے۔

آپ نے اپنے فضل و کمال، خداداد صلاحیت اور ہمہ گیر شخصیت سے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں نئے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ چمنستان دارالعلوم کو نئے بیل بوٹوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے موسم کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ عندلیبان گلستان قاسمی کو ہم آہنگی کا گر سکھایا ہے۔ اس برق رفتار عہد میں سست رفتار بلکہ شکستہ پا طائروں کو بال و پر عطا کئے ہیں انھیں بلند پروازی کے طور طریقے سکھلائے ہیں۔

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

غرض دارالعلوم دیوبند کے در و دیوار پر آپ نے اپنی حیات زریں کے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں، ایسے انمٹ نقوش جن کو حالات کے کیسے ہی تیز و تند جھونکے کیوں نہ ہوں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اگر آپ کے دست نباض نے بر وقت حیات تازہ کی رگ رگ نہ پھونکی ہوتی تو کاروان قاسمی کا رگ حیات

ہیں خدا جانے کتنا پیچھے رہ جاتا۔

ارباب دارالعلوم، فضلاء اور ہمدردان دارالعلوم دیوبند کا فرض تھا کہ وہ اپنے درِّ یکتا کی قدر کرتے۔ مگر ستم ظریفیٔ روزگار کہ طوطی کی آواز گرہ کشایان چمن پر بار ہونے لگی۔

سعودی عرب میں اپنے درمیان آپ کو پاکر ہم سبھی احباب و فضلاء کو ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے اندر بڑی تقویت و افادیت کا احساس ہوا ہے لہٰذا ہم سبھی کی گذارش ہے کہ براہ کرم اگر زیادہ نہیں تو ایک سال میں کم از کم ایک ڈیڑھ ماہ ہمیں اپنے گرد موجودگی کا شرف بخشیں۔ یہ اگرچہ آپ کے لئے قدرے باعثِ زحمت ہوگا لیکن ہمارے لئے نہایت باعث رحمت ہوگا۔ ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں کہ ہم سے آپ کے تئیں کوتاہیاں ہوئی ہوں گی ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

ہم لوگ اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ دارالمؤلفین دیوبند کا قیام جن اغراض و مقاصد کے لئے عمل میں آیا وہ نہایت عظیم مقاصد ہیں۔ ان کی حیثیت ہر فاضل کے لئے حرز جاں کی ہے۔ حالات کی انتہائی نامساعدت کے باوجود اس ادارہ نے آپ کے زیر اہتمام و نگرانی مختصر سی مدت میں جو تصنیفی و تالیفی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور قابل رشک بھی۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لئے اسلامی لٹریچر بالخصوص علوم و معارف اکابر دیوبند رحمہم اللہ کی اشاعت کا ایک عہد ساز ادارہ بنادے، ہم لوگ حتی الامکان ادارہ کے ساتھ تعاون کے لئے سعی کریں گے، آپ براہ کرم ہم لوگوں کو بھی اس کے پروگراموں سے باخبر فرماتے رہیں، کرم ہوگا۔

اپنے کاروان زندگی کی اس مبارک اور مسعود ساعت میں ہم لوگ علامتی طور پر آپ کی خدمت میں ایک حقیر ہدیہ پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں، اپنے خلوص اور محبت کی بناء پر ہمیں توقع ہے کہ حوصلہ افزائی کی خاطر ہماری یہ پیش کش قبول فرمائیں گے۔ آپ کو کلی اختیار ہے کہ ذاتی استعمال کے لئے اس سے گاڑی خریدیں یا حسب منشاء جس مصرف میں چاہیں صرف فرمائیں۔ یہ آپ کی ذات کے لئے ایک معمولی نذرانہ ہے۔

ہم بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ وہ جناب والا کو صحت و سلامتی عطا فرمائے اور آپ کو ملت اسلامیہ کے لئے بیش از بیش مفید بنائے۔ آپ ہمارے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اپنے دین کی خدمت کے قابل بنائے۔ (آمین)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
فضلائے دارالعلوم دیوبند
(سعودی عرب)

مولانا حبیب الرحمن کیرانوی نمبر

ریاض کا دوسرا سفر

حضرت مولانا کا دوسرا سفر اپنے تلامذہ ومحبین کے (بذریعہ ٹیلیفون) مستقل اصرار اور خواہش پر ۱۸ ؍اگست ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ ریاض میں قیام کے دوران مختلف مذاق وخیال کے اہل علم سے مولانا کی گفت گو رہتی تھی۔ روزانہ بعد نماز عشاء علمی مجلس منعقد ہوتی جس میں پوری توجہ اور اشتیاق کے ساتھ فضلاء دارالعلوم دیوبند شریک مجلس ہوتے اور حضرت والا مختلف دینی وعلمی مسائل، اکابر دیوبند اور ان کی گراں قدر خدمات، ودیگر موضوعات پر محققانہ گفت گو فرماتے۔

ایک مجلس میں جماعت تبلیغ اور عقائد علمائے دیوبند کے خلاف لکھی گئی کتاب "القول البلیغ والدیوبندیۃ (عربی زبان میں) آپ کے سامنے پیش کی گئی تو اس کا بغور مطالعہ کیا اور شدید لہجہ میں فرمایا کہ اس تنگ نظر مؤلف نے سراسر غلط بیانی سے کام لے کر حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور عقائد علماء دیوبند کو اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ ان کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کتاب کا جواب لکھی جائے اور علماء دیوبند کے عقائد کا صحیح تعارف کرایا جائے تاکہ عرب علماء کما حقہٗ ان سے واقف ہو سکیں اور ان کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔ اور فرمایا کہ یہاں سے واپسی کے بعد ان شاء اللہ اس اہم کام کو میں خود ہی انجام دوں گا۔ لیکن افسوس کہ حضرت والا اس ارادے کو روبہ عمل نہ لا سکے۔ سفر سے واپسی کے بعد اچانک شدتِ مرض کی وجہ سے مستقل ہسپتال میں رہے اور کچھ ہی دنوں بعد سفر آخرت فرما گئے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مولانا کے تلامذہ ومحبین کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان کی اس نیک خواہش اور ارادے کی تکمیل کر کے ان کی روح کو تسکین پہونچائیں۔

باہمی اتفاق واتحاد کی تلقین

اس سفر میں ایک اہم کام یہ ہوا کہ حضرت والا کو اپنے تلامذہ کے درمیان کچھ آپسی اختلافات کا احساس ہوا تو فوراً سب کو بلا کر نہایت ہی توجہ کے ساتھ دونوں فریقوں کی باتیں سننے کے بعد فرمایا۔ آپ لوگوں کے اختلافات صرف غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔ لہٰذا آپ سبھی حضرات اپنی اپنی غلط فہمیاں دور کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر محبت کی زندگی گزاریئے اور مخلصانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کیجئے

آپسی نفرت، بیزاری کی روش چھوڑیئے۔

دونوں فریقوں کے درمیان مصالحت کراتے ہوئے فرمایا کہ کبھی کبھی ساتھ مل کر کھانے پینے کا بھی اہتمام ہونا چاہئے۔ اس سے بھی محبت و خلوص کے جذبات بڑھتے اور مستحکم ہوتے ہیں۔ اس اجتماعی پروگرام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں اپنا اپنا ماحضر لے کر کسی ایک کے مکان پر جمع ہو کر کھالیا کریں۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ سب سے ملاقاتیں ہوں گی، اجتماعیت کا سلسلہ قائم رہے گا۔ اور غلط فہمیاں دور ہوتی رہیں گی۔

اس کی افادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اپنے زمانہ مدرسی کے دوران اسی قسم کا پروگرام شروع کیا تھا جو الحمدللہ خوش اسلوبی کے ساتھ تقریباً ۱۲ سال تک چلتا رہا۔

حضرت والاؒ نے اس پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی آپ حضرات جمع ہوں تو مجھے بھی ٹیلیفون کے ذریعہ شریک کرلیا کریں۔ الحمدللہ یہ پروگرام فضلاء کے درمیان نہایت ہی خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔

کلماتِ تشکر

اس سفر کے اختتام پر فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) نے حضرت والاؒ کا شکریہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

۱۰/ستمبر ۱۹۹۴ء

مخدوم و مکرم حضرت استاذ محترم زیدت معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم تمام فضلائے دارالعلوم دیوبند (سعودی عرب) کے لئے باعث سعادت ہے کہ اس مبارک موقع پر حضرت والا کی خدمت میں اپنے جذبات تشکر پیش کریں، تقریباً دو سال پیشتر ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے جب آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا تھا اس وقت ہم احباب نے آپ سے زبانی اور تحریری گذارش کی تھی کہ کثرتِ مشاغل کی بنا پر اگر زیادہ ممکن نہیں تو کم از کم ہر سال ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے ہم غریب الوطنوں کو تلمذ اور نیازمندی کا موقعہ عنایت فرمایا کریں۔

ہمیں بے انتہا خوشی و مسرت ہے کہ ہماری اس نیازمندانہ گذارش پر آپ نے جسمانی عوارض اور اتنے طویل سفر کی ہزار صعوبتوں کے باوجود ایک بار پھر ہمیں اپنے شرف صحبت و مجالست سے سرفراز فرمایا

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر

جنابِ والا کی اس عنایت پر دل منت شناس اظہار جذبات کے لئے الفاظ کی کوتاہ دامنی سے شکوہ سنج
ہے۔ اس کا کچھ اندازہ وہی حضرات کرسکتے ہیں جنھوں نے یہاں مختلف شخصیات کی تشریف آوری کے
مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں، فضلاء کی یہ چہل پہل آپ کی تشریف آوری کے ساتھ مخصوص ہے۔
یقیناً اس کا سبب اندرون و بیرون ملک فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کے دل و دماغ پر آپ کی
پرکشش شخصیت کے وہ گہرے نقوش ہیں جن کی تابندگی گردشِ لیل ونہار اور کاروبارِ زندگانی کے
گرد وغبار کے باوجود مضمحل نہیں ہوتی۔ اخلاص وللّٰہیت، محبت وشفقت، محنت ومشقت،
خودداری وغیرت، خوداعتمادی وجرأت اور نظافت ونفاست آپ کی ذاتِ گرامی کے کچھ
نمایاں اوصاف ہیں۔

اربابِ عقل ودانش سے یہ امر مخفی نہیں کہ حضرت والا اپنی صلاحیتوں کے سبب ایک بے نظیر
استاد ہیں۔ ابنائے دارالعلوم دیوبند آپ کی صورت میں ایک استاد سے صرف تعلیمی سبق ہی نہیں
پڑھتے تھے بلکہ ایک انسان سے انسانیت کا درس بھی لیتے تھے۔

لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اقلیم علم وآگہی کے شہریاروں کی کوتاہ بینی نے
تشنگانِ علم وآگہی کو اس سرچشمۂ آبِ حیات سے محروم کردیا۔ مگر یہ امر باعثِ مسرت واطمینان ہے کہ
آپ کے ہاتھوں دارالمؤلفین کے قیام کی شکل میں قدرت کے دستِ کارساز نے ایک دوسرا میدانِ
عمل مہیا کردیا جس کی کارگذاری انتہائی حوصلہ افزا، خوش آئند اور قابلِ فخر ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی جسمانی
صحت کی صورتِ حال سے واقف ہو اور اسے آپ کے مادی وسائل کی قلت ومحدودیت کا
اندازہ ہو تو وہ اس سچائی کا یقین نہیں کرے گا کہ اس ادارہ نے نہایت قلیل مدت میں آپ کی زیرِ سرپرستی
متعدد اہم اور وقیع کتابیں شائع کرکے اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا جو فکرِ دیوبند کے گنجہائے گراں مایہ
میں قیمتی اضافہ ہیں۔

ہماری خواہش ہے کہ جنابِ والا کی زیرِ ترتیب عظیم ڈکشنری کے اخراجات میں شریک ہونے
کی سعادت حاصل کریں۔ امید ہے کہ جنابِ والا ہماری یہ پیش کش قبول فرمائیں گے جو درحقیقت
آپ کی ذات کے لئے ہماری جانب سے ایک حقیر نذرانہ ہے۔ آپ کو کامل اختیار ہے کہ جہاں اور
جیسے تصرف فرمائیں استعمال کریں۔

آخر میں ایک بار پھر ہم اپنی گذارش کا اعادہ کرتے ہیں کہ ازراہِ لطف وکرم اگر ہر سال کچھ وقت یہاں
گذارا کریں تو یہ بات ہمارے لئے باعثِ سعادت ومسرت ہوگی۔ یقیناً آپ کے تئیں ہم لوگوں سے کوتاہیاں

بھی ہوئی ہیں ہم اس کے لئے پشیمان اور معذرت خواہ ہیں۔ ہم سب لوگ بارگاہ رب العزت میں دعاگو ہیں کہ وہ حضرت والا کو صحت و تندرستی کی دولت سے مالا مال کرے اور امت مسلمہ کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ آپ سے اپنے لئے بھی دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں۔

والسلام

فضلائے دار العلوم دیوبند (سعودی عرب)

ص ب ۷۰۶۰۱ ریاض ۱۱۴۶۲

تعزیتی پیغام

آپ کی وفات حسرت آیات پر فضلاء دار العلوم دیوبند (سعودی عرب) نے ایک تعزیتی پیغام ارسال کیا جو مندرجہ ذیل ہے:

ریاض

۲۰/ اپریل ۱۹۹۵ء

محترم و مکرم جناب مولانا عمید الزماں صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۹۹۵ء کو شب میں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قدس سرہٗ کے سانحۂ ارتحال کی اچانک خبر جو یہاں بذریعہ ٹیلی فون موصول ہوئی، بجلی بن کر دل و دماغ پر گری پہلے تو یقین نہیں آیا کہ علم و ادب کا یہ روشن آفتاب اتنی جلد غروب ہو جائے گا اور تاریخ علم و ادب کے ایک سنہرے باب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن نوشتۂ تقدیر، مرضی الٰہی اور فیصلۂ سماوی کے آگے مجبور و بے بس ہو کر یقین کرنا اور بے ساختہ زبان سے کلمات قرآنی "إنا لله وإنا إليه راجعون" کہنا پڑا۔

حضرت مولاناؒ کی وفات کا یہ حادثۂ عظیم ہم سب کے لئے بڑا جانکاہ ہے مگر آج نہیں تو کل ہونا ہی تھا اور یہ سخت گھڑی ہم سب پر آنی تھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ دفعتاً اور بے وہم وگمان آگئی۔ اس سانحہ سے شکستہ خاطر ہونا ایک فطری اور طبعی امر ہے۔ ہم سچ کہتے ہیں کہ اس خبر سے دل و دماغ پر حزن و ملال، رنج و الم کی جو کیفیت طاری ہے وہ ناقابل ذکر ہے۔

حضرت استاذ محترم رحمہ اللہ کے وصال پر ملال کا حادثہ صرف آپ کا یا خاندان کا یا شہر دیوبند کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے، ان کے وصال سے علماء کی جماعت اپنے عظیم قائد سے محروم ہو گئی۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہم سب بالکل

یتیم ہوگئے۔ ان کی وفات "موت العالِم موت العالَم" کا صحیح مصداق ہے۔

حضرت استاذ علیہ الرحمۃ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو صدیوں بعد جنم لیتے ہیں اور اپنی دنیا اپنے ہاتھوں تعمیر کرنے کا حوصلہ اور عزم رکھتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزند تھے، آپ نے سخت جد و جہد کرکے عربی زبان و ادب میں ایسی مہارت حاصل کرلی تھی جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ آپ نے طریقۂ تعلیم میں ایسی جدت و انفرادیت پیدا کی جس سے عربی زبان کا سیکھنا اور بولنا آسان ہوگیا۔ برصغیر کے مدارس کے طلبہ، اسکالرز اور دانشوروں نے اس جدید طرز تعلیم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس سے بے حد مستفید ہونے کے بعد ہند و بیرون ہند کسی نہ کسی طرح عربی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ سب انھیں کی ذاتی دلچسپی، بلند نگاہی، بالغ نظری کا نتیجہ ہے۔

حضرت استاذ علیہ الرحمۃ اپنی امتیازی خصوصیات اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے سبب حضرت شیخ الادب کی جانشینی کے ساتھ ساتھ نظامت تعلیم، معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

حضرت استاذ علیہ الرحمۃ کے آغوش تربیت میں جن لوگوں نے نشو و نما پائی ہے یا جن لوگوں نے ادنیٰ سا بھی شرف تلمذ حاصل کیا ہے وہ انھیں عمر بھر نہیں بھول سکیں گے، انھوں نے ایثار و اخلاص امانت داری، راست بازی کے ایسے نمونے اور گر سکھائے ہیں جو صدیوں تک لوگوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے، ان کی علمی ادبی اور اصلاحی خدمات کئی نسلوں کے لئے سامان ہدایت ہیں جن کی فلاح و بہبود کے لئے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا، اب ہر نگاہ انھیں تلاش کر رہی ہے۔

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشہ می روی

حضرت استاذ علیہ الرحمۃ کی طلبہ نوازی کا یہ عالم تھا کہ ان کی کسمپرسی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی، ان کی بیماری، راحت و سکون، ان کے ساتھ شفقت، لطف و کرم، اخلاص و مودت اور ان کی ضروریات کا ہمہ وقت خیال رہتا۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن کی بنا پر طلبہ میں وہ بے حد مقبول و محبوب تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور آپ حضرات سے ہم سب کو محبت و عقیدت کا جو رشتہ ہے اس کے پیش نظر یہ سانحہ ہمارا اپنا خاندانی سانحہ ہے گو کہ یہ خسارہ پوری ملت کا خسارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، آپ سب پسماندگان اور ہم شاگردوں و اصحاب تعلق کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین

منجانب: فضلائے دارالعلوم دیوبند، مقیمین ریاض، سعودی عرب۔

دارالعلوم کے منتظمین کی ناانصافی

زیر نظر تحریر مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد دفتر تنظیم ابنائے قدیم کو قطر میں مقیم فضلائے دارالعلوم کی جانب سے موصول ہوئی تھی ——— ادارہ

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کی بلند پایہ شخصیت نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں معروف و مشہور ہے بلکہ عالم عرب بھی آپ کی گرانقدر خدمات سے واقف ہے، آپ نے عربی و اردو ادب دونوں میں عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، اردو صحافت سے آپ نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اور اپنے دینی اور ادبی مضامین کے ذریعہ قوم وملت کی جو زبردست ذہن سازی کی ماہنامہ "القاسم" کے پرانے شمارے اس کے شاہد ہیں۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند کی فضاء میں عربی زبان و ادب کی روح پھونکی، عربی کے جدید اسالیب سے دارالعلوم کی فضاء کو روشناس کرایا، نئی نسل میں انشاء و ادب کی ایسی روح پھونکی جس کے اثرات انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔

دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب و انشاء کے استاذ کی حیثیت سے جیسے ہی آپ کا تقرر عمل میں آیا آپ جلد ہی اپنے انوکھے انداز تعلیم و تربیت کی وجہ سے طلبہ میں انتہائی مقبول ہو گئے، تدریس میں آپ نے ہمیشہ اختصار اور سہل انداز کو ملحوظ رکھا۔ طویل اور لمبی لمبی تقریروں سے آپ نے ہمیشہ گریز کیا۔ دارالعلوم میں تقریباً ہر خاص و عام میں یہ بات مشہور ہے کہ جس طالب علم پر آپ نے خصوصی توجہ کر دی وہ باکمال بن کر ابھرا ہے یہی تمام خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے دارالعلوم کے طلبہ آپ سے ہمیشہ والہانہ اور

مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں ۔

پچھلے دِنوں دارالعلوم دیوبند میں اصلاح کی خاطر جو انقلاب آیا تھا وہ صرف آپ ہی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا ۔ یہ انقلاب اس لیے لایا گیا تھا تاکہ دارالعلوم میں ایک عرصے سے جو تعلیمی اور انتظامی خامیاں دَر آئی تھیں ان کو دُور کیا جا سکے، اور حقیقت یہ ہے کہ استاد محترم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مدظلہ العالی اپنی علمی بصیرت و ذکاوت کے ذریعہ ان تمام پروگراموں کو عملی شکل دینے کا آغاز کر چکے تھے لیکن ان کے راستے میں ان ناعاقبت اندیشوں نے ہمیشہ روڑا اٹکایا جو علم اور اس کی اقدار سے ناواقف ہیں جن کی ہمیشہ سے یہ سیاست رہی ہے کہ کسی شخصیت کو اپنے سامنے ابھرتا ہوا نہ دیکھا جائے، جو دارالعلوم میں انقلاب سے قبل بڑے زوردار لفظوں میں قسمیں کھاتے تھے کہ وہ اور ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد دارالعلوم میں آنا اکل خنزیر کے مساوی سمجھتا ہے وہ آج دارالعلوم کو ایک سیاست کا اڈہ بنا چکے ہیں وہ جس طرح چاہتے ہیں من مانی کرتے ہیں، مجلس شوریٰ کے ممبران کو گویا خرید لیا ہے، جس طرح چاہتے ہیں ان سے فیصلہ کرا لیتے ہیں، مہتمم دارالعلوم کو اپنا رشتہ دار بنا کر ان کی زبان پر بھی تالا لگوا دیا ہے۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کو جس وقت مہتمم بنائے جانے کی خبر پڑھی گئی تھی تو ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کیونکہ ان کی شخصیت شروع ہی سے غیر متنازعہ رہی ہے، حق گوئی ہمیشہ ان کا شیوہ تھا، ناجائز بات کبھی نہیں گوارہ کرتے تھے لیکن حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کو مدرسی سے الگ کیے جانے کے حادثہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی اب سیاسی جال میں پھنس گئے ہیں۔

بہرحال حضرت مولانا وحید الزماں صاحب مدظلہ العالی کو دارالعلوم سے الگ کر کے مولانا اسعد مدنی صاحب نے اپنی جس عداوت کا بدلہ لیا ہے قوم اس کو کبھی برداشت نہیں کرے گی جمعیۃ العلماء کی طرح دارالعلوم کو کبھی تباہ ہونے نہیں دیا جائے گا ۔ ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم پھر ایک شدید بحران سے دوچار ہوگا جس کا سہرا ملت کے سرخرو فرزند حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب کے سر ہوگا، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کو الگ کر کے حق کو چیلنج کیا گیا ہے ناعاقبت اندیشوں کو اس کے انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے اِنَّ بطشَ ربّکَ لشدید

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی بز

ملی و اجتماعی سرگرمیاں

مولانا عزیز الحسن صدیقی

مولانا وحید الزماں، ملی دردمندی کی علامت

۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کی تاریخ تھی اور صبح کا وقت، سخت سردی اور موسم کی خرابی کے باوجود شوکت منزل غازی پور کے ڈاکٹر انصاری ہال میں کچھ سربھرے یہ سوچنے کے لئے اکٹھا ہوئے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا کیا بنے گا، ان کے الجھے ہوئے مسائل کون حل کرے گا، کوئی صالح قیادت کھڑی ہوگی یا جمہوری ہندوستان میں ان کے سلگتے ہوئے مسائل اور بنیادی حقوق خوشنما تجاویز کے متن میں کھوتے ہی چلے جائیں گے ـــ آج کے اجتماع کی دعوت دینے والوں نے شرکاء کے سامنے چند سوالات رکھے تھے اور اپنے دعوت نامے میں بڑی صفائی سے کہا تھا:

> آزادی کا سورج طلوع ہوئے چالیس برس گذر گئے مگر اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اس کی ہمارے نزدیک ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ۲۷ برسوں میں ملک میں، سیاست میں اور ایوان حکومت میں علماء کی ایک آواز بھی ان کی رائے اور ان کی جدوجہد کی قدر کی جاتی تھی لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے چالیس برسوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ تدریجاً وہ آواز ختم ہوگئی۔ آج علماء کا، ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں رہ گیا کیونکہ انھوں نے مسائل پر کھل کر رائے دینے سے صحیح موقف اختیار کرنے سے اور اپنے موقف پر جدوجہد اور قربانی دینے کی روایتوں سے انحراف کرکے اپنے وجود اور اپنی آواز کو بے وزن کر دیا ہے۔
>
> آج میرٹھ، احمد آباد اور مراد آباد میں مسلمان ضرور آباد ہیں اور اسی طرح ملک بھر میں آباد ہیں مگر ان کے وجود، ان کی آبرو اور ان کے خون کی کیا قیمت ہے؟ اس کے باوجود

• مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور۔ (سابق رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند)

ملک میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ عوام تو عوام خواص بالخصوص علماء کرام میں بھی وہ بے چینی اور اضطراب نہیں ہے جو مسائل کو حل کرانے کے لئے درکار ہے، کوئی مرکزی فکر نہ ہونے کی وجہ سے انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ نوجوان طبقہ حتیٰ کہ ہمارے فضلاء مدارس بھی ہم سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔

ایسے بہت سے مسائل ہیں جن پر آپ سے اور آپ کے احباب سے ہم خدام کھل کر بات کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کی آبرومندی کا کوئی راستہ نکالا جاسکے۔

زیر بحث موضوع سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری ہال شرکائے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، شرکاء کے دلوں میں یقیناً اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کل تک جو جماعت ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا دھڑکتا ہوا دل سمجھی جاتی تھی اور جس نے تقسیم ملک کے قبل اور بعد انتہائی نازک لمحات میں مسلمانوں کو سہارا دیا تھا اس کے کردار کو کیسے بحال کیا جائے۔ اکابر کی راہ سے انحراف نے اس مقدس اور برگزیدہ جماعت کو کہاں پہنچا دیا ہے، اس کو سنبھالا نہ گیا تو ہمیں صدیوں تک اس کا ماتم کرنا پڑے گا۔ انھیں یہ غم بھی تھا کہ تقسیم وطن کے بعد یہی ایک جماعت تھی جس نے بیدار مغزی اور پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا تھا اور مسلمانوں کو یتیمی کی دلدل سے نکالا تھا، ان کے مستقبل کو تابناک بنانے کا جتن کیا تھا۔ اس جماعت کے لوگ حکومت کے اندر بھی تھے اور باہر بھی، مگر ارباب اقتدار کے حاشیہ نشین کبھی نہیں رہے۔ اسی جماعت کے ایک بزرگ مولانا آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا مگر افسوس کہ اس کو ہم نے کبھی نظر انداز کیا اور دوسرے بھی بھلا بیٹھے ہم نے لکیر ضرور پیٹی مگر اس پیغام سرمدی کی روح کو نہ سمجھ سکے، نتیجہ یہ نکلا کہ ہم میدان سے پیچھے ہٹتے چلے گئے، ہمارے جلسے اب مسجدوں اور مدرسوں میں سمٹنے لگے اور چند طلبہ اور سادہ لوح مصلیوں کے درمیان ہمارے شعلہ بیان مقرر جذباتی تقریروں کو حق گوئی کا معیار سمجھ بیٹھے، عوامی میدان ہم نے ان کے لئے چھوڑ دیا جو کل تک زبان نہیں کھول پاتے تھے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے بہترین داعیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور کوئی راہ ڈھونڈھی جائے، جماعت کو اور مسلمانوں کو نیا DIRECTIVE (لائحہ عمل) دیا جائے۔ خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں اور نوجوان فضلاء مدارس کو کچھ کام سونپے جائیں، ان کو مایوسی اور گمنامی کے غار سے نکالا جائے۔

اس اجتماع سے جہاں رفقاء جماعت کو خوشی ہوئی وہیں مدعیان قیادت کے چہروں کا رنگ اڑنے لگا تھا۔ انھوں نے اس خالص تعمیری و اصلاحی جلسہ کو تخریبی کارروائی قرار دیا، اور دور و نزدیک سے اس کی نگرانی شروع

کردی، الحمدللہ اجتماع ہوا اور کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ جنون عشق نے وہ راہ جسے اہل خرد لامحدود سمجھ رہے تھے چند لمحوں میں طے کرلی۔ اس تاریخی اجتماع میں جماعت کا کریم موجود تھا، قوموں کی تاریخ، ملت کی تاریخ، جہاد آزادی کی تاریخ جاننے والے موجود تھے، سوچنے والے، لکھنے اور بولنے والے موجود تھے، اکابر کی نگاہوں کو دیکھنے والے شیخ الاسلام اور مجاہد ملت کی صحبت میں بیٹھنے والے اور ان کے منشار کو سمجھنے والے بھی تھے، مولانا محمد میاں کا قلم چومنے والے بھی تھے۔

اس اجتماع کو خطاب کرنے والوں میں مولانا ہاشمی، مولانا افضال الحق قاسمی، مولانا وحید الزماں کیرانوی اور مولانا صادق علی قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ راقم سطور نے بھی کچھ ضروری باتیں عرض کی تھیں لیکن اس مضمون میں ہم صرف مولانا وحید الزماںؒ کے چند کلمات کا ذکر کریں گے کیونکہ جس نمبر میں یہ مضمون شامل ہو رہا ہے وہ مخصوص ہے۔ قائد مظلوم مولانا وحید الزماں کی شخصیت اور کردار اور خدمات کے تذکرہ کے لئے۔

سامعین دیر سے لوگوں کو سن رہے تھے لیکن نگاہ مولانا مرحوم کی طرف تھی، لوگ اس وحید العصر اور یگانۂ روزگار عالم دین اور میدان ادب کے شہ سوار کو سننا چاہ رہے تھے جو الفاظ سے تیر و نشتر کا کام لینا جانتا تھا، دکھتی ہوئی رگوں پر ہاتھ رکھتا تھا، سبکساران ساحل کو طوفانوں سے کھیلنے کا سبق دیا کرتا تھا، دلوں کو تازہ ولولوں سے گرما دیتا تھا، طبیعتوں میں جوش عمل پیدا کر دیتا تھا، اوپر سے نہایت سخت لیکن اندر سے ایسا نرم، جیسے پہاڑی چشمہ جو بہت دور تک پتھر کی سلوں کے نیچے بہتا ہے لیکن پتھر ہٹاتے ہی ابل پڑتا ہے۔ یہ بزرگ نما نوجوان جب گویا ہوا تو سب نے جگر تھام لیا۔ دل کے کانوں سے سنا، ذہن کا بوجھ ہلکا ہوا، ضمیر کی خلش دور ہوئی۔ مولانا مرحوم نے شرح و بسط کے ساتھ ماضی کی داستان سنائی، تجربات بیان کئے، واردات کا ذکر کیا، تلخ حقائق پر سے پردہ ہٹایا۔ جماعت کو اور ملت کو کیسے کیسے نقصانات اٹھانے پڑے۔ مسائل کا حل کیا ہو سکتا ہے یہ ساری باتیں بیان کیں اور زبان حال سے کہا۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

مولانا مرحوم کی یہ تقریر ایک میجر آپریشن سے کم نہ تھی جس میں گوشت و پوست کے کچھ حصے کاٹنے پڑتے ہیں، جراثیم کش دوائیں چھڑکنی پڑتی ہیں اور بینڈیج کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں مریض کو کچھ زحمت و تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے

اس اجتماع کے بعد کیا ہوا دنیا جانتی ہے۔ ہمارے خلاف ایک زبردست مہم شروع کی گئی، ضابطہ کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا گیا، جماعت سے ہمارا اخراج ہوا، اچھا ہوا کہ ہم اپنے جلتے ہوئے گھر سے خود نکل آئے

اور نشیمن کی تعمیر شروع کردی، گھٹن سے نجات ملی، اب ہم آزاد ہیں، ہمارا فکر آزاد ہے، قلم آزاد ہے اپنی مرضی سے لکھتے اور بولتے ہیں، ہم جہاں بھی ہیں خوش ہیں، مطمئن ہیں۔ جگہ بدلی ہے، موقف نہیں بدلا، ہم آج بھی جمعیۃ علماء کے نظریات کے حامل ہیں۔ یہ عبوری دور ہے، جب یہ ختم ہوگا تو صاف اور سیدھی ڈگر سامنے ہوگی۔ مستقبل کا مورخ سر پھروں کو اچھے ناموں سے یاد کرے گا جنھوں نے شیخ الہندؒ کی تحریک کے حامیوں اور مددگاروں ڈاکٹر انصاری، حکیم عبدالرزاق اور دیوبند اور جمعیۃ پر تن من دھن نچھاور کرنے والے مولانا ابوالحسن اور مولانا عبدالوحید صدیقی کے مرز بوم میں جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا، قربانی دی اور اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ ہم چشم و ابرو کے اشاروں پر نہیں حق و صداقت کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ آنے والی نسل ہمیں یاد کرے گی اور ہمارے فیصلوں کی داد دے گی۔ ہم جب کہتے ہیں کہ ملک و ملت بچاؤ تحریک کانگریس کی اسپانسر کی ہوئی تحریک تھی تو کچھ لوگوں کی پیشانیوں پر شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو تحریک مرارجی کے زمانے میں چلی تھی اندراجی کے زمانے میں کیوں نہیں چلی مسائل تو اس وقت بھی وہی تھے اور آج بھی ہیں، تحریک کا دوسرا دور چرن سنگھ کی وزارت کے زمانے میں چلا اور جہاں تک ہم جانتے ہیں چرن سنگھ نے سوائے ایک مطالبہ یعنی فسادات میں ہلاک ہونے والوں کی جانوں کے معاوضہ کی ادائیگی کے باقی سب مطالبات مان لئے تھے اور اس کے لئے کابینہ کی اجلاس تک مہلت مانگی تھی مگر اس وقت تحریک کے ذمہ داروں نے مہلت نہیں دی اور کہا کہ آپ کابینہ کی منظوری حاصل کرتے رہیئے ہم تو تحریک چلائیں گے لیکن جب اندراجی تخت پر بیٹھ گئیں تو کچھ بھی نہیں ہوا، تیسرے دور کا اعلان ہوا، رضاکار اپنے گھروں سے چل پڑے، راستے میں اور دہلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے سادہ کاغذ پر دستخط کرکے جنرل شاہنواز خاں کو دے دیا اور کہا کہ اس پر جو چاہئے لکھ لیجئے، ہمیں سب منظور ہے۔

اس کے بعد دہلی میں جشن فتح کا اعلان کردیا گیا۔ ہوا کچھ بھی نہیں بوٹا سنگھ کی بوٹی اپنا کام کرگئی اور پہاڑ کاٹنے والے زمین سے ہار گئے۔ اندراجی کے دست راست بی پی موریہ زندہ ہیں، کسی کو سننے کا یارا ہو تو تحریک کے کانگریس کی جانب سے اسپانسر کئے جانے کی کہانی سن سکتا ہے۔ جس دن جنرل شاہنواز خاں تہاڑ جیل سے رہائی پانے والے تھے جیل کے باہر سیکڑوں کانگریسی جھنڈے اور باجہ گاجہ لے کر پھاٹک کھلنے کے انتظار میں کھڑے تھے۔

تحریک کا انجام بد، ایمرجنسی کے زمانے میں سہل پسندی اور امارت کی ضد، یہ تین چیزیں ہیں جنھوں نے جماعت میں دراڑ پیدا کی۔

مولانا وحید الزماںؒ نے ۱۷؍ دسمبر کی تقریر میں ان تمام خامیوں کی نشاندہی کی۔ یہ بات نہیں ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے زبان نہیں کھولی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ سچی بات کہی اور صحیح مشورے دیئے مگر اس کی قدر نہیں کی گئی اور

مخالفت ودشمنی پر محمول کیا گیا، کانگریس جو ایک جمہوری جماعت اور آزادی سے قبل مختلف سیاسی نظریات رکھنے والوں کا ایک فورم تھی اور آزادی کے بعد بھی اس کی ورکنگ کمیٹی اور جنرل کونسل میں خوب بحثیں اور اختلاف رائے ہوا کرتی تھی مگر ایمرجنسی نے کانگریس کی اس روایت کو ہضم کرلیا۔ اور اسی وقت سے اس کا جمہوری کردار مشکوک ہوگیا۔ ہماری جماعتی قیادت اور ہائی کمان کی کانگریس سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ووابستگی نے جماعت کو اسی ڈگر پر ڈال دیا جس پر کانگریس چل رہی ہے۔ جمعیۃ ایک ایسی جماعت تھی جس کے ممبر کسی بھی سیاسی جماعت میں شریک ہوسکتے تھے مگر جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر سب ایک ہوتے تھے۔ مولانا سید حمید الدینؒ نے ایک موقع پر کہا تھا، جمعیۃ کی سیاست یہ ہے کہ وہ کہتی ہے کہ ہم سیاست میں نہیں ہیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں جماعت کا رول بالکل بدل گیا۔ آزادی سے قبل کانگریس کے فیصلے جمعیۃ کے تابع ہوا کرتے تھے۔ مثال میں نہرو رپورٹ کو پیش کرسکتے ہیں جس کا مسودہ ۱۹۲۸ء میں موتی لال نہرو نے پیش کیا تھا جس کو علماء نے رد کردیا تھا۔ اور اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے لاہور میں اپنا اجلاس طلب کرکے خود اس کو رد کردیا۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے جبلپور کے فساد کے بعد ڈاکٹر سید محمود کی صدارت میں جب مسلم کنونشن طلب کیا تو کانگریس نے اس کی سخت مخالفت کی اور یہ طے کردیا کہ جو کانگریسی اس میں شریک ہوگا کانگریس سے نکال دیا جائے گا۔ مولانا عبد الحمید اعظمی کہتے ہیں کہ میں دفتر جمعیۃ علماء ہند میں موجود تھا، مولانا مرحوم دفتر سے یہ کہہ کر پنڈت نہرو کے پاس گئے کہ نہرو جی نہیں مانے تو آج پارلیمنٹ کی ممبری کا طوق گردن سے اتار کر آؤں گا۔ قیادت اس کو کہتے ہیں۔ مولانا کے دلائل کے آگے نہرو جی ڈھیر ہوگئے اور فیصلہ واپس لے لیا۔

سچ پوچھئے تو مولانا وحید الزماںؒ اس درد کی ایک علامت تھے جو ملت کے سینے میں رہ رہ کے اٹھتا ہے ایک چیخ تھے جو مظلوموں کی زبان سے نکلا کرتی ہے، وہ کچھ کرنا چاہتے تھے، خفتگان خواب غفلت کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے، ان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ اعتراف کرنا چاہئے کہ دارالعلوم اور جمعیۃ دونوں اداروں سے انھیں عشق تھا انھوں نے دونوں کو بہت کچھ دیا، نوجوانوں کو گلے لگایا، ان کے وجود میں بجلیاں بھردیں اور خود بھی اندر اندر سلگتے رہے، لوگوں نے انھیں غصہ ور کہا، زود رنج کہا لیکن یہ جاننے کی کوشش نہیں کی ان کے دل کا درد کیا ہے پھر مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا حفظ الرحمان کو بھی غصیلا اور بد مزاج کہئے اور اپنی عاقبت خراب کیجئے۔

بلاشبہ وہ دارالعلوم کے قضیہ میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے مقابل آگئے تھے مگر حکیم الاسلام کی طبعی شرافت وفراست ہر ہیجان انگیز موڑ پر شفقت وترحم کی پھواریں برساتی تھی حکیم الاسلام نے انھیں دل سے قبول کررکھا تھا اور دارالعلوم کے لئے بیحد مفید سمجھتے تھے۔ اجلاس صدسالہ کے موقع پر انھوں نے جو کچھ کیا اور احاطہ دارالعلوم میں جو گل بوٹے کھلائے سچ پوچھئے تو اس کے پیچھے حکیم الاسلام کا وہ بھروسہ واعتماد

(بقیہ صفحہ ۴۸۶ پر)

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

مولانا فصیح الدین دہلوی

مولانا وحید الزماںؒ دارالعلوم اور جمعیۃ علماء ہند

یہ بات ۱۹۵۸ء کی ہے، میں مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فتحپوری میں زیر تعلیم تھا۔ جلالین، ہدایہ اولین اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ رہا تھا۔ برادرم عمید الزماں، مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کے چھوٹے بھائی بھی اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ وہ میرے ہم سبق نہیں تھے۔ جیسا کہ دستور ہے کہ مدرسہ میں، خاص طور پر کسی چھوٹے اور اوسط درجے کے مدرسہ میں، جہاں طلبہ کی تعداد مختصر ہوتی ہے؛ وہاں طلبہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اگرچہ میں اور مولوی عمید الزماں صاحب ہم سبق نہیں تھے، لیکن میں اُن سے بالواسطہ واقف تھا۔ وہ اس طرح کہ حفظ قرآن کے مرحلہ میں، میرے استاذِ محترم حافظ محمد قمر صاحب کیرانہ کے باشندہ ہونے کے سبب، مولانا مرحوم کے والد مرحوم مولانا مسیح الزماں صاحب کا اکثر مختلف مواقع اور مناسبت سے ذکر کرتے تھے۔

اسی سال مدرسہ کے طلبہ میں اپنی ایک تنظیم "جمعیۃ الطلبہ" قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ راقم الحروف، برادرم مولوی عمید الزماں اور مولوی جمیل الرحمٰن (صاحبزادۂ مولانا واصف صاحب اور نبیرۂ مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ) ہم سب ان طلبہ میں تھے جو اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ تنظیم قائم ہوگئی۔ جس کا بنیادی مقصد طلبہ کی ان صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا تھا، جو کہ براہِ راست نہ سہی، لیکن بالواسطہ طور پر تعلیم ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم لوگ ہر ہفتہ جمعرات کے روز بعد نماز مغرب ایک اجتماع کا اہتمام کیا کرتے تھے، جس میں طلبہ مختلف موضوعات پر تقریریں کرتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار ہم نے مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی۔ مولانا نے انتہائی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا۔ وقتِ موعود پر میں مولانا کو لینے کے لیے جمعیۃ علمائے ہند کے پرانے دفتر واقع گلی قاسم جان گیا۔ مولانا میرے ساتھ پیدل چل کر لال کنواں اور کٹرہ بڑیاں کے راستہ مسجد فتحپوری تشریف لائے۔ اجتماع میں شرکت فرمائی۔ تقریر کی اور طلبہ کو نصائح اور مشوروں سے نوازا۔ اللہ! اللہ! کیا شان تھی ان بزرگوں کی! یہ عظمت اور یہ سادگی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بس یہ تنظیم اور اس کی سرگرمیاں ہی نقطۂ آغاز ہیں مولانا وحید الزماں مرحوم سے تعلق کا ــــ اس لیے کہ تنظیمی عمل نے ہم سب رفقاء کو (راقم، مولوی عمید الزماں، مولوی جمیل الرحمٰن اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی انیس الرحمٰن)

تعلق کے ایک ایسے مضبوط بندھن میں باندھ دیا جو الحمدللہ تاحال اسی طرح مضبوط اور پائدار ہے۔ بلکہ اس کی مضبوطی میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ ۵۸ء سے ۹۵ء تک ۳۷ سال کے طویل عرصہ میں زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں گزرا جس میں یہ رفقاء ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک نہ رہے ہوں... اور الحمدللہ تادم تحریر ایسا ہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس تعلق کا دائرہ گھر کے دوسرے افراد تک وسیع ہو گیا اور سب ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہو گئے۔

جمعیۃ الطلبہ کے دفتر کی حیثیت سے مسجد فتحپوری کے دارالاقامہ کا ایک کمرہ ہم لوگوں کی تحویل میں تھا۔ اکثر یہاں ہم لوگ جمع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں مولانا مرحوم کے ایک دوسرے بھائی مرحوم مولوی حمید الزماں بلیماران میں رہتے تھے، عمید الزماں بھی انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ مولانا وحید الزماں صاحب جب دہلی تشریف لاتے تھے تو اسی گھر میں قیام رہتا تھا۔ مولانا سے ملاقات اور تعارف اسی جگہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک یا دو مرتبہ مولانا مسجد فتحپوری کے اس کمرے میں، جو کہ جمعیۃ الطلبہ کا دفتر تھا، مقیم رہے۔ اس طرح ان سے قریب ہونے اور ان کو سمجھنے کا ایک بہتر موقع میسر آیا۔

آئندہ تعلیمی سال میں یہ تینوں رفقاء (عمید الزماں، جمیل الرحمٰن اور انیس الرحمٰن) دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور میں تنہا رہ گیا... اب تنظیم کی سرگرمیاں بھی دھیمی پڑ گئیں بلکہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئیں۔ لیکن رفاقت اور تعلق کی جو بنیاد قائم ہو گئی تھی، اس پر تعمیر کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ میں نے دوستوں سے ملاقات اور دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے شوق میں دیوبند کا سفر کیا اور اس موقع پر "دارالفکر" بھی دیکھا۔ وہ دارالفکر جو مولانا وحید الزماں مرحوم کے ذہن رسا اور فکر و نظر کا ابتدائی عملی نمونہ تھا۔ یہ پودا جس کو مولانا وحید الزماں مرحوم نے محض اپنی ذاتی کوشش اور کاوش سے لگایا تھا، اس کو اگر مخلصین اور معاونین کی مدد حاصل ہوتی تو یقیناً ترقی پا کر ایک پورا چمن زار بن جاتا۔ اس طرح مرحوم کے ساتھ جو تعلق قائم ہوا تھا، وہ آگے بڑھتا رہا۔ میں نے دارالفکر میں بہ حیثیت ایک مہمان کے جو چند ایام گزارے، وہ بہت اہم ہیں۔ بایں معنی کہ میں نے وہاں سے ایک فکر اخذ کیا۔ ایک خاموش رہنمائی حاصل کی۔ مولانا وحید الزماں کی ذاتی کتابیں، رسالوں اور عربی زبان کے اخبارات و پمفلٹ وغیرہ کا مجموعہ یہاں موجود تھا۔ ان سب پر نظر ڈالنے اور دیکھنے سے طبیعت میں ایک امنگ اور جوش اور ذوق و شوق پیدا ہوا۔ ایک ایسا ذوق و شوق جو آگے چل کر ایک حقیقت اور امر واقعہ بن گیا۔ ذہن اور دماغ کا رُخ اسی طرف مڑ گیا۔ ایک سمت سفر متعین ہو گئی۔ مختلف مراحل اور منزلوں سے گزرتے رہے۔ لیکن رُخ نہیں بدلا۔

دارالعلوم میں داخلہ

میں نے شعبان ۱۳۷۹ھ مطابق فروری ۱۹۶۰ء میں مدرسہ عالیہ فتحپوری سے

سندِ فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد یہ طے کیا کہ دورۂ حدیث دوبارہ دارالعلوم میں پڑھا جائے۔ وہاں داخلہ مل گیا۔ لیکن بعد میں استاذ محترم مولانا عبدالسمیع صاحب مدظلہ کے مشورہ پر اس میں تبدیلی کی گئی اور فنون کی مختلف کتابیں دارالعلوم میں پڑھیں، میبذی، سامرہ، سراجی وغیرہ۔

دارالعلوم کے قیام کے دوران مولانا وحید الزماں صاحب سے تعلق میں مزید اضافہ ہوا اس میں پختگی پیدا ہوئی۔ دارالفکر سے جو "فکر" حاصل کیا تھا، اب وہ فکر و نظر کے مرحلہ سے نکل کر عملی شکل اختیار کرنے لگا۔ چنانچہ دارالعلوم میں رفقاء اور احباب کے اسی پُرانے گروپ نے اپنی تعلیمی اور لسانی سرگرمیاں شروع کر دیں اور نتیجہ کے طور پر ایک پندرہ روزہ مطبوعہ جریدہ "الیقظة" کے نام سے جاری کیا گیا جس کے مدیر برادرِ عزیز جناب مولانا عمید الزماں صاحب تھے۔ اسی دوران یہاں جامعہ ازہر کے مبعوث شیخ محمود عبدالوہاب محمود (مرحوم) بھی تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں بھی میں شریک ہوتا تھا۔ دیوبند کے قیام کے دوران درسی اوقات کے علاوہ زیادہ وقت دارالفکر ہی میں گزرتا تھا۔ وہاں احباب اور رفقاء کی جو مجلسیں ہوتی تھیں، اس کے نقوش ذہن میں ابھی تک تازہ ہیں۔ اس وقت تک مولانا وحید الزماں صاحب دارالعلوم میں مدرس نہیں ہوئے تھے، ان کی توجہ، سرگرمی اور عملی کوششوں کا محور "دارالفکر" ہی تھا۔ اسی دوران انھوں نے ایک ماہنامہ اُردو میں "القاسم" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ پرچہ کتنے عرصہ تک نکلتا رہا۔ لیکن اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ مرحوم کے جو علمی، تعلیمی، ادبی اور لسانی منصوبے ہیں، حالات کی ستم ظریفی اور معاشی تنگدستی، ان کی تکمیل میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ کسی طرف سے ایسی ہمت افزائی نہ ہوتی جو ان کاموں کی تکمیل میں مساعد و معاون بنتی جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ میرے تعلق کی نوعیت ایک "قریبی اور ذاتی" حیثیت کی تھی اس لیے میں بعض حالات سے واقف تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وقت مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کی زندگی کا ایک "صبر آزما" مرحلہ تھا، چونکہ وہ بڑے تھے، اس لیے گھر کے دوسرے افراد کی ذمہ داری بڑی حد تک ان پر اور کسی حد تک ان کے چھوٹے بھائی حافظ حمید الزماں مرحوم پر تھی (جو مولانا مرحوم سے دو سال چھوٹے تھے)۔

ایک شریف اور وضعدار خاندان میں، جہاں اقدار اور روایات کا اہتمام اور وضع کی پابندی کو دوسری ہر چیز پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہو، وہاں یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی عارضی اور عبوری پریشانی اور دشواری کے پیش نظر اپنے ماضی سے بغاوت کر دی جائے؛ ہرگز یہ ممکن نہیں تھا۔ مرحوم نے اپنی ذمہ داریوں کو جس سلیقہ، ہمت اور حکمت کے ساتھ نبھایا، اس کی مثال کم از کم دورِ حاضر میں مشکل ہی سے ملے گی۔ غالباً ۱۹۶۳ء میں یا ۱۹۶۴ء میں (مجھے صحیح یاد نہیں) وہ دارالعلوم سے باقاعدہ وابستہ ہو گئے تھے۔ میں ان کے زمانۂ تدریس کے واقعات کی تفصیل سے تو واقف نہیں، یہ میدان تو اُن کے عزیز شاگردوں اور ان رفقاء و احباب کا ہے جو ان کے ساتھ

وہاں رہے۔ البتہ اجمالی طور پر کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور ہے۔ انھوں نے ایک کامیاب، بلکہ انتہائی کامیاب مدرس، استاذ، مربّی اور منتظم کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا اعتراف نہ صرف ہمدردوں سے بلکہ مخالفین سے بھی کرایا۔ وہ بہت تیزی سے کامیابی اور ترقی کے مدارج طے کرکے درجۂ علیا میں پہنچ گئے۔ ان کے عہدِ تدریس کی امتیازی خصوصیت عربی زبان وادب کی ترویج اور اس کی تدریس کو ایک نیا رُخ دینا ہے۔ نہ صرف دارالعلوم دیوبند میں بلکہ دیگر بہت سے مدارس میں بھی مولانا کی اس جدوجہد کے نتائج واضح اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ بہت سے مدارس تو ایسے ہیں کہ جن کا قیام اور تاسیس بھی مرحوم کی دین ہے۔ میرے علم کے مطابق مرحوم کے بہت سے ہونہار، باصلاحیت اور ذی استعداد شاگردوں نے ان کے ایما اور مشورے سے مدارس قائم کیے اور مرحوم مولانا وحید الزماں نے ان کے قیام اور ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے ان مدارس میں گئے، وہاں قیام کیا، منتظمین کی رہنمائی کی اور اساتذہ وطلبہ کو اپنے مشوروں سے نوازا۔ ان کے لیے نظام الاوقات مرتب کیے، حالات کے مطابق نصاب اور کتب درس میں تعدیل وترمیم کی۔ غالباً مشرقی یوپی کے بعض علاقوں میں ایسے بہت سے مدارس ہیں جہاں اکثر مولانا وحید الزماں صاحب جایا کرتے تھے۔ اور زندگی کے آخری ایام میں (شاید ۱۹۹۰ء میں) اپنے بعض شاگردوں کی دعوت اور اصرار پر بنگلہ دیش کا سفر بھی کیا تھا اور وہاں کچھ عرصہ قیام کرکے بعض مدارس میں تدریسی اور انتظامی امور میں اپنے گراں قدر مشوروں سے خدمت علم انجام دی تھی۔

تصنیفی وصحافتی تجربہ

درس وتدریس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے میدان ہیں، جن میں مولانا موصوف نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تصنیف وتالیف کا شعبہ ہے۔ عربی زبان وادب تو ان کا خاص میدان تھا۔ ان کی ترتیب دی ہوئی "اردو- عربی" اور "عربی- اُردو" ڈکشنریاں مقبول عام ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی کتابیں مرتب کی ہیں اور اپنی نگرانی میں دوسروں سے مرتب کرائی ہیں۔ صحافت اور طباعت کا بہت اعلیٰ تجربہ تھا۔ طباعت کے تعلق سے میں نے خود دیکھا ہے: چند منٹ میں مسودہ دیکھ کر یا یہ اندازہ کرکے کہ یہ کتاب کتنے صفحات اور کس سائز کی ہوسکتی ہے مکمل تخمینہ اور پوری فنی تفصیلات بتادیتے تھے۔ دارالعلوم کے زمانۂ تدریس میں انھوں نے ایک عربی سہ ماہی مجلہ "دعوۃ الحق" جاری کیا اور اس کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد ایک پندرہ روزہ جریدہ "الداعی" دارالعلوم سے شائع کیا گیا، اس کے بھی آپ بانی ایڈیٹر رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا عربی ترجمان "الکفاح" (پندرہ روزہ)

مرحوم کی کوششوں اور کاوشوں کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ بیشک افراد واشخاص کو دیر تک بقار حاصل نہیں رہتا، اس کے مقابلہ میں ادارے، تنظیمیں اور جماعتیں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اداروں اور جماعتوں کی اہمیت، مقبولیت اور کارکردگی کے پیچھے متحرک، فعال اور باکردار افراد ہی ہوتے ہیں۔ جس جماعت اور ادارے سے باصلاحیت افراد وابستہ ہوتے ہیں، اس کی کارکردگی میں ان افراد کا کردار نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ مرحوم نے ایک خاص صورتِ حال کے پیش نظر اپنی مرضی اور ارادے سے "الکفاح" کی ذمہ داری سے دست کشی اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد ذمہ داران جمعیۃ علمار ہند اخبار کو زندہ نہیں رکھ سکے اور وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ جماعت کے پاس وسائل کی فراوانی ہی نہیں بلکہ طغیانی ہے۔ مگر محض وسائل بیکار اور بے اثر ہیں جب تک کہ ان کو روبہ عمل لانے کے لیے مناسب اور موزوں افراد نہ ہوں، باصلاحیت اور ذی استعداد عناصر کی بنیادی اہمیت ہے۔

جمعیۃ علمار ہند سے وابستگی

مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کا جمعیۃ علمار ہند سے تعلق اور وابستگی تو پشتینی ہے۔ ان کے والد محترم مولانا مسیح الزماں صاحب کانگریس اور جمعیۃ کے سرگرم اور فعال رکن تھے۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا، جیل بھی گئے۔ ان کی فکری اور ذہنی پختگی اور صلابت رائے کا یہ ثبوت ہے کہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مسلم لیگ کے ساتھ تھے، بلکہ مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کے اہم ترین رکن اور روحِ رواں تھے۔ ان کا ذاتی اور شخصی تعلق مولانا مسیح الزماں صاحب سے اس درجہ کا تھا کہ جب بھی کیرانہ تشریف لاتے تو قیام مولانا مسیح الزماں ہی کے گھر پر ہوتا تھا۔۔۔ اس دور کی سیاست آج کی "مفاد پرستی" اور "مصلحت بینی" کے جراثیم سے پاک تھی۔ کیا مجال ہے کہ تعلق اور وضعداری کے اس بلند درجہ پر فائز ان حضرات کی نیت پر کسی کو شک بھی ہو جائے۔ مولانا مسیح الزماں صاحبؒ کے ساتھ کانگریس کے جو ورکر ہیں یا حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مسلم لیگی ہمنوا، ممکن نہیں کہ اپنی قیادت کو ذرا بھی شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس ڈسپلن اور انضباط کے پیچھے اصل قوت قیادت کے بلند کردار کی تھی۔ ان حضرات کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ ان کی خلوت وجلوت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ اسٹیج پر جو کہتے تھے اس پر ہر حال میں ثابت قدم رہتے تھے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ سے ذہنی تعلق اور فکری وابستگی مولانا وحید الزماں مرحوم کو اپنے والد محترم سے وراثت میں ملی تھی۔

مولانا وحید الزماں مرحوم کی اصل سرگرم علمی زندگی کا آغاز دارالعلوم دیوبند کی مدرسی سے ہوا۔ یہ بات ایک کھلی

اور واضح حقیقت ہے کہ مولانا اسعد صاحب اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان طویل عرصہ سے ایک سرد جنگ جاری تھی۔ دارالعلوم کا ہر مدرس، ہر ملازم، شہر دیوبند کے باشندے اور طلبہ سب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دارالعلوم کے اندر ہمیشہ یہ صورت حال رہی کہ کچھ لوگ صاحبزادہ ہونے کے باعث مولانا اسعد صاحب کے ہمنوا، ان کے خیمہ بردار اور حمایتی سمجھے جاتے تھے اور کچھ لوگ حضرت مہتمم صاحب مرحوم کے۔ یہ چشمک کافی پرانی تھی اور ہر موقع پر کسی نہ کسی شکل میں اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ ایسی صورت حال تھی کہ ایک خیمہ کے لوگ دوسرے خیمہ کے لوگوں سے تاحد امکان تعلقات سے گریز کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو دارالعلوم دیوبند میں مدرس یا ملازم تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ اس سرد جنگ کی تپش سے دور رہیں۔ البتہ بعض پرانے اور سینئر اساتذہ جن کا اپنا ایک منصب اور مقام تھا، وہ نسبتاً اس خطرے سے قدرے دور تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان حضرات کی صفوں میں بھی خیمہ برداری کی نسبت واضح تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محترم مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم نے جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت قبول کرکے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔ اس لیے کہ ذمہ داران جمعیۃ اور دارالعلوم دیوبند کے درمیان جو کش مکش تھی، وہ اس کا شکار بن سکتے تھے۔ اس پیش کش کی قبولیت خطرات سے خالی نہ تھی۔ بڑی حد تک یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مرحوم کی جگہ کسی اور مدرس یا دارالعلوم سے وابستہ کسی عہدیدار کو یہ پیش کش کی جاتی تو وہ قبول نہ کرتا۔ لیکن مولانا وحید الزماں نے "دو متحارب طاقتوں" کے ساتھ وابستہ رہ کر دونوں جگہ اپنی ذمہ داریاں اس خوبی سے انجام دیں کہ خراج تحسین وصول کیا۔ اور اپنی وہ حیثیت اور مقام بنایا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی انگشت نمائی کی جرأت نہ ہوسکی۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ "حیثیت" اور یہ "مقام" ہی ان کے لیے مصیبت بن گیا۔

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

مولانا اسعد کا سیاسی مزاج

جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا اسعد صاحب کا مزاج سیاسی ہے اور طویل عرصہ سے عملی سیاست میں سرگرم ہونے کی وجہ سے یہ مزاج مزید پختہ ہوگیا ہے۔ ان کی منصوبہ بندی طویل المدت ہوتی ہے۔ ... اس کو بدگمانی بھی کہہ سکتے ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک یہ بات مولانا اسعد صاحب کی سیاسی دوربینی بھی ہوسکتی ہے کہ انھوں نے مرحوم کو ورکنگ کمیٹی کا رکن بنا کر ان سے قلعہ دارالعلوم کی فتح میں مدد لی۔ بہرحال یہ بات اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے کہ اگر اس سے قبل نہیں تو کم از کم ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک معرکہ دارالعلوم میں مولانا وحید الزماں صاحب کا کردار ایک سپہ سالار اور کمانڈر انچیف کا کردار ہے۔

اس طرح مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کی عملی زندگی کی سرگزشت ان دونوں اداروں (دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند) سے تعلق اور وابستگی کی ایک روئداد ہے۔ وہ دونوں جگہ ذمہ دارانہ حیثیت سے معاملات میں دخیل رہے۔ عصرِ حاضر کی صحافتی اور سیاسی اصطلاح میں اگر یہ کہا جائے کہ اسٹیج پر اُن کا کردار مرکزی رہا، خاص طور پر دارالعلوم دیوبند میں، تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

راقم بھی چونکہ براہِ راست جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہا ہے، اس لیے مرحوم کے سلسلہ میں میری یادداشتیں زیادہ تر جمعیۃ کے تعلق ہی سے ہیں۔ دارالعلوم کے معاملات سے متعلق میری معلومات اتنی ہی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت میں جمعیۃ علماء سے بھی ہے۔ آخر کار دونوں ادارے ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور دونوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ فصل کرنا مشکل ہے۔

جمعیۃ علماء ہند سے میرے تعلق کی ابتداء ۱۹۵۸ء میں اس وقت ہوئی، جبکہ مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن مرحوم کی خواہش پر مجھے جمعیۃ کے پرانے دفتر واقع گلی قاسم جان میں، نمازِ تراویح میں قرآنِ کریم سنانے کا شرف حاصل ہوا، میں اس وقت مدرسہ عالیہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ ۵۸ء سے لے کر ۶۲ء تک برابر پانچ سال یہ شرف حاصل رہا۔ اُس وقت کی بہت سی یادیں اِس وقت ذہن کے نقشہ پر اُبھر رہی ہیں۔ لیکن اس کا نہ وقت ہے، نہ موضوع سے تعلق۔ اگست ۶۲ء میں مجاہدِ ملت کا انتقال ہوگیا۔ جب مولانا اسعد مدنی صاحب نے ناظمِ عمومی کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تو ان کی خواہش ہوئی کہ ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل کی جائیں جو عرب ممالک سے تعلقات قائم کرنے، اسلامی ممالک کے سفارتخانوں سے رابطہ قائم کرنے، خط وکتابت کرنے اور مختلف مواقع پر ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے۔ چنانچہ احقر پر نظرِ انتخاب پڑی، ابتدائی دور تھا، خود جماعت ابھی انقلاب اور انتقالِ اقتدار کے مرحلہ سے گزر رہی تھی۔ چند روز میں نے یہ خدمت انجام دی اور اس کے بعد مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو پورا وقت دے سکے۔ نظرِ انتخاب برادرم مولانا عمید الزماں صاحب پر گئی۔ وہ اُس وقت دارالعلوم دیوبند میں ایک ادارہ کے انچارج تھے۔ اس کو حضرت مولانا محمد طیب صاحب مرحوم نے بعض اہلِ خیر کے تعاون سے قائم کیا تھا۔ جس کا مقصد علومِ قرآنی، نیز اکابرِ دیوبند، خصوصاً حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی تسہیل اور ان کو عربی زبان میں منتقل کرنا تھا۔ غالباً اس ادارہ کا نام "اکیڈمی قرآن عظیم" تھا (معلوم نہیں اب یہ ادارہ باقی ہے یا نہیں؟) میرے علم کے مطابق برادرم عمید الزماں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل کی تعریب کا کام مکمل بھی کرلیا تھا۔ بہرحال مولانا اسعد صاحب اُن کو آمادہ کرکے دہلی لے آئے اور تعلقاتِ عامہ اور عربی زبان سے متعلق خدمات ان کے سپرد کردی گئیں۔ اس وقت دفتر جمعیۃ مسجد عبدالنبی میں منتقل ہوگیا تھا۔ مئی ۶۵ء سے غالباً اگست یا ستمبر ۶۷ء تک برادرم عمید الزماں نے جمعیۃ کے مرکزی دفتر میں خدمت انجام دی۔ ان کا مزاج

علمی اور پُرسکون ماحول میں رہ کر کام کرنے کا ہے۔ جس وقت انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی تو خیال یہ تھا کہ کام کے بہتر مواقع میسر ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں اس وقت کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں، بلکہ مشاہد ہوں۔ وہ پریشانیاں اور دشواریاں میرے علم میں ہیں جنھوں نے ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ترک تعلق کرلیں۔ (تفصیل کا موقع نہیں)۔

ان کے جانے کے بعد یہ خدمت عرصہ پچیس سال تک راقم الحروف نے انجام دی۔ جب مولانا وحید الزماں مرحوم ورکنگ کمیٹی کے رکن بنائے گئے تو یقیناً یہ بات میرے لیے خوشی و مسرت کا باعث تھی۔ وہ پابندی سے ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اکثر کسی خاص موقع پر یا کسی ذیلی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے دفتر آتے تھے، میں چونکہ تقریباً روزانہ ہی دفتر جاتا تھا اس لیے ملاقات، بات چیت اور باہمی دلچسپی کے موضوعات و مسائل پر گفتگو کا موقع خوب میسر آتا تھا۔ وہ اگرچہ ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے اور میرے سپرد ایک خاص نوعیت کی ذمہ داری تھی۔ لیکن اس کے باوجود میرے اور ان کے درمیان بہت سے کاموں میں نہ صرف باہم مشورہ بلکہ اشتراکِ عمل بھی رہتا تھا۔ خاص طور پر جب سے پندرہ روزہ "الکفاح" جاری ہوا، اس وقت سے یہ اشتراکِ عمل اور بڑھ گیا تھا۔ بہت عرصہ تک برادرم عمید الزماں بھی جریدہ "الکفاح" میں ایک کالم لکھتے رہے مولانا اسعد مدنی صاحب نے بحیثیت ناظم عمومی اور صدر جمعیۃ علماء کے، جو غیر ملکی اسفار کیے اور بہت سے مواقع پر جمعیۃ کی نمائندگی کرتے ہوئے مختلف کانفرنسوں اور اجتماعات میں جو شرکت کی ہے، اس کے لیے ضروری تیاری اور علمی موضوعات پر مقالے لکھنے کا اصل اور بنیادی کام مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ بعض مواقع پر راقم الحروف کا تعاون بھی شامل رہا ہے۔

عملی مزاج اور ناقدانہ نظر

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم کی افتادِ طبع علمی اور مزاج عملی واقع ہوا تھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "وقتی ہنگاموں اور تماشوں" سے مرحوم کو بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ جماعت سے وابستگی اور رسمی تعلق کی ذمہ داری کے تحت انھوں نے ایسے کاموں اور پروگراموں میں شرکت کی۔ نیز ان کا مزاج ناقدانہ اور نظر عارفانہ تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ صرف "ہاں" "جی" کرتے رہیں۔ جو رائے رکھتے تھے وہ برملا اور واضح طور پر ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ اس کا لازمی طور سے یہ مطلب نہیں کہ ان کی رائے "صحیح ہی" ہوتی تھی۔ کسی بھی شخص کی رائے سے اختلاف ممکن ہے۔

مرحوم سے مختلف مواقع پر میری جو گفتگو ہوتی اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان کے ذہن میں

جمعیۃ کے تعلق سے کام کرنے کے جو عزائم ہیں، وہ اس کے لیے فضا کو ساز گار نہیں پاتے۔ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کوئی بھی منصوبہ یا پروگرام بنایا جائے تو تا حدِ امکان اور بہ قدر استطاعت اسی پر عمل کرنے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جاتے۔ یہ نہیں کہ طویل و عریض بحث کے بعد ایک قرار داد پاس ہوگئی اور کسی پروگرام کا اعلان کر دیا گیا، لیکن عمل نہ دارد۔ چند سال کے بعد ان کو اچھی طرح یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اب جماعت کا "کلچر" بدل گیا ہے۔ سیاست اور "سیاسی مصالح" کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے کہ اس نے ذمہ داران کے ذہن و مزاج کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان کی یہ رائے عملی تجربہ اور مشاہدات پر مبنی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت کے بعد انھوں نے جو دیکھا اور سمجھا، اس نے ان کو یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو بہت سی ملاقاتوں میں چند واقعات بتائے، جن کا ذکر اس موقع پر غیر مناسب نہ ہوگا۔

مولانا نے مجھ کو بتایا کہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جب کوئی ممبر کسی موقع پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہے، یا کھل کر بولنے کی کوشش کرتا ہے، تو بعض اوقات خود صدر محترم اس کو سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ڈانٹ دیا (ایک مشہور عالم اور پرانے رکن، جن کا انتقال ہو گیا... اُن کو مولانا اسعد صاحب اکثر ڈانٹ دیا کرتے تھے... نام ذکر کرنا مناسب نہیں...) مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم نے مجھے کئی بار یہ بات بتائی۔ ان کو بہت افسوس ہوتا تھا، ساتھ ہی مرحوم نے یہ تضاد بھی دیکھا کہ کمیٹی کے ایک "تاجر رکن" جب گفتگو کرتے ہیں تو صدرِ اجلاس کا رویہ ان کے ساتھ بہت زیادہ نرم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خود ممبران میں سے بعض حضرات کا رویہ اکثر یہ رہتا تھا کہ اگر کسی نے بھی "سرکاری موقف" کی مخالفت تو کیا، اس کے کسی پہلو پر گفتگو کرنے کی کوشش کی تو اس کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ "جو حضرت کی رائے ہے وہ ٹھیک ہے..." مجھے اس موقع پر ایک دلچسپ بات یاد آگئی، ایک بار دفتر میں کچھ لوگ اسی طرح کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور مجلس میں ورکنگ کمیٹی کے چند ارکان بھی تھے، گفتگو بے تکلف اور دوستانہ ماحول میں ہو رہی تھی، میں بھی شریک تھا۔ میں نے کہا کہ مولانا اسعد صاحب اپنی جماعت کے "نہرو" ہیں... کسی کو ان پر تنقید کرنے یا ان کا معارضہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔ برجستہ... صاحب بولے، نہیں! وہ جمعیۃ علماء ہند کی "اندرا گاندھی" ہیں۔ اس کی تشریح انھوں نے یہ کی کہ نہرو کے سامنے لوگ احتراماً نہیں بولتے تھے۔ لیکن اندرا گاندھی کے سامنے "خوف" سے نہیں بولتے۔ بہر حال...

مرحوم نے مجھے ایک واقعہ سنایا، ایک بار ورکنگ کمیٹی میں مولانا اسعد صاحب نے ایک پروگرام کا منصوبہ پیش کیا، اس پر گفتگو ہوئی۔ مرحوم اس پروگرام کی افادیت اور ضرورت سے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے تقریر کی اور مجوزہ پروگرام کے منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ شرکاء اجلاس ان کے نقطۂ نظر سے متفق ہوگئے۔ (صدر محترم بہر حال اپنے ممبران کے مزاج شناس تھے، اس بنا پر انھوں نے اجلاس میں تو مرحوم کو تقریر کرنے

اور پروگرام کی مخالفت سے نہیں روکا، البتہ جب نشست برخاست ہوئی تو کہا: " مولانا وحید الزماں صاحب! یہ کیا کردیا؟" اور پھر کہا کہ اگر ہم یہ کام شروع نہیں کریں گے تو . . . . وہ کر ڈالیں گے (ایک حریف جماعت کی طرف اشارہ تھا)۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ مرحوم مولانا وحید الزماں اور مولانا اسعد صاحب کے درمیان ایک گونہ بے تکلفی تھی . . . لہذا مولانا اسعد صاحب کی بات سن کر مرحوم نے مذاقاً کہا: " فکر نہ کیجئے آپ کو اصرار ہے تو اگلی نشست میں پروگرام کے مثبت پہلو پر زور دے دیں گے "۔

مولانا وحید الزماں مرحوم بہت جم کر، خود اعتمادی سے اور مدلل انداز میں بولتے تھے۔ میں نے ورکنگ کمیٹی کے کسی اجلاس میں تو نہیں، لیکن اور مواقع پر ان کو بولتے ہوئے سنا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں عید الفطر کی نماز کے وقت مرادآباد میں پولیس نے نمازیوں پر فائرنگ کی تھی اور ایک بڑا فساد برپا ہو گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا اسعد صاحب نے ایک نمائندہ اجتماع طلب کیا تھا۔ جس میں دیگر جماعتوں کے لوگ اور عوامی زندگی کے مختلف گوشوں کی نمائندگی کرنے والے شامل تھے۔ کانسٹی ٹیوشن کلب کے ہال میں یہ میٹنگ ہوئی تھی۔ میں بھی شریک تھا۔ مولانا وحید الزماں صاحب نے فساد، اس کے متعلق اور بہت سے امور اور گوشوں پر ایک ایسی پُر جوش، مدلل، اور مسکت تقریر کی کہ حاضرین دنگ رہ گئے۔ میں خود بھی بہت متاثر ہوا۔ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو سیاسی حالات پر تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔

مصالح کی سیاست

جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی، جو کہ دستور اور ضابطہ کے اعتبار سے جماعت کی اعلیٰ قیادت سمجھی جاتی ہے۔ واقعہ کے اعتبار سے ایسا نہیں۔ عام طور پر میں نے یہ دیکھا کہ " علماء اور اہل علم " کے علاوہ کسی بھی شخص کو شرکت کی دعوت دے دی گئی۔ یہی نہیں، بلکہ مستقل اراکین میں اچھی خاصی تعداد ایسے ممبران کی رہی جو حلقۂ علماء سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے۔ تاجر، پیشہ ور، یا بعض دیگر اداروں اور تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ علماء میں سے بھی ایسے لوگ رکن رہے ہیں جن کا حلقۂ اثر نہ صرف بہت محدود بلکہ تقریباً معدوم ہے۔ اور اب تو شاید نصف کے قریب تعداد ایسے اراکین کی ہے جو نہ حقیقتاً اور نہ عرفاً عالم ہیں۔ مولانا اسعد صاحب نے اپنی مصالح کی بنا پر (جن کو وہ ہمیشہ " جماعتی مصلحت " کا نام دیتے ہیں) جماعت کو ایک ایسے ادارے میں تبدیل کر دیا کہ جہاں ہر چیز، ہر بات، ہر کام کو مفادات اور مصالح کے پیمانہ سے ناپا جانے لگا۔ مولانا اسعد صاحب کی آمد کے ابتدائی دور میں ان کے اقتدار کی کرسی کے پایوں کو مضبوط بنانے میں بعض تاجر اور پیشہ ور حضرات بھی شامل تھے۔ بعد میں یہ لوگ جماعت کے نظام میں دخیل ہو گئے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

توازن اور بیلنس قائم رکھنے کے لیے ان کو دخیل کرلیا گیا۔ بہرحال اس کا اثر جماعت کے نظام اور عمل و کردار پر پڑنا ضروری تھا اور یہی ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جمعیۃ علماء ہند اب علماء کی جماعت نہیں بلکہ ایک معمولی تنظیم بن کر رہ گئی ہے جس کے ممبران، ورکر، ہمدرد اور مخلصین مسلمان ہیں۔ اور بھی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں جو مسلمانوں کے کاز کے لیے کام کرتی ہیں ان تنظیموں میں اور جمعیۃ علماء ہند میں اب کوئی نمایاں فرق اور مابہ الامتیاز نہیں، جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ جماعت اپنی ساخت اور کارکردگی اور اسلوب و طریقہ عمل کے اعتبار سے اس مقام پر ہوتی جو کہ علماء کا امتیازی وصف ہے۔ آج یہ عالم ہے کہ بس جلسے جلوس، دھرنے، مارچ، مظاہرے، عید ملن، لنچ، ڈنر، عصرانے اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔ کوئی جگہ ہو، کیسی ہی مجلس ہو، صرف "مصلحت" کی بیساکھی کے سہارے ہم بھی وہاں وارد ہیں۔ مقصد صرف اپنے وجود کو ثابت کرنا ہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اب فلم ستاروں کو جماعت کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور "علماء کرام" اسٹیج پر محو حیرت بیٹھے ہوئے داد تحسین دیتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ افسوس صد افسوس۔۔۔ ان حضرات کی حیرت اور استعجاب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ تالیاں بجانے کے متعلق حکم شرعی کو بھی بھول جاتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا، جون ۷۵ء میں جب آنجہانی اندرا گاندھی کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ آیا، تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جلسے، جلوس، مظاہرے اور اندراجی کی حمایت میں کانگریس نے عوام کو اکسا کر کھڑا کر دیا۔ یہ وقت "اظہارِ وفاداری" کا مناسب موقع تھا۔ دفتر میں ایک میٹنگ ہوئی۔ ایک میمورنڈم تیار ہوا۔ غالباً ۲۱ ریا ۲۲ر جون ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ بعد نماز ظہر دس بارہ افراد کا ایک وفد ۱ صفدر جنگ روڈ روانہ ہوا، مولانا اسعد صاحب، مولانا محمد میاں صاحب مرحوم، مولانا نوراللہ صاحب مرحوم، حاجی فاروقی صاحب مرحوم، حکیم عبدالجلیل صاحب مرحوم، مولانا قاری محمد میاں صاحب اور بعض حضرات، راقم الحروف بھی شریک تھا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے اور لان میں ایک جانب صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر کھڑے رہے۔ ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ محمد یونس خاں تشریف لائے۔ کچھ دیر بعد اندراجی نمودار ہوئیں۔ حسب عادت خندہ و فرحاں نہیں تھیں، بلکہ چہرے پر پریشانی اور پراگندگی کے آثار تھے۔ "پیمان وفا" ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ نہ کوئی گفتگو، نہ بات چیت نہ بیٹھنے کو کہا گیا، یہ ضعیف العمر اور نورانی چہرے اسی طرح کھڑے رہے۔ وہاں ہمارا مقام بھی وہی تھا، جو ملک کے مختلف گوشوں سے آنے والے کانگریسی ورکروں کا تھا۔ مسلسل اسی طرح لوگ آرہے تھے اور جا رہے تھے۔ میرے ذہن میں اس وقت کا نقشہ تاحال مرتسم ہے۔ کچھ اچھا منظر نہیں تھا۔

راقم الحروف کے ذمہ جو خدمت تھی، اس کے تعلق سے عرب ممالک سے آنے والے مہمانوں سے ملاقات جماعت کا تعارف کرانا، ترجمانی کے فرائض انجام دینا، اسی ضمن میں بعض تحریریں، خطوط، رسائل مرتب کرنا۔۔۔

عرصۂ دراز تک یہ خدمت انجام دیتے دیتے "پدرم سلطان بود" کا سبق حفظ یاد ہوگیا تھا۔ جب ہم ماضی کے شاندار کارناموں کا ذکر کرتے تھے اور اپنا سلسلۂ نسب بیان کرتے تھے، تو میں نے محسوس کیا کہ مخاطب ہمارے "حال" کو ماضی کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بہت سے مواقع پر یہ بات بہت اچھی طرح محسوس کی اور مختلف موقعوں پر بہت سے ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑا کہ جن کا جواب کم از کم اس وقت مشکل تھا۔

لفظ "عالم" اور "علماء" قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سلف صالحین کے کردار کی روشنی میں ایک ایسے مخصوص اور متعین مفہوم کا حامل ہے، جس کا تصور اُمت مسلمہ کے نزدیک بالکل واضح ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کی اہمیت وزن اور جلالت شان اس حدیثِ نبوی سے مترشح ہوتی ہے۔ "اِنَّ عَالِمًا واحدا أشدّ علی الشیطان من الف عابدٍ ..." لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے کارناموں سے اپنے اسلاف کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔

جب دارالعلوم کو فتح کرنے کی جنگ زوروں پر تھی، اس وقت بہت سے لوگ بہت افسردہ دل تھے، ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ علماء کا وقار اور بھرم خاک میں مل رہا ہے۔ مجھے مولانا وحید الزماں مرحوم نے بتایا کہ قاضی سجاد صاحب مرحوم نے ایک بار کہا کہ "میاں اسعد آپ دیوبند کے قضیہ سے الگ رہیں، اگر دارالعلوم میں کوئی خرابی ہے تو آپ سے آخرت میں باز پرس نہیں ہوگی"۔ استاذ محترم قاضی سجاد صاحب بہت رنجیدہ اور ملول تھے۔ ایک بار انھوں نے رو کر کہا کہ "بس رہنے دو!" مجھے یاد ہے کہ ایک بار قاضی صاحب مرحوم نے ناز انصاری مرحوم (ایڈیٹر اخبار الجمعیۃ) سے میرے سامنے کہا کہ "یہ گڑے مردے نہ اکھاڑو ..... " ان کا اشارہ اخبار کی کسی ایسی تحریر کی جانب تھا، جس میں غالباً ماضی کے کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ تھا جس کی زد مرحوم قاری محمد طیب صاحب کے اہلِ خاندان پر پڑتی تھی۔

جمعیۃ کے نئے خدوخال

دراصل مولانا اسعد صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کی زمام اقتدار ایک ایسے عمل کے نتیجہ میں سنبھالی تھی جو تبدیلی کا "عمل طبیعی" نہیں تھا۔ بلکہ اس میں "قسر قاسر" کا دخل تھا ... انھوں نے آنے کے بعد جو کیا اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔ " أفسدوها وجعلوا أعزة اهلها اذلة " اور پھر "الناس علی دین ملوکہم" ان کے دور اقتدار میں زیادہ تر لوگ ان ہی کے ڈھنگ اور ڈھب کے آئے، اس لیے جماعت کے نئے خدوخال (ORIENTATION) ماضی سے یکسر مختلف تھے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دور جدید میں جماعت کی اصل سرگرمی "عملی سیاست" رہی۔ برخلاف ماضی کے

کہ اُس وقت علماء کا اصل کردار "رہنمائی" تھا۔ وہ اقتدار طلبی اور سیاسی مناصب کے حصول کے متمنی نہیں تھے۔ اور یہی چیز ان کے کردار کی بلندی کا سبب تھی۔

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ بات مئی ۱۹۸۱ء کی ہے۔ عراق کے وزیر اوقاف فیصل نوری شاہر ہندوستان آئے۔ ان کے ساتھ عراق کے سنی اور شیعہ علماء کا ایک وفد تھا۔ اس وقت عراق اور ایران کے درمیان جنگ جاری تھی۔ سفیر عراق فاضل عزاوی نے اپنی رہائش گاہ واقع پرتھوی راج روڈ نئی دہلی میں عشائیہ کا اہتمام کیا۔ مدعوئین میں زیادہ تر علماء اور مسلم زعماء تھے۔ کھانے سے پہلے مہمان جمع تھے۔ اسی اثناء میں وزیر کے ہمراہ ان کے اسٹاف کے جو لوگ ساتھ تھے، وہ میرے پاس آئے۔ ایک صاحب کے ہاتھ میں قلم اور نوٹ بک تھی۔ انھوں نے بڑے اہتمام اور سنجیدگی سے دریافت کیا: "ماهي مؤلفات الشيخ ؟" (شیخ اسعد کی تصانیف اور تالیفات کیا ہیں؟) اس نے اچانک اس طرح سوال کیا کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ اب یہاں تو کچھ بھی نہیں (صرف اللہ کا نام ہے) اپنی تہی دامنی کو کس طرح چھپاؤں ... میں نے کسی نہ کسی طرح اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ بتایا کہ حضرت تو ہمہ وقت "دعوت وارشاد، اصلاح وتبلیغ اور خدمتِ خلق" میں مصروف رہتے ہیں (اور کیا کہتا)۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ فروری ۱۹۸۳ء میں آسام میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تھا۔ اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہوئی تھی۔ جنوری ۱۹۸۴ء کے پہلے ہفتہ میں سعودی عرب سے شیخ ابن باز کا ایک نمائندہ آیا۔ وہ دفتر جمعیۃ پہنچا، اس کو کچھ معلومات حاصل کرنا تھیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا، مولانا اسعد صاحب حسب عادت سفر میں تھے۔ مولانا حماد صاحب میرے پاس آئے، رات کا وقت تھا، چونکہ اس نمائندہ سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ بہرحال ہوٹل کنشک پہنچے۔ ملاقات کے دوران اس نے بہت سے سوالات کیے۔ اندازہ یہ ہوا کہ آسام کے واقعہ سے متعلق معلومات فراہم کرنا، اس کا مشن ہے۔ لیکن راقم الحروف اس قسم کی تفصیلات سے قطعًا ناواقف تھا، جو وہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ برادرم مولانا حماد صاحب کی معلومات بھی مجھ سے زیادہ نہیں تھیں۔ اس نے یہ بھی سوال کیا کہ ہندوستان کے کتنے "ذی علم علماء" جماعت کے ممبر ہیں اور دوسرے عام مسلمان کتنے؟ جب میں اس کو کچھ بتانے کی کوشش کرتا، تو وہ مطمئن نہ ہوتا۔ میں نے اس طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ ان پیمانوں سے ناپنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو اہلِ علم کی ایک نمائندہ تنظیم ہے جس کا کام رہنمائی کرنا اور صحیح راستہ کی نشاندہی کرنا ہے۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہوا۔

یہ دو واقعات میں نے صرف بطور مثال، مشتے نمونہ از خروارے، ذکر کیے ہیں۔ ورنہ ایسے واقعات بہت ہیں۔ مجھے بسا اوقات اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ آنے والے مہمانوں سے تعارف

کرانا اور "خدماتِ جلیلہ" اور "کارہائے نمایاں" کا ذکر کرنا، راقم کا فرض منصبی تھا۔ لیکن ہر سننے والا محض مروّت اور لحاظ میں خاموش سامع نہیں رہتا۔ بعض لوگ بڑے "ناقدانہ اور متجسسانہ" استفسارات کرتے ہیں۔ اس ناقدانہ استفسار پر ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔

ستمبر ۱۹۸۰ء میں امیر کویت ہندوستان کے دورہ پر آئے۔ ان کے ہمراہ جو وفد تھا، اس میں ان کے مشیر ڈاکٹر عبدالعزیز کامل بھی تھے۔ یہ مصری عالم ہیں، وزیر اوقاف کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ مشہور ذی علم شخص ہیں۔ مولانا اسعد صاحب ان سے ملاقات کے لیے اشوکا ہوٹل تشریف لے گئے۔ راقم الحروف ساتھ تھا۔ گفتگو کے دوران مولانا نے فرمایا "جمعیۃ کے تحت ہزاروں کتاتیب ہیں" (کتاتیب جمع کاتینہ ہے، مفرد کُتّاب کا) جس کا مفہوم وہی ہے، جو ہمارے ہاں "تعلیم قرآن کے مکتب" کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں بہت سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ اس کی تفصیل اور فہرست مطلوب ہے اور مزید یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے ہاں (اشارہ حکومت کویت کی طرف تھا) ایک نظام ہے۔ اور کوئی بھی امدادی رقم متعلقہ کمیٹی کی منظوری کے بغیر کسی ادارے کو نہیں دی جاتی۔

قیادت کی علم سے دوری

بات طویل ہو گئی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ "عالم" اور "علماء" کا لفظ استعمال کرتے ہی ذہن میں تصور ابھرتا ہے علم کا، تصنیف و تالیف کا، علمی تحقیق اور ریسرچ کا، کسی خاص موضوع پر کسی اہم مقالے یا تحریر کا، کسی اہم علمی ادارے یا کسی باوقار یونیورسٹی سے وابستگی کا۔ مجھے پھر اس مناسبت سے ایک بات یاد آ گئی۔ ۱۹۷۳ء میں جب مصر کے دورہ پر گئے۔ تو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ سلام دعا اور مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا اسعد صاحب سے سب سے پہلا جو سوال کیا۔ وہ یہ تھا: "ما ھو آخر مؤلفات اخینا الشیخ ابی الحسن الندوی" مولانا اسعد صاحب نے اپنی "مسکراہٹ" سے بات کا رخ موڑ دیا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں، بہت اہم اور قابلِ توجہ امر ہے۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک "عالم" کی اصل دلچسپی اور دلبستگی کا سامان، صرف اور صرف "علم" ہے۔ دنیا کے سب سے مشہور، قدیم اور باوقار علمی ادارہ کا سربراہ "ہندوستانی علماء کی جماعت کے صدر" سے ملاقات کرنے کے بعد اگر کوئی علمی سوال کرے تو یہ بات مقتضائے حال کے عین مطابق ہے۔ وہ اگر کسی دوسرے کام میں دلچسپی لیتا ہے، تو وہاں بھی علم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن [illegible]

کویت کی ایک مشہور شخصیت سید یوسف السید ہاشم الرفاعی، وہاں کے عالم، صاحب نسبت اور سلسلۂ رفاعی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کئی بار ہندوستان تشریف لا چکے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریبات میں بھی شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک بار ایک شخص کے ذریعہ محترم مولانا اسعد صاحب کو خط بھیجا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ: میرا مشورہ ہے کہ آپ پارلیمنٹ کی رکنیت سے دست بردار ہو جائیں اور کانگریس سے قطع تعلق کرلیں۔ آپ ایک عالم جلیل اور مجاہد باپ کے فرزند ہیں۔ کانگریس سے وابستگی آپ کی ذات کے لیے باعثِ فخر نہیں، بلکہ کانگریس کے لیے یہ بات باعثِ شرف ہے کہ آپ اس سے وابستہ ہیں۔

مجھے یاد ہے، استاذ محترم مولانا قاضی سجّاد صاحب مرحوم کی بھی یہی رائے تھی۔ اور ایک ایسے موقع پر جبکہ مسلمان حکومت سے سخت شاکی تھے، انھوں نے یہی فرمایا تھا۔ شاید براہِ راست مولانا اسعد صاحب سے یہ بات کہی تھی۔

آمدم برسرِ موضوع، مرحوم مولانا وحید الزماں صاحب کو بھی بہت سے مواقع پر ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ وہ بھی اکثر یہ فرماتے تھے کہ ہماری ساری جد وجہد اور کوششوں کا محور سیاسی سرگرمیاں رہ گئی ہیں۔ ان کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن دوسرا پہلو بھی بہت ضروری ہے، اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ وہ اکثر کبیدہ خاطر ہو کر کہا کرتے تھے کہ مولانا پروگرام اور منصوبے بنانے کے بہت ماہر ہیں۔ فوراً ایک میٹنگ طلب کرلینا، ایک اجتماع یا کسی موضوع پر کانفرنس کا انعقاد، ان کے لیے بہت آسان ہے لیکن کوئی بھی پروگرام یا منصوبہ تکمیل تو درکنار عمل کے مرحلہ میں داخل ہی نہیں ہوتا۔

اس قسم کے امور پر بعض اوقات غیر رسمی انداز میں کبھی کبھی گفتگو ہوتی تھی۔ بہت سے مواقع پر میں نے مولانا اسعد صاحب کو اپنے احساسات اور تاثرات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ لوگ کس طرح سوچتے ہیں اور مشورے بھی دیئے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ جو روش چلی آرہی ہے، اس میں تبدیلی لانا ناممکن ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس وقت تک تو دوسرے کی بات سنتے ہیں، جب تک ان کو یہ احساس ہو کہ کہنے والا عملاً زیادہ مؤثر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان کو یہ احساس ہو جائے کہ بات ذرا آگے کی ہے، تو پھر ان کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ بعض اوقات صورتِ حال کو دیکھ کر انھوں نے اس قسم کی کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، لیکن محض نیم دلانہ کوشش، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ صرف "ڈرامہ اور وقتی ہنگامہ"۔ اس کے علاوہ ان کے ہر اقدام اور فیصلے کے کچھ محرکات ہوتے ہیں، جن کا علم صرف ان ہی کو ہوتا ہے۔ اور یہ محرکات ایسے ہوتے ہیں جن کا ایک رُخ جماعت کے عام لوگوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے رُخ کا علم صرف ان کو، یا بعض انتہائی راز دار مقربین کو۔ اسٹیج پر آنے سے قبل ہر چیز کی پیشگی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور مقررہ ترتیب

کے مطابق کام انجام دیئے جاتے ہیں۔ جس جانب سے خطرہ کا احتمال ہوتا ہے، اس کا سدِ باب پہلے سے کر دیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے ذہن کو ہموار کرنے میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی موقع پر مولانا سید احمد ہاشمی صاحب نے کہا کہ " وہاں فیصلے کانا پھوسی سے ہوتے ہیں، گفت گو اور بحث و تمحیص سے نہیں۔۔۔"

امارتِ شرعیہ کا ڈرامہ

یہ امارت شرعیہ اور امیر الہند کا ڈرامہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ جس کے "ماورائی محرکات" ہیں۔ ایک کتابچہ جمعیۃ علماء ہند نے شائع کیا ہے۔ عنوان ہے: "امیر الہند ثانی کا انتخاب"۔ مسلمانانِ ہند کا "نمائندہ اجتماع"۔ ۴۸ صفحات کے اس پمفلٹ میں ۳۰ صفحات "شرکاء اجتماع" کی فہرست پر مشتمل ہیں۔ ان ناموں میں سے سب نہیں تو کم از کم بعض کیا، بلکہ اچھی خاصی تعداد میں ایسے نام ہیں کہ ان کو "نمائندہ" یا "صاحب رائے" یا "اہل نظر" یا "ارباب حل و عقد" کہنا، ایک صریح فریب ہے۔ جماعت سے تعلق رکھنے والے بعض مدارس دینیہ کے مدرسین، طلبہ، منتظمین اور اسی طرح کے ہر اس شخص کا نام اس میں ذکر کیا گیا ہے، جو اس اجتماع کے وقت جلسہ گاہ میں آکر بیٹھ گیا۔۔۔ یہاں تک کہ مولانا اسعد صاحب کے صاحبزادگان اور بعض کم سن اعزہ کے نام بھی اس میں درج ہیں۔ بلکہ دفتر جمعیۃ کے اسٹاف کے بعض لوگوں کے نام بھی شامل ہیں۔

ایک سادہ لوح چندہ دینے والا مسلمان، وہ ہندوستان میں ہو یا افریقہ اور انگلستان میں، یا کسی عرب ملک کا کوئی ادارہ اور ذمہ دار۔ جب ان کے سامنے یہ فہرست پیش کی جائے گی تو وہ تو یہی سمجھیں گے کہ اتنی بڑی تعداد میں شرکت کرنے والے علماء صرف علماء نہیں بلکہ "منتخب علماء" نے اس منصب اور عہدہ کی تفویض کا فیصلہ کیا ہے۔ اور "امیر الہند" جیسے عظیم و ضخیم لقب کے تحت جو ادارہ کام کر رہا ہے، اس کا دائرۂ عمل صرف "رویتِ ہلال" کے اعلان تک محدود ہے۔ ایسا ہی ہے کہ کسی قصبہ کے میونسپل بورڈ یا بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کو "صدر جمہوریہ ہند" کے نام سے پکارا جائے۔ رویت ہلال کا اعلان امام جامع مسجد اور امام مسجد فتحپوری بھی کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ جرأت اور بیباکی کا مظاہرہ تو وہ اجتماع ہے جو ہندی ترجمۂ قرآن کے اجراء کے نام پر کیا گیا۔ اور وہ ہندی ترجمہ جو اجرت پر کسی ہندی داں سے کرایا گیا ہے، اس کو حضرت امیر الہند، و صدر جمعیۃ علماء ہند کے برادرِ عزیز مولانا ارشد صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

چہ دلاور است ۔۔۔۔۔۔

کیا جماعت کے ذمہ داران اس حقیقت سے واقف نہیں کہ میاں ارشد صاحب کو ہندی نہیں آتی ابتدائی زبان بھی نہیں آتی

مولانا حبیب الرحمٰن عزیز الدین بہر

چہ جائیکہ " ہندی داں " ہوں اور وہ بھی اس حد تک کہ قرآن کریم کا ترجمہ کر سکیں ۔ شاعر نے تو کہا تھا ؎ عیب را ہنر باید مگر یہاں تو حصول مال وجاہ کے لیے دین فروشی کا تھوک کاروبار ہو رہا ہے ۔

زیادہ افسوس اس کا ہے کہ جماعت کی صفوں میں اب شاید " حق گوئی " کا عنصر بالکل مفقود ہو گیا ۔ کسی کو نکیر کی توفیق نہیں ہوئی ۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہر وہ قدم جو حضرت اٹھاتے ہیں ، اس کے محرکات و دوافع کا علم صرف اسٹیج مینیجر کو ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ شرکاء و حاضرین کے سامنے صرف وہ تصویر ہوتی ہے جس کو حسب موقع وضرورت مطلوبہ رنگ سے رنگ دیا جاتا ہے ۔

کیا ہمارا " ماضی " تھا ! اور اب یہ " حال " ہے ۔ کیا تھے ہم کیا ہو گئے ! مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے :

" حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہ اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور نہایت معتقد اور ان کے مقصدِ جہاد سے بالکل متفق تھے ۔ مگر اس وقت کی سیاسی تحریکات نے ہندوؤں کے اشتراک اور شرعی حدود سے ناواقف اور بے پرواہ لیڈروں کی شمولیت سے کچھ ایسا رنگ اختیار کر لیا تھا کہ جلسوں جلوسوں میں خلافِ شرع امور بے پروائی کے ساتھ کیے جاتے تھے ۔ ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل میں اسلامی شعائر اور شرعی حدود کی کوئی پرواہ نہیں رہی تھی ۔ اس لیے ان تحریکات میں آپ نے شرکت نہیں فرمائی ۔ حضرت شیخ الہندؒ جو اس وقت تحریک کے امام تھے ، اُن کو بھی اس کے احساس ہی نے ایک جماعت بنام جمعیۃ علماءِ ہند قائم کرنے پر مجبور کیا تھا کہ اس تحریک کے ساتھ علماء کی رہنمائی کی وجہ سے ان منکرات اور خلافِ شرع امور سے نجات ملے جس کا پہلا جلسہ دہلی میں حضرت ہی کی صدارت میں ہوا اور اس کے خطبۂ صدارت میں اس طرح کے منکرات پر کھل کر نکیر بھی کیا گیا ۔ "

اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بانیِ جماعت حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کے نزدیک تاسیسِ جماعت کا " اصل مقصد ہی " منکرات اور خلافِ شرع امور سے اجتناب کی کوشش تھی ۔ ۔ ۔ اور اب تو " منکرات ہی منکرات " ہیں ۔ ان سے اجتناب چہ معنی ۔

بات بہت طویل ہو گئی ۔ دراصل واقعات اور حالات کا ایک ایسا سلسلہ ہے اور ایک دوسرے سے اس طرح کڑیاں جڑی ہوئی ہیں کہ کتنا بھی اختصار کیا جائے ، چند اہم اور ضروری واقعات کا ذکر کیے بغیر بات مکمل نہیں ہو پاتی ۔

دارالعلوم سے علاحدگی

مرحوم مولانا وحیدالزماں صاحب کے دل میں برابر ایک خلجان اور کھٹک رہتی تھی، ان سے ملاقاتوں اور گفتگو میں اس کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ آخرالامر ایک ایسی منزل آئی کہ ان کے لیے اپنے احساسات اور جذبات کو دبا کر رکھنا، مشکل ہو گیا۔ آخر کب تک محض "حسنِ ظن" اور تفاؤل سے کام چل سکتا ہے۔ جب تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ مولانا اسعد مدنی صاحب جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ملت کے مفاد میں ہے، تو انھوں نے ان کا ساتھ دیا، مکمل ساتھ دیا۔ ہر کوشش اور ہر پروگرام میں عملی طور پر حصہ لیا۔ سینہ سپر ہو کر، بے دریغ اور بے دھڑک ہر معرکہ میں کود پڑے۔ انھوں نے اپنوں کی پروا کی نہ اغیار کے طعنوں اور طنز و تشنیع کی۔ لیکن افسوس! صد افسوس . . . !

دراصل دارالعلوم کو اپنے پنجۂ گرفت میں لانا، مولانا اسعد صاحب کا ایک دیرینہ خواب اور آرزو تھی۔ وہ مسلسل چوتھائی صدی سے اس آرزو کی تکمیل کے لیے کام کر رہے تھے۔ جب ان کو گوہرِ مقصود حاصل ہو گیا، تو اس کے بعد انھوں نے نئی حکمتِ عملی وضع کی۔ مستقبل کے نقشہ میں ان کے نزدیک مرحوم مولانا وحیدالزماں جیسے لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے تصور میں، ایسے لوگ "خطرہ" ثابت ہو سکتے تھے۔ اب ضرورت تھی تملق پسند، خوشامدی درباریوں کی، جو صرف تالیاں بجانے اور واہ واہ کرنے کی خدمت انجام دیں۔ ابھی چند روز بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ مرحوم کی راہ میں کانٹے بچھانے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اور صرف تین سال کے اندر اندر ایسی صورتِ حال پیدا کر دی گئی کہ مرحوم خاموشی سے کنارہ کش ہو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۷ء میں ایک بار وہ دہلی آئے، تو مجھ کو ملاقات کے لیے بلایا۔ یہ ان کی محبت اور اعتماد کی بات تھی کہ انھوں نے مجھ کو تفصیل کے ساتھ مکمل حالات سُنائے اور پس منظر سے آگاہ کیا۔ یہ اُن کی سرگزشتِ احوال واقعی تھی۔ جس منطقی ترتیب اور تسلسل سے انھوں نے بیان کیا، یہ ان ہی کا حصہ تھا۔ سب کچھ تو مجھ کو بھی یاد نہیں، بہت سا حصہ ذہن میں ہے۔ لیکن اس حصہ میں سے بھی سب کہنے کا اور بتلانے کا نہیں۔ کچھ "ان کہنی" اور "ناگفتنی" ہے۔ البتہ چند اہم نکات کا ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۱) کس طرح مولانا اسعد صاحب نے ان کو کیمپ دارالعلوم کے زمانہ میں مشکلات اور الجھنوں میں پھنسائے رکھا، اور یہ سب قصداً اور عمداً خاص مقصد کے تحت کیا گیا۔

(۲) برابر یہ کوشش کی گئی کہ وحیدالزماں عوام کے سامنے منظرِ عام پر نہ آسکیں، ان سے صرف اندرونی محاذ کو سنبھالنے کا کام لیا جائے۔

(۳) دہلی میں تحفظ دارالعلوم دیوبند کے نام سے جو اجتماع نومبر ۱۹۸۱ء میں ہوا تھا۔ اس میں ان کو شرکت سے باز رکھا گیا، اور ایک بہانہ بنا کر نصف شب میں دیوبند سے ایک پیغام بھجوایا گیا اور ان کو دہلی سے دیوبند بلا لیا گیا، تاکہ وہ اجتماع میں شرکت نہ کر سکیں۔

انتقالِ اقتدار کے بعد ابتدائی دو سالوں میں دارالعلوم کو چلانے کے لیے بڑے پیمانہ پر سرمایہ کی فراہمی ضروری تھی کیونکہ نزاع کے سبب سابقہ سرمایہ منجمد ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا وحید الزماں مرحوم نے اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور جدوجہد کی۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کا بھی سفر کیا اور سرمایہ کی فراہمی میں کافی کامیابی حاصل کی۔ جب مرحوم غیر ملکی سفر سے واپس آئے تو ان کے محبین اور مخلصین نے از راہِ محبت اور تعلق ان کے استقبال کا اہتمام کیا۔ حضرت امیر الہند کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ دیوبند کی سرزمین پر کوئی دوسرا سورج طلوع ہو۔ انھوں نے استقبالیہ تقریب کا اہتمام کرنے والوں کو بلا کر ڈانٹا اور سرزنش کی۔

بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا شخص میدان میں آکر سرگرم عمل ہو۔ اور نتیجہ کے طور پر ان کی تصویر دھندلی پڑ جائے۔ خاص طور پر وہ اپنے اس امیج کو برقرار رکھنا چاہتے تھے کہ سرمایہ صرف وہی مہیا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ جب کسی کام کرنے والے کو موقع ہی فراہم نہیں کیا جائیگا تو یہ حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی میں اہلیت اور صلاحیت نہیں۔ یہ بات محض بدگمانی نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔ جمعیتہ کے ماحول میں بھی عرصہ دراز سے یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ سرمایہ کی فراہمی تو حضرت کے سوا کوئی نہیں کرتا۔

مجھے مولانا مرحوم نے تفصیل کے ساتھ وہ واقعہ بتایا کہ کس طرح شوریٰ کی اس میٹنگ میں، جس میں ممبر بنائے جانے کے بعد سب سے پہلی بار مولانا اسعد صاحب نے شرکت کی اور اجلاس میں آتے ہی میرے اوپر حملہ کیا۔ یہ سب پیشگی منصوبہ بند تھا۔ مرحوم ان کے تیور سمجھ گئے اور خاموشی سے کنارہ کش ہو گئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جمعیتہ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ اس کے باوجود بھی مولانا اسعد صاحب، ان کے برادرِ عزیز مولانا ارشد صاحب اور ان کے دیگر حواریین مطمئن نہیں تھے، ان کو برابر خوف لاحق رہتا تھا۔ آخر الامر طرح طرح کی ریشہ دوانیاں کر کے مولانا کو دارالعلوم سے الگ کرا کے ہی دم لیا۔ مجھ سے خود ان کے حلقہ کے ایک قریبی شخص نے یہ بات کہی کہ دراصل مولانا وحید الزماں کو دارالعلوم کے اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوئی دیگر شکل ممکن نہیں تھی۔ اور وہ دارالعلوم میں آتے رہتے تو خطرہ تھا۔

. . . . ایں چہ بوالعجبی است!

مولانا فضیل احمد قاسمی

دردمند قائد

حضرت مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ اس دور کے بے مثال عالم دین، عظیم مربی، بالغ نظر مصنف اور مجتہد استاد تھے، میں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ کو بہت قریب سے ایک مدت تک دیکھا ہے۔ عجیب کشش تھی۔ مولانا مرحوم کی شخصیت میں جو قریب آیا وہ ان کی شفقتوں کی بساط جنگ آگیں میں لپٹ گیا اور جو جس قابل تھا اس نے مولانا سے قریب رہ کر اپنے ظرف کے مطابق حاصل کرلیا۔

حضرت مولانا کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے بھی کھینچا اور اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کی کفش برداری میں راحت محسوس ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی تربیت بھی مجتہدانہ رنگ و آہنگ سے مزین تھی۔ آپ کے دامنِ علم سے جو طلبہ بھی وابستہ تھے وہ اپنے تئیں مطمئن رہتے تھے کہ مولانا کا اندازِ تربیت شفقت و محبت رعب و وقار اور دلی ہمدردی کا آئینہ دار تھا۔ نادار طلبہ کی خبرگیری اور مالی امداد مولانا مرحوم کا معمول تھا۔ مجھے ذاتی طور پر بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت مولانا سے کسی غریب طالب علم کی اعانت کے لیے سفارش کی تو مولانا نے نہ صرف تعاون فرمایا بلکہ اس کو خود سے قریب کیا اور پھر کسی واسطے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم کی تربیت و ذہن سازی کا ایک پہلو یہ تھا کہ اُن کے دامنِ علم سے وابستہ طالب علم مقاماتِ زندگی میں ناکام نہ رہے۔ وہ ایک اچھے عالمِ دین بننے کے ساتھ ساتھ کسی فن میں بھی مہارت حاصل کرلے تاکہ وہ مستقبل میں اچھی زندگی گذار سکے۔ چنانچہ جو طلبہ میدانِ علم وادب میں سست گام نظر آئے ان کو اردو اور عربی کا اچھا خطاط بنادیا۔ ان کے بالمقابل جو طلبہ میدان علم وادب میں تیز رفتار تھے، ان کو عربی زبان وادب کا استاذ، صحافی اور ادیب بنادیا۔ نیز

جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء ہند

مولانا مرحوم کے حلقۂ تربیت میں وہ تیز گام طلبہ بھی شامل تھے جنہوں نے اردو اور عربی میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تصنیفی تربیت بھی حاصل کی۔ عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا مشکل فن بھی سیکھا اور دونوں زبانوں کے مثالی خوش نویس بھی بنے۔

تربیت کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے شاگردوں کو میدانِ خطابت کا شہسوار بھی بناتے تھے چونکہ مولانا مرحوم خود ایک بلند پایہ خطیب تھے۔ فن خطابت کی نوک و پلک اور اس کے رموز و اوقاف لب و لہجے اور صوتی زیر و بم اور دیگر خطیبانہ زاویوں پر ان کی وسیع نظر تھی۔ اس لیے وہ اپنے تلامذہ کو اس فن میں عاری نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ اس مؤثر و مفید فن سے طلبہ کو آراستہ کرنے کے لیے ایک خاکہ تیار کیا۔ اسی خاکہ کے مطابق ہر طالب علم کو ہر ہفتہ تقریر کے موضوع پر پوری تیاری کے لیے کتب و رسائل کی نشاندہی فرماتے۔ مجلسِ خطابت کی نگرانی بنفسِ نفیس خود کرتے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ایک ہی موضوع دو طلبہ کو دیتے تھے، ایک طالب علم تقریر کرتا تھا اور اسی موضوع پر تیار دوسرا طالب علم اس تقریر پر تبصرہ کرتا تھا۔ آخر میں حضرت مولانا تقریروں پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے خطیبانہ کمزوریوں کی نشاندہی فرماتے تھے۔ اس انداز تربیت نے بے زبانوں کو زبان داں کم سخنوں کو سخنور بنا دیا اور ساتھ ہی مطالعہ اور فکر و نظر کا اعلیٰ مذاق بھی بیدار کر دیا۔

بات دور جا پہنچی کہنا یہ تھا کہ میں نے مولانا مرحوم کو ہر میدان میں قریب سے دیکھا ہے جب وہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے اس وقت بھی اور جب جمعیۃ علماء ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے، اس وقت بھی اور جب جمعیۃ علماء ہند کے شعبۂ مرکز دعوۃ الاسلام کے سربراہ بنائے گئے تب بھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے عربی زبان میں شائع ہونے والے ترجمان "الکفاح" کے مدیر اعلیٰ مقرر کئے گئے، اس وقت بھی اور وہ دور بھی دیکھا جب مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں اصلاحات کے لیے جد و جہد شروع کی جس نے بعد میں ایک مکمل انقلاب کی شکل اختیار کرلی اور پھر اس انقلاب کا مولانا اسعد مدنی کے ذریعہ استحصال اور قائد انقلاب مولانا مرحوم کے ساتھ ان کا ناروا سلوک بھی دیکھا لیکن حضرت مولانا مرحوم کی عملی زندگی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، وہ اپنے ذہن و فکر کے مطابق اپنے تمام کاموں میں ہمہ جہت مصروف رہے۔ دارالعلوم سے سبکدوشی اور جمعیۃ علماء ہند سے علیحدگی کے بعد انتقامی جد و جہد کے بجائے ایک صاحبِ نظر، وسیع الظرف شخصیت کی طرح مثبت

رویہ اپنا کر ملی جمعیۃ علماء کی صدارت قبول فرمائی اور تا دم آخر مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے منصب صدارت پر فائز رہے۔

اس موقع پر اس حقیقت بیانی سے گریز کرنا یقیناً ناانصافی اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی تاسیسی تاریخ سے چشم پوشی ہوگی کہ جب حضرت مولانا وحیدالزماں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر میں نے سرپرستی اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی صدارت قبول کرنے کی درخواست پیش کی اور مولانا اسعد مدنی کے آمرانہ رویہ اور ملی مسائل کے سلسلہ میں ان کی دسیسہ کاریوں کی داستان سنائی تو حضرت مولانا کا وہ دلی اضطراب جس کا باعث مولانا اسعد مدنی تھے چہرہ سے عیاں تھا لیکن واہ رے اعلیٰ ظرفی کہ زبان نہ کھلی اور یقین دلایا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں اور جو خدمت بھی مجھ سے ہوسکے گی اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ حضرت مولانا کی منظوری افسوس ہے کہ ان لوگوں کو بھی بہت شاق گذری جو مجھ سے اور حضرت مولانا سے برابر کا تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ہر طرح حضرت مولانا کے ذہن کو خراب کرنے اور مرکزی جمعیۃ سے دور کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت مولانا بات کے دھنی اور پختہ عزم و فیصلہ کے انسان تھے۔ کسی ایک کی نہ سنی اور فرمایا کہ میں نے نیک نیتی سے جو فیصلہ کرلیا ہے اسی پر قائم رہوں گا۔ میں مولوی فضیل کے ہمدردانہ طرز عمل کو زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں۔ مجھے ایسے شخص کے ساتھ رہ کر کام کرنے میں راحت محسوس ہوگی اور ان شاء اللہ کام ہوگا۔ تقریباً یہی الفاظ حضرت مولانا نے مرکزی جمعیۃ علماء کے تاسیسی جلسۂ عام میں بھی کہے تھے۔ اس کے باوجود انتشار و ریشہ دوانی کے خوگر لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔

حضرت مولانا کے ہمراہ ملک و بیرون ملک کے اسفار بھی کئے اور ایک سفر تو ہمیشہ یاد رہے گا جو رابطۂ عالم اسلامی کی دعوت پر سعودی عرب کا ہوا تھا۔ حضرت مولانا علالت کے باوجود اس سفر میں ہشاش بشاش تھے لیکن سعودی عرب میں طبیعت ایسی ناساز ہوئی کہ حسب پروگرام بعض اہم عرب شخصیات سے ملاقاتیں نہ ہوسکیں۔ میں نے حضرت مولانا کی علالت کا ذکر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (سابق سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی و حال نائب صدر مجلس شوریٰ سعودی عرب) سے کیا تو انھوں نے فرمایا: کیا وہی مولانا وحیدالزماں جو دارالعلوم دیوبند میں ادب عربی کے استاذ تھے۔ پھر بہت سے توصیفی کلمات ان کی زبان سے بے ساختہ نکلے اور حضرت مولانا سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس سفر سے اور بہت سی یادیں وابستہ ہیں جن کو ان شاء اللہ کسی مناسب وقت پر حیطۂ تحریر میں لایا جائے گا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے دورِ صدارت میں مجھے حضرت مولانا سے مزید قریب رہنے کا موقعہ ملا لیکن اب قریب رہنے کی نوعیت بدل چکی تھی۔ مولانا مرکزی جمعیۃ العلماء کے صدر تھے اور میں اس کا جنرل سکریٹری۔ اس عرصہ میں مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ حضرت مولانا ملت کے انتشار اور زبوں حالی سے انتہائی پریشان ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے تئیں حکومتِ ہند اور ریاستی حکومتوں کے رویہ سے ان کا حساس دل بے چین رہا کرتا تھا۔ مرکزی جمعیۃ کے جلسوں کے علاوہ بھی گفتگو میں ملت کے تعمیری کاموں کا بڑے سوز و گداز کے ساتھ لائحۂ عمل پیش فرماتے خوابیدہ ملت میں بیداری عمل پیدا کرنے کے لیے انتہائی علالت کے باوجود دور دراز مقامات کا سفر کرنے میں بشاشت محسوس کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا جلدی جلدی ملی اور علمی کاموں کو سمیٹنا چاہتے ہوں اس کے باوجود بہت سے کاموں کا صرف لائحۂ عمل مرتب ہوسکا اور قضا و قدر نے عملی جامہ پہنانے کی فرصت نہ دی۔ جماعتی وابستگی کے اس دور میں حضرت مولانا کی زندگی کا وہ پہلو سامنے آیا جس میں عموماً کمزوریاں کھل کر سامنے آجاتی ہیں لیکن مولانا مرحوم کو اس میدان میں بھی بالکل صاف ستھرا اور بے باک پایا۔ حرص و انا سے تو کوسوں دور تھے۔ جماعت کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا انھوں نے عظیم گناہ سمجھا بلکہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور وسائل سے جماعت اور ملت کو نفع پہونچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں وقت نے فرصت دی تو دورِ صدارت کے چند نمونے پیش خدمت کروں گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت مولانا کی وفات پر سب سے زیادہ تعزیت کا مستحق میں خود کو سمجھتا ہوں۔ وہ مربی نہ رہا جس کی تربیت کے زیر سایہ ملت کے کام سرانجام پاتے تھے؛ وہ مفکر نہ رہا جس کے ناخن تدبیر سے گتھیاں سلجھ رہی تھیں؛ وہ عالی دماغ نہ رہا جس کے اشارات دلیلِ راہ تھے؛ وہ حساس دل نہ رہا جس کے ملی احساسات سے جسم و جان کو حوصلہ ملتا تھا۔

بقیہ: چند یادیں اور چند باتیں

مرقع، جدید عربی صحافت کا امام اب نہیں رہا، شر و روفتن سے بھری ہوئی اس دنیا کی جانب اس نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اس نے یقین کرلیا کہ یہ دنیا دیکھنے کی چیز نہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

عبد الرحمٰن عابد

مولانا وحید الزماںؒ کی سیاسی بصیرت

ہر انسان کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ معاشرے میں معروف ونمایاں ہوتا ہے اگر کسی انسان کی یہی خصوصیت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے تو پھر وہ انسان بھی معاشرے میں اتنا ہی غیر معمولی اور اہم ہوجاتا ہے، سماج میں اس کو بلند واعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کی شخصیت مشہور ہوتی ہے لیکن دنیا میں کچھ شخصیات مختلف ادوار میں ایسی بھی پیدا ہوتی رہی ہیں، جن کی گوناگوں صلاحیتوں نے ان کو متعدد خصوصیات کا حامل بنا کر بہ یک وقت کئی کئی میدانوں کے شہسوار ہونے کا شرف بخشا ہے ایسی شخصیات کو عموماً عبقری کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ مولانا وحید الزماںؒ کیرانوی سابق معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند ان ہی شخصیات میں سے تھے جن کے لیے کہا گیا ہے ؏

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا کی متعدد صلاحیتوں نے خصوصیت کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ مختلف میدانوں میں ان کے کارنامے ایک زندۂ جاوید حقیقت ہیں۔ حقیقت کوئی بھی ہو ثبوت اور دلائل کی محتاج نہیں ہوتی، مولانا کی خصوصیات میں مردم سازی نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہے، لیکن اتنی ہی اہم خصوصیت ان کی جہد مسلسل بھی ہے۔ زندگی کے طوفانوں سے لڑنا بڑے دل گردے کی بات ہے، جو ہر کس وناکس کے بس کا نہیں، امانت داری کے تمام تقاضوں کی سختی سے پابندی کرنا اس دور قحط الرجال میں تقریباً محال ہے، مگر مولانا کی امانت داری اور دیانتداری پر ان کے حاسدین اور دشمنوں کو بھی کبھی ذرہ برابر شک نہیں ہوسکا۔ ایفائے عہد، اور ذمہ داری کا احساس ایسا کہ معلوم ہو اس سے زیادہ اہمیت ان کے یہاں کسی اور چیز کی ہے ہی نہیں۔ ہم میں سے بہت سے حضرات ایسے ہیں جو مولانا کو ایک شفیق معلم، ایک مشفق دوست، ایک بیباک منتظم، ایک حساس انسان، ایک شعلہ بیان مقرر، ایک متبحر ادیب، ایک محقق عالم، ایک متحرک قائد اور بے خوف مجاہد وغیرہ جیسی خصوصیات سے جانتے سمجھتے اور دیکھتے رہے ہیں۔ بیشک یہ تمام خصوصیات ان میں اعلیٰ درجے کی تھیں، ان پر ہم میں سے بہت سے بڑے چھوٹے لکھ چکے ہیں

اور لکھ رہے ہیں، مگر ہم اس مضمون میں دیگر خصوصیات سے قطع نظر مولانا کی سیاسی بصیرت پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا وحید الزماںؒ نے جن حالات میں ہوش سنبھالا اور پرورش پائی وہ غلام ہندوستان میں آزادی کے لیے اُٹھنے والے طوفانوں کے عروج کا دور تھا، ان دنوں ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں نے چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ مولانا نے انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ کر بھاگنے کے حالات اپنی نوجوانی میں دیکھے۔ مولانا کا تعلیمی دور بھی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے متاثر ہوا۔ کیرانہ سے حصول تعلیم کے لیے حیدرآباد جانا اور پھر وہاں سے واپسی میں بھی غالباً ان حالات کا دخل رہا۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا نے دہلی میں اپنے والد مرحوم مولانا مسیح الزماںؒ کے زمانۂ طالب علمی کے بے تکلف دوست اور اس وقت کی عظیم سیاسی اور علمی شخصیت مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ کی معیت اختیار کی، چندہی برسوں کے ساتھ سے مولانا وحید الزماںؒ نے اپنی اعلیٰ ذہانت وفطانت کی وجہ سے سیاست کی باریکیوں کو دیکھ اور سمجھ لیا، اسی زمانے میں انھوں نے محمد احمد کاظمی مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی کتاب "تقسیم ہند اور مسلمان" کا عربی میں ترجمہ کیا، مختلف مواقع پر مولانا لدھیانویؒ کے ترجمان کی حیثیت سے عرب سفراء اور مختلف سیاستدانوں سے گفتگو کا موقع حاصل ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نوجوانی ہی میں سیاست کے نشیب وفراز اور رموز سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی وسماجی اور علمی زندگی سے روشنی حاصل کی اور تقریباً اسی طرز پر دارالعلوم سے وابستگی کے دور سے لیکر آخر دم تک زندگی گذارنے کی کامیاب کوشش کی۔!

مولانا نے زندگی بھر کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی لیکن وہ سیاسی حالات سے کبھی غافل بھی نہیں رہے۔ ملی سرگرمیوں کے لیے انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز اکابر کی معتبر اور قدیم سیاسی تنظیم جمعیۃ علماء ہند کو بنایا۔ اور طویل عرصے تک اس کے پلیٹ فارم سے ملی سرگرمیوں میں نہ صرف حصہ لیتے رہے بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا۔ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کو عرب دنیا میں متعارف کرایا، اس کے لیے عربی جریدہ "الکفاح" جاری کیا اور دیگر راستے اور اسباب بھی اختیار کیے۔ مولانا کا سیاسی نظریہ ان کے استاذ گرامی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نظریہ کے مطابق تھا۔ جمعیۃ کی موجودہ قیادت پر مولانا کو عدم اعتماد کا احساس ہوا تو خاموشی کے ساتھ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ بعد میں ملی جمعیۃ کے بانی صدر منتخب ہوئے، اس کے بعد مرکزی جمعیۃ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے صدر منتخب ہوئے۔ راقم الحروف کو مولاناؒ سے دو مرتبہ ملی سیاست اور ملکی سیاست پر تفصیلی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی مرتبہ اس موضوع پر گفتگو کرنے کا وہ زمانہ تھا جب مولاناؒ کو خالص سیاسی انداز میں دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پر راقم الحروف کے ساتھ چند ہندی اخبارات کے صحافی بھی موجود

تھے، ہم لوگوں نے مولانا کا تفصیلی انٹرویو لیا تھا جو دہلی کے اردو، اور میرٹھ وسہارنپور کے ہندی اخبارات میں شائع ہوا تھا، اس وقت مجھ سے زیادہ میرے ساتھیوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ طلبا زیں اپنی بے پناہ مقبولیت وعظمت کا فائدہ اٹھا کر ایک نیا انقلاب برپا کر سکتے ہیں اور اس کام میں پریس ان کا معاون ہوگا۔ اس وقت مولانا نے اپنی علالت اور دوسری اہم مصروفیات کا عذر پیش کر کے ہم لوگوں کو مطمئن کردیا مگر بعد میں جب اُن صحافی دوستوں کو رخصت کر کے میں چند منٹ کے لیے پھر واپس آیا اور اس سلسلہ میں مولانا سے سوال کیا تو انھوں نے جو بات کہی وہ آج بھی ہم سب کے لیے خصوصاً ہمارے قائدین اور زعماء کے لیے سبق آموز ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ذاتی جذبات کی وجہ سے یہ پیشکش میرے لیے بھی پُرکشش ہے، لیکن اس کے پیچھے عوامل کیا ہیں ان کو بھی ہمیں نظر میں رکھنا چاہیئے۔ اس سے دارالعلوم بحران کا شکار ہوگا، علمار کی بدنامی ہوگی، اور طلبار کا نقصان ہوگا اور سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کے وقار مجروح ہونے کا ہوگا، ہمارے اکابر کی توہین ہوگی، وغیرہ۔

دوسری مرتبہ سیاسی موضوع پر گفتگو کا موقعہ وفات سے تقریباً ایک برس پہلے ہی ملا تھا جب راقم الحروف نے ایک صحافتی مقصد سے ملاقات کی تھی۔ تقریباً ڈھائی یا تین گھنٹے کی ملاقات میں بہت سے سیاسی مسائل اور معاملات پر گفتگو ہوئی، اس موقع پر میرے ایک دوست حافظ عبدالستار صاحب ساتھ تھے۔ مولانا سے ملی مسائل میں اشتراک وتعاون اور اتحاد کے مسئلہ پر بات ہوئی، ملی کونسل کے ذمہ داروں سے رابطہ کا ذکر ہوا، ساتھ کام کرنے کی بات ہوئی، آمادگی کا اشارہ ملا لیکن افسوس کہ یہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اس ملاقات میں مولانا سے جہاں اور بہت سے موضوعات پر کھلے ماحول میں گفتگو ہوئی وہیں مسلمانوں کے جذباتی مسائل پر بھی مولانا نے مدلل اور مفصل روشنی ڈالی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دینی اور شرعی معاملات میں کسی بھی قسم کا سمجھوتہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے لیکن جو چیزیں ان کے اختیار اور طاقت سے باہر ہیں ان میں اپنی صلاحیتوں کو ہرگز ضائع نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اپنی تمام تر توجہ اپنے مستقبل کی تعمیر، بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت اور مستقبل کے سیاسی منصوبے پر صرف کرنی چاہیئے، مسلمانوں کو معاشیات، تجارت وصنعت پر خاص توجہ دینی چاہیئے تاکہ آنے والے بیس برس کے بعد وہ ایک مضبوط معاشی اور سیاسی قوت بن کر کھڑے ہو سکیں، ان کی آمدنی اتنی ہو کہ اکثریت انکم ٹیکس دینے والوں کی ہو تاکہ کوئی انھیں اپنے اوپر اور ملک کے اوپر بوجھ نہ سمجھے۔ اگر مسلمان ان اصولوں کو اپنا کر صرف پانچ برس کے لیے بھی جذباتی مسائل کو ملتوی کردیں تو یقینی طور پر جذباتیت کے مسائل آدھے سے زائد خود ہی دم توڑ دیں گے اور باقی آدھے مسائل کو پیدا کرنے والے عناصر پانچ برس کے بعد خود ہی اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ وہ مسائل پیدا ہی نہیں کر سکیں گے۔

مولانا کی سیاسی بصیرت بہت زبردست تھی، یہ بہت لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اچھا ہو کہ اس پر کوئی اور بھی قلم اٹھائے۔!

●●●

سفرِ آخرت

- بیماری یا سحر
- آخری ایّام
- تجہیز و تکفین

اشرف عثمانی دیوبندی

جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ کی مشہور و معروف شخصیت کا تعارف ان کے تلامذہ رفقاء، متعلقین یا ہم جیسے معتقدین پیش کریں، یہ بات بڑی غیر منطقی سی لگتی ہے۔ مولانا مرحوم کی ذات گرامی تقریر و تحریر اور علم و عمل کی دنیا میں کسی کے ذریعہ تعارف کرائے جانے کی محتاج نہیں۔ اس لئے زیر قلم مضمون کوئی تعارفی خاکہ نہیں بلکہ راقم کے ذہن میں ان کا جو نقش "اسلاف کی سنہری اقدار کے محافظ اور روشن عہد کے نقیب" کی صورت کندہ ہے، اس پر ایک بزرگ کے حوالے سے "خود کلامی" اس مضمون کا منشاء یا یہ سمجھ لیجئے کہ مولانا مرحوم کے تذکرے کے پس منظر میں اپنے خاندان اور اپنی ذات کی پرچھائیاں گہری کر کے در نمایاں کرنے کا جذبہ اس تحریر کا محرک ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ اسلاف کی سنہری اقدار کے محافظ تھے، مولاناؒ کی زندگی خود اس کی دلیل پیش کرتی ہے، موازنے سے ٹھوس تصدیق مقصود ہو تو اسلاف کی تاریخ کے سنہرے اوراق الٹے جائیں۔ اشاریہ وار (INDEX WISE) حضرت شاہ ولی اللہؒ سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن عثمانیؒ تک مطالعہ کیا جائے، شخصیت سازی کا ایک مشترک نصب العین اجاگر ہوگا۔ اسی طرح نیچے سے اوپر کی جانب حضرت شاہ ولی اللہؒ سے اپنی تاریخ کی ابجد تک پہونچا جائے، اس سفر میں جتنی تاریخ ساز ہستیاں موجود ہیں ان کو پڑھتے جانے سے عموماً ایک بات سامنے آئے گی کہ ان کے تاریخ ساز ہونے کا سبب کتاب سازی سے کہیں زیادہ انسان سازی ہے۔ لیکن وقت تاریخ کے اس گھنے اور لامتناہی جنگل کی وسعتوں کے مقابلے بہت کم ہے، اس لئے ایک جگہ قیام پر اکتفا کیا جائے۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ مولانا وحید الزماںؒ کی تعمیر مزاجی، اولوالعزمی، حق شناسی حق گوئی، علم کی دنیا میں نئی وادیوں کی کھوج، ناسازگار حالات میں علمی سوچ، تلامذہ سے شفقت، ان کی ذہن سازی اور تربیت ہمہ گیر اور انقلابی شخصیت شیخ الہندؒ کے مشابہ ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ اپنے اسلاف کی جمیع صفات کے حامل تھے، دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم، مایہ ناز عالم دین، عظیم فقیہہ و مفسر، بے مثال شفیق استاذ، دیوبند مکتبۂ فکر کی اساس، شوق جہاد سے لبریز دل رکھنے والے جانباز مومن اور مجاہد آزادی، اس قسم کے اور بہت سے اوصاف حمیدہ ممدوحؒ کی سوانح حیات کے حوالوں سے بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اپنے تلامذہ پر شفقتیں لٹانے اور شخصیت سازی کے منفرد ذہن، مزاج اور نصب العین کا تذکرہ اس بیان میں شامل نہ کیا جائے تو شیخ الہند کا تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ یہی خاص وصف شیخ الہندؒ کو ان کے ہم عصروں سے بڑا بناتا ہے۔ حوالے کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قبیل میں سب سے زیادہ جانفشانی شخصیت سازی پر کی تھی اس کی تصدیق ان کے تلامذہ کی فہرست پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینے کے بعد از خود ہو جاتی ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ، حضرت علامہ شبیر عثمانی، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا میاں جی اصغر حسین، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی، حضرت مولانا منصور انصاری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا عزیر گل رحمۃ اللہ علیہم، اس انداز کے نہ جانے کتنے چاند سورج شیخ الہند کی درسگاہ سے طلوع ہوئے جن کی شعاعیں ہندوستان، پاکستان افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر، اردن، انڈونیشیا، ملیشیا، فلپائن اور مغربی دنیا کے دوسرے بڑے ممالک تک پھیلی نظر آتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے آٹھ سو ساٹھ ۸۶۰ تلامذہ میں سے کسی بھی ایک کو دیکھا جائے وہ اپنی جگہ مکمل ایک تحریک نظر آئے گا۔

راقم کو ان کے خانزادہ میں پیدا ہونے پر ناز ہے، اسی کے ساتھ اس بات پر ملال بھی کہ یہ ناکارہ شیخ الہندؒ اور ان کے دور کو نہیں دیکھ سکا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان جب کسی صورت کا متلاشی ہوتا ہے خاص طور پر ان حالات میں جہاں مطلوبہ شے نہ ملنے کا قوی یقین ہو تب اس کی مشابہ صورت (خواہ تخیلاتی کیوں نہ ہو) بھی سامان تسکین بن جاتی ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کو دیکھ کر ان محروم اور تپتے احساسات پر ایک سایہ سا ہو جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ شیخ الہندؒ کی روش کے پاسدار، پتھر تراش کر روح پھونکنے کا ہنر جاننے والے ابھی اس زمین پر باقی ہیں۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا تذکرہ معاون مہتمم دار العلوم، ناظم تعلیمات دار العلوم، استاذ دار العلوم، عالم دین اور زبان عربی کے مایۂ ناز ادیب کے حوالوں سے کیا جاتا ہے، معاف کیجیے! شیخ الہندؒ کی طرح یہ بھی نامکمل تذکرہ ہے۔ اس تذکرہ میں "شخصیت ساز" کا اضافہ ضروری ہے۔ یہی "محمودی وصف" مولانا کو تاریخ ساز بھی بنا دیتا ہے اور یہی وصف ان کا طرۂ امتیاز ہے جو ان کو تمام ہم عصر اساتذہ اور ادیبوں سے بلند قامت کرتا ہے۔

شیخ الہندؒ اور مولانا کیرانوی کا یہ شعار بڑا مماثل ہے، اسی لئے شعور یہ کہتا ہے کہ مولانا مرحوم شیخ الہندؒ کی اس روایت کے امین تھے۔

مولانا وحید الزماںؒ کے تلامذہ میں فی الوقت کس کس کا نام لیا جائے جن کی حیثیت راہ علم وادب میں بے پتھر جیسی تھی اور اب وہ مولانا کی صناعی سے عبادت گاہ علم وادب میں "صنم بنے بیٹھے ہیں۔ نوک قلم پر نام آگئے تو کئی اصنام کی پردہ کشائی ہوگی جنھوں نے خود یہ سطحی خواہش رکھی کہ وہ صنم تراش بھی ان کے آگے جھک جائے جس کی پُرخلوص صناعی نے انھیں خوبصورت شکل وصورت اور وجود بخشا ہے۔ ایک صنم ساز کے لئے اس سے زیادہ اذیت ناک گھڑی کون سی ہو سکتی ہے؟ یہ بڑا تلخ اور زہرناک پہلو ہے "امن عامہ" اور خوشگواری کے لئے جس کا ترک واجب ہے اور پھر خود مولانا مرحوم نے ضرورت سے زیادہ اس پر لب کشائی کی اجازت نہیں دی۔ اور اس پہلو سے اجتناب اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ بات ہو رہی ہے شیخ الہندؒ کے نقش قدم پر مولانا مرحوم کے سفر جاری رکھنے کی اور خصوصاً تلامذہ کی تربیت اور شخصیت سازی کی۔

شیخ الہندؒ نے اسلام کی اشاعت وترویج کی حکمت عملی کی بنیاد افراد سازی پر رکھی۔ اور ایک منصوبے اور نصب العین کے تحت تلامذہ کو کتابی کیڑا بنانے کے بجائے وقت وحالات اور اس کے تقاضوں کے اعتبار سے تربیت اور ذہن سازی کے ذریعہ کارآمد انسان بنایا۔ مولانا کیرانوی کی زندگی کا نصب العین اور محنت کا نچوڑ بھی یہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے بھی وقت کے منہ زور تقاضوں سے برسرپیکار ہونے کے لئے اپنے تلامذہ کی تربیت کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو بامصرف بنانے کی سعی کی ہے جبکہ اپنے دور کے لحاظ سے شیخ الہندؒ نے بھی تو یہی — اور ایسا ہی کچھ کیا تھا۔

خیال آتا ہے کہ ہم شیخ الہندؒ کو دیکھنے والوں میں سے ہوتے تو آج کس قدر محترم ہوتے۔ لیکن غنیمت یہ ہے کہ ہم نے مولانا کیرانوی جیسی عظیم شخصیت اور ان کے زمانے کو دیکھا ہے۔ بلاشبہ یہ بات باعث فخر ہے — فخر کا یہ احساس اسلاف کا زمانہ نہ دیکھنے کے احساس محرومی اور اس کی شدت میں کمی لاتا ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی کو دیکھنے (جبکہ دیکھنے اور سمجھنے میں بڑے فاصلے ہیں) کا فخریہ احساس اس نسل تک محدود نہیں بلکہ یہ آنے والی نسلوں کا مقدر بھی ضرور بنے گا۔ فراق گورکھپوری نے عالم تعلی میں ہی سہی قابل انتقال فخر کی بابت ہم عصروں کو کس انداز میں ہوشیار کیا ہے ؎

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
وہ یہ جب سوچیں گی تم نے فراق کو دیکھا ہے

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی صنم تراش شخصیت ہی کچھ ایسی تھی جس کو دیکھ کر (کاش ہم سمجھ بھی لیتے)

اسلاف کی تاریخ کے بہت سے کردار زندہ ہو جاتے تھے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت پر ابھی کئی دبیز پردے پڑے ہیں دَورِ انحطاط کو ایک سیڑھی اور نیچے آنے دیجیے، زمانہ کی دہلیز پر دستک دے رہے اس انقلاب کو جس کی بانہوں میں ظلمت و جہالت کی وحشت ناک آندھیاں بھرنے کے لئے تلملا رہی ہیں کسی "راہ" سے آنے دیجئے تب ان آندھیوں میں مولانا کی ذات سے وہ دبیز پردے ہٹیں گے اور پھر ان کی قدر و منزلت کا اور زیادہ بے کراں احساس جاگے گا۔ قحط الرجال کا عذاب جب جب بڑھے گا دیگر اسلاف کے ساتھ وقت مولانا کیرانوی کو بھی آواز دے گا؟

قحط الرجال کا حال یہ ہے کہ نہ رجال کار نظر آتے ہیں نہ رجال ساز حتیٰ کہ نہ ہی رجال شناس، تینوں درجے فنائیت کی حدوں میں آخری ہچکیاں لے رہے ہیں۔ ایسے جاں گسل ماحول میں مولانا کا دم کس قدر غنیمت تھا۔

لیکن ان کو بھی ہلاک کر دیا گیا ــــ کن دشمنوں کے ہاتھوں؟ یہ بات صرف عالم الغیب جانتا ہے۔ اس بارے میں بدظنی کرنا، شبہ کرنا اور قیاسی گھوڑے دوڑانا اور کسی کے نام پر تہمت دھرنا گناہ عظیم ہے۔ چونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رفیق دوا میں زہر دیدیتے ہیں اور وہ لوگ جن پر مخاصمت و عداوت کا الزام ہوتا ہے وہ تریاق دینے والے بن جاتے ہیں۔ یعنی اس دنیا میں دوست نما دشمن بھی ہوتے ہیں اور دشمن نما دوست بھی۔ اس لئے عدو کی تلاش و جستجو لاحاصل ہے۔

بیماری یا مہلک سحر

یہ صدی سائنس کی صدی ہے۔ انسان نے چاند پر کمند ڈال کر بہت سے اوہام پرستی کے دروازوں کو بند کر دیا ہے، پورے ماحول میں بے دلیل باتوں کی کوئی گنجائش نہیں، سحر، جنات اور عملیات کے تصورات فرسودہ ہو چکے۔ اس سائنسی دور میں اس قسم کی باتیں تحریر کرنا قطعی بے محل مانی جاتی ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ درج ذیل تذکرہ بے محل ہے، چھیڑوں گا ضرور۔ "ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے": موت کا انداز اور موت کا وقت متعین ہے، اس کے باوجود اسباب موت پر تبصرہ ہوتا ہے۔ اسباب کے لحاظ سے ہی "فطری موت" اور "غیر فطری موت" کے عنوان قائم کئے جاتے ہیں۔ اس سیاق سے مراد یہ ہے کہ مولانا وحید الزماں کیرانوی کو عاملین کی کثیر رائے کے مطابق جادو کے ذریعہ ہلاک کیا گیا ہے، اس لئے ان کی موت فطری نہیں بلکہ غیر فطری طور پر واقع ہوئی ہے، بشرطیکہ عاملین کے علم ظنی کو یقینی کے درجے میں دیکھا جائے ــــ زبان خلق واقعی اگر نقارۂ خدا ہوتی ہے تو تمام عاملین کی ایک رائے یقینی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کئی برس پہلے میں نے اپنے عمل کے ذریعے مولانا مرحوم کے مرض کی تشخیص کرنے کی ٹھانی تھی، تب یہ بات میرے سامنے آئی تھی کہ ان پر مہلک سحر کیا گیا ہے اور اس کو اتارنے کی مدت ختم ہو چکی ہے تب مجھ سے ایک ایسی لغزش بھی سرزد ہو گئی تھی جس کو ایمان کی کمزوری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے (اس کے بعد میں نے ہمیشہ کے لئے ترک عملیات کا عہد کر لیا تھا) مولانا کیرانوی کو عملیات کے ہر طریقہ وزاویہ سے دیکھنے کے بعد ایک ہی جواب آتا تھا کہ یہ سحر لاعلاج ہے۔ اس نتیجہ سے میرا متوحش ہو جانا غیر فطری نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ایک دوسرے شہر کی راہ لی، جہاں ایک گوشہ نشین 'پنڈت جی' سفلی عملیات کا ایک جہان سنبھالے بیٹھے تھے، ان سے میرے خاصے مراسم تھے، وہ حرام کام تو ضرور کرتے تھے لیکن اس کی کھاتے نہیں تھے، بلامعاوضہ "دھرم پالن" اور "مانو سیوا" کے طور پر یہ کام کرتے تھے۔ پنڈت جی نے میرے سواگت اور آؤ بھگت کے بعد پوچھا "کہو کیسے آنا ہوا؟" میں نے سوال کیا ـــــ وحید الزماں بن ..... کے بارے میں کچھ بتایئے سر پر انگوچھا ڈالے اور سر جھکائے وہ دس منٹ بیٹھے رہے، دس منٹ بعد انھوں نے بولنا شروع کیا، یقین جانئے کچھ لمحوں کے لئے تو عالم حیرت نے عقیدۂ علم الغیب کو خطروں کے نرغے میں لا کھڑا کیا، دور دراز علاقے میں بیٹھے اس شخص نے مولانا کی بیماری، ان پر پڑنے والے اضطرابی دوروں کی کیفیات اس طرح بتانا شروع کیں کہ مولانا بھی خود اس کو اتنی اچھی طرح بیان نہیں کر پاتے تھے، اس نے اس کیفیت کی مدت بھی بتائی اور یہ بھی کہا کہ یہ زبردست قسم کا جادو ہے جس کا مستقل علاج میرے پاس بھی نہیں ہے۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ اس کی تشخیص اور میری تشخیص دونوں ایک تھیں۔ پنڈت نے کہا اس کا ایک عارضی علاج ہو سکتا ہے جس سے ان کو رمضان کی پہلی تاریخ تک آرام سا ہو جائے گا۔ رمضان کے بعد پھر میرے پاس آجانا میں اس علاج کی تجدید کر دوں گا پھر اگلے رمضان کی پہلی تاریخ تک مریض چین سے رہے گا۔ انھوں نے میرے سامنے پچیس منٹ تک کچھ پڑھا۔" کچھ پڑھنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے وقت دیکھنے کے لئے کہا، میں نے دیکھا ۲-۲ بجے تھے۔ ۲-۴۵ تک اس نے اپنے عمل سے فراغت پائی اور بڑے اعتماد سے کہا، یہ وقت یاد رکھنا اور مریض سے تصدیق کر لینا کہ اس وقت اس پر تشنج اور اضطراب کا دورہ پڑا تھا یا نہیں" میں رات تک دیوبند واپس آگیا اور اگلے دن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، اس دن وہ بالکل رو بصحت لگ رہے تھے۔ ایک دن پہلے کی کیفیت معلوم کرنے پر انھوں نے بتایا کہ "کل تو عجیب حالت ہوئی، لگتا تھا جسم سے کوئی روح کھینچ رہا ہے، دوپہر کے وقت بہت زیادہ اضطراب رہا" مجھے پنڈت جی کی شیطانی قوت پر یقین ہو گیا۔

اس کے بعد مولاناؒ کی طبیعت میں کچھ سدھار آیا۔ لیکن تین مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ خبر ملی "پنڈت جی

کا دیہانت ہوگیا۔ علاوہ ازیں مولانا کو بہت سے عاملین نے دیکھا ان سب میں اکثریت نے یہی تشخیص کیا کہ مولانا پر جان لیوا جادو کیا گیا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اس طرح عملیات کا یہ ظنی علم یقین کی حدیں چھوتا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا " ان کو بھی ہلاک کر دیا گیا" ہوسکتا ہے بہت سے قارئین اسے مفروضہ قرار دیں۔ ایسا نہ کرنے پر میرا ابھی کوئی اصرار نہیں۔ البتہ اس بات پر میرا اصرار ہے کہ اس سرخیل کارواں کو تاریخ کی مظلوم شخصیت کہا جائے۔

یادوں کی جھیل میں واقعات کی بے شمار لہریں متلاطم ہیں ــــ جی چاہتا ہے ــــ کہ یہ لہریں کنارے توڑ کر باہر آجائیں ــــ لیکن جی کا ہر چاہا پورا ابھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ اسی خیال سے میں نے کناروں پر مضبوط پشتے باندھ دیئے ہیں۔ خوف ہے کہ کہیں یہ لہریں جھیل سے باہر نکل کر کسی پُرخطر سیلاب کی صورت نہ اختیار کرلیں ــ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کس لہر میں کتنے تلاطم اور سیلاب پوشیدہ ہیں۔

ان بیتاب لہروں پہ تاریخ کی اس مظلوم ہستی کی دلخراش داستان جھلکتی ہے جس نے اپنے قبیلے کو جگ ہنسائی اور بے آبروئی سے بچانے کی خاطر خاموشی کا زہر قبول کیا۔

اسی سم خاموشی سے مولاناؒ اندر ہی اندر گھلتے رہے اور زندگی MELTING POINT کے عروج کو پہونچ کر فنا ہو گئی ــــ معاف کیجئے ــــ لفظ فنا روانی میں بے محل استعمال ہوگیا۔ چونکہ 'فنا' وہ زندگی ہوتی ہے جو جسم سے تعبیر ہو، وہ زندگی جس کی وسعتوں کے دائرے کسی عہد اور اس کی نسل کے شعور وآگہی تک پھیلے ہوں، وہ زندگی جسم در جسم، روح در روح آگے بڑھتی ہے، رازی وغزالی اور سعدی وحافظ کا خاکی جسم کب کا خاک ہوا لیکن ان کی زندگی کو فنا کے زمرے میں تو نہیں لایا جاسکتا کیونکہ ان کی زندگی انسانی شعور وآگہی کی روح میں ڈھل گئی۔ علمی حیات کو فنا نہیں، یہ تو آگی نسلوں کے لئے آب حیات کا کام کرتی ہے۔ حال میں مولانا وحید الزماںؒ کی علمی زندگی بھی روح شعور کا استعارہ بن گئی۔ اس لئے روانی میں میرا یہ لکھ جانا کہ ان کی زندگی فنا ہوگئی قطعی غلط ہے جس پر یہ میرا "کنفیشن" ہے۔

ہاں! ان کے بدن نے دکھوں سے نجات پائی ــ ان کی زمانہ شناس آنکھیں ان اذیت ناک مناظر سے، جن کو دیکھنے سے دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں، محفوظ ہوگئیں، ان کی سماعت دوست نما دشمنوں کی زہر آلود آوازوں کی حدوں سے دور ہوگئی۔

بھلا ایسے مریضانِ محبت کیا جئیں انورؔ
پکاریں جب مسیحا کو سنیں آواز قاتل کی

مختصر یہ کہ ان کو چین آگیا لیکن ــــ اہل دانش بے چین ہوگئے ــــ اس عہد بیمار کو اس حاذق طبیب کی ابھی اور ضرورت تھی۔ زمانہ (اور قوم) کی غیر معتدل اور ڈوبتی نبض پر ابھی ان کی انگلیاں تھیں، وہ اس کا مرض جان چکے تھے کہ اس عہد بیمار کی رگوں میں سم جہالت اپنا مزاج دہرا رہا ہے ــــ علم دین سے اس کا تریاق کشید کرنا اس حاذق طبیب کا نصب العین تھا ــــ پر یہ کیا ہوا، وہ کیمیا ساز علاج کی جدوجہد میں خود ابدی نیند سو گیا ــــ اہل دانش بے چین ہیں ــــ اب کون کیمیا ساز عہد بیمار کی رگوں میں دوڑ رہے سم جہالت کا تریاق تلاش کرے گا۔

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی ؒ نے "پیری مریدی" کی خانقاہیں آباد نہیں کیں، بلکہ شکستہ اور برباد خانقاہوں میں علم کی شمع جلانے کی مبارک سعی کی ہے۔ وہ اسلامی مزاج کی ان منزلوں پر تھے جہاں علم کو عمل اور عمل کو خلوص کی میزان پر تولا جاتا ہے اور اداکارانہ بزرگی اور ظاہری علم جہاں "ریاکاری" جیسا حرام ہوتا ہے۔ سازشوں سے پُر کھوپڑی پر اونچی دستار، اکل حرام سے پلے جسم پر جبہ، سیاہ قلب کے برابر بغل میں مصلّی بہتان کے لئے اٹھنے والی انگلیوں میں تسبیح، کمزوروں کے لئے ہاتھ میں عصا، اور خود ساختہ پیر طریقت ہو کر "مسند نشینی" کے لئے ائرکنڈیشنڈ بنگلہ، تشویشناک امر یہ ہے کہ صوفیہ کے خانقاہی نظام میں یہ چلن عام ہوتا جارہا ہے۔ شریعت اسلامی نے ایسے تصوف اور خانقاہی نظام کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ طرز نظام اسلام کو بدنام کرنے کی ایک کوشش ہے۔

دیوبند مکتبۂ فکر طریقت کے خلاف نہیں لیکن طریقت کے خانقاہی نظام میں اداکاریوں اور ریاکاریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ دیوبندیت عالم دین کے تمام رات سونے کو غیر عالم عابد کے تمام رات جاگنے پر افضلیت دیتی ہے۔

دیوبندی علماء نوافل پڑھنے کی جگہ حصول علم کو فوقیت دیتے آئے ہیں۔ مولانا اعزاز علی صاحب ؒ تو اس معاملے میں بڑے متشدد تھے، پڑھائی کے وقت کسی طالب علم کو نوافل پڑھتے دیکھ لیا تو برس پڑتے تھے، بلکہ راوی کا کہنا تو یہاں تک ہے کہ ہم نے ایسے طلباء کی پٹائی ہوتے بھی دیکھی ہے۔ دراصل کوئی بھی نظام ہو علم کی روشنی کے بغیر ناقص ہے۔ ہمارا خانقاہی نظام بھی فقدان علم کے باعث ریاکاروں کی چیرہ دستی کا شکار ہے۔ اسی لئے مولانا کیرانوی ؒ نے کوئی خانقاہ نہیں بلکہ خانقاہوں کو سنوارنے والی درس گاہیں سجائیں۔

مولانا وحید الزماں ؒ خانقاہوں اور مدرسوں کے مقصد کو سمجھتے تھے اور ان کے نظام کی روح سے بھی واقف تھے اس لئے جہاں کہیں ان میں غیر شرعی اور غیر ضروری نیز مضر نظام افنانے دیکھتے بلبلا اٹھتے تھے اور حق بات کہہ جاتے تھے ــــ جبکہ وہ یہ جانتے خوب تھے کہ حق ناشناسوں کے سامنے حق گوئی عذاب قبول کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن وہ یہ بھی تو جانتے تھے کہ حق جل شانہ کی بارگاہ میں یہی معاملہ معکوس ہو جاتا ہے۔

مولانا [illegible]

مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی

بیماری یا سحر

مولانا وحید الزماں صاحب مرحوم سے میری تفصیلی اور آخری ملاقات رمضان المبارک میں یعنی انتقال سے تقریباً ماہ ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی۔ مرحوم نے اپنے اوپر سحر کا شبہ ظاہر کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اچھا! کل صبح آکر آپ کو چیک کرلوں گا، دوسرے روز معلوم ہوا کہ مولانا کا شک بے بنیاد نہیں اور وہ بدترین سفلی عمل کی زد میں آچکے ہیں نیز مولانا کے جسمانی عوارض کا باعث وہی بات ہے جس کے بارے میں مولانا کو شک ہے لیکن میرے لئے پریشان کن یہ بات تھی کہ مرض اور سحر دونوں ہی آخری اور فیصلہ کن اسٹیج پر تھے اگرچہ میں نے مولانا کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی ڈھارس ہی بندھائی پھر بھی بجائے خود خطرات کے احساس سے پریشان تھا اس لئے مولانا سے یہ کہہ کر وطن واپس آگیا کہ آپ کے علاج کے سلسلے میں بعض ایسے احباب سے مدد لینے کی کوشش کروں گا جو علم جفر کے ماہر اور عملیات کے سلسلے میں کافی تجربہ کار ہیں۔ مولانا نے ازراہِ نوازش کچھ رقم بھی عنایت فرمائی تاکہ دوبارہ سفر میں کوئی زحمت نہ ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تین چار سال قبل بھی مولانا کے ساتھ یہ حرکت کی گئی تھی اور بروقت علاج و رد سحر کی وجہ سے خود مخالف عامل صاحب لڑھک گئے تھے۔ حالانکہ انھوں نے بعض ذرائع سے مولانا کو چیلنج کیا تھا کہ وہ مولانا کو قبرستان پہونچا کر دم لیں گے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود قبرستان پہنچ گئے۔" وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ"۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ مولانا کا وقت موعود آچکا تھا کیونکہ حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ کسی زمانے میں پڑھا ہوا شعر یاد آگیا ؎

واذا المنیة انشبت اظفارها
الفیت کل تمیمة لا تنفع

بہرحال دیوبند سے واپسی کے بعد عامل دوست کے پاس پہنچا اور وہ جونکہ خاکسار پر ضرورت سے

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

زیادہ مہربان ہیں اس لئے میں نے مولانا مرحوم کا نام پیش کرکے عامل صاحب سے کہا کہ آپ حساب جوڑ کر پہلے تو یہ بتایئے کہ ان کا کیا معاملہ ہے؟ اور اگر مرض کے علاوہ کوئی دوسری بات بھی ہے تو اس کے ازالہ اور تدارک کی تدبیر آپ کو یہ سوچ کر کرنی ہے کہ آپ ان کا نہیں بلکہ میرا علاج کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا حساب کتاب جوڑنے کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے ان مولانا دوست کی کسی سے سخت دشمنی چل رہی ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت کسی ایک سے نہیں بلکہ کئی ایک سے چل رہی ہے، چل چکی ہے اور خیال ہے کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی، بہرحال انھوں نے ازراہ نوازش اپنے یہاں روزانہ آنے والے مریضوں کے ازدحام کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سفر دہلی کے لئے یکم اپریل کی تاریخ دے دی اور راقم الحروف ان کے ساتھ ۲ اپریل ۱۹۹۵ء کی صبح دہلی پہنچ گیا، انھوں نے مولانا کو دیکھا اور مجھ سے تنہائی میں کہا کہ معاملہ بہت سخت ہے اور مکمل علاج کے لئے مطلوبہ وقت تک مولانا محض اپنی قوتِ ارادی سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھ سکیں گے امر مشتبہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ علاج شروع کیجئے باقی جو اللہ کی مرضی ہے اس کے سامنے چارہ کار ہی کیا؟ کم از کم اس احساس سے دل میں کبھی خلش تو نہ پیدا ہوگی کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ رمضان المبارک کی مذکورہ ملاقات ہی کی بات ہے، میں نے عرض کیا کہ اگر واقعی سحر وغیرہ کا معاملہ ہے تو علاج ضرور کروں گا لیکن اگر آپ صحت یاب ہوگئے تو آپ سے تحریر بھی لے لوں گا کہ بقیہ زندگی آپ سیاسی یا نیم سیاسی سرگرمیوں سے دور رہیں گے کیونکہ آپ کی صحت اب مزید مصروفیات اور اعصابی تناؤ کی متحمل نہیں ہوسکتی میری اس بات پر مولانا مرحوم نے میرے بے تکلف دوست اور ساتھی حکیم عبدالقدوس صاحب دیوبندی مرحوم (خلیفہ حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ حکیم صاحب موصوف نے بھی مدینہ منورہ میں تقریباً یہی مشورہ دیا ہے۔ (رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں حکیم صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔)

سحر کے اثرات

مولانا مرحوم کہنے لگے کہ گذشتہ سفر سعودی عرب کے دوران مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں خیرآباد کے مشہور عامل مولانا نصیر احمد صاحب کرمانی سیتاپوری (مرحوم) سے ملاقات ہوئی جن کی شاید سفر افریقہ سے واپسی ہوئی تھی انھوں نے ایک متعینہ تاریخ پر لکھنؤ بلایا تھا تاکہ وہ میرا مکمل علیاتی علاج کردیں۔ مگر بدقسمتی سے مذکورہ متعینہ تاریخ سے صرف چند روز قبل مولانا نصیر احمد صاحب کا جیپ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا جس کو وہ خود ہی چلا رہے تھے۔ مولانا مرحوم فرمانے لگے کہ جب میں دہلی میں ہوتا ہوں اس

وقت طبیعت بہت کچھ غنیمت رہتی ہے۔ مگر دیوبند پہنچتے ہی مصیبت آجاتی ہے، معلوم ہوتا ہے یہیں سے کسی نے کچھ کیا گیا ہے یا کیا جارہا ہے بلکہ دارالعلوم میں ملازمت کے دوران تو یہ کیفیت تھی کہ مدرسہ میں داخل ہوتے ہی قدم بوجھل ہونے لگتے جیسے ٹانگوں پر منوں بوجھ پڑ رہا ہو، بڑی مشکل سے زینوں پر چڑھنا ہوتا تھا لیکن دارالعلوم کی چہار دیواری سے باہر آتے ہی جسمانی کیفیت تقریباً نارمل ہوجاتی تھی۔ مرحوم سے میں نے دریافت کیا کہ چند سال قبل چند چیزیں پابندی سے پڑھنے کے لئے جو بتائی تھیں ان کو معمول بنایا کہ نہیں؟ تو مولانا مرحوم نے نفی میں جواب دیا۔ یہ نماز مغرب کے بعد میری گفتگو ہورہی تھی میں نے مرحوم سے کہا کہ نماز عشاء کے بعد بعض آیات متعینہ تعداد میں پڑھ کر کل صبح مجھے کیفیت بتائیں تو کہنے لگے کہ مولوی ابوالحسن! اس وقت تو میرا دل و دماغ بالکل قابو میں نہیں، مجھ سے تو اب کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔ مولانا کی بات سن کر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے اور میری ہمت پست ہونے لگی ــ مولانا نے بتایا کہ اب تو مجھ سے نماز بھی نہیں پڑھی جاتی، جوں ہی نیت باندھتا ہوں پیٹ میں اس قدر شدید گڑبڑ ہوتی ہے کہ نیت توڑنے پر مجبور ہوجاتا ہوں اور نماز کی نیت توڑتے ہی وہ بے چینی جاتی رہتی ہے۔ شاید مولانا کے کھانے میں کوئی سفلی چیز آگئی تھی جس کا علاج کوئی عامل کامل اٹھارہ کے نقش سے ہی کرسکتا تھا مولانا نے بتایا کہ دلی کے مشہور ترین ماہر ترین اور گراں ترین ڈاکٹروں کا علاج جاری ہے لیکن جب بھی وہ چیک کرتے ہیں کسی خاص اور متعین نتیجہ تک پہنچنے میں قاصر رہتے ہیں اور نہ ہی علاج ہی سے کوئی فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیچارے ڈاکٹر اس چیز کو کہاں گرفت میں لاسکتے تھے جو تمام جسمانی تکلیف کا بنیادی سبب تھی اور جس کی موجودگی میں کوئی بھی دوا تھوڑی ہی دیر کے لئے اپنا اثر دکھاسکتی ہے بلکہ ممکن ہے اس کے بعد نقصان دہ ثابت ہونے لگے۔

ایک آخری کوشش جو ناکام ہوگئی

؎ دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو ۔۔۔ اک جنازہ جارہا ہے دوش پہ تقدیر کے

مرحوم کی علالت فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی تھی اور بہ سلسلۂ علاج امید و بیم کے دھندلکوں میں مختلف تدابیر اپنائی جارہی تھیں معالجین تو اطمینان دلارہے تھے لیکن راقم الحروف کی چھٹی حس کسی کربناک انجام کے اندیشہ سے لرزاں و ترساں تھی۔ کیونکہ حالات کی ہر کروٹ نہ صرف یہ کہ پریشان کن ثابت ہورہی تھی بلکہ مایوس کن بھی جیسے کہیں دور سے آواز آرہی ہو

ے اٹھائے ہاتھ سوئے آسماں تیمارداروں نے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امید شفا کم ہے

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مولانا مرحوم کے ایک قدیم ترین اور مخلص ترین دوست نے جو کہ ہومیو پیتھک علاج کے ماہر ہیں علاج کی ذمہ داری خود قبول کرتے ہوئے اسپتال کے ڈاکٹروں سے کہا کہ : بیس پچیس روز آپ حضرات کوشش کر کے دیکھ چکے اب چند روز ہمیں بھی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں! اسپتال کے ڈاکٹر اس بات پر بخوشی راضی ہوگئے اور ہمیں بھی قدرے اطمینان ہوا کہ شاید یہ طریق علاج کامیاب رہے لیکن دو باتیں ایسی سامنے آگئیں کہ ہم لوگ دوبارہ پریشان ہوگئے ، ایک تو معالج نے یہ ہدایت جاری کردی کہ دوران علاج گلوکوز نہ چڑھایا جائے جبکہ راقم الحروف کو معلوم تھا کہ شاید ہفتہ عشرہ سے معدہ پانی کا گھونٹ بھی نہیں قبول کر رہا ہے اگر جسم میں پانی کی کمی ہوگئی تو دوران خون کس طرح برقرار رہ سکے گا۔ ؟ بار بار یہی خیال آتا۔ میں نے اپنی تشویش کا اظہار بعض قریبی احباب سے کیا تو وہ بھی پریشان ہوگئے ، دوسری سب سے بڑی یہ مصیبت پیش آئی کہ معالج صاحب سفر حج پر روانہ ہوگئے اور بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

ے اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

اس وقت اندازہ ہوا کہ موت کے مقابلے میں زندگی کا حصول کس قدر دشوار ہے۔ ممکن ہے جسے ہم زندگی سمجھ رہے ہیں وہ فریب زندگی ہو۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔

ے کسی کے در پہ سنا کل حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں خود موت بھی نظر آئی

مولانا حبیب الرحمٰن کیرانوی نمبر

مولانا بدر الزماں کیرانوی

والدِ محترم کے آخری ایّام

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں بہت سے مضامین لکھے جاچکے ہیں اور ترجمان دارالعلوم کے اس خاص نمبر میں متعدد مضامین ایسے ہوں گے جن میں ان کے علم وفضل اور کمالات پر مختلف انداز میں روشنی ڈالی گئی ہوگی۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد جو حضرات تعزیت کے لیے آئے خاص طور سے وہ لوگ جو دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے اور جن کو ان کی بیماری کے بارے میں تفصیل معلوم نہیں تھی اور جن کے لئے والد صاحب کی وفات ایک ناگہانی حادثہ تھا وہ سب ان کی بیماری اور علاج کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ مولانا آخری وقت میں کن حالات سے گذرے اور وہ کیا فرماتے تھے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کچھ تفصیل اس بارے میں قلمبند کر دی جائے۔

میں گذشتہ آٹھ سال سے ملازمت کے سلسلہ میں خلیجی ریاست قطر میں مقیم ہوں میرے یہاں قیام کے دوران والد صاحب دو مرتبہ قطر تشریف لائے۔ ایک مرتبہ ۱۹۹۱ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۴ میں۔ دونوں مرتبہ پہلے سعودی عرب کا سفر ہوا اور اس کے بعد قطر آنا ہوا۔ ۱۹۹۱ میں جب سعودی عرب کا سفر ہوا تو وہاں ہی میں ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور اسی حالت میں وہ قطر تشریف لائے۔ یہاں ایک ہفتہ قیام کرکے ہندوستان واپس تشریف لے گئے جہاں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کو یرقان کی شکایت ہے۔ دراصل ان کو یرقان کی شکایت سعودی عرب ہی میں ہوگئی تھی جس کی صحیح تشخیص نہیں ہوسکی۔ بیماری کا یہ حملہ ایسا تھا جس کے بعد وہ پوری طرح صحتیاب نہیں ہوسکے اور ان کی صحت میں بتدریج انحطاط آتا چلا گیا۔ یوں تو وہ گذشتہ ۲۰ سال سے ذیابیطس کے مریض تھے لیکن پابندی سے علاج کرتے تھے اور شکر کنٹرول میں رہتی تھی۔

سعودی عرب اور قطر کا دوسرا سفر ۱۹۹۴ میں ہوا۔ اس مرتبہ بھی وہ پہلے سعودی عرب تشریف لائے

اور ریاض میں اپنے بیحد قریبی اور خاص شاگرد مولانا عبدالسلام قاسمی صاحب کے یہاں قیام کیا۔ اتفاق سے اس مرتبہ بھی آٹھ دس روز تک طبیعت بالکل ٹھیک رہی۔ میں جب بھی فون کرکے خیریت معلوم کرتا فرماتے کہ اس مرتبہ ماشاءاللہ طبیعت ٹھیک ہے لیکن اچانک بیماری کا حملہ ہوا اور پھر مسلسل ۲۰ روز تک ریاض میں بیماری کی حالت میں قیام کیا۔ ریاض سے قطر تشریف لائے تو یہاں آکر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، تین روز تک یہ حال رہا کہ جو بھی چیز کھاتے وہ قے ہوجاتی تھی۔ میں ان کو ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مختلف ٹیسٹ لینے کے بعد بتایا کہ ان کا "بلڈ یوریا" بڑھا ہوا ہے کیونکہ گردے صحیح کام نہیں کر رہے ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر کے علاج سے قدرے افاقہ ہوا اور وہ کچھ کھانا وغیرہ کھانے لگے۔ اس درمیان والد صاحب سے ملاقات کے لیے مسلسل لوگ آتے رہے جن میں قطری، ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلا دیشی لوگ شامل تھے۔ وہ سب لوگوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے رہے اور اس طرح قطر میں چند روز قیام کے دوران بیحد مصروفیت رہی۔ لوگوں سے ملاقاتوں کے بعد جو وقت ملتا تھا اس میں وہ اپنی ڈکشنری "القاموس المحیط" کے کام میں مصروف ہوجاتے تھے کیونکہ ان دنوں ڈکشنری کا کام تکمیل کے مرحلے میں تھا۔ قطر میں ایک ہفتہ قیام کے بعد متحدہ عرب امارات میں اپنے ایک شاگرد مولانا احمد شاکر صاحب کے اصرار پر دبئی تشریف لے گئے، خیال یہ تھا کہ وہیں سے ہندوستان کے لیے واپسی کا سفر ہوجائے گا لیکن عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس روز ان کی دبئی سے ہندوستان روانگی تھی اس سے ایک روز قبل ہندوستان کے بعض علاقوں میں طاعون پھیلنے کی وجہ سے وہاں کے لئے تمام پروازیں منسوخ ہوگئیں، اس لیے وہ ہندوستان کا سفر نہیں کرسکے۔ ادھر ہم لوگ سخت پریشان ہوئے کہ دبئی میں طویل قیام ہوگا تو وہ پریشان ہوجائیں گے کیونکہ وہاں انکو گھر کا آرام نہیں مل سکے گا حسن اتفاق اسی دوران والد صاحب کے لیے قطر کی وزارت اوقاف کی طرف سے ویزا مل گیا اور وہ ایک بار پھر دبئی سے قطر تشریف لے آئے اور یہاں ایک ہفتہ قیام کرکے ہندوستان واپس تشریف لے گئے۔

قطر میں قیام کے دوران وہ اکثر اپنے سعودی عرب کے سفر اور وہاں کے قیام کا تذکرہ کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ ریاض اور جدہ میں ان کے شاگردوں نے کس طرح ان کی میزبانی کی۔ خاص طور سے مولانا عبدالسلام قاسمی صاحب نے ان کی مہمانداری اور خدمت میں دن رات ایک کردیا۔ انھوں نے والد صاحب کی اس قدر خدمت کی جس کو سنکر مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید اتنی خدمت اور ان کا اتنا اہتمام میں بھی نہیں کرسکتا۔ وہ اکثر ان مجلسوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے جو مولانا عبدالسلام صاحب کے مکان پر جمتی تھیں جہاں ریاض میں مقیم بیشتر فضلاءِ دارالعلوم دیوبند روزانہ شام کو جمع ہوجاتے تھے اور نہایت بے تکلفانہ ماحول میں اپنے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے اور والد صاحب سے مشورہ لیتے۔

قطر سے جب ہندوستان واپس تشریف لے جارہے تھے ہمیں اُسی وقت ان کی صحت کی طرف سے کافی تشویش تھی۔ ایئرپورٹ پر روانگی کے وقت کہنے لگے اَب تو تم چھ ماہ بعد آؤ گے، اگر زندگی رہی تو ملاقات ہوجائے گی۔ یہ کہتے ہوئے اُن کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ ہندوستان واپسی کے بعد طبیعت کی خرابی کا سلسلہ جاری رہا۔ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ میں طبیعت زیادہ خراب رہی اور عید کے بعد یعنی مارچ ۱۹۹۵ کے شروع میں ان کو ایک بار پھر بغرض علاج دہلی لایا گیا اور جیون نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے۔ ۱۸ مارچ کی صبح کو اطلاع ملی کہ طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں نے فوراً سفر کی تیاری شروع کردی اور ۲۴ مارچ کو دہلی پہونچ گیا۔ اس وقت والد صاحب جیون نرسنگ ہوم کے آئی۔ سی۔ یو (انتہائی نگہداشت والے یونٹ) میں داخل تھے۔ مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اچھا ہوا تم آگئے ملاقات ہوگئی۔ اس کے بعد میں گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ۲۲ روز تک ان کی تیمارداری میں لگا رہا۔ اس دوران ان کے اوپر مایوسی اور اُمید کی ملی جلی کیفیات طاری رہیں۔

علالت یا سحر

ہسپتال میں بیماری کے دوران اکثر کہتے تھے کہ "یہ صرف بیماری نہیں ہے بلکہ میرے اوپر سحر کا اثر ہے اس لیے علاج کا کوئی اثر نہیں ہورہا ہے" اور انتقال سے ایک روز قبل تک ان کو یہ احساس رہا کہ اگر سحر کا اثر ختم ہوگیا تو میرا علاج ہوجائے گا اور میں صحتیاب ہوسکوں گا۔

ہسپتال کے آئی۔ سی۔ یو میں ایک روز مجھ سے دریافت کیا کہ کیا مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) عیادت کے لیے آئے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ تو نہیں آئے، فرمایا کہ اگر آئیں تو اُن سے کہنا کہ اَب ہمارا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں نے سب کو یکطرفہ طور پر معاف کیا اَب وہ جانیں اور اُن کا ضمیر جانے۔ میں نے کہا کہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب تو نہیں آئے اور مجھے اُمید بھی نہیں کہ وہ آئیں گے، اگر آپ کی خواہش ہو تو یہ بات اُن تک پہونچادی جائے، اس پر کچھ دیر خاموش رہے پھر کہا کہ اس بارے میں تم جو مناسب سمجھو وہ کرو، اس کے بعد مختلف مواقع پر بہت سی باتیں ہوئیں لیکن اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوسکی۔

طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو ان کو آئی۔ سی۔ یو سے ہسپتال کے کمرہ میں منتقل کردیا گیا لیکن اگلے ہی روز سینے میں شدید تکلیف کی شکایت ہوئی اور پوری رات نہایت بے چینی اور تکلیف میں گذری ڈاکٹروں کو بتایا تو اُنھوں نے کہا کہ گردے پوری طرح کام نہیں کررہے ہیں جس کی وجہ سے بلڈ پوریا بہت بڑھ گیا

ہے اور جب تک یہ کم نہیں ہوگا تکلیف باقی رہے گی۔ وقتی طور پر سکون کے لیے انجکشن دیا گیا جس سے آرام ملا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے، مختلف لوگ عیادت کے لیے آتے رہے اور طبیعت جب ذرا سنبھلتی تو باتیں بھی کرتے۔ ان کا زور اس بات پر تھا کہ یہ صرف بیماری نہیں ہے بلکہ سحر کا بھی اثر ہے، چنانچہ ہسپتال کے علاج کے ساتھ چند عاملوں کا بھی علاج کرایا گیا۔ اسی دوران جیون نرسنگ ہوم کے ڈاکٹروں نے مایوس ہوکر مولچند ہسپتال دہلی کے گردوں کے اسپیشلسٹ کو بلایا۔ انھوں نے آکر بتایا کہ اب سوائے ڈایالیسس کے ان کا کوئی علاج نہیں اور کمزوری اتنی زیادہ ہے کہ ڈایالیسس کے کامیاب ہونے کی پوری اُمید نہیں اس لیے ہم لوگ تردد میں ہیں کہ ڈایالیسس کرایا جائے یا نہیں۔

کچھ لوگوں کا مشورہ ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کرایا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد قاسمی سے جن کی حال دنوں میں اس علاج کے لیے کافی شہرت ہے رجوع کیا گیا۔ جیون ہسپتال میں رہتے ہوئے ان کا علاج ایک ہفتے تک جاری رہا اور بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ ان کے علاج سے کچھ فائدہ ہوا ہے لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر خالد صاحب ایک ہفتہ کے بعد حج کے لیے چلے گئے اور ان کا علاج جاری نہ رہ سکا۔ میڈیکل رپورٹ سے پتہ چلا کہ اس وقت بلڈ یوریا بہت بڑھ گیا ہے۔ چوں کہ جیون ہسپتال میں ان کا کوئی علاج نہیں تھا اس لیے والد صاحب کے بیحد اصرار اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے ہم ان کو گھر لے آئے اور یہ فیصلہ کیا کہ کسی دوسرے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کا علاج کرائیں گے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہسپتال اور گھر پر بیماری کے پورے عرصے میں ان کے ہوش وحواس باقی رہے جبکہ جتنی مقدار میں ان کا بلڈ یوریا بڑھا ہوا تھا ڈاکٹروں کے مطابق ان پر مکمل غنودگی طاری ہوسکتی تھی لیکن وہ بیشتر اوقات میں پورے ہوش میں رہے۔ مزاج کے اندر نظم اور ڈسپلن اتنا زیادہ تھا کہ اگر تیمارداری کرنے والوں کی طرف سے کوئی بدنظمی ہوتی تھی تو اس پر بھی ٹوکتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ ایسے نہیں ایسے کرو، میرے پاس بیٹھنے کے لیے تم لوگ ایک ترتیب قائم کرلو، سب ایک ساتھ بیٹھوگے تو تھک جاؤگے، باری باری بیٹھو اور اپنی صحت کا بھی خیال رکھو۔ عیادت کے لیے جو لوگ آتے تھے ان کے بارے میں دریافت کرتے۔ غالباً وہ اس بات کے متمنی تھے کہ دارالعلوم کے لوگ ان کی عیادت کے لیے آتے، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے دیوبند لے چلو وہیں علاج کراؤں گا۔ دراصل وہ دارالعلوم سے قریب رہنا چاہتے تھے۔ دارالعلوم سے ان کو عجیب وغریب والہانہ لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم سے جبری سبکدوشی کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ وہ بظاہر تو اس کا اظہار نہیں کرسکے لیکن اس کو برداشت بھی نہیں کرسکے۔

انتقال سے ایک ہفتہ قبل میرے چچا فریدالزماں نما کے ایک واقف کار ڈاکٹر جو دہلی کے آل انڈیا

انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد صاحب کو دیکھنے کے لیے گھر آئے، انھوں نے تمام میڈیکل رپورٹیں دیکھنے کے بعد کہا کہ ابھی علاج کی گنجائش باقی ہے۔ انھوں نے نہ صرف ہم لوگوں کو اطمینان دلایا بلکہ والد صاحب کے پاس بیٹھ کر ان کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ ایک بار پھر ہسپتال علاج کے لیے چلیں کیونکہ والد صاحب کے مسلسل اصرار پر ان کو گھر لایا گیا تھا اور وہ دوبارہ ہسپتال جانے کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ جانے کا ارادہ کرلیا گیا لیکن اسی رات کو ان ڈاکٹر صاحب کا فون آیا اور انھوں نے بتایا کہ ایک حادثہ یہ پیش آگیا کہ سابق وزیراعظم مرارجی ڈیسائی کا انتقال ہوگیا ہے اس لئے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ کی او پی ڈی دو روز کے لیے بند رہے گی اس لیے فوری طور پر وہاں داخل کرنا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ ہم نے ہولی فیملی ہسپتال میں بات کرلی ہے آپ ان کو وہاں لے چلئے کل ہی ان کا ڈایالیسس کیا جائے گا۔ اس رات ہم نے والد صاحب کے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ پچھلے دو تین روز سے جو مایوسی کی کیفیت تھی وہ ختم ہوگئی تھی اور ان کو ایک بار پھر یہ اُمید ہو چلی کہ ابھی علاج کی گنجائش باقی ہے کیونکہ اس رات انھوں نے کئی بار ہسپتال جانے کے بارے میں دریافت کیا حالانکہ اس سے قبل وہ ہسپتال چلنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔

اگلے روز ان کو ہولی فیملی ہسپتال لے جایا گیا جہاں ان کا ڈایالیسس ہوا لیکن کمزوری زیادہ ہونے کی وجہ سے ڈایالیسس کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے بعد ان کا اصرار ہوا کہ مجھے گھر لے چلو۔ ڈاکٹروں کا مشورہ بھی یہی ہوا کہ اب گھر ہی لے جانا بہتر ہے۔ جس وقت ان کو ہولی فیملی سے گھر لائے تو ہم سب بیحد مایوس تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک بار پھر ہومیو پیتھک علاج کا سہارا لیا گیا اور یہ مشورہ بھی ہوا کہ کلکتہ کے ایک مشہور عامل مولانا مصطفےٰ قاسمی سے جن کے بارے میں سُنا تھا کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا بھی کامیاب علاج کیا تھا رجوع کیا جائے۔ چنانچہ والد صاحب سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے رضامندی ظاہر کی اور پھر مسلسل انتظار رہا اور دریافت کرتے رہے کہ وہ آئے یا نہیں۔ ادھر ہم لوگوں نے بڑی دُشواری کے بعد مولانا مصطفےٰ قاسمی صاحب سے جو کلکتہ کے قریب کسی جگہ رہتے ہیں، رابطہ قائم کیا لیکن انھوں نے کسی وجہ سے دہلی آنے سے معذوری ظاہر کردی۔ انتقال سے ایک روز قبل رات کو والد صاحب پر کچھ غنودگی کی کیفیت طاری رہی۔ اسی حالت میں انھوں نے کئی بار مولانا مصطفےٰ کے بارے میں دریافت کیا۔ صبح کو تقریباً چار بجے کہنے لگے کہ کیا مولوی مصطفےٰ ابھی سو کر نہیں اُٹھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ تو ابھی کلکتہ سے نہیں آئے۔ یہ سُنکر ان کو بڑی مایوسی ہوئی اور دوبارہ انھوں نے اس بارے میں دریافت نہیں کیا۔ اگلے روز پورا دن بے چینی میں گذرا اور شام کو تقریباً چھ اور سات

(بقیہ صفحہ ۵۴۲ پر)

محمد اظہار الحق وینالوی قاسمی

سفر آخرت کی سرگذشت

۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء کی شام کو دیوبند میں عثمانی مسجد کے قریب سے گذر ہوا تو ذہن میں آیا کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی خیریت معلوم کرلوں۔ اس سے پہلے بھی میرا معمول تھا کہ وقتاً فوقتاً کتب خانہ حسینیہ میں جاکر بھائی مولوی قمر الزماں سے مولانا کی خیر وعافیت معلوم کرلیتا۔ حضرت مولانا کے گھر کی دہلیز پار کی تو ایک صاحب پر نظر پڑی، جو کتب خانہ حسینیہ میں رہا کرتے تھے۔ ان سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا کی کوئی خبر ملی ہے آئی ہے؟ ان کا جواب تھا کہ جی ہاں سب خیریت ہے۔ شاید ان کو حقیقت حال کا علم نہیں تھا۔ چند ہی لمحے گذرے ہوں گے کہ اندر سے رونے کی آواز آئی۔ گھبراہٹ کے عالم میں تھوڑا اور اندر داخل ہوا تو تمام لوگوں کی آنکھیں رو رو کر یہ کہہ رہی تھیں کہ ابھی ابھی نادرِ علمی کا وہ فرزند جس نے افراد سازی کے لیے اپنے آپ کو مٹا ڈالا تھا، قضائے الٰہی کو لبیک کہہ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر قلب وجگر پر کیا گزری، الفاظ میں اس کا بیان آسان نہیں۔ زبان جیسے گنگ ہوگئی۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں، کس کو تسلی دوں، اپنے آپ کو یا اہلِ خانہ کو۔ تھوڑی دیر کے بعد روتے ہوئے دل کے ساتھ باہر آیا اور ٹیلی فون پر دارالعلوم کے متعدد اساتذہ کو اس عظیم سانحہ کی اطلاع دی۔ جس کو بھی یہ المناک خبر ملی شدتِ تاثر کے باعث اپنی جگہ ساکت و صامت رہ گیا اور اِنّا للہ کے دامنِ تسلی میں پناہ لی۔ دیوبند کے ایک نوجوان فاضل دیوبند کو (جن کے یہاں راقم کا عارضی قیام تھا) جب اس سانحہ کی اطلاع دی تو سنتے ہی بے ساختہ

متعلم شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اور حواس باختگی کے عالم میں ان کے منھ سے نکلا کہ "مظلوم کی موت ہو گئی" وہ دوڑتے ہوئے مجھے ساتھ لے کر مولانا کے گھر پہونچے۔ اس وقت احساس ہوا کہ ہم ادنیٰ طالبعلموں کی جب یہ حالت ہے تو زیادہ قریبی لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ دہلی فون پر رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ۲-۲ بجے رات تک جسد خاکی دیوبند پہونچ سکے گا۔ پھر تو طلبہ اور اساتذہ اور شہریوں کا ہجوم مولانا کے گھر پر سیلاب کی طرح امنڈ پڑا۔

میری نظروں کے سامنے آج پھر وہی تاریخی حادثہ تھا جو ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی میں پیش آیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت ایک تحریک کی آنکھیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کی وفات کی شکل میں بند ہو گئی تھیں اور آج اسی تحریک کے ایک بے لوث اور بے مثال خادم کی آنکھیں حضرت مولانا وحید الزماں کی رحلت کی شکل میں بند ہو گئیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ کہتے ہوئے آخری سانسیں لی تھیں کہ "مرنے کا تو مجھے افسوس نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر مرگ پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میں میدانِ جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے" حضرت مولانا وحید الزماں صاحب شاید مرنے سے پہلے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے موت کا کوئی غم نہیں مگر کاش کہ آج میں طلبائے دارالعلوم کے درمیان ہوتا اور میری آخری سانس بھی دارالعلوم اور طلبہ کے کام آتی۔

رات میں تقریباً ۲ بجے مولانا کا جسدِ خاکی دہلی سے دیوبند لایا گیا۔ اس وقت تک طلبہ دارالعلوم اور شہری حضرات انتظار کر رہے تھے۔ آخری دیدار کے لیے زائرین کا تانتا سا بندھ گیا۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ ظالم بھی تعزیت کے لیے آیا ہے۔ اسے بھی افسوس ہے کہ میں نے ایسے شیشے کو ٹھیس پہونچائی ہے جس میں انسانوں کو اپنا آئیڈیل نظر آتا ہے۔

ایک ذمہ دار استاد نے مجھے حکم دیا کہ مائک پر آج کی تعطیل کا اعلان کردو اور ایصالِ ثواب کے لیے اساتذہ اور طلبہ سب کو دارالحدیث میں یکجا ہونے کی اطلاع کرو چنانچہ کچھ ہی دیر میں لوگ پروانہ وار ایصالِ ثواب کے لیے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد تمام محبین مولانا کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ جوں جوں نمازِ جنازہ کا وقت قریب ہوتا گیا دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔

جنازہ اٹھایا گیا۔ راقم نے ایک طرف کاندھا لگانے کی سعادت حاصل کی۔ مولسری

میں پہونچے تو انسانوں کا جم غفیر دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ جس طرف نگاہ اٹھتی پژمردہ چہرے نظر آتے۔ البتہ ان لوگوں کے دلوں میں شاید مسرت وشادمانی کے پھول کھل رہے ہوں اور وہ فتح مبین کے خیالی ترانے گا رہے ہوں جو مولانا کو اپنے مفادات کی تکمیل کی راہ میں مانند خار سمجھتے تھے۔ میت کے آخری دیدار کے لیے لوگ اس طرح باہم دست وگریباں ہو رہے تھے کہ شبہ النا شکل ہو رہا تھا۔ مولسری سے کرتا حدِ نگاہ باب قاسم کے بیرونی حصہ میں بھی طلبہ، اساتذہ اور اہالیان دیوبند کا ہجوم بے پناہ تھا۔ گیارہ بجے بحرالعلوم حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی نے نماز جنازہ پڑھائی، پھر جنازے کو لے کر مزارِ قاسمی کی طرف روانہ ہوئے جنازہ میں بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئیں تھیں اس کے باوجود کاندھا دینے والوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ ناکافی ہو رہی تھیں۔ میں نے پچھلے پائے کو پھر کاندھا دینے کی سعادت حاصل کی۔ سخت اژدھام کی وجہ سے پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ کاندھا دینے والے انگلیوں پر رینگتے رہے۔ کسی کی گھڑی کھل کر گر رہی تھی تو کسی کی چپل چھوٹ جا رہی تھی۔ تا آنکہ کسی کسی طرح جنازہ مدفن تک پہونچا اور ہزاروں سوگواروں نے اس مخزن علم وادب کو غمزدہ دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اکابرین دیوبند کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا۔ قبرستان سے لوٹتے وقت ذہن خیالوں میں گم ہو گیا اور ماضی کے واقعات نگاہوں میں پھرنے لگے۔

مولانا سے عقیدت کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی جب میں مدرسہ اشرف العلوم سیاڑھی (بہار) میں زیرِ تعلیم تھا اور وہاں مولانا کی تالیف نفحۃ الادب پڑھنے اور القاموس الجدید سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا۔ عربی درجہ چہارم میں داخلے کے لیے دارالعلوم دیوبند آیا۔ خوش قسمتی سے داخلہ تو ہو گیا لیکن میری بدقسمتی کہ اسی سال چند روز پہلے رمضان میں مولانا کو دارالعلوم سے علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ باب الظاہر کمرہ ۲۲ میں الجمعیۃ اخبار پر نظر پڑی جس میں تحریر تھا کہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کو پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریسی مشاغل سے سبکدوش کر کے سات سو روپے ماہوار وظیفہ دیا جانا منظور کیا گیا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر دل کو سخت صدمہ پہونچا کیونکہ میں یہ ارمان لے کر آیا تھا کہ مولانا سے کچھ حاصل کروں گا۔ اس خبر کے عام ہونے سے ماحول میں افراتفری پھیل گئی۔ مولانا کے ساتھ ہوئی ظلم وزیادتی کی تفصیل پوسٹروں کی شکل میں دیواروں پر لگنے لگی۔ شاگردوں کے اصرار پر حضرت مولانا وحید الزماں صاحب نے "مدلل جواب" نامی ایک کتاب تحریر کی جس

سے ظالموں کی نقاب کشائی ہوگئی اور مولانا کے مخالفین میں گھبراہٹ سی پھیل گئی۔ اس کے نتیجہ میں ہر اس طالب علم پر کڑی نگاہ رکھی جانے لگی جو مولانا وحیدالزماں صاحب کے گھر کا رُخ کرتا۔ اُن دِنوں طلبہ کی اصطلاح میں بہت سے "چمچے" فریضۂ تملق وتجسس کی انجام دہی کے لیے خفیہ طور پر یہاں وہاں گھومتے اور طلبہ کی نقل وحرکت کو سونگھتے پھرتے تھے۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور مولانا سے استفادہ کی راہ ڈھونڈھتا رہا۔

مولانا سے پہلی ملاقات ان کے شاگرد رشید مولانا عمران صاحب سیتامڑھی (سابق کیبنٹ ممبر جمعیۃ الطلبہ) کی معیت میں ہوئی۔ مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوران یہ سوچ کر کہ میں ایک عظیم مربی ومعلم کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں، دل فرطِ مسرت سے جھوم رہا تھا لیکن ساتھ ہی ڈر کے مارے مضطرب اور سہما ہوا بھی تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس طرح بے ضابطہ ہی سہی مولانا کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوگئی۔ کئی دفعہ دارالعلوم دیوبند کی انٹلی جنیس کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن بلا خوف وخطر اپنی منزل کی تلاش وجستجو میں لگا رہا۔ مطالعہ کا طریقہ، انشاء پردازی کا اسلوب، تقریر کا انداز وغیرہ، ان سب امور کے بارے میں مولانا نے مختصر ملاقاتوں کے دوران جو رہنمائی فرمائی اس کی قدر وقیمت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو ان سے کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ مولانا کے علم وفضل، اندازِ تعلیم وتربیت اور دوسرے اوصاف وکمالات کے بارے میں مجھ جیسے طفلِ مکتب کی کیا مجال جو لب کھولے۔ ان کے تمام تلامذہ اور تمام اہلِ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ وہ اس دور کے سب سے بڑے معلم اور سب سے بڑے مربی تھے۔

بقیہ: والدِ محترم کے آخری ایّام

بجے۔ کے درمیان ان کو خون کی کئی اُلٹیاں ہوئیں اور ساڑھے سات بجے جب آخری اُلٹی ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ ہم سب کو غمزدہ چھوڑ کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اسعد الاعظمی

علم و ادب کا آفتاب غروب

گذشتہ ماہ اپریل کے وسط میں ملک و بیرون ملک کے علمی و دینی حلقوں پر یہ اندوہناک خبر بجلی بن کر گری کہ برصغیر ہند و پاک کے ممتاز عالم دین اور عربی زبان و ادب کے معروف اسکالر، دار العلوم دیوبند کے سابق استاذ حدیث و عربی ادب، ناظم تعلیمات و مددگار مہتمم نیز ملی جمعیۃ علمائے ہند کے سابق اور مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کے موجودہ صدر، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی طویل علالت کے بعد ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء کو شام ساڑھے سات بجے ذاکر نگر نئی دہلی میں اپنے برادر خورد مولانا عمید الزماں صاحب کے مکان پر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اس خبر صاعقہ اثر کا پھیلنا تھا کہ تھوڑی ہی دیر کے اندر دہلی میں مولانا کی آخری زیارت کے لئے محبین و معتقدین، تلامذہ اور دیگر معززین شہر بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔

رات ہی میں مولانا کی میت دہلی سے دیوبند لے جائی گئی جہاں صبح ۴ بجے سے ساڑھے دس بجے تک دار العلوم دیوبند کے طلباء و اساتذہ و اہالیان شہر نے قطار اندر قطار مولانا کے جسد خاکی کی زیارت کی۔ مولانا کے آخری دیدار کے لئے خاص طور پر طلباء کے بے پناہ جوش و خروش کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگرچہ مولانا کو آخر میں دار العلوم دیوبند کی خدمت سے جبری سبکدوش کر دیا گیا تھا لیکن اس سے طلبائے دار العلوم کے درمیان ان کی بے مثال مقبولیت و محبوبیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، نائب مہتمم و شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خاں، ناظم تعلیمات مولانا قمر الدین، اساتذۂ حدیث مولانا نعمت اللہ

اعظمی، مفتی سعید احمد پالن پوری، مولانا عبدالحق اعظمی، مولانا زبیر احمد، مفتی ظفیر الدین، مولانا ارشد مدنی مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا عبدالخالق سنبھلی، مولانا عبدالخالق مدراسی، وقف دارالعلوم کے مہتمم مولانا محمد سالم قاسمی، شیخ الحدیث مولانا سید انظر شاہ کشمیری، مظاہر علوم وقف کے شیخ الحدیث مولانا عثمان غنی، مولانا وقار احمد، مظاہر علوم سہارنپور کے استاد مولانا رضوان نسیم، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ کے مہتمم اور مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا عبداللہ مغیثی اور ان اداروں کے دیگر اساتذہ وطلباء، نیز تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، کارگزار ناظم اعلیٰ مولانا مزمل الحق حسینی، رکن عاملہ مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، سکریٹری مولانا انس محمد گلزار قاسمی، ارکان مشاورتی بورڈ مولانا غیاث الحسن مظاہری، مولانا شفیق الرحمٰن میرٹھی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی، مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری مولانا فضیل احمد قاسمی، معززین شہر دیوبند جناب حسیب صدیقی، ڈاکٹر شمیم و حکیم اسحاق وغیرہ۔ دہلی سے حافظ انس علوی، جمعیۃ علمائے ہند کے سکریٹری مولانا مسجد مدنی اور مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ کے اساتذہ پر مشتمل وفود اور دوسرے بہت سے حضرات نے مولانا کے گھر پر ان کے برادران و صاحبزادگان کو تعزیت پیش کی۔

اس دوران دارالعلوم دیوبند کے لاؤڈ اسپیکر پر وقفہ وقفہ سے مولانا کے سانحۂ ارتحال کی خبر کا اعلان کیا جاتا رہا۔ دارالعلوم دیوبند اور وقف دارالعلوم میں تعطیل کا اعلان کر دیا گیا اور آیت کریمہ کے ختم کا اہتمام کیا گیا۔

جنازہ اور تدفین

صبح ۱۱ بجے دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مولسری میں مولانا کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس ہزار افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس سانحہ کی خبر فوری طور پر نشر ہو جانے سے دیوبند کے علاوہ سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ

اور دوسرے نواحی علاقوں سے بھی بہت سے افراد نے جنازہ میں شرکت کی۔ نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی نے پڑھائی۔ جس کے بعد علم و اخلاق اور عزم و عمل کے اس پیکر کو قبرستان قاسمی میں اکابرین دیوبند کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ کو کاندھا دینے کے لئے لوگوں کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ قطر کی وزارت اوقاف کے شیخ عبدالمحسن نے بھی نماز جنازہ میں شرکت کی۔

تعزیتی پیغامات

مولانا کے سانحۂ ارتحال پر ہند و بیرونِ ہند سے تلامذہ و معتقدین اور دوسرے حضرات کی طرف سے خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعہ بڑی تعداد میں تعزیتی پیغامات موصول ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ تعزیتی پیغامات بھیجنے والی اہم شخصیات میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، مفتی مظفر حسین صاحب ناظم مظاہر علوم وقف، مولانا محمد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد رابع حسنی ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، جناب امین الحسن رضوی، ڈاکٹر سید عبدالباری (آل انڈیا ملی کونسل۔ نئی دہلی) مولانا رضوان القاسمی حیدرآباد، ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی لکھنؤ، مولانا ندیم الواجدی دیوبند، مفتی فخرالاسلام کلکتہ (ارکان عاملہ تنظیم ابنائے قدیم) مولانا عزیز الحسن صدیقی غازیپور، مولانا اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ بنارس، مولانا ظہیر انوار بستی، مولانا عبدالعلی فاروقی ایڈیٹر البدر لکھنؤ، ڈاکٹر محمد فرقان ایڈیٹر سچ بات کل سچ دہلی، مولانا نور عالم خلیل الامینی، مولانا محمد رضوان بمبئی، جناب عبدالعزیز شمر سلفی ایڈیٹر نوائے اسلام دہلی، مولانا محمد شعیب قاسمی ججے پور، مولانا محمد فرقان قاسمی بجنور، مولانا محمد عزیز قاسمی پورہ معروف مئو، مولانا محمد اسلم جاوید رامپور، مولانا عبدالغفار و مولانا افتخار احمد (مدرسہ امینیہ دہلی) شیخ عبدالعزیز عمار جامعۃ الامام محمد بن سعود (سعودی عرب) قابل ذکر ہیں۔ سعودی عرب، قطر اور کویت میں مقیم فضلائے دیوبند اور کویت و سعودی عرب کے سفارت خانوں کی طرف سے بھی تعزیتی خطوط موصول

ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بے شمار مدارس عربیہ اور مسلم اداروں اور تنظیموں کے ذمہ داروں نے بھی تعزیتی پیغامات ارسال کئے ہیں جن میں مدرسہ فلاحِ دارین سورت، تنظیم علمائے ٹانڈہ بادلی مدرسہ انوار القرآن نعمت پور سہارنپور، مدرسہ قاسمیہ تعلیم الاسلام موانہ میرٹھ، جامعہ اسلامیہ قاسمیہ سیتامڑھی، مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی، دار العلوم الاسلامیہ بستی، بزم فلاح دارین سہارنپور، مدرسہ ٹانڈہ بادلی، مدرسہ ریاض العلوم سرونج، مدرسہ ٹنڈیرہ مظفر نگر، قاضی پبلشرز دہلی، مدرسہ دینیہ غازیپور وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سے تلامذہ و معتقدین دور دراز کا سفر طے کرکے دہلی و دیوبند پہنچے اور مولانا کے متعلقین سے اظہار تعزیت کیا۔ مولانا اسعد مدنی، مولانا بدر الدین، مولانا ابو القاسم بنارسی (ارکان مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند) اور مولانا مرحوم کے بچپن کے دوست حکیم منظور صاحب (شاملی، مظفر نگر) نے بھی گھر پہنچ کر اعزہ و اقارب کو تعزیت پیش کی۔

تعزیتی جلسے

مولانا کی وفات پر ملک کے مختلف حصوں میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔ دار العلوم دیوبند، وقف دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مظاہر علوم (وقف)، امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، دار القضا رجنوبی دہلی، دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد، آل انڈیا ملی کونسل، مدرسہ شاہی مرادآباد، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، جامعہ رحمانی مونگیر، مرکز تبلیغی جماعت دہلی، مدرسہ ریاض العلوم سرونج، جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ، جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، مدرسہ حسین بخش دہلی، جامعہ رحیمیہ دہلی، جامعہ اسلامیہ فیض العلوم رامپور، جامعۃ القرآن الکریم بجنور، مدرسہ قاسمیہ کلکتہ، اور تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کی شاخ شہر میرٹھ، نیز سعودی عرب و قطر کی شاخوں سے تعزیتی جلسوں اور ایصالِ ثواب کی محفلوں کی خبریں موصول ہوئی ہیں۔

تنظیم ابنائے قدیم کا تعزیتی جلسہ

حضرت مولانا کیرانوی تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اور اس کی مرکزی مجلس عاملہ کے اہم رکن تھے، ان کی وفات حسرت آیات جہاں ایک ناقابل تلافی ملی خسارہ ہے وہیں تنظیم ابنائے قدیم کے لئے ایک عظیم ذاتی سانحہ بھی ہے۔ تنظیم کے مرکزی دفتر نے مولانا کے سانحہ ارتحال پر ۱۲؍اپریل ۱۹۹۵ء کو بعد نماز مغرب غالب اکیڈمی نئی دہلی میں بڑے پیمانے پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس میں دہلی اور آس پاس کے علاقوں سے علمائے کرام دینی مدارس کے ذمہ داران اور متعدد مسلم اداروں اور تنظیموں کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور مولانا کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی، اس جلسہ کو مسلمانوں کے تقریباً ہر مکتب فکر کی نمائندگی کا امتیاز حاصل رہا۔

اس موقع پر مولانا سید احمد ہاشمی سابق ایم پی نے کہا کہ مولانا مرحوم ایک طرف انتہائی شریف، وضع دار اور مرنجاں مرنج اور دوسری طرف بہت کھرے انسان تھے۔ جو بات ان کی نظر میں حق ہوتی اس کے برملا اظہار میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ وہ نرے عالم نہیں تھے بلکہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور متانت فکر بھی اس درجہ تھی کہ اکابرین ان کی قدر دانی پر مجبور تھے۔ وہ عربی زبان وادب کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ ہوسکتا ہے کہ تشہیر و پروپیگنڈہ کی اس دنیا میں ہم ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے ہوں اور ان کو وہ شہرت نہ مل سکی ہو جس کے وہ مستحق تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت سی شہرت یافتہ شخصیتوں سے بلند تھے۔ قحط الرجال کے اس زمانے میں ان کا کوئی بدل ملنا ناممکن ہے۔

آل انڈیا ملی کونسل کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل مولانا اسرار الحق قاسمی نے کہا کہ مولانا مرحوم میرے استاذ تھے اور مجھے ایک عرصہ تک ان کے قریب رہنے، ان کے ساتھ کام کرنے اور کچھ سیکھنے کا

موقع ملا۔ میں نے پایا کہ مولانا فکری انسان ہونے کے ساتھ ساتھ علمی شخصیت تھے۔ کوئی فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرتے اور پھر اس پر جم جاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ سوچا گیا ہے اس کو عملی شکل دی جائے، اور ان کی یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے ہر میدان میں انھیں لڑائی مول لینی پڑی۔ شریعت اور اپنے اسلاف کی روایات پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ساتھ ہی عصری تقاضوں کو بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ طلبار کے ساتھ ان کی دردمندی اور شفقت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ طلبار کی مالی ضرورتوں کے لئے انھوں نے دارالعلوم میں باہمی امدادی فنڈ قائم کیا جس سے بے شمار طلبار مستفید ہوئے۔

انھوں نے کہا کہ مولانا موصوف صرف پڑھاتے نہیں تھے بلکہ شمع کی طرح پگھل پگھل کر رجالِ کار تیار کرتے تھے۔ تدریس اور تصنیف وتالیف کی مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے آرام کے اوقات میں طلبار پر محنت کرتے تھے۔ اس محنت کے نتیجہ میں وہ طرح طرح کی جسمانی تکلیفوں میں مبتلا رہتے۔ لیکن کبھی ہمت نہ ہارتے۔ اس محنت کا ثمرہ آج پورے ملک میں موجود ہے۔ مولانا دنیا سے چلے گئے لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ وہ ایسی نسل اور ایسے افراد تیار کر کے گئے ہیں جو ان کے مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ مولانا کے تلامذہ ان کا سب سے بڑا ورثہ اور ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مولانا قاسمی نے تجویز پیش کی کہ مولانا مرحوم پر بڑے پیمانہ پر ایک سیمینار کر کے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا جائے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے کہا کہ مولانا وحید الزماں علیہ الرحمۃ کے کردار کا ایک یادگار پہلو ان کا خلوص تھا، ان کی رائے خیانت کے ساتھ نہیں دیانت کے ساتھ ہوتی تھی۔ ان کی رائے سے اختلاف تو ممکن ہے لیکن ان کے اخلاص اور ان کی نیک نیتی پر شک کی گنجائش نہیں۔ ان کا جوہر انسانیت کا جوہر تھا وہ بڑے بہادر اور جرأت مند انسان تھے۔ ان کی خدمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مدارس کے فضلار پر عربی بولنے اور لکھنے پر قادر نہ ہونے کے الزام کو دور کیا۔ مولانا کا یہ قابل قدر کارنامہ ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

طلبار کو عربی زبان اور عربی صحافت کا ماہر بنا کر انھوں نے عرب دنیا میں ہندوستانی علمار کا وقار بڑھایا ہے۔

جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا محمد شفیع مونس نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم سے میری ذاتی ملاقاتیں کم رہیں لیکن میں اس بات سے بہت متاثر رہا کہ ان کے علمی مرتبہ اور علمی و ملی خدمات کے ساتھ ان کے احباب و رفقار اور شاگرد سب ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے معترف ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو آج بہت ہی کم یاب ہے۔ ایسی شخصیت کا اٹھ جانا بڑے صدمہ کی بات ہے۔

قومی مشاورت کمیٹی کے کنوینر جناب جاوید حبیب نے کہا کہ مولانا اگرچہ میرے استاد نہیں تھے لیکن ان کے بہت سے شاگردوں سے میرے روابط رہے ہیں۔ وہ جس عقیدت سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عظمت کے کس بلند مقام پر فائز تھے، انھوں نے عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور طلبار کی شخصیت سازی جیسے عظیم کام میں مدت حیات صرف کی، زہد و استغنا کی زندگی گذاری اور حکومت وقت اور حکمرانوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اسی لئے انھیں وہ شہرت جو حکمرانوں کے توسط سے ملتی ہے نہ ملی۔ لیکن علم و عمل سے حاصل ہونے والی دائمی عزت و عظمت حکمرانوں کے طفیل ملنے والی حقیر اور عارضی شہرت سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ جناب جاوید حبیب نے مولانا کی ظاہری یادگار کے ساتھ دلوں اور دماغوں میں ان کی یادگار قائم کرنے پر زور دیا۔

ممبر پارلیمنٹ جناب م افضل نے ۱۹۸۰ء میں مولانا مرحوم سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا جب دارالعلوم کے ہنگامہ کے دوران وہ صحافی کی حیثیت سے دیوبند گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا نے تمام معاملات پر جس طریقے سے روشنی ڈالی اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور اسی دن سے مولانا سے ہمیشہ کے لئے ایک عقیدت سی ہو گئی۔ وہ اپنی بات اس طرح پیش کرتے تھے کہ سننے والا مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ م افضل نے کہا کہ دیوبند میں گھومتے ہوئے طلبار اور اساتذہ کی زبان پر بس ایک ہی نام سنائی دیتا تھا

اور وہ مولانا مرحوم کا تھا۔ مولانا کے ساتھ بعد میں جو حالات پیش آئے وہ ہم سب کے لئے بڑے تکلیف دہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ دنیاوی اعتبار سے شاید مولانا کو وہ شہرت نہ مل پائی جو ان کی بلند وبالا اور عظیم المرتبہ شخصیت کو ملنی چاہئے تھی۔ اور ان کے مقابلے میں بہت چھوٹے لوگوں نے بڑی شہرت حاصل کرلی۔ لیکن اس سے ان کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ مولانا ہمیشہ صاف گو، راست باز اور اصولوں پر اٹل رہے وہ خوشامد اور تملق کے شائبہ سے بھی بچتے تھے۔ طلبا میں ان کی مقبولیت کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث نے مولانا مرحوم کے اخلاق کریمانہ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء کا واقعہ سنایا۔ جب وہ عربی درجہ اول کے طالب علم تھے اور دارالعلوم دیکھنے کا شوق انھیں دیوبند لے گیا۔ وہاں اتفاقاً مولانا سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے خیریت اور سفر کا مقصد وغیرہ پوچھا اور عربی میں مہارت کے لئے کچھ نصیحتیں کیں اور کچھ کتابوں کی نشاندہی کی۔ مولانا خلجی نے کہا کہ مولانا علیہ الرحمہ مجھ ادنی جماعت کے طالب علم کے ساتھ بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے اور پھر یہ بھی پوچھا کہ آپ جس طالب علم کے کمرہ میں مقیم ہیں وہاں کوئی پریشانی تو نہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ اس کے باوجود حضرت مولانا نے غایت شفقت سے مولانا معراج الحق علیہ الرحمہ کے نام رقعہ لکھ کر دیا کہ عبدالوہاب کو مہمان خانہ یا کسی خاص کمرہ میں الگ سے جگہ دی جائے اور ان پر خاص توجہ دی جائے۔ یہ وہ نقش ہے جو میں کبھی بھول نہیں سکتا اور جو اسلاف کی یاد دلاتا ہے۔

مولانا موصوف نے سفر کویت کے بھی کچھ واقعات سنائے جب وہ مولانا مرحوم کے رفیق سفر تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا نے عربی کا ایک نیا ذوق پیدا کیا اور مختلف اداروں میں عربی کی جو خدمت ہو رہی ہے اس کے اولین معماروں کی فہرست میں مولانا کا اسم گرامی صف اول میں ہوگا۔ وہ ہمارے لئے عربی لغات کا بہترین سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جس سے کوئی طالب علم مستغنی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے مولانا کے خطوط و مکاتیب کی ترتیب و اشاعت پر زور دیا۔ اور کہا کہ مولانا پر سیمینار کم از کم برصغیر کے پیمانے پر ہونا چاہیے۔

مولانا عبدالرحمن کیرانوی نبر

مولانا احمد علی قاسمی نے کہا کہ میں مولانا مرحوم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب تقریباً ۴۴ سال پہلے وہ اور میں دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، دور طالب علمی سے ان میں یہ جذبہ نمایاں تھا کہ اپنا علم وفن دوسروں کی طرف منتقل کردیں۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی انھوں نے عربی زبان وادب کو فروغ دینے کا کام شروع کردیا تھا۔ مولانا کا بڑا کمال یہ تھا کہ ان کے خلوص سے کسی کو اختلاف نہ رہا۔ زندگی کی ہر جد وجہد میں خلوص ان پر حاوی رہا۔ عربی سے متعلق ان کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

مولانا عبداللہ طارق نے اپنے طویل مقالہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن اور علوم ومعارف کی ایک دنیا تھے۔ دارالعلوم میں وہ جس عہدے پر بھی فائز رہے اس کے وقار کو بڑھایا۔ عہدوں سے جتنا ان کا نام روشن ہوا اس سے زیادہ ان کی ذات سے ان عہدوں کو چار چاند لگ گئے۔ طلبار کا ان سے تعلق والہانہ اور شیفتگی وفریفتگی کا ہوتا تھا۔ دارالعلوم میں یہ بات مشہور تھی کہ جو کام مزدوروں اور بیلداروں سے نہ ہوسکے مولانا اپنے طلبار کی فوج سے آناً فاناً کراسکتے ہیں۔ وہ درس کے ساتھ طلبار میں سلیقہ اور شائستگی پیدا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی زندگی میں ایک خاص طرح کی سلیقہ مندی آجاتی تھی۔ مولانا ایک بہترین خطاط بھی تھے۔ جب ہندوستان میں عربی ٹائپ اور کمپیوٹر کا رواج نہیں تھا اس وقت انھوں نے بہت سے طلبار کو خط ٹائپ کی ایسی مشق کرائی کہ کوئی ماہر فن ہی پہچان سکتا تھا کہ یہ کتابت ہے یا ٹائپ۔
عربی زبان کی انھوں نے ایسی ہوا چلائی کہ نہ صرف دارالعلوم میں عربی جرائد ورسائل کی بہار آگئی اور عربی تقریر وتحریر کا رواج عام ہوگیا بلکہ دیگر مدارس میں بھی عربی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ آج دینی مدارس میں عربی کے جو ماہرین پائے جاتے ہیں یہ ساری پود انہی کی لگائی ہوئی ہے۔ تعمیر وتزئین میں بھی اچھے اچھے انجینئر ان کے سامنے ہیچ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ اسم با مسمیٰ یعنی یکتائے روزگار تھے۔

مولانا مرحوم کے دوسرے متعدد تلامذہ نے بھی اپنے اپنے زمانۂ طالب علمی کے واقعات کی روشنی میں مولانا کے گوناگوں اوصاف وکمالات پر روشنی ڈالی، مولانا عبدالستار سلام قاسمی مہتمم دارالعلوم دہلی نے کہا کہ حضرت الاستاذ کے تئیں طلباء کی دیوانگی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر طالب علم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ عفو و درگذر ان کی خاص صفت تھی، وہ مکر و فریب، منافقت اور مداہنت کی سیاست سے قطعی ناآشنا تھے۔ حق کا برملا اظہار ان کا شیوہ تھا۔ اصول و اقدار پر سودے یا مصالحت کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا۔ اگر سودے بازی ان کا مزاج ہوتی تو وہ تادمِ حیات دارالعلوم کے مددگار مہتمم ہی رہتے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور تنظیم ابنائے قدیم کے اربابِ حل وعقد پر زور دیا کہ مولانا کی کوئی ایسی یادگار قائم کی جائے جو ان کے مشن اور کاز کو فروغ دے اور انھیں زندہ وتابندہ رکھے۔ مولانا عقیل احمد قاسمی صدر مدرس جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ، مولانا انس محمد گلزار قاسمی سکریٹری تنظیم ابنائے قدیم، مولانا شفیق الرحمٰن میرٹھی، ڈاکٹر معروف قاسمی (دیوبند) اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے بھی اپنے استاذ کو جذباتی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری اور جناب جبریل امین صدیقی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا ریاض الدین نمائندہ مظاہر علوم وقف، مولانا رضوان نمائندہ مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، ریاض میں مقیم فضلائے دیوبند، جناب محفوظ الرحمان صاحب ایڈیٹر بادبان جدید اور بعض دیگر حضرات کے پیغاماتِ تعزیت پڑھ کر سنائے گئے۔ جلسہ کی صدارت تنظیم ابنائے قدیم کے صدر اور مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق کار مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض مولانا علیہ الرحمہ کے تلمیذ رشید مولانا مزمل الحق حسینی کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم نے انجام دیئے۔ مولانا جمیل احمد الیاسی اور مولانا حفظ الرحمان میرٹھی نے بھی اظہار خیال کیا۔

قابل ذکر ہے کہ مولانا علیہ الرحمہ کے اہم تلامذہ و رفقاء، مختلف مکاتب فکر اور اہم مسلم اداروں اور تنظیموں کی نمائندگی سے اس تاریخی جلسۂ تعزیت نے ایک سیمینار کی شکل اختیار کرلی

تھی۔ وقت کی تنگی اور مقررین کی کثرت کی وجہ سے بہت سے حضرات کو چند جملوں پر اکتفا کرنا پڑا اور بہتوں کو اس کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔ حاضرین کا عام خیال تھا کہ اتنے بھرپور تعزیتی جلسے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

تجویز تعزیت

جلسہ میں ایک تعزیتی تجویز پاس کی گئی جس کا متن حسب ذیل ہے:

"حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات نہ صرف یہ کہ علمی و دینی اور ملی حلقوں کا بلکہ عالم اسلام کا بڑا حادثہ ہے۔ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پورا ہونا مشکل ہے، مولانا جید عالم دین، ہندستانی مسلمانوں کے مخلص قائد اور راہنما، عربی زبان کے عظیم ادیب اور مصنف تھے۔ آپ نے بڑی تعداد میں عربی زبان کے انشاء پرداز اور ماہرین بنائے آپ کے تلامذہ کی بڑی تعداد دنیا کے مختلف ممالک میں عربی زبان اور علم و فن کی اہم خدمات انجام دے رہی ہے۔ آپ کی مرتب کردہ القاموس الجدید و القاموس الاصطلاحی عربی اردو و اردو عربی سے ہندوستان و بیرون ہند ہزاروں شائقین و طلبائے عربی زبان و ادب مستفید ہو رہے ہیں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان کی ترویج و تعلیم کے لئے جو جد و جہد کی اور جس کی وجہ سے عرب ممالک میں دارالعلوم کو امتیازی مقام حاصل ہوا اور اس کی شہرت ہوئی وہ ان کی دارالعلوم کی تاریخ میں ایسی خدمت ہے جس نے دارالعلوم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا مرحوم کو دارالعلوم دیوبند سے زبردست جذباتی تعلق تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند کو دنیا کی ممتاز دانش گاہ بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دارالعلوم کے مددگار مہتمم کی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔ افسوس کہ بعض عوامل اور حالات نے ان کے خوابوں کی تعبیر کو عمل پذیر نہیں ہونے دیا۔ وہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم کے سرپرست تھے۔ تنظیم ابنائے قدیم ان کی وفات

کو ملت اسلامیہ اور فضلائے دیوبند اور علمی حلقوں کا زبردست نقصان تصور کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔"

مرکزی جمعیۃ علماء کا تعزیتی جلسہ

دہلی میں دوسرا بڑا تعزیتی جلسہ ۶؍مئی ۱۹۹۵ء کو جامعہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ میں مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کے زیراہتمام ہوا جس کے مولانا مرحوم صدر تھے۔ اس جلسہ میں بھی بڑی تعداد میں علمائے کرام، مسلم قائدین اور دیگر معزز شخصیات نے شرکت کی اور مقالوں اور تقریروں کے ذریعہ مولانا کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مولانا کے متعدد تلامذہ نے چشم دید واقعات وتجربات کی روشنی میں ان کے گوناگوں اوصاف وکمالات اجاگر کئے اہم مقررین میں مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا احمد علی قاسمی، مولانا فصیح الدین دہلوی، مولانا عبدالحفیظ رحمانی، جناب جاوید حبیب، جناب انور علی دہلوی، کشور لال (سابق ایم پی) مولانا فضیل احمد قاسمی جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء، مولانا مزمل الحق حسینی مولانا قاری شفیق الرحمان میرٹھی، مولانا انس محمد گلزار قاسمی، مولانا حفظ الرحمٰن میرٹھی، مولانا ریاض الدین مظاہر علوم وقف، ایم دودوساجد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ صدر جلسہ مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی کی طرف سے منظوم خراج عقیدت مولانا فضیل احمد صاحب نے پیش کیا۔ مولانا محمد فرقان قاسمی مہتمم جامعۃ القرآن الکریم بجنور اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے تفصیلی مقالے پڑھے۔

(ترجمان دارالعلوم، اپریل۔ مئی ۱۹۹۵ء)

۹

منظوم خراجِ عقیدت

جوہر قاسمی

عربی زباں کا بلبلِ ہندوستاں گیا

بولِ عندلیب نازشِ ہندوستاں گیا — وہ تاجدارِ علم وحید الزماں گیا
اپنی زمیں سے اُڑ کے وہ تا کہکشاں گیا — اور باوجود بندشِ نامہرباں گیا
فصلیں اگائیں پھول کھلائے چمن چمن — کلیوں کو گدگدا کے وہ ابرِ رواں گیا
جن کا غبار سر بھی کوئی جھاڑتا نہ تھا — ان کو بنا کے بلبلِ صد داستاں گیا
سوکھی زمیں کو اشکِ محبت سے سینچ کر — پھولوں کو ہر قطار سے آبِ رواں گیا
فکرِ عجم، زبانِ عرب، روحِ دیوبند — تنہا تھا اس کے ساتھ مگر کارواں گیا
رمزِ سخن شناس، متاعِ سخن وراں — عربی زباں کا بلبلِ ہندوستاں گیا
جس نے قلم کو خونِ جگر سے رواں کیا — سمجھا کے دردِ دل کو متاعِ گراں گیا
سو سال پر کھلا تھا گلِ تر، زہے نصیب — جب اس کو لگ گئی نگہ باغباں گیا
وہ شہ سوارِ علم و ہنر صاحبِ نظر — جو ڈھونڈھتا تھا محفلِ قدوسیاں گیا
جو نظمِ گلستاں کے لئے بے قرار تھا — فکرِ جمیل لے کے شعورِ زیاں گیا
کہتا ہوا اکابرِ گلشن کی داستاں — اپنے خدا کے سامنے با صد فغاں گیا
سمجھے گا کون غنچہ و گل کی اداسیاں — جو بھانپتا تھا سوزشِ دردِ نہاں گیا
جھولا جھلا رہی تھی نسیمِ ہنر جسے — طوفاں کی زد میں آج وہی آشیاں گیا
اندھے کنویں میں پھینک کر آنسو بہائیے — وہ تو عزیزِ مصر تھا با عز و شاں گیا
جس کے لئے صلیب بناتے رہے رقیب — وہ تھا مسیحِ علم، سوئے آسماں گیا
کہہ دینا تاجرانِ حرم سے میرا سلام — تھا عاشقِ رسول سوئے آستاں گیا
دیوار و در کی رونقِ حسن آفریں لئے — وہ حسنِ اہتمام کا محرم کہاں گیا
ہاں آبروئے مادرِ دارالعلوم پر — سو جان سے فدا تھا وہ جوہر کہاں گیا

محمد زبیر اعظمی ایولہ ضلع ناسک

گلہائے عقیدت

درشان علامہ وحید الزماں کیرانوی

علم و اخلاق کا اک کوہِ گراں چھوڑ کر ہم کو دنیا سے جاتا رہا
محفلِ علم و فن سونی سونی ہوئی، دیوبند آنسوؤں میں نہاتا رہا

تو علوم و معارف کا ابرِ کرم، تھے امینِ صداقت زبان و قلم
اک تکلم بھی تیرا خدا کی قسم، علم و فن کے ستارے بچھاتا رہا

قصرِ نفرت گرانا ہی اسوہ ترا، دستِ الفت بڑھانا ہی شیوہ ترا
پیار کی اوس سب پر چھڑکتا رہا، جو بھی آتا رہا جو بھی جاتا رہا

زندگی بھر تجھے کام سے کام تھا، سب کے حق میں تو رحمت کا پیغام تھا
رزم گاہ سیاست ہو یا بزم ہو، تو محبت کے موتی لٹاتا رہا

تو زبانِ عرب کا بڑا نکتہ رس، تجھ کو حاصل تھی اس پر عجب دسترس
تیری قاموس تھیں جس کے بیش نظر، ٹھوکروں سے وہ بچتا بچاتا رہا

اے وحیدِ زماں فخرِ ہندوستاں، لائقِ ناز ہیں تیری سب خوبیاں
کامیابی ملی تجھ کو ہر موڑ پر، گو مقدر تجھے آزماتا رہا

تجھ پہ عربی ادب کو بڑا ناز تھا، جس کے لاکھوں میں تو ہی سرافراز تھا
تجھ کو فیضانِ حق سے قلم وہ ملا، جو عرب سے بھی آنکھیں ملاتا رہا

حق شناسوں کی توہین کے حرمت رہا، علم والوں کی توہین کے رفعت رہا
تجھ کو نیچا دکھاتا کوئی کس طرح، جب خدا تجھ کو اونچا اٹھاتا رہا

تو نے زہرابِ غیظ و غضب پی لیا، چاکِ دل سوزنِ صبر سے سی لیا
تلخ حالات میں غم کے جذبات میں تو سدا مثلِ گل مسکراتا رہا

تیری تحریر کی دلکشی تھی عجب، تیری تقلید کرتے تھے اہلِ عرب
نطقِ عربی سے جس کو رہا کچھ شغف، اپنی لَے تیری لَے میں ملاتا رہا

جب ہوا تیغِ ظالم سے مجبور تو، ہو گیا اپنے گھر میں ہی محصور تو
تجھ کو بھولا نہ دارالعلوم آج تک، جس میں تو نہرِ حکمت بہاتا رہا

تجھ سے عربی زباں کی رہی آبرو، ہے عبث تیرے جیسے کی اب جستجو
نیند آئے نہ کیوں علم و عرفان کو، جب نہیں وہ جو سب کو جگاتا رہا

تذکرہ تیرا دلچسپ یادت بخیر، ایک طرفہ تماشا ہے نظمِ زبیر
جس نے دیکھا نہیں ہے تجھے عمر بھر، داستاں تیری سنتا سناتا رہا

ؔ مولانا مرحوم سے راقم کی ملاقات یاد نہیں پڑتی۔ حالانکہ دارالعلوم دیوبند میں ہمارا دورِ طالب علمی ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ باکار طالب علم تھے اور ہم بیکار۔ پھر ملاقات کیونکر ہوتی؟ خاکسار تقسیم ہند کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا اور ۱۹۵۰ء میں فارغ ہوا۔ اور عجیب تر یہ کہ ابھی تک زندہ ہے۔ مرنے کی بھرپور صلاحیتوں اور موت کے پیہم تقاضوں کے باوجود۔

محمد زبیر اعظمی ایولہ ضلع ناسک

نوائے غم
مولانا وحید الزماں

گری ہے موت کی بجلی اک ایسے آشیانے پر
کہ جس کو برتری تھی علم کے ہر ہر ٹھکانے پر

خموشی ہے فضاؤں میں
اُداسی ہے ہواؤں میں
گرانی ہے نواؤں میں

کہیں پر آہ و زاری ہے کہیں پر بیقراری ہے
غمِ علامۂ دوراں سے کِس کو رستگاری ہے؟

کوئی نالاں کوئی بسمل
کوئی گریاں کوئی گھائل
نہیں قابو میں کوئی دِل

کسی کی بیگناہی نے ہی اس کا گھر اُجاڑا ہے
تناور پیڑ کو ظالم ہواؤں نے اکھاڑا ہے

غموں کے پڑ گئے سایے
کوئی کیسے خوشی پائے؟
زبیرؔ اب کس طرف جائے؟

بتا شمعِ وحیدی تیرے پروانے کہاں جائیں؟
بتا روحِ وحیدی تیرے دیوانے کہاں جائیں؟

مولانا محمد ... ... الزماں بر

مفتی کفیل الرحمان نشاط عثمانی

نقشِ الم

حضرت مولانا وحید الزماںؒ کے حادثۂ وفات پر

فاضلِ دوراں وحیدِ عصر قاموسِ جدید
صاحب طرزِ نگارش قاسمی فردِ فرید

منحنی پیکر میں رقصاں اک ذہانت کا شباب
مختصر لفظوں میں خنداں رفعتوں کا آفتاب

زورِ دریا کا سا جیسے قوتِ تحریر میں
توڑ روباہی کا جیسے جرأتِ تقریر میں

مسلکِ فکر و نظر جس کا تھا عیاری سے دور
ساتھیوں کی خو سے ہٹ کر ہر ریاکاری سے دور

جس کی گردن خم تھی آدابِ اکابر کے لئے
جس کی شفقت عام تھی سارے اصاغر کے لئے

جس کے ایثار و وفا کا رنگ پہچانا نہیں
غیر تو کیا اپنے ہی احباب نے جانا نہیں

اک معلم اک مدرس قاسمی مہتاب پر
رحمتیں حق کی رہیں اس گوہرِ کمیاب پر

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

جبریل امین ثاقب صدیقی

گلہائے عقیدت

بسلسلۂ وفات حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

اک مردِ حق شناس مسلماں چلا گیا
عالم سے ایک صاحبِ ایماں چلا گیا

علم و ادب کے پھول کھلاتا تھا چار سُو
وہ رشکِ صد بہار گلستاں چلا گیا

صدق و صفا کے نور سے روشن تھی بزمِ علم
اے ہم نشیں وہ شمعِ فروزاں چلا گیا

فردِ وحید ہو کے بھی تھا ایک انجمن
دنیائے علم و فن کا شبستاں چلا گیا

عربی ادب کا شاہ تھا دارالعلوم میں
مسند اداس ہے کہ وہ سلطاں چلا گیا

اب تشنگانِ علم کی کیسے بجھے گی پیاس
فن ادب کا بحر دبستاں چلا گیا

کردار اور فکر و عمل کا تھا وہ دھنی
رشد و ہدیٰ کا صاحبِ عرفاں چلا گیا

عشاقِ علم کیلئے تھی اک پناہ گاہ
وہ سایہ دار شجر دبستاں چلا گیا

رکھتا تھا دوستوں میں وہ اک شانِ امتیاز
اک بے مثال عالم ذیشاں چلا گیا

دیوبند کا بھی "حادثہ" سوہانِ روح تھا
دل میں چھپائے زخم عزیزاں چلا گیا

عالم کی موت گویا اک عالم کی موت ہے
ملت کا مایہ ناز نگہباں چلا گیا

شامِ الم میں چہرۂ احباب ہے دھواں
اک سانحہ ہے نیرِ تاباں چلا گیا

یارب تو فضلِ خاص عطا کر وحید کو
نعم البدل دے نازشِ دوراں چلا گیا

ثاقب بھی تعزیت میں برابر کا ہے شریک
ہے مختصر کہ محسنِ انساں چلا گیا

مولانا محمد ...

ولی اللہ ولی قاسمی

نالۂ فراق

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ

گلستانِ دینِ حق کا باغباں جاتا رہا
کاروانِ علم و فن کا پاسباں جاتا رہا

جس کی مرگِ ناگہانی پہ ہے عالم اشکبار
جس کے جانے سے ہے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہر طرف برپا ہوا ہنگامۂ آہ و فغاں
محفلِ خنداں کو کر کے نوحہ خواں جاتا رہا

یاد کر کے موت کو پایا تھا جو کیف و سرور
ہو کے ہم آغوشِ مرگِ ناگہاں جاتا رہا

جاہ و حشمت کو ہزاروں بار دی اس نے طلاق
روٹھ کر دنیا سے سوئے ایزداں جاتا رہا

کاروانِ ملتِ اسلامیہ کو چھوڑ کر
دوستو! مخلص امیرِ کارواں جاتا رہا

عظمتِ اسلام کو اس نے لگائے چار چاند
اک مسیحائے گروہِ طالباں جاتا رہا

عندلیبانِ چمن کہتی ہیں ہو کے اشکبار
گلستاں کو چھوڑ کر مالی کہاں جاتا رہا

دیکھ کر جس کو ہمیں اسلاف کی آتی تھی یاد
جس سے وابستہ تھی یادِ رفتگاں جاتا رہا

اتحادِ ملک و ملت کے لئے کوشاں رہا
دل میں لے کے قوم کا دردِ نہاں جاتا رہا

جس کی تدبیریں تھیں مشعل نکتہ دانوں کے لئے
آہ ایسا نازشِ ہر نکتہ داں جاتا رہا

وہ تڑپ جاتا رہا ہے دیکھ کر مظلوم کو
آہ! سچا غمگسارِ ناتواں جاتا رہا

ایک جانب مردِ آہن اور بیباک و دلیر
دوسری جانب تھا بیحد مہرباں جاتا رہا

• استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، دھولیہ، مہاراشٹر

عالموں کے درمیاں ہوتا رہا مسند نشیں — آہ اک سرخیلِ بزمِ عالماں جاتا رہا
جس کی کوشش سے بنا رشکِ ارم دار العلوم — نشأۂ ثانی کا وہ روحِ رواں جاتا رہا
جس کی باتیں پُر اثر، انمول اندازِ بیاں — دہر سے افسوس وہ شیریں زباں جاتا رہا
مردگانِ قوم کو دیتا تھا جو درسِ حیات — محفلِ دنیا سے وہ جادو بیاں جاتا رہا
جو گرجتا تھا سرِ اسٹیج بجلی کی طرح — شیر دل افسوس وہ شعلہ بیاں جاتا رہا
چاشنی باقی ہے گل افشانیٔ گفتار کی — گو لیے اپنی زبانِ دُرفشاں جاتا رہا
اک زعیمِ زندہ دل، اک رہنمائے باوقار — صاحبِ طرزِ نگارش عربی داں جاتا رہا
غازیٔ کردار تھا وہ پیکرِ رعب و جلال — اک مثالی، صاحبِ عزمِ جواں جاتا رہا
گردشِ ایام سے لغزش نہ آتی پاؤں میں — عزم و استقلال کا کوہِ گراں جاتا رہا
انقلاباتِ زمانہ سے رہا زور آزما — ایک فولادی مجاہد بے گماں جاتا رہا
علم و فن کے موتیوں سے تھا بھرا دامانِ دل — آہ اک غوّاصِ بحرِ بیکراں جاتا رہا
ایک سحبانِ زمانہ اور حسانِ گروہ — درحقیقت وائلِ ہندوستاں جاتا رہا
جس کی عربیت کا تھا عرب و عجم کو اعتراف — آہ ایسا ماہرِ عربی زباں جاتا رہا
سرزمینِ ہند میں عربی ادب کا تھا امام — آہ عربیت کا یکتائے جہاں جاتا رہا
جس کی تصنیفات جیتی جاگتی تصویر ہیں — چھوڑ کر انمٹ نقوشِ جاوداں جاتا رہا
نسلِ نو قاموس سے ہوتی رہے گی مستفید — جاودانی دے کے ایسا ارمغاں جاتا رہا

زندۂ جاوید ہے، دنیا میں جسکا تذکرہ
اے ولیؔ وہ نازشِ ہندوستاں جاتا رہا

فاضلِ جلیل علّامہ یگانہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے

سانحۂ ارتحال پر

تأثرات ظفر جنکپوری

وہ عظیم المرتبت، وہ مردِ بیباک و جری
حق نے بخشا تھا انھیں فکر و شعور و آگہی

تھے مدبّر، صاحبِ فکر و نظر، روشن خیال
تھی میسّر رحمتِ حق کی، اُنھیں جلوہ گری

وہ وحیدِ عصر، عالم، وہ شہنشاہِ ادب
جس کے فیضِ علم سے عالم نے پائی روشنی

ان کو بخشا تھا مشیت نے عجب حسنِ کمال
لائقِ صد رشک تھی، اُن کی درخشاں زندگی

نیک فطرت، پاک طینت، مردِ حق، سادہ مزاج
تھی درخشاں اُن کی پیشانی سے شانِ بندگی

اب کہاں مردِ مجاہد، وہ نگہبانِ چمن
ہجر میں گریہ کناں ہے، اس کے ہر گُل، ہر کلی

رہتی دنیا تک انھیں ہرگز بھلا سکتے نہیں
لائقِ صد رشک تھا، اُن کا نظامِ زندگی

فیض جاری ان کا رہتا تھا ہر اک شام و سحر
یاد آئے گی ہمیشہ ان کی یہ دریا دلی

آفتابِ علم و دانش ہو گیا آخر غروب
چل بسا دے کر ہمیں درسِ شعور و آگہی

مغفرت فرما خدایا اُن کی اپنے فضل سے
آخرت میں ہو بہر عنواں انھیں آسودگی

رحمتِ حق، قبر پہ اُن کی گل افشانی کرے
سایۂ فضلِ خدا ہو، اُن کے سر پہ ہر گھڑی

تھا فراست میں کوئی، ثانی نہ اُن کا اے ظفر
کون تھا اس عہد میں کرتا جو اُن کی ہمسری

محمد کبیرالدین اکبر القاسمی
مدرسہ عربیہ سراج العلوم، بالیکندری بزرگ
بیلگام (کرناٹک)

وحیدِ زماں

علم کے پاسباں وحیدِ زماں
صدق کے ترجماں وحیدِ زماں

پدر و مادر سے بھی بہت زیادہ
مشفقِ طالباں وحیدِ زماں

تو کہ تھا یادگارِ حق گویاں
تو صداقت نشاں وحیدِ زماں

ادبِ عربی کے شہسوارِ عظیم
تیری لونڈی زباں وحیدِ زماں

فیض سے تیرے ان گنت گونگے
بن گئے خوش بیاں وحیدِ زماں

رشکِ احباب، فخرِ ہم عصراں
رہبرِ رہبراں وحیدِ زماں

ہر ادا تیری ترجمانِ ادب
واعظ درفشاں وحیدِ زماں

تو تھا فضل و کمال کا مخزن
نازشِ عالماں وحیدِ زماں

کارواں کا تو میرِ راہِ صواب
صاف دل پاک جاں وحیدِ زماں

حق تعالیٰ سے ہے دعا اکبر
پائیں قیام جناں وحیدِ زماں

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

ڈاکٹر رفیق بلگرامی

قطعۂ تاریخ وفات

برسانحۂ ارتحال حضرت مولانا مرشدی وحید العصر وحید الزماں صاحب کیرانوی

وحید الزماں عالمِ باوقار
تھے قدرت کے جو اک حسیں شاہکار
معلّم، مدبّر، مفکّر مزاج
طریقت، شریعت، فضیلت شعار
مقرّر، مجدّد، خطیب وادیب
جہاں میں وہ اک قدرتِ کردگار
وہ اک مخزنِ علم وفن بے بدل
نہیں جن کے اوصاف کا کچھ شمار
خزاں آگئی گلشنِ علم میں
مگر ہے فضاؤں میں صوتِ ہزار
رفیق اُن کی تاریخ رحلت ہے یہ
سبھی کے تھے جو مخلص وجاں نثار

۱۹۹۵

مفتی محمد طاہر الاعظمی
مدرسہ دینیہ اشاعت العلوم، کوٹلہ، اعظم گڈھ

تاریخ وفات کے چند مادّے

مولانا وحید الزماں الکیرانوی رحمہ الحی المتین
۱۴۱۵

قد ذھب الی رحمۃ ربہ الباسط
۱۴۱۵

رحمہ اللہ الواجد العظیم
۱۴۱۵

نیک سیرت وحید زمن مولانا وحید الزماں کیرانوی
۱۴۱۵

الوداع استاذ علماء
۱۴۱۵

یکے شیخ ادب دار العلوم دیوبند
۱۴۱۵

زمادۂ محمد طاہر الاعظمی
۱۴۱۵

مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمہ اللہ الرشید
۱۹۹۵

نور مرقدہ اللہ الواحد العظیم
۱۹۹۵

روشن بیاں شیخ ادب دار العلوم دیوبند
۱۹۹۵

نکتہ سنج شیخ الادب دار العلوم دیوبند
۱۹۹۵

بطبع پاک مفتی محمد طاہر الاعظمی
۱۹۹۵

چند تصنیفی و تعمیراتی کارناموں کی کہانی

تصویروں کی زبانی
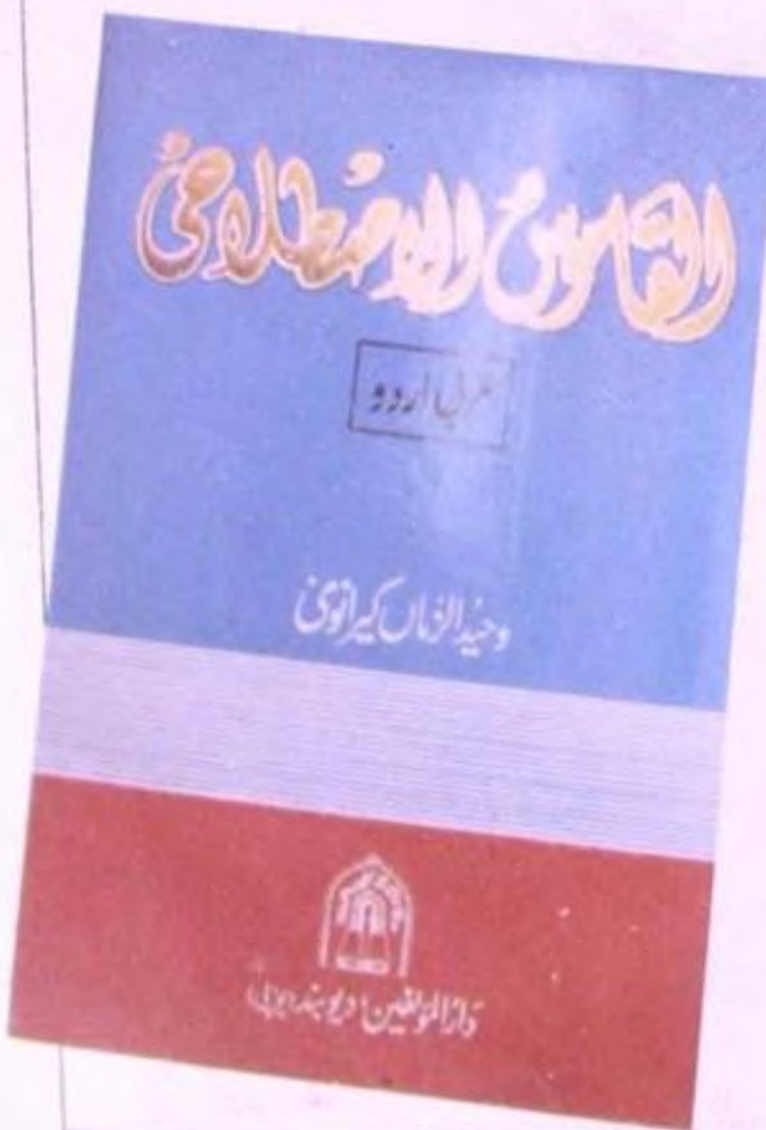
قرر مجلس الشورى لدار العلوم بديوبند تدريس هذا الكتاب في المرحلة العربية الابتدائية لتلاميذ السنة الثانية من عام ١٣٩١هـ

نفحة الادب

لتلاميذ السنة الثانية

اعداد
وحيد الزمان الكيرانوي
استاذ اللغة العربية في دار العلوم بديوبند

ملتزمة الطبع والتوزيع

ادارة نشر واشاعت دار العلوم ديوبند

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی تقریباً ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل عظیم ڈکشنری "القاموس الوحید" کے ابتدائی مسودہ کے ایک صفحہ کا عکس۔ اس ڈکشنری کی کتابت مولانا کی زندگی ہی میں تقریباً مکمل ہو چکی تھی اور عنقریب اس کے منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

بَرَّحَ دا بَرَّحَ بِہٖ ح ساما

تَبَرَّجَتِ المَرْأَةُ: غیر شوہر کے سامنے سنگار کرنا، آسمان کا ستاروں سے مزین ہونا

الإِبْرِيْجُ: دودھ بلونے کا آلہ ج أَبَارِيْج

البَارِجَةُ: شریر (۲) برج والی کشتی (۳) جنگی جہاز [illegible]

البُرْجُ: قلعہ، محل (۲) گنبد (۳) فصیل پر بنا ہوا برج [illegible]
(۴) رکن (۵) آسمان کے بارہ برجوں میں کوئی برج۔ ج: بُرُوج

البَرَجُ: خوب رو۔ ج أَبْرَاج

التَّبَارِيْجُ: نباتات کے پھول

البُرْجُدُ: دھاری دار موٹی چادر۔ ج بَرَاجِد

• البُرْجَاسُ: نیزے کی نوک پر رکھی ہوا نشانہ ج بَرَاجِیْس

• البَرْجَلُ: پرکار، دائرہ کش

• بَرْجَمَ الکلامُ: بات کا سخت ہونا

البُرْجُمَةُ: انگلی کا جوڑ ج بَرَاجِم

• البُرْجُوَازِيَّةُ: سرمایہ دار طبقہ، مقابل مزدور طبقہ

• بَرِحَ ــ بَرَحًا و بُرُوحًا: ظاہر ہونا (۲) پرندہ کا دکھائی دینا (جس کا بائیں جانب سے دائیں طرف گزرنا علامت بدفالی)

بَرِحَ ــ بَرَحًا و بَرَاحًا و بُرُوحًا: الْمَكَانَ ومنہ: جگہ سے ہٹنا
مَا بَرِحَ يَفْعَلُ کذا: برابر کرتا رہا (۲) کھلی جگہ میں آ جانا (۳) ــ
الخَفَاءُ: پوشیدگی ختم ہونا

أَبْرَحَ الشَّیءُ: عجیب لگنا ــ الشَّیءُ فلانًا: پسند آنا ــ فلانًا
خستہ کرنا، أَبْرَحَ بِہٖ: تکلیف دینے پر مصر ہونا ــ ہ: تعجب میں ڈالنا

[illegible] ولیاہ

البَرَاحُ: کشادہ زمین (۲) واضح بات (۳) ناپسندیدہ امر

البَرْحُ: سخت تکلیف، سختی و مصیبت، لَقِيَ منہ بَرْحًا بَارِحًا: اس کی طرف سے سخت تکلیف پہنچی، بَنَاتُ بَرْحٍ: مصائب و تکالیف

بُرْحَی: نشانہ خطا ہونے کے وقت بولا جانے والا لفظ جس سے تعجب و افسوس [illegible]
مَرْحَی کی ضد جو صحیح نشانہ کے وقت بولا جاتا ہے برائے خوشی و تعجب۔

البُرَحَاءُ: سختی، مصیبت، بُرَحَاءُ الحُمّٰی: بخار کی تیزی و شدت

البُرْحَةُ: ہر شے کا بہتر فرد، عمدہ حصہ

البَرِيْحُ: تعب

التَّبَارِيْحُ: مصائب، سختیاں، تباریح الشوق: عشق کی سختیاں

مُبَرِّحٌ: اذیت رساں، أَلَمٌ مُبَرِّحٌ: سخت درد

• بَرَدَ ــ بَرْدًا و بُرُودًا: ٹھنڈا ہونا (۲) سست پڑ جانا (۳) رہ جانا
(۴) کام کا آسان ہو جانا (۵) تلوار کا اچٹ جانا (۶) ٹھنڈا کرنا
(۷) پانی سے تر کرنا، برف ملانا (۸) لوہے وغیرہ کو [illegible]۔ [illegible]
(۹) [illegible] (۱۰) ــ مَرِيْدًا: ڈاک روانہ کرنا (۱۱) بَرَدَ حَقُّہٗ
علی فلانٍ: حق ثابت ہونا (۱۲) ــ ہ: حوصلہ پست کرنا

بَرُدَ ــ بُرُوْدَةً: ٹھنڈا ہو جانا (۲) زمین پر اولے پڑنا

بُرِدَ القومُ: قوم کو ٹھنڈک لگ جانا، زکام ہو جانا

أَبْرَدَ: موسم سرما میں داخل ہونا، ٹھنڈک کے وقت میں داخل ہونا (۲) کسی کو
قاصد بنا کر بھیجنا (۳) ٹھنڈا رکھنا (۴) ٹھنڈا کر دینا (۵) روٹی
پانی سے تر کرنا (۶) سست و پست حوصلہ بنانا (۷) ــ بِرِسَالَةٍ

مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ کی غیر مطبوعہ ڈکشنری "القاموس الموضوعی" کے کتابت شدہ مسودہ کا عکس۔

ملبوسات

(کپڑے وغیرہ)

قماش : بن سلا کپڑا (ہر قسم کا) ج اقمشۃ

مَلابِس، ثیاب : کپڑے (سلے ہوئے)

ثیاب جاھزۃ : تیار شدہ کپڑے

ملبوسات : پہننے کی چیزیں کپڑے وغیرہ

لباس : کپڑے، ڈریس ج البسۃ

فاخِر (شاندار) ساذج، بسیط (سادہ) ثمین (قیمتی) رخیص (سستا) خِلق (پرانا) جدید (نیا) بالی (بوسیدہ) مُمزّق (پھٹا ہوا) مرقوع (پیوند لگا ہوا) مخیط (سلا ہوا) ابیض (سفید) ملوّن (رنگین) مُخطّط (دھاری دار) مُطرّز (پھولدار) مصبوغ (رنگا ہوا) مغسول آلِیًّا (ڈرائی کلین کیا ہوا) نظیف (صاف)

وَسِخ (میلا) قذِر (گندا) طاھر (پاک) نجِس (ناپاک) خشن (کھردرا) ناعم (ملائم) سمیک، غلیظ (موٹا) رقیق (باریک) مکوِیّ (پریس کیا ہوا) ضیّق (تنگ) فضفاض (ڈھیلا) تامّ، مطابق للجسم (فٹ)

حریریّ : ریشمین کپڑے

قطنی : سوتی کپڑے

صُوفی : اونی کپڑے

کتّانیّ : فریا سلک کے کپڑے

بَدلۃ، حُلّۃ:

سوٹ، کپڑوں کا جوڑا ج حُلَل

لَبِسَ ۔ لبسًا : کپڑے پہننا

خَلَعَ ۔ خلعًا : کپڑے اتارنا

خاط ۔ خیاطۃ : سینا

مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ کی غیر مطبوعہ عربی کتاب "نخبة الاحادیث" کے ابتدائی مسودہ کا عکس، جو ایمان وعقائد اور اخلاق وآداب معاشرت سے متعلق منتخب احادیث اور عربی میں ان کی مختصر تشریح وتفسیر پر مشتمل ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: بُنی الاسلامُ علی خمسٍ: شہادةِ ان لا الہ الا اللہ وانَّ محمدا عبدہ ورسولہ واقامِ الصلوة وایتاءِ الزکوة والحجِ وصومِ رمضانَ. متفق علیہ.

(مشکوٰة ص ۱۲ کتاب الایمان)

اُسّہ علی خمسٍ: علی خمس دعائم وھی جمع دعامة مایقوم ویُسند علیہ البناء کما یقوم علی دعائم هکذا دین الاسلام قائم علی خمسة اصول، فبقوتها وضعفها وسقوطها کلها او بعضها یکون وضع الدین قویا او ضعیفا او متهدما او ناقصا فیجب الاحتفاظ بها

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المُسلم من سَلِمَ المسلمون من لِسانہ ویدِہ والمُہاجر من هجر ما نهی اللہ عنہ، هذا لفظ البخاری ولمسلم قال: ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای المسلمین خیر؟ قال: من سَلِم المُسلمون من لسانہ ویدہ.

(مشکوٰة ص ۱۲ کتاب الایمان)

المسلم بالمعنی الصحیح هو الذی لا یؤذی اخاہ المسلم بکلمات مؤذیة مهینة تدل بها لسانہ ولا یتعدّی علیہ بیدہ او بسلاحہ فان ذلک مقتضی الایمان باللہ فمن لم یمتنع عن ذلک فکأنہ لم یتحل بالایمان الکا[مل]

هَجَرَ ترک و ابتعد عنہ.

عن انس انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من صلّی صلاتنا واستقبل قِبلتَنا واکل ذبیحتنا فذلک المُسلِم الذی لہ ذِمّة اللہ وذمّة رَسولِہ فلا تُخفِرُوا اللہ فی ذمّتہ. رواہ البخاری

(مشکوٰة ص ۱۲ کتاب الایمان)

صلّی صلاتنا صلی علی طریقتنا (طریقة النبی صلی اللہ علیہ وسلم) لہ ذمّة اللہ ای ان اللہ ورسولہ یضمنان لہ فیما لزم من حفظ وامان. فلا تخفِروا اللہ لا تخونوا فی حق اللہ علیکم ما وفوا ما وجب علیکم من مسئولیة لاداء حق اللہ.

"باب امداد" جس کا بالائی جدید ہال (جس میں دفتر اہتمام واقع ہے)
مولانا وحید الزماں معاون مہتمم کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔

دارالعلوم کی قدیم مسجد کا جدید دروازہ جشن صد سالہ کے موقع پر
مولانا وحید الزماں کیرانوی کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔

دارالتفسیر، دارالحدیث اور ان سے ملحقہ درسگاہوں پر مشتمل عمارت جس کے عالیشان گنبد اور شمالی وجنوبی برجیوں کی تزئین وترمیم اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماں صاحب کی زیر نگرانی عمل میں آئی۔
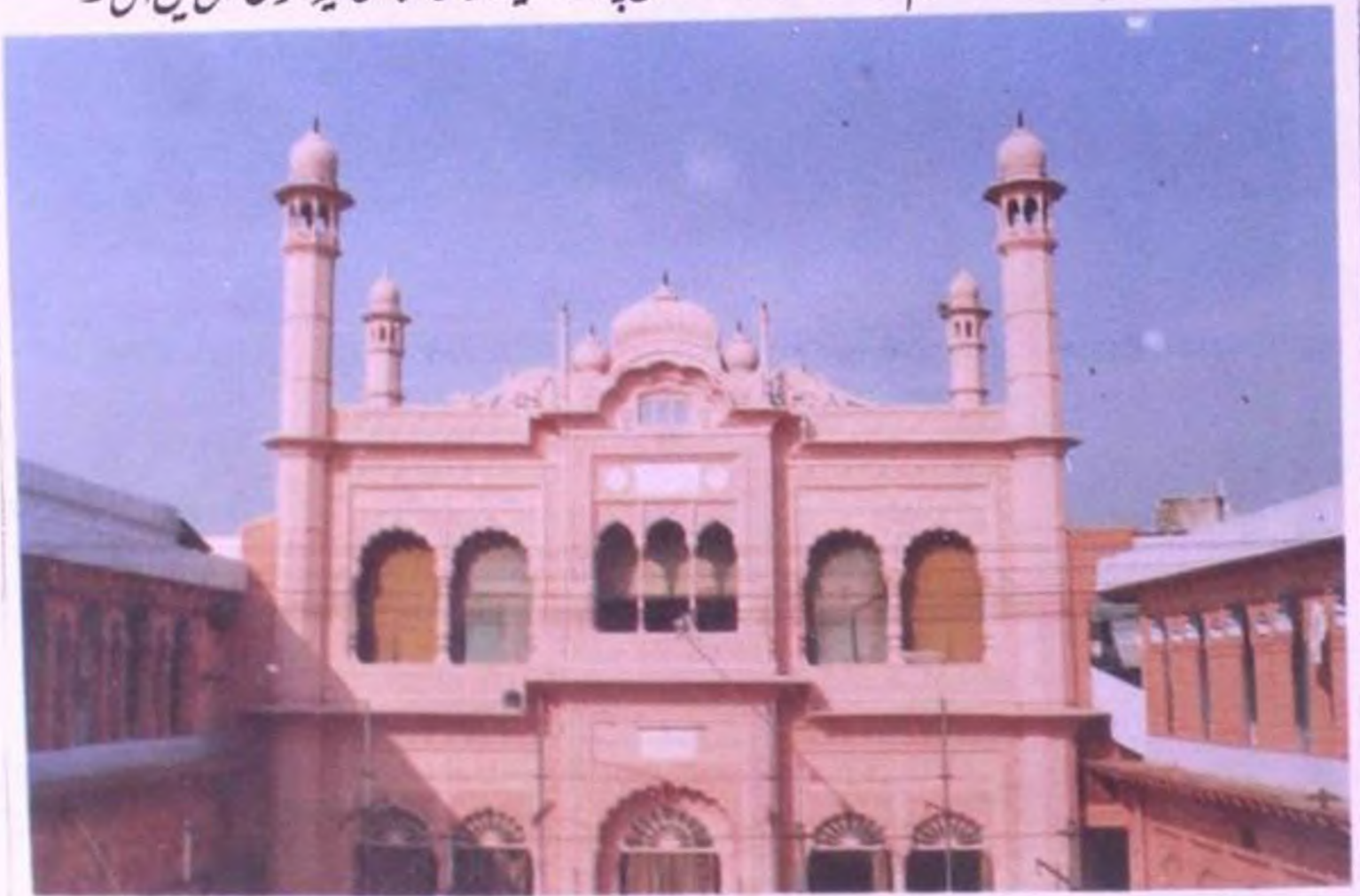
دارالعلوم کی قدیم مسجد جس کی بالائی منزل اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماں صاحب نے تعمیر کرائی۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر

دارالتربیت کی خوبصورت عمارت جو مولانا وحید الزماں صاحب کی نگرانی میں تعمیر ہوئی۔

افریقی منزل جدید جس کی بالائی منزل مولانا وحید الزماں کیرانویؒ معاون مہتمم دارالعلوم کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی۔

دار المدرسین، جس کی تعمیر مولانا وحید الزماں صاحب معاون مہتمم دار العلوم کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔

رواقِ خالد (خالد ہاسٹل) جس کی تعمیر مولانا وحید الزماں صاحب کی نگرانی میں انجام پذیر ہوئی۔

کتب خانہ دار العلوم کا دو منزلہ برآمدہ جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماںؒ صاحب کی زیر نگرانی تعمیر ہوا۔

دفتر تعلیمات کی جدید عمارت جو اجلاس صد سالہ کے موقع پر مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی۔

R.N.I. - 57442/94, DL-11333/95-96 JANUARY-MAY 1996
TARJUMAN-E-DAR-UL-ULOOM (JADID)
161/11, JOGABAI, JAMIA NAGAR, NEW DELHI-110025

مولانا وحید الزماں کیرانوی ؒ

نام: مولانا وحید الزماں ابن مولانا مسیح الزماں۔ ننھیالی نام: قمر الزماں۔
ولادت: کیرانہ ضلع مظفر نگر۔ یوپی۔ بتاریخ ۱۷ فروری ۱۹۳۰۔ تعلیم: کیرانہ، حیدرآباد اور دارالعلوم دیوبند (فراغت: ۱۹۵۲) ۱۹۵۹ میں عربی اور انگریزی تعلیم کے لئے دیوبند میں دارالفکر قائم کیا۔ ۱۹۶۳ میں دارالعلوم میں بحیثیت استاذ عربی تقرر ہوا۔ دارالعلوم سے ۲۷ سالہ وابستگی کے دوران مختلف النوع عظیم الشان کارنامے انجام دیئے جن میں عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت، اجلاس صد سالہ کے لئے بنائی گئی مختلف کمیٹیوں کی سربراہی، دارالعلوم کی مختلف عمارتوں کی ترمیم و تزئین اور تعمیر جدید اور اجلاس کے بعد تحریکِ اصلاح وانقلاب کی کامیاب قیادت شامل ہے۔ انقلاب کے بعد ۱۹۸۳ میں ناظم مجلس تعلیمی اور ۱۹۸۵ میں معاون مہتمم کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ ۱۹۸۸ میں دارالمؤلفین کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا جس سے تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہوئیں۔

صحافتی خدمات: اردو ماہنامہ القاسم، سہ ماہی عربی مجلہ دعوۃ الحق، پندرہ روزہ عربی الداعی اور پندرہ روزہ عربی الکفاح کا اجرا وادارت۔

تصنیفات مطبوعہ: تقسیم ہند اور مسلمان (اردو سے عربی ترجمہ)، خدا کا انعام، اسلامی آداب، انسانیت کا پیغام، آخرت کا سفرنامہ، شرعی نماز، اچھا خاوند، اچھی بیوی، القراۃ الواضحہ تین حصے مع شرح، القاموس الجدید اردو عربی، القاموس الجدید عربی اردو، القاموس الاصطلاحی عربی اردو، القاموس الاصطلاحی اردو عربی، نفحۃ الادب مع شرح، جواہر المعارف۔

تصنیفات غیر مطبوعہ: القاموس الوحید (۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل ڈکشنری)، القاموس الموضوعی، نخبۃ الاحادیث، جواہر المعارف جلد دوم۔

عہدے اور مناصب: رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، صدر ملی جمعیۃ علماء ہند، صدر مرکزی جمعیۃ علماء ہند، رکن عاملہ تنظیم ابنائے قدیم، معتمد دارالمؤلفین، ڈائریکٹر مرکز دعوتِ اسلام، ممبر کورٹ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

بیرونی اسفار: سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین، متحدہ عرب امارات، مصر، رشین یونین، انگلینڈ، فرانس، ماریشش، بنگلادیش۔ وفات: ۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء